

WITH
BEST COMPLIMENTS
FROM

JINDAL METAL INDUSTRIES

Specialist in ; FANCY HANDLES & TOWEL RAIL

MANUFACTURER OF :

All Kinds of Aluminium Fancy Door & Window Fittings

ƧOΛS

Jindal Metal Industries

525, PATI RAM STREET,
BAZAR SITA RAM,
DELHI-110006

Phone :
SHOP FACTORY, Residence : 279440-267470

اشاعتِ خصوصی جشنِ جمہوریت

ٹیلیفون نمبر ۲۷۸۸۹ | رجسٹرار آف نیوز پیپر آف انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۲۵/۳۴۴۶ | رجسٹرڈ نمبر D ۲۳۷۰

ماہنامہ

ایڈیٹر
سرور تونسوی

قیمت سالانہ
بارہ روپے
فی پرچہ
ایک روپیہ پچیس پیسے

شانِ ہند

جلد نمبر ۲۹ | جنوری ۱۹۷۸ء | شمارہ نمبر ۱

نیا یومِ جمہوریت اور شانِ ہند

تھا کل بھی، مگر آج ہے رنگِ چمن اور — جمہور کی قدروں سے بڑھی شانِ وطن اور
گلشن ہے یہ ستیہ وادی ہر چند کا گلشن — طوفاں سے نکھرتا ہے صداقت کا چمن اور
کچھ بڑھ سی گئی عشق کی پاکیزہ نگاہی — کچھ آ ہی گیا حسن میں بیساختہ پن اور
دامن کا الجھنا بھی دلآویز ہے یارو — پھولوں کا چلن اور، نہ کانٹوں کا چلن اور
پانی میں کبھی ایسی روانی تو نہیں تھی! — آزاد ہیں، دلشاد ہیں کچھ گنگ و جمن اور
[illegible] ہوئی سرزمیں ہے [illegible] ہوئی قسمت — پھولوں کی رنگت [illegible] کلیوں کی پھبن اور
ہر گوشۂ گلزار میں بارات سجے گی — پردے ہیں کہیں چھپ کے نہ بیٹھے گی دلہن اور
گلشن کی فضاؤں کو قرار آ گیا آخر — ہر روز نہ بدلے گا اب آئینِ چمن اور!

فیاض بہر گام ہیں میرے لئے کعبے!
آئینہ جہاں بن گئے ذراتِ وطن اور!!

محمد فیاض الدین خاں فیاض گیاوی

افکار و واقعات

جشنِ جمہوریت ۱۹۷۸ء کا مشاعرہ لال قلعہ دہلی

جس کی ناکامی پر بہادر شاہ ظفر کی رُوح تک لرز اٹھی، لال قلعہ کی دیواریں سرگوشیاں کر رہی تھیں کہ یہ مشاعرہ جشنِ جمہوریت ہے یا دہلوی تہذیب کا جنازہ، قلعہ دہلی کی زبان "اُردو" پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ مجھے میرے محافظوں سے بچاؤ۔ مشاعرہ کمیٹی کے مجوزہ غیر درباری شاعروں کی "جنتا" کی طرف سے بے مثال ہوٹنگ۔ محمود سعیدی کی مُردہ اناؤنسنگ مشاعرہ کمیٹی کے ارکان نے کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ اور گلزار دہلوی کی مخالفت کے چکر میں اپنے ہاتھوں سے اُردو کا گلا گھونٹ دیا۔ گزشتہ تیس سالوں میں اُردو کے بدترین دشمنوں کی سرگرمیاں اُردو کا کچھ نہ بگاڑ سکیں مگر مشاعرہ کمیٹی کی ایک ہی لغزش نے اُردو کو لال قلعہ میں دفن کر دیا۔ تاریخ میں یہ موٹے حروف میں لکھا جائے گا کہ ۱۹۷۸ء کے جشنِ جمہوریت کے اُردو مشاعرہ کی "مشاعرہ کمیٹی" نے اُردو کے کفن میں آخری کیل ٹھونک دی تھی۔ پرمانند ردولوی آف پرتاپ اور گوپال متل صاحب ایڈیٹر "تحریک" کو مشاعرہ کی ناکامی پر جنتا حکومت کی طرف سے اعزاز ملنے چاہئیں۔

مندرجہ بالا حاشیہ نعرہ آرائے گرامی اُن باذوق حضرات کی ہیں جو مشاعرہ جشنِ جمہوریت لال قلعہ کو سُننے کے بعد واپس آپس میں دوران گفتگو فرما رہے تھے۔

شانِ ہند کی اشاعت ماہ اکتوبر میں "مشاعرہ جشنِ جمہوریت لال قلعہ ۱۹۷۸ء" کے عنوان سے ایک اداریہ نوٹ میں جناب گیان چند ساحر صاحب کی خدمت عالیہ میں چند گزارشات [illegible] اور یہ گزارشات دہلی کے لفٹنٹ گورنر جناب کوہلی صاحب تک بھی پہنچائی گئی تھیں جناب ساحر صاحب نے ایڈیٹر شان ہند کو بذریعہ خط یقین دلایا کہ انہوں نے شانِ ہند میں اس سلسلہ میں لکھے گئے اداریہ کو بغور پڑھ لیا ہے اور وہ اس سلسلہ میں مناسب کارروائی کر رہے ہیں۔

اخبار الجمعیۃ میں ایڈیٹر شان ہند نے جب پڑھا کہ مشاعرہ لال قلعہ میں شریک ہونے والے شاعروں کی فہرست [illegible] اس کا ماننا تھا کہ یہ مشاعرہ "پرمانند ردولوی [illegible]"

کی باہمی مشترکہ سیاست "درباری شعراء" کی نذر ہو جائے گا اور ناکام رہے گا۔

اس فیصلے سے پورا پورا اتفاق کرنے کی وجوہات موجود ہیں کیونکہ مشاعرہ کمیٹی نے زیادہ تر توجہ اس بات پر مرکوز رکھی ہے کہ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر اور گلزار دہلوی کو اس مشاعرہ سے دور رکھا جائے۔ یہاں تک ہی نہیں بلکہ ان دونوں حضرات کے ملنے جلنے والے شعراء کو بھی لال قلعہ کے اس مشاعرہ میں پھٹکنے تک نہ دیا جائے۔ اگر یہ بات نہیں تھی تو وسیم بریلوی کو اناؤنسر کے فرائض سونپنے کے بارے میں کیوں نظر انداز کیا گیا۔ مخمور سعیدی کو اناؤنسر بنانے کی تجویز یقینی طور پر گوپال متل صاحب اور پروانہ ردولوی کی طرف سے ہی پیش کی گئی ہوگی کیونکہ مشاعرہ کمیٹی کے دوسرے ارکان اس سلسلے میں بلا شبہ یہ جانتے تھے کہ مخمور سعیدی کسی نشست کے لئے اناؤنسر کے فرائض بہتر انداز میں ادا کر سکتے ہیں مگر لال قلعہ کے مشاعرہ کو خوش اسلوبی سے چلانا ان کے بس کی بات نہیں ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ شان ہند میں جگناتھ آزاد کی کی گئی تنقید اُن کے عین مطابق عمل کیا گیا اور یہ محض اس لئے کہ اگر اُن پر عمل کیا گیا تو ساہنی صاحب اور دیگر سرکاری سربراہوں کی نظروں میں شان ہند کی اہمیت بڑھ جائے گی۔ کہا جائے گا کہ آغا امیر قزلباش تو کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کے حاشیہ برداروں میں ہیں انہیں اس مشاعرہ میں مدعو کیا گیا۔ اس سلسلے میں اگر صاف گوئی کو پسند کیا جاتے تو یہ عرض کرنے میں کوئی باک نہیں کہ اس مشاعرہ میں آغا قزلباش کی شرکت بھی جناب گوپال متل اور پروانہ ردولوی کی ہی رہین منت ہے۔ آغا امیر صاحب جب دہلی میں ہوتے ہیں تو وہ کنور صاحب کے ہاں جائیں یا نہ مگر دفتر تحریک میں حاضری دینا اُن کا عین ایمان ہے۔ اُن کے اور اُن کی بیگم کے شعری مجموعے کی اشاعت کے تمام مرحلے دفتر تحریک میں ہی طے ہوتے رہے۔ اور تو اور رات کو دفتر تحریک میں شراب نوشی کی دعوتوں میں امیر قزلباش کی شرکت ضروری سمجھی جاتی ہے۔

شان ہند میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ کسی مشاعر کو اس مشاعرہ میں مدعو نہ کیا جائے چاہے وہ تاج سلین کا سالا ہی

کیوں نہ ہو۔ کیا مشاعرہ کمیٹی کے ارکان میں سے کوئی ممبر بھی سینے پر ہاتھ رکھ کر یہ کہہ سکتا ہے کہ تسنیم فیضی میرٹھی کو کس میرٹ پر مدعو کیا گیا۔ مشاعرہ کمیٹی میں گوپال متل، پروانہ ردولوی اور دیگر دو تین ممبران شاعر ہیں۔ کیا یہ حلفیہ بیان کر سکتے ہیں کہ یہ محترمہ بحیثیت شاعرہ ایک مصرع بھی صحیح طور پر موزوں کر سکتی ہیں؟ اگر ایسا نہیں ہے اور یقیناً ایسا نہیں ہے تو اس محترمہ کے نام کو پیش کرنے والے حضرت یا تو اس مشاعرہ کے حق میں صاف دل نہیں تھے یا انہیں ان محترمہ سے آئندہ کے لئے خوشگوار تعلقات بنانے کی اُمید ہوگی۔ اسی طرح شاعروں کے انتخاب میں۔ مشاعرہ کمیٹی کے ارکان نے یقیناً بددیانتی نہیں تو احباب نوازی کے جذبہ سے کام لیا۔ اور جس کام کی بنیاد ہی نیک نیتی۔ دیانت داری اور صداقت پر مبنی نہیں ہوگی وہ یقیناً سو فیصدی ناکام رہتا ہے۔ اس لئے اس مشاعرہ کی ناکامی کی سو فیصدی ذمہ داری مشاعرہ کمیٹی پر ہے مشاعرہ کمیٹی کی چیرمین صاحبہ اور جناب کیدار ناتھ صاحب ساہنی مشاعرہ کمیٹی کے کھاگ قسم کے ارکان کی سیاست کو سمجھنے سے قاصر رہے اور ملک کے قومی تہوار کا سب سے بڑا مشاعرہ محض مطلب پرستی، احباب نوازی اور درباری اور غیر درباری شعرا کی بحث کی نذر ہو گیا۔ لہذا مشاعرہ کی ناکامی کی سب سے اولین وجہ مشاعرہ کمیٹی کو قرار دینا یقینی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کچھ عرصہ سے اُردو مشاعروں کو ناکام کرنے کی ایک منظم سازش بڑی رازداری سے موثر طور پر کام کر رہی ہے۔ مظفر نگر، سہارنپور کے مشاعرے اسی سازش کے نذر ہو چکے ہیں۔ لال قلعہ کے اس مشاعرہ میں اندرا گاندھی زندہ باد۔ اُردو کے دشمن ہائے ہائے۔ سیٹیاں بجانا۔ کرسیاں اچھالنا۔ سب کچھ اس سازش کے زیر بحث ہو رہا تھا۔ ٹولیوں کی ٹولیاں ہوٹنگ کے لئے پورے جما کر بیٹھی ہوئی تھیں اور یہ سب کچھ باقاعدہ اُجرتاً ہو رہا تھا اور لطف کی بات تو یہ ہے کہ یہ سب کچھ مسلمان نوجوان کر رہے تھے۔ یعنی مسلمانوں کے ہاتھوں ہی اُردو کو لال قلعہ میں دفن کرایا جا رہا تھا۔ ایک طرف تو مسلمان یہ کہتے ہیں کہ اُردو کو حکومت

ختم کر رہی ہے اور دوسری طرف مسلمان نوجوان ہی اردو مشاعروں کو ناکام بنانے میں پیش پیش ہیں۔ یہ سب کچھ کون کرا رہا ہے۔ کیوں کرا رہا ہے۔ اگر آپ عقلِ سلیم سے کام لیں گے تو حقیقتِ حال سمجھ جائیں گے۔ اندرا گاندھی زندہ باد کے نعروں سے یہ غلط خیال اپنے دل میں نہ بٹھا لیجئے گا کہ اندرا گاندھی صاحبہ مشاعروں کو تارپیڈو کرا رہی ہیں۔ ہرگز ہرگز یہ وہم بھی دل میں نہ لائیے گا بلکہ اردو دشمنی کی یہ بندوق اندرا گاندھی کے کندھوں پر رکھ کر چلائی جا رہی ہے۔

سب سے زیادہ افسوسناک واقعہ یہ ہے کہ ہمارے محترم وزیرِ خارجہ جناب اٹل بہاری باجپئی جو اس مشاعرہ میں مہمانِ خصوصی تھے کے ساتھ ان نوجوانوں نے بدتمیزی کی حد تک نامناسب سلوک کیا۔ جنتا حکومت کے وزرا میں اگر اپنے فرائض کو خوش اسلوبی اور بے تعصبانہ انداز میں کسی نے نبھایا ہے تو وہ ہیں اٹل بہاری باجپئی اور لال کرشن اڈوانی۔ حالانکہ یہ دونوں حضرات جن سنگھی تھے مگر جنتا پارٹی میں شمولیت کے بعد جس سوجھ بوجھ کا مظاہرہ ان دونوں حضرات نے فرمایا ہے اسے ملک کے ہر فرد نے پسند کیا ہے اور ساری حکومت میں اگر اردو کا کوئی ہمدرد ہے تو وہ ہے اٹل بہاری باجپئی۔ جن لوگوں نے ان کی افتتاحی تقریر کے دوران بدتمیزی کا مظاہرہ کیا وہ یقیناً اردو دشمن تھے اور سامعین کا فرض تھا کہ اس قسم کے ناپسندیدہ عنصر کی آواز کو دبانے میں کوئی رعایت نہ کرتے۔ ہمارا خیال تھا کہ مشاعرہ کمیٹی کی طرف سے اس بارے میں کوئی بیان اخبارات میں آئے گا کہ انہیں مشاعرے کی ناکامی کا افسوس ہے اور وہ اپنی حماقتوں کا اعتراف کرتے ہیں اور مہمانِ خصوصی کے ساتھ جو نامناسب سلوک روا رکھا گیا اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ ابھی تک ایسا کوئی بیان اخبارات میں نہیں آیا۔

اس مشاعرے کی ناکامی کا ایک بڑا سبب یہ پروپیگنڈا [illegible] مشاعروں کے بارے میں کیا گیا اور [illegible] کہ پروانہ ردولوی صاحب کی

اس تحریک کو گوپال متل صاحب کی ہمدردی حاصل تھی۔

ایمرجنسی کے زمانے میں پروانہ ردولوی صاحب نے جو تیر ایمرجنسی کے خلاف چلائے اگر ان کی تفصیل سے وہ عوام کو آگاہ کر سکیں تو پتہ چل سکتا کہ درباری شعرا اور ان میں واقعی کوئی فرق رہا۔ ایمرجنسی کے ہٹنے اور اندرا گاندھی کی حکومت کے زوال کے بعد پروانہ ردولوی تو کیا اگر بدھوا خاکروب بھی یہ کہے کہ میں ایمرجنسی کے زمانے میں سٹّے کی بوتل چڑھا کر تھانے دار کو گالیاں دیتا رہا تو وہ بھی سچا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس اداریہ کے شروع میں حاشیہ زدہ آرائے گرامی لفظ لفظ صحیح ہیں اور جن حضرات نے اپنی دلی کیفیت ان الفاظ میں بیان کی ہے۔ وہ حق بجانب تھے۔ کیا غضب ہے کہ جشنِ جمہوریت کا مشاعرہ ۹ بجے شروع ہو کر گیارہ بجکر ۲۰ منٹ پر ختم ہو جائے۔

یہ بالکل بجا ہے کہ اس مشاعرہ کی آڑ میں مشاعرہ کمیٹی نے قلعہ معلیٰ کی زبان اردو کو لال قلعہ میں دفن کر دیا۔

سرور تونسوی

بہ کوئے یار بانداز محرمانہ گزر

مرحوم رسالہ "شعلہ وشبنم" کے مدیر مسئول جناب گوہر دہلوی بھی اپنے دل و دماغ کے اکثر گوشوں میں ان بیگم صاحبہ کے تئیں مختلف زاویوں سے عشق کی منازل طے کر رہے تھے مگر ایک تو جینی ہونے کے ناطے اُن میں یہ ہمت ہی نہیں تھی کہ وہ اپنے عشق کا اظہار کھُل کر کر سکتے۔ دوسرے ان کی صرافی کی دکان تھی اور یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ اگر بیگم صاحبہ پر ان کے جینیانہ عشق کا راز افشا ہو گیا تو صرافی کی جگہ شاید مونگ پھلی بیچنی پڑے۔ اس لئے یہ بڑی احتیاط کے ساتھ اپنے عشق کا گلا دباتے رہے۔ مگر برا ہو شاعرانہ مزاج کا کہ وہ انہیں کسی نہ کسی بہانے بیگم صاحبہ کی بارگاہِ حُسن تک لے ہی جاتا۔ تخلص تو ان کا گوہر ہے مگر شاعری کے لحاظ سے گوبر تھے لہٰذا ان کے دوست اور مداح بھی ان کی عدم موجودگی میں گوہر کے بیش بہا تخلص سے ہی یاد کرتے ہیں۔ گوہر صاحب ہر سال مہاویر جینتی کے مبارک موقع پر ایک مشاعرہ بھی کراتے ہیں۔ لہٰذا اس مشاعرہ میں بطورِ خاص ان بیگم صاحبہ کو مدعو کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ گوہر صاحب بیگم صاحبہ کے لئے سی آئی ڈی کا کام بھی کرتے تھے یعنی "تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے" کے مصداق انہوں نے بیگم صاحبہ کے ہاں اکثر و بیشتر اوقات حاضری دینے کا یہ طریقہ نکالا کہ انہیں سچ یا جھوٹ یہ اطلاعات بہم پہنچائے کہ کس شاعر نے بیگم صاحبہ کے خلاف کیا کچھ کہا۔ ازل سے آج تک کسی بھی ایسی عورت نے جنم نہیں لیا جو خوشامد پسند نہ ہو یا اپنے بارے میں عوامی رائے جاننے کی متمنی نہ ہو اور عورت کی یہ فطری فضیلت تا ابد قائم رہے گی۔ چنانچہ گوہر صاحب کی سی آئی ڈی سے بیگم صاحبہ خوش تھیں اور انہیں اس خدمت کے صلہ میں چند قہقہے۔ دو چار پُرکشش مسکراہٹیں اور گھٹیا شعروں پر بڑھیا داد کا مل جانا ہی ان کے اندرونی عشق کی کافی حد تک تکمیل کر دیتا تھا۔ چنانچہ گوہر صاحب اپنی خبر رسانی کے دوران کئی مرتبہ ایڈیٹر شان ہند کے خلاف بھی بیگم صاحبہ کے کان بھرتے رہے۔ جسکی اطلاع ایڈیٹر شان ہند کو بھی مل جاتی تھی۔ اس وقت تک راقم الحروف نے ان بیگم صاحبہ کو دیکھا تک نہ تھا مگر دہلی کی ادبی دنیا میں ان بیگم صاحبہ کے حُسن۔ تغزل اور ترنم کا سکۂ حُسن شاہی یوں چل رہا تھا کہ جس کے سامنے حکومت ہند کا سکہ ماند پڑ رہا تھا۔ چنانچہ اس بلبلِ ہزار داستان کو دیکھنے کے لئے مہاویر جینتی کے مشاعرہ میں یہ نیازمند بھی شریک ہوا۔ اور دیدہ دانستہ اسٹیج پر بیٹھا تاکہ اس آفتِ جاں کو قریب سے دیکھ سکوں۔ مشاعرہ شباب پر تھا کہ بیگم صاحبہ نصف شب کے قریب پوری رعنائیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہوئیں۔ جینی حضرات بظاہر مہذب۔ اور پُر وقار انداز میں مشاعرہ سُن رہے تھے۔ مگر شاید ہی کوئی آنکھ ایسی ہوگی جو ان بیگم صاحبہ کے حور وش انداز کی داد نہ دے رہی ہو۔ بیگم صاحبہ عالمِ رویا میں تھیں۔ آتے ہی گوہر صاحب سے اشارتاً کہا کہ ابھی پڑھوا دو۔ جو شاعر کلام سُنا رہے تھے اُن کی غزل اور ترنم ویسے ہی بیگم صاحبہ کے آتے ہی دَم توڑ چکے تھے۔ لہٰذا انہوں نے مقطع پڑھا اور بیٹھ گئے۔ گوہر صاحب نے مائیک سنبھالا اور بیگم صاحبہ کے تعارف میں اپنی تمام چرب زبانی ختم کرنے کے بعد انہیں کلام سُنانے کی عاجزانہ درخواست کی۔ شاعری۔ شراب اور ترنم کی یہ تثلیث مائیک پر آئی تو ہزارہا سامعین کا مجمع مبہوت ہو کر رہ گیا۔ غزل کا ہر شعر دل و دماغ کو چھونے والا۔ ترنم ایسا کہ اگر داؤد بھی سُن لے تو اپنی لحن بھول جائے۔ اسٹیج پر بیٹھے بیٹھے گوہر صاحب نے اشاروں سے بیگم کو بتا دیا تھا کہ سرور تونسوی یہ ہیں۔ یہ اندازہ مجھے بھی ہو چکا تھا۔ چنانچہ بیگم صاحبہ ابھی کلام سُنا ہی رہی تھیں کہ میں چپکے سے اسٹیج سے اتر رکشا لے چاندنی محل کی طرف چل دیا کیونکہ یہ میں نے سُن رکھا تھا کہ مشاعروں کی روداد میں جن شعرا کی پول کھولی جاتی ہے وہ چاہتے

ہیں بیگم صاحبہ سے سرور تونسوی کی بے عزتی کرائی جاتے (اور اس کی تصدیق بعد میں بیگم صاحبہ نے فرمائی) ۔

ہارڈنگ لائبریری میں مشاعرہ تھا ۔ میں اور نقش صحرائی صاحب ٹکٹ خرید کر سامعین میں جا بیٹھے ۔ مشاعرے کی رُوداد کے لئے میں مختصر نوٹ لکھ رہا تھا کہ یکدم ہال میں سناٹا چھا گیا ۔ جو شاعر کلام سُنا رہے تھے وہ بھی خاموش ہوگئے ۔ دیکھا تو یہ آفتِ جاں تشریف لائی ہیں ۔ امریکی جارجٹ کی سفید براق ساڑھی گیسو تراشیدہ ۔ آہو چشم ۔ سُرخ و سفید رنگ ۔ ہونٹوں پر مشہورِ زماں "ٹانگو" لپ اسٹک کا سرخ رنگ چغلی کھا رہا تھا کہ جیسے ابھی کسی عاشق زار کا خون پی کر آئی ہوں ۔ چال ایسی کہ ہر قدم پہ ہزاروں دل فرشِ راہ بننے کی تمنا رکھیں ۔ متشرع ڈاڑھیاں ہلنی شروع ہوگئیں ۔ نقش صحرائی فرمانے لگے ۔ سرور صاحب یہ کون ہیں عرض کیا کہ یہی وہ بلبلِ ہزار داستان ہے جنہیں نکہت بادِ بہاری بھی اپنا حریف سمجھتی ہے ۔ اس مشاعرہ کی رُوداد جب "شان ہند" میں شائع ہوئی تو اس رُوداد میں اس مشاعرہ کا ذکر جس پیرائے میں کیا گیا تھا اُسے اتنا سراہا گیا کہ "نرالی دُنیا" اور دیگر کئی رسائل و جرائد نے اس حصہ رُوداد کو شائع کیا جس پر حاسدوں نے بیگم صاحبہ کے کان بھرے کہ سرور تونسوی آپ کو اتنا بدنام کر رہا ہے کہ اب دوسرے رسائل و جرائد بھی سرور تونسوی کی وہ تحریر شان ہند سے اخذ کرکے شائع کر رہے ہیں جس میں آپ کے بارے میں لکھا گیا ہے ۔

مگر ان بدبخت حاسدوں کو نسوانی خاصیت کا تجربہ ہی نہ تھا کہ خدا نے آج تک ایسی عورت پیدا ہی نہیں کی جو اپنی تعریف سے خوش نہ ہوتی ہو یا اپنے آپ کو خوبصورت نہ سمجھتی ہو ۔ چنانچہ یہ حاسد شانِ ہند کی رُوداد بیگم صاحبہ کو پڑھ پڑھ کر سُناتے اور وہ دل ہی دل میں اپنے حسن، اپنے سراپا، اپنے کلام ۔ اپنے ترنم اور فراخ دلی کی تعریف سُن سُن کر ایڈیٹر شان ہند کی مداح بنتی گئیں ۔

غالباً لال قلعہ کا ہی مشاعرہ تھا کہ جونہی یہ بیگم صاحبہ تشریف لائیں بجلی فیل ہوگئی ۔ جب شان ہند میں اس مشاعرہ کی رُوداد شائع ہوئی تو لکھا گیا کہ جونہی ۔۔۔۔ صاحبہ مشاعرہ میں جلوہ افروز ہوئیں بجلی کے قمقمے ان کے حسنِ جہاں تاب کی جلوہ سامانی نہ دیکھ سکے اور انہوں نے ندامت سے اندھیرے میں منہ چھپا لیا ۔ ہائے ظالم تبرؔ نے اسی موقع کے لئے تو کہا تھا ؎

وہ آئے بزم میں اتنا تو میرؔ نے دیکھا
پھر اُس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

یار لوگ شان ہند لے کر بیگم صاحبہ کے پاس پہنچے اور انہیں سنایا کہ دیکھئے سرور تونسوی نے آپ کو کس انداز میں ۔۔۔۔۔ بدنام کیا ہے ۔ مگر بیگم صاحبہ کے دل و دماغ میں ایڈیٹر شان ہند کے لئے اور بھی جگہ بن گئی ۔ چنانچہ انہوں نے ایک بہت بڑے افسر کو ایک پارٹی میں بتایا کہ جب یہ گتے سرور تونسوی کے خلاف مجھے بھڑکانے آتے ہیں تو دل چاہتا ہے کہ ان کے منہ نوچ لوں اور اُس افسر نے اکبر الہ آبادی کا یہ شعر بیگم صاحبہ کو سُنایا ؎

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبرؔ نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

تو دونوں نے قہقہے لگاتے ہوئے اپنے اپنے جام ہونٹوں کو لگا لئے ۔

یہ حاسد حضرات اِدھر تو بیگم صاحبہ کو میری تحریروں کو دکھا دکھا کر میرے خلاف بھڑکاتے اور اِدھر مجھے رُوداد کے انداز تحریر پر داد دیتے ہوئے بیگم صاحبہ کے بارے میں لکھی گئی سطور پر کچھ اس انداز میں تبصرہ کرتے کہ جس سے وہ کچھ اور میری زبان سے سُن کر وہاں آگ لگا سکیں ۔ مگر میں اس سلسلے میں ہمیشہ محتاط رہتا ہوں کہ لکھتے وقت رعایت کرنا گناہ ہے اور زبانی طور پر جاہلِ مطلق کی بھی دل شکنی نہیں کرتا ۔ (جاری ہے)

آل انڈیا مشاعرہ ۔ اُردو سروس

(عزیز اندوری)

۷ رجنوری ۱۹۷۸ء کو اُردو سروس (آل انڈیا ریڈیو) کا سالانہ مشاعرہ حسبِ سابق ماؤلنکر ہال میں منعقد ہوا۔ جو کامیاب رہا واقعہ یہ ہے کہ ادھر چند برسوں سے "عوامی مشاعروں" نے جس ذہنی پستی کو جنم دیا ہے اُس نے مشاعروں کی افادیت کو بھی سخت نقصان پہنچایا ہے اور عام طور پر مشاعروں کے انعقاد کا مقصد محض "ہلڑ بازی" سے زیادہ کچھ نہیں رہا ہے۔ میں ایسے کئی مشاعروں کی مثالیں دے سکتا ہوں جہاں باشعور فن کاروں کی پگڑیاں اُچھالی گئیں اور ترنم کا جادو جگانے والے جاہلِ مطلق، طفلِ مکتب متشاعر یا لفظی بازی گری کرنے والے اداکار شعراء کو سر آنکھوں پر بٹھایا گیا۔ ان مشاعروں کو اگر شعری کھیل تماشا کہا جائے تو نا واجب نہ ہوگا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ منتظمین مشاعروں کی "تہذیب" کو پورے طور پر زندہ رکھنے کی کوشش کریں اور ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں بانسری نہ پکڑائیں جو راگ اور سُر سے بھی واقف نہ ہوں۔ میں ایسے بھی کئی مشاعروں کی مثالیں دے سکتا ہوں جن کی کامیابی (صحیح کامیابی) کا سبب منتظمین کا وہ شعور رہا ہے جس نے مشاعرے کو کھیل تماشہ نہ بننے دیا۔ ان مثالوں میں ایک تازہ مثال آل انڈیا ریڈیو کی اُردو سروس کا یہ مشاعرہ ہے جو ماؤلنکر ہال میں منعقد ہوا۔

۷ رجنوری کی شام ۵½ بجے جب میں اپنی بیٹی ساجدہ عزیز کے ساتھ مشاعرہ گاہ پہنچا تو ہال سے باہر ہی بہت سے احباب مل گئے۔ ڈاکٹر ظفر نظامی، ڈاکٹر عنوان چشتی، ڈاکٹر عظیم الشان، عقیل شادات، کاوش بدری، ندا فاضلی، حمید الماس وغیرہ سے اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ ڈاکٹر عظیم الشان کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے صدر شعبۂ اُردو بنائے جانے پر مبارکباد پیش کرنے کے بعد ہم لوگ ہال میں پہنچے۔

اسٹیج پر مدعو شعراء تشریف لا رہے ہیں۔ اس وقت تک ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی، ڈاکٹر معین احسن جذبی، ڈاکٹر وحید اختر، باقر مہدی، ندا فاضلی، محمد علوی، عقیل شاداب، حمید الماس، کاوش بدری، پریم کمار نظر، مظفر ایرج، سلطان اختر، کرشن ادیب موجود ہیں۔ ڈاکٹر خورشید الاسلام، اعجاز صدیقی، خمار بارہ بنکوی اور نازش پرتاب گڑھی کا انتظار ہے۔

اس وقت چھ بجے ہیں اور اب مائیک پر زبیر رضوی (جن کا تبادلہ حال ہی میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر آل انڈیا ریڈیو سری نگر کے عہدے پر ہوا ہے) آتے ہیں اور مشاعرے کا آغاز کرتے ہوئے فرما رہے ہیں۔ "آل انڈیا ریڈیو کی اُردو سروس کی اس شعری نشست میں آپ سب کا میں خیر مقدم کرتا ہوں آپ کو دعوت نامے کے ذریعہ معلوم ہو گیا ہوگا کہ ہم نے اس نشست میں مُلک کے دُور دراز علاقوں سے اُردو کے ذہین شعراء کو زحمت دی ہے۔ اب شاعروں میں تقدیم و تاخیر کی روایت بڑی حد تک ٹوٹ چکی ہے۔ میرے پیشِ نظر بھی یہی بات ہے۔ نشست میں جہاں تک ممکن ہو تنوع باقی رہے۔" اس سلسلے میں زبیر نے فراق کا وہ مشہور لطیفہ سنایا ہے جسے اکثر اُن کے نام سے ہی منسوب کیا جاتا ہے۔

دیکھئے وہ اعجاز صدیقی صاحب اسٹیج پر تشریف لا رہے ہیں۔

اور اب زبیر رضوی کہہ رہے ہیں "جہاں شعراء کو زحمت دینے سے پہلے میزبانی کا حق خود ادا کر رہا ہوں۔ مائیک (جہاں سے شعراء کو کلام پڑھنا ہے) پر پہنچ کر زبیر اپنے مخصوص لیکن پسندیدہ ترنم سے غزل کا مطلع پڑھ رہے ہیں۔

کئی کوٹھے چڑھے گا وہ کئی زینوں سے اُترے گا
بدن کی آگ لے کر شب گئے پھر گھر کو لوٹے گا

زبیر رضوی کو ان کے شعروں پر داد مل رہی ہے۔ سنئے

گزرتی شب کے ہونٹوں پر کوئی بے ساختہ بوسہ
پھر اس کے بعد تو سورج بڑی تیزی سے چمکے گا
ہماری بستیوں پہ دُور تک اُمنڈا ہوا بادل
ہوا کا رُخ اگر بدلا تو صحراؤں پہ برسے گا
میں اس محفل کی روشن ساعتوں کو چھوڑ کر گُم ہوں
اب اتنی رات کو دروازہ اپنا کون کھولے گا
پُرانے لوگ دریاؤں میں نیکی ڈال آتے تھے
ہمارے دَور کا انسان نیکی کرکے چیخے گا

زبیر کی غزل نے مشاعرہ کو شروع ہی سے چمکا دیا ہے اور اب زبیر گوشہ سے آئے ہوئے نئے شعری مزاج کے شاعر عقیل شاداب کو ان کا ایک شعر پڑھ کر بلا رہے ہیں۔ عقیل شاداب نے تحت اللفظ میں اپنی غزل کا مطلع پڑھا ہے۔

مرے ذہن و دل میں فکر و فن میں تھا
نیم کا وہ پیڑ جو آنگن میں تھا

مطلع پر اسٹیج اور ہال دونوں طرف سے داد ملی ہے۔ ایک شعر اور پڑھنے کے بعد شاداب پڑھ رہے ہیں

جس پر لکھا تھا میرا نام و نسب　　قید میں مٹی کے اس برتن میں تھا
دیکھ کر بھی جو نہ دیکھا جا سکا　　عکس آرا وہ ہر اک درپن میں تھا
کہہ نہ پایا جانے کیوں اک حرف بھی　　جانے کیا اُس آدمی کے من میں تھا
آندھیاں سب کچھ اُڑا کر لے گئیں　　پیڑ پر پتہ نہ پھل دامن میں تھا
چھین کر شاداب کوئی لے گیا
اک انوکھا سکھ جو گھر آنگن میں تھا

عقیل شاداب کے بعد زبیر رضوی پریم کمار نظر کو پنجاب کے حسن و جلال کی روشنی میں آواز دے رہے ہیں۔ نظر نے اپنی غزل کا مطلع سنایا ہے۔

حادثہ ایسا کبھی اس کوچے میں کر جاؤں میں
کوئی کھڑکی نہ کھلے اور گزر جاؤں میں

مطلع پر مناسب داد ملی ہے ان کی غزل میں کچھ اچھے اشعار بھی ہیں جن پر داد مل رہی۔ چند شعر آپ بھی دیکھئے ۔

منتظر کب سے ہوں اک دستِ کراماتی کا
وہ اگر شاخ ہلا دے تو بکھر جاؤں میں
سارے دروازوں پہ آئینے لٹکتے دیکھوں
ہاتھ میں سنگ لیے کون سے گھر جاؤں میں
مجھ کو ہر سمت سے آواز لگانے والے
حدِّ فاصل بھی کوئی رکھ کر اُدھر جاؤں

پریم کمار نظر کے بعد اب زبیر رضوی جنوبی ہند کی ادبی و شعری اہمیت کو پیشِ نظر رکھ کر کاوش بدری کو آواز دے رہے ہیں۔ کاوش بدری نے حال ہی میں اپنی طویل ترین نظم "کاویم" کی تخلیق کرکے اہلِ فکر و شعور سے خاصی داد حاصل کی ہے۔ کاوش نے پہلے ترنم سے ایک رباعی سنائی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ گائیکی کے فن سے بھی پوری طرح واقف ہیں لیکن اس نشست میں انھیں ان کے ترنم کے فن پر کم اور اشعار پر زیادہ داد مل رہی ہے ۔

یوں تو ساحل پہ مرا جسم ہے پتھر کی طرح
پھیل جاؤں گا کسی روز سمندر کی طرح
خواب آلود ہے ہر منظرِ خونینِ بہار
زندگی آج ہے روندے ہوئے بستر کی طرح
دشتِ اوہام و گلنارِ یقیں ہونے تک
ہم کو اس دَور میں جینا ہے پیمبر کی طرح
پیکرِ سنگ کو پیراہنِ جاں پہنا کر
ہم بھی پتھرائے گئے ہیں بُتِ آذر کی طرح
میں بھی بُک شیلف ہوں مجھ میں بھی کتابیں ہیں ہزار
یاں تو کاوش ہوں کتب خانے میں نوکر کی طرح

کاوش بدری کے بعد زبیر رضوی نے کرشن ادیب کا تعارف کراتے ہوئے یہ شعر پڑھا ہے ۔

پڑھتے پڑھتے تھک گئے سب لوگ تحریریں تری
لکھتے لکھتے شہر کی دیواریں کالی ہو گئیں

کرشن ادیب مائیک پر پہنچ چکے ہیں اور تحت اللفظ اپنی غزل کا مطلع پڑھا ہے

لاکھ چاہا اُسے دنیا نے خدا کے مانند
ہم پہ وہ جسم کھلا بند قبا کے مانند

مطلع پر خاصی داد پانے کے بعد ادیب پڑھ رہے ہیں ۔

میں ترے دل میں رہوں حرفِ تمنا بن کر
تو سجالے مجھے ہونٹوں پہ دعا کے مانند

اس شعر پر بھی مناسب داد ملی ہے اور آپ فرما رہے ہیں

شہرِ ظلمات سے بس اتنا تعلق ہے مرا
کہ دیا ساتھ ترا میں نے ضیا کے مانند
وقت کا سیل بہا کر اسے لے جائے گا
گیلے کاغذ پہ ہے جو حرفِ وفا کے مانند
مہرباں ہم پہ نہیں اور جفا جو بھی نہیں
زندگی ہم سے ملی تیری ادا کے مانند
ایک اک پل مرا برسوں کے برابر گزرا
کاٹ دی نصف صدی میں نے سزا کے مانند
میں تو تنہا تھا بیابانِ خموشی میں ادیب
کس نے شانوں پہ دھرا ہاتھ صدا کے مانند

کرشن ادیب کے بعد زبیر رضوی فرما رہے ہیں اور اب نئی غزل کی وہ آواز مائیک کے سامنے آ رہی ہے جس نے جذب اور احساس کے نئے منظر ہمارے سامنے کھولے ہیں اور وہ ہیں سلطان اختر صاحب ۔

سلطان اختر نے مائیک پر پہنچ کر خالص مشاعرے کے ترنم میں غزل سنانی شروع کی ہے لیکن اس مشاعرے کے سامعین ترنم کے مقابلے میں شعروں پر داد دینے کے موڈ میں ہیں۔ اسی لئے سلطان اختر کو ان کے اچھے اشعار پر داد مل رہی سنیئے ۔

روشنی سے نم آنکھیں تیرگی سے تر چہرے
دوسروں پہ ہنستے ہیں خود سے بے خبر چہرے

مطلع پر کافی داد ملی ہے اور اب آپ بعض خوبصورت اشعار سنا رہے ہیں

رینگتے ہیں سناٹے عارضِ شکستہ پر !
اپنے آپ سے خائف یہ کھنڈر کھنڈر چہرے
لہر لہر امیدیں — موج موج مایوسی
ڈوبتے ابھرتے ہیں بات بات پر چہرے
بے نمک تو تھے لیکن، اس قدر نہ تھے یعنی
جیسے آج نکلے ہوں قید کاٹ کر چہرے

سلطان اختر اپنی غزل سنا کر اور مناسب داد پاکر اپنی جگہ واپس آگئے ہیں اور اب زبیر رضوی اسٹیج پر بیٹھے بعض شعرا کو متوجہ کر رہے ہیں کہ وہ شاعر کا کلام ذرا غور سے سنیں اور اچھے اشعار پر داد بھی دیں۔ واقعہ یہ ہے کہ مشاعرے کی کامیابی اسٹیج سے ملنے والی داد اور توجہ کی محتاج ہوتی ہے اور یہ بھی واقعہ ہے کہ بعض مرتبہ اسٹیج کی عدم توجہی اچھے خاصے اشعار کو غارت کر دیتی ہے اور اس کے باعث پوری فضا سرد مہری کا شکار ہو جاتی ہے۔ زبیر رضوی نے اس بات کو پوری طرح محسوس کر لیا ہے اور اسی لئے انہوں نے اسٹیج کی بے دادی کی طرف شعراء کو متوجہ کیا ہے۔

اور اب زبیر کشمیر کے حسن و جمال کا ذکر کرتے ہوئے جوش ملیح آبادی کا یہ مشہور شعر پڑھ رہے ہیں

ہم ایسے بادہ کشوں کو ثبوتِ حق کے لئے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

اسی شعر کے ساتھ وہ ایک اور جدید رجحانات کے شاعر مظفر ایرج کو آواز دے رہے ہیں۔ مظفر مائیک پر آکر بڑے شگفتہ لہجے میں غزل کا مطلع سنا رہے ہیں۔

اشک آنکھوں سے کسک دل سے لگائے رکھنا
ان خزانوں کو زمانے سے بچائے رکھنا ۔

اس مطلع پر کافی داد ملی ہے اس کا سبب کچھ تو یہی ہے جو زبیر رضوی نے اسٹیج پر بیٹھے شعراء کو اشعار پر داد دینے کی طرف متوجہ کیا تھا اور کچھ واقعی اس مطلع کے حسن کا اثر بھی ہے۔ بہرحال مظفر ایرج اپنی غزل پر خاصی داد پا رہے ہیں۔ سنیئے

برف ہو جائے تعجب نہیں ظلمت کا غبار
آفتابوں کی طرح خود کو جلائے رکھنا
اس سے پہلے تو کبھی لوگ تہی دست نہ تھے
کل کی خاطر بھی کوئی درد چرائے رکھنا

نہ ملے کچھ بھی تو کیا ظرف ہوا ہے ایرج
آسمانوں کی طرف ہاتھ اٹھائے رکھنا

ایرج سے ان کا مطلع دوبارہ پڑھوایا گیا ہے ۔ اور اب زبیر رضوی اس خطے کا ذکر کر رہے ہیں جس نے ممتاز شیریں جیسی شاعرہ اور ادیبہ کو جنم دیا اور اس کے بعد اس مشاعرے میں شرکت کے لئے اسی خطے سے آئے شاعر حمید الماس کو آواز دے رہے ہیں ۔ حمید الماس اتنی لمبی مسافت طے کر کے آئے ہیں جس کے تصور ہی سے بعض اصحاب کو خوف سا لگتا ہے ۔ غالباً اسی خیال کی ترجمانی کرتے ہوئے انہوں نے اپنی غزل کا یہ مطلع پڑھا ہے اور خوب داد حاصل کی ہے ؎

جب کسی لمبے سفر سے لوٹ کر آتا ہے وہ
خود کو اپنے ہی مکاں میں اجنبی پاتا ہے وہ

مطلع کے بعد آپ نے جو اشعار سنائے ان پر بھی بڑی سنجیدہ داد ملی ہے ۔ سنیئے ؎

دن کے ہنگاموں سے اس کو کوئی دلچسپی نہیں
رات کے اک اک لمحے سے لپٹ جاتا ہے وہ
تند موجوں سے بچا کر مجھ کو لاتا ہے مگر
آگ جیسی ریت کے ذرّوں پہ تڑپاتا ہے وہ
وسعتِ کون و مکاں ہے اسکی آنکھوں میں اسیر!
ساعتِ رفتہ کے پیچھے کس لئے جاتا ہے وہ

اور اب اُردو کے ایک جیالے شاعر جس کی شاعری میں معصوما استعجاب ایک خصوصیت بن کر ابھرتا ہے ۔ مائیک کے سامنے آ رہا ہے اور وہ ہے ندا فاضلی ۔

ندا بڑی بے نیازی سے مائیک پر آئے ہیں ۔ بالوں میں انگلیاں ڈال کر کچھ مسکرائے ہیں اور پھر سامنے سے آنے والی چند مسکراہٹوں کا استقبال کر رہے ہیں ۔ اس پر ایک ہلکا سا قہقہہ لگا ہے ۔

باقر مہدی کو مخاطب کر کے پہلے ندا نے ایک قطعہ پڑھا ہے سنئے

دیوتا ہے کوئی ہم میں نہ فرشتہ کوئی — چھو کے مت دیکھنا ہر رنگ اُتر جاتا ہے
ملنے جلنے کا سلسلہ ہے ضروری ورنہ — آدمی چند ملاقاتوں میں مر جاتا ہے

قطعہ پر مناسب داد پا کر ندا نے غزل کے تین شعر سنائے ہیں اور اپنی اس غزل کے مخصوص لہجے پر خاصی داد پائی ہے

محبّت میں وفاداری سے بچیئے
جہاں تک ہو اداکاری سے بچیئے
شرافت آدمیت ، درد مندی
بڑے شہروں میں بیماری سے بچیئے

اس شعر پر بھی باقر مہدی کو مخاطب کیا ہے

بنا پیروں کے سر چلتے نہیں ہیں
بزرگوں کی سمجھداری سے بچیئے

ان اشعار کے بعد ندا نے جنگ کے موضوع پر ایک مختصر لیکن موثر نظم سنائی ہے ۔ جسے پسند کیا گیا ہے ۔

اور اب زبیر رضوی محمد علوی کے تعارف میں کہہ رہے ہیں "اب جو شاعر مائیک پر آ رہے ہیں ان کے کلام کو میں نے جب جب پڑھا مجھے اسی قسم کی حیرت اور استعجاب کا احساس ہوا جیسے تخلیقِ کائنات کے وقت آدم کو ہوا تھا" اسی کے ساتھ زبیر ۔ محمد علوی کا ایک شعر بھی پڑھ رہے ہیں علوی مائیک پر آ چکے ہیں اور غزل کا مطلع سنانے سے پہلے ایک انتہائی مختصر نظم "نیا سال" سنا رہے ہیں ۔

دن مہینے اور موسم
سب پرانا مال لے کر
پھر نیا سال آگیا

اور اب سنئے غزل کا مطلع ، جس پر محمد علوی کو کافی داد ملی ہے ۔

جاتے جاتے دیکھنا ، پتھر میں جاں رکھ جاؤں گا
کچھ نہیں تو ایک دو ، چنگاریاں رکھ جاؤں گا

ایک شعر اور سنانے کے بعد علوی نے جب یہ پڑھا تو داد کا ایک شور چاروں طرف اُمنڈ آیا

سب نمازیں باندھ لے جاؤں گا میں اپنے ساتھ
اور مسجد کے لئے گونگی اذاں رکھ جاؤں گا

اس کے بعد باقی اشعار پر بھی خاصی داد ملی ہے ۔ آپ سے ایک غزل اور سنانے کی فرمائش کی جا رہی ہے ۔ سنئے

اور بازار سے کیا لے جاؤں — پہلی بارش کا مزہ لے جاؤں

گھر میں ساماں تو ہو دلچسپی کا حادثہ کوئی اٹھا لے جاؤں
اک دیا دیر سے جلتا ہوگا ساتھ تھوڑی ہوا لے جاؤں
روز کہتا ہے ہوا کا جھونکا آ تجھے دور اُڑا لے جاؤں
جیب میں کچھ تو رہے گا علوی لاؤ تم سب کی دُعا لے جاؤں

محمد علوی کے بعد زبیر رضوی اُردو کے ایک سنجیدہ اور باوقار شاعر ڈاکٹر وحید اختر کو مناسب تعارف کے بعد تکلیف غزل سرائی دے رہے ہیں۔ وحید اختر نے فرض کا مقطع پڑھا ہے اور کافی داد حاصل کی ہے

کتنے دل سیراب رہے تشنہ لبی میں میری طرح
کس کو ملی سرافرازی آشفتہ سری میں میری طرح

سنئے وحید اختر کس قدر خوبصورت اشعار سنا رہے ہیں اور اہل نظر سے داد پا رہے ہیں

اپنے سب محبوب سرِ فہرستِ بزمِ نگاراں ہیں
کس کو یہ اعزاز ملا ہے خوش نظری میں میری طرح
آوازوں کے زنداں میں زنجیر بھی پر بن جائے گی
خود سے گزرنا تو سیکھو، بے بال و پری میں میری طرح
شوق ہے گر وحشت کی دریدہ خوں آلودہ قباؤں کا
پہلے نام کمانا ہوگا دیدہ وری میں میری طرح

لیجئے اب زبیر رضوی فرما رہے ہیں "آج کی بزم میں آپ اُردو شاعری کے مختلف اسالیب اور آہنگ کے نمونے ملاحظہ فرما رہے ہیں۔ اب ایک اور موثر اسلوب بیان نازش پرتاب گڑھی کی زبانی سنئے۔ نازش پرتاب گڑھی کا تالیوں سے استقبال کیا جا رہا ہے۔ آپ اپنی غزل کا مطلع سنا رہے ہیں۔

یہ سیاست کی ادا ہے سانحہ کوئی نہیں
سب کے منہ میں ہیں زبانیں بولتا کوئی نہیں

مطلع پر مناسب داد پا کر ارشاد ہوا ہے۔

سو گئے سب لوگ چادر مصلحت کی تان کر
اب مری بستی میں دروازہ کھلا کوئی نہیں
اک نہ اک اندھے کنویں پر ہر گلی کا اختتام
گھر کی جانب لوٹنے کا راستہ کوئی نہیں
واقعہ یہ ہے کہ صدہا راہ بر ہیں ہم سفر
سانحہ یہ ہے کہ منزل آزما کوئی نہیں

تہہ بہ تہہ جمتی چلی جاتی ہے سناٹوں کی گرد!
شہرِ دل میں دیر سے آیا گیا، کوئی نہیں
مجھ کو نازش قتل کر دے گا یہ قحطِ آگہی
میری محفل میں مجھے پہچانتا کوئی نہیں

نازش پرتاپ گڑھی اپنی جگہ واپس جا رہے ہیں اور اب باقر مہدی کا تعارف کراتے ہوئے کہا جا رہا ہے کہ شاعری میں ایک خاص لہجے کی ابتدا شکوے کی شکل میں کسی روایت سے انحراف کرتے ہوئے جن شعراء نے اس احتجاج کو آگے بڑھایا۔ باقر مہدی کا ان میں اہم مقام ہے۔"

باقر مائیک پر آ کر اپنی نظم سنانے سے قبل کہہ رہے ہیں "یہ نظم ایمرجنسی کے زمانہ میں کہی تھی اور اسے اردو کے مشہور ترقی پسند نقاد محمد حسن کے نام معنون کیا تھا۔ ایک کالی نظم کے عنوان سے باقر رواں دواں اپنی احتجاجی نظم سنا رہے ہیں جس میں لفظ و بیان سے مکمل انحراف موجود ہے۔ غالباً احتجاج اب باقر کی فطرت بن گیا ہے۔ وہ احتجاج جو اظہار کے اجراء پر انہیں مسرت بخشتا ہے لیکن بلراج ورما کے "تناظر" پر وہی ان کے لئے ناقابل برداشت بن جاتا ہے۔ خیر نظم کے بعد باقر نے ایک غزل بھی سنائی ہے۔ مطلع سنئے اور احتجاجی لہجہ کو غور سے رکھئے

کانٹے کی طرح دل سے نکالا نہیں جاتا
ہاں جان چلی جائے یہ چھالا نہیں جاتا

ایک شعر باقر مہدی نے اتنی تیزی سے پڑھا ہے کہ میں ان کا منہ ہی دیکھتا رہ گیا اور اب دو ایسے شعر سنئے جن پر خاص داد ملی ہے۔

جو کچھ بھی ملا ہے اسے سینے میں چھپا لے
سکے کی طرح غم کو اچھالا نہیں جاتا
جا کے کوئی مفتیٔ اعظم سے بتا دے
اقبال کی مسجد سے شوالا نہیں جاتا

ان دونوں اشعار نے خاص تاثر چھوڑے۔ اس کے بعد باقر مہدی نے ایک ایسا شعر پڑھا جس پر قہقہہ نما داد ملی سنئے

افلاس وہ سایہ ہے کہ چھپ کر نہیں مرتا
سب یار بچھڑ جائیں یہ سالا نہیں جاتا

سنئے زبیر رضوی فرما رہے ہیں۔ آپ نے ابھی باقر مہدی کو سنا جنھوں نے ایک بار پھر اس نشست میں زندگی پیدا کر دی۔ اس کے بعد زبیر رضوی نے بتایا کہ فراق گورکھپوری نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اگر ان کی مکمل شیلف میں سے گم ہونے والی کتب میں سب سے زیادہ افسوس دیوان حسرت موہانی کے گم ہو جانے پر ہوگا۔ اسی طرح اگر کوئی مجھ سے میرے دل کی بات پوچھے تو میں یہی کہوں گا کہ مجھے ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کے دیوان کے گم ہو جانے پر اسی قسم کا قلق ہوگا۔

اور لیجیے خلیل صاحب مائک پر پہنچ چکے ہیں اور انتہائی خوبصورت مطلع سنایا ہے جس پر بھرپور داد ملی ہے

راستہ پُر پیچ ہے اور ہم سفر کوئی نہیں
سب مرے ہم شکل ہیں مجھ سا مگر کوئی نہیں

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کو ہر شعر پر بے پناہ داد مل رہی ہے ملاحظہ کیجیے

ایک پرچھائیں نہ جانے کب سے اپنے ساتھ ہے
جسم اس کے سیکڑوں ہیں اور سر کوئی نہیں
اپنے گھر سے متصل کل ایک گھر آباد تھا
دور تک اب دور تک دیوار و در کوئی نہیں
ہاں مری ویران آنکھوں میں سدا آباد رہ
اے مرے خواب جواں تیرا مگر کوئی نہیں

خلیل صاحب بے پناہ کامیاب غزل سنا کر اپنی جگہ تشریف لے جا رہے ہیں اور اب زبیر رضوی اعجاز صدیقی صاحب (مدیر شاعر) کو یہ کہہ کر دعوت غزل سرائی دے رہے ہیں کہ آپ نے اردو شاعری کی روایت کو ایک سمت دی ہے۔ سنئے اعجاز صاحب کو مطلع ہی سے داد ملنی شروع ہو گئی

فکر اگر تہذیب عصر نو کی زائیدہ نہیں
فن کے سانچے کچھ بھی ہوں لیکن پسندیدہ نہیں

اعجاز صاحب اپنا اگلا شعر سنا رہے ہیں جس میں ان کی زندگی کی عکاسی پورے طور پر ملتی ہے۔ سنئے ؎

تو نے جو کچھ بھی دیا اس کو سر آنکھوں پر لیا
اے غم امروز ہم تجھ سے تو رنجیدہ نہیں

اور سنئے

راہ گاہوں تک مسلسل آ رہی ہیں آہٹیں
جسم خوابیدہ ہیں لیکن ذہن خوابیدہ نہیں
ہے پیام انقلاب تازہ ہر سنجیدگی
اس سے کب انکار ہے حالات پیچیدہ نہیں
دیکھنا ہے کون اب کس کا اڑاتا ہے مذاق
وقت سنجیدہ ہے لیکن لوگ سنجیدہ نہیں

اور لیجیے اب آخر میں ڈاکٹر معین احسن جذبی مائک پر تشریف لا رہے ہیں آپ کے بارے میں زبیر رضوی کہہ رہے ہیں "لیجیے اس محفل کے آخر میں ایک ایسے شاعر تشریف لا رہے ہیں جنھوں نے جذبہ و احساس کی سچی داستانیں لکھیں اور وہ ہیں معین احسن جذبی"۔ جذبی صاحب نے مطلع ارشاد فرمایا ہے۔

کیا جانے ذوق و شوق کہ بازار کیا ہوئے — یوسف پکارتا ہے خریدار کیا ہوئے

مطلع پر خاصی داد ملی ہے جذبی صاحب کی اس غزل کے اشعار میں "عہد گزشتہ" کی بازگشت صاف جھلک رہی ہے۔ سنئے ؎

گستاخی نگاہ تمنا کدھر گئی — تعزیر دار کے وہ سزاوار کیا ہوئے
صبر آزما وہ شوق نظارہ کہاں گیا — آسودگان سایۂ دیوار کیا ہوئے
تھا جن کے پاس زخم کا مرہم کہاں گئے — جو دل کو جوڑتے تھے وہ معمار کیا ہوئے
جذبی کہاں گئیں وہ ترنگ دل فروزیاں — ڈوبے ہوئے جو سوز میں اشعار کیا ہوئے

جذبی صاحب کو اس غزل پر ان کے معیار و مزاج کے مطابق کافی داد ملی ہے ابھی آپ مائک سے تشریف لے جانا ہی چاہتے تھے کہ سامعین کے اصرار پر آپ کو ایک اور غزل کے چند اشعار سنانے پڑے ہیں اور خوب خوب داد حاصل کی ہے۔ سنئے ؎

چمن میں بیٹھے نہ جو چمن کی داستاں سنتے — کوئی قرار کوئی نغمہ کوئی فغاں سنتے
قدم نہ چھوڑتے راہوں کو تا بہ منزل شوق — ہماری بات جو یہ اہل کارواں سنتے
ہمارے درد کا طوفاں کہاں کہاں اٹھتا — یہ شور آپ جہاں چاہتے وہاں سنتے
اک عمر اپنی بھی گزری ہے اے چمن والو — گلوں کے کنج میں اندیشۂ خزاں سنتے

کسی کا رنج، کسی کا الم، کسی کا ملال
اب اور کیا تھا جو ہم زیر آسماں سنتے

اس وقت ۱۰ بجا چاہتے ہیں۔ مشاعرے کے اختتام کا اعلان شکریے کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ مجھے بھی اجازت دیجیے۔

خدا حافظ

چھبیس جنوری ۱۹۷۸ء

دِلور کوہلی اکبر آبادی

رُخ پہ لئے نکھار ہے چھبیس جنوری
اب کتنی پُر بہار ہے چھبیس جنوری
قُربان نفس نفس ہے تصدق نظر نظر
ہر دل کو تجھ سے پیار ہے چھبیس جنوری
شکوا کسی کو ہے نہ کسی کو کوئی گلہ
تسکین روزگار ہے چھبیس جنوری
گلشن میں ہر کوئی ہے نئی تازگی لئے
وہ گل ہے یا وہ خار ہے چھبیس جنوری
برنا و پیر سب ہیں نیا بانکپن لئے
ہر رُخ سے آشکار ہے چھبیس جنوری
ہر گل ہے آج نذرِ عقیدت لئے ہوئے
تجھ پر چمن نثار ہے چھبیس جنوری
بوئے گلاب جس میں ہے اب تک بسی ہوئی
اک ایسی یادگار ہے چھبیس جنوری
ہم پوجتے ہیں جن کو شب و روز پیار سے
اُن میں ترا شمار ہے چھبیس جنوری
جن کو ملا تھا رنگ شہیدوں کے خون سے
ایسے گُلوں کا ہار ہے چھبیس جنوری
قلب و نظر پہ کیف مسلسل نہ چھا سکے کیوں
ساقیِ پُر بہار ہے چھبیس جنوری
اے نور سب پہ جشنِ مسلسل کا فیض ہے
اب کے جو تاجدار ہے چھبیس جنوری

غزل

طاہر تلہری

کچھ خیالِ خاطرِ دلبر بھی ہونا چاہیئے
آئینہ خانے میں اک پتھر بھی ہونا چاہیئے
اِبتلا کی دھوپ میں تپ کر نکھرتی ہے حیات
زیست مشکل ہے تو مشکل تر بھی ہونا چاہیئے
یوں بھی ہم پہچان لیں گے آپ کو لیکن حضور
احتیاطاً ہاتھ میں خنجر بھی ہونا چاہیئے
سروری ہے حرفِ باطل سرفروشی کے بغیر
صاحبِ دستار کو بے سر بھی ہونا چاہیئے
صرف آوازِ آذاں کافی نہیں وقتِ سحر
سونے والوں کے لئے ٹھوکر بھی ہونا چاہیئے
تابکے سڑکوں پہ کاٹے جائیں گے غربت کے دن
شہر کے صحرا میں کوئی گھر بھی ہونا چاہیئے
دوستو اس انتباہ و سرزنش کے ساتھ ساتھ
طنز میں ڈوبا ہوا نشتر بھی ہونا چاہیئے
تاکہ راہِ زیست میں آنکھیں کھلی رہے بغیر
ہر قدم پر اک نہ اک ٹھوکر بھی ہونا چاہیئے
اس لئے ترکِ وطن کرتا [illegible] رہیں
اس کی شہرت شہر کے باہر بھی ہونا چاہیئے

پیشہ ور اُستاد

کرگس سہسوانی

کل ایک مارکیٹ سے میرا ہوا گزر ۔۔۔ تجار جس میں آئے نظر مجھ کو بیشتر
بکھری زیورات کی قیمتیں دکانیں سجی ہوئیں ۔۔۔ بچے "شاپس" پارچے کی عریاں تھیں لگی ہوئیں
میوہ فروش سیب دکھاتے تھے چھانٹ کے ۔۔۔ آواز گاہکوں کو لگاتے تھے ڈانٹ کے
حلوائی بولتے تھے بڑی آن بان سے ۔۔۔ ہوٹل کھلے ہوئے تھے بڑی آب تاب سے
ایسے میں اک دکان پہ میری پڑی نظر ۔۔۔ جس پر براجمان تھے اک حضرت جگر
چھوٹا سا ایک بورڈ بھی لٹکا تھا گیٹ پر ۔۔۔ "اصلاح" اب کرائیے آسان ریٹ پر

تھا شاعری کا مجھ کو بھی جھٹکا لگا ہوا
تازہ غزل میں تھا ذرا کھٹکا لگا ہوا

سوچا کہ کیوں نہ مشورہ کر لوں جناب سے ۔۔۔ اشعار کیوں غزل میں رہیں پھر خراب سے
اصلاح ٹھیک ہو تو غزل کامیاب ہے ۔۔۔ سامع بھی کہہ اٹھیں گے کہ بے لاجواب ہے
گھس کر کہا دکان میں تسلیم محترم ۔۔۔ کیا فیس نظم کی ہے غزل کی ہے کیا رقم؟
دو چار غزل و نظم کے پیسے بتائیے ۔۔۔ سستا جو ریٹ ہو وہی مجھ پر لگائیے
فدوی جب آ گیا ہے تو خالی نہ جائے گا ۔۔۔ تازہ غزل جناب کو پوری دکھائے گا

کہنے لگے کہ فکر نہ کیجے مرے عزیز
رکھتا ہوں ایک "کونسل" اصلاح کی تمیز

جس نے بھی مجھ سے لی ہے غزل کامیاب ہے ۔۔۔ سچ مچ وہ بزم شعر میں اک ماہتاب ہے
"لوکل" غزل کا ریٹ تو بس پانچ سات ہے ۔۔۔ "آل انڈیا" غزل کی مگر اور بات ہے
اچھی غزل کا ریٹ ہے بس بیس پچیس ۔۔۔ بھرتا ہوں جس میں خوب محبت کے قافیے
کیسے پڑھو گے بزم میں پڑھ کر سناؤ تو ۔۔۔ "دھن" جو رواں تمہیں ہو ذرا گنگناؤ تو

میں نے گلے کو صاف کیا اور چل پڑا
حضرت کو میری دھن نے جو مبہوت کر دیا

بولے درست شعر تمہارے کروں گا میں ۔۔۔ اب تک نہ بھر سکا ہوں جو جا کے بھروں گا میں
مجھ کو یقیں حشر اٹھاؤ گے خوب تم ۔۔۔ نغمے سے اپنے فتنے جگاؤ گے خوب تم
جب میرے شعر جھوم کے محفل میں گاؤ گے ۔۔۔ سب سے زیادہ "ایام" "داد" پاؤ گے

میں نے کہا حضور مجھے فن سکھائیے
کیا "فاعلن" کا "ع" کا ہے چکر بتائیے؟

کہنے لگے کہ کان ذرا پاس لاؤ تم ۔۔۔ رکھو گے "راز" پہلے قسم یہ بھی کھاؤ تم
بولے کہ کیا "عروض" ہے یہ میں جانتا نہیں ۔۔۔ فن کی کسی بھی بات کو میں مانتا نہیں
میرے لئے تو فن کی یہ باتیں فضول ہیں ۔۔۔ ابیات، وتد، دو لخت یہ سب شاعری کے اصول ہیں

کرگس نیا کلام تمہیں کہہ کے دوں گا میں
پیسوں کی بات یہ ہے کہ پہلے ہی لوں گا میں

یومِ آزادی

خنجر خیر آبادی

آج کا دن ہے کیسا پیارا۔ ملک ہوا آزاد ہمارا
کیوں نہ خوشی ہم ملکے منائیں
پریم پیالہ کیوں نہ پلائیں
دوش کو ہم کیوں نہ مٹائیں
آؤ ملیں اور مل کر گائیں

آج کا دن ہے کیسا پیارا۔ ملک ہوا آزاد ہمارا
نام ہے پربھو جس شکتی کا
وہی خدا ہے ہر ہستی کا
رستہ نیا رہبر بھگتی کا
آؤ ملیں اور مل کر گائیں

آج کا دن ہے کیسا پیارا۔ ملک ہوا آزاد ہمارا
گاندھی جی کی پیاری ہستی
جس کو دنیا آج ترستی
دیش پہ کیسی ٹوٹ گئی شکستی
آؤ ملیں اور مل کر گائیں

آج کا دن ہے کیسا پیارا۔ ملک ہوا آزاد ہمارا
سُورگ جسے کہتی ہے دنیا
ہند کا وہ ہے کونا کونا
فرض ہے اس میں مل کر رہنا
آؤ ملیں اور مل کر گائیں

آج کا دن ہے کیسا پیارا۔ دیش ہوا آزاد ہمارا
دیش کی جنتا دھرم ہے خنجر
کیسی یہ سجّن ہے خنجر
سب کا من پرسن ہے خنجر
آؤ ملیں اور مل کر گائیں

آج کا دن ہے کیسا پیارا۔ دیش ہوا آزاد ہمارا

غزل

(حکیم شبیر علی خاں شبیر کانپوری)

ستم آپ پیہم جو ڈھاتے رہیں گے
تو ہم بھی یوں ہی مسکراتے رہیں گے

وہ شمعِ تبسم جلاتے رہیں گے
مرے زخمِ دل جگمگاتے رہیں گے

مری تشنگی اور بڑھتی رہے گی
وہ آنکھوں سے مجھکو پلاتے رہیں گے

مرے جان و دل عشق میں لٹ چکے ہیں
وہ کب تک مجھے آزماتے رہیں گے

خزاں ہی سہی پھر بھی ہمت نہ ہارو
چمن میں سبھی دور آتے رہیں گے

ہوا انجام کچھ بھی مگر اہل دل تو
حسینوں کی گلیوں میں جاتے رہیں گے

وہ بیزار ہوں یا کہ شبیر شاداں
مگر ہم تو غزلیں سناتے رہیں گے

۱

فارسی اور ہندوستان
ایران، افغانستان اور اُردو

وشوا ناتھ طاؤس

مُسلمان جب ہندوستان میں آئے تو فارسی زبان اپنے ساتھ لائے۔ سینکڑوں برس تک فارسی اس مُلک کی سرکاری زبان رہی ہے۔ بلا امتیازِ مذہب وملت عوام نے یہ زبان سیکھی۔ مُسلم ریاستوں کے حکمرانوں کے علاوہ کئی ہندو اور سکھ والیان ریاست نے اسے سرکاری زبان بنایا۔ ان ریاستوں میں تمام شاہی فرمان اور سرکاری احکامات اسی زبان میں جاری کیے جاتے تھے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دورِ حکومت میں پنجاب کی سرکاری زبان یہی تھی۔

فرنگیوں کے عہد میں اُردو کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہوا لیکن فارسی کا چلن باقی رہا۔ تمام سرکاری مدرسوں میں فارسی زبان پڑھائی جاتی تھی اور مُلک کی ہر یونیورسٹی میں اس کی اعلیٰ تعلیم کا معقول انتظام تھا۔ سرکاری ملازمت کے حصول کے لئے گو فارسی سے واقفیت ضروری نہ سہی تھی پھر بھی ثانوی زبان کی حیثیت سے اور تکمیلِ شوق کی خاطر ہر مذہب کے بچوں نے یہ زبان پڑھی۔ مُلک کی تقسیم کے بعد سرکاری مدرسوں میں اردو کے ساتھ فارسی کی تعلیم بھی ختم کردی گئی اور نئی نسل اس شیریں زبان کے مطالعے سے محروم رہ گئی لیکن آج بھی ملک کے ہر شہر اور قصبے میں فارسی سے آشنا بڑی عمر کے لوگ مل جاتے ہیں جو مزے لے لے کر فارسی کے اشعار سناتے اور ان کا مطلب سمجھاتے ہیں۔

فردوسی، حافظ، شیخ سعدی، جامی اور عمر خیام ہندوستان میں جانے پہچانے شاعر ہیں اور ہر تعلیم یافتہ شخص ان کی شاعرانہ عظمت سے واقف ہے۔ فردوسی اور محمود غزنوی کا قصہ کون نہیں جانتا اور کون سا ہندوستانی باشندہ رستم سہراب کی داستان سے آشنا نہیں ہے۔ مثنوی مولانا روم یہاں بھی اسی عقیدت سے پڑھی جاتی ہے جس عقیدت سے ایران کے لوگ اس کا مطالعہ کرتے ہیں۔ فال نکالنے کے لئے نہ صرف مُسلم گھرانوں میں بلکہ اکثر ہندو خاندانوں میں یہ مثنوی استعمال میں لائی جاتی ہے۔ گورو گوبند سنگھ نے اپنی معرکۃ الآرا منظوم تصنیف "ظفر نامہ" فارسی زبان میں لکھی تھی ہندوستان میں مسلمانوں کے علاوہ فارسی کے بے شمار غیر مسلم شاعر بھی پیدا ہوئے۔ عمر خیام کی جام و صراحی کی تصویریں اور ان کے نیچے لکھی ہوئی فارسی رُباعیات یہاں بہت سے گھروں میں آویزاں ملیں گی۔

تقسیم وطن سے قبل عمر خیام کی زندگی پر ایک فلم ریلیز ہوئی تھی جس میں سہگل اور ثریا نے کام کیا تھا اور اس کے نغمے بڑے مقبول ہوئے تھے۔ اب پھر اس عظیم شاعر کی زندگی پر فلم بننے کے چرچے ہیں جس میں غالباً دلیپ کمار اہم رول ادا کریں گے۔ تقسیم وطن سے پہلے رستم و سہراب کی داستان پر ایک فلم ... لاہور میں بنی تھی اور ایک بمبئی میں۔ چند برس قبل بمبئی میں اسی داستان پر ایک فلم پرتھوی راج کپور، پریم ناتھ اور ممتاز کو لے کر بنائی گئی تھی جو خوب چلی تھی۔

سنہ ۱۹۴۹ء میں مشہور فلم ڈائرکٹر رُوپ کے شوری نے لاہور کے اپنے اسٹوڈیو میں افغان سرکار کے لئے ایک فارسی فلم تیار کر کے دی تھی جس میں لاہور کے اداکاروں نے ہی کام کیا تھا۔

فارسی کے کئی ناشر یہاں موجود ہیں جن کا بیوپار کامیاب ہے۔ معقول تعداد میں ہر سال اس زبان کی کتابیں یہاں

چھپتی اور بکتی ہیں۔ مرکزی حکومت کی جانب سے ہر سال دیگر زبانوں کے دانشوروں کے ساتھ ساتھ فارسی کے عالموں کو بھی اعزازات اور انعامات سے نوازا جاتا ہے۔ دلی کے ایرانی سفارت خانے اور بمبئی کے ایرانی قونصل کے دفتر میں فارسی کی کلاسیں لگتی ہیں جن میں ہر فرقہ کے نوجوان یہ زبان سیکھ کر ڈپلومہ حاصل کرتے ہیں۔ مشہور فلمی ہیرو دیو آنند کی بیوی کلپنا کارتک نے بمبئی کے ایرانی قونصل خانے سے ہی فارسی کا ڈپلومہ حاصل کیا ہے۔ کونسا ایسا ہندوستانی ہے جو ہنوز دلی دور است، کس نمی پرسد کہ بھیا کیستی .... زبانِ یار من ترکی و من ترکی نمی دانم، چشم بد دور، ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم، دل را دلی می شناسد، خس کم جہاں پاک، من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو، جیسے فارسی کے چند محاورے نہ جانتا ہو۔ کسی بھی خوبصورت مقام کو دیکھ کر یہ شعر ہر شخص کی زبان پر آجاتا ہے ؎

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمین است و ہمین است و ہمین است

ہمارے ہاں بہت سے لوگوں نے اپنی رہائش گاہوں کے نام فردوس خیال، خیابان، گلستاں، کہکشاں، دل آرام، قصر راحت، الممتاز، آشیانہ، راحت کدہ وغیرہ خوبصورت فارسی الفاظ میں رکھے ہوئے ہیں۔ شیراز کو کون نہیں سمجھتا۔ ہندوستان کی قریب قریب سب یونیورسٹیوں میں فارسی کے شعبے قائم ہیں جن کے سربراہ فارسی کے مشہور ہندوستانی عالم ہیں۔

یہ تمام حقائق ثابت کرتے ہیں کہ فارسی زبان کی پرورش اہل ہند صدیوں سے کر رہے ہیں اور یہ ان کی رگ و پے میں سرایت کر چکی ہے۔ آج بھی اس کا وجود ملک کے ہر حصے میں باقی ہے۔ ایران اور افغانستان کی سرکاری زبان فارسی ہے۔ ہندوستانیوں کی ایک خاصی تعداد ان دونوں ملکوں میں آباد ہے اور انہوں نے وہاں کی زبان کو اپنا لیا ہے۔ افغانستان کے سکھ جب ہر سال پنجہ صاحب اور ننکانہ صاحب کی زیارت کے لئے پاکستان پہنچتے ہیں تو وہ فارسی ہی بولتے ہیں ہندوستانی سکھوں کے لئے اُن کی بات سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ ایران اور افغانستان میں اردو کی کیا پوزیشن ہے؟ ہوسکتا ہے کہ وہاں جن شہروں میں ہندوستانی اور پاکستانی باشندے زیادہ تعداد میں رہتے ہوں وہاں انہوں نے اپنے طور پر بچوں کو اردو پڑھانے کا کوئی انتظام کر رکھا ہو یا پھر اردو کی پڑھائی کے لئے کسی یونیورسٹی میں کوئی بندوبست کر دیا گیا ہو، اس سے زیادہ حیثیت اسے وہاں حاصل نہیں ہے اور نہ ہی وہاں سے اردو کا کوئی اخبار یا رسالہ چھپتا ہے جبکہ ہمارے ہاں سے فارسی کے پرچے شائع ہوتے ہیں ہندوستان کی کئی مغنیوں نے فارسی کی غزلیں گائی ہیں اور ان کے گراموفون ریکارڈ تیار کئے گئے ہیں سہگل کی گائی چند فارسی غزلیں اکثر آل انڈیا ریڈیو سے بجتی ہیں۔ لیکن یہ بھی سننے میں نہیں آیا ہے کہ ایسی ہی کوئی بات اردو کے حق میں ایران یا افغانستان میں ہوئی ہو۔

اردو کے حامیوں نے تقسیم وطن سے قبل کے سازگار حالات میں بھی اس زبان کو اپنے ملک کی حدود سے باہر پھیلانے کی کوشش نہیں کی۔ اس معاملے پر کبھی غور ہی نہیں کیا گیا کہ ہم نے فارسی کی اتنی سرپرستی کی ہے تو ہم بھی اہل فارس اور افغانستان سے یہ مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ وہ اپنی سرزمین پر ہماری زبان کو بھی پنپنے کا موقع دیں۔ کوتاہی ہماری ہے کہ ہم نے کبھی تبلیغ زبان کے جذبہ کے تحت ان ممالک میں اردو کا پرچم بلند کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ کبھی ہم نے ان حکومتوں کی اعانت یا وہاں کے عوام کا اعتماد اس معاملے میں حاصل کرنے کی سعی نہیں کی ہے۔ ہم نے غالب اور اقبال کا فارسی کلام تو انہیں مہیا کر دیا ہے لیکن ان کا اردو کلام پڑھنے کی ترغیب انہیں کبھی نہیں دی ہے۔

یہ درست ہے کہ اس وقت اردو اپنے ہی گھر میں مظلوم ہے اور ہم اس کی بقا و حیات کے لئے ایک صبر آزما جدوجہد کر رہے ہیں لیکن بہادر قومیں بیک وقت کئی کئی محاذ کھولے رکھتی ہیں ہمیں اپنے اس فرض کو نہیں بھولنا چاہیے کہ اردو کی ترویج ہمیں دوسرے ممالک میں بھی کرنی ہے اور دنیا والوں کو اسکی خوبیوں سے آشنا کرانا ہے۔ اردو کی عالمی حیثیت بڑی نمایاں ہے انگریزی اور چینی زبانوں کے بعد اردو بولنے والوں کی تعداد دنیا میں سب سے زیادہ ہے اور اس طرح اسے تیسری بڑی عالمی زبان کا درجہ حاصل ہے۔

سولہ کلا سمپورن بھگوان کرشن جی مہاراج

پر میرا ایمان ہے اور میں اُن کے نام پر اپنا سب کچھ نچھاور کر سکتا ہوں

اس لئے

میں بھگوان کرشن جی مہاراج ہی سے پرارتھنا کرتا ہوں کہ

وہ

بھارت ورش کے ہر نر ناری کو یہ بدھی دیں

کہ

ہم سب بھائیوں کی طرح مل جل کر رہیں اور بھارت ورش کو اپنا سب کچھ سمجھیں۔

کرشن بھگوان

ہم سب کی سہایتا کریں۔ ہر بھارتی صحت مند رہے اور سُکھی رہے اور ہم کسی کا بُرا نہ چاہیں

۲۶ جنوری کے شُبھ قومی تہوار پر میری یہی پرارتھنا ہے

ہر ایک بھارتی کا سیوک

رام پرکاش کنٹھوریہ

راما کرشنا پورم
نئی دہلی

سٹہ، عوام اور حکومت

بیدل سرحدی
بی۔ اے، ادیب کامل

ہندوستان میں جہاں دوسری کئی بری عادتیں لوگوں کی زندگی کا حصہ بن چکی ہیں وہاں "سٹہ" جسے مشدہ ہندوستانی زبان میں "دڑا" کہہ کر پکارا جاتا ہے کی وبا بھی ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیل چکی ہے۔ یوں تو ملک میں کچھ ہی آدمی ہوں گے جو اس نامراد شوق سے نا آشنا ہوں گے۔ تاہم راقم الحروف کا ذاتی معلومات کو کاغذی پیراہن دینا کچھ بے جا نہ ہوگا۔

ملک میں چند سرمایہ داروں کا ایک گروہ ہے جو اس کو فروغ دے رہا ہے۔ آج کل یہ گروہ ہندوستان کی راجدھانی دہلی میں آباد ہے۔ اس گروہ کا کام "ایک" سے لے کر "سو" تک کے اعداد شمار کا کاغذی سو پرچیوں پر لکھنا اور کسی سنسان ویران یا غیر آباد جگہ جا کر ان سو پرچیوں کو کسی مٹی کے گھڑے میں ڈال کر اس میں سے ایک پرچی نکالنا ہے۔ پرچی نکالنے میں ایمانداری کا کس درجہ خیال رکھا جاتا ہے یہ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا۔ بہرحال پرچی نکالی جاتی ہے اور اس پرچی پر تحریر شدہ عدد کو بذریعہ ٹیلیفون یا کبھی کبھار بذریعہ تار ملک کے ہر گوشہ میں نشر کیا جاتا ہے۔ ان سرمایہ داروں کے ایجنٹ ہندوستان کے کم و بیش ہر شہر میں ہوتے ہیں۔ یہ ایجنٹ حضرات ہر شہر میں بظاہر مختلف قسم کے باعزت دوکانداروں کی حیثیت سے رہتے ہیں ان کی دوکانوں پر ظاہرہ طور پر سنہری تیر مارکہ بھی، بنوک باند جاتے ہیں اور شہر کے مشہور مراقوں کے بورڈ آویزاں رہتے ہیں، مگر درون خانہ "سٹے" کا بزنس کرتے ہیں۔ بورڈ تو ضلع کے حکام کو دھوکا دینے کی غرض سے لگائے جاتے ہیں۔ ان ایجنٹ حضرات کو مروجہ مخصوص زبان میں "کھائیوال" کہا جاتا ہے۔

کھائیوالوں کا کام دہلی سے خبر نشر کرنے والے سرمایہ داروں سے خبر حاصل کرنا ہے۔ علاوہ اس کے ان کا کام اس شوق سے دلچسپی رکھنے والوں سے رقم وصول کرنے کا ہوتا ہے یہ لوگ رقم بھی صبح سے لے کر شام یعنی خبر نشر ہونے سے تقریباً دو گھنٹے قبل تک ہی قبول کرتے ہیں اس کے بعد نہیں لیتے جن لوگوں کے لگائے ہوئے عدد نشر ہونے والی خبر سے مختلف ہوتے ہیں۔ ان کی لگائی ہوئی رقم کھائیوالوں کی اپنی ملکیت بن جاتی ہے۔ اگر کسی نے اتفاق سے اس عدد پر رقم لگائی ہوتی ہے جو نشر ہوتا ہے تو یہ لوگ اس کو خبر نشر ہونے کے دوسرے روز بحساب سوا روپیہ لگانے کے سو روپیہ ادا کرتے ہیں یہ تھی ایک مختصری تفصیل اس نامراد کھیل کی ....

برسبیل تذکرہ یہ عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کھائیوال لوگوں سے مختلف اعداد پر وصول کی ہوئی رقم اور اعداد شمار سرمایہ داروں کو خبر نشر ہونے سے قبل بذریعہ ٹیلیفون مطلع کر دیتے ہیں۔ تاکہ سرمایہ دار حضرات پرچی نکالنے میں انصاف کے تقاضہ کو بالائے طاق رکھ کر ایسے عدد کو نشر کریں جس سے کھائیوالوں کو مجموعی طور پر حتی الامکان مالی فائدہ ہو۔ ایسے کرنے کے عوض میں کھائیوال سرمایہ داروں کو طے شدہ ماہانہ رقم بطور رشوت ادا کرتے ہیں۔ اس کاروبار کا انحصار چونکہ ٹیلیفون سروس کی بہتر جانبدارانہ کارکردگی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے یہ ٹیلیفون دفاتر کے ملازموں کو بھی خوش رکھنے کی کوشش کرتے ہیں، بالخصوص اگر کوئی ٹیلیفون آپریٹر ان کی دوکانوں پر پہنچ جاتا ہے تو یہ اس کی خوب خاطر تواضع کرتے ہیں، اور چونکہ یہ پیشہ ایک غیر قانونی پیشہ ہے [illegible] پولیس کو بھی [illegible] بطور نذرانہ پیش کرتے ہیں بلکہ مقامی پولیس کے ساتھ یہ لوگ اپنے [illegible] کا [illegible] کرتے ہیں۔ بہرکیف اب آپ اس نامراد شوق سے باشندگان

ملک پر جو مضر اثرات پڑتے ہیں وہ ملاحظہ فرمائیں۔

اس پیشہ میں کھائیوالوں کی جھونپڑیاں کوٹھیوں میں تبدیل ہوتی دیکھی گئی ہیں مگر اُن لوگوں کو جو اپنے اندھے اندازے کے مطابق اعداد شمار پر رقم کھائیوالوں کو دیتے ہیں کو اکثر فاقوں مرتے اور خودکشی کرتے دیکھا گیا ہے۔ کچھ ایک اگر مکمل پاگل نہیں تو نیم پاگل ضرور ہو گئے ہیں۔ یہ ایک سیدھی اور صاف بات ہے کہ لگانے والے کے پاس کامیاب ہونے کے لئے صرف ایک ہی عدد ہوتا ہے جب کہ کھائیوالوں کے پاس باقی ماندہ ننانوے عدد ہوتے ہیں۔ تو لگانے والے کیسے کامیاب ہو سکتے ہیں؟ لگانے والوں کے لئے اس پیشہ سے دلچسپی رکھنا بغیر محنت کئے دولت حاصل کرنے کی ایک موہوم تمنا کے مترادف ہے، جو کبھی شرمندۂ تکمیل نہیں ہوتی۔ دیکھنے میں آتا ہے کہ اس سے رغبت رکھنے والوں میں صرف گاؤں کے گنوار یا اَن پڑھ جاہل ہی نہیں بلکہ تعلیم یافتہ لوگ بھی شامل ہیں یہاں تک کہ عوام و خواص گھرانوں کی خواتین اور طالب علم بھی اس نامراد مرض کے شکار ہیں۔ اَن پڑھ اور گنوار لوگوں کی حرکتیں دیکھ کر تو اتنا تعجب نہیں ہوتا جتنا اس پیشے سے متعلق تعلیم یافتہ لوگوں کی گفتگو سننے اور اُن کی حرکتیں دیکھنے سے حیرت ہوتی ہے۔ کئی بار بے اختیار ہنسی آجاتی ہے اور بعض اوقات ان کی حالت زار پر رونا آتا ہے۔ مثال کے طور پر کچھ طالب علموں نے بازار میں کوئی کار کھڑی دیکھی جس کا نمبر فرض کر لیجئے ۷۵ ۲۵ ۹۶ ۱۷ ہے تو ایک طالب علم عدد ۲۷ پر کچھ رقم دے آتا ہے۔ تو دوسرا عدد ۲۵ پر کچھ رقم کھائیوالے کو دے دیتا ہے۔ اور تیسرا ۲۰، ۵۰، ۲۰، ۱۷ پر حسب توفیق رقم لگاتا ہے اور خبر نشر ہونے کا بڑی بے صبری سے انتظار کرتے ہیں اور دل ہی دل میں ہر طالب علم یہی سوچتا ہے کہ اُسی کا منتخب کردہ نمبر نشر ہوگا۔ اور پچیس پیسہ کی لگائی ہوئی رقم اسے مبلغ بیس روپیہ ملے گا۔ مان لیجئے خبر میں نشر ہوتا ہے سولہ تو وہ طالب علم جس نے عدد سترہ پر رقم لگائی ہوتی ہے فوراً کہہ اٹھتا ہے "سالا ایک دانے کی چوٹ دے گیا" اور اگلے روز پھر یہ غلطی کرکے اس میں احتیاطاً ایک حرف کی تفریق کر دیتا ہے کہ ....

کہیں سالا پھر ایک دانے کی چوٹ نہ دے جائے۔ اور اسی طرح کوئی رات کو خواب میں سانپ دیکھ کر عدد سات پر رقم لگاتا ہے تو کوئی بس کے ٹکٹ پر چھپے نمبر پر رقم لگاتا ہے تو کوئی ریلوے ٹکٹ کے نمبر سے حساب لڑاتا ہے۔ اور کوئی سادھو مہاتماؤں، پیروں، فقیروں سے نمبر حاصل کرنے کی جستجو میں رہتا ہے۔ ایسا بھی عام دیکھنے میں آیا ہے کہ نقلی پیر فقیر سٹّہ پوچھنے والوں پر گالیوں کی بوچھاڑ کر رہے ہیں ڈنڈے سے پیٹ رہے ہیں اور مُرید ہر گالی کا نمبر بنا رہے ہیں۔ اس پیشہ سے نقلی سادھوؤں کا دھندہ بھی خوب چل نکلا ہے۔ یہ لوگ ہر سٹّہ پوچھنے والے کو مختلف نمبر بتاتے ہیں یعنی دن بھر میں اگر ان سے سو آدمیوں نے نمبر پوچھا تو یہ لوگ ایک سے لے کر سو تک ہی نمبر بتاتے چلے جاتے ہیں اور وہ شخص جس کا نمبر نکل آتا ہے اس نقلی سادھو کو خدا سے بھی بڑھ کر پوجنے لگتا ہے۔ سٹّہ لگانے والوں کے دلوں کی دھڑکنیں کبھی تیز کبھی ماند اس وقت تک ہوتی ہی رہتی ہیں جس وقت وہ نشر شدہ خبر کی تصدیق نہیں کر لیتے۔ خبر سن لینے کے بعد ہی ان لوگوں کو نیند آتی ہے۔ کئی بار تو عالم بیخودی میں دفتر کے بابو لوگ فائلوں پر ہی سٹّے کا حساب لگانے لگ جاتے ہیں۔ اِن حالات و واقعات کے پیشِ نظر ایک ذی ہوش شخص بہ آسانی سمجھ سکتا ہے کہ اس شوق سے رغبت رکھنا تپ دق جیسے مہلک مرض کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔

نیز ایں ہمہ اس غیر قانونی شوق سے عوام میں اخلاقی گراوٹ، چوری اور رشوت جیسی بدعادات فروغ پا رہی ہیں۔ عوام اور خصوصاً جوانانِ وطن اگر اس بھنور میں پھنس جاتے ہیں تو ملک کے مستقبل کے تاریک ہونے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا امرِ غور طلب یہ ہے کہ اس نامراد مرض کو کیسے ختم کیا جائے؟ اس کی ذمہ داری کیا اُن لوگوں پر ہے جو اس شوق سے رغبت رکھتے ہیں؟ کیا کھائیوالوں کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا جا سکتا ہے؟؟ کیا خبر نشر کرنے والے سرمایہ داروں پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے؟؟؟ آخر اس کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟ کیا حکومت اس غیر قانونی وبا کو ختم کرنے کیلئے کوئی مؤثر قدم نہیں اٹھا سکتی ہے؟

بانگِ جرس

توصیف علوی بی۔ اے
عاصی کیرانوی

اے وطن کے نوجواں اب قدم کو تیز کر
ختم ہو چکی ہے شب ہو چکی ہے اب سحر
ضوفشاں ہوا وطن جاگ اٹھیں ہیں بام و در
ذرہ ذرہ دیش کا ہو رہا ہے جلوہ گر
تو بھی چھوڑ غفلتیں منزلوں کی لے خبر
اے وطن کے نوجواں اب قدم کو تیز کر

اب ہے تیرا میکدہ تیرا جام تیری مے
تیرا اب رباب ہے تیرا ساز تیری لے
تیرا گیت، تیری دھن، تیرا نام، تیری جے
لے کے شمع زندگی جگمگا دے بام و در
اے وطن کے نوجواں اب قدم کو تیز کر

تو وطن کے واسطے یہ وطن تیرے لئے
تو ہے اس کا پاسباں یہ چمن تیرے لئے
تو ہے شمع انجمن، انجمن تیرے لئے
تیرے واسطے ہیں اب زندگی کے بحر و بر
اے وطن کے نوجواں اب قدم کو تیز کر

چار سو حیات کے تیز رو ہیں کارواں
منزلیں بنا رہے۔ منزلوں کے راز داں
باغباں سجا رہے۔ اپنا اپنا گلستاں
تو بھی اٹھ کے دے بدل زندگی کے بام و در
اے وطن کے نوجواں اب قدم کو تیز کر

اب چمن نیا بنا۔ گلستاں نیا سجا
ہو روش نئی نئی پھول ہو نیا نیا
ہو نئی شمیم گل۔ اور ہو نئی صبا
چہرۂ افق سے تو جگمگا نئی سحر
اے وطن کے نوجواں اب قدم کو تیز کر

پھر فروغِ کیف کا بھر کے سب کو جام دے
پھر سے اس جہان کو امن کا پیام دے
پھر سکونِ قلب کی اک صدائے عام دے
منزلِ حیات کو پھر بنا دے بے خطر
اے وطن کے نوجواں اب قدم کو تیز کر

"میرا وطن"

ظفر انجلی (بی۔ اے)

قابلِ رشکِ دُنیا ہے میرا وطن
میری دھرتی کے ذرّے ہیں لعلِ یمن
اس کے پربت جواہر کے انبار ہیں اس کے جنگل بھی تو مثلِ گلزار ہیں
جن میں آزاد پھرتے ہیں شیر و ہرن
قابلِ رشکِ دُنیا ہے میرا وطن

خوشنما دلربا ہیں یہاں وادیاں جن میں جھرنے ہیں ہر سو ہیں ندیاں رواں
جوئے شیریں سے بڑھ کر ہیں گنگ و جمن
قابلِ رشکِ دُنیا ہے میرا وطن

خوب رنگیں ہیں کے گلستاں کے پھول جن کے مذہب جُدا ہیں جُدا ہیں اصول
ایک ہیں پھر بھی کیا شیخ کیا برہمن
قابلِ رشکِ دُنیا ہے میرا وطن

قابلِ دید ہیں اس کے سارے مقام صبح کاشی ہو یا ہو اودھ کی ہو شام
قابلِ داد تاج و اجنتا کے فن
قابلِ رشکِ دُنیا ہے میرا وطن

تلسی و سور و غالب کی یہ سرزمیں شیام کے گیت میرا نے گائے یہیں
گھومے بن بن یہیں رام و سیتا لکھن
قابلِ رشکِ دُنیا ہے میرا وطن

چشتی و کرشن نانک کا یہ آشیاں ایسا منظر ہے سارے جہاں میں کہاں
مسجدوں میں اذاں مندروں میں بھجن
قابلِ رشکِ دُنیا ہے میرا وطن

جس کے بیٹا وطن کے وفادار ہیں قابلِ فخر سب اس کے فنکار ہیں
سارے محنت کشوں کے کھیلیں بدن
قابلِ رشکِ دُنیا ہے میرا وطن

ایس۔ایم۔عابد نقوی
لندن

ہالینڈ سے شملہ تک

اب بارش رُک چکی تھی آسمان نیلا اور شفاف ہوگیا ہے۔ روشنی کی لکیریں پانی میں قوس قزح کی طرح چمک رہی ہیں۔ جہاز کے بادبانوں، مستولوں اور کرین مشینوں کے نیچے۔۔ بندرگاہ سے دُور۔ ہالینڈ کے خوبصورت دارالخلافہ۔ ایمسٹرڈم چمکیلی دُھوپ میں نہایا ہوا ہے۔

خدا حافظ ایمسٹرڈم۔۔۔ مَیں بندرگاہ کے لنگر کی زنجیروں کو اوجھل ہوتے دیکھ رہا ہوں۔ میری نظریں۔ ڈاکیارڈ کے باہر تک دیکھ رہی ہیں۔۔۔ ایک موہوم امید۔ شاید وہ آجائے۔ لیکن وہ نہیں آئی۔۔ اور میرا جہاز آہستہ آہستہ ساحل سے دُور ہوتا جا رہا ہے۔ چند روز پہلے جب ہم یہاں لنگر انداز ہوئے تو میرے سارے اخباری دوست شہر میں گھومنے نکل گئے۔ میں یونہیں بلا مقصد گھومتا رہا۔ خوشی کے اس بے پناہ احساس کے ساتھ کہ کئی ہفتوں سے سمندری سفر کے بعد زمین پر قدم رکھنا نصیب ہوا ہے۔ میں گرد وپیش کا جائزہ لیتا رہا، یہ مکانات ڈھلوانی سلسلوں میں آدھے پانی اور آدھے خشکی پر بنے ہوئے۔ ایلم کے خنک سائے۔ ہر طرف پھیلے ہوئے تھے، کشتیاں پانی میں سرسراہٹ کے ساتھ لہروں کے جال سے گزر رہی تھیں۔ پُل کے بعد پُل پار ہو رہے تھے خاموش اور اجنبی، بالکل کسی دوسری دُنیا کی طرح۔ میں "وڈکرک" اونچے مینار کو سیدھا کھڑا دیکھتا رہا۔۔ سات سو سال پرانا مینار۔ لوگ اِرد گرد سے گزر رہے تھے۔۔ لیکن میں نے کسی کی طرف نہیں دیکھا۔ مَیں ہر آرٹ کی خوبصورتی دیکھ رہا تھا۔

اچانک کوئی چیز تیزی سے میرے بازو کے پاس سے گزر گئی۔ میں پلٹا تو دیکھا وہ ایک لڑکی کا جھکا ہوا سر تھا۔۔

لالہ کے پھول زمین پر بکھرے ہوئے تھے گہرے سُرخ اور زرد رنگ کے۔۔ لڑکی نے معذرت کے انداز میں مُسکرا کر دیکھا۔

"معاف کیجئے" وہ بولی۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور سُنہرے رنگ کی تھیں۔ اُس کے بال گہرے اور چمکدار تھے۔

"میرا قصور"۔ میں نے شرمندگی سے کہا اور زمین پر بکھرے ہوئے پھول اُٹھانے لگا جو دھکا لگنے سے گر گئے تھے۔

اس طرح میری ملاقات اس لڑکی سے ہوئی جس کا نام "للی" (LILA) تھا۔ ایمسٹرڈم کی دُھوپ میں بکھرے ہوئے گُلِ لالہ کے درمیان جب ہم نے سارے پھول چُن لئے تو اُس نے ڈچ زبان میں کہا "تم بہت اچھے ہو۔ لیکن گئی نہیں۔ ہم اسی طرح کھڑے ہوتے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ آنکھوں آنکھوں میں اشارے ہوتے رہے۔

مَیں یہاں کی زبان اچھی طرح نہیں جانتا تھا۔ کیا تم انگریزی بول سکتی ہو۔؟ میں نے آہستہ سے ٹوٹی ہوئی ڈچ زبان میں کہا۔

"بہت کم۔ اچھی طرح نہیں بول سکتی۔ اس نے ہلکے سے تبسم کے ساتھ جواب دیا۔ اس کی آنکھیں دُھوپ کے عکس سے چمک رہی تھیں۔ اور گلابی گال۔۔۔

"ایمسٹرڈم بہت خوبصورت ہے" میں نے اس کے قریب آتے ہوئے کہا۔

"تم ابھی تک یہی سوچ رہے ہو" وہ ایک دلکش انداز میں بولی۔۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ قدرت نے کیا موقع دیا ہے۔ کہ مجھے اس جہاز پر ایسے ہی وقت گھومنے کے لئے کہ "للی" سے ملاقات ہو سکے۔

میرا جہاز تین دن بعد روانہ ہوگا۔ میں نے کہا۔
س نے ایک طرف کو سر جھکایا۔ یہ تو بہت کم وقت ہے "
یا تم اس وقت کسی خاص کام سے جارہی ہو؟ میں نے پوچھا...
خاص کام"۔ نہیں ۔ مجھے تو پھول اپنے گھر سے جانے ہیں
رلبس تے۔ وہ بولی ۔
میرے ساتھ آؤ" میں نے کہا ۔
میں تمہیں نہیں جانتی" اس کی آنکھیں بہت سنجیدہ تھیں۔
میرے دل میں دھڑکن اور جذبہ بڑھ رہا تھا۔ مگر میں
نے بے پروائی سے کندھے اُچکائے لیکن اسی جذبے نے مجھے
یقین دلادیا کہ میرے ساتھ آنا چاہتی تھی۔ میں نے اس سے زیادہ
ت نہیں کی اور چند قدم چلنے کے بعد پھر مڑ کر دیکھا۔ وہ ابھی
ک وہیں کھڑی تھی۔
آجاؤ" میں نے پکارا۔
وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی قریب آگئی۔ ایک خوبصورت مسکراہٹ
س کے ہونٹوں پر پھیل گئی ۔
تمہارا نام کیا ہے" اس نے دھیمے لہجہ میں پوچھا۔
لخت حسن" میں نے اس کی گہری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے
جواب دیا۔ کیا لالا خ ۔ یہ تو بڑا مشکل نام ہے۔ اس نے
ہر حرف کو مشکل سے دہراتے ہوئے جواب دیا۔ ہندوستانی
نام مشکل ہوتے ہیں۔
اچھا تم مجھ کو۔ لکن کہو"۔ ہاں یہ آسان ہے۔
اس طرح خوابوں کا دور شروع ہوا۔ ایسٹرڈم شہر میں تقریباً
پچاس نہریں ہیں جن کو چار سو پل کراس کرتے ہیں۔ ہم ان سب
پر ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے گھومتے رہے۔ ہم نے "ممبر یلا" میں
ڈانس کیا ۔ اس نے پیار سے کہا تم بہت اچھا ناچتے ہو۔
پھر ہم نے ایک ریبار ڈولنس ہاؤس میں پیار کیا ۔ اور ایک قریب
ہوٹل "ڈیوٹ ویلین" میں کھانا کھایا ۔
لیکن میں چاندی کی طرح چمکتی ہوئی نہروں کو نہیں دیکھ سکا۔
میں نے موسیقی کی مدھری تانوں کو نہیں سُنا۔ نہ ہی کھانوں کی لذت
محسوس کی جو کچھ دیکھا اور محسوس کر سکا وہ سب لِلی کے بارے
میں تھا۔ اس کی مسکراہٹ کو دیکھنا بہاروں کی صبح میں سورج

طلوع ہونے کا خوشگوار نظارہ تھا۔ اس کی ہنسی کی آواز کو
سُننا کہیں دُور سے معلوم ہوتا تھا گھنٹیاں بج رہی ہوں ..... لِلی...
جس کی سیاہ زُلفیں تھیں ــــ بہت خوبصورت تھی۔ دو دن کے
لئے میں نے ساری دُنیا کو اپنے قبضہ میں کر لیا تھا۔ صاف شفاف
وہ دُنیا میرے ہاتھوں میں تھی۔
پچھلی رات ہم ایک پُل پر کھڑے تھے ۔ اور پانی میں
جھلملاتی رُوشنیوں کا عکس دیکھ رہے تھے۔ سردی بڑھ گئی تھی
قریب ہی دُوکان پر جاکر ایک گرم کھال کی جیکٹ خرید کر پہنی
کچھ سردی بھی مجھے زیادہ ہی لگتی ہے۔ لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے
کہا ــــ
لِلی نے مضبوطی سے میرا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ پھر نہ جانے کتنی دیر
تک ہم یونہی ایک دوسرے کی گرمی محسوس کرتے رہے۔
" لکن کیا تم پھر کبھی ایمسٹرڈم آؤگے ۔ ؟ لِلی نے بڑے خواب ناک
لہجہ میں پوچھا ۔ میں نے کہا ہاں۔
اس نے میری طرف دیکھا اور اس کی آنکھوں میں پیار تھا
چمک تھی۔ کب تک ؟ دوسرا سوال کیا ۔ ؟
شائد چند مہینوں تک ۔ میں ہندوستان جاتے ہی
اخباری نمائندوں کے دوسرے وفد کے ہمراہ - - - -
یہ بہت زیادہ وقت تو نہیں ہے۔ میں تم سے کل ملوں گا۔
ضرور آنا ــــ ہم دوپہر کو روانہ ہونگے ــــ
میں تم سے یہاں دس بجے مل سکتا ہوں۔"
اس نے سر ہلا کر اقرار کیا. . . . میری طرف مڑتے ہوئے اس
کے سُرخ ہونٹوں کی حلاوت میرے لبوں کو محسوس ہونے لگی۔
اس کی آنکھیں بند تھیں .... ہم نے ایک دوسرے کو پیار کیا
وقت گزر رہا تھا۔ اور ہم دل کی گھڑیوں کو تھامے ہوئے یہ سوچ
رہے تھے .... کاش یہ لمحہ امر ہوتا . . .
مجھے تم سے محبت ہے" میں آہستہ سے بولا ــــ
" دو دن میں" ؟
اس نے ملائمت سے پوچھا ــ" ایسی بات ممکن نہیں "۔
اور حیرت و مسرت کے ملے جلے جذبات اس کے چہرے سے
نمایاں تھے۔

میں مسکرایا اور اس کے گورے گورے ملائم ہاتھوں کو اپنی انگلیوں سے دبایا لیکن میرا دل مسکرانے کو تیار نہ تھا۔ "کیا تم نے مجھے پسند نہیں کیا" میں نے پوچھا۔
اس کے بازو میرے گردن میں حمائل ہو گئے۔
"ممکن مجھے تم سے محبت ہو گئی۔"
ایسی بات ناممکن ہے۔ میں نے بھی اس کا جملہ شرارتاً دہرایا۔
"ہاں" اس نے کہا لیکن یہ ممکن ہو گیا ہے"
"اتنی اداس مت نظر آؤ۔"
میری آواز بھرا رہی تھی۔
میں قابو نہیں پا سکتی — مجھے اب جانا چاہیئے — بہت دیر ہو گئی ہے" اس کی پلکیں بھیگ رہی تھیں اور آواز سے ارتعاش ظاہر تھا۔
ہم نے گرمجوشی سے ایک دوسرے کو الوداعی پیار کیا — اور وہ پل کے آخری سرے تک تیزی سے چلی گئی — پھر پلٹ کر ہاتھ ہلایا۔ "کل صبح دس بجے یہاں ضرور آجانا۔"
میں نے چلا کر کہا —
"ضرور" اس کی آواز دور سے سنائی دی — اور پھر وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئی ..... اور — پوری رات سینے پر ہاتھ رکھ کر بے قراری کے عالم میں گزاری۔
جب صبح ہوئی تو بارش شروع ہو گئی —
میں ساحل پر نو بجے پہنچ گیا لوگ اِکّا دُکّا نظر آ رہے تھے ... ہر طرف خاموشی سی تھی۔ ایمسٹرڈم بے رنگ تھا اور بارش کی وجہ سے دھندلا ہو رہا تھا ... میں نے پہلا پل پار کیا دوسرا اور پھر تیسرا ... پھر رک گیا ... کل رات ہم ایک پل پر کھڑے تھے ...
لیکن میں شہر کو اچھی طرح نہیں جانتا تھا اور وہاں چار سو پل تھے۔ میرا دل اچانک درد سے کھنچنے لگا ... میں جس پل پر کھڑا تھا وہ اسی طرح کا دکھائی دے رہا تھا ... لیکن مجھے پوری طرح یقین نہیں تھا ... رات کو اپنے جہاز کی طرف جاتے ہوئے میں نے پلوں کو گننے کی زحمت بھی نہ کی تھی۔ ان کے بارے میں سوچا بھی نہ تھا — "اس کو وہی ہونا چاہیئے" میں نے نیچے پانی کی طرف دیکھا اور یاد کرنے کی کوشش کی .....
میرے چہرے پر بارش کے چھینٹے پڑ رہے تھے ....
میرے جیکٹ کے کالر سے پانی ٹپک رہا تھا ... میرے بال بھیگ کر پھیل گئے تھے۔
لَلی کے ساتھ گزارے ہوئے خواب ناک لمحات میں۔ میں نے اس کے بارے میں کچھ بھی تو نہیں پوچھا تھا بس میں تو اس کے ہونٹوں کے پیار میں وِسکی کا سرور محسوس کرتا رہا تھا۔
میں صرف اتنا جانتا تھا کہ وہ خوبصورت تھی اور میں اس سے محبت کرنے لگا تھا۔ اس کی عمر بیس سال تھی اور وہ ایمسٹرڈم یونیورسٹی میں پڑھتی تھی۔
اس کی خوبصورت مقناطیسی آنکھوں نے مجھ سے وہ سب کہہ دیا تھا۔ جو زبان سے کبھی الفاظ کی صورت میں ادا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ شہر سے باہر رہتی تھی۔ اس کا اور اس کی ایک سہیلی کا ایک ہی کمرہ تھا۔ اس کے والدین "نورڈوک آف ری" میں رہتے تھے۔ بس اتنا ہی جانتا تھا —
آج کی ملاقات میں میں نے اسے اپنا "ساوتھوا ایکسٹنشن" کا پتہ دینا تھا اور آج ہی اس نے بھی اپنا پتہ دینے کا وعدہ کیا تھا
اس پل کو یقیناً وہی پل ہونا چاہیئے۔ ورنہ کیا ہوگا ...
کیا ہماری محبت یونہی ایک دوسرے کے لئے بھٹکتی رہے گی؟ لیکن دس بج گئے — اور لَلی نہیں آئی — لوگ بارش کی وجہ سے سر جھکاتے گزر رہے تھے۔ بھورے بال سفید چہرے۔ آسمانی رنگ نہر کے پانی میں منعکس ہو رہا تھا۔
ایمسٹرڈم دھندلا اور بعید نظر آ رہا تھا — لَلی کے بغیر ساری دنیا بے رنگ اور پھیکی تھی ..... سوا دس بجے میں نے اس پل کو چھوڑا اور دوسرے پل کی طرف گیا — اور یاد کرنے کی اتنی کوشش کی کہ میرا سر درد سے پھٹنے لگا — اس کا کوئی فائدہ نہ تھا — ان تمام پلوں میں ایک ہی وہ خاص پل ہو سکتا ہے — مجھے صرف اتنا علم تھا کہ میں نے ایمسٹرڈم کے ایک پل پر اس لڑکی کو پیار کیا تھا۔ جس سے مجھے محبت ہو گئی تھی — بس اتنا ہی مجھے معلوم ہے ....
میں نے اپنے آپ کو دلاسہ دیا —

میں اس کو خط لکھ سکتا ہوں ایمسٹرڈم یونیورسٹی کے پتہ پر اور یقیناً اسے مل جائے گا۔ اُس کا اصلی نام "مارگریتا کوف ہتا" پیار سے اسے للی کہتے تھے۔

اب میں بارش میں بُری طرح بھیگ چکا تھا۔ جیکٹ سے پانی جذب ہو کر قمیص میں داخل ہو رہا تھا۔ میں چھینکیں مارتا ہوا ایک پُل سے دوسرے پر پھر تیسرے پر پہنچ گیا۔

گیارہ بجے تک میں بلا مقصد پُلوں پر گھومتا رہا۔ سمندر کے اوپر بادل چھٹ گئے تھے۔ اور نیلے رنگ میں شہر کی طرف پھیل رہا تھا۔

میں بھیگا ہوا اور تھکاوٹ و بوریت محسوس کر رہا تھا۔ چند منٹ بعد بارش بالکل رُک گئی۔ آسمان صاف نکھرا ہوا ہے۔ پانی میں جہاز کے انجن کے تیل کی لکیر "RAINBOW" کے رنگوں کے مانند چمک رہی ہے۔۔۔ ساحل سے بادبانوں اور کرین مشینوں کے پیچھے شہر چمکیلی دھوپ میں چمک رہا ہے۔ میں واپس آگیا۔

"ٹوٹ زینز" ڈچ زبان میں۔ خدا حافظ ایمسٹرڈم۔ میں جہاز کے لنگر کو دُور رہتا دیکھ رہا ہوں۔۔۔ ڈاکیارڈ کے باہر ایک مبہم سی اُمید پر۔ شائد وہ آجائے۔ لیکن۔ لیکن للی نہ آئی اور جہاز لمحہ بہ لمحہ ساحل سے ہٹ رہا ہے اس کا سامنے کا حصّہ آہستہ آہستہ پانی میں ڈوبنے لگا۔

اور اب للی کو دیکھ رہا ہوں۔ میں جہاز کے عرشہ پر کھڑا ہوں۔ ایک پیلی برساتی کوٹ پہنے۔ وہ دوڑ رہی ہے!۔ وہ بندرگاہ کے کنارے پر رُک گئی ہے۔ اور نا اُمیدی سے ہاتھ ہلا رہی ہے۔ میں بھی ہاتھ ہلا رہا ہوں۔

میری پلکیں بھیگنے لگیں۔ میرا دل خوشی کے عالم میں ہے۔ للی تم نے دیر کر دی۔ میری محبت۔ الوداع۔ یہاں بہت سے پُل ہیں۔ میں جلد ہی لوٹ کر آؤں گا اور تمہیں ڈھونڈ ہی لوں گا۔ الوداع للی الوداع۔ "ٹوٹ زینز"

میں نے دہلی پہنچ کر اخبار کے اکسزیکیٹیو "EXCUTIVE" سے ہالینڈ دوبارہ بھجوانے کی درخواست کی۔۔ اس کمبخت نے ایک کڑک مُرغی کی طرح ہوں سے کیا اور شملہ بھجوانے کے آرڈر پہ دستخط کر دیئے۔

اب میں سردیوں میں سکڑ رہا ہوں۔۔۔ للی کے گرم گرم ہونٹوں کا لمس یاد آ رہا ہے۔ شملہ کے سفید برف پوش پہاڑ پر جب صبح کے سورج کی سنہری کرن پڑتی ہے تو۔۔۔ REFLECT ہو کر پورے ۹۰ ڈگری کا زاویہ بناتے ہوئے میرے دل سے ٹکراتی ہے۔ اور میں "ٹوٹ زینز" الوداع کہتا ہوا U.S. کلب میں گھس جاتا ہوں۔۔۔ جہاں مجھے گرم گرم سانسوں کے ساتھ کسی اور کی دھڑکنیں سُنائی دیتی ہیں۔۔۔

غزل

مظہر اعظمی
(چالیس گاؤں)

موجوں کے کڑے تیور اٹھتا ہوا طوفاں ہے
اب ایسے میں کشتی کا اللہ نگہباں ہے

اِس دَورِ سیاست کا انداز معاذاللہ
تعمیر کے پردے میں تخریب کا ساماں ہے

اے شام تری زلفیں اب کون سنوارے گا
اِس دَورِ تباہی میں ہر ایک پریشاں ہے

کیا تم نے بھی سوچی ہے یہ بات کبھی لوگو
کیوں فصلِ بہاراں میں یہ حال گلستاں ہے

وہ ہو کے پشیماں اب آئے ہیں سرِ بالیں
بیمارِ محبت جب اک لمحہ کا مہماں ہے

کیوں پوچھ رہے ہیں وہ سب حال مرا مظہر
جب عالمِ بیتابی چہرے سے نمایاں ہے

غزلیں

روحی بھاردواج

تیرے جسم پر میرے خون کا لبادہ ہے
دل زندگی تیرا ۔ اور کیا ارادہ ہے

وقت کی اداؤں کا ذکر اور کیا کرتا — جب ستم زیادہ تھا ۔ اب کرم زیادہ ہے
کاش ہمسفر کوئی معتبر سا مل جائے — زندگی کی منزل کا راستہ کشادہ ہے
عمر بھر بھٹکتا ہے جس کی کھوج میں انساں — کون سی یہ منزل ہے ، کون سا وہ جادہ ہے
اس میں شک نہیں انساں آسماں پہ جا پہنچا — دوستو پیادہ تو آج بھی پیادہ ہے
بدلیوں کی چھاؤں میں ریشمیں فضاؤں میں — آپ ہی بتائیں کیا آپ کا ارادہ ہے
اپنے خون سے دل کی تشنگی مٹاتا ہوں — اب تو حسرتو بولو ۔ اور کیا ارادہ ہے
عمر یہ گزاری ہے جس کی یاد میں اے دل — اُس پہ جان دینے کا اب میرا ارادہ ہے
حسرتوں کی وادی میں گھومتے پھریں ہر سو — دل کی دھڑکنوں کا بس اِک یہی اعادہ ہے
گھومتے ہو آوارہ زندگی کی گلیوں میں — آپ کا روحی صاحب کیا نیا ارادہ ہے

ٹیسوں کا تسلسل ہے یہ آہوں کی صدا ہے — کہتے ہیں جسے جینا یہ جینے کی سزا ہے
سائنس کے اس دور میں جو ہم نے کیا ہے — وہ سارے جہاں کے لئے دستور نیا ہے
اپنوں نے میرے ساتھ وہ برتاؤ کیا ہے — غیر دل سے کسی بات کا شکوا نہ گلا ہے
یہ دیکھنا ہے کون ہے اس کا نشانہ — کچھ دور اندھیرے میں نیا تیر چلا ہے
اب فن کا بھی دیوالہ نکلتے ہوئے دیکھو — اس دور کا ہر شخص ہی فنکار بنا ہے
گردش کے ستاروں کی چمک تیز ہے کتنی — ہر شخص ہی دیوانہ بنا گھوم رہا ہے
بیکار ہی الزام تراشے ہیں جہاں نے — کچھ ان کی خطا ہے نہ کوئی میری خطا ہے
گھٹتے ہیں بہ خود سے اب اہلِ جنوں بھی — وہ میری صدا ہے وہ فضا میری صدا ہے

تم بھی تو ذرا شیشوں میں لے آؤ نیا پن
یہ دور روحی دیکھو کہ یہ دور نیا ہے

دماغی ورزش

ساٹھ روپے انعام

ان ۳۳ شعروں میں ۳۰ بیمار اور ۳ چنگے ہیں۔ شعر لکھنے کی زحمت نہ فرمائیں صرف نمبر شعر لکھ بیماری بتائیں۔
(اگر کوئی علاج ممکن ہو تو وہ بھی لکھ دیجئے یہ انعام کی حد سے بالا ہوگا) (ادارہ)

۱۔	اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے	مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے	ذوقؔ دہلوی
۲۔	نزدیکِ وصل دل زِ بادل کو تسلی ہے بجا	لنگر سفینے کو ہوا پہنچا اگر ساحل کے پاس	امیرؔ مینائی
۳۔	ضرر پہنچا نہ مجھ کو آن کر اس بھڑ کے چھتے میں	کہ میں نے نوش کو بھی نیش بل کہ نیش تر جانا	تظلمؔ طباطبائی
۴۔	دل ایسے شخص کو مومن نے دیدیا کہ وہ ہے	محبِ حسین کا اور دل رکھے شمر کا سا	مومنؔ دہلوی
۵۔	رزق سے محروم رازق نے نہ رکھا شکر ہے	گوشت پر اپنے گرے ٹوٹے جو ہم خوراک سے	سحرؔ لکھنوی
۶۔	کسی صورت نہ ہونے دی شبِ غم کی سحر میں نے	سیاہی جب گھٹی پھیلا دیا دودِ جگر میں نے	ندرتؔ میرٹھی
۷۔	گو نہ لی یعقوب نے زنداں میں یوسف کی خبر	لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں	غالبؔ دہلوی
۸۔	وحشت ایسی ہے کہ سایہ سے بھی میں کہتا ہوں	آپ کیوں میرے برابر میں چلے آتے ہیں	داغؔ دہلوی
۹۔	خطِ نورستہ نہ قرآن کو کر دے منسوخ	لوحِ محفوظ سے اتری ہے یہ آیات نئی	ناسخؔ لکھنوی
۱۰۔	کس حال میں نجانے مرے ہمصفیر ہیں	ہم آپ مدتوں سے قفس میں اسیر ہیں	شادؔ عظیم آبادی
۱۱۔	قبلۂ من جناب یاس آپ ہیں کس حساب میں	سنی بے امام ہیں یا شیعہ بے نماز میں	یاسؔ عظیم آبادی
۱۲۔	نگاہِ گرم نے دعوائے جاں بازی پہ جھلا کر	چھری جلتی ہوئی گردن پہ وقتِ امتحاں رکھ دی	آرزوؔ لکھنوی
۱۳۔	کہے تھی یہ طفلی میں دیکھ اس کو دایہ	یہ لڑکا طرحدار پیدا ہوا ہے	مصحفیؔ امروہوی
۱۴۔	اثر ظاہر ہوا یہ چشمِ نم کا	کرم مستوں پہ ہے ابرِ کرم کا	عشرتؔ لکھنوی
۱۵۔	چٹختی ہڈیوں جلتے ہوئے جسموں کی بدبو سے	پگھلتی چربیوں جھلسی ہوئی لاشوں کی بدبو سے	سیمابؔ اکبرآبادی
۱۶۔	محلِ سجدہ جہاں ہوگا سر جھکے گا وہیں	اسیرِ قیدِ تعین نہ بندگی ہوگی	مختارؔ ہاشمی
۱۷۔	وہ چمن میں جب روش سے ہو کے گزرے بے نقاب	دیر تک ہر ایک گل کا رنگ گہرا ہو گیا	جگرؔ مرادآبادی
۱۸۔	وہ کیسے بن جاتی تری مہرالنسا نورجہاں	کیسے ہو جاتی وہ تاجِ ہند کا قدرِ یتیم	آفیؔ جائسی
۱۹۔	تجھ کو کیا خبر ہوئی یا نہ ہوئی جانوں کی	رہ گئی نوک تو قاتل ترے پیکانوں کی	مہرؔ گوالیری
۲۰۔	چار حرفِ آرزو کی شرح اور اتنی دراز	ایک دفتر لکھ چکا ہوں ایک دفتر رہ گیا	نوحؔ ناروی
۲۱۔	اللہ رے زور مجبوری کہ خود مجھکو حیرت ہوتی ہے	جو بار اٹھایا پڑتا ہے کیوں کر وہ اٹھایا جاتا ہے	وحشتؔ کلکتوی
۲۲۔	یہ گلہ ہے کہ رہے ہیں آج ان کا پیمانِ وفا وہ بھی	کہ شاید ہو چکے ہیں اب پشیمانِ جفا وہ بھی	ثاقبؔ کانپوری
۲۳۔	حاضر ہوا بزم میں آج ہم آپ کیوں لگے کھسیاں	وجہ اس کی میں بتا دوں آج کیوں جل گیا	مظفرؔ خیرآبادی
۲۴۔	سنائے دولتِ اندلس بتا گئی ہم کو	نہ مٹ سکے گا ستم سے غرورِ بے کسی	نیازؔ فتح پوری

۲۵	[illegible] کی اک سی چال ڈھال [illegible] روشن	[illegible] ہو کشش کیوں نہ فنروں [illegible]	[illegible]
۲۶	[illegible] تبرک کی طرح	کچھ اتنی جو رہا تھا مری رسوائی کا	[illegible]
۲۷	کسی نے لے لیا تھا ایک بوسہ ان کا چوری سے	ہوئے بیچین کہ اب تک انہیں [illegible] ہوتی ہے	تسلیم لکھنوی
۲۸	[illegible] یعنی قیصر کا دیار	ہو جو امت کی سطوت کا [illegible] پاسدار	اقبال لاہوری
۲۹	[illegible] کہ گل اپنا ہے گلستاں اپنا	حوریں اپنی ہیں جناں اپنا ہے رضواں اپنا	ناظم رام پوری
۳۰	مست ہوں پیر مغاں کیا مجھ کو فرماتا ہے تو	پائے بوسی خم گردوں یا دست بوسی سبو	تیر [illegible]
۳۱	[illegible] کی طرف دیکھ رہا ہے ساقی	لہر آئی ہے تو خیمہ [illegible]	صبا لکھنوی
۳۲	تم کو بھی اپنا پرایا کچھ نظر آتا نہیں	دو ... اندھے نظر آتے ہو تم نرگس [illegible]	ناطق گلاوٹھی
۳۳	یار کو میں نے مجھے یار نے سونے نہ دیا	رات بھر طالع بیدار نے سونے نہ دیا	آتش لکھنوی

رکھ کر سیٹھ نے کہا "پاگل یہ کیا کر لیا تم نے ... آخر یہ ایسا کیوں کیا ... میں تمہیں ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر تو نہیں جا رہا تھا ..."

مالتی کی آنکھوں میں رکے ہوئے پانی کے چشمے بہہ نکلے "سیٹھ میں سب کچھ جانتی ہوں ... میں تمہارے احسان کا بدلہ نہ چکا سکوں گی ... تم ... تم مجھے چھوڑ کر جا رہے تھے نا ... مجھے احسانوں کے بوجھ تلے دبا کر جا رہے تھے ... آخر میں حیوان تو نہیں ... میں سب کچھ سمجھتی تھی میرے پہلو میں بھی دل ہے ... تم چلے تھے مجھے چھوڑ کر مجھے شمبو کا چھوڑ کر جانا چاہتے تھے ... تم آ گئے ... میری بھوک مٹ گئی ... محبت ہر ایک بھوک کو شا دیتی ہے ... میرے گھر والے بھوکے تھے ... وہ بھوکے ہی رہیں گے ... یہاں ایسے لاکھوں بھوکے ہیں ... مگر میری بھوک مٹ گئی سیٹھ ..."

تھرتھراتے ہاتھوں سے مالتی نے سیٹھ کو کوشش کر کے [illegible] اپنی طرف کھینچا اور اس کے ہونٹوں کی [illegible] لگا لیا ہونٹ اس طرح کھول کر بیٹھ جائے جیسے [illegible] پھول شبنم کے لئے اپنا دامن کشادہ کر دیتا [illegible] مٹ گئی سیٹھ ... میری بھوک [illegible] مالتی کے ہاتھ زمین پر گر گئے اور نازک کلائیوں میں پہنی ہوئی چوڑیاں پتھروں سے ٹکرا کر درد بھرا راگ پیدا کرتی ہوئی ٹوٹ گئیں۔

قطعات

نرگس سہسوانی

گندم رینرز سے حجامت کر تو لی — وقت کی پوری ضرورت کر تو لی
جیب خالی پیٹ خالی ہے تو ہو — جشن آزادی میں شرکت کر تو لی

شکل انسانوں کی ہے خصلت میں گو شکور ہوں
حریت کی مے سے پھر بھی چور ہوں مخمور ہوں
تجھ سے تو ربط خاص رکھتا ہوں میں اے ہندوستان
تو مری جمہوریہ ہے میں ترا جمہور ہوں

"سالِ نو"

سالِ نو جب آ گئے ہے — جشن منایا جائے گا
[illegible] تو — [illegible] ہمیں دکھلائے گا

[illegible]

مثنوی مالوہ

قسط ۶

نازش الہ آبادی

غم ہجر سے وہ کنارا کرے
ہو جیسے بھی کمرے میں گزارا کرے

نہ پاؤ گی تم "یکش" کو در حیات
ملے گا وہ جنت میں بعد از وفات

کہا اُس کی بیوی نے "بھائی شتو"
پلٹ کر اُسے میرا پیغام دو

کروں گی میں جنت میں خود انتظار
تم "یکش" یہاں رہ کے ہو سوگوار

وہ جنت میں آ کر کے مجھ سے ملے
گلے مجھ سے دونوں دلوں کا کھلے

تمھیں بھائی دیتی ہوں دل سے دعا
نہ ہو تم سے بجلی تمھاری جدا

مہاکوی کالیداس کی تصانیف اور مورخ عرب البیرونی

اسی واقعے کی ہے جاں میگھ دوت
جو ہے شاعرانہ ہنر کا ثبوت

مقدس ہے اُجین کا یہ نگر
جو تاریخِ عالم میں ہے نامور

عرب "البیرونی" مورخ عظیم
مہاکوی کا ثابت ہوا جو ندیم

وہ انگلش زباں، لیٹن و جرمنی
جو تھا فصیح بھاشا کا پیدا ہو معنی

وہ سنسکرت کا عالم بھی مشہور تھا
ہر اک علم و فن سے وہ معمور تھا

مہاکوی کی ساری تصانیف پر
پڑی اُس کی جب عالمانہ نظر

وہی لے گیا یورپ و روس تک
مہاکوی کو چمکا دیا تا فلک

ہوئیں ترجموں سے زبانیں وہ غنی
وہ ہو فرنچ یا فارسی، جرمنی

ہو لیٹن کہ انگلش کہ روسی زباں
مہاکوی کی سب بن گئیں قدرداں

ہے "بکرم چرتی" بھی ایسی کتھا
جو ہے ہندوؤں کے لیے انوکھی حیاں

بکرماجیت کے دوسرے نورتن

امر سنگھ "تھے نورتن شاندار
جہاں تو ادب میں ہے جن کا شمار

"امر کوش" کے ہیں مصنف امر
جہاں جو ادب جن سے ہے با اثر

تھا بیتال نامی بھی اک نورتن
جو تھا بندۂ علم اہلِ سخن

سیاسی وہ شاعر تھا اک بے مثال
جو مشہور عالم ہوا با کمال

جو لکھی ہے بیتال کی داستاں
سیاست کا ہر فن ہے جس میں بھرا

"وراہ مہر" تھے منجم مہد نورتن
تھے عہد میں وہ سبھی [illegible] فن

[illegible] بھارت کا اب [illegible]
کرتا عہد میں اپنے [illegible]

[illegible] کے عہد میں بکرماجیت کے [illegible] کی [illegible] پتلیوں کی کہانی ہے

بھوک

و. س. دلگیر چنڈی گڑھ

کشمیر۔۔ ہاں کشمیر۔۔ یہ وہ دھرتی ہے جسے محبان قدرت، شعرا اور اہل علوم و فنون نے بہشت بر روئے زمین کہا ہے۔ سیٹھ لالمن بھی اسی بہشت میں زیست کے مزے لے رہے تھے۔ شراب میسر تھی۔ حوریں حاضر تھیں۔ رنگا رنگ کے پھل پھول افراط سے حاصل تھے۔ چاند کی چاندنی میں لامبے لامبے اشجار کے اٹھکیلیاں کرتے ہوئے سائے قدرت کا ایک حسین اشارہ معلوم پڑتے تھے۔ چاندنی راتوں میں شکارہ کی سیر۔۔۔ مچلتی جوانی مدہوش سنہری اندام اور دمکتے چاندی کے سکے بے نظیر مرقع بن جایا کرتے تھے۔

حسب معمول آج بھی سودا کیا گیا۔ مدہوش جوانی نے جھیل میں چاندنی کا لطف اٹھانے کے لیے معصوم حسن خریدا۔ رات ختم ہوا چاہتی تھی۔ چاند اپنا فرض نبھاتے نبھاتے تھک چکا تھا۔ مگر جوانی کی خواہشات لمحہ بہ لمحہ اور بھی جوان ہوتی جا رہی تھیں۔

اتنی شرم؟ ہر روز ایک نئے گاہک کے پاس جانا اور پھر اتنی حیا؟ یہ دیکھتے ہی سیٹھ ایک الجھن میں پھنس گیا۔ مگر وہ تو اس کی زر خرید غلام تھی۔۔۔ اس ایک رات کے لیے جس کے جذبات کا احساس ایک بے معنی اور لغویات تھی۔ آخر اس کا کیا حق تھا کہ اس نے پاس بیٹھ کر اس طرح لجائے۔؟

سیٹھ اس حسین تن کے زانو پر سر رکھ کر شکارہ میں لیٹ گیا اور آہستہ سے اس کی ٹھوڑی پر چٹکی بھرتے ہوئے پوچھا "کیا نام ہے تمہارا"

لڑکی کے ہونٹ آندھی میں کانپ رہے تنکے کی طرح لرزہ میں آئے "مالتی"۔

اوہو! بہت ہی پیارا نام ہے۔ جس قدر تم خود حسین ہو اتنا ہی نام بھی حسین ہے۔ مالتی! بالکل پھولوں کی طرح رس بھری۔۔ گداز۔۔ ملائم۔ خوشبو دار اور حسین۔۔۔

مگر۔۔" سیٹھ نے قریب ہی رکھے ہوئے گلاس اور بوتل اٹھا کر مالتی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "گھبرا کیوں رہی ہو جان من۔ کیا آج پہلا دن تو نہیں ہے تمہارا؟"

مالتی نے ایک تجربہ کار ساقی کی طرح گلاس میں شراب انڈیل کر سیٹھ کے ہاتھ میں دیتے ہوئے سہمی ہوئی آواز میں کہا "جی۔۔۔ نہیں۔"

"اچھا تو پہلے تم پیو۔" سیٹھ نے گلاس مالتی کے ہونٹوں کی طرف بڑھایا مگر اس نے آہستہ سے پرے ہٹا دیا۔ اصرار بھی کیا گیا مگر ایک معصوم انکار اس گستاخ اصرار کو شرمندہ کر گیا۔ رات ختم ہو رہی تھی مگر امنگیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ دو سخت ہاتھ ایک ہی رات میں نامعلوم کتنی نرم کلیوں کو مسل گئے۔ مگر مالتی بت بن کر بیٹھی رہی۔

شکارہ کی سیر ختم کرنے کے بعد سیٹھ اپنے گھر آ پہنچا ایک حسین بنگلہ جسے دیکھ کر مالتی حیران نہیں ہوئی۔ وہ تو شاید کہیں بہت پہلے سے ہی پتھر کے ان مضبوط محلات کی حقیقت سے آگاہ ہو چکی تھی۔ مدہوش سیٹھ کے مخمور ہونٹ والہانہ طور پر دو قیدی ہونٹوں سے پیوست ہو گئے مگر مالتی اب بھی ایک بے حس پتھر سے بڑھ کر اور کچھ نہ تھی۔ سیٹھ نے اپنی باہیں اس کے گلے میں ڈال دیں اور مضبوط ہاتھ معصوم جسم سے اٹھکیلیاں کرنے میں مصروف ہو گئے۔ مالتی ایک بے حس و حرکت جسم تھی۔

سخت جوان ہاتھوں نے بے رحمی سے نرم و نازک جسم کو چھیڑا۔

جب مالتی بالکل پتھر کی مورت بنی رہی تو سیٹھ نے جھنجلا کر کہا۔ "مالتی کیا تمہیں معلوم نہیں کہ تمہارے ماں باپ نے مجھ سے پندرہ روپے لئے ہیں؟ میں تمہارے اس روکھے برتاؤ سے تو تمہیں ایک کوڑی بھی نہیں دوں گا۔ کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ مجھے اسی طرح ٹال دوگی؟ یقین رکھو سیٹھ لالمن اتنا بے وقوف نہیں۔ اس کے ہاتھوں میں سے آج تک تم ایسی سینکڑوں ہو گذری ہیں۔"

مالتی سر سے لیکر پاؤں تک کانپ اٹھی۔ اس کی باہیں بید کی طرح کانپتی ہوئی اٹھیں اور سیٹھ کے گلے کا ہار بن گئیں۔ سیٹھ نے ہنستے ہوئے اُسے اپنی باہوں میں کھینچ لیا۔ "ہاں اب ٹھیک ہے۔ میری جان اب ٹھیک ہے۔ پیسہ کمانے کے لئے انسان کو بہت کچھ سیکھنا پڑتا ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس کے گرم بیتاب ہونٹ ایک بار پھر مالتی کے کانپ رہے ہونٹوں کے نزدیک پہنچے مگر یکدم رُک گئے۔ "ارے رو رہی ہو! مجھے بے وقوف بنانا چاہتی ہو؟"

مالتی سیٹھ کے قدموں سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ "سیٹھ تو نے مجھے خریدا ہے۔ میں تمہیں روک نہیں سکتی۔ تم جس طرح بھی چاہو مجھے استعمال کرسکتے ہو۔ مگر۔۔ مگر میری آتما بھوکی ہے۔ میں نے اپنے ہی اندر ایک اور زندگی سنبھال کر رکھی ہوئی ہے۔۔ کئی مہینے سے دُنیا کے پاؤں اپنے آنسوؤں سے دھو رہی ہوں صرف ماں بننے کے لئے۔ میں نے بچوں کو دیکھا ہے۔۔۔ حسین عورتوں کو اپنے جوان ساتھیوں کی آغوش میں زندگی گذارتے دیکھا ہے۔ مگر میں۔۔ میں کچھ بھی نہ کر سکی۔۔۔ سینکڑوں [illegible] ایک [illegible] وند کے لئے [illegible] سارا [illegible] کی اور ماں باپ کے پیٹ بھوکے ہیں۔ تمہیں

تمہارے نفس کی بھوک ستا رہی ہے مگر میری آتما بھوکی ہے۔۔ تم امیر ہو۔ روپیہ پیسہ سے اپنی بھوک مٹا سکتے ہو۔ تم نے اب بھی سودا کیا ہے اپنی بھوک مٹاؤ۔۔۔ جب تک کسی دوسری چیز کو تلف نہ کیا جائے اس وقت تک بھوک بھی مٹنے نہیں پاتی۔۔۔ میرے ماں باپ کے پیٹ بھوکے ہیں۔۔۔ وہ ہر روز میرا جسم بیچتے ہیں۔۔۔ مگر میرا حسن ابھی تک بھوکا ہے اور میری بھوک صرف اشک اور آہوں میں ختم ہو جاتی ہے۔۔۔ لوگ روپیہ خرچ کرتے ہیں اور میں ان کی ہو جاتی ہوں۔ نہیں سیٹھ نہیں مجھے انکار نہیں۔ اگر میں انکار کروں گی تو میرا سب خاندان بھوکوں مر جائیگا۔ تمہارا حق ہے تم اپنی بھوک مٹاؤ۔ میرے یہ آنسو تو اسی طرح بہتے اور خشک ہوتے رہیں گے۔ مگر میرے گھر والوں کو روٹی۔۔۔ روٹی۔۔۔" وہ سسکیاں بھر کر رونے لگی "نہیں سیٹھ مجھے انکار نہیں۔۔۔ میرا خاندان بھوکوں مر جائیگا۔"

مالتی بچوں کی طرح روتے ہوئے اپنے کپڑے اُتار رہی تھی۔ وہ جسم جسے چند گھڑیاں پہلے سیٹھ لالمن زبردستی برہنہ کرکے مسمار کر دینے پر آمادہ تھا وہ جسم اب خود ہی اس کے سامنے عُریاں تھا۔ مگر اب اس کی آنکھوں کے سامنے ایک "ماں" تھی جس سینے میں وہ اپنی نفسانی خواہشات کا جواب دیکھ رہا تھا اب اُسی سینہ سے لپٹا ہوا اسے ایک بچہ دکھائی دینے لگا۔ اُس نے ایسے محسوس کیا جیسے اس کے سخت ہاتھوں نے کسی معصوم بچے کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی ہو۔ سیٹھ نے ایک دو بار اپنی آنکھوں کو زور سے بند کیا اور کھولا پھر اچانک ایسے سنبھلا جیسے کسی نے گہری نیند سے جگا دیا ہو۔

"کپڑے پہن لو مالتی۔" یہ کہتے ہوئے سیٹھ باہر چلا گیا۔ مالتی نے کپڑے پہن لئے مگر سیٹھ کے اس رویّہ نے اسے متفکر کر دیا۔ "اب کیا ہوگا؟ وہ ناراض ہو کر چل دیا؟ پیسے نہیں دے گا؟ والدین کا غصّہ اور بھوک ناقابل برداشت ہوں گے۔۔۔" وہ پھر رونے لگی اور اسی طرح روتے روتے سو گئی۔

صبح کی پُر امید کرنوں نے سیٹھ کو جگایا۔ وہ مالتی کے

کمرے میں گیا۔ پاس ہی لیٹے محسن سہا ہوا فرش پر ہی سو گیا تھا۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "مالتی"!

مالتی نے آنکھیں کھول کر سیٹھ کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں نے ترس بھری نظر سے اسے دیکھا۔ "یہ لو پیسے اور اپنے گھر جاؤ۔" لڑکی کے ہاتھ میں دس دس کے دو نوٹ دے کر وہ کمرے سے باہر چل دیا۔ مالتی نے کچھ کہنا چاہا مگر وہ "سب ٹھیک ہے۔" کہتے ہوئے چلا گیا۔

تین سو روپے ماہوار... ایک مستقل گاہک پاکے خوش ہوئے مالتی کے ماں باپ۔ سیٹھ ولمن کے لئے تو یہ تین سو روپے کوئی بڑی بات نہ تھی۔ آتنی ملوں کا مالک تو تین سو روپے روزانہ بھی دے سکتا تھا۔ مالتی ہر شب اس کے بنگلہ میں آتی اور صبح ہوتے ہی گھر لوٹ جاتی۔ کتنا بڑا احسان تھا اس کا مالتی اور اس کے والدین پر۔ کئی بار تو وہ پُرنم آنکھوں سے کہہ دیا کرتی تھی "سیٹھ ایسا مت کرو۔ میری وجہ سے تم اپنا روپیہ ضائع کر رہے ہو۔ آخر میں غریب اس احسان کا بدلہ بھی نہ چکا سکوں گی... ایک رات کی ملاقات نے مجھے ہمیشہ کے لئے تمہاری بنا دیا ہے۔ تمہارا پیسہ...."

سیٹھ ہنس دیتا اور اُسے ٹھوڑی سے پکڑ کر پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے کہتا "پاگل نہ بنو۔ بھلا ایسی بھی باتیں کیا کرتے ہیں۔ تم نے میرے گناہوں کو ایک ہی رات میں اپنے مقدس اشکوں سے دھو ڈالا ہے... اچھا اب بتاؤ کتنی دیر باقی ہے؟"

مالتی آنکھیں زمین پر گاڑ دیتی اور آہستہ سے کہتی "دو مہینے۔"

سیٹھ پھر پوچھتا "اگر کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو کہہ دیا کرو یہ گھر تمہارا ہی ہے۔" لڑکی سرنگوں پُرنم آنکھوں سے کہتی "مجھے زندگی مل گئی ہے۔ زندگی کی ہر دولت مل گئی ہے۔ پہلے کو نسے آپ کے احسان کم ہیں... اس بھوکی روح کو خوراک دی ہے۔ اب مجھے اور کچھ نہیں چاہیئے۔"

مالتی کے ساتھ پہلی ملاقات کی رات کے چند ایک آنسوؤں نے سیٹھ کا مکدر دل دھو کر صاف کر دیا۔ جوں جوں مالتی کے ماں بننے کے دن نزدیک آتے گئے دو نو پھولے نہ سماتے تھے... اب تیس دن باقی... پچیس دن... اب صرف بیس دن رہ گئے۔

دن نزدیک آتے گئے مگر سیٹھ کو کشمیر سے واپس لوٹنا پڑا۔ ادھر اس کی ایک مل کے مزدوروں نے ہڑتال کر دی تھی۔ مگر اس میں آتنی ہمت نہ تھی کہ وہ مالتی کو اپنے وہاں سے رخصت ہونے کی خبر دے سکتا۔ وہ جانتا تھا کہ اُسے سخت صدمہ ہوگا۔ اُس نے بہتر یہی سمجھا کہ مالتی سے کچھ کہے بغیر ہی کشمیر کو الوداع کہہ دے۔ آخر وہ ایک صبح مالتی کو بے خبر چھوڑ کر کشمیر سے چل دیا۔ مگر کسی نے مالتی سے جا کر کہہ دیا کہ "تیرا سیٹھ تو تجھے چھوڑ کر جا رہا ہے" وہ دیوانہ وار چلائی "نہیں! نہیں! یہ ممکن نہیں... وہ نہیں جا سکتا... وہ تمام دُنیا کو چھوڑ سکتا ہے... مجھے چھوڑ سکتا ہے مگر ایک ننھی سی جان کو نہیں چھوڑ سکتا۔"

مالتی سیٹھ کے بنگلہ کی طرف بھاگی۔ بنگلہ کے باہر والے پھاٹک پر تالہ دیکھ کر اُس کے منہ سے بیساختہ ایک چیخ نکلی اور آنسو بہہ نکلے۔ وہ اپنے محسن کو اس طرح بغیر نیاز حاصل کئے جانے دیتی؟ بے قابو ہو کر وہ سیٹھ کو پکارتی ہوئی پہاڑ کی دشوار پگڈنڈی پر بھاگنے لگی۔ "سیٹھ نہ جاؤ۔ میں کہتی ہوں نہ جاؤ۔ تمہاری مالتی تمہیں کہتی ہے نہ جاؤ... سیٹھ نہ جاؤ..." محبت کے بھوکے ہونٹ خشک ہو گئے مگر قدم تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ مالتی ایسے جا رہی تھی جیسے کوئی مقناطیس اسے کھینچ رہا تھا۔ دُور سے اُسے سیٹھ دکھائی دیا۔ خوشی سے آنکھوں میں پانی کے چشمے اُمڈ آئے مسرت کی لہر گویا جسم کے ہر حصہ میں دوڑ گئی۔ اُس نے تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے ہاتھ اُٹھا کر سیٹھ کو آواز دی کہ اسی لمحہ پاؤں ایک پتھر سے ٹکرایا اور وہ منہ کے بل زمین پر آگری۔ منہ سے چیخ نکلی اور پہاڑیوں میں گونج کر رہ گئی سیٹھ آواز سنتے ہی مالتی کی طرف لپکا۔ وہ پتھریلی چٹانوں میں خون سے لت پت پڑی تھی۔ اُس کا سر اپنے زانو پر

دیال سنگھ کالج

کرنال

مشترکہ پنجاب میں نصف صدی اور کرنال (ہریانہ) میں چوتھائی صدی سے اپنی شاندار روایات کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ دیال سنگھ کالج کرنال میں طلباء کو ہمیشہ ڈسپلن، قومی یکجہتی اور مُلک کی ہر طرح سے حفاظت کرنے کی تلقین کی جاتی ہے اور اُنھیں ایک اچھا شہری اور ایک ذمہ دار ہندوستانی بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اہلِ کرنال اور گرد و نواح کے طلباء کے لئے دیال سنگھ کالج ایک نعمت ہے اپنے بچوں کو اگر آپ اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ساتھ ایک اچھا شہری بنانا چاہتے ہیں۔ تو دیال سنگھ کالج کرنال کی خدمات سے فائدہ اُٹھائیے۔

دیال سنگھ کالج کرنال (ہریانہ)

اراکین منتظمہ کمیٹی

JANUARY 1978 Phone : 278880
THE SHAN-E-HIND MONTHLY, NEW DELHI-110002
Regd. with the Registrar of News Paper at R. No. 644/57

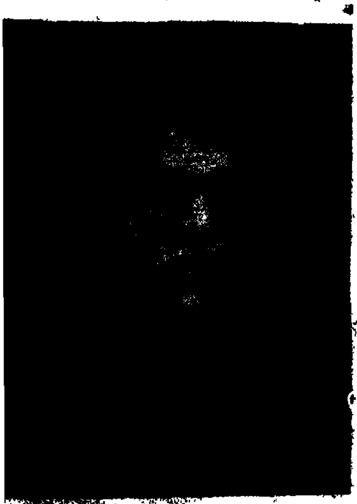


Only Title Printed at Pilot Press, Delhi-110006









FAIZ RATLAMI



ٹیلیفون نمبر ۲۷۸۸۸۸ | رجسٹرار آف نیوز پیپر آف انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۵۷/ ۶۴۴ | رجسٹرڈ نمبر ۵۳۰۰

ایڈیٹر
سرور تونسوی

ماھنامہ

شانِ ھند دھلی

قیمت سالانہ
بارہ روپے
فی پرچہ
ایک روپیہ پچیس پیسے

جلد نمبر ۳۹ | فروری ۱۹۷۸ء | شمارہ نمبر ۲

فرمودات عالیہ

آیا نہ ہو رقیب کے گھر وہ خدا کرے
اس نقشِ پا میں شان اسی نقشِ پا کی ہے

بام و در مطلعِ انوار نظر آتے ہیں
اُن کے آنے کے سے آثار نظر آتے ہیں

تُو نے خنجر کر لیا زیبِ کمر میرے لئے
اب وبالِ دوش ہے یہ میرا سر میرے لئے

اہلِ محفل چاہتے ہیں شمع روشن تا حشر
شمع کہتی ہے قیامت ہے سحر میرے لئے

چلو ایسے میں چل کر آج ہاتھوں ہاتھ لے آئیں
حیاتِ جاودانی بٹ رہی ہے کوئے قاتل میں

حضرت سید صولت حسین صولت ٹونکی مرحوم

ودیا پرکاش سرور تونسوی پرنٹر پبلشر نے خواجہ پریس جامع مسجد دہلی میں چھپا کر دفتر شان ہند فلیٹ ۵ انصاری مارکیٹ [illegible] سے شائع کیا

افکار و واقعات

اُردو رسائل و جرائد کی تعدادِ اشاعت میں غلط بیانی

قابل توجہ پریس رجسٹرار و محکمہ ڈی اے وی پی

ایڈیٹر شان ہند نے سردار دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر "ریاست" کی کفش برداری کیا جہاں ہمیشہ مقروض رہنا، برانڈی کو بطور دوا چکھ لینا، فضول خرچی۔ اور دشمن کو معاف نہ کرنا وغیرہ کسی حد تک بری باتیں سیکھیں وہاں اس نے یہ بھی سیکھا کہ سچائی ہر حال میں فتح پاتی ہے۔ فراخ دلی اور رحم دلی سے بڑے مفید نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ ظلم کے خلاف آواز بلند کرنا ایماندار ہونے کی نشانی ہے۔ دیانت داری سے ساکھ بڑھتی ہے۔ اپنے آپ کو جب تک خطرے میں نہ ڈالا جائے مقابلے کی ہمت پیدا نہیں ہوتی۔ جہاں تک ہو سکے کسی سے دشمنی نہ کرے۔ دوست کا ساتھ دینا خصوصاً مصیبت میں اپنا ایمان سمجھنا چاہیئے۔ ضرورت مند کی ضرورت (اگر اس کی استطاعت ہو) پوری کی جائے۔ ایسے بیمار کو دوائی لے کر دینا جو دوا خرید نہ سکتا ہو۔ ایسے طالب علم کو کتابیں خرید کر دینا جو کتابیں خرید نہ سکتا ہو، بھوکے کو کھانا کھلانا وغیرہ۔ سب سے بڑی عبادت ہے اور اپنے اخبار کی اشاعت کبھی غلط نہ بتانا اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے کوئی بھی جھٹلا نہیں سکتا کہ شان ہند کی تعدادِ اشاعت میں کبھی غلط بیانی سے کام نہیں لیا گیا۔ پچھلے چار سالوں میں دو مرتبہ پریس رجسٹرار کے دفتر کے افسرانِ متعلقہ نے بغیر کسی اطلاع کے شان ہند کی اشاعت کی تحقیقات کی مگر کئی دنوں کی ہر ممکن چھان بین کے باوجود متعلقہ افسران یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ ایک کاپی تک کی غلط بیانی نہیں کی گئی ہے۔ حالانکہ ایمرجنسی کا زمانہ تھا اور پریس رجسٹرار کے ان افسران کے خلاف لکھا گیا تھا کہ یہ اپنا فرض نبھانے میں نہ جانے کیوں خاموش ہیں جبکہ اکثر و بیشتر اخبارات غلط اشاعت بتا کر سرکاری روپیہ کو ناجائز طور پر حاصل کر رہے ہیں اور ان افسران نے شان ہند کو نشانہ بنانا چاہا اور جب ان کی کئی روز کی تحقیقات کے باوجود کوئی غلط بیانی ثابت نہ ہو سکی تو انہی افسران نے بتایا کہ ہم تو اسی خیال میں آئے تھے کہ شان کو ہی پہلا نشانہ بنائیں کیونکہ آج تک یہ محکمہ کسی بھی اخبار یا رسالے کے خلاف اشاعت کے بارے میں غلط بیانی کرنے کا قانونی حق استعمال نہ کر سکا تھا۔

محکمہ ڈی۔ اے۔ وی پی نے شان ہند میں سرکاری اشتہارات دیئے جانے کے جو نرخ مقرر کئے اس کی اطلاع جب ہمیں موصول ہوئی تو اس وقت شان ہند کی تین صد اشاعت کم ہو چکی تھی لہٰذا اسی وقت بذریعہ رجسٹرڈ لیٹر محکمہ کو اطلاع دی گئی کہ آپ نے شان ہند کے نئے نرخ اشتہارات جس تعدادِ اشاعت پر مقرر کئے ہیں۔ اب اس میں تین صد کی کمی ہو گئی ہے۔ آپ کا دل چاہے تو نرخوں میں کمی کر دیجئے۔ مگر اس وقت کے میڈیا ایگزیکٹو سردار ۔۔۔ نام سنگھ نے ٹیلیفون پر ایڈیٹر شان ہند سے کہا کہ آپ پہلے اخبار نویس ہیں جنہوں نے ایسی اطلاع دی ہے ورنہ یہاں تو جو اخبار نویس آتا ہے وہی کہتا ہے کہ اس کا اخبار سب سے زیادہ چھپتا ہے۔ لہٰذا آپ کی اس سچائی پر ہم شان ہند کے نرخ اشتہارات وہی رکھیں گے جن کی منظوری دی جا چکی ہے۔

انگریزی ہندی اور دوسرے اخبارات و رسائل میں بھی یہ بدعت یقیناً ہوگی مگر اردو کے کم و بیش اسی نوے فیصد اخبارات اپنی اشاعت غلط بتانے میں کوئی عیب نہیں سمجھتے۔ اور تو اور پہلے پریس کمیشن کے ہاں شہادت دیتے ہوئے سردار دیوان سنگھ نے اپنی شہادت میں یہ ثبوت پیش کیا تھا کہ ایک ہفت روزہ نے اپنی تعدادِ اشاعت کے ثبوت میں ایسے چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ کا سرٹیفکٹ پیش کر رکھا تھا جس کا اس دنیا میں وجود ہی نہیں تھا اور دہلی کے ہی ایک مشہور مذہبی رسالے کی یہ چوری ایسے ہی پکڑی گئی تھی کہ ڈاک خانہ کے وی پی جنرل میں اس نے پانچ کو ایک صفر لگا کر پچاس اور دس کو ایک صفر بڑھا کر ایک سو بنا کر اپنی غلط اشاعت کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔

ہم نے محکمہ اطلاعات و نشریات کے مرکزی وزیر جناب ایل۔ کے۔ اڈوانی صاحب کی خدمت میں یہ گزارش کی تھی کہ آپ نے پالیسی تو مرتب کر دی ہے مگر آپ نے اپنی پالیسی میں یہ بات شامل کیوں نہیں کی کہ غلط اشاعت بتانے والے اخبارات کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا محض ڈرا دھمکا دینا ہی کافی نہیں ہے۔

کیا غضب ہے کہ دہلی کا ایک ماہنامہ کی اشاعت پریس رجسٹرار کی رپورٹ میں اکیس ہزار سے زائد (تعجب) ہے جبکہ وہ ایک ہزار بھی نہیں چھپتا۔ اس طرح اسی نوے فیصد اخبارات و رسائل نے محض سرکاری اشتہارات کے حصول اور پرائیویٹ سیکٹر کے اشتہارات حاصل کرنے کے لئے اپنی تعداد اشاعت کو غلط بتانے میں ہی عافیت سمجھے ہوئے ہیں۔

جب نیوز پرنٹ کا غذ کا بلیک تھی تو اکثر اخبارات و رسائل کے مالکان نے اپنے اخبارات و رسائل کی تعداد غلط بتا کر کاغذ کا زیادہ کوٹا لے کر بلیک میں فروخت کیا اور اس غلط اشاعت کے مطابق سرکاری اشتہارات کے نرخ بھی زیادہ لئے مگر جونہی نیوز پرنٹ کاغذ پر بلیک ختم ہوئی تو یار لوگوں نے کوٹے کا کاغذ اٹھایا تک نہیں۔ مگر سرکاری اشتہارات سے وہ اب بھی ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ۲۸ فروری تک ہر اخبار اور رسالہ کو اپنی سال بھر کی اشاعت کے اعداد و شمار کی اطلاع پریس رجسٹرار کو اور اگر اسے ڈی سے ڈی۔ وی۔ پی کے اشتہارات ملتے ہوں تو محکمہ ڈی۔ اے۔ وی۔ پی کو بھی بہم پہنچانی ہوتی ہے۔

کیا ہی اچھا ہو کہ اس مرتبہ اخبارات و رسائل کے اشاعتی اعداد و شمار کا محاسبہ ایک اسپیشل اسٹاف کے ذریعہ کرایا جائے تاکہ اڈوانی صاحب کو پتہ چل سکے کہ جھوٹ اور غلط بیانی کرنے والے اخبارات و رسائل کس طرح سرکاری روپیہ ناجائز طور پر وصول کر رہے ہیں اور جو بیچارے سچائی کو اپنا اصول بنائے ہوئے ہیں وہ جنتا حکومت کے ہاتھوں نقصان میں ہیں جبکہ جنتا حکومت کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ سچائی کی طرف دار ہے۔ کیا ستم ظریفی ہے کہ عوام کو راستہ دکھانے والے اخبار نویس جو اپنے آپ کو ایک الگ ہی مخلوق سمجھتے ہیں محض غلط طور پر سرکاری روپیہ وصول کرنے کے لئے اپنے اخبارات کی تعدادِ اشاعت غلط بتاتے ہیں۔

کیا ہی اچھا ہو کہ پارلیمنٹ میں یہ قانون پاس کر دیا جائے کہ کسی بھی اخبار یا رسالے کی تعداد اشاعت غلط ثابت ہو جانے پر کم از کم ایک سال کی سزائے قید دی جائے گی اور جو سرکاری روپیہ اس غلط بیانی سے ناجائز طور پر وصول کیا گیا ہو وہ بطور جرمانہ وصول کیا جائے گا۔ ہم ممبرانِ پارلیمنٹ سے اس سلسلہ میں ملاقات کر رہے ہیں کہ وہ پارلیمنٹ میں ایسا قانون پاس کئے جانے کے بارے میں حکومت کو مجبور کریں۔

ہم اپنے قانونی مشیر سے مشورہ کر رہے ہیں کہ کیا چند ایسے اخبارات و رسائل کے خلاف ہائی کورٹ میں شکایت دائر کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنی اشاعت غلط بتا کر حکومت سے ناجائز طور پر روپیہ اشتہارات کی اجرت کی شکل میں وصول کر رہے ہیں۔ اگر کوئی ایسا قانونی جواز نکل آیا تو ہم فی الحال امتحاناً صرف ایک صدر رسائل و جرائد کے بارے میں یہ سلسلہ جنبانی کریں گے۔

سرکاری اشتہارات کے لئے اردو اخبارات کی تعداد اشاعت پانچ صد مقرر کی جائے۔

سرکاری اشتہارات کے لئے جو نئی پالیسی ترتیب دی گئی ہے

اس کی رُو سے اُردو کے رسائل واخبارات کے لئے یہ شرط قرار دی گئی ہے کہ اگر اُن کی فروختگی کی اشاعت کم از کم ایک ہزار ہے، تو انہیں سرکاری اشتہارات دیئے جا سکیں گے۔
ایک طرف، تو حکومت یہ کہتی ہے کہ ملک میں اردو پڑھنے والوں کی تعداد سات فیصد ہے اور دوسری طرف وہ یہ امید رکھتی ہے کہ اُردو کے رسائل و جرائد ایک ایک ہزار کی تعداد میں فروخت ہوتے ہوں گے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اُردو کے کچھ روزناموں ۔ شمع گروپ کے رسائل اور دیگر چند ایک رسائل و جرائد کو چھوڑ کر باقی اردو کا کوئی ایسا رسالہ یا اخبار نہیں ہے جو ایک ہزار کی تعداد میں فروخت ہوتا ہو۔ ہاں اشتہار حاصل کرنے کے لئے فرضی طور پر حساب کتاب ایسا بنا رکھا ہو تو دوسری بات ہے۔

کانگریس حکومت نے اس جھوٹ فریب اور ریاکاری کو ختم کرنے کے لئے یہ تعداد پانچ صد تک کر دی تھی جس سے چھوٹے اخبارات و رسائل کو سرکاری اشتہارات ملنے شروع ہو گئے تھے۔ مگر جنتا سرکار نے پھر حسب سابق تبدیلی کر کے اکثر و بیشتر اخبارات کو ختم کرنے کا خطرناک قدم اٹھایا ہے۔ بہت سے اخبارات بند ہو گئے۔ کئی دم توڑ رہے ہیں۔ اس لئے جناب اڈوانی صاحب سے یہ جائز طور پر مطالبہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر وہ واقعی اُردو کے چھوٹے اخباروں کو زندہ دیکھنا چاہتے ہیں تو اپنی اس پالیسی میں یہ تبدیلی فرمائیں اور کم از کم تعدادِ فروختگی پانچ صد کر دیں۔

اُردو اکاڈمی راجستھان

ساہتیہ اکاڈمی سنگم، اُودے پور نے راجستھانی اردو شعراء ادیبوں اور صحافیوں کو تحریری طور پر اطلاع دی ہے کہ چونکہ اب اُردو اکاڈمی راجستھان کے انعقاد کا اعلان ہو چکا ہے لہذا ساہتیہ اکاڈمی راجستھان سے اُردو کا کوئی تعلق نہیں رہا۔ نیز ساہتیہ اکاڈمی کا اُردو سہ ماہی "آر کن نخلستان" کی اشاعت بھی بند کر دی گئی ہے۔

نئی حکومت آجانے سے اُردو اکاڈمی راجستھان کے انعقاد کے بارے میں وہ ہماہمی دب کر رہ گئی ہے جو اس سے پہلے سننے میں آرہی تھی۔ جناب رام کشور ویاس جنہیں اکاڈمی کا چیرمین مقرر کیا گیا تھا وہ اب آئی کانگریس کے سرگرم رُکن ہو چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ویاس صاحب ایسے آزمودہ کار اور اُردو دوست کی سرپرستی سے اب اُردو اکاڈمی فائدہ نہ اٹھا سکے گی۔

ان حالات میں سارے راجستھان میں ایک ہی ہستی پر نظر جاتی ہے جو اس اہم ذمہ داری کو نہایت خوش اسلوبی، حقیقت پسندی اور ذمہ داری کے ساتھ نبھا سکتی ہے اور وہ ہیں جناب اچاریہ دھرمیندر ناتھ صاحب جو راجستھان تو کیا ملک میں فارسی اُردو ہندی اور سنسکرت میں ٹھوس ادبی علمی کام کرنے میں اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ گلستان سعدی کے ہندی اور سنسکرت منظوم ترجمہ نے انہیں اُن علمی و ادبی ہستیوں کی صفِ اول میں لا کھڑا کیا ہے کہ جب تک فارسی اور سنسکرت اور ہندی زبانیں بولی جاتی رہیں گی آچاریہ دھرمیندر ناتھ جی کا نام زندہ رہے گا۔ اچاریہ جی کی اس خالص ادبی اور علمی خدمت کو اعلیٰ حضرت شہنشاہ ایران نے بھی سراہا ہے اور اب اچاریہ جی فردوسی کے شاہنامہ اور دیوان حافظ کا ہندی اور سنسکرت میں منظوم ترجمہ کر رہے ہیں جس کے لئے اعلیٰ حضرت شاہ ایران نے پسندیدگی کا اظہار فرمایا ہے اس سے پہلے اچاریہ جی شری گورو گوبند سنگھ جی کی مشہور زمان تصنیف "ظفر نامہ" کا بھی ہندی ۔ سنسکرت اور انگریزی میں منظوم ترجمہ فرما چکے ہیں اور جدید فارسی اُن کی تازہ ترین ایسی تصنیف ہے کہ جس پر ہندی اور فارسی دونوں زبانیں اچاریہ جی کی مرہونِ منت رہیں گی۔ اس کے علاوہ راجستھان کا ہر ہندو مسلمان، سکھ، عیسائی، جینی، ہریجن اچاریہ جی کے اخلاق، حُسنِ سلوک، خدمتِ عوام اور غیر متعصبانہ رویہ کا مداح ہے۔

لہٰذا اردو اکاڈمی راجستھان کی چیرمین شپ کے لئے اس وقت اگر کوئی ہستی موزوں، حق دار اور اُردو کی صحیح معنوں میں خدمت کرنے والی راجستھان میں موجود ہے تو وہ ہے آچاریہ دھرمیندر ناتھ جی۔

چنانچہ ہم راجستھان کے چیف منسٹر جناب بھیرون سنگھ شیخاوت کی خدمت میں یہ تجویز رکھتے ہیں کہ وہ اس ذمہ داری کو سنبھالنے کیلئے اچاریہ جی سے کہیں کیونکہ اگر وہ اس ذمہ داری کو قبول فرمالیں تو اس جہیز میں غضب کو چار چاند لگ جائیں گے۔ ورنہ اچاریہ جی نے تو عمر بھر انتہائی خاموشی کے ساتھ علمی ادبی کام ایک کونے میں بیٹھ کر کیا ہے۔ انہیں نام و نمود کی خواہش نہ پہلے تھی اور نہ اب ہے۔ اگر وہ اس ذمہ داری کو قبول فرمالیں تو یہ اردو کی خوش قسمتی ہے۔ راجستھان کے ہر اردو داں کا فرض ہے کہ وہ راجستھان کے چیف منسٹر کو بذریعہ خطوط اور تار یہ گذارش کرے کہ اردو اکاڈمی راجستھان کی یہ ذمہ داری اچاریہ جی کو سونپی جائے تبھی راجستھان میں اردو کے سلسلے میں غیر جانبدارانہ طور پر کام ہوسکے گا۔ دہلی کے اردو شعرا۔ ادیب۔ صحافی اور اردو پرست حضرات بھی راجستھان کے چیف منسٹر صاحب لکھ رہے ہیں کہ اردو اکاڈمی راجستھان کی چیرمین شپ کے لئے اچاریہ جی مہندر ناتھ ایک موزوں اور مناسب شخصیت ہیں۔

راجستھان میں مسلم آبادی کا تناسب موزوں حد تک ہے۔ اس لئے راجستھان میں اردو کے تحفظ کے لئے سرکاری طور پر ہر ذمہ داری کو نہایت دیکھ بھال کر نبھانا چاہیئے۔ علمی۔ ادبی اور اردو کے تحفظ کے علاوہ اس کا سیاسی طور پر بھی اہم رول ہے۔ لہذا اردو اکاڈمی کی سکریٹری شپ کے لئے کوئی ایسا موزوں انتخاب ہونا چاہیئے۔ جو اس کام کو خوش اسلوبی سے نبھا سکے اور راجستھان میں اردو کو کس طرح محفوظ رکھا جاسکتا ہے۔ اُسے اس کا تجربہ ہو اور وہ سیاسی طور پر بھی اثر و رسوخ کا مالک اور علمی و ادبی طور پر بھی اس کا اہل ہو۔ راجستھان کے اردو داں طبقہ کے علاوہ اردو کے شعراء ادیبوں اور صحافیوں سے بھی اس سلسلے میں مشورہ کرلیا جائے تو یقینی طور پر جنتا حکومت کی مقبولیت کا باعث ہوگا۔ یقین ہے کہ راجستھان کے چیف منسٹر اردو اکامی کے چیرمین شپ کے لئے مندرجہ بالا معروضات کو دھیان میں رکھیں گے۔

ہندوستانی آکسفورڈ علی گڑھ یونیورسٹی پر مفاد پرستوں کا منحوس سایہ

برصغیر ہند و پاک میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ڈسپلن طلبا میں اخوت اور ہم آہنگی۔ اساتذہ کرام کی وقعت اور عزت۔ علی گڑھ کو آکسفورڈ بنائے ہوئے تھی اور سر سید کے خواب کی تعبیر دنیا کے سامنے موجود ہے۔

مگر علی گڑھ یونیورسٹی کے حالیہ واقعات تصویر محل کا ہنگامہ، ٹرکوں کو نذر آتش کرنا۔ شمشاد مارکیٹ پر ہنگامہ وغیرہ نے جہاں علی گڑھ کی تاریخ کو داغدار کیا ہے وہاں یونیورسٹی کی صد سالہ شاندار روایات کو چشم زدن میں ملک کی اُن یونیورسٹیوں یا کالجوں کی صف میں لا کھڑا کیا ہے جہاں آئے دن ہنگامے برپا ہوتے رہتے ہیں اور جنہیں علم گاہیں کہتے ہوئے علم کی توہین ہوتی ہے۔

دراصل فرقہ پرست اور ذاتی مفاد پرست کوئی بھی موقع اپنے ہاتھ سے نہیں جانے دیتے اور یہی وہ اہم کردار مصروف کار ہیں اور اس شاندار یونیورسٹی کی تابناک روایات کو بٹہ لگانے پر تلے ہوئے ہیں۔

طالب علم بیشک یونیورسٹی کے طالب علم ہونے کے ناطے سمجھدار کہے جاسکتے ہیں مگر پھر بھی اُن میں عمر کے لحاظ کی وجہ سے لاابالی پن کے باعث سوجھ بوجھ نہیں ہوتی کہ مفاد پرستوں اور فرقہ پرستوں کے عیارانہ ہتھکنڈوں کو سمجھ سکیں اور جب فرقہ پرستی اساتذہ کرام کو بھی اپنے دامن میں لپیٹ لے تو یہ معاملہ اور بھی خطرناک صورت اختیار کرلیتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض اساتذہ کرام اُن فرقہ پرستوں کے ساتھ مل کر ان ہنگاموں کو ہوا دیتے رہتے ہیں جو کہ یونیورسٹی کو اپنی جاگیر سمجھے ہوئے ہیں اور کیا ستم ظریفی ہے کہ یہ فرقہ پرست اور ہنگامہ کو جنم دینے والے خود چند مسلمان اساتذہ اور طالب علم ہیں۔ یہ غیر ذمہ دار اساتذہ درس و تدریس کا عملی فرض نبھانے یا علمی ریسرچ میں کوئی اہم مقام حاصل

رنے یا کسی ادبی، علمی، تاریخی تصنیف و تالیف کرنے کی بجائے ن خرافات میں دلچسپی رکھتے ہیں جن کا مظاہرہ پچھلے دنوں ہوا۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ کرام اسٹاف کلب یں رات کے تین تین بجے تک فلیش جو جوئے کا شریفانہ اور یفائینڈ نام ہے، کھیلتے ہیں۔ علی گڑھ میں گزشتہ فرقہ وارانہ فسادات میں شہر کے عوام جب پریشان تھے اور اُن کی راتوں کی نیندیں حرام تھیں تو یہ اساتذہ کرام یونیورسٹی اسٹاف کلب میں رات گئے تک فلیش سے اپنا دل بہلاتے رہتے تھے۔ اب طالب علموں کو خود اور ان کے والدین کے سوچنے کا مقام ہے کہ اگر اساتذہ حضرات رات گئے تک تاش کے پتوں سے دل بہلاتے رہیں گے تو صبح کو وہ کلاسوں کو کیا پڑھا سکیں گے؟ یونیورسٹی اسٹاف کلب میں اساتذہ کا فلیش کے علاوہ دوسرا دلچسپ مشغلہ شطرنج کھیلنا ہے۔ جس طرح پرانے دنوں میں راجے شطرنج کے مہروں کی طرح اپنے عوام کو استعمال کرتے تھے۔ اسی طرح یہ اساتذہ کرام (کرام نہیں)، یونیورسٹی کی تعلیمی زندگی کو شطرنج کی بساط بنائے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے کی ٹانگ گھسیٹنے میں لگے ہوئے ہیں۔

یہاں کمیونزم اکثر اساتذہ کی رگ و پے میں یہاں تک اثر کر چکا ہے کہ انہیں نماز۔ روزے سے دور کا بھی واسطہ نہیں رہا۔ یہ عہد جدید کے "مفکرانِ اسلام" جس جدید انداز سے اسلام کی جڑیں کھودنے میں لگے ہوئے ہیں اس کا فکر ہر ذی ہوش کو ہونا چاہیے۔ یہ حضرات برملا کہتے ہیں کہ ہم پرانے اسلام اور مذہب کو جدیدیت میں بدل رہے ہیں اور دراصل ہم ہی اسلام کے علمبردار ہیں۔ یہی استاذ فرقہ پرستوں کی شہہ پر معصوم طلبا کو یونیورسٹی کے انتظامیہ کے خلاف اکساتے ہیں جس کے نتیجے میں حالیہ واقعات رونما ہوئے۔ دراصل فرقہ پرستوں کا مقصد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ کے ترمیمی بل میں رکاوٹیں پیدا کرنا ہے اور اس بدترین مطلب پرستی کیلئے یہ لوگ بڑے سے بڑا قدم بھی اٹھا سکتے ہیں

یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب خسرو صاحب جو کہ یونیورسٹی ترمیمی بل کے دلی طور پر حامی ہیں۔ یہ لوگ چاہتے ہیں یونیورسٹی میں ایسے حالات پیدا کر دیئے جائیں کہ خسرو صاحب از خود یونیورسٹی سے چلے جائیں۔ اقلیتی گروپ کے طلبا اور کمیونسٹ نظریہ کے اساتذہ کا پاس شدہ ریزولیشن ہی ان لوگوں کی دلی کیفیت کا آئینہ دار ہے۔ جس میں ان لوگوں نے موجودہ وائس چانسلر کے خلاف کمیشن بٹھانے کی نامناسب مانگ کی ہے۔ جناب خسرو گزشتہ تین سال سے وائس چانسلر ہیں۔ ایسے کمیشن کی مانگ ان تین سالوں میں کیوں نہیں کی گئی اور اب یکایک کون سے ایسے واقعات رونما ہو گئے کہ خسرو صاحب موردِ الزام ٹھہرائے جانے لگے؟ دراصل اچانک یہ حالیہ واقعات جان بوجھ کر رونما کرائے گئے تاکہ ایسا جواز پیدا کیا جا سکے۔

طلبا اور ان کے والدین کے لئے یہ لمحۂ فکریہ ہے کہ آیا وہ سر سید احمد کی علی گڑھ یونیورسٹی کو اُن کے خواب کی تعبیر بنائے رکھنا چاہتے ہیں یا فرقہ پرست عناصر اور کمیونسٹ عقیدہ کے اساتذہ کی چالوں کو کامیاب بنانا چاہتے ہیں۔ یہ بات جذبات سے بالاتر ہو کر عقلمندی کا تقاضا کرتی ہے۔

یاد رکھئے خسرو صاحب کا علی گڑھ یونیورسٹی کا وائس چانسلر ہونا یونیورسٹی کے لئے باعثِ عزت ہے۔ یہ تمام ہلڑ بازی محض وائس چانسلر کے ترقی پسندانہ اقدامات کو ختم کرنے کے علاوہ حکومت کو یہ ترمیمی بل لوک سبھا میں پیش نہ کر دینے کے لئے کی گئی ہے۔

اس لئے ہر وہ فرد جو علی گڑھ یونیورسٹی کو سر سید کے خوابوں کی تعبیر دیکھنا چاہتا ہے۔ اسے خسرو صاحب کا ساتھ دینا چاہیئے۔

(صفحہ ۲ سے آگے)

جب سحر چپ ہو ہنسا لو ہم کو
جب اندھیرا ہو جلا لو ہم کو (دلشر بدر)

یہ مصرع کاش نقش ہر در و دیوار ہو جائے
جسے جینا ہو مرنے کے لیے تیار ہو جائے (جگر)

نقط نقط برق خاطف بن کے ضو دینے لگے
حرف گل جائیں لب گفتار لو دینے لگے (جوش)

بہ کوئے یار باندازِ محرمانہ گزر

(سرور تونسوی)

اولین جشنِ جمہوریت ۱۹۴۹ء میں لال قلعہ میں تین دن تک منایا گیا۔ یہ جشن اپنی نوعیت کا ایک یادگاری جشن تھا۔ اس جشنِ جمہوریت کے مشاعرہ میں مرحوم پنڈت جواہر لال نہرو، ان کی ہمشیرہ محترمہ مسز وجے لکسمی پنڈت، مسز پنڈت کی بھانجی ریٹا پنڈت بھی تشریف لائے تھے۔ اس جشن کی مفصل رُوداد راقم الحروف نے لکھی جو اُس وقت کے ہی نہیں بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اُردو صحافت میں اپنا انفرادی مقام رکھنے والے ہفت روزہ ریاست کی تین مسلسل اشاعتوں میں شائع ہوئی۔ ریاست کے مدیر بے مثال سردار دیوان سنگھ مفتون مرحوم ان دنوں مسٹر شنکر لال (آف دہلی کلاتھ ملز مرحوم) اور جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر سے ناخوش تھے۔ سردار صاحب کی سرشت میں یہ خاصیت تھی کہ وہ اپنے کسی بھی اصلی یا مفروضہ دشمن کے دوستوں کو بھی اپنا دشمن سمجھتے تھے۔ لہٰذا مجھے یہ ہدایت کی گئی کہ جشنِ جمہوریت کی رُوداد میں کسی کی رعایت نہ کی جائے۔ چنانچہ یہ رُوداد اس انداز سے لکھی گئی کہ رُوداد نگاری میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ مجھ پر کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کے احسانات تھے اور کرنا خدا کا یہ ہوا کہ اس جشنِ جمہوریت کے مشاعرہ کی رُوداد میں کنور صاحب، مسٹر شنکر لال صاحب اور ساحر ہوشیارپوری صاحب اور دیگر کئی سرکردہ حضرات کے بارے میں ایسے ایسے ریمارکس تھے کہ جسے یار لوگوں نے مزے لے لے کر پڑھا۔ سردار صاحب نے میری گزارش پر یہ کرم ضرور فرمایا کہ یہ رُوداد میرے نام سے شائع نہیں کی۔ مگر جب انہیں ملک کے ہر حصے سے اس رُوداد کی پسندیدگی کے بارے میں سینکڑوں خطوط موصول ہوئے تو انہوں نے 'ریاست' میں اعلان فرما دیا کہ یہ رُوداد ... تو سرور تونسوی ایڈیٹر شان ہند دہلی کی لکھی ہوئی ہے۔ سردار صاحب نے یہ تمام تعریفی خطوط میرے پاس بھجوا دیئے جنہیں پڑھتے ہوئے ایک خاص قسم کی خوشی محسوس ہو رہی تھی مگر اس کے ساتھ ہی میرا خون خشک ہو رہا تھا کہ کیسے کیسے لوگ سرور تونسوی کے دشمن بن چکے تھے۔ اُن دنوں اس آفتِ جان شاعرہ اور جناب ساحر ہوشیارپوری کے تعلقات بادی النظر میں شکوک کی حدوں سے بھی آگے سمجھے جاتے تھے۔ ویسے شعرائے کرام ایسی باتوں میں غلط قافیے ملانے میں اپنی مثال نہیں رکھتے۔ تاہم ساحر ہوشیارپوری اور ان صاحبہ کے بے تکلفانہ تعلقات تھے اُن سے ہر صاحبِ نظر یہی اندازہ لگانے میں حق بجانب تھا جو عام طور پر مشہور تھا۔ اس مشاعرہ کے بعد ساحر صاحب کاروباری سلسلے میں کلکتہ تشریف لے گئے۔ دو سال کے بعد اُن کا مکتوب گرامی ایڈیٹر شانِ ہند کو ملا کہ سرور تونسوی مشاعروں کی رُوداد لکھتے وقت دیوان سنگھی سیاست کا شکار ہو چکا ہے لہٰذا جب تک میں آپ سے ملاقات نہ کر لوں یہ سلسلۂ رُوداد نگاری ملتوی رکھا جائے۔ ساحر صاحب سے اُس وقت تک یونہی واجبی سے تعلقات تھے۔ مگر انہوں نے جس ہمدردانہ انداز میں خط لکھا تھا اُس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے دل میں سرور تونسوی کے لئے واقعی دوستانہ بلکہ برادرانہ جذبہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ ساحر صاحب کے حکم کی تعمیل کی گئی۔ دو ماہ بعد ساحر صاحب کا فون آیا کہ وہ دہلی تشریف لے آئے ہیں اور کراؤن ہوٹل فتحپوری میں قیام پذیر ہیں۔ لہٰذا شام کے چھ بجے کراؤن ہوٹل میں پہنچ جاؤں۔ رات کا کھانا اُن کے ساتھ کھانا ہوگا۔

اُن دنوں ساحر ہوشیارپوری صبح کا ناشتہ۔ دوپہر کا کھانا۔ رات کا ڈنر شراب کے بغیر بے مزہ سمجھتے تھے چنانچہ کراؤن ہوٹل میں پہنچتے ہی بیئر سے معاملہ شروع ہوا اور اس کے بعد وہسکی۔ ہندوستان کی اُردو صحافت۔ اُردو شاعری اور مشاعروں کی رُوداد پر جی بھر کر تبادلۂ خیال ہوا۔

ساحر ہوشیارپوری، جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر سے متعلق ایڈیٹر شانِ ہند کو تفصیل سے بتا رہے تھے کہ دوستی۔ فراخدلی مشکل کے وقت کام آنا۔ ایسی خوبیوں کا دوسرا نام کنور مہندر سنگھ بیدی سحر ہے کہ اتنے میں یکایک کمرے کا دروازہ اس انداز سے کھلا کہ جیسے آندھی کے زوردار جھونکے نے اپنی پوری طاقت سے دروازے کے پٹ چوپٹ کر دیئے ہوں۔ دیکھا تو سامنے حسن و شباب کا ایک جھکڑ اپنی پوری دلربانہ رعنائیوں کو اپنے جلو میں لئے مقویِ حسن مسکراہٹ کے ساتھ عشق کو دعوتِ نشاط دیتا ہوا نظر پڑا۔ شراب کے نشے میں مرد کی جمالیاتی حس باقی تمام حواسِ خمسہ پر غالب رہتی ہے۔ اور اس عالم میں عورت خواہ مٹی کی ہی کیوں نہ ہو اردو نا لیلیٰ نظر آتی ہے۔ لہٰذا یہ تسلیم کرنے میں کوئی قباحت نہیں کہ راقم الحروف نے ان بیگم صاحبہ کو اس وقت سے پہلے اور پھر اس کے بعد اتنے حسین اور دلکش سراپے میں کبھی نہیں دیکھا۔ جوانی کے دنوں میں ساحر ہوشیارپوری کی مسکراہٹ بھی اپنا ایک ایسا ساحرانہ زاویہ رکھتی تھی کہ اکثر و بیشتر حسنِ سرکش نے اپنا سب کچھ اس مسکراہٹ کی نذر کر دیا۔ لہٰذا ساحر صاحب اپنی اسی ساحرانہ مسکراہٹ سے اس آفتِ جاں کا استقبال کر رہے تھے اور راقم الحروف کے کانوں میں کسی فلمی گانے کے اس گھٹیا مصرع سے

یوں تو ہم نے لاکھ حسیں دیکھے ہیں تم سا نہیں دیکھا

کی آواز خود سے سنائی دیتی ہوئی ایسے معلوم ہوئی جیسے اس گھٹیا مصرع کے خالق نے سرور تونسوی کی طرف سے اس مجسمۂ حسن کی تشریف آوری پر نذرِ عقیدت کا گلدستہ پیش کر دیا ہو۔

ساحر صاحب ساحرانہ انداز سے اُٹھے عشق نے نذرانۂ عقیدت پیش کیا اور دنیا کی تمام مسکراہٹوں کا یہ مرکز اداے قاتلانہ کے ساتھ ایک کرسی پر تشریف فرما ہوا۔ ایوننگ ان پیرس کی خوشبو شراب کے نشے کے سرور کو اور بھی خوشگوار بنا رہی تھی ساحر صاحب نے بڑے اہتمام سے پیگ بنا کر حسن کے حضور... پیش کرتے ہوئے کہا۔ انہیں تو آپ جانتی ہی ہوں گی۔ فرمانے لگیں نہیں، پھر مجھ سے پوچھنے لگے کہ آپ ان سے واقف ہیں۔ عرض کیا کہ واقف تو نہیں البتہ ایک دو مشاعروں میں دیکھا ہے۔ کچھ تو یہ آفتِ جاں پہلے ہی عالمِ رو رہا میں تھیں۔ دو چار پیگ اور نوش فرما چکیں تو نہایت متانت سے فرمانے لگیں۔ سرور صاحب میں آپ سے بہت اچھی طرح واقف ہوں۔ آپ مشاعروں کی روداد میں میرے بارے میں جو کچھ لکھتے رہے ہیں وہ بھی حرف حرف مجھے یاد ہے۔ مجھے کوئی موقع میسر ہی نہیں آیا تھا کہ میں آپ کا شکریہ ادا کر سکتی۔ آج ساحر صاحب سے دن میں ملاقات ہوئی تو یہ پروگرام بنایا گیا کہ ساحر صاحب آپ کو بلائیں اور آپ کو معلوم نہ ہونے دیا جائے کہ میں بھی یہاں آ رہی ہوں کیونکہ اس کا خدشہ تھا کہ شاید آپ میری وجہ سے آئیں ہی نہیں۔ اس کے بعد بیگم صاحبہ نے مشاعروں کی روداد کو ایک الگ اور دلچسپ انداز میں لکھنے کی تعریف ایسے انداز میں فرمائی کہ شاید ہی کسی ادیب یا شاعر نے ایسی تعریف کی ہو۔ میں نے اس قدر افزائی کا شکریہ ادا کیا تو بیگم صاحبہ نے چھٹا پیگ ختم کرتے ہوئے ان حاسدانِ کرام کی کرم فرمائیوں کی داستان سنانا شروع کی جو ایڈیٹر شانِ ہند کے خلاف بیگم صاحبہ کے کان بھرا کرتے تھے۔ ان شعرائے کرام نے بیگم صاحبہ کے عشق میں جو دلچسپ حماقتیں کی تھیں ان کی تفصیل بیگم صاحبہ نے اس دلکش انداز میں سنائی کہ ہنستے ہنستے رات کے ساڑھے گیارہ بج گئے۔ یہ تمام عجیب حقیقتیں آپ انہیں صفحات میں پڑھ سکیں گے۔

راقم نے اپنی زندگی میں دو عورتوں کو ایسا پایا کہ پوری بوتل وسکی پی جاتے پر اُن کے ہوش و حواس میں اور کبھی تانگہ آجاتے۔ ان میں سے ایک یہ آفتِ جاں تھیں اور دوسری کا ذکر یہاں مناسب نہیں بارہ بجے تک کھانا ختم ہوا اور یہ محفل ختم ہوئی۔ بیگم صاحبہ کا باقاعدہ تعارف اسی محفل میں ساحر صاحب کے طفیل ہوا۔

محولہ بالا واقعات سے آپ کسی حد تک غلط فہمی کا شکار تو ہو گئے۔ اسلئے یہ واقعہ بھی سننے جائیے کہ جناب ساحر ہوشیارپوری کی بیگم صاحبہ تشویشناک حد تک علیل ہو کر نرسنگ ہوم میں داخل ہوئیں تو یہی بیگم صاحبہ ایک تجربہ کار نرس کی طرح کئی دنوں تک بیگم ساحر کی تیمارداری میں اپنے آپ کو بھول گئیں اور یہ حقیقت ہے کہ جس اپنائیت اور نیک نیتی سے بیگم صاحبہ نے یہ تیمارداری کی اس کی تعریف ان کے دشمنوں نے بھی کی غرضیکہ ان بیگم صاحبہ کو قدرت نے کچھ ایسی خوبیاں بھی عطا کی تھیں کہ آج جب کہ ان کا وہ ہوش رُبا حسن و شباب سفید بالوں اور جھریوں میں تبدیل ہو گیا ہے اور مخمل و اطلس کے بستر پر سونے والی یہ بلبل ہزار داستان آج تک کتنے ہی حرم کے حجرے میں مقیم ہے انہیں انتہائی عزت و احترام کے ساتھ سلام کرنے کو جھک جاتے ہیں۔

(جاری ہے)

قطعات رئیسؔ امروہوی

مالِ حرام

اک صاحبِ نظر نے کسی بزمِ عام میں
کہہ دی عجیب بات بہ زورِ کلام میں
اکلِ حلال میں وہ میسر نہ آسکی
لذت ملی جو لقمۂ مالِ حرام میں

ناز

ہم نے اک شوخِ خود نما کو رئیسؔ
آج جھک کے گلے لگا ہی لیا
عشق نے باوجودِ کمزوری
بار نے دو من کا ناز اٹھا ہی لیا

پالتو غنڈے

بعض ہیں غنڈہ گر سچ مچ کے
بعض غنڈے، فالتو غنڈے
کچھ سیاست کے نازپروردہ
کچھ حکومت کے پالتو غنڈے

دواء

وہ شانِ حذاقت ہے نہ وہ دستِ شفا ہے
ہر علمِ معالج کے لئے آج روا ہے
امراض و بالی کی دوا بس تو بہت کی
یا رب کوئی ان ڈاکٹروں کی بھی دوا ہے

بخشش و عطا

اس عہد میں بخشش و عطا کا
دستور عجیب ہو گیا ہے
اربابِ دول سے بھیک مانگو
افلاس غریب ہو گیا ہے

بھیک منگے

اپنی ملت میں ہزاروں لوگ ہیں
روس و امریکہ کی رنگت میں رنگے
فکر میں اعمال میں اطوار میں
اللہ اللہ یہ سیاسی بھیک منگے

تائب تھے!

بعض افسر ہوئے ہیں تائب تھے
بادۂ بے خمار کافی ہے
مستیٔ آبِ آتشیں کے بجائے
نشۂ اقتدار کافی ہے

چرس پی!

تلخابۂ ایام نہ آمیدکا رس پی
ساقی تجھے جو کچھ بھی پلائے وہی بس پی
روٹی نہیں ملتی نہ ملے شوق سے غم کھا
وہسکی نہیں ملتی نہ ملے ووٹ کے چرس پی

اے سیٹھ

میں یہ نہیں کہتا کہ زر و مال عطا کر
میں یہ نہیں کہتا کہ مدد بہرِ خدا کر
تحقیق ہوا تیری دعاؤں میں اثر ہے
اے سیٹھ مرے واسطے للّٰہ دعا کر

تھک کر!

بندوں میں نہیں ہے کوئی فی الحال
نا چیز کے کام آنے والا
اس واسطے ہو گیا ہوں تھک کر
راضی بہ رضائے حق تعالیٰ

ریل گاڑی

زندگی ہے وہ معمہ جس کا حل کوئی نہیں
جس میں الجھی ہیں تمنائیں وہ الجھن ہے اجل
خضرِ منزل حادثے ہیں منزلِ آخر عدم
ریل گاڑی زندگی ہے اور انجن ہے اجل

میٹرک فیل

میٹرک فیل۔ طالبانِ علوم
کب ذلیل و حقیر ہوتے ہیں
میٹرک فیل ہی تو اپنے یہاں
مملکت کے وزیر ہوتے ہیں

چار چیزیں

چار چیزیں یہاں نہیں ملتیں
راحتِ دل — تلافیٔ ایذا
ووٹ کا منصفانہ استعمال
بھارتی پاسپورٹ کا ویزا

دو چار خون

کیسا فساد ہے یہ مزاجِ عوام میں
لوگوں میں بڑھ رہا ہے بلا کا جنون بیز
اصلاحِ حال کی کوئی صورت تو سوچئے
دو چار قتل روز تو دو چار خون روز

تاریخِ وفات مولانا ابوالکلام آزاد

اُف یہ مرگِ ابوالکلام آزاد
اے قیامت! یہ کیا قیامت ہے
اس غریقِ محیطِ رحمت کا
سالِ رحلت "غریقِ رحمت" کا

۱۹۵۸

غُنڈے کی تلاش میں

فکر تونسوی

طنز و مزاح میں ایک خاص انفرادیت رکھنے والے جناب فکر تونسوی کے مزاحیہ مضامین کے دو مجموعے "فکر نامہ" اور "پیاز کے چھلکے" حال ہی میں شائع ہوئے ہیں اور دونوں مجموعے ایسے ہیں کہ اگر آپ اردو پڑھ سکتے ہیں تو انہیں ضرور پڑھئے۔ ورنہ اردو زبان کو آپ سے یہ شکایت رہے گی کہ آپ نے فکر تونسوی کے یہ مجموعے نہیں پڑھے تھے تو اردو پڑھنے کی ضرورت ہی کیا تھی آپ اس شرط پر بھی منگا سکتے ہیں کہ اگر یہ مجموعے آپ کو پسند نہ آئیں تو واپس فرماکر اپنی پوری ادا شدہ رقم واپس لے لیجئے مگر ہر دو جانب کا ڈاک خرچ آپ کے ذمہ ہوگا۔

ذیل میں ہم فکر تونسوی صاحب کا ایک مزاحیہ فیچر "غنڈے کی تلاش میں" شائع کر رہے ہیں۔ تاکہ اس فیچر کے مطالعہ سے آپ کو پتہ چل سکے کہ فکر تونسوی واقعی اپنی طرز کا واحد مزاح اور طنز نگار ہے۔
(ایڈیٹر)

کل میں غنڈے کی تلاش میں نکلا۔ روزانہ نارمل انسانوں کو دیکھتے دیکھتے بور ہو چکا تھا۔ نارمل انسان جو زندگی کے چند سانس قائم رکھنے کے لئے خود غرضی کو شہد سمجھ کر اس سے مکھیوں کی طرح چمٹے رہتے ہیں۔ اُمید اور نا اُمیدی کی دلدل سے نکل کر کسی نہ کسی لیڈر کو ووٹ دے دیتے ہیں اور گھر آکر تکئے میں منہ چھپا کر رونے لگتے ہیں۔ نارمل انسان اپنے ان آنسوؤں کو بے بسی کہتے ہیں اور لیڈر ان آنسوؤں کو جمہوریت کی چمک دمک کہتے ہیں۔

گھر سے نکلا تو ایک صاحب سے راستے میں ملاقات ہوئی کھدر کا لباس۔ ٹیڑھی سفید براق ٹوپی، بادام ایسے رنگ کی جیکٹ۔ منہ میں پان کی گلوری۔ گلے میں موتیے کا ہار۔ سگریٹ کے کش کے دھوئیں سے جیسے پورے ہندوستان کو اُڑاتے ہوئے ۔۔ میں نے قریب جاکر مؤدبانہ عرض کیا۔

"کیا آپ غنڈے ہیں؟"

"نہیں۔ میں تو ایم ایل اے ہوں"

"سوری! آج کل غنڈے اور ایم ایل اے کی شناخت کافی مشکل ہو گئی ہے۔ لباس بہت دھوکا دے رہے ہیں ایک بار پھر معذرت چاہتا ہوں۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ غنڈہ کہاں ملے گا۔ مجھے اس کے درشن کرنا ہیں"

وہ مسکرایا۔ میں نے اسے غنڈہ کہا تھا۔ اسے تو قتل کا لینا چاہیئے تھا۔ یہ تو خیر بعد میں معلوم ہوا کہ لیڈر خود چاقو نہیں چلاتے دوسروں سے چلواتے ہیں۔ وہ اپنا اقتدار دو عناصر پر قائم رکھتے ہیں۔ پالتو غنڈے اور دھارمک مہنت ۔۔ پان کی پیک بظاہر نالی میں اور بباطن میرے کپڑوں پر چھوڑتے ہوئے بولے ۔۔

آپ غنڈے کے درشن کیوں کرنا چاہتے ہیں؟

میں نے کہا ۔۔ کیونکہ وہ بہادر لوگ ہیں۔ دور حاضر کے کھشتری ہیں اور میں دن رات کایروں کو دیکھتے دیکھتے تھک گیا ہوں۔ ہر وقت گریہ وزاری۔ بے بسی۔ رونا۔ رونا دھونا۔ سوچتا ہوں اُن بہادروں کو ہی جنبیہ سمجھنا چاہیئے جن کے طفیل آج پورا ملک کھڑا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہر ملک کھشتریوں کے قربانیوں پر باوقار بنتا ہے۔ آپ کسی غنڈے کا ایڈریس اس لئے پوچھا کہ آپ کی معلومات بڑی وسیع ہیں۔ آپ پورے حلقے کی نمائندگی کرتے ہیں جن میں غنڈے بھی شامل ہیں"

وہ پھر مسکرایا۔ اس مسکراہٹ میں دیکھا معلومات چھپی ہوئی تھیں۔ ممکن ہے وہ مجھے پاگل سمجھا ہو یا شاید کچھ بھی سمجھ ہو کر ہی شاید سیاست کا [illegible]

کرنا چاہتا ہوں۔ اس لئے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ مجھے ٹالتے ہوئے کہنے لگا "دوکسی پولیس اسٹیشن پر جاکر معلوم کرو انہیں دن رات غنڈوں سے واسطہ پڑتا ہے۔"

قہقہے کے ساتھ، سلگائے ہوئے تین چوتھائی سگریٹ کو اپنے بوٹ تلے مسلتے ہوئے وہ چلا گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے اس نے سگریٹ کو نہیں، مجھے مسلا ہے۔

مجھے مایوسی ہوئی "اوں ہوں! پولیس اسٹیشن جانا فضول ہے کیونکہ غنڈوں کی شناخت وہاں بھی مشکل ہے۔ ایک دن مجھے ایک نیک دل فریڈم فائیٹر نے بتایا تھا کہ ایک غنڈہ گر پولیس کی وردی پہن لے تو تھانیدار لگتا ہے۔ غنڈے اور تھانیدار میں صرف وردی کا فرق ہوتا ہے۔ لباس ہمیشہ دھوکا دیتا ہے چاہے کھدر کا ہو یا پولیس وردی کا ہو — اور پھر کون جانے تھانے والے مجھے ہی غنڈہ "ڈکلیئر کردیں"۔ میری جیب میں ناجائز چرس ڈال اور کہیں جب تک خود ثابت نہ کردو کہ یہ چرس میری نہیں ہے۔ اس وقت تک ہم تمہیں غنڈہ سمجھیں گے اور چالان کردیں گے۔

میں نے پولیس اسٹیشن جانے کا ارادہ ترک کردیا — لیکن کسی غنڈے سے ملنے کی تمنا اور بھی زور پکڑ گئی —

غنڈہ کہاں ملے گا؟ — کئی دنوں سے سن رہا تھا کہ شہر بھر میں غنڈے اور رہزن سول لبرٹی کا جھنڈا اٹھائے گھوم رہے ہیں، کسی کا طلائی ہار چھین لیا، پٹرول پمپ کا کیش اٹھالیا۔ دن دہاڑے گھروں پر ڈاکہ ڈالا۔ پستول چلایا اور کار پر فرار ہوگئے۔ اور پرسوں تو ایک ہی دن میں سولہ سترہ جرم کر ڈالے۔ اور پولیس . . . ؟

اور پولیس کی نفری بڑھادی گئی — جوں جوں غنڈوں کی تعداد بڑھتی ہے۔ پولیس کی تعداد بھی بڑھادی جاتی ہے۔ غنڈے جرم کرتے ہیں۔ پولیس مصروفِ تفتیش رہتی ہے۔ پولیس کو تفتیش کا شوق زیادہ ہے۔ غنڈوں کو جرم کا شوق زیادہ ہے — اور ہوم منسٹر کو یہ اعلان کرتے رہنے کا شوق زیادہ ہے کہ ہم شہر کے غنڈوں کو کچل کر رکھ دیں گے — تینوں کے شوق بڑے اطمینان سے پورے ہورہے ہیں۔

تھانے کی بجائے ایک پریس رپورٹر دوست کے پاس چلا گیا۔ پوچھا — یار۔ یہ شہر میں نئے نئے غنڈے کہاں سے آگئے ہیں؟

وہ بولا "جہاں سے نئے نئے پولیس افسر آگئے ہیں۔"

میں نے کہا کیا مطلب؟"

وہ کہنے لگا "مطلب یہ کہ دوسرے صوبوں سے نئے نئے پولیس افسر [illegible] ہیں۔ چنانچہ اُن صوبوں کے غنڈوں نے بھی سوچا کہ ہمارے بھائی بند اگر اس شہر میں چلے گئے ہیں — تو ہمیں بھی اُن کے پیچھے پیچھے اسی شہر میں جاکر بسنا چاہیئے — اور تم جانتے ہو۔ اتہاس گواہ ہے کہ برادری کے کچھ افراد اگر ہجرت یا نقل مکانی کر جائیں تو برادری کے باقی افراد بھی اسی مقام پر ہجرت کر جاتے ہیں۔"

میں نے رپورٹر دوست سے کہا "تم تو مذاق کررہے ہو حالانکہ میں لا اینڈ آرڈر کے معاملے میں بڑا سیریس ہوں اور کسی غنڈے سے مل کر معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آخر وہ جرم کیوں کرتا ہے؟ جرم کرنے کے لئے نقل مکانی کیوں کرتا ہے؟"

رپورٹر بولا: سوری! مجھے ایک سفارت خانے میں کاک ٹیل پارٹی پر جانا ہے۔ سیریس باتوں کے لئے میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔ وہسکی کا ایک پیگ — اور غنڈے اور تھانے دار دونوں غائب۔"

اور پھر یہ جا وہ جا — رپورٹر غائب ہوگیا۔

شہر میں اتنے زیادہ غنڈے —؟ اور مجھے ایک بھی نہ ملے۔ ڈوب مرنے کا مقام ہے چنانچہ میں نے سوشل سائنس کے ایک پروفیسر کو ٹیلی فون کیا "ہیلو! آپ سے صرف یہ پوچھنا چاہتا کہ کیا آپ کسی غنڈے سے واقف ہیں؟

وہ بولا: "ہاں، کل شام سیر کرتے کرتے ایک غنڈے سے مڈبھیڑ ہوئی۔ وہ میری بیوی کا طلائی ہار اور میرا بٹوہ چھین کر بھاگ گیا۔"

آپ کی سوشل سائنس کیا کہتی ہے۔ غنڈہ کون تھا

کہاں سے آیا تھا۔ دہشت نی کیوں کرنے لگا۔ اپنا کوئی ایڈریس بھی دے گیا کہ نہیں۔ شکل و شباہت کیسی تھی؟" نوجوان تھا۔ انگریز نہیں تھا مگر انگریزی بولتا تھا۔ کبھی جب کوئی نوجوان گریجویٹ بن جاتے اور مسلسل بیروزگاری کے تھپیڑوں سے اس کی روح میں لاوا اُبلنے لگے تو وہ رہزنی اختیار کر لیتا ہے۔ سوشل اور اقتصادیات کی سائنس تو یہی کہتی ہے۔ سُنا ہے اُس غنڈے کو پولیس نے پکڑ لیا ہے۔ جاؤ تھانے میں جاکر اس سے مل لو۔"

آخر جھک مار کر تھانے جانا پڑا۔ وہاں غنڈہ تو دکھائی نہیں دیا۔ مگر وہ صاحب ضرور نظر آئے جو اپنے آپ کو ایم ایل اے کہتے تھے۔ وہ تھانے دار سے کہہ رہے تھے "نہیں صاحب آپ نے کل جس نوجوان کو طلائی ہار چھیننے کے جُرم میں پکڑا تھا۔ اُسے تو چھوڑنا پڑے گا۔ وہ تو اپنا آدمی ہے۔ غنڈہ نہیں ہے۔ وہ تو ہمارا وفادار پولٹیکل ورکر ہے۔ اُس پر ہاتھ مت ڈالئے۔ کیونکہ پالیٹکس کے ہاتھ آپ سے بہت زیادہ لمبے ہوتے ہیں۔"

مجھے غنڈہ تو نہ مل سکا۔ اُس کا ورانر ضرور مل گیا۔

فکر تونسوی

(بقیہ ۳۲) اپنے والدین سے علیحدگی اختیار کی ہوتی تو آج یہ دن دیکھنے نہ پڑتے اب اُسے اس بات کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ والدین سے الگ گھر بسانا خود اپنی موت کو دعوت دینے سے کسی طرح بھی کم نہیں۔ بہرحال وہ تبادلہ کروانے کے بعد ایک شہر سے دوسرے شہر اور دوسرے شہر سے تیسرے شہر کی سیر کرتا ہی رہتا ہے لیکن اُسے کہیں سکون میسر نہیں ہوتا۔ انہیں تبادلوں میں نئے مکان کی سجاوٹ کے لئے خریدی گئیں تمام اشیاء آدھے پونے داموں بکتی رہتی ہیں سیکے بعد دیگرے تبادلہ در تبادلہ کا یہ سلسلہ اس وقت ختم ہوتا ہے جب اُس کے بچے اسکول میں تعلیم پانے لگتے ہیں۔ اس وقت اس کی آنکھیں کھلتی ہیں اور اس میں احساسِ بزرگی کا جذبہ بیدار ہوتا ہے۔ اس طرح وہ ملازمین کے حصہ سوم میں داخل ہوجاتا ہے۔

حصہ سوم

اوسط درجہ کا ملازم جب حصہ سوم میں داخل ہوجاتا ہے تو اس کی زندگی اپنی زندگی نہیں رہتی۔ اس وقت وہ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت میں ہی منہمک ہوکر رہ جاتا ہے دونوں میاں بیوی کبھی اچار سے کبھی چٹنی سے یا پھر کبھی پیاز سے ہی روٹی کھا لیتے ہیں۔ بعض اوقات تو دونوں کو ایک ہی وقت روٹی نصیب ہوتی ہے۔ اُن کی تمام تر توجہ اولاد پر ہی مرکوز رہتی ہے۔ اولاد کو اعلیٰ تعلیم دلوانے کی ہر ممکن سعی کرتے ہیں تاکہ انہیں کوئی اچھی ملازمت مل سکے اور وہ اُن کے بڑھاپے کا سہارا ثابت ہوں۔

مگر جب اولاد تعلیم سے فارغ ہوکر کسی اچھی ملازمت پر مامور ہوجاتی ہے اور شادی کے بعد اپنے والدین کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اُن سے لڑ جھگڑ کر اپنا ایک گھر بسانے میں مشغول ہوجاتی ہے تو وہ بوڑھا ملازم، وہ بوڑھا باپ تڑپ اُٹھتا ہے۔ اس وقت اسے اپنے ضعیف ماں باپ کی یاد بڑی شدت سے آتی ہے۔ وہ سرد آہیں بھرتے بھرتے آخر ایک دن خود سرد ہوجاتے ہیں۔ یعنی دم توڑ کر ملکِ عدم کو رخصت ہوجاتا ہے۔

مبارکباد

جناب الیاس دہلوی کی صاحبزادی اور قبلہ حافظ محمد یوسف صاحب دہلوی مدیر اعلیٰ "شمع" کی پوتی عزیزی فرح کی شادی خانہ آبادی ۱۷ فروری کو جناب ناصر نور صاحب چشمہ والے کے ساتھ بفضلِ خدا بخیر و خوبی انجام پائی۔

مقامی اور غیر مقامی سینکڑوں معززین نے نئے جوڑے کو دلی دعائیں دیں۔ ادارہ شانِ ہند دولہا دلہن کے لئے درازیٔ عمر صحت اور خوشحال زندگی بسر کرنے کی دعاؤں کے ساتھ قبلہ حافظ محمد یوسف صاحب، جناب یونس دہلوی جناب ادریس دہلوی اور جناب الیاس دہلوی کو اس فرض سے سبکدوشی پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہے۔

مثنوی مالوہ

مہاراجہ بھرتھری ہری اور اُجّین

(قسط نمبر ۹)

نازکؔ الہ آبادی

شری بھرتھری کا یہی ہے وطن — کہ جن کا ہے اُجّین ادبی چمن
خوش اخلاق بھی تھے بڑے باتمیز — ولی عہد تھے مالوا کو عزیز
ولی عہد پڑھ لکھ کے فارغ ہوئے — شباب آیا گویا وہ بالغ ہوئے
وہ پنڈت ہوئے پڑھ کے وید و پُران — ہوا جن سے آگاہ پورا جہان
وہ سمراٹ بھی بن گئے با اثر — سیاست سے لیکن وہ تھے بے خبر
حکومت میں آتے ہیں ایسے اُمور — ضروری ہے جس میں سیاسی شعور
چنانچہ گئے اک طوائف کے گھر — سیاست سے ہوں تاکہ وہ باخبر

اثر اُن پہ لیکن یہ اُلٹا پڑا
کہ وہ ہو گئے نرتکی پر فدا

مہاراجہ بھرتھری ہری اور طوائف کے یہاں کے تجربات

ہوا اُس سے پیدا جو دل میں لگاؤ — نظر آئے مقصد میں کافی گھٹاؤ
بہت اُس پہ مائل ہوئے "بھرتھری" — مگر اُن سے غافل رہی نرتکی
تھا محبوب اُس کا نگر کوتوال — اُسی سے وہ رکھتی تھی فکرِ وصال
مگر اُس سے کوتوال تھا لے لگاؤ — کہ اُس کا تھا اک دوسری پر جھکاؤ
غرض دوسری کا جُدا تھا خیال — نہ تھا اُس کے دل میں کوئی کوتوال
بسے اُس کے دل میں تھے بس "بھرتھری" — اُنہیں کے لئے تھی وہ دل میں دُکھی
غرض بھید سب کا جو اُن پر کھلا — دُکھی وہ ہوئے دل کو دھکا لگا
سمجھ کر وہ سنسار ہی کو حقیر — محل چھوڑ کر ہو گئے وہ فقیر
ذرا دُور پر بن ہے اک خوش نما — جہاں "بھرتھری" نے بنالی گپھا
گپھا بن میں دائم ہے فصلِ بہار — فضا جس سے جنگل کی ہے خوشگوار
ہٹا کر زمانے سے اپنی نظر — وہ کرنے لگے بن میں جیون بسر
وہیں کرتے تھے بندگی کی ریاض — سخن کی وہیں لکھتے تھے وہ بیاض
گپھا پر ہے چٹان کا سلسلا — جسے کہتے ہیں "بھرتھری" کی شلا
لگاتے تھے آسن وہیں رات بھر — جماتے تھے خود روح پر ہی نظر
وہ اک شب لگا کر کے بیٹھے تھے دھیان — مگر کام دیتا نہ تھا کوئی گیان
بشدہ پہ بھی چاندنی رات تھی — مخل دھیان میں سامنے بات تھی

(باقی آئندہ)

سولہ کلا سمپورن بھگوان کرشن جی مہاراج

پر میرا ایمان ہے اور میں اُن کے نام پر اپنا سب کچھ نچھاور کر سکتا ہوں

اس لئے

میں بھگوان کرشن جی مہاراج ہی سے پرارتھنا کرتا ہوں کہ

وہ

بھارت ورش کے ہر ناری کو یہ بدھی دیں

کہ

ہم سب بھائیوں کی طرح مل جُل کر رہیں اور بھارت ورش کو اپنا سب کچھ سمجھیں

کرشن بھگوان

ہم سب کی سہایتا کریں - ہر بھارتی صحت مند رہے اور سکھی رہے اور ہم کسی کا بُرا نہ چاہیں -

مُلک جبھی خوشحال ہو گا جب ہم سب مل کر اس کی ترقی کے لئے کوشاں ہوں گے اور ہر قسم کی پیداوار کو ہم بڑھائیں گے اور آبادی بڑھنے سے روکیں گے -

ہر ایک بھارتی کا سیوک

رام پرکاش کتھوریہ

راما کرشنا پورم

نئی دھلی

گوشۂ عقیل

مشاہیر شعراء

قسیم گیاوی کی شاعری

نبی احمد اطہر ادیب کامل بی۔اے آنرز۔ ایم۔اے (اُردو)

قسیم الحق گیاوی بہار کے چیدہ شاعروں میں سے ایک ہیں جنھوں نے اپنی تخیل آئینہ سازی کی مدد سے متضاد ذہنی سمتوں کی آئینہ داری کی ہے۔ اگر انھوں نے ایک طرف گیسوئے اُردو کو سنوارا ہے تو دوسری طرف انسانی زندگی کی تلخ حقیقتوں کو منظرِ عام پر لانے کی سعی کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمارے سامنے مختلف رنگ و روپ میں دکھائی دیتے ہیں۔ کبھی ایک واعظ کی طرح پند و نصیحت کرتے ہوئے اور کبھی ایک مردِ مجاہد کی طرح قومِ مسلم کی غیرت و حمیت کو للکارتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے کلام میں کہیں کہیں عشقِ حقیقی اور عشقِ مجازی کا حسین امتزاج دکھائی دیتا ہے۔

تیرے جلوے بس گئے ہوں جس میں باصد آب و تاب
کیوں نہ ہم اس دل کو تیرا آئینہ خانہ کہیں

جب غم سے ان کا سابقہ پڑتا ہے تو غم کو تلخیٔ حیات سمجھ کر چھوڑ نہیں دیتے بلکہ اس کو گلے لگا لیتے ہیں۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ غم اور زندگی کا تعلق جسم و روح کا ہے۔ یہی وہ جذبہ ہے جس کے ذریعہ انسان اپنی خوابیدہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتا ہے اور اپنے اندر حس و حرکت محسوس کرتا ہے اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ در اصل یہ غم خوشی کا پیش خیمہ ہے۔ غالبؔ نے کہا تھا ؎

رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

قسیم نے بھی تلخیٔ حیات کو [illegible] لیا ہے اور اسے زندگی کا جزو تصور کر کے اپنے اندر [illegible] و توانائی محسوس کرتے ہیں ؎

غموں کی قدر کرو غم کے ساتھ ساتھ رہو
کہ غم فریب نہ دیں گے تجھے خوشی کی طرح
میرے غموں کا کچھ بھی نہ غم آپ کیجئے
غم اتنے سہہ چکا ہوں کہ اب غم نہیں مجھے

زندگی کے رُخِ روشن پر پڑے ہوئے پردوں کو اٹھانے کی کوشش کی ہے تو وہاں بھی اقبال کی طرح رجائیت کا عنصر تلاش کر کے انسان کو منزلِ مقصود پر پہنچنے کی تلقین کی ہے۔

اقبالؔ ؎ راہ خود بڑھ کے اُٹھاتا ہے نشانِ منزل
چلنے والا بھی تو ہو گردشِ ایام کے ساتھ

قسیمؔ ؎ کیوں نہ چومے گی منزلِ مقصود بھلا
سوئے منزل جو قدم اپنے بڑھائیں ہم لوگ

شاعر کو لیلائے وطن سے بھی اتنی ہی نسبت ہے جتنی کہ ایک عاشق کو معشوق سے ہوتی ہے۔ آزادی کی پری جمال کا تصور اس کے نہاں خانوں میں اس قدر پنہاں ہے کہ وہ اس پیکر کو الگ نہیں رکھ سکتا اور فیض کے انداز میں اس طرح گنگناتا ہے ؎

نگاہ جب بھی اٹھی ہے کسی کی للچائی
ہماری جان ہمارے وطن کے [illegible]
سدا بلند رکھیں گے ۔۔۔ آزادی
قسیم ہم کو ہے ونکہ بقائے آزادی

شاعر [illegible] حیات کو اپنی زندگی سمجھتا ہے۔ اس جذبے کے تحت شاعر [illegible] ایک طرف زندگی کو ساز تبسم [illegible] دیتا ہے تو دوسری طرف توجہ خواں بھی ہے۔ دورِ [illegible] اور معاشرہ کی ناہمواریوں کو دیکھتے ہوئے جو تبصرہ کیا ہے وہ بالکل ہی حقیقت پر مبنی ہے۔ اس لئے کہ طبقاتی امتیازات نے ملک کی حالت دگرگوں کر دی ہے۔ کہیں نسل و قوم کا جھگڑا ہے تو کہیں امیری اور غریبی کا [illegible] جمہوریت کا راگ الا [illegible] ہے

قسیم نے کیا خوب ہی کہا ہے

یہ دورِ عوامی ہے اس دور میں بھی لیکن
چنگیز ہزاروں میں خاقاں ہزاروں ہیں

شاعر معاشرہ کی ان تمام ترخامیوں کو دیکھ کر صرف افسوس ہی نہیں کرتا بلکہ عزم و عمل اور ہمت و توانائی کے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر برسرِ پیکار ہونے کی تلقین بھی کرتا ہے۔

اجاڑ اجاڑ سا ہے گلشنِ حیات تمام
اٹھو کہ ہم کو رکھنے ہیں اب تو باغ نئے

قسیم کے بعض اشعار دوسرے شعراء کی بازگشت معلوم ہوتے ہیں لیکن اس میں بھی انہوں نے اپنی ذاتی صلاحیت کو بروئے کار لانے کی احسن کوشش کی ہے ؎

نئے سپہرے کی جستجو کشاں کشاں کہاں کہاں
میں ڈھونڈتا پھروں گا یوں ترا نشاں کہاں کہاں

زندگی کی فنا پذیری کا تجزیہ اکثر شاعروں نے کیا ہے لیکن ان کے اندر زیادہ تر اصولی باتیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ وہ حقیقت کی میزان پر بالکل ٹھیک اترتی ہیں۔ قسیم نے اس کو تجربات کا لبادہ پہنا کر یوں آشکار کیا ہے

کیا کیا نہ ہم نے زیست کے خاکے بنائے تھے
کیا جانتے تھے ہوں گے یہ نذرِ اجل تمام

ضمناً یہ تذکرہ ہو چکا ہے کہ کچھ اشعار دوسروں سے مستعار لئے گئے ہیں لیکن اس سے ان کی عظمت پر حرف نہیں آتا کیونکہ ایسا ہی ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا۔ لیکن اس کے باوجود اس کے اندر نیا پن کا ہونا ضروری ہے کہیں کہیں قسیم اس سے بالکل ہی محروم ہیں۔ پروفیسر اختر قادری کا ایک شعر ہے۔

رنج و غم ہے کلفتیں ہیں کاہشِ آلام ہے
زندگی کوئی سزا ہے یا کوئی انعام ہے

قسیم نے اسی خیال کو اپنے انداز میں یوں باندھنے کی کوشش کی ہے

الجھن ہے درد و غم ہے الم ہے تسیم ہے
ماشاءاللہ اس زندگی کی بھی تقدیر عجب ہے

میرا یہ خیال ہے کہ شاعر کو یہاں حسبِ منشا کامیابی نہیں ہوئی ہے کیونکہ اس کے اندر نیا پن کا قطعی احساس نہیں ہوتا۔ عشق و محبت کی بات آتی ہے تو وہاں بھی قسیم ایک گھسے پٹے عاشق کی طرح تمام تر دشواریوں کو برداشت کرنے کے باوجود خوش و خرم نظر آتے ہیں اور یہ ظاہر کر دیتے ہیں کہ انسان اگر اپنی منزل تک پہنچنا چاہے تو زمانے کی دشواریاں اس کے پائے ثبات میں لغزش پیدا نہیں کر سکتیں ؎

ہم بھی ہیں آپ کے دل بھی ہے آپ کا
شوق سے آپ مشقِ ستم کیجئے

انیس اور جواہر لال نہرو پر جو شخصی عقیدت کا اظہار کیا ہے اس میں قسیم کی انفرادیت کا راز کھلتا ہے اور لامحالہ اس کی شاعرانہ صلاحیت کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے۔
"دنیا کے بدلتے ہوئے حالات کو سمجھو" میں انہوں نے تلخ حقیقت کو بڑے ہی شیریں اور لطیف انداز میں بیان کیا ہے جس سے چبھن کا احساس تو ہوتا ہے لیکن نیش زنی کا کوئی مزید اور دیرپا اثر باقی نہیں رہتا۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے "مار پھولوں کی چوٹ سے بھی ہوتی ہے لیکن اس چوٹ کا احساس چوٹ کی طرح نہیں ہوتا"۔ قسیم نے بھی یہی انداز اپنانے کی کوشش کی ہے اور نتیجے کے طور پر کامیابی بھی ہوئی ہے۔ ان کی دوسری نظمیں "اے قلم حال کیا ہے"، "دلِ ناداں"، "مضطرب ہیں ہم بہت جس کے لئے"، "خوف"، "شبِ برات" وغیرہ بھی ان کے قادر الکلامی کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ نقش و نغمہ کی آخری نظم "نورِ ایمانی" کو پڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر کو جہاں شاعری کے لوازمات کا احساس ہے وہیں خیالات کی پاکیزگی اور جذبات نگاری پر بھی مہارت حاصل ہے۔ اس لئے اسی کی زبان میں ہم یہ کہہ کر اپنی بات ختم کر سکتے ہیں۔

شاعری میری یقیناً نقش بھی نغمہ بھی ہے

چند جملے اپنے بارے میں

رحمان عباسی

میرا پورا نام سید حفظ الرحمٰن ہے۔ قلمی نام (تخلص)

رحمان عباسی ہے۔ میرے والدِ محترم کا نام سید عباس علی ہے انھیں کے نام کی مناسبت سے میں نے اپنا قلمی نام رحمان عباسی رکھا ہے۔ میں تحصیل فتحپور (بارہ بنکی) کا رہنے والا ہوں۔ افسانہ نویسی، شعر و شاعری و مضمون نگاری کا شوق بچپن سے ہے۔ میری پہلی نظم بارہ سال کی عمر میں شائع ہوئی تھی جو آج بھی میرے پاس شائع شدہ محفوظ ہے۔ اس کے بعد آج تک اردو کے معیاری رسائل و اخبارات میں برابر میری تخلیقات شائع ہو رہی ہیں۔

اردو ادب پر کیے گئے نئے تجربات اور ادب میں نئے رجحانات کا حامی ہوں اور ان کا دل سے خیر مقدم کرتا ہوں بشرطیکہ وہ تجربات مقصدیت اور جدیدیت کے ساتھ ساتھ افادیت کے حامل ہوں اور ایک صحت مند جدید ادب (MODERN LITRATURE) پیش کرنے کی صلاحیت ان میں بدرجہ اتم موجود ہو۔ میں صرف جدید ادب کی (SPR IT) سے دلچسپی رکھتا ہوں۔ جہاں تک تجربات کا سوال ہے، تو تجربے تو ہر دور میں ہر زبان کے ادب پر ہوتے رہتے ہیں۔ ان سے تمام اپنے گوشے منظر عام پر آتے ہیں جو ایک انفرادیت کے حامل ہوتے ہیں اور ادبی حلقوں میں ایک خوشگوار تاثر چھوڑ جاتے ہیں۔ اگر (ideal) نیک ہو تو کوئی تجربہ برا نہیں۔ ہاں اس میں ایک (Social) ادب کی تخلیق کا جذبہ ہونا چاہیے۔ یہ میرا نظریہ ہے۔ اپنے عہد کی حسیت صرف ذات کے کرب سے عبارت ہے۔! دنیا کی ساری شاعری اسی نقطہ پر ٹھہر گئی ہے!! یہ میرا عقیدہ ہے ــــ خدا اور اس کی مخلوق پر ایمان رکھتا ہوں۔ یہ میرا طریقہ ہے! ــــ اور بس!

میرا یہ شعر، میری زندگی کی تصویر ہے ٭

یوں تو [illegible] نے کو اک جہاں ہے [illegible] تھ
[illegible] میں اکیلا ہوں

غزل

(رحمان عباسی)

کیا کہوں آنکھوں نے کیا کیا مری منظر دیکھے
شہر میں جلتے ہوئے چاند سے پیکر دیکھے

سونا پن کم نہ ہوا سونے مکاں کا ہرگز
طاقِ ماضی پہ دیئے ہم نے جلا کر دیکھے

سر کے زخموں نے انھیں جھک کے وہیں چوم لیا
تپتے صحرا میں جو بکھرے ہوئے پتھر دیکھے

ڈھونڈھنے والے نہ اس طرح آ سے پائے گا
لاکھ آنکھوں کے سمندر میں اتر کر دیکھے

میں کہ اک لمحہ ہوں صدیوں میں بدل جائے گا
دستِ انفاس تو مجھ کو پکڑ کر دیکھے

تجھ کو ہو جائے گا وحشت کا مری اندازہ
پیار سے تو جو مری آنکھ کے اندر دیکھے

ایسے دیوانے پہ فرزانے ہوں رحمان نثار
اپنے ہاتھوں سے جو گھر اپنا جلا کر دیکھے

یہی اپنی حقیقت ہے یہی اپنی کہانی ہے
تمہیں حق ہے جو تم سمجھو وگرنہ کون ثانی ہے

عبدالرؤف حات فتحپوری

میری پیدائش ۱۹۵۸ء میں ضلع بارہ بنکی کے ایک قصبہ تحصیل فتحپور میں ہوئی۔ جب میں کچھ جاننے والا ہوا تو میرے والد بزرگوار نے میرا داخلہ یہیں کے ایک مدرسہ ضیاء الاسلام میں کرا دیا۔ میں نے اس مدرسہ میں درجۂ پنجم تک تعلیم حاصل کی۔ اسی دوران میری دوستی ایک ایسے نامور شاعر سے ہو گئی جو قادر فتحپوری کے نام سے مشہور تھے۔ ان کے شعر سن سن کر ذہن شعر و شاعری کی طرف متوجہ ہو گیا۔ قادر صاحب کہیں بھی جاتے تو ہم کو ساتھ ضرور لے جاتے۔ چونکہ میری آواز اچھی تھی۔ میں ان کی نعتیں و غزلیں پڑھتا تھا۔ یہ دیکھ کر میرے والد صاحب نے مجھے میرے سگے پھوپھا کے ہمراہ جو ضلع ہیرپور کے ایک قصبہ مودہا رحمانیہ انٹر کالج میں ماسٹر تھے بھیج دیا جو ماسٹر حسین احمد کے نام سے مشہور ہیں۔ پھوپھا نے میرا یہیں کے اسکول میں داخلہ کرا دیا۔ کچھ عرصہ تک میں زیرِ تعلیم رہا اور اکثر شعر کہتا رہتا تھا۔ اپنے دوستوں کو سنایا کرتا تھا۔ پھر بھی وہاں کا ماحول

راس نہ آیا ۔ اب ہمیں اپنے دوست قادر کی یاد بہت ستانے لگی ۔ آخر کار جب ضبط نہ کر سکا تعلیم چھوڑ کر گھر چلا آیا ۔ اس طرح میری تعلیم ادھوری رہ گئی لیکن گھر آکر کتابی کیڑا بن گیا ۔ میں نے جب اپنے کہے ہوئے شعر قادر صاحب کو سنائے تو انہوں نے بڑی حوصلہ افزائی کی جس سے میرا دل باغ باغ ہو گیا اور حوصلہ بڑھا ۔ اب میں خود شعر کہنے لگا اور ادبی نشستوں میں حصہ لینے لگا ۔ آج میں جو کچھ بھی ہوں قادر صاحب کی بدولت ہوں ۔ میری سب سے پہلے غزل کشمیر سے شائع ہونے والے پرچہ "اقبال" میں شائع ہوئی تھی یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی ۔ پھر پوچھئے نہ صاحب خوشیوں کے خزانے کھل گئے اور میں لوٹتا رہا ۔ اسی طرح کئی رسالوں میں میری غزلیں چھپتی رہیں ۔ اب میری خوشیاں دور ہوتی گئیں ۔ میری دنیا بدلتی گئی ۔ میں اس دنیا سے بہت دور نکل گیا ۔ میری خوشیاں مجھ سے ناراض ہو کر بہت دور لے جا چکی تھیں ۔ اب میرے پاس غموں کے سوا کچھ نہ بچا جن کو ہر دم اپنے گلے سے لگائے پھرا کرتا ۔ لوگ ان سے کھلونا سمجھ کر کھیلا کرتے اور میرا کھلونا مجھ سے چھین کر میری نظروں کے سامنے توڑ ڈالا اور میں کھڑا دیکھتا رہا ۔ میں نے جب انصاف مانگا تو سب نے رُخ پھیر لیا ۔ نمونہ کلام کے طور پر ایک غزل ملاحظہ فرمائیے ۔

غزل

بس اتنی انتہا ہے مری ہر خاص و عام ہے
نفرت نہ کیجئے کبھی الفت کے نام سے

یوں سر جھکا کے سامنے آیا نہ کیجئے
دل خوش کہاں ہے آپ کے اس احترام سے

وعدہ نہ بھول کر کوئی اب تک وفا کیا
کیا فائدہ ہے آپ کے جھوٹے پیام سے

میں نے کیا سلام تو فوراً پلٹ گئے
کب سے ہوئی جناب کو نفرت سلام سے

ساقی بھی ہے شراب بھی ہے میکدہ بھی ہے
ایمان لٹ رہا ہے بڑی دھوم دھام سے

آنے بھلا وہ کیسے شبِ وعدہ اے حیات
فرصت کہاں ہے ان کو رقیبوں کے کام سے

شاہد علی شاہد

مدھیہ پردیش کے چھوٹے سے شہر شاجاپور میں ایک فروری سنہ ۱۹۴۲ء کو میرا جنم ہوا ۔ زندگی میں آگے بڑھنے کے لئے مجھے کافی جد و جہد کرنا پڑی ۔ آج بھی وہ کشش وہ تڑپ قلب و جگر میں سمائی ہوئی ہے ۔ اپنی منزل پانے کے لئے ایک سچے اور ایماندار مسافر کی طرح اپنی راہ پر گامزن ہوں ۔ میں نے ہندی اور انگریزی ادب میں بی ۔ اے کی ڈگری حاصل کی ۔ آج کل ایک چھوٹے سے گاؤں میں مدرس ہوں اور اپنے فرائض انجام دے رہا ہوں ۔ کافی لمبی مدت سے ہندی ادب میں لکھ رہا ہوں ۔ خاص طور سے ڈراما لکھنے میں اور اسٹیج پر پیش کرنے میں مجھے بڑی دلچسپی رہی ہے ۔ آکاش وانی اندور سے "سیپ اور موتی" "دگاؤں کی مانی تجھے پرنام" ڈرامہ ریلے ہو چکے ہیں ۔ ایک افسانہ "عجیب کترا" بھی ریلے ہو چکا ہے ۔ اسی طرح اداکاری کی خواہشات بھی میری روح میں سمائی ہوئی ہیں ۔ اپنے ڈراموں میں خود ہی کام کر رہا ہوں ۔ اردو ادب میں لکھنے کے لئے دل میں تمناؤں کے جگنو جگمگاتے رہے ہیں لیکن کوئی سہارا نہ مل سکا تھا ۔ اب نکہت باجی (زبیدہ بانو نکہت صاحبہ شاجاپوری) کا مجھے سہارا ملا ہے اور اردو ادب کے افق پر پر تول رہا ہوں ۔ میرے محبوب شاعر اقبال، جوش ملیح آبادی، غالب، شاد، حفیظ، مجاز لکھنوی ہیں ۔ افسانہ نگاروں میں کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، واجدہ تبسم کے افسانے مجھے بے حد پسند ہیں ۔ انگریزی کیٹس (KEATS) شیلی (SHELLEY) برنارڈ شاہ، ٹی ایس ایلیٹ (ELIAT) شکسپیر (SHAKESHPEERE) ادیب مجھے بہت پسند ہیں ۔ یہ اشعار مجھے مشعل بن کر راہ دکھاتے ہیں ۔

(باقی صفحہ پر)

بَابُو۔۔۔۔دفتر کا

(بیدلؔ سرحدی بی اے ادیب ۱۱ کلکٹر گنج ہاپوڑ ۲۴۵۱۰۱ (یو۔پی)

(وسط درجہ کے ملازم پیشہ لوگوں کے لئے پہلی تاریخ کا دن بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ہر شخص پہلی تاریخ کو تنخواہ لے کر دوسرے دن سے اگلے مہینے کی پہلی تاریخ کا انتظار شروع کر دیتا ہے اور یہ انتظار در انتظار کا سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک وہ شخص ملازمت سے ریٹائر نہیں ہو جاتا۔ بشرطیکہ ملازمت کے دوران وہ مُلکِ عدم کو نہ سدھار جائے مختصر یہ کہ ملازم کی زندگی ایک مسلسل انتظار ہے۔ ویسے بھی لفظِ انتظارؔ میں کس درجہ جاذبیت و کشش ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ اردو شاعری کے بابائے آدم جناب ولی دکنی سے لے کر آج تک کے کم و بیش تمام شعرا حضرات کے کلام پر اگر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے تو شاید معدودے چند اصحاب سخن ایسے ملیں جنہوں نے لفظِ انتظارؔ کو بخش دیا ہو۔ بہ الفاظِ دیگر ہر شاعر نے موضوعِ انتظار پر کسی نہ کسی ڈھنگ سے طبع آزمائی ضرور فرمائی ہے۔ اگر تنگ نظری سے کام نہ لیا جائے تو لفظِ انتظار میں خاصی وسعت بھی ہے۔ بظاہر اس لفظ میں زندگی کی راحتیں، عشرتیں امنگیں اور مسکراہٹیں وابستہ نظر آتی ہیں مگر پس پردہ زندگی کی چیخیں، فریادیں، کڑواہٹیں حتیٰ کہ انسان کی موت تک پوشیدہ ہے۔ مختصراً اگر ہم زندگی اور موت کے درمیانی فاصلہ کو "جلوۂ انتظار" کہہ دیں تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔ بہرکیف اصل مقصد سے دُور نہ ہٹتے ہوئے میں زیرِ نظر عبارت میں موضوعِ انتظار کے صرف ایک پہلو کو اجاگر کرنے کی سعی کروں گا یعنی ملازمین کا ہر مہینے کی پہلی تاریخ یا یوں کہئے تنخواہ کے دن کا انتظار . . . . . انتظار تو ہر ملازم کرتا ہے لیکن ہر ملازم کا مقصدِ انتظار بھی ایک ہو یہ ضروری نہیں۔ مقصدِ انتظار کے پیچھے ملازم کی ذاتی خواہشوں، آرزوؤں اور ارمانوں کے خوابوں کی ایک دُنیا آباد ہوتی ہے جسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے ہر شخص تانے بانے میں مبتلا رہتا ہے اس لئے کسی بھی ملازم کے مقصدِ انتظار پر اظہار خیال کرنا یا کوئی رائے قائم کرنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے تا وقتیکہ ملازمین کو کچھ حصوں میں منقسم نہ کر لیا جائے۔ لہٰذا اپنے تجربات و مشاہدات کے تحت ملازمین کو مندرجہ ذیل تین حصوں میں تقسیم کرنے کے بعد اُن کے مقصدِ انتظار پر ذاتی تاثرات رقم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میرے تاثرات اگر اُن کے حالاتِ واقعی کا عکسِ جمیل نہ ہوں گے تو کم از کم اُن میں ملازمین کی زندگیوں کی ایک خاصی جھلک ضرور موجود ہوگی۔

حصہ اوّل: میں وہ غیر شادی شدہ نوجوان جنہیں ملازمت حاصل کرنے میں ابھی ابھی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

حصہ دوم: میں وہ شادی شدہ نوجوان جنہوں نے حال ہی میں شادی رچائی ہو۔

حصہ سوم: میں وہ بال بچے دار صاحبان جن کے ذہن میں جذبۂ احساس بزرگی بیدار ہو چلا ہو۔

حصّہ اوّل

کے ہر نوجوان کو طالبعلمی کی زندگی سے دست بردار ہو کر حصولِ ملازمت میں کم و بیش کچھ عرصہ سڑکیں تو ناپنی ہی پڑتی ہیں یہ عرصہ اُن کے لئے کیف و بیزاری کا ملا جلا زمانہ ہوتا ہے۔ اس دور میں اُن کے معصوم چہروں پر کبھی اُمید کے آثار نظر آتے ہیں۔ تو کبھی مایوسی ٹپکتی ہے۔ بہر حال جب وہ ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو اُن کی کیفیت بدل کر بالکل ایسی ہو جاتی ہے جیسے سالہا سال کی لگاتار ریاضت کے بعد کسی سالکِ راہِ حقیقت کو کوئی مقام حاصل ہو جاتا ہے ان کی سالہا سال کی دبی ہوئی امنگیں، بجھی ہوئی آرزوئیں

...یف۔ وہ ... تنخواہ ملازمت جگمگا اٹھتی ہیں۔ ملازمت مل جانے کے بعد جب وہ بازار میں گھومنے نکلتے ہیں تو دکانوں میں سجی ہوئی خوبصورت چیزیں اُن کی نگاہوں کا مرکز بن جاتی ہے۔ وہ ہر چیز کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ مختلف دکانوں پر جاکر فونٹین پین، چشمے، ٹائی پن، سگریٹ کیس۔ لائٹرز، لانڈ شرٹ، مفلر، ریڈیو، ... پولسٹر کی قمیضیں، تیری کاٹ کی پتلونیں، گھڑیاں، کیمرے اور نہ معلوم کن کن اشیاء کو حسرت بھری

نظروں سے تکتے ہیں اور دام پوچھ کر گھر واپس آجاتے ہیں۔ رات کو بستر پر سونے کے وقت مختلف دکانوں پر دیکھی ہوئی چیزیں ان کی اندرونی آنکھ کے سامنے سینما کی متحرک تصویر کی مانند رقص کرنے لگتی ہیں۔ وہ اپنے ذہن میں حساب لگاتے ہیں کہ اس مہینے کی تنخواہ پر پائپ، اس سے اگلے مہینے کی تنخواہ پر اسکارف اور اس کے اگلے مہینے "وہ" اور پھر اس سے اگلے مہینے "وہ" چیز خریدیں گے۔ غرض اس طبقہ کا ہر فرد ایسی ہی ادھیڑ بن میں منہمک رہتا ہے حتیٰ کہ نیند اسے جبراً ... اپنی آغوش میں دبا لیتی ہے بہرحال شروع کے دو چار مہینوں میں تو وہ دو چار اشیاء خرید ہی لیتے ہیں۔ اکثر والدین اولاد کی خوشی میں ہی اپنی خوشی محسوس کرتے ہیں۔ انہیں اپنی اولاد سے زیادہ دنیا کی کوئی شے عزیز نہیں ہوتی۔ اس لئے وہ اپنے بچوں کو اُس وقت کچھ نہیں کہتے سنتے، جب تک ان کی فضول خرچیاں حد سے تجاوز نہیں کر جاتیں۔ دورِ حاضر میں بچوں کی پرورش اور بالخصوص تعلیم و تربیت میں کس قدر تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ کسی صاحبِ اولاد سے پوشیدہ نہیں۔ بلا وجہ والدین کو اپنی اولاد سے کافی امیدیں وابستہ ہوتی ہیں اور اگر ملازمت مل جانے کے بعد اولاد اپنی من مانی کرنے لگے گھر کی بحالی کا کچھ خیال نہ کرے تو والدین کو دکھ ہوتا ہے۔ وہ اولاد کو سمجھانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ وہ سمجھاتے ہیں اور ہر ممکن طریقے سے سمجھاتے ہیں مگر عمر کا یہ حصہ کچھ ایسا ہوتا ہے کہ کسی کا سمجھایا بجھانا، پند و نصائح کچھ اثر نہیں رکھتے۔ اس عمر میں اکثر لڑکے اپنی ہستی میں ہی مگن رہتے ہیں۔ انہیں مکان کے کرایہ سے غرض نہ پرچون سودا سلف والے دوکاندار کے اُدھار چکانے سے کوئی مطلب، نہ ماں کی بوسیدہ شلوار کی پرواہ، نہ باپ کی ٹوٹی ہوئی کمانی والی عینک کی مرمت کی کوئی فکر اور نہ ہی چھوٹے بھائی بہنوں کی اسکول فیس کی ادائیگی کا کوئی خیال ..... انہیں اگر کوئی فکر دامنگیر ہوتی ہے تو وہ فقط اپنی فکر، اپنے لئے خوبصورت رومال، دلکش عطریات، بال گھنگھروالے بنانے کے کلپ اور سگریٹ کیس وغیرہ خریدنے سے مطلب اور بس ـــ" ان حالات میں اکثر والدین اپنے لڑکے کی شادی کے لئے چارہ جوئی شروع کر دیتے ہیں۔ ایسا کرنے میں اُن کا یہ خیال مضمر ہوتا ہے کہ شادی کے بعد اُن کا لڑکا راہِ راست پر آجائے گا۔ شادی کی باتیں نوجوان لڑکے کے دل میں ایک نیا طوفان برپا کر دیتی ہیں۔ اس کے دل میں جذبۂ عشق مچلنے لگتا ہے اور وہ کسی نہ کسی لڑکی سے محبت کی پینگیں بڑھا کر شادی رچانے کے خواب دیکھنے لگتا ہے۔ اس ضمن میں دفتر میں کام کرنے والے ایک نوجوان کا ذکرِ خیر کر دینا کچھ بے محل نہ ہوگا۔ جس نے اپنے جذبۂ عشق کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی غرض سے دفتر کے بڑے صاحب کی اسٹینو گرافر عیسائی لڑکی مس ایولین Miss Eavlin کو ہر مہینے تحفے تحائف دینا شروع کر دیئے تھے۔ اس کا کہنا تھا کہ شادی کے لئے دولت درکار نہیں بلکہ محبت کی ضرورت ہے اور وہ یہ بات اپنے والدین پر ثابت کرنا چاہتا ہے۔ اسی لئے اُس نے رومانس کا آغاز تحفے تحائف سے کر دیا ہے۔ تاکہ مس ایولین کو اپنا سکے مگر اس کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا تھا۔ وہ اپنی ہر ممکن کوشش کے باوجود ناکام رہا تھا اور بالآخر اپنے والدین کے منتخب و طے کردہ رشتہ میں ہی شادی کرنی پڑی تھی۔ بہرحال شادی کے بعد وہ ملازمین کے حصہ دوم کے شمار میں آجاتا ہے

حصہ دوم

شادی سے پہلے نوجوان لڑکوں کی طرح لڑکیاں بھی اپنے دلوں میں خیالی محل تعمیر کرتی رہتی ہیں۔ کم و بیش ہر لڑکی کی خواہش ہوتی ہے کہ اُسے خوبصورت تعلیم یافتہ، خوش اخلاق اور برسرِ روزگار دولہا نصیب ہو۔ وہ شادی کے بعد ایک نیا گھر، ایک نئی دنیا بسانے کے خواب دیکھا کرتی ہیں۔ اُن کے

دلوں میں طرح طرح کے ارمان مچلتے رہتے ہیں۔ وہ اپنے ہونے والے شوہر کے دل کو جیتنے کے لئے گھر کی سجاوٹ کے جدید طریقوں پر غور کرتی ہیں۔ خوش ذائقہ پکوان بنانے میں دسترس حاصل کرتی ہیں۔ اپنی طرزِ گفتگو سدھار کر اس میں دل کشی، حلاوت، شیرینی اور مٹھاس پیدا کرنے کی پریکٹس پیدا کرتی ہیں اور سب سے زیادہ توجہ تنہائی میں آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے جسم کے ہر عضو پر کرتی ہیں۔ اپنے عکس سے دل ہی دل میں باتیں بھی کرتی ہیں۔ بعض اوقات خدا جانے وہ کن کن خوش فہمیوں کے تحت اپنے آپ سے ہی شرما جاتی ہیں اور نہ معلوم کیا کیا جذبات شادی سے پہلے لڑکیوں کے دلوں میں ابھرتے ہیں جن کی تفصیل بیان کرنے سے راقم اس لئے قاصر ہے کیونکہ وہ مرد ہے۔ بہرکیف کچھ اس نوع کے تخیلات و تصورات میں وہ کھوئی کھوئی رہتی ہیں۔ لیکن ساس، سسر کا تصور غالباً بھولے بھٹکے بھی اُن کے ذہن میں نہیں آتا۔ جب شادی ہو جاتی ہے تو وہ اپنی کم فہمی و نادانی کے سبب ساس، سسر کو بھی اپنی ترقی کی راہ میں ایک رُکاوٹ خیال کرتی ہیں۔ اکثر دیکھنے میں یہ بھی آیا ہے کہ شادی کے بعد جب والدین اپنے لڑکے کی فضول خرچیوں، اس کی عادات، طور و اطوار اور روش میں کچھ تبدیلی نہیں پاتے تو اُس کا غصہ اپنی بہو پر اُتارتے ہیں۔ وہ اپنی بہو کو اپنے بیٹے کی بداعمالیوں کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں اور شادی کے کچھ عرصہ بعد ماں اپنے بیٹے کے سامنے اُسکی بیوی کے خلاف شکایتوں کا دفتر کھول کر رکھ دیتی ہے۔

"تمہاری بیوی رانی مجھ سے اچھا سلوک نہیں کرتی۔ مجھ سے عزت سے پیش نہیں آتی۔ میرا کہنا نہیں مانتی۔ گھر کے کام کاج میں میرا ہاتھ نہیں بٹاتی، دوپہر تک پلنگ پر پڑی سوتی رہتی ہے۔ بس ہمہ وقت اپنے حسن و جمال کی آرائشوں میں محو رہتی ہے وغیرہ وغیرہ ......" اب ماں کا سعادت مند بیٹا بھلا اپنی ماں کی توہین کیسے برداشت کرے وہ اپنی بیوی کو پریشان کرنے لگتا ہے۔ جذبات میں مغلوب اپنی نئی نویلی دلہن پر طرح طرح کے ظلم و ستم ڈھانے لگتا ہے

جس سے دلہن کا حساس دل کانپ اٹھتا ہے۔ اس کے خیالی محل مسمار ہونے لگتے ہیں۔ اس میں اپنی ساس کے خلاف آتشِ انتقام لاوہ بن کر پھوٹ پڑتی ہے اور وہ کبھی موقع بے موقع ساس کے خلاف اپنے شوہر کے کان بھرنا شروع کردیتی ہے۔ اس طرح کبھی ماں کی کہانی کبھی بیوی کا افسانہ لڑکے کیلئے مستقل دردِ سر کے عارضہ کی صورت اختیار کرلیتے ہیں۔ ماں اور بیوی میں آئے دن چھوٹے چھوٹے جھگڑے آخر اُسے ایسے مقام پر لاکھڑا کر دیتے ہیں جہاں ان پریشانیوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے اُسے کوئی نہ کوئی فیصلہ کرنے پر مجبور ہونا ہی پڑتا ہے اور اکثر وہ فیصلہ ہوتا ہے۔ والدین سے علیحدگی کا . . . . . . والدین سے علیحدگی کا فیصلہ اس کے لئے خود کو تباہی کی جانب لے جانے کے مترادف ثابت ہوتا ہے جس کا احساس اُسے بعد ازاں ہوتا ہے۔

بہرحال علیحدگی کے بعد لڑکا خود مختار ہوجاتا ہے بلکہ یوں کہئے کہ مکمل 'بابو' بن جاتا ہے۔ مکان کرایہ پر لیا جاتا ہے مکان کی سجاوٹ کے لئے بابوجی اور بی بی جی دونوں مل کر غور وخوض کرتے ہیں۔ دفتر کے بابوؤں کو شروع شروع میں قرض قدرے آسانی سے مل جاتا ہے۔ اس لئے بابوجی کو نئے گھر کی سجاوٹ کے لئے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ وہ کسی دکان سے ریڈیو سیٹ، کسی سے ٹائم پیس، کسی سے سلائی کی مشین، کسی سے صوفہ سیٹ اور کسی سے بستر رکھنے والا ٹرانزسٹرنک قرض پر کرایہ کے مکان کو بھر دیتا ہے۔ مکان کی آرائش کے بعد دونوں اپنی اپنی زیبائش کے بارے میں سوچتے ہیں اور بابو ایک بار پھر اپنے دو عدد ریڈی میڈ سوٹ، ایک عدد سائیکل اور اپنی بیوی دو عدد جدید ڈیزائن کے لیڈیز کوٹ اور اس کی نرم ونازک کلائی پر باندھنے کے لئے ایک خوبصورت گھڑی قرض پر اٹھا لاتا ہے۔ اس طرح وہ اپنی سمجھ سے ہر قسم کی ترقی کرلیتا ہے۔ مگر اپنے دفتر میں ترقی کا اسے بھول کر بھی خیال نہیں آتا۔

ویسے اوسط درجہ کا ملازم عموماً دفتر میں ترقی کر بھی نہیں پاتا کیونکہ اس کا بیشتر وقت ذہنی الجھنوں میں آنا

کٹ جاتا ہے۔ اکثر جس عہدہ پر اُس کا تعین ہوتا ہے اُس ہی پر ریٹائر ہوتا ہے۔ بابوجی کی تنخواہ اس قدر کم ہوتی ہے کہ اُس کے گھر کے اخراجات بمشکل پورے ہوتے ہیں اور جب قرض کی ادائیگی کا سوال اٹھتا ہے تو وہ پریشان ہوجاتا ہے۔ قرض کی ادائیگی کا خیال اس کے ذہن پر ہر گھڑی بھوت کی طرح سوار رہتا ہے۔ کافی سوچ وچار کے بعد جب اُسے کوئی صورت نظر نہیں آتی تو وہ پٹھان نما سود خور بنیوں کا سہارا لیتا ہے اور یہ سہارا لے کر وہ اپنی زندگی کو کبھی نہ ختم ہونے والے عذاب میں دھکیل دیتا ہے کیونکہ ان پٹھان نما سود خور بنیوں کا سود اور پھر سود در سود اتنا خطرناک ہوتا ہے کہ ایک بار قرض لینے کے بعد انسان سود دیتے دیتے ہی مرجاتا ہے اور اصل رقم جوں کی توں قائم رہتی ہے۔ ایک وقت آتا ہے جب اسے بازار سے نکلنا تو درکنار بابوجی کا دفتر سے تنخواہ لے کر باہر نکلنا بھی مشکل ہوجاتا ہے۔ تنخواہ کے روز دفتر کے باہر قرض خواہوں کی ایک لائین لگی رہتی ہے۔ تنخواہ والے دن بابو بے چارہ قرضخواہوں کی قیامت خیز نگاہوں سے بچ بچاکر، چھپ چھپاکر نئے نئے راستے اختیار کرکے کہیں رات کو اپنے گھر آ لگتا ہے جہاں اُس کی بیوی اس کی راہ دیکھ رہی ہوتی ہے اسی طرح وقت گزر جاتا ہے۔ بابوجی کی نکٹائیاں اُترتی جاتی ہیں۔ اس کے گرم سوٹ پھٹتے جاتے ہیں اور وہ تنہائی میں بیٹھ کر گھنٹوں اپنی حالت زار پر آنسو بہایا کرتا ہے۔ اس دور میں اُسے کچھ بھی نہیں سوجھتا پریشانی کا کوئی حل نظر نہیں آتا۔ اس کی حالت پاگلوں کی سی ہوجاتی ہے۔ وہ زندگی سے فرار چاہتا ہے۔ کئی بار خودکشی تک کے خیالات اُس کے ذہن میں اُبھرنے لگتے ہیں۔ لیکن چونکہ اسی دوران وہ ایک دو بچوں کا باپ بن چکا ہوتا ہے اس لئے وہ زندگی سے راہِ فرار اختیار نہیں کرسکتا خودکشی نہیں کرپاتا۔ اسی کس مپرسی کے عالم میں وہ اس شہر سے تبادلہ کے بارے میں درخواستیں دینا شروع کردیتا ہے۔ اپنے افسران سے گڑگڑا کر منت سماجت اور خوشامد کرتا ہے التجائیں کرتا ہے۔ تب وہ بار بار سوچتا ہے کہ کاش اُس نے

(باقی [illegible] پر)

حضرت ساقی سکروڈہوی مرحوم

(اپنے خطوط کے آئینہ میں)

حکایتیں تو بڑی پیارے حسین ہوتی ہیں
مرے خلوص کو شامل نہ کر فسانے میں
عدم

ادب و انشا کے کارواں میں ایسی بیشمار، قد آور، نامور، مقبول، مشہور اور عظیم شخصیتیں نظر آتی ہیں۔ جنہوں نے (ہر راہ میں اک نقش قدم چھوڑ دیا ہے)
بلکہ یہ کہنا درست ہوگا (مستند ہے جن کا فرمایا ہوا۔۔)
لیکن میں آپ کا تعارف ایک ایسی گمنام اور خاموش شخصیت سے کرا رہا ہوں جسے اپنے بارے میں اعتراف ہے کہ: (اس تبسم فروش دنیا میں ___ ہم غریبوں کو کون پہچانے)
اگر آپ تھوڑی دیر کے لئے میری یہ گذارش قبول کر لیں کہ یہ نہ دیکھئے کس نے کہا، بلکہ یہ دیکھئے کہ کیا کہا، تو جہاں مطلع ادب پر بہت سے آفتاب اور ماہتاب چمک رہے ہیں وہاں کچھ ستاروں اور ذروں کی ضوفشانی بھی آپ کو دعوت نظارہ دے رہی ہے۔
اردو زبان کی خطوط نویسی، فن کی ایک مستقل قدر کا درجہ حاصل کر چکی ہے اور اسی سلسلہ میں مرزا غالب کے خطوط (اردوئے معلیٰ، عود ہندی) اور مولانا آزاد کے خطوط کا مجموعہ (غبار خاطر) ایک ایسا ادبی سرمایہ ہے جو اردو خطوط نویسی کے لئے ایک مستقل روایت کی حیثیت رکھتا ہے لیکن مرحوم ساقی سکروڈہوی نے اپنے کچھ معروف اور غیر معروف دوستوں کو جس انداز سے خطوط لکھے میں یہ نہیں کہتا کہ وہ ایک تاریخی دستاویز ہیں۔ بلکہ اُن کا سیدھا سادا بے تکلف اور پُر خلوص انداز بیان، ایک اچھوتا پن اور منفرد حیثیت رکھتا ہے ہاں اتنا اور عرض کر دوں گا کہ مرحوم کے جو چند خطوط پیش کئے جا رہے ہیں انہیں مرحوم نے اس یقین کے ساتھ لکھا کہ وہ ہمیشہ مکتوب الیہ تک ہی رہیں گے۔
کبھی اخبارات اور رسائل کی زینت نہیں بنیں گے۔ اس نقطہ نظر سے اِن خطوط کی بے ساختگی قابل توجہ ہے۔ مرحوم نے اپنے خون دل سے چراغ اس لئے نہیں جلائے کہ اُن سے کوئی روشنی لے۔ اپنے خلوص کو متاع ہنر سمجھ کر پیش نہیں کیا۔ شہرت کی خاطر اپنے کمال کا مظاہرہ نہیں کیا فکر و فن کی راہوں میں کہیں امیر کارواں بننے کا خواب نہیں دیکھا۔
ایک دور افتادہ گاؤں میں گوشہ نشینی کی زندگی گذارنے والا صرف غزل کا ایک شاعر اپنے احباب کو ایسے ہلکے پھلکے اور بے تکلف خطوط لکھے۔ جن میں کتنا ادب ہے خلوص کی کتنی شدت ہے کیسا بے ساختہ پن ہے۔ کتنی حلاوت اور دلکشی ہے۔

مجھے یہ حق نہیں کہ یہ سب باتیں میں آپ کو تسلیم کرنے پر مجبور کروں بلکہ مرحوم کے چند خطوط آپ کے سامنے رکھ کر فیصلہ آپ ہی پر چھوڑتا ہوں۔

والسلام

خیراندیش نصرت فخری

سکروڈہ۔ سہارنپور

۵ جنوری سنہ ۱۹۷۸ء

حضرت ساقی سکروڈہوی مرحوم خلد آشیاں کا ایک خط

اپنے ایک ساتھی شری جگدیش نرائن سنہا وزیر تعلیم یو.پی سرکار کے نام

سکروڈہ ۲۰ جنوری سنہ ۱۹۶۴ء

میں خطاکار تو غریب نواز میری تیری برابری کیا ہے

محترمی۔ بجا ارشاد فرمایا۔ اوچھے گھڑے چھلک ہی جاتے ہیں۔ میری صاف بیانی میری کم ظرفی کی دلیل ہے اور آپ کی خاموشی اور سادگی گمبھیرتا کا روشن ثبوت۔

مگر میرے دوست کبھی جو ساقی کے اب کہیں گے۔ تو مبالغہ سے کام نہیں لے گا۔ "گذارش واقعات ہوگی۔ جناب کے حسنِ کار کردگی سے کس کافر کو مجال انکار ہو سکتی ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ دشمن بھی کبھی آپ کی سرکار سے نامراد واپس نہیں گیا۔ نامرادی تو دوستوں کا حصہ ہے۔"

محبت جسکو دیتے ہیں اُسے پھر کچھ نہیں دیتے
اُسے سب کچھ دیا ہے جسکو اس قابل نہیں سمجھا

اگر میں یہ کہوں۔ کہ جناب کی بارگاہ میں دوست دشمن کا کچھ امتیاز نہیں۔ تو آپ کو ناگوار تو نہ گذریگا۔؟

اچھا حضور ہم دشمن ہی سہی۔ پھر بھی ایک تعلق تو ضرور رہا۔ دوستی کے ناطے نہ سہی دشمنی کے ناطے ہی۔

کہ ہیو فاکہے سے بُرا مانتے ہو تم
میری طرف تو دیکھئے میں بیوفا سہی

بھولی سرکار۔ شاعر کی زندگی میں ایسے بیشمار وقت آتے ہیں جب وہ اپنے ضمیر کے لئے نہیں محبوب کی رضا کے لئے اپنی ہر خواہش کو ٹھکرا دیتا ہے۔

طاقت سے ٹکرانا تو نہایت آسان ہے۔ مگر شرمسار آنکھوں میں آنسو کا ایک قطرہ۔ لرزتے ہونٹوں پر التجا کا ایک لفظ میرے ایسے کمزور ناتواں کی قوتِ برداشت سے باہر ہے۔

آ میری اور اپنی حقیقت کو تول لے
طاقت پہ تجھ کو ناز مجھے عاجزی پسند

فقط آداب

ہر حال میں آپکا دیرینہ ساتھی۔

ساقی سکروڈہوی

شری مہابیر پرشاد تیاگی وزیر بحالیات حکومت ہند کے نام

سکروڈہ ۲۸ فروری سنہ ۱۹۶۵ء

محترم تیاگی جی۔۔۔

گرامی نامہ موصول ہوا۔ یاد آوری کا شکریہ اور بیحد شکریہ جہاں تک آپ کے تشریف لانے کا سوال ہے" یہ بات ہماری آرزو کے عین مطابق ہے"۔ اس لئے کہ آپ کی تشریف آوری پر ہم غریبوں کے پاس نذر دینے کے لئے سوائے دو ووٹ کے اور تھا ہی کیا" جو عقیدت اور احترام کے ساتھ پیش کر دئے گئے تھے۔ بقول شخصیکہ۔

قطرۂ خونِ جگر سے کی تواضع عشق کی
سامنے مہمان کے جو تھا میسّر رکھ دیا

ہماری رائے میں آئندہ سال آپ کی تشریف آوری کے لئے وقت مناسب ہوگا۔ اب رہی ہماری مانگ اور ہماری ضروریات کی بات ؟ سو بندہ نواز گذارش یہ ہے کہ

یاروں کو جو جواب ملا مجھ کو یاد ہے
اب کس کو آرزو جو تمنا کرے کوئی

آپ کی عنایتوں کے طفیل ابھی تک جی رہے ہیں۔ آپ فکر نہ فرمائیں۔

"زندگی ہے تو بہر طور گذر جائے گی"

یار زندہ و صحبت باقی

والسلام

نیازمند آپ کا۔
ساقی سکروڈہوی

اپنے رفیق کار بچپن کے ساتھی حضرت روشن صدیقی کے نام مرحوم

سکروڈہ ۱۰ ستمبر ۱۹۶۶ء

آرہی ہے شام ہی سے آنکی یاد — رات گذریگی بڑے آرام سے

میرے محبوب۔ سلام قبول ہو۔

نہ جانے آج کیوں آپ بے حد یاد آرہے ہیں۔ برسات کا یہ حسین موسم۔ اور آپ کی یاد۔ دل چاہتا ہے کہ جی بھر پیار کروں۔ مگر تقدیر کو یہ بات کہاں پسند۔

آپ مجھے شرمندہ کرتے ہیں۔ آپ کی عنایتوں اور محبتوں کا بدل دینا میری محبت سے باہر ہے۔

میری ناکام محبت ہی کچھ شاید بدل ہو سکے۔

کچھ بھی ہو جیتے جی تو آپ کو بھلا دینا میرے لئے ناممکن ہے۔

وہ گرمئی بازار اب کہاں۔ مدت ہوئی کسی غریب نواز نے اپنی عنایتوں اور نوازشوں کے بدلے سب کچھ خرید لیا تھا۔

آپ نے ایک پتھر کو تہذیب بخشی۔ انسانیت دی۔ اور اپنی محبت عطا کی۔ تو پھر وہ پتھر، پتھر کہاں رہا اب تو وہ ایک انسان ہے۔ جو ہر وقت آپکے مبارک قدموں کو چومنے کیلئے تڑپتا ہے۔ اور آپ ہیں کہ اسے اپنے قدموں کی خاک بھی مرحمت نہیں ہونے دیتے۔

جس پتھر سے آپ نے بار بار ٹھوکر کھائی ہے۔ کیا وہ آپ کو دیوار بن کر نہیں روک سکے گا۔ آپ مغالطہ میں ہیں۔ اندھیرا ہمیشہ نہیں رہتا۔

رہِ حیات کا تنہا سفر نہیں اچھا
کسی غریب کو بھی اپنے ساتھ لیکے چلو

نیازمند آپ کا
ساقی سکروڈہوی

حضرت مولانا شریف احمد صاحب کے نام

سکروڈہ ۳ اکتوبر ۱۹۷۴ء

مولوی۔ خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کردے۔ ابتلا کے اس دور میں اسلام کو حجاج کی نہیں مجاہدین سربکف کی ضرورت ہے۔ یہ گندم نما جو فروشی یہ اسلام کے پردے میں رہبانیت کی تعلیم۔ ارے معاذ اللہ۔ خدا فریبی نہیں تو پھر کیا ہے۔

آ تجھ کو بتاؤں میں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول تقریر و کلام آخر

بفضلہ حجاج کی کھیپ تو یہاں پہلے ہی سے وافر ہے۔ مزید دعاؤں کی ضرورت نہیں اگر تمہیں ضرورت ہو تو یہاں سے برآمد کئے جا سکتے ہیں۔

دعا تو یہ فرمائیے۔

جنھیں حج کا شرف بخشا ہے تو نے
انہیں بازوئے حیدر بھی عطا کر

اگر آپ اپنی رائے پر بضد ہیں تو آپ کی مرضی۔ مگر خدا کے لئے میرے گھر پر رحم فرمائیے پہلے ہی مستورات کی تنک مزاجی سے ناک میں دم ہے۔ حج کے بعد کا عالم کیا ہوگا؟

خدا محفوظ رکھے۔

والسلام

دعائے خیر کا طالب
ساقی

اپنے ساتھی اپنے ہم نشیں جناب غازی سکروڈہوی کے نام جناب عامر عثمانی دیوبندی کے انتقالِ پُرملال پر

سکروڈہ ۔ ۲۰/ اپریل ۱۹۷۵ء

محبی ۔ سلام مسنون۔

آپ کا خط پا کر کچھ عجیب سی کیفیت ہوتی ہے۔ مسکراہٹیں، مسرتیں، طنز و مزاح، آہ و بکا احاطہ کر لیتے ہیں۔ اشتیاق کے عالم میں خط وصول کرتا ہوں۔

آپ کا خط پہنچا۔ کچھ مصروف تھا۔ پر کچھ خود نہیں پڑھ سکا۔ اس لئے خزانے کی طرح جیب میں چھپا لیا مگر جب کسی سے پڑھوایا تو وائے حسرتا۔ کیا سمجھتا تھا کیا سنا۔ اِنا للہ و اِنا الیہ راجعون۔ موت تو زندگی کا انجام ہے۔ مرنے کی نہ کوئی شکایت نہ گلہ۔

مگر اس سانحہ کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ مشیت بھی کچھ "جن سنگھی" معلوم ہوتی ہے۔ ایک طرف تو حکومت اردو کو مٹانے کے لئے اپنی تمام تر صلاحیت صرف کر رہی ہے تو دوسری طرف قضا و قدر کے فرشتے پوری تندہی سے اس خدمت کو انجام دینے میں مصروف ہیں۔

ان واقعات سے متاثر ہو کر یہ گزارش ہے کہ خدا کے لئے اپنے نام کے ساتھ آئندہ سے غازی نہ لکھا کریں مبادا یہ اناڑی فرشتے کہیں آپ کو بھی شاعر سمجھ کر وقت سے پہلے ہی نہ دھر لیں۔ یہ کوئی بناوٹ نہیں۔ بلکہ حقیقت ہے کہ آپ کے ساتھ ادب و تہذیب اخلاق و مروت کا آخری چراغ سکروڈہ سے گل ہو جائے گا۔ یہ شمع کچھ اور دن کے لئے روشن رہے تو بہتر ہے۔

رسالہ تجلی میں عامر مرحوم کا سفرنامہ ہے۔ وہ دیکھنے کے لئے عنایت کر دیجئے۔

والسلام

آپ کا
ساقی سکروڈہوی

اپنے ایک دوست ملٹری آفیسر بالی صاحب کے نام۔

سکروڈہ ۲۶ / مارچ ۱۹۷۷ء

بھول گئے وہ عہدِ محبت پڑ گئی شاید بات پرانی

پیارے بالی۔ خدا تجھ پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔ کیوں میرے عزیز اتنی جلدی بھول گئے۔ وہ محبت سے بھرپور اخلاص وہ مدبھری عنایتیں کیا صرف ایک فرضی حادثہ تھا۔

حضرت آرزو لکھنوی کا یہ شعر کبھی آپ نے سنا ہے۔

زور کیا ہے جو تو وفا نہ کرے
پھول کانٹا بنے خدا نہ کرے

مجھے آپ کی مصروفیت کا علم بھی ہے اور آپ کے قیمتی وقت کا احساس بھی۔ لیکن گستاخی معاف۔

محبت ہو وفا کا پاس ہو خود تم کو الفت ہو
جو تم چاہو تو کیا کچھ ہو نہیں سکتا مگر کیوں ہو

بُرا نہ مانو۔ تو صاف کہہ دوں۔ اگرچہ آپ کو فوجی ملازمت اختیار کئے عرصہ ہو چکا ہے۔ مگر فنِ سپہ گری میں آپ نہ صرف یہ کہ کوئی مہارت ہی حاصل کر سکے ہیں بلکہ بالکل ہی ناواقف ثابت ہوئے ہیں۔ اس لئے کہ

یہ روٹھنا پیار کی علامت ہے
تم کو بیداد بھی نہیں آتی

حضور روٹھنے کی شان تو یہ ہے کہ آپ کسی کو یاد بھی نہ آئیں۔ تب ہم جانیں۔

ہائے رے آپ کے دیوانہ کا یہ شعر

یوں چلے ہیں وہ روٹھ کر جیسے
اب کبھی یاد بھی نہ آئیں گے

آپ کا مختصر قیام زندگی کی ایک حسین یادگار بن کر رہ گیا ہے۔ غمِ دوراں سے جب بھی تھوڑی سی فرصت ملتی ہے تو وہ محبت یاد آجاتی ہے کہ مومن نے کس حقیقی انداز میں کہا ہے۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اپنی اِس طویل خاموشی اور غیر حاضری پر مخلص دوستوں سے شرمندہ بھی ہوں اور معذرت خواہ بھی۔ لیکن اگر وہ اِس حقیقت کو سمجھنے کی تکلیف گوارا فرمائیں۔

اے عشق تجھے برباد نہ کر شورش کیلئے اسباب نہیں
اُمید کے اجڑے گلشن میں ایک پھول بھی شاداب نہیں

جب پیار کرنیوالے ہی اپنوں سے منہ موڑ لیں۔ جب طوفانی ہوائیں اپنا رُخ بدل لیں تو من کے ساگر میں موج آئے تو کیسے۔ یگانہ لکھنوی نے اِس کیفیت کو یوں بیان کیا ہے۔

نقشہ بھی پامال اپنا بھی یہ حال
کروٹ بدلیں کس کے سہارے

ہولی کے رنگین تہوار پر مبارکباد قبول فرمائیے۔ دو شعر حضور کی نذر کرتا ہوں۔

رنگینیٔ بہار کی باتیں نہ پوچھئے
کیسے کٹیں فراق کی راتیں نہ پوچھئے
اشکوں سے کہہ رہے ہیں حکایاتِ دردِ دل
وارفتگانِ شوق کی باتیں نہ پوچھئے

خدا کرے مزاج بخیر ہو۔

آپ کا۔
ساقی سکروڈہوی

نئی کتابیں

تاریخ ادب اُردو	ڈاکٹر جمیل جالبی	۶۰/-
ارسطو سے ایلیٹ تک	"	۴۰/-
بستانِ آتش	شاہ عبدالسلام	۱۶/-
…گڑھ سے علی گڑھ تک	ڈاکٹر اطہر پرویز	۱۲/-
…افشانیٔ گفتار	نشور واحدی	۵/-
ریڈیو فیچر	جگن ناتھ آزاد	۲/۲۵
مکاتیب احسن	ڈاکٹر عنوان چشتی	۲۰/-
اُردو شاعری میں جدیدیت کی روایت	"	۲۰/-
دھنک	عزیز اندوری	۶/-
اقبال اور قرآن	ابو محمد مصلح	۱۸/-
اقبال ایک تجزیاتی مطالعہ	سید معراج نیر	۱۵/-
سفرنامہ اقبال	حق نواز	۲۵/-
خطوطِ اقبال	رفیع الدین ہاشمی	۴۰/-
اقبال شخصیت اور شاعری	رشید احمد صدیقی	۱۲/-
مُرقع اقبال	مرتبہ جگن ناتھ	۵/-
خسرو کا ذہنی سفر	ظ انصاری	۱۵/-
انتخاب سکندر علی وجد	سکندر علی وجد	۱۰/-
تاریخ ادبیاتِ تاجکستان	کبیر احمد جائسی	۱۳/-
فنِ شاعری	عزیز احمد	۶/-
مسافتِ شب	زبیر رضوی	۱۰/-
اقبال کے نثری افکار	عبدالغفار شکیل	۱۰/۵۰
گفرستان	کرشن موہن	۲۰/-
انتخاب کرشن موہن	کرشن موہن	۱۰/-
اردو میں تمثیل نگاری	منظر اعظمی	۲۱/-
نیاز فتحپوری	امیر عارفی	۱۵/-
نقشِ صدا	رفعت سروش	۵/-
یادوں کی برات کا خصوصی مطالعہ	صابر کمال	۱۲/-
ہندوستانی مشرقی افریقہ میں	کالی داس گپتا رضا	۱۰/۵۰
رنگِ سیاہ	ذکاالدین شایاں	۵/-
لسانی مسائل	ڈاکٹر شوکت سبزواری	۱۰/-
فکرِ اقبال	خواجہ عبدالحکیم	۳۰/-
جامِ شعور	سید اطہر حسین	۱۲/-
مہذب اللغات	مہذب لکھنوی دس حصے فی حصہ	[illegible]
کہئے ملامت	کرشن موہن	۱۰/-
گیان مارگ کی نظمیں	کرشن موہن	۱۰/-

مشاعرہ اٹاوہ نمائش

حضور سہسوانی

شرکیٔ مشاعرہ شعرائے کرام کے اسمائے گرامی :۔ نشتر رامپوری، وامق جون پوری، معین احسن جذبی، فنا نظامی کان پوری، شہری بھوپالی، راز الہ آبادی، تاباں حنفی، کمال جائسی، یزدانی صدیقی، نرگس سہسوانی، شاعر فتح پوری، حضور سہسوانی، شمیم الہ آبادی، ظفر اکبرآبادی، طرز کانپوری۔

حسبِ سالہائے گزشتہ و پیوستہ امسال بھی اٹاوہ نمائش کا مشاعرہ سابقہ روایات برقرار رکھتے ہوئے ۱۰ دسمبر سنہ ۷۴ بروز سنیچر، نمائش کے وسیع و عریض اور دلہن کی طرح سجے ہوئے پنڈال میں، محمد امیر صاحب، لکچرار ڈگری کالج اٹاوہ کی کنوینر شپ میں منعقد کیا گیا۔ دس بجے کے بعد شعرائے کرام کے ڈائس پر جلوہ افروز ہوتے ہی محمد امیر صاحب نے آج کے مشاعرے کے سلسلے میں مختصر مگر جامع تقریر کی۔ موصوف نے فرمایا کہ آج اقبال صدی کے سلسلے میں ملک کے مختلف مقامات پر آل انڈیا لیول کے اٹھارہ مشاعرے ہو رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ملک کے مشاہیر شعرا ان میں مدعو ہوں گے۔ ایسی صورت میں ہمارے اس کل ہند مشاعرے میں جو شعرائے کرام حصہ لے رہے ہیں ہم ان کے شکر گزار ہیں کہ انھوں نے ہمارے لئے وقت نکالا ہے۔ مشاعرے کو ہمیشہ کی طرح کامیاب بنانے کے لئے ہم نے ہر مکتبۂ فکر اور ہر عمر کے شاعروں کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہماری اس بزم میں شریک سبھی شعرا ملک کے جانے مانے ہیں اور کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ موصوف نے علی گڑھ سے تشریف لائے ہوئے مہمانِ خصوصی جناب نسیم قریشی ہیڈ آف دی اردو ڈپارٹمنٹ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو نظامت کے فرائض سونپتے ہوئے جناب ایس۔ پی صاحب سے مشاعرہ کی صدارت کی درخواست کی۔ ایس۔ پی صاحب کی مختصر صدارتی تقریر کے بعد نسیم صاحب نے مائک سنبھال لیا ہے۔ موصوف نے مشاعروں کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالنے کے بعد اپنے ساتھ آئے ہوئے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نوجوان طالب علم جناب شفیع کو نظامت سونپ دی ہے۔ شفیع صاحب اس میدان میں نووارد ہیں۔ اسی لئے بڑی دھیمی آواز میں اٹک اٹک کر بول رہے ہیں۔ سب سے پہلے انہوں نے نوجوان شاعر طرز کان پوری کو آواز دی ہے۔ طرز مشاعروں کی دنیا میں نئے نئے آئے ہیں۔ پھر بھی گوارہ قسم کے ترنم میں غزل پڑھ رہے ہیں۔ غزل اچھی ہے مگر سامعین کا موڈ اچھا نہیں ہے۔ لگتا ہے جیسے وہ سن ہی نہ رہے ہوں۔ طرز صاحب کی غزل کا مطلع اور ایک شعر آپ بھی سن سکتے ہیں :۔

آئینہ ہاتھ میں جب اس نے اٹھایا ہوگا
اپنے جوڑے کو گلابوں سے سجایا ہوگا

اے ہواؤ مرا پیغام بھی لیتی جاؤ
مری یادوں کا چراغ اس نے جلایا ہوگا

طرز جوں ہی غزل پڑھ کر پلٹے، ناظم مشاعرہ نے ظفر اکبرآبادی کو پکار لیا۔ ظفر صاحب بھی نوجوان شاعر ہیں۔ دو شعر تحت اللفظ میں پڑھنے کے بعد غزل ترنم سے پڑھ رہے ہیں۔ بہتر ہوتا کہ وہ غزل بھی تحت اللفظ

میں سُناتے۔ چوں کہ ترنّم سے وہ پڑھ نہیں پا رہے ہیں۔ شاید اسی لئے داد سے محروم رہے۔ آخر بے نیل و مرام مائک چھوڑ کر اپنی جگہ آ بیٹھے۔ ظفر صاحب کا ایک شعر نوٹ کر سکا ہوں۔

سارے عالم پہ محبت کا سکوں طاری ہو
کر لیا آپ کے جلوؤں کا نظارہ کس نے

اب شمیم الہ آبادی کو آواز دی گئی ہے۔ شفیع صاحب نے پہلی بار ڈھنگ سے تعارف کرایا ہے۔ شمیم صاحب اکثر آل انڈیا مشاعرے پڑھ چکے ہیں۔ عوام کی توجہ مبذول کرانے کی بھرپور کوشش کر رہے ہیں لیکن اب تک عوام جیسے سو رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ شاعر مختصر سا کلام پیش کرتے آئے ہیں۔ شمیم صاحب کی غزل کا مطلع اچھا ہے اور اسے انھوں نے کئی بار پڑھا ہے۔ ڈائس والوں نے پہلی بار ہونٹ کھولے ہیں اور پنڈال میں سے بھی کئی آوازیں اُبھری ہیں۔ اور شمیم صاحب لہک لہک کر پڑھ رہے ہیں۔

تو یہ نہ سمجھ اِن باتوں سے تصدیق محبت ہوتی ہو
ملتے ہی نظر شرما جانا کچھ لوگوں کی عادت ہوتی ہے

دیوانو چلو بزم گل سے کچھ درد کے غنچے لے آئیں
سنتے ہیں چمن کی نگری میں زخموں کی تجارت ہوتی ہے

جس قدر داد شمیم صاحب کو ملنی چاہیے تھی یا جتنی وہ پانا چاہتے تھے اتنی نہ مل سکی۔ غالباً اسی لئے انھوں نے زیادہ شعر نہیں پڑھے۔ لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ اب تک جتنے شعرا نے پڑھا ہے شمیم صاحب سب سے زیادہ کامیاب رہے ہیں۔

شمیم الہ آبادی کے بعد نقیب مشاعرہ نے شاعر فتح پوری کو دعوت سخن دی ہے۔ شاعر صاحب نے گیت پیش کیا ہے۔ گیت اچھا ہے اور اس سے کہیں اچھا ان کا ترنّم ہے۔ سامعین نے شاعر صاحب کو پسند کیا ہے وہ گیت پڑھ کر پلٹے ہیں کہ ایک اور ایک کی صداؤں سے پنڈال گونج اُٹھا ہے۔ اور شاعر صاحب مسکراتے ہوئے پھر مائک کے سامنے ہیں۔ اور اب غزل سُنا رہے ہیں۔ وہی ترنّم ہے وہی انداز ہے۔ اور داد و تحسین کی وہی صدائیں ہیں۔

اے حسن یار اس میں تری خطا نہیں ہے
ہم اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو گئے ہیں

جس دن سے میرے دل کا افسانہ سن لیا ہو
اس دن سے اور بھی وہ مغرور ہو گئے ہیں

شاعر صاحب سننے والوں پر ایک اثر چھوڑ کر واپس ہوئے تو اناؤنسر صاحب نے راقم الحروف کو مائک کے سامنے حاضر ہونے کا حکم دیا ہے۔ اور میں نے موقع کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے صرف چند قطعات نذر کئے ہیں۔ جنھیں سامعین کرام نے توجہ سے سُنا ہے اور پسند کیا ہے۔ دو قطعے آپ بھی سنتے چلئے۔

میں منافقت کا رہیں نے اک نہ سُنی
شہر توں نے بہت خطاب کیا
جب مکمل ہوئی کتاب حیات
موت کے نام انتساب کیا

اُس نے خط لکھتے کر دیئے جب بند
پہلو، تسکین کا یہ نکالا ہے
اُس کی جانب سے خود اپنے نام
ایک خط لکھ کے پھاڑ ڈالا ہے

اب جناب کمال جائسی کی باری ہے۔ کمال صاحب مشاعرے میں جو گرمی دیکھنا چاہتے ہیں اس کا فقدان ہے۔ اور انھوں نے اس کا شکوہ سامعین سے بھی کیا ہے۔ اور شعرا حضرات سے بھی۔ اب تک جس قدر شعرا نے پڑھا ہے شعرا صاحبان نے جیسے سنا ہی نہیں ڈائس پر گور غریباں جیسی خاموشی طاری رہی ہے کسی کے اچھے شعر کو بھی شعرا نے نہیں اٹھایا ہے۔ کمال صاحب کے نزدیک یہ تنگ نظری ہی نہیں ایک طرح کا ادبی بخل بھی ہے۔ عجیب بات ہے کہ ہر شاعر جب کلام سناتا ہے تو دوسرے شاعروں سے داد

چاہتا ہے لیکن وہ خود کسی کو داد دینے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ کمال صاحب نے اپنی شستہ تقریر سے سامعین کو بھی جھنجوڑا ہے اور شعرا کو بھی بیدار کیا ہے۔ اور اب کمال صاحب اپنے مخصوص ترنم میں غزل سرا ہیں۔

کس موڑ پہ آ گئے ہیں ابرو کی کماں والے
سہمے نظر آتے ہیں شیشے کے مکاں والے

مطلع ہٹ ہوا ہے۔ ہر طرف سے داد و تحسین کی صدائیں بلند ہوئی ہیں۔ ڈائس والوں نے بھی سکوت توڑا ہے۔ کمال صاحب کو مطلع کئی بار پڑھنا پڑا ہے۔ غزل کے دیگر اشعار کو بھی پسند کیا گیا ہے۔ خصوصاً یہ شعر

موسم تری یادوں کا کس درجہ اثیرا ہے
بے بس نظر آتے ہیں شمشیر و سناں والے

کمال صاحب داد سے جھولیاں بھرے مائک سے ہٹ رہے ہیں۔ اُدھر سامعین ایک غزل اور سنانے کا اصرار کر رہے ہیں۔ کمال صاحب نے کہا ہے کہ پہلا دور ختم ہو جانے دیجئے دوسرے دور میں آپ کو ایک نہیں دو غزلیں سنا دوں گا۔ اور سامعین نے ان کی بات مان لی ہے۔

کمال صاحب کے بعد یزدانی صدیقی کا نام لیا گیا ہے۔ یزدانی صاحب نے لمبا چوڑا گیت پیش کیا ہے۔ جس کا کوئی بند نوٹ نہیں کیا جا سکا۔ بہرحال گیت اچھا تھا جسے سکون کے ساتھ سن لیا گیا۔

کرگس بھوانی کا نام آتے ہی لوگ پتا نہیں کیوں ہنس پڑے ہیں اور کرگس صاحب کرگس (گدھ) کی تعریف بیان کر رہے ہیں۔ اس کی ضرورت انھوں نے کیوں محسوس کی اسے وہی بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ اور اب وہ قطعات پیش کر رہے ہیں۔ یکے بعد دیگرے انہوں نے پورے آٹھ قطعے داغے ہیں۔ کئی قطعوں پر کچھ لوگ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئے ہیں۔ پنڈال زعفران زار بن گیا ہے انھوں نے مائک جوں ہی چھوڑا ہے سامعین نے کچھ اور سننا چاہا ہے۔ اور کرگس صاحب نے پھر کئی قطعے داغے ہیں۔ پھر ایک ہزل پیش کی ہے۔ قطعے پسند کئے گئے ہیں مشاعرہ گاہ میں پھر ہنسی کے چشمے اُبلے ہیں۔ لیکن ہزل ہٹ نہ ہو سکی۔ کرگس صاحب انتہائی کامیاب لوٹ رہے ہیں۔ دراصل اپنے رنگ کے وہ اکیلے ہیں اور لگتا ہے سننے والوں میں طنز و مزاح کے شیدائیوں کی تعداد زیادہ ہے۔ کرگس صاحب کے دو قطعے اور ہزل کا مطلع یاد رہ گیا ہے۔

مجھے پھوکٹ میں خواہش داد کی ہے
وراثت یہ میرے اجداد کی ہے
گلے بازی کی کر لی ہے ریہرسل
غزل میری نہیں اُستاد کی ہے

میں نے اک لڑکی سے پوچھا یہ بتا اے مہ لقا
وہ جو کل تک تیرا پردہ تھا اُسے اب کیا ہوا
وہ بصد ناز و ادا کہنے لگی او بے خبر
مرد، عورت بن گئے پھر کاہے کا پردہ رہا

اک نئی راہ زمانے کو دکھائی جائے
عشق کی جیب فضاؤں میں چلائی جائے

اور اب تاباں حنفی کا نمبر ہے۔ تاباں صاحب نے پہلے چار مصرعے پیش کئے ہیں اس کے بعد اپنے مخصوص ترنم اور دُھن میں ایک گیت پڑھا ہے۔ جسے سراہا گیا ہے۔ چار مصرعے آپ کے لئے نوٹ کر لئے ہیں۔

کل کی ارزانی بازار میں چپ تھے ہم تم
آج کے دورِ گرانی میں یہ اک بات ہوئی
شہر کے لوگ ترے گاؤں میں بسنے آئے
اب ترے گاؤں کو پانی میں یہ اک بات ہوئی

تاباں صاحب کے بعد بزرگ شاعر جناب راز الہ آبادی کو پکارا گیا ہے۔ جہاں تک پڑھنے کا تعلق ہے راز صاحب نے محفل کو گرما کر رکھ دیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ پہلی بار ایک اچھی آواز نے کانوں میں شہد انڈیلا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ڈائس پر بیٹھے ہوئے کئی شعرا کو ان کے بعض اشعار میں جھول نظر آئی ہے۔ اور انھوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو جتایا ہے۔ (باقی پھر)

پتھّر کی لکیر

صابر دہلوی

یوں تو زندگی میں ہزاروں طوفان آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ جن کا ہر وقت خفیف سا احساس ہوتا ہے۔ لیکن کچھ طوفان زندگی اس طرح وارد ہوتے ہیں جو کچھ نہ نے جاتے ہوئے بھی بہت کچھ لے جاتے ہیں۔ تڑپ، اضطراب، بے بسی و بے کسی پر ناامیدی کا جامہ پہنا کر اس وجود کو ہستیٔ انسان میں پیوست کر جاتے ہیں کہ کچھ کہتے نہیں بنتی۔

ایک ایسا ہی طوفان ایک فقیر کی زندگی میں آیا۔ ہماری یہ کہانی ایک تاریک اور پُرشباب سرد شام سے شروع ہوتی ہے۔

تو کیا آج پھر بھوکا سونا پڑے گا یہ سوچا اُس فقیر نے، جس کے بدن پر ایک میلا بوسیدہ کوٹ اور پھٹے ہوئے پاجامہ کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ خدا... خدا... آخر میں ہی کیوں؟ تیرے قہر و غضب کا شکار رہنا۔ اُف! اب میں کیا کروں؟... آج کل بھیک بھی نہیں ملتی ٹھیک ہے پیٹ بھرنے کے ذرائع اور بھی ہیں۔ اگر میں کوئی غیر قانونی حرکت کر بیٹھوں تو پولیس مجھے پکڑ لے گی اور جیل میں بھوکا نہیں رہنا پڑے گا۔

یہ سوچ کر اُس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی اور ایک راہ گیر کو تاک لیا۔ اس کے قریب آتے پر اسے ایک زوردار طمانچہ مار دیا۔ بے چارہ راہ گیر اس ناگہانی اُفتاد پر پہلے تو بوکھلا گیا پھر فقیر کو عجیب نظروں سے دیکھا اور گال سہلاتا ہوا چپ چاپ چل دیا۔

ہت تیرے کی!... یہ تو یوں ہی چلا گیا... پھر اس کی نظر ایک بابو صاحب پر پڑی جو بیگ ہاتھ میں لئے تیز تیز قدم اُٹھائے جا رہے تھے۔ فقیر نے بیگ اُس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ اور لے کر بھاگا چور چور کی آواز فضا میں بلند ہوئی فقیر کو لوگوں نے پکڑ لیا۔

"کیوں بوڑھے؟ تم کو شرم نہیں آتا؟" بابو بولے "ہاں! نہیں آتا۔ پھر؟"

لوگو! اسے چھوڑ دو۔ یہ پاگل ہے بابو صاحب نے اس کے ہاتھ سے بیگ لے لیا اور چلتا بنا راہ گیروں نے بھی اسے چھوڑ دیا۔ ایک بار پھر وہ اس وسیع و عریض دُنیا میں اکیلا کھڑا تھا۔

تعجب ہے۔ لوگوں نے پاگل سمجھ کر چھوڑ دیا۔ وہ آگے بڑھا۔ ایک جگہ فٹ پاتھ پر بھیڑ لگی دیکھی تماشائی اپنے منطقی دلائل سے تھکے ہوئے ذہن کے لوگوں کو بے وقوف بنانے کی کوشش میں لگا ہوا تھا اور آہستہ آہستہ کامیاب بھی ہو رہا تھا۔ فقیر نے ایک خوش پوش نوجوان کی جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔ دوسرے لمحے فقیر کا ذہن جھنجھنا کر رہ گیا۔ ممکن ہے اسے سورج بھی نظر آ گیا ہو۔ کیوں کہ کانوں پر پڑنے والا چانٹا اتنا ہی پُرقوت تھا۔ شخص مذکور نے فقیر کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"کیوں بوڑھے، اُستادوں سے استادی؟"

"تو پھر"

"ارے" جیب کاٹتا ہے لوگوں کی اور پھر اکڑتا بھی ہے۔"

"ہاں! اکڑتا ہوں، کیا کرے گا تو میرا؟"

"چل ہٹ یہاں سے، سالے پاگل،"

اب شام گہری ہو چکی ہے گویا [illegible]

شب دنیا پر آہستہ آہستہ دراز ہو رہی تھیں اس مناسبت سے بھوک بھی عروج پر تھی ہر ممکن کوشش کے باوجود اسے سوائے دھکوں کے اور کچھ نہ ملا۔

"ٹھیک ہے۔ سردی اپنے شباب پر ہے۔ وہ ایک گلی میں گھستے ہوئے سوچنے لگا۔ صبح کا سورج جب ایک گمنام انسان ... نہیں بلکہ گمنام فقیر کی لاش پر طلوع ہوگا۔ ایک ایسے انسان کی لاش جس کی موت کا احساس کسی کو نہ ہوگا۔ اخباروں میں یہ خبر شائع ہوگی۔ کہ لاوارث فقیر بھوک اور سردی کی تاب نہ لاکر اکڑ کر مرگیا۔ تو

کسی باپ کی آنکھیں آنسوؤں سے نم نہ ہونگی، کسی ماں کا کلیجہ نہیں پھٹے گا۔ ہائے رے زندگی! وہ رک گیا۔ میونسپل بتی کے نیچے ایک چھوٹی سی بچی کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ تیل سے بے نیاز بال، میلا کچیلا فراک، گندہ جسم اور اس کی بدبو، چہرے پر مفلسی دہری کی تہ۔

"کیوں؟ کیا سردی لگ رہی ہے۔ لڑکی نے سر ہلایا مگر منہ سے کچھ نہ کہا۔"

"مجھے بھی سردی لگ رہی ہے۔" یہ کہہ کر فقیر نے اپنا کوٹ لڑکی کو پہنا دیا۔

"تیرا کوئی نہیں، ماں، باپ بھائی بہن۔ لڑکی نے پھر سر ہلایا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں

"میرا بھی کوئی نہیں ہے دُنیا میں، افسوس! افسوس! کیا تجھے بھوک لگ رہی ہے۔ لڑکی نے جلدی جلدی سر ہلا کر ہاتھ پھیلا دیا۔"

"مجھے بھی بھوک لگی ہے چل میرے ساتھ، ممکن ہے تیرے نصیب سے کچھ مل جائے۔ ایک بدنصیب بھوکا دوسری بدنصیب لڑکی کو لے کر واپس سڑک کی طرف چل پڑا۔ چوراہے پر سڑک کے کنارے آگ جلتی نظر آئی۔ جہاں کچھ لوگ بیٹھے آگ تاپ رہے تھے۔ اپنی خوش نصیبی پر ناز کرتے ہوئے، وہ لوگ جو گرم لحافوں میں سوتے ہیں کبھی ان لوگوں کے بارے میں بھی سوچ لیا کریں۔ جن کے پاس اوڑھنے کے لئے کمبل یا چادریں نہیں ہوتیں جنھیں سردی کے باعث نیند نہیں آتی۔ فقیر اس بچی کو لے کر، ادھر ہی چلا۔ ابھی دس قدم ہی چلا ہوگا کہ پیچھے سے ایک پولیس گاڑی آئی۔

"اے ٹھہرو... فقیر رک گیا۔ سارجنٹ نے فقیر کو قہر آلود نظروں سے دیکھا

"کون ہو تم؟"

"ایک فقیر... صاحب"

"یہ لڑکی کون ہے؟"

"میری طرح ایک لاوارث"

"کہاں جا رہے ہو؟"

"بھوک کا علاج کرنے پیٹ کی خاطر.........

"جھوٹ بولتا ہے۔ بیوقوف بناتا ہے۔ تم بچہ چرانے والے گروہ کے سردار معلوم ہوتے ہو۔ چلو ادھر بیٹھو گاڑی میں فقیر کو دو سپاہیوں نے پکڑ لیا۔ لڑکی بھی آگے بڑھی۔

اے لڑکی بھاگ جاؤ... اپنے گھر... گاڑی آگے بڑھ گئی۔ لڑکی وہیں کھڑی کانپتی رہی اور روتی رہی اس کی نظر گاڑی کی عقبی روشنی پر جمی ہوئی تھیں جو بتدریج دور ہوتے ہوئے آہستہ آہستہ اندھیرے میں گم ہو رہی تھی۔ گاڑی میں بیٹھا ہوا فقیر اپنی بے بسی پر رو رہا تھا۔ جب وہ اپنا پیٹ بھرنے کی خاطر جیل جانا چاہتا تھا مگر کسی نے نہیں بھیجا۔ اب وہ کسی دوسرے کے لئے جیل نہیں جانا چاہتا تھا۔ تو اسے جیل لے جایا جا رہا ہے۔ اس دُنیا میں کسی سے پیار کرنا بہت آسان ہے۔ مگر کسی کا پیار پانا بہت مشکل ہے..........!!

معیار کی کسوٹی پر

"تحریر" ضیا فتح آبادی شخص اور شاعر
ضخامت ۲۲۰ صفحات۔ قیمت پندرہ روپیہ

ضیا فتح پوری کا شمار اُردو کے ان شعراء میں ہوتا ہے جو اُردو کی کلاسیکی شاعری میں ہیئت کے حامل ساتھ ساتھ شعوری طور پر جدید ادبی رجحانات سے بھی پوری طرح آگاہ رہے ہیں اور انھیں اختیار کرتے وقت جنھوں نے انتہائی معتدل رویّے کا اظہار کیا ہے۔

شاگردان سیماب اکبر آبادی کی فہرست میں ضیا صاحب کا نام اس لحاظ سے بھی احترام کیساتھ شامل کیا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنے اُستاد کی طرح اُردو کی مختلف اصناف پر بڑی کامیابی کے ساتھ طبع آزمائی کی۔ نہ صرف غزل ہی میں بلکہ نظم، رباعی اور گیت وغیرہ کہہ کر ضیا صاحب نے اپنی مشاقی کے ثبوت دیئے ہیں۔

انکی شاعری میں فکر کی گہرائی کیساتھ ساتھ اسلوب بیان کی شگفتگی کے ایسے نمونے بھی مل جاتے ہیں جنھیں اُردو کے ذہین اور پختہ گو شاعر کی دماغی کاوشوں سے منسوب کیا جاسکتا ہے۔ وہ اپنی فکر کے ذریعے حالات پر مکمل گرفت کے فن سے بھی پوری طرح واقف ہیں اسی لئے ان کی شاعری کی مخصوص ادبی رجحان کی عکاس نہ ہو کر ایک ایسا کینواس بن جاتی ہے جو مختلف لیکن حسین رنگوں کی آمیزش سے مزیّن ہو کر جاذب نظر بن جاتا ہے۔ اور اسی لئے مختلف رنگوں کو پسند کرنے والوں کی نگاہیں اس پر جم کر رہ جاتی ہیں ضیا صاحب اس کینواس پر رنگ حیات بکھیرنے میں جس شعوری کوشش کا اظہار کرتے ہیں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ رنگوں میں جان ڈالنے کے فن سے بھی پوری طرح آگاہ ہیں۔ اور اپنی ذہنی استعداد سے بیجان اور بے کیف پہلوؤں کو بھی جان دار بنا دیتے ہیں۔

ان کی اسی شعوری کوشش کا اعتراف کرنے کیلئے اُردو کے مشہور محقق مالک رام نے اپنے رسالہ "تحریر" کے تازہ شمارے میں انکے فن اور شخصیت پر اہل قلم سے تفصیلی مضامین شائع کر کے واقعی ایک ایسے شاعر کی ادبی کاوشوں کو سراہا ہے جسکی شاعری پر ذہنی یکسوئی کیساتھ بہت کم غور کیا ہے۔ اس نوع کے اقدام ادب اور شاعری کیلئے یقینی طور پر لائق تعریف ہیں۔ اُردو رسائل اور ان کے مدیران اگر اس قسم کے اقدام کی جانب سنجیدگی کے ساتھ متوجہ ہوں تو یقین ہے کہ ہمارے وہ بہت سے شعراء جن کی ادبی و شعری خدمات سے انکار ممکن نہیں، حالات کی ناقدری کا شکوہ کرتے نظر نہ آئیں اور اسطرح انکی ذہنی کاوشوں کو محفوظ کیا جاسکتا ہے۔

"تحریر" کے اس شمارے میں اوم پرکاش بجاج، اجاوید وششٹ، کوثر چاندپوری، اعجاز صدیقی، رادھا کرشن سہگل، ڈاکٹر تنویر علوی، رفعت سروش وغیرہ کے تفصیلی مضامین کے ذریعے ضیا فتح آبادی کی شخصیت اور انکے فن پر خاصی روشنی پڑتی ہے جنکے مطالعہ کے بعد ضیا صاحب کے ذہنی تحرکات کو پوری طرح پہچانا جاسکتا ہے۔

(عزیز اندوری)

مکاتیب احسن (جلد اوّل)

(مع مقدمہ و حواشی)

مرتبہ: ڈاکٹر عنوان چشتی، صغیر احسنی۔ قیمت مجلد ۲۰ روپے
ملنے کا پتہ: دفتر شان ہند، انصاری مارکیٹ، دریا گنج نئی دہلی ۲

ڈاکٹر عنوان چشتی اور صغیر احسنی صاحب نے مولانا احسن مارہروی کے ایسے خطوط کو یکجا کر دیا ہے جن میں عروضی، فنی، لسانی، شعری، ادبی اور گرامر کے مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ ابتدا میں مولانا احسن کی حیات، شخصیت، علمی کارنامے اور مکتوب نگاری پر بھرپور مقدمہ ہے۔ ہر مکتوب الیہ کے مستند حالات درج ہیں۔ اور ہر خط پر ضروری حواشی تحریر ہیں۔ جن مشاہیر کے نام خطوط ہیں انکے نام یہ ہیں سواغ دہلوی، دل شاہجہاں پوری، سجاد حیدر یلدرم، امتیاز علی خاں عرشی، سیکش اکبر آبادی ابر احسنی، ڈاکٹر حفیظ سید، ڈاکٹر غلام عمر خاں، ثاقب کانپوری، مولوی عبدالحق سید مسعود حسن رضوی ادیب، مانی جائسی، تالک چند محروم گلزار دہلوی اور اعجاز صدیقی وغیرہ اسطرح یہ کتاب مولانا احسن مارہروی کے خطوط کا مجموعہ ہے۔ انکے معاصرین کا تذکرہ بھی ہے یہ کتاب ۱۸x۲۲ سائز کے ۲۰۰ صفحات پر نہایت بہترین کاغذ پر اعلیٰ طباعت و کتابت کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔

(شکیل احمد)

چکبست و جگر مرادآبادی

(حب الوطنی کی فضاؤں میں)

مفتون کوٹوی

حب الوطنی یعنی ہند پرستی کے علاوہ چکبست و جگر میں زمانہ و ماحول، عقیدہ و مسلک اور رنگِ سخن، کا کافی اختلاف ہے۔ لیکن بھی قدرِ مشترک ایسی ہے جو دونوں میں شدت و کثرت کے ساتھ محسوس کی جا سکتی ہے، جذبۂ حب الوطنی کے تحت، چکبست کا تخاطب، غیر ملکیوں یعنی انگریزوں سے ہے، جگر، اپنے ہی اربابِ وطن و رہنمایانِ وطن سے مخاطب ہوتے ہیں چکبست کے زمانے میں جد و جہد آزادی کی گرم رَو تمام ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھی۔ ملک غلام تھا اور اس پر انگریزوں کی گرفت نہایت مضبوط تھی، جگر نے قبل آزادی اور بعد آزادی کے دونوں زمانے دیکھے۔ لیکن اس وقت منزلِ آزادی قریب آ چکی تھی، پھر آزادی بھی حاصل ہو گئی۔ اور رہنمایانِ وطن نے چمنستانِ وطن کی آرائش و زیبائش اپنے طور پر شروع کر دی تھی، تعمیر و ترقی کے منصوبے بننے لگے۔ ان پر عمل بھی شروع ہو گیا تھا۔ ملک کا دستور بنایا جا رہا تھا، اور پھر اعلانِ جمہوریت ہو بھی گیا۔ ماحول و حالات کے ان اختلافات کے باعث دونوں شاعروں کے رنگِ سخن اور اندازِ شعر گوئی میں نمایاں فرق ہے۔ لیکن وطن دوستی کی برقی رَو۔ دونوں کے شعور و لاشعور، احساسات و جذبات، اور شعور و ادراک میں واضح طور پر چلتی پھرتی محسوس ہوتی ہے، جگر غزل کے شاعر تھے، حسن پرستی، محبت دوستی، ان کا شیوہ تھا انھیں شباب و شراب کا شاعر کہا جاتا ہے۔ بایں ہمہ، شاعرانہ منصب کے تحت وہ اس بصیرت و فراست سے بہرہ ور تھے جہاں انسان زندگی کے مختلف شعبوں میں تجزیہ و تنقید کا حوصلہ رکھتا ہے۔ اس عمل جراحی کے بعد، چارہ گری و درماں گری بھی کرتا ہے، چکبست کو یہ موقع حاصل نہ تھا انھیں کا دور ان آزادی کے سپاہیوں کی حوصلہ افزائی کر رہی تھی، غیر ملکی اقتدار کو ہٹانے کی تدبیروں میں حصہ لینا تھا۔ یہ سبھی کچھ وطنی محبت، اور ملکی دوستی کے تحت ظہور میں آیا۔ اور جو کچھ مساعیٔ جمیلہ ان دونوں شاعروں نے اپنے شعر و سخن میں کی وہ ہمارے ادب کے لئے ہمیشہ فخر و ناز کا سرمایہ بنی رہیگی، ویسے ہماری قومی شاعری کی عمر بہت طویل ہے، آزاد، حالی، اسماعیل میرٹھی، سرور جہاں آبادی وغیرہ اپنی اپنی لے اور اپنی اپنی ترنگ میں حب الوطنی کے راگ الاپ چکے ہیں، ؎

ہر نباتات کا نمو تجھ سے — رو کر تجھ بن ہر [illegible] ([illegible])

رکھو رفاہِ قوم پہ اپنا مدار تم
اور ہو کبھی ملے کے نہ امیدوار تم (آزاد)

آہ اے خاکِ وطن اے دردمندِ بیقرار
آہ اے شوریدہ قسمت اے پریشاں روزگار ([illegible])
اُڑ رہا تھا پرچمِ شوکت ترا افلاک پر
سرنگوں ہے تری عظمت کا نشاں خاک پر (سرور)

وطن دوستی، غیر ملکیوں سے نفرت پر بھی منتج ہوتی

چاہیے تھی، جدوجہد آزادی میں گرمی و تحریک اس کے بغیر پیدا ہو ہی نہیں سکتی تھی، یہ حسرت و سرور کے زمانے میں ہوئی۔ چکبست کی "کرزن سے چھیڑ" اس سلسلہ کی اہم کڑی ہے۔ ؎

لیجیے سامنے میرے ہے شبیہہ کرزن
رنگ اس طرح بدلتی ہے کہ جیسے گرگٹ
اب مناسب ہے یہی کیجیے پنجہ اچھالی
ہم بھی خوش خوش آپ بھی خوش خوش دور کہیں ہو جھنجھٹ
یا الٰہی یہ چلی بادِ مخالف کیسی
آ گیا اڑ کے جو لندن سے یہ کوڑا کرکٹ

سپاہیانِ آزادی سے مخاطب ہیں ؎

موجود ہے جن بازوؤں میں زورِ جوانی
طوفاں سے انھیں کشتیٔ قومی ہے بچانی
پڑ رہے ہیں غفلت سے سروں میں یہ گرانی
آرام پسندی میں یہ رکھتے نہیں ثانی
پہلو میں کسی کے دلِ دیوانہ نہیں ہے
ہیں مرد مگر ہمتِ مردانہ نہیں ہے

"ہوم رول" کا اس زمانہ میں بہت چرچا تھا، یعنی برطانیہ کا اقتدارِ اعلیٰ تسلیم کرتے ہوئے۔ ہندوستان کی اندرونی آزادی ـــ چکبست کا شعر ہے ؎

برطانیہ کا سایہ سر پر قبول ہوگا
ہم ہوں گے عیش ہوگا اور ہوم رول ہوگا

"سوراج" یعنی آزادی کی تڑپ کا اندازہ ان کے اس شعر سے لگائیے ؎

دل تڑپتا ہے کہ سوراج کا پیغام ملے
کل ملے، آج ملے، صبح ملے شام ملے

"ہوم رول" کے متعلق دو شعر اور ؎

مدعی آئے گا ہے ہوم رول پائے ہوئے
فقیر قوم کے بیٹھے ہیں لو لگائے ہوئے
طلب فضول ہے کانٹوں کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

جوشِ حصولِ آزادی کے متعلق صرف ایک بند ؎

حکمِ حاکم ہے کہ گویائی زبانی رک جائے
دل کی بہتی ہوئی گنگا کی روانی رک جائے
قوم کہتی ہے ہوا بند ہو پانی رک جائے
یہ تو ممکن نہیں اب جوشِ جوانی رک جائے
ہوں قصوروار جنھوں نے یہ اذیت دی ہے
کچھ تماشا نہیں یہ قوم نے کروٹ لی ہے

گاندھی جی ہندوستان کے سیاسی افق پر ابھر رہے تھے لیکن چکبست نے ان کی عظمت و شخصیت کا اندازہ کر لیا تھا ان کی قید و بند کے متعلق ان کا یہ شعر کتنے جذباتِ عقیدت اور احساسات و حقیقت سے بھرے ہوئے ہے ؎

وطن کے واسطے زنجیر و قید گہنا ہے
وفا کے شوق میں گاندھی نے جس کو پہنا ہے

جگر کے زمانے میں گاندھی جی کی رہنمائی مکمل طور پر تسلیم کر لی گئی تھی، اور انھیں کی رہنمائی میں کاروانِ آزادی، قریبِ منزل آ چکا تھا۔ بلکہ حصولِ منزل کر بھی چکا تھا۔ ان کی نظم "گاندھی جی کی یاد میں" ایک وطن دوست شاعر کا بڑا پُر عقیدت خراجِ محبت ہے۔ ؎

دیکھا ہے [illegible] ہجوم مردِ حق
وہ حسنِ زندگی مگر وہ جنتِ وطن
ترقیوں پہ گرچہ ہیں تمدن و معاشرہ
مگر وہ حسنِ سادگی وہ سادگی کا بانکپن
[illegible] کی مستیاں، کہ الحفیظ الاماں
مگر وہ اک لطیف [illegible]
[illegible] ستارے ہیں مگر کہاں وہ ماہتاب [illegible]
[illegible] ہے انجمن مگر کہاں وہ شمعِ انجمن

"آزادی کا [illegible] ایک ساقی کا [illegible] لیکن [illegible] ہو گیا ہے شاعر [illegible] اپنے رہبر و رہنما کے طرزِ عمل پر نکتہ چینیاں کرتا ہے،

اپنے اربابِ وطن کو کھول کھول کر ایک ایک خامی جتاتا ہے ؎

اگرچہ آزادیٔ وطن کو گزر چکا ایک سال کامل
مگر خود اہلِ وطن کے ہاتھوں فضائے گلشن ہے تار اب بھی
خود اپنی بدنیتی کے ہاتھوں تبہ، نتائج بھگت رہے ہیں
صداقتوں سے حقیقتوں کو یہی ہے لیکن فرار اب بھی
زمین بدلی زمانہ بدلا مگر نہ بدلے تو وہ نہ بدلے
جو تنگ و تاریک ذہنیت تھی وہی ہے برسرِ کار اب بھی
کوئی یہ چپکے سے ان سے پوچھے کہاں گئے اُٹھ کے وہ وعدے
نچوڑتا ہے لہو غریبوں کا دستِ سرمایہ دار اب بھی
جو مجھ سے جشنِ نظامِ نو ہیں پکار کر ان سے کہہ رہا ہوں
یہ جان لے سوگوار اب تک یہ دل ہے ماتم گسار اب بھی

اس کے ساتھ چارہ گری و درماں گری بھی ملاحظہ فرمائیے ؎

وسیع مسلک، رفیع فطرت خلوصِ ایماں خلوصِ نیت
انھیں فضائل پہ ہے وطن کے وقار کا انحصار اب بھی
خلوصِ نیت سے صرف اپنی ہی زندگی پر کریں توجہ
خلوصِ نیت کی منتظر ہے سعادتِ کردگار اب بھی

"اعلانِ جمہوریت" کے موقع پر بھی یہی نشتر زنی ہے۔ ساتھ ہی اسی انداز کی مرہم سازی بھی ہے ؎

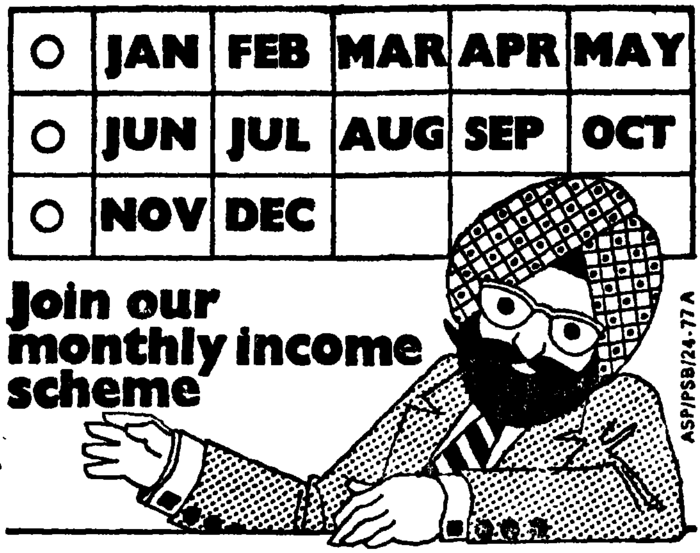
چمن چمن ہی نہیں جس کے گوشے گوشے میں
کہیں بہار نہ آئے کہیں بہار آئے
یہ میکدے کی یہ ساقی گری کی ہے توہین
کوئی ہو جام بکف کوئی شرمسار آئے
خلوصِ نیتِ اہلِ چمن پہ ہے موقوف
کہ شاخِ خشک میں بھی پھر سے برگ و بار آئے
نظامِ خلق و مروت کبھی جو برہم ہو
نگاہِ لطف و محبت بڑھے سنوار آئے
دلوں پہ نقش نہ رہ جائے کوئی نفرت کا
یہ فتنہ بن کے نہ آشوبِ روزگار آئے
خلوص و عدل و مساوات دل میں گھر کر لیں
نہ یہ کہ ذکر زباں پر ہی بار بار آئے

ضمیر صاف ہوا اپنا تو غیر ممکن ہے
کسی کے آئینۂ قلب پر غبار آئے

"شدتِ حب الوطنی کے تحت" وہ ساقی سے خطاب میں کتنے سپاہیانہ تیوروں سے کہتے ہیں ؎

یہ سنتا ہوں کہ پیاسی ہے بہت خاکِ وطن ساقی
خدا حافظ چلا میں باندھ کر سر سے کفن ساقی
سلامت تو ترا میخانہ، تیری انجمن ساقی
مجھے کرنی ہے اب کچھ خدمتِ دار و رسن ساقی

چکبست و جگر نے اپنے اپنے وقت کے تقاضوں کے تحت جن جذباتِ وطن دوستی کا اظہار کیا وہ انھیں زندہ جاوید رکھیں گے۔



Get a handsome interest regularly

Here's what you do
To get started all you need is Rs. 600/- or its multiples.

- Deposit it for a minimum of 12 months, and get a regular income every month.

You are also at liberty to withdraw the amount every month or credit it into your account to get more interest. Yet your principle remains intact. The table will tell you more.

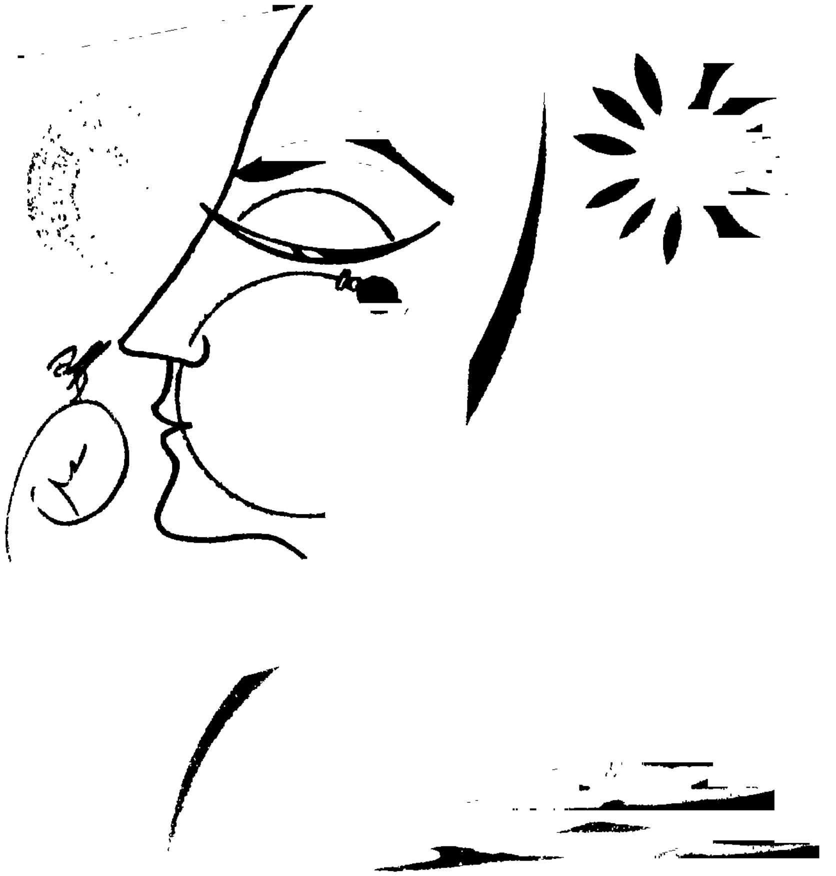
Amount of Deposit	Monthly Interest for 61 months	Monthly Interest for 37 months to 60 months	Monthly Interest for 12 months to 36 months
600	5.00	4.00	3.00
1200	10.00	8.00	6.00
2400	20.00	16.00	12.00
3000	25.00	20.00	15.00
6000	50.00	40.00	30.00
9000	75.00	60.00	45.00
12000	100.00	80.00	60.00
24000	200.00	160.00	120.00
30000	250.00	200.00	150.00
60000	500.00	400.00	300.00
120000	1000.00	800.00	600.00
150000	1250.00	1000.00	750.00

PSB will show you multiple ways to multiply your savings.

THE PUNJAB & SIND BANK LTD.

FEBRUARY 1978 Phone: 278880 Regd. No. D-(D)378
THE SHAN-E-HIND MONTHLY, NEW DELHI-110002
Regd. with the Registrar of News Paper at R. No. 644/57





ٹیلیفون نمبر ۲۶۸۸۹۰ رجسٹرار آف نیوز پیپر آف انڈیا کا رجسٹریشن نمبر رجسٹرڈ نمبر ڈی ۳۷۰
۶۴۴۷/۵۷

ماھنامہ

ایڈیٹر
سرور تونسوی

شان ھند دھلی

قیمت سالانہ
بارہ روپے
فی پرچہ
ایک روپیہ پچیس پیسے

جلد نمبر ۳۹ مارچ ۱۹۷۸ء شمارہ نمبر ۳

افکار و واقعات

سرور تونسوی صاحب پر دردِ دل کا شدید دورہ

شانِ ہند کے ہر بہی خواہ کو اس اطلاع سے یقیناً دلی تشویش ہوگی کہ سرور تونسوی صاحب پر تین اور چار مارچ کی درمیانی رات کو دردِ دل کا شدید دورہ پڑا۔

پرسوں ۱۰ مارچ سے انہیں ڈاکٹروں نے خطرے سے باہر قرار دیا ہے اور اس وقت وہ گووند ولبھ پنت ہسپتال نئی دِلّی کے نرسنگ ہوم وارڈ نمبر ۱ کمرہ نمبر ۲۰ میں زیرِ علاج ہیں۔

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ جناب سرور تونسوی صاحب اس جان لیوا حملہ سے محفوظ ہیں۔

۴ مارچ سے ہی دفتر کا تمام کام کاج ٹھپ پڑا ہے اور دفتر کا اسٹاف ہمہ وقت اُن کی دیکھ ریکھ میں ان کے رشتہ داروں کے ساتھ شریک ہے۔

آج ۱۱ مارچ کی صبح کو میں ڈاکٹر سے آنکھ بچا کر اُن سے شانِ ہند کے شمارہ مارچ ۱۹۷۸ء کی اشاعت کے بارے میں دریافت کیا۔ تو انھوں نے فرمایا کہ جیسا تمہارا دل چاہے الٹا سیدھا مارچ کا شمارہ شائع کر دو۔

جمع شدہ خطوط میں ملک کے کونے کونے سے لال قلعہ کے مشاعرہ میں ہوئی بدنظمیوں نیز کھلے بندوں اس مشاعرہ کی ناکامیابی کی تمام تر ذمہ داری پروانہ ردولوی اور گوپال متل صاحب آف تحریک پر نہایت ذمہ داری کے ساتھ ڈالنے کے سلسلے میں سینکڑوں خطوط میں پروانہ ردولوی اور گوپال متل صاحب کے خلاف اظہار ناراضگی کا جو اظہار کیا گیا ہے اسے سرور صاحب صحت یاب ہونے کے بعد ملاحظہ فرمائیں گے۔ اور ان تحریروں میں سے جو ضروری اور مناسب ہوں گی انھیں "من کے مکتوب الیہ" کے صفحات میں شائع کر دیا جائے گا۔ مگر اس سلسلے میں جناب نازش پرتاب گڑھی کا مکتوب گرامی ایسا ہے کہ جو • گزشتہ بیس سال کی گوپال متلانہ شوگر کوٹڈ چالاکیوں

ودیا پرکاش سرور تونسوی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر خواجہ پریس جامع مسجد دہلی میں چھپوا کر دفتر شان ہند فلیٹ ۳ الفلاح مارکیٹ دریا گنج دہلی سے شائع کیا

اور پروانہ ردولوی کی مزیدار نامہ نگاری پر ایک سیر حاصل تبصرہ ہے۔

محترم بہن کشور ناہید مدیرہ ماہِ نو پاکستان کا مکتوب گرامی بھی اپنی نوعیت میں ایک قابل مطالعہ اور اعلیٰ پاکستانی ادب کا شہ پارہ ہے۔

غرض یہ کہ ملک کے کونے کونے سے جو خطوط موصول ہوئے ہیں ان کے مطالعہ سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کا ہر وہ اردو پڑھا لکھا شخص گوپال متل صاحب اور تحریک، امریکہ نواز سمجھتا رہا ہے پروانہ ردولوی کی تیرہ بے چارے نہ تین میں نہ تیرہ میں۔

کہتے ہیں عاشق چہ خیال بیم ملک در چہ خیال سوچا تھا کہ مارچ کا شمارہ اتنا بھاری بھرکم دلچسپ اور گوناگوں دلچسپیوں کا ایک گہوارہ ہوگا جسے لوگ مدتوں سنبھال کر رکھیں گے۔

جناب حق بنارسی کا مکتوب گرامی جو انہوں نے جناب راہی شہابی جے پوری کی کسی متنازعہ غزل کے بارے میں لکھا تھا جناب ادیب کمن پوری کا خط جناب حق بنارسی کے مکتوب نوشتہ ۱۹۶۹ اور جو ردیف سکے کچھ حضرات کے تصدیقی خط کہ انھوں نے حق صاحب کی یہ متنازعہ غزل راہی صاحب کی زبانی سنی اور عالم فتحپوری کے خط جس میں انھوں نے لکھا کہ حق صاحب نے ان کے سامنے اقرار کیا کہ راہی صاحب نے جو غزل انھیں سنائی وہ ان کی نہیں تھی۔ وغیرہ وغیرہ دستاویزات کے بلاک تیار ہیں جو اسی شمارے میں شائع ہونے تھے۔

مگر اب حالت یہ ہے کہ کہاں تو پہلے کی نسبت تین گنا زیادہ تعداد میں مارچ کا شمارہ چھپ رہا تھا اور ۲۴ صفحات کا اضافہ کیا جا رہا تھا اور کہاں یہ کہ بھرتی کے مضامین سے عام حجم سے بھی آٹھ صفحات کم پرچہ چھاپا جا رہا ہے کیونکہ اس سے مزید صفحات پر شمارہ شائع کرنا قانونی طور پر جرم ہے۔

"بکوئے یار بانداز محرمانہ گزر" کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ پڑھنے والے یہ کہہ رہے ہیں کہ اس کالم نے یادوں کی بارات ناقابل فراموش اور دوسری آلو بائی گرافیوں کے لطف کو پھیکا کر دیا ہے۔ لہٰذا اس فیچر کو دو صفحات تک محدود رکھنا پڑھنے والوں پر ظلم کرنا ہے۔ بہن کشور ناہید مدیرہ ماہِ نو پاکستان نے تو اس فیچر کے بارے میں جو حوصلہ افزا خط لکھا ہے اس سے بہتر داد شاید ہی کسی نے دی ہو۔

سرور صاحب کا یہ خیال تھا کہ اس اشاعت سے یہ فیچر آٹھ صفحات تک بڑھا دیا جائے۔ پنت ہسپتال کے کچھ ڈاکٹروں نے سرور صاحب سے کہا ہے کہ جب آپ اچھے ہو جائیں اور لکھنے لکھانے کا کام شروع کریں تو اس کالم کے تحت جو بھی پہلا مضمون لکھیں وہ ایسا ہو جسے پڑھے بغیر کوئی بھی اپنی ہنسی نہ روک سکے کیونکہ دردِ دل کے بعد ہنسی مذاق کا ہونا ضروری ہے۔

ان ڈاکٹروں نے یہ بھی شرط لگائی ہے کہ اس مضمون میں ان کا مخصوص اندازِ بیان، تسلسل، صداقت اور مسحور کن طرزِ نگارش کے معیار میں کمی نہ آنے پائے۔ آپ حضرات کی اطلاع کے لئے یہ عرض کر دوں کہ سرور صاحب نے یہ مطالبہ منظور کر لیا ہے اور اشاعت آئندہ میں "بکوئے یار بانداز محرمانہ گزر" کے تحت جو یہ مزاحیہ مضمون ہوگا اس کا عنوان ہے۔ "خوشترِ گرامی کی ٹوپی اور سولی" خدا نے چاہا تو یہ شمارہ عوام مدتوں اپنے پاس یادگار کے طور پر محفوظ رکھیں گے

ان الفاظ کے ساتھ میں آپ سے یہ استدعا کروں گی کہ اپنے بہی خواہ، دلی دوست اور خادمِ اردو سرور تونسوی کی صحت کے لئے دعا فرمائیں۔

آمین دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

سائرہ بانو

نائب مدیرہ

۱۱ر مارچ ۱۹۷۸ء

مشاعرہ جشنِ جمہوریت لال قلعہ دلّی

کریمی الاحسانی

غلام ربانی تاباں، خمار بارہ بنکوی، شعری بھوپالی، نصرت سروش، زبیر رضوی، بشیر بدر، ساحر ہوشیارپوری، کرشن موہن، حسن نعیم، حفیظ میرٹھی، نسیم مخموری، قاضی سلیم، افتخار امام

یہ ہے وہ جشنِ جمہوریت کا نام نہاد آل انڈیا مشاعرہ ہے جسے پورے ملک میں لال قلعہ کے مشاعرہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جس کی ایک تاریخ، ایک شہرت رہی ہے۔ لیکن اس سال اس تاریخ کے پرخچے اُڑا دیئے گئے اور شہرت کی دھجیاں بکھیر دی گئیں۔

یہ وہ مشاعرہ ہے جسے سرکاری مشاعرہ کہا جاتا ہے لیکن یہ کیسا سرکاری مشاعرہ ہے جس میں سیاست کو زیادہ دخل رہا اور اس سیاست نے اسے موت کے گھاٹ اُتار دیا۔

یہ وہ مشاعرہ ہے جس میں درباری شعراء کی ایک بیہودہ اصلاح وضع کر کے مشاعرہ میں کرسیاں چلوا دیں اور اراکینِ مشاعرہ کو عوام نے احتجاج کر کے بتلا دیا کہ شاعر عوامی ہوتا ہے اور وہ کسی گروہ، کسی پارٹی، کسی قبیلہ کا نہیں ہوتا۔ لہٰذا لال قلعہ میں ایسا دھماکہ ہوا کہ درجِ ظفر بھی بلبلا اٹھی۔

یہ وہ مشاعرہ ہے کہ کئی سال سے اسے دفنانے کا پروگرام بن رہا تھا مگر امسال "نئے درباریوں" نے اپنے ہاتھوں سے اس کو دفنا دیا اور اس عظیم الزام سے بیچارے پہلے "درباری" صاف بچ گئے۔

یہ وہ مشاعرہ ہے جسے کوئی سنجیدہ نا آشنودہ ناظر بھی نصیب ہوا اور کیا ستم ہے کہ ناظر ایک نہیں عین دھرنے ہوئے تھے اور وہ مشاعرہ کو ڈوبنے سے بچا نہ سکے اور بچاتے کیسے جبکہ یہ خود ڈوبنے والوں میں شریک تھے۔

یہ وہ مشاعرہ ہے کہ اسٹیج سے ایک نیم شاعرہ کو محض اس بنا پر اٹھا دی گئی کہ وہ مدعو نہیں تھی۔ وقت کے اس سنجے نے ایک عورت کی توہین کر کے بڑا کارنامہ سرانجام دیا اور کیا غضب ہے کہ ایک سال تک یہی سنجے اس مشاعرہ کے خلاف "درباری شعراء" کی پگڑیاں اچھال کر ایک زہرآلود اخبار میں شعلہ باری کر کے بھی اس مشاعرہ کو پٹنے سے بچا نہ سکا۔ ذرا سی دیر کا اقتدار جاہل کو ایسا حاسد بنا دیتا ہے جو مثل پروانہ حسد کی آگ میں مستقل جلتا رہتا ہے۔

یہ وہ مشاعرہ ہے جس میں اُردو کے بدترین دشمنوں، شعر و شاعری کے قاتلوں نے منظم سازش کے تحت اس مشاعرہ کو آن واحد میں اُٹھا کر رکھ دیا اور عوام کے اس احتجاج کے سامنے مشاعرہ کمیٹی بے بس تلملاتی رہی۔ درباری لوگوں کا ہاتھ دربار ہی میں چلتا رہا اور عوام کے اس غصہ کو دبانے کی کس میں طاقت تھی جو یہ غصہ یہ احتجاج دبا دیتا؟

یہ وہ مشاعرہ ہے کہ T.V. پر پورا مشاعرہ دکھانے کی ہمت نہ ہو سکی ریڈیو پر سنانے کی جرأت نہ کر سکے۔ اور یہ قوم کا روپیہ یہ قوم کی پسینہ کی کمائی ــ ہے کوئی اس بات کا جواب دینے والا کہ اس T.V. اور ریڈیو پر کتنا سرمایہ صرف ہوا؟ حساب نہیں اچھی بات ہے!

یہ وہ مشاعرہ ہے جہاں وزیر اعظم جناب شاہ نواز کمال بہاری یا چیف جی تک کو بھی نہیں سنا گیا کوئی کیوں ایسا ہوا ــ؟

اس توہین کے ذمہ دار کون ہیں آیا ہماری شاعر یا مشاعرہ کمیٹی —— ؟

یہ وہ مشاعرہ ہے جس میں شعراء کرام کلام سنانے سے کانپ رہے تھے اور قوم کا سرمایہ ان بے اندازہ خرچ ہوا۔

یہ وہ مشاعرہ ہے کہ کئی شعراء نے سالہا سال کا سنایا ہوا کلام سنایا اور پُر لطف بات یہ کہ موضوع سے اتفاق کی تو کسی شاعر کو ہوش ہی نہ رہی اور کبھی جیسا اس موضوع پر کلام سنایا گیا ہے ۔؟

یہ وہ مشاعرہ ہے جس کے خلاف ایک سال سے ایک مقامی اخبار نے زہر افشانی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی اور پھر اس نے اپنی ہار کا اظہار اسی اخبار میں اس طرح کیا ۔ لال قلعہ کا مشاعرہ ناکام اور ع

ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

یہ وہ مشاعرہ ہے جہاں نعرے بازی ہوئی، کرسیاں چلیں اور گھونسوں کا تبادلہ ہوتے ہوتے بال بال بچا۔ یہ مشاعرہ تھا یا میدان کارزار —— ؟ کیا اس مشاعرہ کا مقصد جنگ بازی اور سیاسی معرکہ آرائی تھی —— ؟

یہ وہ مشاعرہ ہے جب ایک شاعر نے گیت چھیڑا تو صرف سازندوں کی کمی محسوس کی گئی ورنہ تالیوں سے سنگت ہوتی رہی۔

یہ وہ مشاعرہ ہے جسے سنا ہی نہیں گیا اور سامعین کا ایک جم غفیر تھا بحمداللہ امسال کرسیاں آنے والوں کا منہ نہیں تک رہی تھیں بلکہ خالی ہی نہیں تھی جبکہ ہر سال کرسیوں پر اُلّو بولتے تھے ۔ کیا یہ ہجوم کسی سازش کے تحت لال قلعہ میں اتارا گیا تھا ۔؟

یہ وہ مشاعرہ ہے جس کے پاس بڑی فراخدلی سے تقسیم کیے گئے اور پھر اس دریا دلی نے اس مشاعرہ کو لونڈوں سے تباہ کرا دیا۔ نئے درباری شہریار مبارکباد کے مستحق ہیں۔ خدا انہیں اگلے سال تک زندہ و سلامت رکھے تاکہ پھر لال قلعہ میں مشاعرہ کا ڈرامہ کرائیں اور پھر پتھراؤ کا نشانہ بنیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ درباری اصطلاح ان پر بھی چھا جائے اور وہ بھی کامیاب مشاعرہ کر ڈالیں ع

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کی بات نہیں

آئیے پھر نام نہاد آل انڈیا ہٹر بونگ مشاعرہ کو سن ہی لیجیے آپ تو خدانخواستہ اُردو کے دشمن نہیں ہیں۔ نہ ہی اس درجہ جھگڑالو اور سیاسی آدمی ۔ آپ ہر سال اس مشاعرہ کو سننے اور پڑھنے آرہے ہیں ۔ لہٰذا اس سال کے مشاعرہ سے کیوں محروم رہتے ہیں جیسا کچھ ہے حاضر ہے ۔ کبھی کبھی ذائقہ بدلنے کو املی بھی کھائی جاتی ہے ۔ آپ اسے املی ہی سمجھ لیجیے۔ ابھی نہ ہنسئے ۔

یہ لال قلعہ دلّی کا دیوان عام کا سبزہ زار ہے۔ اس وقت رات کے نو بجا چاہتے ہیں۔ ۲۴ رجنوری ۱۹۷۸ء ہے۔ یہ مشاعرہ جشن جمہوریت ساہتیہ کلا پریشد دلّی کی جانب سے منعقد کیا جارہا ہے ۔ محترم اٹل بہاری باجپئی جی وزیر خارجہ، خورشید قدوائی صاحبہ ڈپٹی چیرمین میٹروپولیٹین کونسل کے ہمراہ تشریف لاکر شعراء کے ساتھ ہی بیٹھ گئے ہیں خورشید صاحبہ باجپئی جی کے بارے میں اعلان فرما رہی ہیں مسٹر کیدار ناتھ ساہنی چیف ایگزیکیٹیو کونسل دلّی باجپئی کو ہار پہنا رہے ہیں ۔ پھر محمد اسمٰعیل صاحب بھی ہار پہنا رہے ہیں ساہنی صاحب نے باجپئی کو وزیر داخلہ کہدیا اس پر ایک قہقہہ بلند ہوا ہے ۔ پھر اسی ہنسی مذاق میں فرما رہے ہیں۔ اُردو کے شاعروں نے آزادی کے ترانے لکھے اُردو کا یہ کردار بھلایا نہیں جا سکتا ——— حضور اگر یہ خبر چودھری چرن سنگھ تک پہنچی ——— ؟ باجپئی نے شاعری اور ادب میں کچھ کیا ہے وغیرہ اب مخمور سعیدی صاحب درخواست کر رہے ہیں باجپئی جی سے وہ آکر کچھ فرمائیں، دیکھا تو وزیر موصوف شیروانی، بالوں والی ٹوپی اور چوڑی دار پاجامہ زیب تن کئے تالیوں کی جھنکار میں آکر فرما رہے ہیں۔

آپ شاعری سننے آئے ہیں تقریر سننے نہیں آئے ۔ میں بھی شاعری سننے آیا ہوں ——— شاعری سنی نہیں جاتی بلکہ اشعار سنے جاتے ہیں ۔ چونکہ محترم باجپئی جی بھی کوی ہیں اس ناتے یہ عبارت کی جارہی ہے ——— یہ ساہنی جی

کی مہربانی ہے مجھے مہمان خصوصی بنا دیا ۔ وہ تو مجھے وزیر داخلہ بھی بنانے چلے تھے ——— قہقہہ ——— پچھلے دنوں زمین کے بارے میں سننے میں آیا تھا داخلہ یا خارجہ ——— قہقہہ ——— کل اس قدر گھٹن تھی کہ قلم آزاد نہیں تھے جو جیلوں سے باہر تھے وہ ایک بڑی جیلوں میں بند تھے اس سے کبھی کبھی ڈر لگتا تھا کیا کبھی آزادی واپس آئے گی۔ بدھائی ہے ہندوستان کی ساٹھ کروڑ جنتا کی جس نے آزادی دلائی ——— تالیاں ——— اب ہم تہیہ کئے ہوئے ہیں کہ اب ایسی کالی رات کبھی نہیں آنے دیں گے ——— تالیاں ——— لیکن یہ بات ہو گئی سیاست کی ——— یہ رنگ میں بھنگ والی بات ہو گی ۔ جب میں اندر تھا تو میں شاعری کیا کرتا تھا ——— ہر اندر جانے والے سیاسی لیڈر نے ملک کو کسی کتاب کا تحفہ دیا وہاں وقت ہی وقت اور فرصت ہی فرصت ہوتی ہے۔ اگر دیکھا جائے تو اندر رہنا ہی ملک و قوم کے لئے مفید اور کار آمد ہے ۔ اس لئے کہ ملک کے عوام کے ہاتھ میں ایک کتاب تو آتی ہے یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ قبلہ باجپئی جی پھر اندر جائیے تاکہ ہم آپ کے بیش بہا اور قیمتی علمی کارناموں سے استفادہ حاصل کر سکیں ——— فی الحال اندر جانے کی بات نہیں ہے ——— انشاءاللہ تعالیٰ ——— اُردو باہر سے نہیں آئی ——— تالیاں ——— اُردو ہندوستان میں پیدا ہوئی تالیاں ——— حضور والا آہستہ سے کہیئے کہیں چودھری چرن سنگھ بالمقابلہ نہ سن لیں ——— ہم چاہتے ہیں اُردو ترقی کرے ——— اندرا بھی یہی کہتی تھی آپ بھی یہی کہہ رہے ——— آوازیں ——— ہُوٹنگ ——— ہلڑ بازی ——— جو اندرا جی کہتی تھی ہم وہ نہیں کریں گے ۔ ہم بے قاعدہ بات نہیں کریں گے ۔ لوگ بول نہیں سکتے تھے ——— آج بھی ایسا ہی ہو رہا ہے ——— آوازیں ——— یہ غلط ہے اگر ایسا ہوتا تو آپ اس طرح نہ بولتے ۔ اس مشاعرہ میں اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ مجھے نہ سنا جائے تو میں جا سکتا ہوں ۔ میں کیا کہہ رہا تھا وہ بھول گیا ——— قہقہہ ——— اُردو نے ملک کا بٹوارہ کیا میں اسے تسلیم نہیں کر سکتا ——— تیز آوازیں اور مداخلت ——— ذرا سرکار عالیجاہ چرن سنگھ سے بھی کہہ دیجئے ۔ وہ تو اُردو کو مستقل بٹوارہ کی زبان کہہ رہے ہیں اور آپ اس بات سے قطعی منکر ہیں ۔ یہ تضاد کیا اور کیوں — ؟ کس بات کو صحیح مانا جائے اور کس کی نہیں ——— اُردو میں اخبارات نکل رہے ہیں جنہیں ہندو بھی پڑھتے ——— پڑھتے ہی نہیں جناب والا بلکہ اُردو اخبارات کے مالکان اور ایڈیٹر بھی ہندو ہیں ——— پنجاب میں اُردو پڑھ رہے ہیں اردو ہر جگہ چل رہی ہے ——— بجا فرمایا جو لوگ اُردو کے نام پر سودا بازی کر رہے ہیں وہ اُردو کے نام پر اپنی جیبوں اپنی تجوریوں اپنے بنک بیلنس میں اضافہ کر رہے ہیں ۔ اُردو کسی بھی سہارے زندہ ہے اور خوب پھل پھول رہی ہے ۔ یہ بھیک کا سلسلہ قطعی طور پر بند ہونا چاہیئے ۔ یہ ایک غلط بات دماغوں میں بٹھلا دی گئی ہے ورنہ چند مفاد پرستوں کے وارے کے نیارے ضرور ہو رہے ہیں ——— اردو پھلے پھولے سرکار اُردو کی مدد کرے ۔ ہم بھی یہی چاہتے ہیں ——— اس مدد سے کون روکتا ہے ۔ ضرور کیجئے اچھی بات ہے نیک خیال ہے ——— جو کمی ہے اسے دور کریں گے ——— تالیاں ——— اور ہم شرمندہ ہیں کہ چند لونڈوں نے بدمزگی پیدا کرنے کی ناکام کوشش کی اس کا پس منظر وہی سیاسی باتیں ہیں ———

محترمہ خورشیدہ صاحبہ فرما رہی ہیں ۔

اس مشاعرہ میں پُرانے شاعر نہیں آئے دنہ جانے پرانے سے آپ کی مُراد کیا ہے ؟ اگر پرانے سے یہ مراد ہے کہ جن شعراء نے گزشتہ سال شرکت کی تھی وہ نہیں بلوائے گئے تو یہ بات صحیح نہیں ہے کیونکہ گزشتہ سال حکیم منظور کشمیری ناوک لکھنوی ، رفعت سروش ، خمار بارہ بنکوی ، ساحر ہوشیار پوری ، شعری بھوپالی وغیرہ نے شرکت کی تھی امسال بھی یہ حضرات مدعو ہیں اور مجھے کہنے دیجئے کہ

اُردو اور مشاعرہ کے سلسلے میں سیاست کی کارفرمائی انتہائی غلط ہے۔ اب دیکھئے نا اس سیاست نے کہ فلاں شاعر درباری ہے۔ فلاں شاعر کانگریسی ہے، فلاں شاعر اندرا نواز ہے، فلاں شاعر کمیونسٹ ہے۔ لہذا ان کو اس مشاعرہ میں مدعو نہ کیا جائے۔ کیا اس طرح یہ مشاعرہ پورے ملک میں بدنام نہیں ہوگیا۔ کیا یہ مشاعرہ رسوائی کا باعث نہ ہو کر رہ گیا ہے؟ حالانکہ ۱۹۷۷ء تک جو مشاعرے ہوئے ان میں یہ تفریق کبھی نہیں ہوئی۔ کبھی بھی مشاعرہ میں سیاست کا دخل نہیں ہوا۔ حد تو یہ ہوتی رہی کہ کمیونسٹ شعراء بھی اس مشاعرہ میں برابر شرکت کرتے رہے اور اس سال عاقبت نا اندیش مشاعرہ کمیٹی کے تنگ نظر اراکین نے خبث باطن کا مظاہرہ کیا اور اس طرح عوام نے اگر بروقت یہ مظاہرہ کیا تو آپ اس بات سے اتفاق کریں یا نہ یہ بالکل صحیح ہی ہوا، مشاعرہ پر کسی کی اجارہ داری نہیں ہے —— ہم نے نئے شاعر بلوائے ہیں۔ آپ انہیں بھی سنیں —— کسے سنایا جائے۔ کیا یہ ملک کے نمائندے شاعر ہیں—؟

—— ہم اُردو کے بارے میں بہت چیختے ہیں لیکن گھر میں اردو جب بچہ پڑھ لکھتا ہے تو اُردو میں دستخط نہیں کرتا اگر اُردو کو دیش میں لانا چاہتے ہیں تو اُردو پڑھئے اُردو لکھئے اردو سیکھئے۔ اگر انگریزی لکھیں اور پڑھیں گے تو اُردو یہاں نہیں آسکتی —— یہ بھی عجیب نظریہ اور تنگ نظری ہے۔ آج کے دور میں کسی زبان کے بارے میں ایسا سوچنا ہی تعصب اور چھوٹی بات ہے۔ کوئی بھی زبان بُری نہیں زبانوں کو محدود کر دینا انتہائی غلط اقدام ہے ——

خورشید صاحب جا رہی ہیں اور نظامت کے فرائض یا مشاعرہ کو دفنانے کے لئے جناب مخمور سعیدی صاحب نے مائک سنبھال لیا۔ رفعت سروش، زبیر رضوی اور بشیر بدر اس مرحلہ پر چپ سے ہیں۔ یہ حبا نمیں اراکین مشاعرہ، ہم قاضیٔ شہر نہ محتسب — فرما رہے ہیں۔ لال قلعہ کی فضا میں یہ مشاعرہ منعقد ہو رہا ہے جو لال قلعہ کی روایات رہی ہیں ان کا احترام ضرور کیجیے —— اس احترام کو تو آپ کے ساتھیوں نے ختم کر دیا۔ مبارک ہو —— اور اب شہزادہ اختر بہادر شاہ ظفر کی غزل سنائیں گے۔ شہزادہ صاحب نے مرحوم ظفر کی ایک غزل ؎

مری آنکھ بند تھی جب تلک وہ نظر میں نور جمال تھا
کھلی آنکھ تو نہ خبر رہی کہ وہ خواب تھا کہ خیال تھا

دلکشی سے سنا کر پلٹ رہے ہیں اور مخمور صاحب زحمتِ غزل دے رہے ہیں افتخار امام صدیقی کو۔ افتخار صاحب فرما رہے ہیں ؎

احساس کی رگ رگ سے ٹپکتی ہے خموشی
حالات نے اس طرح مجھے باندھ دیا ہے
کیا یاد دلائیں گے مجھے میرے ستمگر
ہر نقشِ ستم خود مرے سینے پہ لکھا ہے
ہر لمحہ مری روح پہ لگتے ہیں نئے زخم
کیسا یہ مرے جسم میں اک شور مچا ہے
چہرہ پہ ہے آئینہ کہ آئینہ میں چہرہ
معلوم نہیں کون کسے دیکھ رہا ہے

ایک اور ایک اور تالیاں اور آپ کو خوب خوب سن لیا گیا۔ ادھر آپ جا رہے ہیں اور ادھر مسٹر کوہلی صاحب لفٹننٹ گورنر تشریف لا رہے ہیں۔ محمد اسمٰعیل صاحب ان کو بھی ہار پیش کر رہے ہیں اور مخمور صاحب عنبر دہلوی کو دعوت نغمگی دے رہے ہیں۔ عنبر صاحب یوں دلکشی سے غزل سرا ہیں ؎

موجیں خود ہی تمہیں لیجائیں گی ساحل کی طرف
حوصلہ اپنا جواں بر سرِ طوفاں رکھئے
اب خدا جانے وہ کس راہ سے گذرے ہونگے
آج ہر راہ میں اک شمع فروزاں رکھئے

داد کا اک شور ہے اور میں ہوں گے پر داد دے رہا ہوں یہاں یارو بہتر رہتا۔ آپ فرما رہے ہیں ؎

راہ کعبہ ہو کلیسا ہو صنم خانہ ہو
اپنی اپنی تو رہا منزل پہ تو ایمان رکھئے

پھر داد شباب پر ہے اور آپ دلکشی سے لہرا رہے ہیں ؎

ایک تصویر بنائی ہے اس انداز کے ساتھ
اپنے شانوں پہ ابھی زلف پریشاں رکھئے

عنبر صاحب مناسب داد پاکر اپنی جگہ لے جاتے جا رہے ہیں (عنبر صاحب نابینا ہیں) اور مخمور صاحب دعوت غزل دے رہے ہیں حکیم منظور کشمیری کو۔ منظور صاحب نے وہی غزل جو کہ گزشتہ سال اسی جگہ سنائی تھی۔ پھر شروع کر دی ہے۔ میں نے سر پیٹ لیا ہے۔ عوام کی یادداشت اور حافظہ اتنا کمزور نہیں ہے جو وہ ایک سال پہلے کی بات یاد نہ رکھ سکیں لہٰذا کوئی خاص اثر نہیں چھوڑا آئیے پھر سُن لیجئے گا ؎

چھوڑ کر مجھ کو کہیں پھر اس نے کچھ سوچا نہ ہو
میں ذرا سوچوں وہ اگلے موڑ پر ٹھہرا نہ ہو
میں بھی اک پتھر لئے تھا خوشدلوں کی بھیڑ میں
اور اب یہ ڈر ہے اس نے مجھ کو پہچانا نہ ہو
ہم کسی بہروپئے کو جان لیں مشکل نہیں
اس کو کیا پہچانئے جس کا کوئی چہرہ نہ ہو

منظور صاحب منہ دیکھے کی داد وصول کئے چلتے بنے۔ اُدھر مخمور صاحب فرما رہے ہیں۔ اس شاعر نے قید و بند کی صعوبت اٹھائی ہے اور اب آپ حفیظ میرٹھی سے ان کی غزل سنئے T.V. والے جاگ گئے ہیں اور حفیظ صاحب لحن داؤدی میں غزل سرا ہیں ؎

گرد آلود سہی ماحول کے تیور کتنے
معرکے پھر بھی محبت نے کئے سر کتنے
واجد و عقد لئے ہوئے نقش تھے امید کے
ہو گئے ایک تبسم سے اُجاگر کتنے
دلِ انساں پہ حوادث کی یہ چوٹیں توبہ
پھول کے سینے پہ توڑے گئے پتھر کتنے
اپنی ہستی پہ نہ اترائے کوئی کوہِ غرور
وقت نے پھینک دیئے ایسے اٹھا کر کتنے

داد کا عالم نہ پوچھئے اور آپ اس سچ وچ سے لہرا رہے ہیں ؎

مڑ کے دیکھا تو نظر آئے بہت چیں بہ جبیں
یہی احباب ملے تھے ابھی ہنس کر کتنے

پھر داد نقطۂ عروج سے سوا ہے اور آپ محفل کو گرما رہے ہیں ؎

مجھ کو طوفان سے لڑنے میں مزا آتا ہے
ورنہ بہہ جاتے ہیں سیلاب کے رُخ پر کتنے

تالیوں کے شور میں مائک سے جُدا ہوا چاہتے ہیں کہ ایک غزل کی فرمائش پر پھر آپ ایک غزل ؎

یہ بات نرالی دلِ خود دار کرے ہے
تڑپے ہے مگر درد سے انکار کرے ہے

سنا کر تالیوں کے شور میں کامراں پلٹ رہے ہیں۔ حفیظ صاحب نے مشاعرہ کو لوٹ لیا۔ اِدھر مخمور صاحب دعوت تفریح دے رہے ہیں ناوک لکھنوی کو۔ ناوک صاحب نے گزشتہ سال کے سنے سنائے قطعات۔ چھیڑے ہیں۔ یار لوگوں نے ان کو تفریح میں اڑا دیا۔ دو ایک قطعات سنانے کے لئے ان کو لکھنؤ سے بلایا گیا ہے۔ دہلی میں ان سے کہیں بہتر کہنے والے پڑے ہیں۔ آئیے ایک قطعہ سُنئے اور ایمان سے کہئے کہ اس قطعہ سے اردو ادب میں کیا اضافہ ہوا۔ ؟ ؎

فیشن کی ترقی کا بدلا ہوا نقشہ ہے
پہچاننا مشکل ہے لڑکی ہے کہ لڑکا ہے
بکھری ہوئی زلفیں ہیں شانوں پہ برابر سے
کس رُخ سے کوئی دیکھے یہ نر ہے کہ مادہ ہے

یہ لال قلعہ کا مشاعرہ ہے۔ کیسے کیسے عظیم فن کار پیش کئے جا رہے ہیں ماشاء اللہ اس انتخاب کی داد دیجئے لیجئے لال قلعہ کے لئے ایک نئی دریافت تسنیم فیضی صاحبہ آ رہی ہیں۔ یہ بھی سفارشی ہیں ورنہ دلی میں بیگم ممتاز مرزا، جمیلہ بانو، مسعودہ حیات بھی موجود ہیں لیکن وہ معتوب قرار دے دی گئی ہیں۔ اللہ رے تنگ نظری تسنیم صاحبہ ایک پرانی غزل الاپ رہی ہیں ؎

تری یاد کا ہر پل وجہ شادمانی ہے
صبح بھی سہانی ہے رات بھی سہانی ہے

دوسروں سے بڑا ہوں خود سے بدگمانی ہے
کیا یہی محبت کا عالمِ جوانی ہے
یہ خلوص کے دعوے مصلحت کا دھوکا ہے
صرف جام بدلے ہیں مے وہی پرانی ہے

یہاں بھی شاعر بدلے ہیں لیکن کلام وہی گھسا پٹا سنا سنایا ہے۔ یہ مشاعرہ جشن جمہوریت کے نام پر ہر سال منعقد ہوتا ہے۔ اسے آپ شبِ غزل کیوں نہیں کہتے۔ ارشاد ہوا ہے ؎

بھیگ تو گیا دامن میرے اشکِ پیہم سے
خود ہی فیصلہ کر لو خون ہے کہ پانی ہے
کل کرم کی شہرت تھی آج ظلم کے چرچے
جانے وہ حقیقت تھی جانے یہ کہانی ہے

تسنیم صاحبہ سے یار لوگ دوسری غزل سننے کے موڈ میں ہیں لہٰذا اب انھوں نے ایک بالکل ہی پٹی پٹائی غزل ؎

چھوتے ہی برگ گل کو میرا ہاتھ جل گیا
لیکن تمام عمر کا کانٹا نکل گیا

چھیڑی ہے کانٹا نکل گیا۔ پر یار لوگ اور انداز سے داد دے رہے ہیں اور میں نے سننے پر اکتفا کیا۔ ایک بات مشاعرہ کمیٹی کی سمجھ میں نہیں آئی جن شعرا کو اس مشاعرہ میں مدعو کیا گیا ہے ان کی تصاویر اور کلام سووِنیر (کتابچہ) کی صورت میں چھپا ہے لیکن کس قدر عجیب بات ہے کہ جو کلام اس سووِنیر میں شامل کیا گیا ہے وہ اس مشاعرہ میں نہیں سنایا گیا۔ ایسا کیوں ہوا۔ اور شعرا نے اس اصول کی پابندی کیوں نہیں کی ——؟ گویا عوام کو مشاعرہ کمیٹی اور شعرا کو بیوقوف سمجھ لیا ہے۔ اس طرح یہ سووِنیر بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے اور اس پر جو خرچ کیا جاتا ہے وہ قطعاً ناجائز۔ آخر اس سووِنیر کا مطلب کیا ہے۔ کیا آئندہ اس کو چھپوانا بند کر دیا جائے گا یا پھر شعرا کو مجبور کیا جائیگا کہ وہ جو کلام اس سووِنیر کو بھجوائیں اسی کو اس مشاعرہ میں پڑھا جائے ورنہ یہ فریب اور دھوکہ دہی ہے۔ لیجئے مخمور صاحب رفعت سروش سے درخواست کلام کر رہے ہیں۔ رفعت صاحب رواں دواں سنا رہے ہیں۔ یار لوگ سننے کے موڈ میں نہیں ہیں۔ اس پر رفعت صاحب خفگی اور برہمی کا یوں مظاہرہ کر رہے ہیں کہ اب مخمور سعیدی سے ان کا کلام سنئے ایسا ہی مشاعرہ چلایا کرتے ہیں وغیرہ رفعت صاحب کو ایسا اعلان کرنے کا کوئی حق نہیں تھا لیکن انہوں نے شعرا کی ترتیب پر ایسا کہا ہے غالباً اس پر مخمور صاحب نے فرمایا۔ رفعت صاحب نے اپنا غصہ مجھ پر اتارا ہے۔ اب آپ بشیر بدر سے ان کا کلام سنئے۔ بدر صاحب فرما رہے ہیں ؎

رو دیئے سنگدل دل مرا دیکھ کر
آئینہ ہو گئے آئینہ دیکھ کر
تم ابھی شہر میں کیا نئے نئے آئے ہو
رک گئے ہو جو یہ حادثہ دیکھ کر
پھول سی انگلیاں کنگھیاں بن گئیں
الجھے بالوں سے ماتھا ڈھکا دیکھ کر
ایک کونے میں ایک شخص روتا رہا
سب کو محفل میں ہنستا ہوا دیکھ کر
پھر دیئے رکھ گئیں تیری پرچھائیاں
آج دروازہ دل کا کھلا دیکھ کر

بدر صاحب اس ہڑبونگی ماحول میں غنیمت ہے کہ سنے گئے اور خوب داد پا کر اپنی جگہ آ رہے ہیں۔ مخمور صاحب زبیر رضوی دعوتِ موسیقی دے رہے ہیں۔ زبیر صاحب نے یہاں ایسی غلطی کی کہ وہ ماحول، فضا اور عوام کے مزاج کو نہ تاڑ سکے اگر اس وقت غزل چھیڑتے تو کامیاب رہتے لیکن وہ گیت سنانے لگے۔ لہٰذا یار لوگوں نے تفریح میں اڑا دیا۔ جس لے اور ترنم سے گیت چھیڑا اسی انداز سے تالیاں شروع ہو گئی ہیں۔ اس پر زبیر صاحب زچ ہو کر فرما رہے ہیں۔ اپنے پیشے کا تو پتہ نہ دیجئے۔ یار لوگ اب زیادہ برہم ہو گئے۔ زبیر صاحب برہمی کے عالم میں اپنی جگہ پینترا بدل کر آ گئے ہیں۔ سو بیٹھ گئے۔ زبیر صاحب گئے۔ اب کون سنانے کی جرأت یا حماقت کرے گا

باصرار تمام . . . . . زبیر صاحب پھر تشریف لا رہے ہیں
اس بار پھر گیت سنانے غلطی کی۔ اس گیت کا مکھڑا ہے ؎
گجرا نہ لانا گجرا نہ لانا میرے لئے موسم کا کوئی پھل لانا
کونسے فلم کا ہے بھائی آواز قہقہہ
یہ حاملہ عورت کی فرمائش ہے ایک آواز
پھر وہی ہٹر بونگ ۔ وہی تالیاں وہی قہقہے۔ یہ محفل شعر و شاعری ہے یا کوئی ہلڑ بازی۔ پھر زبیر صاحب اس ہنگامہ کی تاب نہ لا کر چلتے بنے، دوسری بار آنا ہی نہ چاہیے تھا۔ کیا ستم ہے کہ اس سیاست میں کیسے اچھے مشہور و مقبول شاعروں کی مٹی پلید کی جا رہی ہے۔ آیئے پھر مخمور صاحب کے انتخاب کی داد دیجیے۔ اب آپ یاد فرما رہے ہیں امیر آغا قزلباش دہلوی کو۔ امیر صاحب یوں گلو خلاصی کر رہے ہیں ؎

ظلمت کے تلاطم سے ابھر کیوں نہیں جاتے
اترا ہوا دریا ہے گذر کیوں نہیں جاتے
بادل ہو تو برسو کبھی بے آب زمیں پر
خوشبو ہو اگر تم تو بکھر کیوں نہیں جاتے
تم راہ میں چپ چاپ کھڑے ہو تو گئے ہو
کس کس کو بتاؤ گے کہ گھر کیوں نہیں جاتے

امیر صاحب کو برداشت کر لیا گیا ہے آپ جا رہے ہیں ادھر ایک آواز بلند ہوئی کسی شاعر کو بھیجیے ایک قہقہہ نغمگی مخمور صاحب ثروت نواز لکھنوی کو دعوت دے رہے ہیں۔ ثروت صاحب غزل سرا ہیں ؎

جو دنیا میں ہمدردیاں ڈھونڈتے ہیں
وہ صحراؤں میں بستیاں ڈھونڈتے ہیں
دھندلکوں میں ماضی کے چھوڑ آئے جن کو
ہم اکثر وہ پرچھائیاں ڈھونڈتے ہیں

ایک صاحب سگریٹ پیش کرتے آ رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا حفیظ صاحب اور نسیم مخموری صاحب پینے والے نہیں ہیں ہم کھانے والے ہیں۔ لہذا ہمارے سامنے سونف مصری کی گولیاں اور الائچی کی ایک طشتری رکھی ہوئی ہے۔ ہم کھا رہے ہیں اور ثروت صاحب کچھ زیادہ نہیں جسے آپ کو بھی سن لیا گیا ہے۔ آج یہ دیکھنے میں آ رہا ہے اگر کسی شاعر نے ایک شعر سن لئے گئے تو اسے کامیاب سمجھا جا رہا ہے۔ نسیم مخموری صاحبہ خلاف توقع تحت سے سنا رہی ہیں ؎

دامن زیست میں داغوں کے سوا کچھ بھی نہیں
کیا خریدے گا کوئی شہر کے بازاروں سے
کیسا آسیب زدہ ہے یہ زمانے کا چلن
ڈر سا لگتا ہے مجھے بنی ہی دیواروں سے
جھانک کر دیکھئے اندر تو اندھیرا ہوگا
روشنی لاکھ نکلتی رہے میناروں سے
کون رویا تھا یہاں کس نے صدائیں دی تھیں
رات بھر پوچھ رہی تھی مری دیواروں سے

نسیم صاحبہ بھی بخیریت تمام جا رہی ہیں اور مخمور صاحب شہریار غزل خمار بارہ بنکوی سے درخواست کر رہے ہیں۔ خمار صاحب نے بانکپن سے غزل چھیڑی ہے ؎

موجوں سے نہ طوفانوں سے اللہ بچائے
کشتی کے نگہبانوں سے اللہ بچائے

داد مل رہی ہے شباب پہ ہے۔ سامنے سے آواز بلند ہوئی آمین۔ اسی ہنسی مذاق میں یوں محفل کو گرمانے چلے ہیں ؎

وہ ناصح مشفق ہوں کہ ہوں واعظ مخلص
بہکے ہوئے انسانوں سے اللہ بچائے

داد پر کسی ہنگامہ کا گمان ہو رہا ہے اور آپ ایسی سج دھج سے لہرا رہے ہیں ؎

یاد آئیں تو اڑ جائیں کئی راتوں کی نیندیں
بھولے ہوئے افسانوں سے اللہ بچائے
تاریخ کے اوراق پہ لکھا ہے لہو سے
انسانوں کو انسانوں سے اللہ بچائے
یہ زہد کی تبلیغ خمار اور یہ رندی
تم جیسے مسلمانوں سے اللہ بچائے

خمار صاحب داد و تحسین پا کر کامراں پلٹ رہے ہیں اور

مخمور صاحب کرشن موہن کو یاد فرما رہے ہیں ۔ کرشن جی رواں دواں فرما رہے ہیں ؎

ہو گئی ہے ختم کہانی یقیں نہیں آتا
گذر گئی ہے جوانی یقیں نہیں آتا

پرانی غزل ہے ——— ایک آواز ——— مشاعرہ جشن جمہوریت ——— زندہ باد ——— آوازیں ——— اور آپ سنا رہے ہیں ؎

تمہارا حُسن ہے فانی یقیں نہیں آتا
ہمارا عشق ہے فانی یقیں نہیں آتا

آپ جا رہے ہیں اور مخمور صاحب دعوت غزل دے رہے ہیں ساحر ہوشیار پوری کو ۔ ساحر صاحب عنایت کر رہے ہیں ؎

جتنا اپناؤ گے اتنے ہی سنور جائے گی
زندگی خواب نہیں ہے کہ بکھر جائے گی
سوئے منزل تو یہ لے جائے گی تسلیم مگر
سوئے مقتل بھی یہی رہگذر جائے گی
آشیانے کو ذرا آگ لگا کر دیکھو
روشنی ہوگی تو ہر آنکھ ٹھہر جائے گی

ساحر صاحب مناسب داد وصول کئے جا رہے ہیں اور مخمور صاحب نصرت گوالیاری کو دعوتِ موسیقی دے رہے ہیں ۔ آج نغمگی اور موسیقی کا جادو بھی نہیں کام کر رہا ہے ۔ نصرت صاحب غزل سرا ہیں ؎

جبر کی انتہا سے گذرے ہیں
امتحان وفا سے گذرے ہیں
ہنستے ہنستے قضا سے گذرے ہیں
ان کی اس برہمی کو کیا کہئے
خواب میں بھی خفا سے گذرے ہیں

لیجیے پھر سامنے والے تفریح کے موڈ میں ہیں ۔ نصرت صاحب اس بیہودگی کو تاڑ گئے ہیں ۔ لہٰذا آپ چلتے بنے اور مخمور صاحب ڈاکٹر شہریار صاحب کو زحمت سخن دے رہے ہیں ۔ ڈاکٹر صاحب کی شہریاری بھی اثر انداز نہ ہو سکی ایک شعر سن لیجیے ۔

اس شہر سے سناٹے ہمیشہ کو چلے جائیں
ایجاد کرو ایسی کوئی طرزِ فغاں بھی

سامنے ایک ہنگامہ دار وگیر ہے اور ڈاکٹر صاحب پلٹ رہے ہیں ۔ کیا اس طرح اُردو زندہ رہے گی ۔ ؟ مشاعروں میں شعراء آیا کریں گے ۔ ؟ مشاعروں میں ذرا سی تفریح روا ہے ۔ اگر یہ نہ ہو تو مشاعرے نہ ہوئے ۔ مجلس وعظ ہو ئی لیکن ایسی تفریح کہاں تک کہاں تک درست ہے کہ مشاعرہ ہی کو اکھاڑ پھینکا جائے اور یہ نہ سوچا جائے کہ پورے ملک پر اس تفریح ، اس ہنگامہ آرائی کا کیا اثر پڑے گا ۔ دیکھا تو اسی ہنگامہ میں شعری بھوپالی گلو خلاصی کر کے چلتے بنے آپ سوچئے جس مشاعرہ میں شعری صاحب کو بھی سنا نہ جائے وہ کیسا مشاعرہ ہوگا ۔ باجپئی جی اور لفٹننٹ صاحب ۱۲ بجے تشریف لے جا رہے ہیں ادھر تالیاں سیٹیاں شروع ہو گئی ہیں اور جس شاعر کو بلایا جاتا ہے وہ اس ہنگامہ سے گھبرا رہا ہے اور اسی میں عافیت سمجھ رہا کہ نہ سنا کر جان بچالی جائے ۔ اسی ہاؤ ہو میں حیات لکھنوی نشانہ تفریح بن رہے ہیں سنئے ؎

جس کا مسلک ہے حوادث سے گذر کر جانا
اس نے مجھ کو بھی بچھڑتا ہوا منظر جانا

مرے حیا ——— ایک آواز ——— دس پیسے لیتے جانا ——— دوسری آواز ——— اور حیات صاحب سیٹیوں کے شور میں چلتے بنے اور ضیا خورجوی ہاؤ ہو کے شور میں پگڑی اچھلوانے کے لئے آ رہے ہیں ——— اب حیات ——— ایک آواز ——— اور ضیا صاحب جرأت رندانہ سے کام لیکر سنا رہے ہیں ؎

یہ ترا حُسن کہ چڑھتے ہوئے سورج کا شباب
پھول سا چہرہ کہ اس دھول میں کمھلا جائے
شیشہ ٹوٹے تو یہ ممکن ہے کہ ہم جوڑ بھی لیں
دل جو ٹوٹے تو کسی سے بھی نہ جوڑا جائے

ضیا صاحب ہمت کر کے سنا گئے اسے چھوڑیئے کہ کون سن رہا تھا ۔ سُنا تو آج کسی کو بھی نہیں جا رہا ہے ۔ لیجیے حسن نعیم

بھی آ پھنسے۔ ایک مطلع بمشکل تمام ضبط کیا گیا ہے۔ آپ بھی سن لیجئے ؎

تلاش نظم میں ہر چند جا بجا ٹھہرا
غزل کے در پہ بہاروں کا قافلہ ٹھہرا

اور کیا پڑھا اللہ جانے اتنا تو دیکھا جب وہ ہاؤ ہو کی زد میں آئے تو اوروں کی طرح صاف گئے اور آج ع

اس شاعری میں عزت سادات بھی گئی

والا عالم نظر آ رہا تھا۔ اب مخمور صاحب خود نشانہ بننے آئے ہیں۔ آپ حسب عادت رواں دواں سنا رہے ہیں۔ یہ یاد رہے کہ ہنگامہ کا وہی عالم ہے۔ یار لوگ اپنی نیند تو حرام کر ہی رہے ہیں اوروں کو بھی سننے نہیں دے رہے۔ ارشاد ہوا ہے ؎

پہ بہ پہ سمت سفر اپنی بدلتا کیوں ہے
چلتے رہنا ہے تو رک رک کے سنبھلتا کیوں ہے
سبز پیڑوں کے گھنے جھنڈ برستا موسم
یہ سماں میرے لئے آگ اگلتا کیوں ہے

مخمور صاحب اپنی جگہ آکر لال قلعہ اور دلی والوں کے لئے ایک نئی دریافت گوہر جلالی بھوپالی کو پیش کر رہے ہیں۔ گوہر صاحب نے کیا جوہر لٹائے کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ ادھر سیٹیوں کے ساتھ رفعت سروش کا نعرہ بلند ہو رہا ہے اور ساتھ ہی کرسیاں بھی اچھلنی شروع ہو گئی ہیں۔ میں سوچ رہا ہوں کیوں تو رفعت صاحب کو سنا نہیں تھا اور اب کیوں ان کا نعرہ بلند ہو رہا ہے یہ کیا بکواس ہے اور کیوں ایسی بیہودگی کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔ اسی ہنگامہ میں ایک دوسری دریافت قاضی سلیم بھی صاف گئے اور ہلڑ بازی کا یہ عالم ہے کہ قبلہ غلام ربانی تاباں صاحب آنے سے کترا رہے ہیں بمشکل تمام ان کو مائک پر لایا گیا ہے، اور آپ رشتہ رواں دواں عطا کر رہے ہیں ؎

تمہیں بتاؤ پکارا ہے بار بار کسے
عزیز رکھتے ہیں غمہائے روزگار کسے
سکوت راز ہو یا سکوت مجبوری
مگر لبوں کی جسارت ہی ناگوار کسے

شگفتگی کا اشارہ تھا پھول برسیں گے
نہ جانے آج نوازے گی شاخ دار کسے

قبلہ تاباں صاحب گلو خلاصی کر کے آ رہے ہیں اور آپ کے ساتھ ہی بارہ بجے جشن جمہوریت کا یہ نام نہاد آل انڈیا مشاعرہ دم توڑ گیا اور زندہ ہی کب تھا

مشاعرہ کمیٹی کی نااہلیت کی وجہ سے یہ سرکاری مشاعرہ پٹا یا عوام کی کسی سازش نے اس کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا۔ لیکن یہ کیا ستم ہے کہ دلی کی بھاری اکثریت ہی اس مشاعرہ کے خلاف گئی۔ چند لوگوں کے علاوہ وہاں بھاری تعداد ہلڑ بازی، ہنگامہ آرائی نعرہ بازی پر اتری ہوئی نظر آ رہی تھی۔ آخر یہ سب کچھ کیا تھا ۔۔۔؟ کیوں مشاعرہ کمیٹی نے شعراء میں تفریق پیدا کی۔ اس مشاعرہ کو ناکام کرانے اور پٹوانے میں سب سے بڑی مجرم مشاعرہ کمیٹی ہے۔ لہذا اس سے باز پرس کی جائے اور وہی اس مشاعرہ کی ناکامی، بدنامی اور رسوائی کی ذمہ دار بھی ہے۔ جب درباری شعراء اور کانگریسی شعراء کی صف بندی کر لی گئی تو اس مشاعرہ کا یہ حشر ہونا لازمی تھا۔ دنیا کی کوئی طاقت اس کو پٹنے سے نہیں بچا سکتی تھی اور یہ جو کچھ ہوا مشاعرہ کمیٹی کی تنگ نظری۔ کور ذوقی پر ایک تازیانہ اور بھرپور طمانچہ ہے ورنہ یہ کمیٹی کو مداری بن کر مشاعرہ کا تماشہ دکھاتی اور یہ دیکھتی عوام کس شاعر کو پسند کرتے ہیں اور کون کون شاعر اس مشاعرہ میں کامیاب ہوتے رہے ہیں۔ ان کو ہی بلایا جاتا۔ لہذا گروپ بندی پارٹی بازی سے بلند ہو کر ان کو بلایا جاتا اور اس طرح مشاعرہ کامیاب ہوتا اور نئی کمیٹی پورے ملک میں نام پیدا کرتی۔ اس کی تعریف ہوتی۔ وہ ایسا نہ کر سکی اور بدنامی، رسوائی کا سرٹیفکیٹ لے کر بیٹھ رہی اور یہ بدنامی و رسوائی کا اس کے ماتھے پر دیکھئے ٹیکہ کب اترتا ہے اور کب وہ سرخرو ہو کر صاف دل و دماغ سے مشاعرہ میں شعراء کو مدعو کرتی ہے اور شہ سر ہونے تک

گلِ نو کا واحد پریمی

کامل بہزادی ایم اے

۱۸۵۷ء کے ناکام غدر کے بعد مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا الطاف حسین حالی لاہور کے مناظمہ کی بنیاد رکھتے ہیں اور اردو شاعری ایک نئے دور میں داخل ہوتی ہے۔ نظم غزل کے مقابلہ میں آجاتی ہے۔ خاص طور سے حالی کو غزل بے وقت کی راگنی معلوم ہوتی ہے۔ اس طرح غزل کے خلاف ایک تحریک شروع ہو جاتی ہے۔ رفیقانِ غزل کچھ تو رخصت ہو جاتے ہیں اور جو کچھ بچ رہتے ہیں۔ ان کی آوازیں ان ہنگاموں میں دب جاتی ہیں۔ غزل کے زوال کا یقین ہونے لگتا ہے لیکن زمانہ ایک ورق الٹتا ہے اور غزل حسرت سے پھر نئے عہد میں داخل ہوتی ہے اور یہ سلسلہ آج کے دور میں فراق اور فیض تک پہنچتا ہے۔

دہلی اور لکھنؤ کی محفلیں اجڑنے کے بعد رامپور، حیدرآباد، اور بھوپال پر بہار آتی ہے۔ غزل کی دیوی نئی امنگ اور نئی ادا کے ساتھ محفلِ شعر و سخن میں جلوہ گر ہوتی ہے۔

بھوپال عرصہ دراز سے علوم و فنون کا مرکز رہا ہے۔ یہاں کی اپنی ایک تہذیب ہے اور شعر و شاعری یہاں کی تہذیب میں رچ بس گئی ہے یہاں کے شعرا نے ہمیشہ اپنے عہد کے فکری رجحانات کو اپنی شاعری میں سمویا ہے مگر اسے زمانے کی ستم ظریفی کہئے کہ شعرائے بھوپال کو محفلِ شعر و ادب میں وہ مقام حاصل نہ ہو سکا جس کے یہ مستحق ہیں۔

اس وقت میرے سامنے بھوپال کے ایک جواں سال شاعر واحد پریمی کا مجموعۂ کلام "گلِ نو" ہے۔ یہ مجموعہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصہ میں مختلف ناقدین کی آراء ہیں جسے "روحِ گلِ نو" کا عنوان دیا گیا ہے اور دوسرے حصے میں منتخب غزلیں جسے "گلِ نو" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

واحد پریمی حضرت شفا گوالیاری مرحوم کے شاگرد رشید ہیں۔ ان کی شاعرانہ عمر "گلِ نو" کی اشاعت کے لحاظ سے مختصر ہے کیونکہ ان کی شاعری کی ابتدا ۱۹۵۷ء میں ہوئی ہے اور ۱۹۶۸ء میں "گلِ نو" شائع ہوا ہے۔ مگر انہوں نے اس مختصر عمر میں جو ترقی کی ہے وہ قابلِ تعریف ہی نہیں بلکہ قابلِ رشک بھی ہے۔ ان کے کلام میں قدیم شاعری کی صدائے بازگشت بھی ہے اور نئے پن کی جھنکار بھی۔ انہوں نے اپنی شاعری میں فن عروض کا کافی خیال رکھا ہے جو کہ سیماب اسکول کا طرۂ امتیاز ہے۔

غزل پر یہ اعتراض ہے کہ وہ محض گل و بلبل اور وصل و فراق کی شاعری ہے۔ حالانکہ یہی ایمائیت غزل کا حسن ہے یہ الفاظ بے جان اور مردہ نہیں ہیں۔ بلکہ یہ ایک تہذیب کی علامتیں ہیں۔ اردو شاعری کی ابتدا سے لے کر آزادی سے پہلے تک گل و بلبل، آشیاں، بجلی، چمن، شراب، ساقی، موج، طوفاں، تیر، تلوار، بسمل، قاتل وغیرہ غزل کی علامتیں رہی ہیں اور آزادی کے بعد بھی یہ علامتیں غزل کی جان رہی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان میں دار، صلیب، شہر، جنگل دیوار اور روشنی وغیرہ کا اضافہ ہو گیا ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ہر دور کی علامتوں میں یکسانیت پائی جاتی ہے مگر ان کے مفہوم بدلتے رہتے ہیں۔

واحد پریمی نے اپنی غزلوں میں ان علامتوں سے بڑا کام لیا ہے۔ انہوں نے زندگی کے نشیب و فراز کو قریب سے دیکھا ہی نہیں بلکہ ان میں نبرد آزما بھی ہوئے ہیں جیسے

بارہا زبانوں پر لگ گئی ہے پابندی
بارہا نگاہوں سے کی ہے گفتگو ہم نے

نہ پوچھئے کہ شبِ ہجر ہم پہ کیا گزری
تمام رات جلے شمع انجمن کی طرح

کیوں حقارت سے دیکھتے ہو ہمیں
سنگ ریزے گہر بھی ہوتے ہیں

بقول رشید احمد صدیقی "غزل اُردو شاعری کی آبرو ہے"
ملے ہمیشہ زمانے کا ساتھ دیا ہے۔ یہ ایسی کافر صنفِ سخن
ہے جو دشوار گزار مرحلوں سے بھی سرخرو ہو کر آئی ہے۔
ں میں دل اور دلی کے مرثیے بھی ہیں اور قزلباش فوجوں
ے قتل و خون کے واقعات بھی۔ صوفیوں اور سنتوں کی روحانیت
کا عکس بھی ہے اور زمانے کی ناقدری کا پرتو بھی۔

واحد پریمی خالص غزل گو شاعر ہیں۔ انھوں نے بھی اپنی
شاعری میں ان تمام واقعات اور حادثات کو نظم کیا ہے
جن سے کہ وہ متاثر ہوئے ہیں مثلاً

دل میں ارمان جو اٹھتا ہے وہ مر جاتا ہے
ریت کا تاج محل بن کے بکھر جاتا ہے

اے خردمندو انہیں کچھ تو ملے دادِ جنوں
پھول برساؤ کہ دیوانوں پہ پتھر برساؤ

آج کے سائنسی دور میں ادبی قدریں بدل چکی ہیں۔ شاعری
میں زیادہ سے زیادہ حقیقت نگاری پر زور دیا جاتا ہے
واحد پریمی نے اس نئی آواز کو پہچان لیا ہے۔ انہوں نے
اکثر اپنے دور کے مسائل کی طرف بڑی خوبصورتی سے
نشاندہی کی ہے۔ ان کے یہاں زندگی سے فرار نہیں بلکہ
ایک مستقل جد و جہد ہے۔ ان کے یہاں عزم بھی ہے اور
حوصلہ بھی جیسے ؎

ہم آج اپنے نشیمن کے خود محافظ ہیں
ذرا سنبھل کے ادھر برقِ بے اماں گزرے

سر بکف اس لئے بیٹھے ہیں نثارانِ وفا
شاید اب تیغ بکف پھر کوئی قاتل آئے

فطرتاً قطرۂ شبنم کی طرح ہیں لیکن
وقت پڑ جائے تو مانند شرر ہیں ہم لوگ

جو اُٹھ سکو تو اُٹھو آندھیوں کی صورت تم
بدل سکو تو بدل دو فضا زمانے کی

آزاد ہندوستان میں ہر فرد کو تحریر و تقریر کی پوری پوری
آزادی حاصل ہے مگر اکثر لوگ اب بھی حق و انصاف کی
باتیں کہنے سے ڈرتے ہیں۔ دیکھئے واحد پریمی نے اس خیال
کو کس دل کشی سے پیش کیا ہے ؎

حق بات سرِ بزم بھی کہنے میں تامل
حق بات سرِ دار کہو سوچتے کیا ہو

کبھی کبھی اہلِ گلشن مصلحت پسندی سے کام لیتے ہیں۔ واحد
پریمی کی زبانی ملاحظہ فرمایئے ۔

وہ بھی وقت آتا ہے گلشن میں کہ اہلِ گلشن
مصلحت دیکھ کے کانٹوں سے بہل جاتے ہیں

دوسروں کے ہنر کو عیب اور اپنے عیب کو بھی ہنر ثابت کرنا آج
کے انسان کا مزاج بن گیا ہے۔ واحد پریمی ایسے لوگوں پر
اس طرح طنز کرتے ہیں ؎

پھر ہر ایک انساں میں حسن ہی نظر آئے
اپنی کم نگاہی پر ہم اگر نظر کر لیں

واحد پریمی کو اپنے وطن کے پھولوں سے ہی نہیں بلکہ خاروں
سے بھی پیار ہے۔ وہ کارزارِ ہستی میں گل و خار کو ایک سطح پر
رکھتے ہیں۔ اس لئے ان کی شاعری میں کہیں کہیں مساوات
کا پرتو بھی ملتا ہے جیسے ؎

خاروں کے بانکپن سے بھی اتنا ہی پیار ہے
مانوس جس قدر ہیں گلوں کی پھبن سے ہم

واحد پریمی کی شاعری میں حسن و عشق کے مضامین بھی ملتے ہیں
مگر بہت کمی کے ساتھ۔ عشقیہ مضامین نظم کرتے وقت
وہ روایت کے بہت قریب چلے جاتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمایئے ؎

شبِ فراق ستم پر ستم ہوا دل پر
تمہاری یاد تمہارا ہی پوچھتی آئی

زمانے کا کوئی بھی غم ہو مستحکم نہیں ہوتا
غمِ محبوب لیکن زندگی بھر کم نہیں ہوتا!

کبھی نہ حسن و محبت میں نبھ سکی واحد
وہ اپنے ناز میں ہم اپنے بانکپن میں رہے

کبھی کبھی ان کے یہاں تصوف کی جھلک بھی نظر آتی ہے جیسے ؎

گل، غنچے، آفتاب، شفق، چاند، کہکشاں
ایسی کوئی بھی چیز نہیں جس میں تو نہ ہو

کولرج کے خیال میں شاعری نام ہے "بہترین الفاظ کے استعمال کا بہترین انداز ہیں۔" جانسن کے نزدیک "شاعری مترنم خیالات کا اظہار ہے۔" اور آرنلڈ کہتے ہیں" شاعری تنقید حیات ہے ۔ ان اصولوں کے تحت جو شاعرانہ صداقت اور شاعرانہ حسن کے مقرر کردہ ہیں۔" ان میں سے ہر ایک کی رائے اپنی جگہ قابل قدر ہے مگر موجودہ سماج کے بدلتے ہوئے دھارے کو آرنلڈ کی رائے کو زیادہ مفید اور مستند کہا جا سکتا ہے ۔ آج کے ادبی تقاضے یکسر بدل گئے ہیں اور ادبی قدروں میں نمایاں تبدیلی واقع ہوئی ہے ۔ اس طرح شاعری میں حقیقت نگاری کو بنیادی حیثیت حاصل ہو گئی ہے ۔

واحد پریمی نے سماجی تقاضوں کو سمجھ لیا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں شعوری طور پر آج کے سماج کی عکاسی نظر آتی ہے جو اپنے خیالات کا اظہار سادہ، صاف الفاظ میں کرتے ہیں ۔ ان کے یہاں لفظی جادوگری کا گزر نہیں وہ صرف خیالی دنیا میں کھوئے ہوئے نہیں رہتے بلکہ جو کچھ محسوس کرتے ہیں بے جھجک کہہ دیتے ہیں ۔

اکثر ناقدین نے غزل میں داخلیت پر زور دیا ہے ان کا خیال ہے کہ داخلیت ہی سے شعر میں تاثر پیدا ہوتا ہے خارجیت سے شاعر کے شعور اور مشقِ سخن کا پتہ چلتا ہے ۔ مگر شعر بے اثر ہو جاتا ہے ۔ واحد پریمی کے یہاں داخلیت کم اور خارجیت زیادہ ہے ۔ اس سے ان کے شعور کی پختگی اور شاعرانہ صناعی کا اظہار ہوتا ہے ۔ مگر ان کے جن اشعار میں روانی اور برجستگی آگئی ہے ان اشعار کو پڑھنے سے دل بھی متاثر ہوتا ہے ۔

مجموعی طور پر واحد پریمی کے کلام میں محبوب کا شکوہ کم اور زمانے کی شکایت زیادہ ہے ۔ آرائش قد و گیسو کا بھی ذکر ہے لیکن آزمائش دار و رسن کی باتیں زیادہ ہیں غرض کہ واحد پریمی اپنی بھرپور شاعرانہ صلاحیتوں کے ساتھ منزلِ شعر و سخن کی راہوں پر کامیابی کے ساتھ گامزن ہیں ۔ اور ان سے مستقبل میں "خوب سے خوب تر" کہنے کی امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں ؂

آخری سفر

ایس۔ ایم۔ عابد نقوی (لندن)

رات کے دو بجے ہیں۔ پنجاب میل رات کی تاریکی کا سینہ چیرتا ہوا اپنی منزل کی طرف چلا جا رہا ہے۔ دیو پیکر انجن کی چنگھاڑ سے رات کا سنسان ماحول لرز اٹھتا ہے۔ رات کی تاریکی اتنی ہیبت ناک ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ سوجھائی نہیں دیتا۔ ایک سیاہ چادر سی آنکھوں کے سامنے حائل ہے۔ ڈبے کے مسافر او نگھ رہے ہیں مگر اس پُر سکوت ماحول میں ایک انسان ایسا بھی ہے جس کے چہرے سے ظاہر ہوتا ہے کہ پریشانیوں اور الجھنوں کا کوئی طوفان اُسے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ ڈبے کے ماحول سے لاپرواہ کھڑکی کے باہر اس کی نگاہیں اس تاریکی میں کچھ ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی ہیں اور اپنی مطلوبہ چیز نہ پاکر بکھر جاتی ہیں۔ اس کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ یہ بتاتے ہیں کہ پریشانی اس کی تقدیر بن چکی ہے اور مایوسیاں اس کو اپنے دامن میں لینے کے لئے بےچین ہیں۔ تفکرات کا ایک پربت ہے جو اس کے ذہن پر پڑا ہوا ہے اور تصورات اسے بار بار آواز دے رہے ہیں۔ تخیلات اسے اپنے آپ میں گم کر دینا چاہتے ہیں۔ اس نوجوان کا نام شاہد ہے۔

بڑھی ہوئی شیو اور آنکھوں کی سُرخی اس کی غمازی کر رہی ہیں کہ جیسے اس کے دل و دماغ میں کوئی آتش فشاں پھٹنے والا ہے۔

شاہد خاموش بیٹھا کھڑکی کے باہر تاریکی میں کسی چیز کو غور سے دیکھ رہا ہے اور تصورات کے ڈانڈے اسے ماضی کی طرف دھکیل رہے ہیں۔

ایکبارگی اس تاریکی میں ایک تصویر اُبھری۔ شاہد نے غور سے دیکھا۔ یہ اس کی جوانی اور لڑکپن کا سنگم تھا۔ اس نے اس تصویر کو آنکھوں میں محفوظ کر کے دل کی گہرائی میں اُتار لیا۔ اس سے ماضی کی ایک آواز اُبھری ... مبارک ہو شاہد ...

تم انٹرمیڈیٹ میں فرسٹ آئے ہو اور وہ چونک پڑا۔ جیسے شاہین یہیں کہیں ہو اور اس نے یہ الفاظ کہے ہوں۔ ایک طنزیہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر رقص کرنے لگی۔ اپنے اس پاگل پن کے خیال سے اس کا ذہن جاگ اُٹھا اور ماضی کا حسین تاج محل تاریکی سے اُبھرا اور وہ سوچنے لگا کتنے حسین تھے وہ لمحے جب وہ پڑھ رہا تھا۔ ہر چیز سے لاپرواہ۔ وہ یہ بھی نہ جانتا تھا کہ پیار کی تڑپ کس چیز کا نام ہے۔

وہ ایک امیر گھرانے کا چشم و چراغ تھا اور اپنے ماں باپ کا تنہا وارث تھا۔ اس لئے ماں کی تمنا اور باپ کے پیار کا اثاثہ تھا۔

شاہین ایک غریب گھر کی لڑکی تھی۔ شاہد اور شاہین نے بچپن کے کھیلوں میں شریک رہ کر اب جوانی کی منزل میں دونوں نے ساتھ ساتھ قدم رکھا۔ بچپن کے قہقہے ختم ہو گئے جوانی کی مسکراہٹ نے جنم لیا تھا۔

پیار کی چنگاریاں دونوں کے دلوں میں دھیمے دھیمے سلگ رہی تھیں۔ انٹر کا رزلٹ آؤٹ تھا۔ وہ فرسٹ آیا تھا ماں باپ خوش تھے ان کا نونہال ایم۔ بی بی ایس کے درجہ میں داخل ہو رہا تھا۔

شاہد اپنے کمرے میں لیٹا ہوا تھا کہ شاہین نسیم صبح کی طرح خوشگوار جھونکے کے مانند کمرے میں داخل ہوئی۔

وہ اسے دیکھتے ہی پھول کی طرح کھل اٹھا۔ شاہین نے کہا "مبارک ہو"

وہ ایک ٹک اسے دیکھتا رہا نگاہیں ٹکراتی رہیں پھر

دل دھڑک اٹھے ۔ وہ چپکے سے اُٹھا اور شاہین کے سامنے جاکر کھڑا ہوگیا ۔ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولا "آج تم مجھے بہت اچھی لگ رہی ہو۔ جی چاہتا ہے تمہیں اپنی نگاہوں میں بٹھالوں"۔ "میرا قد ۵ فٹ ۴ انچ ہے شاہد" شوخی سے بولی۔

"لیکن میری آنکھوں کا حدود اربع آسمان کی وسعت سے بھی زیادہ اور دل کی گہرائیوں میں پیار کا اتھاہ سمندر ہے" شاہد نے مجسم پیار بن کر جواب دیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے برابر پلنگ پر بٹھالیا ۔ دونوں ایک دوسرے کو مسکرا کر پیار بھری نگاہوں سے دیکھنے لگے ۔ اچانک شاہین کے لب ہلے "شاہد کہیں میں تمہارے پیار کے سمندر میں ڈوب نہ جاؤں"۔ "میری محبت تمہارے لئے زندگی کی نیا بن جائے گی شاہین"۔ ... شاہد نے کہا۔

"محبت کسے کہتے ہیں"۔ شاہین نے شوخی سے پوچھا۔

"جو دو روحوں کو ایک کردیتی ہے"۔ شاہد بولا۔

"اور پیار ؟"

شاہد کو شرارت سوجھی ۔ اس نے منہ آگے بڑھادیا یہ بتانے کے لئے کہ پیار کیا ہوتا ہے ۔ اس دم شاہین کا نرم نازک ہاتھ حائل ہوگیا اور اس کے ہونٹ اس پر مچل کر رہ گئے ۔ وہ تڑپ اٹھا ۔ شاہین اسی حالت میں اسے چھوڑ کر کمرے سے بھاگ گئی ۔

وقت گزرتا گیا ۔ دونوں کا پیار پرورش پاتا رہا ۔ کبھی امیر و غریب کا تضاد ہوجاتا کبھی محل اور جھونپڑی کا سوال ہوجاتا ۔ لیکن دونوں کا پیار اس سے دور تھا ۔ دنیا والے ، خاندان والے اس کے اپنے والدین کے ماتھے ٹھنکنے لگے ۔ لیکن کچھ بول نہ سکے ۔ موقع کے انتظار میں تھے ۔ شاہین کی محبت میں سرشار شاہد دنیا سے بے خبر لاپرواہ محبت کی دنیا میں پیار کا حسین تاج محل بنانے میں مشغول تھا ۔ شاہین صرف اس کو اپنا سب کچھ سمجھ کر محبت کئے جارہی تھی ۔

دن مہینوں میں اور مہینے برسوں میں بدلتے رہے ۔ شاہد نے ایم ۔ بی ۔ بی ایس کرلیا ۔ اس کے والد اعلیٰ تعلیم کے لیے اسے امریکہ بھیجنے کی تیاری کرنے لگے ۔ شاہین ایم اے میں داخل ہوئی تھی ۔ آج شاہد امریکہ جارہا ہے ۔

شاہد کا سارا گھر خوش ہے ۔ گھر میں مہمان اکھٹا ہیں ۔ شاہین کمرے میں شکستہ دل کے ساتھ شاہد کا سامان باندھ رہی ہے ۔ آنکھوں میں آنسو بھرے ہیں ۔ شاہد نے اسے اپنی تصویر ہاتھوں میں لئے ہوئے دیکھا ۔ تصویر کو دیکھ رہی ہے اور آنکھوں سے آنسو کی دھار بہہ رہی ہے ۔ شاہد نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا ۔ شاہین چونک پڑی ۔ شاہد سے لپٹ کر رونے لگی ۔ وہ بھی غم کی تصویر بنا کچھ دیر خاموش رہا ۔ پھر اس کے رندھے ہوئے گلے سے آواز آئی ۔

"شاہین میں جارہا ہوں ۔ مگر تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر زندگی نے ساتھ دیا اور وقت نے رہنمائی کی تو تمہارا شاہد پھر تمہارے پاس ضرور آئے گا اور ہم دونوں ایک ہوجائیں گے"

..."شاہد دل تنہائی سے ڈرتا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ دنیا جیت جائے اور ہماری محبت ہار جائے ۔ تم ایک غریب لڑکی کی مجبوری نہیں سمجھ سکتے"۔ وہ روتے ہوئے بولی "اپنے کو دنیا کی مرضی پر قربان کرسکتی ہوں ... مگر اپنی محبت کو بدنام نہیں کرسکتی"۔ وہ بولی ۔

"شاہین خدا کے لئے ایسا مت سوچو ۔ میں امریکہ پہنچنے کے فوراً بعد پاپا کو خط لکھ کر اپنی محبت کی کہانی سنادوں گا مجھے امید ہے کہ وہ اپنے بیٹے کے پیار کا گلا نہیں گھونٹیں گے ... تم اطمینان رکھو اور ہنستے ہوئے مجھے رخصت کرو ۔ اور ہاں "شبو" اس نے پیار سے کہا ۔ ایک وعدہ تم بھی کرو کہ کیا تم میرا انتظار کروگی ۔ صرف چند سال کی جدائی ہمیں اور تمہیں زندگی بھر کے لئے ایک کردے گی"۔

شاہین نے لرزتے ہوئے ہونٹوں سے جواب دیا ۔

"ایک لڑکی جس وقت تک اپنی مجبوری کا سہارا لے کر انتظار کرسکتی ہے ۔ میں اس وقت تک انتظار کرونگی ایک میری بھی خواہش ہے ۔ شاہد تم اپنی تصویر مجھے دیدو"۔

اس کے بدلے تم مجھے کیا دوگی "پیاری شبو"

اس نے کہا غریب دل۔
شاہد نے کہا نہیں اور پھر مہر محبت اس کی پیشانی پر ثبت کردی۔ وہ شرما گئی۔
شاہین کوٹھے پر کھڑی تھی جب تک شاہد کی کار آنکھوں سے دکھائی دیتی رہی اس وقت تک ایک ٹک اسی طرف دیکھتی رہی۔
جب کار آنکھوں سے اوجھل ہوگئی تو تھکے ہوئے مسافر کی طرح دھیرے دھیرے کوٹھے سے نیچے اتر آئی۔
شاہد کے امریکہ سے کئی خط آئے۔ ہر خط میں پیار کا ایک سمندر تھا جو موجیں مار رہا تھا۔ شاہین خطوں اور اس کی تصویر کے سہارے جدائی کی گھڑیاں گزار رہی تھی، اسے کیا معلوم تھا کہ گھر میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ اچانک ایک دن اسے معلوم ہوا کہ اس کی شادی عارف سے ہو رہی ہے جو شاہد کا جگری دوست تھا۔
شاہین بہت پریشان ہوئی۔ اس نے شاہد کو خط لکھا۔
جان سے زیادہ عزیز شاہد
جانتے ہو یہ دنیا والے جیت گئے۔ ہمارے پیار کا حسین تاج محل ان طوفانوں کا مقابلہ نہ کرسکا۔ شاہد اس کو سہارا دو ورنہ یہ بہت جلد مسمار ہو جائے گا۔ تم نے تو کہا تھا کہ تم امریکہ پہنچتے ہی پاپا سے خط کے ذریعے بات کرو گے۔ مگر شاہد میں کچھ عرصہ میں پرائی ہو جاؤں گی۔ اور دنیا والے جس کو میرا مالک بنا رہے ہیں وہ تمہارا دوست عارف ہے...
لڑکی زندگی میں صرف ایک ہی مرد سے محبت کرتی ہے اور اس محبت کی منزل تم ہو۔
جتنا بھی ایک بے سہارا لڑکی احتجاج کرسکتی ہے میں نے کیا... مگر کیا کروں شاہد۔
... قفس میں ایک پرندے کی طرح مجبور ہوں
... مجھے بے وفا نہ کہنا... دنیا ایک زندہ لاش کو دلہن کا روپ دینے کے لئے بضد ہے
... شاید یہ میرا آخری خط ہے... اگر خودکشی گناہ نہ ہوتی تو میں موت کو زندگی پر ترجیح دیتی۔
التجا ہے کہ ایک بدنصیب کی غربت اسیری پہ قربان ہو رہی ہے۔ تماشائی تماشا دیکھ رہے ہیں... منہ میں زبان ہوتے ہوئے بھی بے زبان ہوں۔
زندگی کے ہر موڑ پر میں نے آرزوں اور تمناؤں کے ہار عالم تصور میں تمہارے گلے میں ڈالے ہیں۔
... میں یہ جانتی ہوں۔ کہاں تم اور کہاں میں ایک ذرہ کو آفتاب کا ہمسر نہیں کہا جا سکتا۔ اس سے میں ڈرتی ہوں... مگر تمہارے الفاظ کے سہارے میں نے اپنی زندگی کی کشتی منجدھار میں طوفان کے سپرد کردی تھی کہ میرا شاہد میری کشتی کا بادبان ہے۔
... آج سہارے ٹوٹ گئے۔ بادبان شکستہ ہوگیا۔ کشتی بیچ منجدھار میں ہچکولے کھا رہی ہے۔ بے رحم موجیں کشتی کو اپنی آغوش میں لینے کے لئے بےچین ہیں۔
... شاہد کیا تم کنارے پر کھڑے ڈوبتی کشتی کو دیکھتے ہی رہو گے؟
... اچھا خدا حافظ! زندگی نے میرے ساتھ بہت بڑا مذاق کیا ہے۔ زندگی میں دنیا والے جسم چاہے جس کو دے دیں مگر روح ہماری ہمیشہ تمہاری تھی تمہاری رہے گی۔
فقط محتاج سہارا
شاہین
جس وقت شاہد کو اس کا یہ خط ملا وہ تڑپ اٹھا۔ اسے رہ رہ کر اپنے پاپا پر غصہ آ رہا تھا۔ انہیں سارے حالات لکھ چکا تھا۔ اپنے پیار کی داستان سنا دی تھی۔ یہاں تک میری

تمنا تھی۔ انہوں نے پھر شاہین کے والد سے میری شادی کی بات کیوں نہیں کی؟ کسی کو بتایا؟ مجھے دھوکے میں رکھا!
اس نے فوراً وطن جانے کی تیاریاں شروع کردیں۔ وہ وطن واپس آرہا تھا۔ شاہین کے پاس۔ آج شاہین کو رہ رہ کر درد اٹھتا تھا۔ آج اس کی بارات آنے والی تھی۔ شاہد کا پتہ نہ تھا۔
شاہین نے اپنی سہیلی بلقیس کو بلایا۔ شاہد کی تصویر کو نکالا۔ اس کو دیکھتے ہی آنسوؤں نے بیخود کردیا۔ دیر تک تصویر کو پیار کرتی رہی . . . . روتی رہی۔ بلقیس سے کہا۔
بہن آج میں ایک امانت تمہارے سپرد کررہی ہوں کیونکہ تھوڑی دیر کے بعد اس تصویر کو پیار کرنے اور خطوط کو رکھنے کا حق مجھ سے چھن جائے گا
. . . بلقیس جب شاہد آئے اس کو یہ امانت لوٹا دینا اور کہنا شاہد بھول جانا نبھا ہوگو! "شبو" تھی جس سے تم نے محبت کا ناٹک کھیلا تھا۔ اس سے کہنا۔ وعدہ کرنا آسان ہے نبھانا مشکل ہے اور شاہین کو ہچکیوں نے وہ سب نہیں کہنے دیا جو وہ کہنا چاہتی تھی!
بارات آئی سماج کے ٹھیکیداروں نے بلا سوچے سمجھے شاہین کی قسمت کا فیصلہ کر دیا اور شاہین ایک زندہ لاش کی اندر ڈولی میں بٹھا دی گئی۔
شاہد حیران و پریشان ایرپورٹ سے گھر آرہا تھا۔ باجے کی آواز سن رہا تھا۔ شہنائی نغمہ بجا رہی تھی۔
. . . . دل رو رہے تھے۔ اس کو کسی نے باہر ہی بتادیا کس کی بارات ہے۔
وہ سیدھا عارف کے پاس پہنچا۔ جو دولہا بنا ہوا دلہن کے کمرے میں قدم رکھ رہا تھا۔ اس کی آواز سنتے ہی چونک پڑا۔
. . . . ایک سسکتی ہوئی آواز نے کہا "مبارک ہو عارف!"
تم کب آئے شاہد تھوڑی دیر پہلے آتے تو شادی میں شرکت کرلیتے" . . . وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر دلہن کے کمرے میں لے گیا۔ چلو تمہاری بھابی سے تم کو اسی وقت

ملاتا ہوں۔!"
ارے دیکھئے تو سہی میرا بچپن کا جگری دوست۔ آج ہی امریکہ سے آیا ہے . . . وہ اس کو کمرے میں بٹھا کر شاہد کے لئے کھانے کا بندوبست کرنے چلا گیا۔
شاہین نے سونی سونی نگاہوں سے شاہد کی طرف دیکھا اور کہا . . . تم ایک مجبور لڑکی کی مجبوریوں کا تماشہ دیکھنے آئے ہو . . . تمہاری شاہین مرچکی ہے۔ یہ زندہ لاش تمہارے دوست کی امانت ہے۔ کیا تم اس چہرے کی منہ دکھائی نہ دوگے؟
کیا دوں تمہیں آنسوؤں کے سوا؟ . . . کہ میرے پاس ہے اک دل ٹوٹا ہوا۔
شاہد نے اس کے آنچل کو پھیلا دیا اور دو موٹے موٹے آنسوؤں کے قطرے اس کے آنچل میں آگرے . . . .
شاہین میرے پاس اس کے سوا کچھ نہیں۔
. . . . میرے پیار کے یہ دو چراغ ہیں جن کو میں نے تمہاری نذر کر دیا۔
"خوش رہو شاہین زندگی تم کو مبارک ہو" یہ کہہ کر عارف کا انتظار کئے بغیر کمرے سے باہر نکل آیا۔ سیدھا اپنے گھر پہنچا۔
. . . اس کے پاپا شاہد کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے اور سوچ بھی نہ پائے کہ یہ کس طرح اور کب بغیر اطلاع کے آپہنچا۔
. . . سرخ آنکھوں سے شاہد نے کہا۔ پاپا میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ ایک باپ اپنے بیٹے کا قاتل ہوسکتا ہے۔
آج یہ سمجھ لیجئے شاہد آپ کے لئے مرچکا ہے۔ یہ کہہ کر الٹے پاؤں . . . ریلوے اسٹیشن کی طرف بھاگا . . . اسے اپنی منزل کا خود بھی پتہ نہ تھا۔ وہ ایک بھٹکے ہوئے مسافر کی طرح جس کی کوئی منزل نہ تھی مارا مارا پھرتا رہا۔
رواں دواں کبھی یہاں کبھی وہاں۔ دل کے در

نے اسے چین سے نہ بیٹھنے دیا جس منزل کی تلاش میں وہ اتنی
دور سے آیا تھا . . . . وہ اس کے لیے سراب بن گئی
اس کا دماغ چکرا گیا۔ جیسے وہ بھنور میں پھنسا ہوا
ایک تنکا ہو۔
جو کبھی اُبھرتا اور کبھی ڈوبتا ہے۔
اس نے ایک بار میری طرف مڑ کر دیکھا۔ میں بہت
دیر سے اس کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ کو پڑھنے کی کوشش
کر رہا تھا . . . پوچھ ہی لیا
آپ کو کہاں جانا ہے ؟ . . . آپ کچھ تکلیف
میں معلوم ہوتے ہیں۔
ایسا معلوم ہوا . . . ع

دل کے شکستہ ساز سے نغمے اُبل پڑے
پوچھا کسی نے حال تو آنسو نکل پڑے

اس کی داستان میں سُن رہا تھا۔
گاڑی کی رفتار دھیمی پڑ گئی۔ شہر کی جگمگاتی روشنیاں نظر
آ رہی تھیں . . . اسٹیشن قریب آ رہا تھا۔ گاڑی اسٹیشن پر رک چکی تھی۔

کوئی مل رہا تھا کوئی بچھڑ رہا تھا . . . .
ایک نیا شادی شدہ جوڑا ہمارے ڈبے میں داخل ہوا۔
اس کے گجرے کے پھول ابھی مرجھائے بھی نہ تھے
اس کو دیکھتے ہی شاہد کو جیسے ایک دورہ سا اٹھا اور
فوراً ڈبے سے اُتر گیا۔
. . . . گاڑی چلی اور جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔
شور مچا ہوا تھا اسٹیشن پر۔ لوگ دوڑ رہے تھے . . .
مجمع لگا ہوا تھا ایک دوسرے سے پوچھ ر[illegible] کیا ہوا ؟
کسی نے کہا کوئی بیچارہ قسمت کا مارا انجن کے نیچے آ کر
کٹ گیا۔ کسی نے کہا خودکشی کر لی
میرا دل و دماغ اس کو دیکھنے کے لئے بیتاب [illegible]
دوسرے ہی لمحہ اس کی کٹی ہوئی لاش اسٹریچر پر [illegible]
جا رہی تھی۔
میری آنکھوں نے اسے پہچان لیا۔ خون میں لت پت [illegible]
نوجوان جو ابھی اپنی کہانی سنا رہا تھا۔ آخری سفر
روانہ ہو گیا۔

(×)

تفصیلات ماہنامہ شان ہند نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

زیر فارم ۴ مطابق رول ۸
مقام اشاعت : انصاری مارکیٹ۔ فلیٹ ۸
دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
وقفہ اشاعت : ماہنامہ
قومیت : ہندوستانی
پتہ : انصاری مارکیٹ فلیٹ ۸ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
پرنٹر کا نام : ودیا پرکاش سرور تونسوی
قومیت : ہندوستانی
پتہ : انصاری مارکیٹ فلیٹ ۸ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
ایڈیٹر کا نام : ودیا پرکاش سرور تونسوی
پتہ : انصاری مارکیٹ فلیٹ ۸ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
مالک کا نام : ودیا پرکاش سرور تونسوی
قومیت : ہندوستانی
پتہ : انصاری مارکیٹ فلیٹ ۸ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
میں سرور تونسوی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفاصیل
میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔
ودیا پرکاش سرور تونسوی
۲۸ مارچ ۱۹۷۹ء

دَردِ دِل

نورجہاں سلیم

تمہارے پہلو میں گر مریں وہ موت کتنی حسین ہو گی —
وہ موت کتنی حسین ہو گی۔ شوبی ریڈیو سے یہ گیت سن کر تڑپ گئی۔ گھبرا کر اس نے ریڈیو آف کر دیا اور اپنی ہتھیلیاں کانوں پر رکھ لیں۔

میرے اللہ! یہ گیت کیوں میرا پیچھا کرتا ہے۔
عدیل تم نے تو میرے پہلو میں حسین موت کو گلے لگا لیا لیکن میں تمہارے بغیر زندگی کا زہر کب تک پیوں گی؟

کب تک میرا وجود ریزہ ریزہ ہو بکھرتا رہے گا؟
کب تک اپنی لاش اپنے کاندھوں پر اٹھائے پھروں گی؟
تنہائی کا یہ بوجھ اب تو ناقابل برداشت ہو گیا ہے؟

عدیل! عدیل!! مجھے بھی اپنے پاس بلا لو! بخدا اب تو نہ جینے کی سکت رہی ہے اور نہ کچھ سہنے کی تاب۔ میں اپنی ہی آگ میں سلگ رہی ہوں۔ تم تو جل کر راکھ ہو گئے لیکن میں حریاں نصیب نہ جل سکی۔ ایک دھیمی دھیمی آنچ مجھے ہر لمحہ جلاتی ہے۔ سسکتی ہوئی اس زندگی سے موت ہی اچھی! بے قابو ہو کر اس نے اپنا سر ٹیبل پر ٹیک دیا اور ماضی اس کے تصور میں گھومنے لگا۔

عدیل! جو اس کا خالہ زاد بھائی تھا پانچ سال کی عمر میں ہی ماں کے سایہ عاطفت سے محروم ہو گیا تو اس کی امی اسے اپنے یہاں لے آئی تھیں۔ اس وقت شوبی دو سال کی تھی!

شوبی کو بچپن سے ہی عدیل سے نفرت ہو گئی کیونکہ اسے یہ بری طرح محسوس ہونے لگا تھا کہ امی عدیل کے آنے کے بعد عدیل کو اس سے زیادہ چاہنے لگی تھیں۔
شوبی لاشعوری طور پر عدیل کو اپنا رقیب سمجھنے لگی کیونکہ عدیل نے اس کی ماں کی ممتا میں حصہ بٹا لیا تھا۔ وقت

گزرتا رہا اور شوبی کی نفرت بھی پختہ ہوتی گئی۔ بڑے ہونے پر اسے یہ احساس ہونے لگا کہ عدیل لاوارث ہے جو ان کے رحم و کرم پر پڑا ہے۔

بچپن کی عدیل سے نفرت کچھ اور بڑھ گئی اور وہ صرف امی اور عدیل کو تکلیف پہنچانے کی خاطر سب کچھ کرنے کو تیار رہنے لگی۔ بچپن میں ماں کی پوری توجہ نہ ملنے پر اس کی عادت میں تلخی اور ایک قسم کا غرور سا بڑھتا گیا۔

عدیل نے اسے ہمیشہ پیار کیا۔ اپنی ہر چیز اسے دے دیتا۔ اس کے برعکس کبھی وہ اس کے کمرے میں کوڑا ڈال دیتی کبھی کتاب پھاڑ دیتی۔ تو کبھی بستر پر روشنائی کی شیشی الٹ دیتی۔ عدیل جانے کس مٹی کا بنا تھا کہ اس کی ہر زیادتی پر مسکرا کر خاموش ہو جاتا۔ شوبی کی زیادتیاں اور بڑھتی رہیں۔

عدیل نے آرٹ میں ایم اے کیا۔ رنگ اور برش سے وہ بے جان کاغذ میں جان ڈال دیتا۔ نمائش میں اس کی پینٹنگز فوراً بک جاتیں۔ امی عدیل کی اس کامیابی سے خوشی سے پھولے نہ سماتیں اور شوبی پیچ و تاب کھا کر رہ جاتی اور ایک دن شوبی کی نفرت کی انتہا ہو گئی۔ اس نے خشک لہجے میں کہہ دیا۔

امی! اب عدیل اپنے پیروں پر کھڑے ہو گئے ہیں۔ کب تک یتیم مسکین بنے اس حویلی میں پڑے رہیں گے۔ ان سے کہئے اپنا الگ گھر بنا لیں
امی کے ہاتھ سے چائے کا کپ گرتے گرتے بچا
وہ بے جان سے لہجے میں بولیں۔
• شوبی! عدیل ہمیشہ سے اسی گھر میں رہا ہے میں

اسے اپنے بیٹے کی طرح چاہا ہے اور پھر اتنی بڑی حویلی میں ہیں تم اور عدیل ہی تو ہیں۔"

"تو ٹھیک ہے! آپ نے اسے اپنے بیٹے کی طرح چاہا ہے بیٹے کی طرح کلیجے سے لگا کر رکھئے۔ میں اس گھر کو چھوڑ دونگی۔"

"بیٹی لڑکیوں کو اتنا غصہ نہیں کرنا چاہیے بابا۔"

"واہ امی! عدیل میرے گھر پر اپنا قبضہ کرتا جائے اور میں غصہ نہ کروں! اب میں بڑی ہو گئی ہوں۔ اپنا اچھا برا سمجھ سکتی ہوں۔ اس گھر میں یا تو میں رہوں گی یا عدیل!" اور وہ پاؤں پٹختی ہوئی چلی گئی۔

عدیل اتنی بے اعتنائیوں کی پرواہ کئے بغیر اسے اپنے دل کے نہاں خانوں میں بسا بیٹھا۔ اسے غصہ میں یہ معصوم سی لڑکی اور بھی بھلی لگتی۔

ایک دن وہ شوبی کے کمرے میں گیا۔ گرمیوں کی تپتی دوپہر میں شوبی بے خبر سو رہی تھی عدیل نے دیکھا تو دیکھتے ہی رہے۔ سوتے میں شوبی انھیں جاگتی ہوئی شوبی سے زیادہ اچھی لگی۔ اس وقت اس کے چہرے پر غصہ کی جگہ ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ کالے بال اس کے صبیح رخساروں کو چوم رہے تھے۔ عدیل چپکے سے اپنے کمرے میں گئے اور آرٹ کا سامان لے آئے اور شوبی کی سوتے میں تصویر کا خاکہ اتار لیا۔ انہوں نے سوچا جس وقت وہ پوری تصویر بنا کر شوبی کو دکھائیں گے وہ ضرور حیرت و مسرت کا اظہار کرے گی۔ اسکیچ کر کے وہ لوٹ گئے۔ پھر کئی دن کی جانفشانی کے بعد انہوں نے اسے رنگوں سے آراستہ کیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ شوبی کو اس کی تصویر دکھاتے شوبی خود ہی [ان] کے کمرے میں آگئی۔ اس کی نظر جیسے ہی تصویر پر پڑی غصہ سے بے قابو ہو گئی۔

"اچھا تو اب آپ بدنام کرنا چاہتے ہیں۔"

"شوبی میری بات تو سنو!"

"کیا بات سنوں؟ میں تمہاری چال سمجھتی ہوں۔ تم اس حویلی کو چھوڑنا نہیں چاہتے۔ اب تمہیں کون سے سہارے کی ضرورت ہے۔"

عدیل نے سنا دھیرے سے مسکرائے۔

"سہارے کی ضرورت تو مجھے اب بھی ہے اور میرا سہارا تم ہی تو ہو۔"

اوہ! تو یہ بات ہے۔ وہ طنزاً مسکرائی۔ "ہماری بلی اور ہم ہی کو میاؤں۔ عدیل یہ بات کہتے ہوئے تم کو شرم آنی چاہیے ہمارے ٹکڑوں پر پل کر"

اس سے پہلے کہ وہ جملہ پورا کرتی۔ امی بیچ میں آگئیں۔ شوبی تم حد سے گزر رہی ہو۔ معافی مانگو عدیل سے۔

"معافی اور عدیل سے، امی یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔"

"خالہ امی! آپ خواہ مخواہ خفا ہو رہی ہیں۔ آپ جائیے میں خود اسے سمجھا دوں گا۔

"نہیں عدیل! تم دیکھ لینا۔ یہ لڑکی میری ناک کٹوائے گی اپنی زبان کے آگے کسی کی چلنے نہیں دیتی جس گھر جائے گی میرا نام اچھلوائے گی۔"

"کسی کے گھر جائے میری بلا۔ میں یہاں سے ٹلنے والی نہیں ہوں۔"

شوبی ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے بولی۔

امی خود ہی چلی گئیں۔

"شوبی امی کا دل نہ دکھایا کرو۔"

"اوہ! آپ تو ان کا دل خوش رکھتے ہیں۔ اس گھر میں تو میں ہی بری ہوں۔ موت بھی تو نہیں آتی مجھے۔"

"شوبی خدا کے لئے ایسا نہ کہو تم غلط سمجھ رہی۔ میں تمہاری دولت سے نہیں تم سے پیار کرتا ہوں۔"

"لیکن میں تم سے پیار نہیں کرتی۔" تلملاتی ہوئی بولی۔

"اگر میرا جذبۂ خلوص سچا ہوا تو ایک دن تم بھی مجھے ضرور چاہنے لگو گی۔"

"اس خوش فہمی میں نہ رہیئے اور یہاں سے چلے جائیے۔"

"کہاں جاؤں؟"

"مر جاؤ کہیں جا کر!"

"مرنے کے لئے بھی مجھے تمہارے پہلو کی ہی آرزو ہوگی۔"

عدیل نے مسکرا کر کہا اور گنگناتا ہوا چل دیا ؎

تمہارے پہلو میں گر مرے ہم
وہ موت کتنی حسین ہوگی

شوبی غصہ کے باوجود مسکرا دی۔ ایک انجانی قوت کے تحت ہی۔

حویلی کے بڑے چمن میں اُس نے بیلا لگا۔ امّی نے اسے سمجھایا۔

"بیٹی! دنیا بھر کے پودوں میں تمہیں صرف بیلا لگانے کی سوجھی۔ اسے مت لگاؤ۔"

"کیوں نہ لگاؤں امّی!"

"بیٹی اسے اچھا نہیں کہتے۔ بیلا اُجاڑ کرتا ہے۔ تم نے سنا نہیں بیلا رہے اکیلا! . . ."

"تب تو میں ضرور لگاؤں گی امی! شاید اس کی برکت سے عدیل حویلی چھوڑ دیں۔"

عدیل نے سنا تو ان کے چہرے پر درد کے سائے رینگنے لگے۔

شوبی اٹھتے بیٹھتے انہیں حویلی چھوڑنے کو کہہ رہی تھی۔ انھیں یہ حویلی یقیناً چھوڑ دینا چاہیئے۔

کمرے میں آکر انھوں نے چند کپڑے اور آرٹ کا سامان لیا — اور امی کے پاس آکر معصوم لہجے میں بولے۔

"میں جا رہا ہوں خالہ امّی!"

"کہاں؟"

"یہ تو میں بھی نہیں جانتا۔ یہ دنیا بہت بڑی ہے کہیں تو سر چھپانے کو جگہ مل ہی جائے گی۔"

"نہیں عدیل! تم اس حویلی سے نہیں جا سکتے۔ اس حویلی پر میرا بھی کچھ حق ہے۔" امی غصّہ سے بولیں۔

"امی! عدیل ٹھیک کہتے ہیں۔ اس حویلی کے علاوہ بھی دنیا میں رہنے کو جگہ ہے۔ آپ کیوں روکتی ہیں —"

"شوبی! ہوش میں آؤ۔" وہ غصّہ سے بولیں۔

"امی! ہوش میں تو میں ہوں۔ آپ عدیل کا وقت کیوں برباد کرتی ہیں۔ چھوڑ دیجیے اس کا راستہ۔"

عدیل نے امّی کو ہٹا دیا اور شوبی سے بولے۔

"شوبی! میرا وجود تم اس حویلی میں برداشت نہیں کر سکیں میں جا رہا ہوں۔ لیکن یاد رکھنا میں نے تمہیں اپنے تمام تر سچے جذبوں سے چاہا ہے جس دن تمہیں میرے پیار پر یقین آجائے مجھے پکار لینا میں تمہیں اپنا لوں گا۔"

"عدیل! آپ بھی سن لیجئے۔ میں نے ہمیشہ آپ سے نفرت کی ہے۔ وجہ جاننا چاہو گے؟ تو سنو! تمہارے آنے سے میں ماں کے پیار سے محروم ہو گئی تھی۔ کیونکہ امی کی تمام تر توجہ تم پر مرکوز ہو گئی تھی۔ اگر امی مجھے آپ کے برابر پیار دیتیں تو آج یہ نوبت کبھی نہ آتی۔ اس لئے میں تم سے نفرت کرنے کے لئے مجبور ہوں۔"

"شوبی!" عدیل اور امی ایک ساتھ بولے۔

"ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہوں امی! اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بتاؤ۔ آپ نے ہمیشہ عدیل کو زیادہ توجہ دی ہے یا نہیں اور عدیل صاحب آپ مجھے بتایئے کیا آپ نے کبھی امی کو اس بات کا احساس دلایا ہے کہ میں اکیلا پن محسوس کر رہی ہوں۔"

"اوہ! میرے خدا یہ تو میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔"

عدیل نے سر تھام لیا۔

"آپ کو سوچنے کی ضرورت بھی کیا پڑی تھی۔ میری طرح آپ تنہائی محسوس کرتے تو احساس ہوتا لیکن خیر جو ہو چکا اُسے دہرانے سے کیا فائدہ؟ عدیل! مجھے تم سے نفرت ہے۔ اب تم جا سکتے ہو۔"

اس نے سختی سے ہونٹ بھینچ لئے لیکن عدیل اپنی جگہ سے ہل نہ سکے۔ پسینے کی ننھی ننھی بوندیں ان کی پیشانی پر ابھر آئیں۔

"خالہ امی! وہ تڑپے میرے دل میں کچھ درد سے"

"رکنے کا بہانہ۔" شوبی نے طنز سے کہا

"شوبی! نہیں . . .؟" انہوں نے کچھ کہنا چاہا لیکن کہہ نہ سکے اور وہیں گرنے لگے۔ امی کے ناتواں ہاتھ ان کا بوجھ نہ سنبھال سکے۔

ڈاکٹر نے بتایا ہائی ہارٹ اٹیک ہے۔ زندگی خطرے میں ہے —" امی تڑپنے لگیں۔ شوبی اپنے کئے پر پشیمان

وہ رات بھر عدیل کے سرہانے بیٹھی آنسو بہاتی رہی۔ صبح عدیل خطرے سے باہر تھا لیکن ایک ہی رات میں اس کے چہرے پر زردی چھا گئی تھی۔ شوبی اس کے قدموں میں بیٹھی سسکتی رہی۔

"عدیل! مجھے معاف کر دیجئے۔"

"شوبی مجھے شرمندہ نہ کرو! تمہاری جگہ ہمارے قدموں میں نہیں ہمارے دل میں ہے۔"

اور شوبی ان کے قریب بیٹھ گئی۔ عدیل نے آنکھیں بند کر لیں اور وہ پیار سے ان کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہی۔

شوبی کی رات اور دن کی تیمارداری سے عدیل صحتیاب ہونے لگے۔ ایک ہی ہفتہ میں شوبی نے عدیل کی اتنی خدمت اور اتنی محبت کی کہ عدیل اس کی ہر زیادتی بھول گئے اور شوبی سوچنے لگی کاش وہ پہلے عدیل کو سمجھ لیتی۔

اسی دن عدیل کی طبیعت پھر کچھ خراب تھی۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔ شوبی عدیل کے پاس بیٹھی بڑے پیار سے ان کے ہاتھوں کو سہلا رہی تھی۔

"شوبی!"

"اب آپ سو جایئے عدیل۔ صبح باتیں کریں گے۔"

"شوبی کون جانے صبح ہو تو ہم نہ ہوں۔"

"عدیل! یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ وہ کانپ گئی۔

"شوبی! بس میری ایک بات کا جواب دیدو! تم مجھ سے پیار کرتی ہو! — یا بیمار سمجھ کر صرف ہمدردی۔"

"عدیل!" شوبی نے اپنا رخسار ان کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ "میں — تم سے پیار کرتی ہوں۔ بس آپ جلدی سے اچھے ہو جایئے۔ سچ عدیل اب میں آپ کو کبھی نہ ستاؤں گی اور آپ کی ہو جاؤں گی۔"

"سچ!" عدیل بے جان سی مسکراہٹ سے بولے۔ "کہیں اچھے ہو جانے پر پھر حویلی سے نہ نکالو گی۔"

"عدیل مجھے شرمندہ نہ کیجئے!"

درد کی لہر سے عدیل پھر تڑپنے لگے۔

"عدیل — عدیل — امی کو بلاؤں میں ...؟"

"شو — بی — تم یہاں سے نہ جانا —"

"عدیل کہاں درد ہے؟" وہ رو دی

"یہاں!" عدیل نے اس کا ہاتھ دل پر رکھ لیا۔

"دل تو ہم نے تمہیں دے دیا تھا... پھر یہ درد کہاں ہے۔"

"عدیل!" اس کے آنسو گرنے لگے۔

"شوبی! قریب آؤ۔"

وہ عدیل پر جھک گئی اور عدیل نے اس کے آنسو پی لئے۔

شوبی! اپنے سب آنسو آج ہمارے دامن میں دیدو... پھر... پھر... اللہ اللہ..." وہ تڑپے۔ میں تمہاری حویلی سے چلا جاؤں گا کبھی نہ آنے کے لئے...

عدیل! میں تمہیں جانے نہیں دونگی نہیں جانے دوں گی

"شوبی تمہیں یاد ہے .... میں نے کہا تھا۔ مجھے مرنے کے لئے بھی تمہارے پہلو کی ضرورت ہوگی" دیکھو میں تمہارے پہلو میں —" اور عدیل نے اس کی گود میں دم توڑ دیا! — عدیل — عدیل —

— امی امی — اس کی دردناک چیخوں سے کائنات کا ذرہ ذرہ کانپ اٹھا۔ اس نے سر اٹھایا۔ بڑے چمن میں بیلا کے پھول سنگ مرمر سے بنے عدیل کے مزار پر گر رہے تھے۔ شوبی نے عدیل کو کوٹھی سے نہیں نکالا تھا۔ اسے ہمیشہ کے لئے رکھ لیا تھا۔ امی بھی اس کا ساتھ چھوڑ کر عدیل سے جا ملیں۔ شوبی باہر آئی اور اپنا سر مزار سے ٹیک کر سسکیاں بھرنے لگی!۔

مشاعرہ اٹاوہ نمائش

(دوسری قسط)

حضور سہسوانی

رازؔ صاحب کے دو صاف ستھرے مطلع آپ سن سکتے ہیں

آپ کیوں پریشاں ہیں ہم کو آزمانے میں
ہم تو سب سے آگے ہیں بارِ غم اٹھانے میں

ہائے میں نے کی توبہ وہ بھی کس زمانے میں
چار دن ہی باقی تھے جب بہار آنے میں

جناب شعری بھوپالی کا نام اناؤنس ہوتے ہی پنڈال تالیوں سے گونج اٹھا ہے۔ شعری صاحب ایک زمانے میں مشاعروں کے کامیاب شاعر رہے ہیں۔ اپنے اچھے ترنم اور جاندار کلام سے انھوں نے کتنی ہی محفلوں میں اپنا لوہا منوایا ہے۔ میں نے موصوف کو تقریباً بیس برس قبل اوجین کے کئی مشاعروں میں سنا تھا۔ اور دیکھا تھا کہ سہرا انھیں کے سر رہا تھا۔ مدھیہ پردیش کے شعرا میں شعری صاحب کو جو مقبولیت حاصل ہے اس سے کون واقف نہیں ہے۔ میں نے جب سنا تھا شعری صاحب کی طرح ان کی آواز بھی جوان تھی۔ لیکن اب ان کے ساتھ ساتھ آواز بھی بوڑھی ہو چکی ہے۔ آواز بوڑھی ہو یا جوان۔ ترنم اچھا ہو یا بُرا۔ اگر شعر اچھے ہیں تو اپنا اثر ضرور چھوڑیں گے۔ شعری صاحب کے شعر، شعر تھے۔ پھر بھلا پسند کیوں نہ کئے جاتے۔

زمانے میں اس نے بڑی بات کر لی
خود اپنے سے جس نے ملاقات کر لی

مطلع پر بھرپور داد ملی ہے۔ کئی بار پڑھوایا گیا ہے۔

تصور کی دنیا سے یوں آ رہا ہوں
کہ جیسے انھیں سے ملاقات کر لی

داد کا سیلاب اُمڈ پڑا ہے۔ شعری صاحب نے دوسری غزل بھی پڑھی ہے جس کے کئی شعر بہت پسند کئے گئے ہیں۔

اور اب جناب فنا نظامی کانپوری سے پڑھنے کی درخواست کی گئی ہے۔ فنا صاحب کے پیر میں تکلیف ہے اس لئے انھوں نے بیٹھ کر پڑھنے کی اجازت چاہی ہے۔ فنا صاحب بوڑھے ہیں لیکن ان کی آواز اب بھی جوان ہے۔ اپنے مخصوص ترنم میں غزل سرا ہیں

اک تشنہ لب نے بڑھ کے جو ساغر اٹھا لیا
ہر بوالہوس نے میکدہ سر پہ اٹھا لیا

مطلع پر خوب داد ملی ہے۔ اور فنا صاحب بار بار پڑھ رہے ہیں۔
اب اور کیا ملے گی مجھے وحشتِ دل کی داد

آج اس نے مجھ کو دیکھ کے پتھر اٹھا لیا

واہ واہ کے شور سے پنڈال گونج اٹھا ہے۔ اور فنا صاحب آگے بڑھے ہیں۔

میں ایسا بد نصیب ہوں جس نے ازل کے روز
پھینکا ہوا کسی کا مقدر اٹھا لیا

داد کا وہی عالم ہے

موجوں کے اتحاد کا عالم نہ پوچھئے
قطرہ اٹھا اور اٹھ کے سمندر اٹھا لیا

اس شعر کو کئی بار پڑھوایا گیا ہے اور داد دینے والوں نے خوب کھل کر داد دی ہے۔

فنا صاحب کی کامیاب ترین غزل کے بعد اناؤنسر صاحب نے معین احسن جذبی صاحب کا تعارف کرایا ہے۔ جذبی صاحب کا نام آتے ہی لوگ ہمہ تن گوش ہو گئے ہیں۔ جذبی صاحب کے پیر میں تکلیف نہیں ہے پھر بھی وہ فنا کی طرح بیٹھ کر پڑھ رہے ہیں۔ جذبی صاحب کے کئی شعر بار بار سنے گئے ہیں۔

جب کبھی کسی گل پر اک ذرا نکھار آیا
کم نگاہ یہ سمجھے موسمِ بہار آیا

اس افق کو کیا کہئے نور بھی دھندلکا بھی
بار ہا کرن پھوٹی بار ہا غبار آیا

جذبی صاحب اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور اب جناب سید واثق جونپوری کو زحمتِ کلام دی گئی ہے۔ واثق صاحب کی تصویر پچھلے سال ہی میں ماہنامہ "شاعر" بمبئی کے ہم عصر اردو ادب نمبر میں

دیکھی تھی جسے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ موصوف جوان العمر ہیں۔ لیکن خود انھیں دیکھا تو معلوم ہوا کہ بڑھاپے کی ڈگر پر چل رہے ہیں۔ قنا صاحب نے پیر کی تکلیف کی وجہ سے بیٹھ کر پڑھا۔ جیسے ان کے بعد بیٹھ کر پڑھنا ضروری ہو گیا۔ وامق صاحب بھی بیٹھ کر پڑھ رہے ہیں۔

کہیں ساقی کا فیض عام بھی ہے کسی شیشے پہ میرا نام بھی ہے
نوائے چنگ و بربط سننے والو پس پردہ بڑا کہرام بھی ہے

وامق صاحب نے جوں ہی یہ اشعار پڑھنا شروع کئے پنڈال سے بیک وقت کئی آوازیں ابھریں "کوئی نئی سنائیے" اور وامق صاحب ہاتھ کا اشارہ کر رہے ہیں۔ گویا کہہ رہے ہوں پہلے پرانی سن لیجئے پھر نئی سنا دوں گا۔ آخر انھیں دوسری غزل سنانی پڑی ہے۔ جسے سنجیدہ طبقے نے پسند کیا ہے۔

وامق صاحب کے بعد اس بزم کے آخری بزرگ شاعر جناب نشور واحدی کو زحمت دی گئی ہے۔ نسیم صاحب نے شفیع صاحب سے مائک لے کر نشور صاحب کا لمبا چوڑا تعارف کرایا ہے بھلا اس کی کیا ضرورت تھی۔ نشور صاحب کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ ہر وہ شخص جسے اردو شاعری یا مشاعروں سے ذرا سی بھی دلچسپی ہے موصوف سے واقف ہے۔

لیکن ہو سکتا ہے نسیم صاحب کو نشور صاحب ہی کے تعارف کرانے کی غرض سے بلایا گیا ہو ورنہ وہ دوسرے شعرا کا تعارف بھی تو کرا سکتے تھے۔ نشور صاحب کبھی جن کی صحت خاصی اچھی تھی بہت کمزور نظر آ رہے ہیں۔ کل ترنم سے پڑھنے والے نشور صاحب آج تحت اللفظ میں پڑھ رہے ہیں۔

وہ لے لے گوشۂ دامن پہ اپنے تا فلک چن لے
مری آنکھوں میں آنسو بار بار آیا نہیں کرتے

اس شعر پر نسیم صاحب نے جو ان کے پاس ہی جا بیٹھے ہیں خوب داد دی ہے۔

جو قیمت جانتے ہیں ساغر و پیمانہ زندگانی کی
وہ شکوہ لب پہ لا کر شکر ادا نہیں کرتے

نشور صاحب پڑھ چکے تو سبھی شعراء اور ڈائس پر بیٹھے ہوئے دیگر لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے اس طرح مشاعرہ ایک ہی دور تک محدود رہا۔ شعرا کی تعداد زیادہ نہیں تھی لیکن سامعین کی تعداد بلا مبالغہ دس ہزار سے کم نہ ہوگی۔ منتظمانِ مشاعرہ و حکامانِ ضلع کے حسنِ انتظام اور حسنِ اخلاق کی تعریف نہ کی جائے تو یہ کوئی اچھی بات نہ ہوگی۔ اب ایک بج چکا ہے اور شعرائے کرام کے۔ کے ڈگری کالج کی طرف بڑھ رہے ہیں جہاں ان کے قیام کا انتظام ہے۔

معیار کی کسوٹی پر

نامۂ گل

مختار شمیم جدید شعری فضا میں سانس لینے کی وجہ سے اپنی شعری تخلیقات میں جدید رجحانات کو پیش کرنے کے قائل ہیں۔ لیکن بقول ڈاکٹر مظفر حنفی "وہ نئے شعر عام قاری کی سمجھ میں آنے والے اسلوب میں کہتا ہے۔" در اصل جدید شاعری میں ابہام کی موجودہ صورتوں کو اختیار کرنے والے انتہا پسندی کے رجحان کو مقبولیت کے کسی بھی خانے میں رکھا جائے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قاری سے ذہنی مطابقت کے بغیر کسی بھی رجحان کے استحکام کو قبولیتِ عام حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس سچائی کو رفتہ رفتہ قبولیت حاصل ہوتی جا رہی ہے اور اسی لئے ابہام کی وہ صورتیں جن کی تزئین میں اہلِ قلم مصروف تھے اب اپنے "کر و فر" کو پھیلانے میں تیز رفتاری کے ثبوت نہیں دے رہی ہیں۔

مختار شمیم کے کلام کو پڑھ کر (اور اکثر اسے سن کر بھی) مجھے تو کم از کم یہی احساس ہوتا ہے کہ وہ جدید تر شعری رجحانات سے نزدیک تر ہونے کے باوجود واضح اسلوب کے ہمیشہ سے قائل رہے ہیں۔ ان کے مجموعۂ کلام "نامۂ گل" کی کسی بھی نظم کو پڑھیئے یا غزل کا کوئی بھی شعر گنگنائیے۔ وہ ذہن کی سطح کو ضرور چھوتا ہوا نظر آئے گا۔ اور یہی وہ خوبی ہے جس نے مختار شمیم کو جدید اسلوبِ شعری کے سلسلے میں "محتاط" رہنے کا ایسا سلیقہ سکھا دیا ہے جو ان کے ہم عمر اور ہم خیال بہت سے جدید شعراء کو نصیب نہ ہو سکا۔

جہاں تک ان کی شعری تخلیقات کے موضوعات کا سوال ہے ان میں بھی مجھے تو کسی جگہ بھی جدید ذہن کا وہ کرب نظر نہیں آیا جو عملی صورتوں میں بے حقیقت بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس مختار شمیم اپنی ذات کے کرب کی ان صورتوں کو ہی واضح کرتے ہیں جن کا عرفان انھیں ان کے تجرباتی شعور کے ذریعے ہوا ہے۔ اسی لئے ان کے اشعار میں صداقت کی وہ تصاویر صاف صاف دکھائی دیتی ہیں جنھیں "عام قاری" بھی اپنی ذات کے آئینے میں دیکھ سکتا ہے۔

مختار شمیم نے "نامۂ گل" میں اپنا منتخب کلام شائع کیا ہے۔ جس نے مجموعہ کو مختصر تو ضرور کر دیا ہے لیکن اس میں منفی پہلو بھی پیدا ہو گیا ہے۔ اس مجموعہ کو دیکھ کر شاید یہ غلط فہمی پیدا ہو جائے کہ ان کے پاس کلام کا "ذخیرہ" بہت کم ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ شمیم صاحب مدت سے شعر کہہ رہے ہیں۔ اگر وہ اپنا سارا کلام اس مجموعہ میں شامل کر لیتے تو اس کی ضخامت تو بڑھ جاتی لیکن اس کا شعری وزن ضرور کم ہو جاتا ہے۔

"نامۂ گل" کی کتابت مختار شمیم نے خود کی ہے۔ اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ کالج کا لیکچرار، ایک اچھا شاعر، فنِ کتابت پر بھی پوری طرح قادر ہے۔ ۵۴ صفحات کی یہ کتاب جس میں ۳۷ غزلیں اور ۷ نظمیں شامل ہیں۔ خوب صورت سرورق کے ساتھ بھوپال بکڈپو بدھوارہ بھوپال یا مکتبہ شانِ ہند دہلی ۶ سے پانچ روپے کے عوض حاصل کی جا سکتی ہے۔

(عزیز اندوری)

سرور تونسوی

مدیر شانِ ہند نرسنگ ہوم سے بوجہ ڈاکٹروں کی ہڑتال ہو جانے کے باعث ۲۱ مارچ کو گھر پر آ گئے ہیں۔ اب ان کی حالت پہلے سے بہت اچھی ہے۔ ڈاکٹروں نے مکمل آرام کے لئے ان پر ملاقاتوں وغیرہ کی پابندی لگا دی ہے۔ ان کے دوستوں اور بہی خواہوں سے دعا کی درخواست ہے۔

(نائب مدیر)

قطعاتِ رئیس امروہوی

شاعرِ وقت

کل میں نے ایک شاعرِ وقت سے کہا
حیراں مشاعروں میں بحث آجکل ہے تو
فکرِ سخن میں جان کہاں تک ہے کس لیئے
ہے شاعری کی جان ! سراپا غزل ہے تو

ناقۂ لیلیٰ

میاں راہ میں دیکھا کہ اک حسین لڑکی
سوار پشتِ شتر پر عجیب شان سے ہے
مرے سوال پہ کچھ صاحبانِ دل نے کہا
یہ اونٹ ناقۂ لیلیٰ کے خاندان سے ہے

ہائے وہ منظر

ہائے وہ منظر کہ جب ہوٹل سے نکلا اک امیر
وعوت رنگیں اڑا کر اپنی محبوبہ کے ساتھ
اور دامن کو بچا کر اک طرف کترا گیا
دیکھ کر پھیلے ہوئے کچھ ناتواں بچوں کے ہاتھ

گلا کیسا ہے؟

پہلے اس نکتے پہ رہتی تھی توجہ سب کی
شعر شاعر نے کہا ہے تو کہا کیسا ہے
مگر اس عہدِ ترنم کے بزرگانِ سخن
داد یہ جانچ کے دیتے ہیں گلا کیسا ہے

فخرِ کراچی

یہ ذکر تھا کہ فخرِ کراچی ہیں کون لوگ ؟
اک رہنمائے قوم پکارا گیا کہ ہم ؟
اک شوخ نازنیں بھی گزرتی تھی راہ سے
برقعِ الٹ کے اس نے اشارہ کیا کہ ہم !

قوال !

غزل پڑھ رہے تھے کہیں کوئی شاعر
غزل میں قیامت کے سُر تال نکلے
میں سمجھا چندوسی کے ہیں کوئی شاعر
مگر وہ بڑودے کے قوال نکلے

حلقوم

مجھ سے دُنیا کو توقع ہے غزل خوانی کی
وہ روش اے دلِ مرحوم کہاں سے لاؤں ؟
جھنجھناتے ہوئے اشعار تو کہہ سکتا ہوں
کھنکھناتا ہوا حلقوم کہاں سے لاؤں

بیادِ اقبال

بیادِ اقبال و فکرِ شہرت مشاعروں پر مشاعرے ہیں
مذاقِ شعر و سخن سے خالی وطن کی اک انجمن نہیں ہے
مگر مذاقِ سخن کی نسبت ہمارے شاعر نے خود کہا تھا
"جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں انہیں مذاقِ سخن نہیں ہے"

بے حجاب

ہم کو دلی میں یہ شکایت تھی
حسنِ زیرِ نقاب نے مارا
اور شکوہ یہ ہے کراچی میں
جلوۂ بے حجاب نے مارا

ذرا بات کیجیے

مانا کہ میں ہوں خاک نشیں آپ ہیں وزیر
لیکن نہ مجھ سے ترکِ ملاقات کیجیے
جس نے دیا تھا ووٹ الکشن میں آپ کو
سرکار! میں وہی ہوں ذرا بات کیجیے

سائنس کی دُنیا

(قائم شدہ جون ۱۹۷۵ء)

جسے ۱۹۷۶ء کا دوسرا قومی انعام حکومت ہند سے ایک ہی برس کی محنت پر حاصل ہوا ہے۔ "اُردو دُنیا میں سائنس کی، اور دُنیائے سائنس میں اُردو کی خدمت کے لئے" کاؤنسل آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ کی پیش کش۔ اُردو داں عوام وطلبہ کے لئے نہایت مفید عوامی اور دلچسپ انداز میں سائنس و تکنیکی ترقیات، نئی نئی ایجادوں عام طالب علموں اور جستجو کاروں کے لئے بہترین مضامین و مواد ان کو اپنی مادری زبان میں دستیاب ہوں گے۔

سائنس کی دُنیا

اُردو عوام اور شہریوں کے لئے انتہائی مفید اور نفع بخش مجلّہ ہے۔ جس کی اشاعت بیس ہزار سے زائد ہے۔

سائنس کی دُنیا

میں لکھنے والے ملک کے بہترین سائنس داں، دانشور، اور ماہرِ تعلیم ہیں۔ پرنٹنگ آفسیٹ پر سائز ڈیمائی کوارٹو، اعلیٰ کتابت وطباعت، خوشنما کور، دیدہ زیب تصاویر ـــــ قیمت فی پرچہ صرف پچاس پیسے یا سالانہ دو روپیہ۔

سائنس کی دُنیا

کے خریدار بننے سے پہلے خریداری چندہ دو روپے سالانہ یا پچاس پیسے فی کاپی کے حساب سے منی آرڈر کے ذریعہ بھیجنا ضروری ہوگا۔ آج ہی بہ حیثیت خریدار، قلم کار اور مشتہر اپنا رابطہ قائم کیجئے۔ قارئین اور ایجنٹ صاحبان نیز اہلِ قلم مدیر سے مندرجہ ذیل پتہ پر خط وکتابت کریں۔ جملہ ترسیل زر، بنام چیف ایڈمنسٹریشن سی۔ ایس۔ آئی۔ آر ہونی چاہئے۔ شری اے۔ ایم۔ زرتشی گلزار دہلوی، مدیر و معتمد "سائنس کی دُنیا" سی۔ ایس۔ آئی۔ آر رفیع مارگ نئی دہلی۔ فون نمبر ۳۸۲۴۹۲۷۔

غزل

واحد پریمی

جو واقف اسرارِ شبِ تار ہوئے ہیں
اک روز وہی پیکرِ انوار ہوئے ہیں

کچھ کام نہ آئی ہے زباں بندیٔ صیاد
دیوانے اگر مائلِ گفتار ہوئے ہیں

پھر رندوں کی آنکھ سے کرن پھوٹ رہی ہے
پھر ساغرِ مے ساغرِ خوں بار ہوئے ہیں

اے صبح کوئی جشنِ ضیا بار منا لے
ہم تیرہ شبانِ تیرے طلبگار ہوئے ہیں

ہم ننگِ بہاراں جنھیں سمجھا کئے اکثر
وہ پھول ہی ناموسِ چمن زار ہوئے ہیں

دنیا نظر آئی ہے ہمیں مثلِ جہنم
جب خوابِ طرب زار سے بیدار ہوئے ہیں

دو گام بھی چلنے سے جو معذور رہیں واحد
قسمت کہ وہی قافلہ سالار ہوئے ہیں

دلّی میں جنتا انتظامیہ

نمایاں کامیابیاں

دیہی ترقی: ۵٫۴۱ کروڑ روپے کے تقاوی قرضوں کی تقسیم۔
- پینے کے پانی کی اسکیم کے لیے ۴۵ لاکھ روپے۔
- ۹۲ ٹیوب ویل کنکشن دیے گئے۔ ۵۰۰ جلد دیے جائیں گے۔

ہریجن بہبود: ہریجنوں کے لیے ۷٫۵۰ لاکھ روپے کے وظائف۔
- ہریجنوں کو مکان بنانے کے لیے ۲٫۴۵ لاکھ روپے کی مالی امداد
- ہریجن طلبا و طالبات کے لیے ہوسٹل: رہائش و خوراک مفت۔

مزدور بہبود: مزدور طبقہ کے ٹریڈ یونین عہدیداروں کی بحالی
- صنعتی امن —— پیداوار میں اضافہ۔
- ورکروں کی شکایتوں کے فوری ازالے کا بندوبست۔
- ورکروں کے لیے تفریحات کے مواقع میں اضافہ۔ مزدور بہبود سینٹروں کا قیام۔

تعلیم: ۱۶۵۰۰ طلبہ کے لیے تکنیکی تعلیم و تربیت۔
- غریب طلبہ و طالبات کے لیے مفت وردیاں و کتابیں۔
- ۳٫۷۵ لاکھ روپے کے وظائف۔
- ۱۰۰۰ تعلیم بالغان کے سینٹروں کا قیام۔

طب: شاہدرہ اور ہری نگر میں ۵۰۰-۵۰۰ بستروں والے دو اسپتالوں کی تعمیر پر ۲۲ کروڑ روپے کا صرفہ۔
- آنکھوں کے جدید اسپتال کی تعمیر پر ایک کروڑ روپے کا صرفہ۔
- دیہی علاقوں کے لیے ۱۰۰-۱۰۰ بستروں والے ۷ اسپتال اور ۱۸ ڈسپنسریاں۔

صنعت: غیر منظور شدہ علاقوں میں ۲۴۰۰۰ صنعتی اکائیوں کے لیے لائسنس۔
- ۵٫۲۴ کروڑ روپے کی لاگت سے ٹول روم اور تربیتی مرکزوں کی تعمیر۔
- نریلا میں ۶۲۰ ایکڑ رقبہ میں صنعتی بستی کی اسکیم تیار۔
- ۲۸ کمیونٹی ڈیولپمنٹ سینٹر: ۵۶۰۰ لوگوں کو روزگار۔

رہائشی مکانات کا انتظام: رہائشی مکانات کی تعمیر کیلئے ہاؤسنگ بورڈ بنانے کا فیصلہ۔
- ہر سال ایک لاکھ مکانات تعمیر کرنے کا نشانہ۔
- نوآباد کالونیوں میں بجلی کے کنکشن اور دیگر شہری سہولتیں۔

اس سمت میں پہلے مرحلے کا آغاز — چار سالوں میں مکمل نقشہ بندی۔

جاری کردہ: محکمۂ اطلاعات واشاعت، دلّی انتظامیہ دلّی۔

تنہائی کی ساتھی کتابیں ہوتی ہیں
سچی یونیورسٹی لائبریری ہوتی ہے

اس کے لئے عوامی لائبریری

دیال سنگھ پبلک لائبریری

میں

ہر قسم کی کتابیں موجود ہیں۔ اُردو، ہندی، پنجابی اور انگریزی میں ہر موضوع پر ذوقِ مطالعہ کی سیری کے لئے بغیر کسی نقد معاوضہ کے آپ صبح دس بجے سے شام کے پانچ بجے تک اپنی پسند کی کتابیں پڑھ سکتے ہیں۔

اخبار، ماہنامے اور ہفت روزے بھی ہیں۔

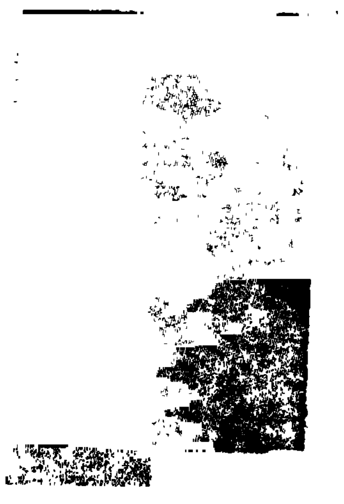
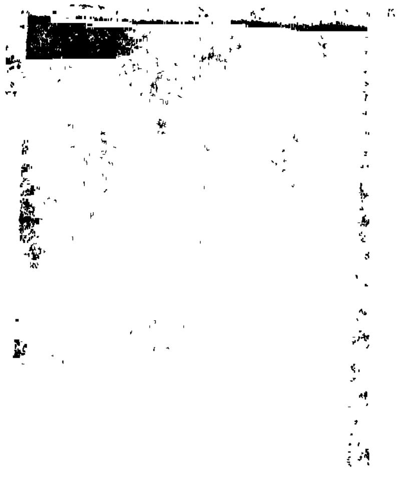
اتوار اور دوسری تعطیلات کو لائبریری بند رہتی ہے۔

دیال سنگھ پبلک لائبریری

ٹرسٹ سوسائٹی، راؤز ایونیو، نئی دہلی





رجسٹرار آف نیوز پیپر آف انڈیا کا رجسٹریشن نمبر
۶۴۴/۵۷

ٹیلیفون نمبر ۲۷۸۸۰ — ماہنامہ — رجسٹرڈ نمبر ۲۴۷ D

شانِ ہند دہلی

ایڈیٹر
سرور تونسوی

قیمت سالانہ
بارہ روپے
فی پرچہ
ایک روپیہ پچیس پیسے
اس شمارہ کی قیمت ڈیڑھ روپیہ

جلد نمبر ۳۹ — اپریل ۱۹۷۸ء — شمارہ نمبر ۴

خاتم العروض حضرت سحر عشق آبادی کا انتقال

۳۱ مارچ ۱۹۷۸ء کی صبح کے ۵ بجے خاتم العروض حضرت علامہ سحر عشق آبادی نے دو ماہ کی علالت کے بعد جناب ... ظفر ادیب کے ——— مکان پر داعی اجل کو لبیک کہا۔

علامہ اپنی اکلوتی بیٹی کے ہاں مقیم تھے اور تقریباً دو ماہ سے علیل تھے۔ انہیں اب اس جہانِ فانی سے رخصت ہونے کا یقین سا ہو چلا تھا اور وہ دس پندرہ روز سے جناب ظفر ادیب کے ہاں چلے آئے تھے کیونکہ کوئی بھی بیٹی کے گھر پر داعی اجل کو لبیک کہنا پاپ اور بدنصیبی سمجھتا ہے۔

حضرت علامہ کے انتقال سے عروض کی دنیا میں ایسا خلا پیدا ہوا ہے جس کا پورا ہونا ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے۔ اب کم از کم ہندوستان میں کوئی ایسا عروض داں نہیں رہا جس کا کسی عروضی تنازعہ پر فیصلہ حتمی کہا جاسکے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ عروض کی اصل شکل و صورت علامہ کے انتقال کے بعد اپنا حسن و جمال کھو بیٹھی ہے تو غلط نہ ہوگا۔

علامہ مرحوم نے سرور تونسوی اور شانِ ہند کو جس قدر نوازا اس کا اظہار ——— الفاظ میں نہیں کیا جاسکتا۔ افسوس کہ میں تشویشناک حد تک ... دل کے باعث علامہ کو آخری بار دیکھ بھی نہ سکا۔ دلی کے اردو شعراء ادیبوں اور صحافیوں کی کم ظرفی کا ماتم کیجئے کہ ان میں سے کوئی بھی علامہ کی ارتھی کو کندھا دینے کی سعادت حاصل نہ کرسکا۔ ظفر ادیب مرحوم کے دو تین شاگرد، مرحوم کی بیوہ اور بیٹی اور اہلیہ سرور تونسوی کے علاوہ مرحوم کے دو تین رشتہ دار اور حافظ صاحب خوشنویس نے مرحوم کی ارتھی کو میونسپل کی گاڑی میں نگم بودھ گھاٹ شمشان بھومی تک پہنچایا اور نذرِ آتش کردیا۔ ایڈیٹر شانِ ہند نے بستر علالت پر پڑے پڑے آکاش وانی اور سماچار کو فون کرکے مرحوم کے انتقال کی حسرتناک خبر کو نشر کرایا اور اخبار ... ہوایا۔ ظفر ادیب صاحب نے اخبارات کے نیوز ایڈیٹروں کو اس افسوسناک خبر کی اشاعت کے لئے اطلاع دی اور اکثر و بیشتر شعراء ادیبوں اور صحافیوں کو بھی اطلاع دی۔ مگر جب کوئی یہ سمجھ لے کہ اس علاقہ میں ہی نہیں تو وہ لیے بعید عالم۔ فقید المثال عروض داں، حافظ قرآن، چلتی پھرتی لائبریری۔ اور علمی و ادبی خزانے کے مالک کی ارتھی کو کندھا دینے کی حماقت کیوں کرنے لگا۔ مرحوم ایک بیوہ ایک شادی شدہ بیٹی اور ایک مرحومہ بیٹی کے دو بچوں کو اپنے پس ماندگان میں چھوڑ گئے ہیں۔ باقی رہے نام اللہ کا

غمزدہ: سرور تونسوی

قطعہ تاریخِ انتقال پُر ملال حضرت علّام عشق آبادی

(متین بدایونی ایم اے)

اُف یہ احوالِ گردشِ ایّام
اک تغیّر زمانہ میں ہے مدام

اور اس پر یہ اہلِ فن کا زوال
بن گئے اہلِ زور و زر کے غلام

کوئی جدّت پسند اس حد تک
خبط میں جس کے کھو دیا احترام

نیچرل شاعری میں کوئی مست
کوئی آزاد شاعری کا امام

کوئی عریانیت کا عاشق ہے
کوئی اہلِ کنایہ و ابہام

مقصدیت کسی کا ہے محور
وہ نہیں کرتا ہے ارادہ کلام

کوئی کہتا تو ہے غزل لیکن
ان میں کبھی ہے وہ بے مہار کلام

نظم ہو یا غزل ہیں سب چوپٹ
یعنی اس فن کو ہو گیا ہے جذام

مانا اچھے نہیں ہیں قید و بند
اس سے ہوتی ہے حریت بدنام

لیکن اتنا نہ ہو کوئی آزاد
جو چلے ہی نہ راہ پر دو گام

ہو نہ اس کی تمیز سامع کو
ہے کلام اس کا یا کہ ہے دشنام

ابتذال و تنافر و سکتہ
ہر جگہ جھول ہر جگہ اسقام

محنتِ اہلِ فن ہوئی ضائع
کچھ خیالِ عروض ہے نہ مقام

سب صنائع گئے بدائع بھی
کوئی زیور نہ عطر ہے نہ قوام

اے عروسِ سخن خدا حافظ
گئے وہ دن کہ تو بھی تھی گلفام

چاشنیٔ بندش و زباندانی
پند و فہمائش و علاج و پیام

ساتھ استاد لے گئے اپنے
سب مضامینِ فرقت و آلام

ایک اک کر کے اہلِ فن گزرے
پہنچے فردوس میں پئے آرام

قدرداں اُٹھ گئے ہیں اردو کے
ہر طرف جہل، کجروی، اوہام

اس پہ رحلت ہمارے تایا کی
حیف صد حیف ہر سحر ہر شام

نکلی تاریخ آپ نے پایا
دامنِ خلد حضرت علّام

۹۵ + ۵۳۴ + ۱۲۰۸ + ۱۴۱ = ۱۹۷۸ء

اظہارِ تشکر

میری تشویشناک علالت کے دوران جن عزیزوں بہی خواہوں، احباب اور اقربا نے میری صحت اور درازی عمر کے لئے بالمشافہ یا خطوط، تار اور ٹیلیفون کے ذریعہ دعائیں فرمائیں اور جو اصحاب نرسنگ ہوم میں عیادت کو آتے رہے۔ اُن سب کے لئے میرے دل میں عزت و احترام کے جذبات ہیں اور میں دل سے ان سب ہندوستانی اور پاکستانی مہربانوں کا ممنونِ احسان ہوں۔

میرے عزیز بھائی عقیل انصاری صاحب نے جدہ (سعودی عرب) سے حرم شریف جا کر جمعہ کی نماز پڑھی [illegible] خانہ کعبہ کے بعد ملتزم۔ میزابِ رحمت۔ رکنِ یمانی اور مقامِ ابراہیم (دعاؤں کی مقبولیت کے مخصوص مقامات) [illegible] صحتِ کامل اور عمرِ طویل کے لے دعائیں مانگیں۔

قبلہ حضرت رتن پنڈوری نے میری صحت اور زندگی کیلئے مخصوص عبادت کا سلسلہ اب تک جاری رکھا ہوا [illegible] بزرگان سے بار بار اُن جی کی خصوصی نظرِ کرم کے لئے ایک خاص "رکھ" موصول ہوئی اور یہ سب کچھ خدائے عظیم کا احسان [illegible] مجھ ایسے ادنیٰ خادمِ اُردو کو ایسے کرم نوازی عطا فرمائے۔

قبلہ حافظ محمد یوسف صاحب مدیرِ اعلیٰ "شمع" نے آبِ زمزم کی ایک شیشی عطا فرمائی تھی جو اس علالت میں آبِ حیات ثابت ہوا [illegible] میں اس سلسلہ میں بھی ممنونِ احسان ہوں کہ انہوں نے شمع لیبارٹریز کی تیار کردہ عارضۂ دل کے لئے مخصوص دوا "ہارٹون" کے استعمال کا [illegible] اس حقیقت سے تو کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ زندگی اور صحت دینے والی تو صرف وہی ذاتِ اقدس ہے جسے خدا کہا جاتا ہے اور اُسی [illegible] سے یہ "ہارٹون" خمیرہ گاؤزبان عنبری جواہر والا۔ دوالمسک معتدل جواہر والی (تیار کردہ شمع لیبارٹریز) تریاق ثابت ہوئیں۔

میری والدہ محترمہ بعمر ۸۰ سال کو جونہی میری تشویشناک حالت کی اطلاع ملی تو وہ اُسی وقت گوڑگاؤں سے دہلی کے لئے روانہ ہو گئیں اور [illegible] پر میری صحت اور درازیٔ عمر کے لئے خدا کے حضور سجدے کرتی ہوئیں نرسنگ ہوم تشریف لائیں اور اُن کی دعاؤں کا یہ سلسلہ اس وقت تک [illegible] ہے۔

عالیجناب دیوان آنند کمار صاحب رئیس اعظم لاہور کے احسانات سے رُوگردانی کرنا خدا کے وجود سے رُوگردانی کرنا ہوگا میری اس علالت کے [illegible] انہوں نے اپنی اعلیٰ ظرفی، بزرگانہ شفقت، نیز خاندانی روایات کا پاس جس قابلِ تعریف انداز میں رکھا اس [illegible] برادرم حکیم شبیر علی خاں صاحب شعبہ کانپوری اور برادرم جناب اچاریہ دھرمیندر ناتھ صاحب جے پوری نے میری علالت کے دوران جس [illegible] کا ثبوت دیا اس سے میرا حوصلہ بڑھا۔ اچاریہ جی تو میری بیماری کے دوران قریب قریب ہمہ وقت میرے پاس ہی رہے۔

میرے بچوں، اہلِ خانہ اور اسٹاف نے جو خدمت کی وہ بے شک اُن کا فرض تھا مگر اس زمانے میں اگر کوئی اپنے فرض [illegible] بھی کرلے تو یہ بڑی خوش قسمتی ہے۔ روحی دہلوی نے سوا سال پیشتر میری والدہ محترمہ کی طویل علالت میں جو خدمت انجام [illegible] بھی تاعمر فراموش نہیں کرسکتا تھا، اب میری علالت میں جس والہانہ انداز میں انہوں نے میری خدمت کی ہے اُس کا اجر سوائے [illegible] اور کوئی کیا [illegible] ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ انہوں نے اس کل یُگ میں ست یُگی اردھانگی کا جو ثبوت دیا ہے اس کے لئے میرا [illegible] اُن کا ممنون ہے۔ میری بیٹی فریدہ نور کھنڈوالہ بمبئی نے بھی خدا کے حضور جو دعائیں میری صحت کے لئے کیں وہ یقیناً قبول ہوئیں۔

آخر میں اس ذاتِ اقدس کا شکر یہ ادا کرنے کے لئے "الفاظ نہیں پا رہا ہوں جس کی مرضی کے بغیر ایک پتّا بھی نہیں ہل سکتا۔ [illegible] نے یہ سب اسباب پیدا کئے جن کا ذکر آپ پڑھ چکے ہیں۔ اور یہ اُسی خدائے برتر کا ہی کرمِ بے پایاں ہے کہ آپ کا یہ خادم اس زبردست [illegible] جب تک یہ ذاتِ اقدس چاہے گی یہ خادمِ اردو خدمتِ اُردو کے لئے اپنا سب کچھ قربان کرتا رہے گا۔ فقط

۱۸ اپریل ۱۹۷۸   خدائے برتر اور آپ سب کا ممنونِ احسان   دویا پرکاش سرور تونسوی

(بستر علالت سے)

افکار و واقعات

واجدہ تبسم بنام رحمٰن نیرؔ

واجدہ تبسم افسانہ نگاری میں اپنا جواب آپ ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ایڈیٹر شان ہند رسائل و جرائد میں چھپنے والے افسانوں کو کبھی نہیں پڑھتا کیونکہ اتنا وقت ہی نہیں ملتا۔ مگر جب بھی "شمع" میں واجدہ تبسم کا کوئی افسانہ چھپا تو نہ صرف اُسے خود پڑھا بلکہ اپنے دوستوں کو بھی پڑھوایا جنہیں افسانے یا ناول پڑھنے کا وقت ہی نہیں ملتا۔

ہندوستان اور پاکستان کے اکثر اردو ناشروں نے ایک دوسرے ملکوں کے ادیبوں اور شاعروں کی مشہور اور قابل مطالعہ کتابوں کے جعلی ایڈیشن چھاپ کر اپنا بنک بیلنس بڑھانے میں کسی بھی ضابطۂ اخلاق کی ضرورت کا احساس تک نہیں کیا۔ چنانچہ اس زمرہ میں واجدہ تبسم کے ساتھ بھی ظلم کی حد تک ناانصافی ہوئی۔ پاکستانی پبلشرز تو خیر غیر ملکی ہونے کی وجہ سے کسی قانونی گرفت میں نہیں آسکتے۔ مگر ہندوستان کے ایک نومولود ناشر رحمٰن نیرؔ ایڈیٹر "بیسویں صدی" اور "روبی" دہلی نے جو سلوک واجدہ تبسم کے ساتھ روا رکھا اُسے واجدہ تبسم کے الفاظ میں ہی سنیئے:

"مگر میں جس ملک میں مکین ہوں یعنی بھارت کی تو اب یہاں کے لوگوں نے بھی دھاندلی شروع کردی۔ ۱۹۷۲ء میں "روبی" کے ایڈیٹر نے میری ایک کتاب "شیشوں کے محل" قسط وار روبی میں شائع کرنے کے لئے لی اور ۱۹۷۶ء میں وہی کتاب "کیسے کالوں بیتی اندھیری" جیسے گھٹیا نام سے شائع کردی کتابت کی ہزاروں غلطیاں، گھٹیا اخباری کاغذ اور طباعت اتنی ناقص کہ کتاب ہاتھ میں لیتے ہی ابکائیاں آنے لگیں۔

میں یہ فیصلہ ۱۹۷۲ء ہی میں کر چکی تھی کہ اپنی تمام کتابیں اسی بمبئی شہر سے اپنی نگرانی میں چھپواؤں گی۔ ۱۹۷۴ء میں اور سیز بک سینٹر نے میری دوسری کتاب "آیا بسنت سکھی" اپنی نگرانی میں چھپوائی۔ چند وجوہات کی بنا پر دو سال کام بند رہا مگر جنوری ۱۹۷۷ء میں "اترن" شائع ہوئی جس کی کتابت و طباعت معیاری تھی۔ پھر جون ۱۹۷۷ء میں "نتھ کا بوجھ" شائع ہوئی جسے دیکھ کر مجھے امید بندھی کہ انشاء اللہ میری تمام کتابیں اسی طرح شائع ہوکر خراج تحسین حاصل کریں گی۔

مئی ۱۹۷۷ء میں بیسویں صدی میں میری ایک کتاب "کیسے سمجھاؤں" کا اعلان ہوا اور اکتوبر ۱۹۷۷ء میں دو کتابوں کا اعلان "روبی" اور "بیسویں صدی" میں شروع ہوا۔ میں نے مئی ۱۹۷۷ء میں ایڈیٹر "بیسویں صدی" کو روکا کہ آپ ایسے بے وقوفی کے اشتہارات دیجئے۔ مگر وہاں تو بندر کے ہاتھ میں تلوار تھی۔ . . . جون ۱۹۷۷ء میں میں اپنی کتاب "نتھ کا بوجھ" میں اعلان کر چکی تھی کہ میں اپنی تمام کتابیں "اوورسیز بک سینٹر بمبئی" سے چھپواؤں گی۔ اور بغیر اجازت کتاب چھاپنے اور بیچنے والا قانون کے ہاتھوں میں ہوگا مگر ستمبر ۱۹۷۷ء میں "بیسویں صدی" بک ڈپو نے میرے آٹھ افسانوں کا مجموعہ "کیسے سمجھاؤں" جیسے گھٹیا نام سے شائع کردیا۔ یہ نام میں زندگی بھر نہیں رکھ سکتی تھی۔ مجھے ہنسی یوں آتی ہے کہ جن لوگوں کو قلم تک پکڑنے کا سلیقہ نہیں۔ قسمت سے کسی پرچے کے ایڈیٹر بن جائیں تو جہالت سے بہرحال دامن نہیں چھڑا سکتے اور اپنی نااہلی کا مظاہرہ اس قسم کے نام رکھ کر ضرور کردیتے ہیں۔ جاہل کتاب چھاپنا کیا جانیں۔ کسی کتاب کا خوبصورت نام رکھنا تو خیر بہت بڑی بات ہے . . . میں نے اپنی اسی کتاب کا نام "زخم دل اور مہک" رکھا تھا جس میں دراصل ۱۵ عدد تک افسانے ہیں جس کا اعلان میں نے ۱۹۷۷ء اپنی کتاب "شہر ممنوع" میں کیا تھا۔ واجدہ اب میری کتاب

آپ کے ہاتھوں میں ہے)
بیسویں صدی پبلیکیشنز نے ایک اور گھٹیا حرکت میرے نام کا فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ کی اپنا ایک کتابچہ "روٹی کا سوال" نومبر ۱۹۸۱ء میں شائع کر دی ۔ ۔ ۔ یہ افسانہ (روٹی کا سوال) میں نے انہیں ۱۹۷۰ء میں روبی کے لئے دیا تھا۔

میرا ایک اور مجموعہ جس کا اعلان میں ۱۹۸۲ء جنوری میں کر چکی تھی "بنتِ اتراتی" تھا جس میں ۱۴ افسانے طوالتوں پر مشتمل تھے ۔ بیسویں صدی والوں نے طوالتوں پر لکھے گئے چھ افسانے شامل کر کے یہ کتاب انتہائی گھٹیا کاغذ پر چھاپ دی ۔ کتابت اور طباعت ماشاء اللہ۔

کتاب خریدنے والا صرف میرے نام پہ کتاب خریدتا ہے اور اسے کتنی مایوسی ہوتی ہے جب اس کے ذوق کی تسکین دس بارہ روپے خرچ کرنے پر بھی نہیں ہوتی۔

پاکٹ بک سیریز والوں نے مجھے بارہا لکھا کہ میں اپنا کوئی مجموعہ یا ناول انہیں دوں ۔ مگر میں اتنی چھوٹی چھوٹی کتابوں میں چھپنے کی قائل نہیں کہ لوگ اسے ایک بار پڑھیں اور بعد میں ردی میں بیچ دیں ۔ بیسویں صدی والوں نے میری جو کتابیں "کیسے سمجھاؤں" اور "روٹی کا سوال" چھاپی ہیں وہ ردی میں بیچنے کے لائق ہیں ۔ یہ کتابیں نہیں ایک نا اہل اور جاہل ایڈیٹر کی جہالت کا منہ بولتا اشتہار ہیں اور میں جب بھی ان کتابوں کا اشتہار کسی پرچے میں پڑھتی ہوں تو اس جاہل شخص کی عقل پہ ہنس دیتی ہوں جو اپنی ہی جہالت کو مشتہر کر رہا ہے

جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ میری بیس سالہ محنت ہے ذہنی کاوش ۔ جسے کوئی بھی لوٹنے کی کوشش کرے تو دنیا کی، عوام کی اور آخرت کی ہر عدالت میں ذلیل ہوگا ہر سزا پائے گا۔

ہر ادیب کی زندگی کا سرمایہ اس کی کتابیں ہوتی ہیں اور میری زندگی کا بھی یہی سرمایہ ہے اور آپ کہنے کی اجازت دیں تو کہوں کہ خوبصورت سرمایہ ہے جسے میں خوبصورت ترین انداز میں چھپوا کر اپنے قارئین کے سامنے پیش کرنا چاہتی ہوں جنہوں نے آج مجھے یہ عزت اور مرتبہ بخشا ہے ۔ اللہ رسول کے بعد آپ لوگوں نے مجھے اس مقام پر پہنچایا ہے کہ میری شرکت سے رسالوں میں حسن آجاتا ہے اور ہر اس شمارے کی اشاعت کئی ہزار بڑھ جاتی ہے جس میں میری کہانی چھپتی ہے ۔

یہ سب میں اس لئے لکھ رہی ہوں کہ روبی ہو یا بیسویں صدی یہ لوگ میرے منع کرنے کے باوجود میری کتابیں چھاپ اور اس کا اشتہار دے کر اپنا پرچہ فروخت کرتے ہیں تو نہ صرف عوام کو لوٹتے ہیں بلکہ میرے بال بچوں کا صدقہ کھاتے ہیں جس کی سزا انشاء اللہ انہیں ضرور ملے گی ۔ بے غیرتی اور بے شرمی کی انتہا ہے ۔ یوں تو بھیک مانگ کر پیٹ بھرا جا سکتا ہے ۔

اس بے غیرت، بے ہودہ اور نالائق ایڈیٹر نے دھاندلی کی انتہا یہ کی کہ میری بنا اجازت، بنا معاوضہ دیئے یہ دو کتابیں چھاپیں اور چھاپیں بھی بڑے کاغذوں پہ لکھ دیا کہ "جملہ حقوق بحق بیسویں صدی پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ دریا گنج محفوظ ہیں۔"

انسان اتنا بے غیرت، تن آسان اور مفت کی کھانے والا ہو تو آمدنی کے بہت سے مسائل تو گھر کی خواتین بھی حل ہو سکتے ہیں —— حیرت تو مجھے یوں ہے کہ اس عقل سے کورے شخص نے آمدنی کا اتنا "آسان" دھندا چھوڑ کر کتابیں چھاپنے کا راستا کیوں چنا۔

لیکن بعض "مرد محنت کی کمائی حرام سمجھتے ہیں اور ہیرا پھیری اور دھوکہ دہی سے اپنا پیٹ بھرنا چاہتے ہیں ۔ انہی میں ایک یہ "روبی" اور بیسویں صدی کا نام نہاد ایڈیٹر ہے ۔ جسے انگلش تو چھوڑیئے مادری زبان اُردو کا بھی ایک صحیح جملہ لکھنا نہیں آتا۔ دوسروں کی ذہانت کے بل بوتے پر ایڈیٹر اور پبلشر بنا پھرتا ہے لیکن مانگے کے اُجالے سے ہمیشہ اپنا گھر روشن کیا دکھا

یہ تو رہا رابعہ تبسم بنام رحمن نیر آگے انشاء اللہ ملاحظہ فرمایئے گا ۔ خوشتر گرامی بنام رحمن نیر

وعدہ ایفائی کے سلسلے میں داخلیں اُردو شعراء سے زیادہ قابلِ اعتماد ہیں

جناب شاداں گوالیاری نائب معتمد بزمِ اردو گوالیار تحریر فرماتے ہیں۔

اس خط کے ذریعہ اُردو کے دعویداران کا عمل آپ تک پہنچانا چاہتا ہوں "دعویدارانِ اردو" شاید میں نے غلط لکھا۔ یوں کہیے کہ "تاجرانِ اردو"

ہوا یہ کہ سنہ ۱۹۷۷ء میں ہر سال کی طرح منشی نارائن پرشاد صاحب مہر گوالیاری، جانشین حضرت داغ دہلوی کی یادگار میں آل انڈیا مشاعرہ منعقد کیا گیا تھا۔ بزم کی جانب سے حضرت فنا کانپوری کو مدعو کیا گیا۔ لیکن ممدوح تشریف نہیں لائے نہ کوئی اطلاع ملی۔ خیر سوچا کچھ مجبوریاں حائل ہوں گی

امسال ۱۸ مارچ کو پھر یہی مشاعرہ منعقد ہوا۔ میں نے پچھلے واقعات کی یاد دلاتے ہوئے اس مشاعرہ میں شرکت کے لئے فنا صاحب کو لکھا جس میں ۵۰/- روپے کی رقم زرِ زادِ راہ بھی تحریر کر دی۔ بڑا پُرخلوص جواب آیا۔ شرکتِ مشاعرہ کی منظوری صادر ہو گئی۔ اُن کے شایانِ شان ہوٹل میں کمرہ ریزرو کرا دیا گیا۔ کیونکہ موصوف نے ۱۷ کو ہی تشریف لا سکنے کی اُمید دلائی تھی ۔ ۱۷ گزری، ۱۸ بھی گزر گئی۔ اور آج ۲۴ بھی ہو گئی لیکن حضرت موصوف نہ خود آئے نہ کوئی اطلاع آئی۔ ممبرانِ بزم کو سامعین و اہلِ ذوق حضرات کے سامنے شرمندہ ہونا پڑا۔ مشاعرہ کی عمدگی پر بھی اثر ہوا۔

اس خط کے ذریعہ میں صرف اہلِ ذوق حضرات کی توجہ اس طرف مبذول کرنا چاہتا ہوں۔ اگر شعرائے کرام کے وعدوں کا یہی عالم ہے تو کون کس کو بلائے اور کس اُمید پر مشاعرے کئے جائیں۔ میری تمنا ہے کہ آپ اپنے رسالہ میں اس موضوع پر ضرور روشنی ڈالیں۔ اور اس رسالے کی ایک کاپی مجھے اور ایک جناب فنا کانپوری چمن گنج کانپور کو ضرور ارسال کریں کیونکہ آپ اُردو کے حامی ہیں

آپ کا

شاداں گوالیاری

شاداں صاحب کے مکتوب گرامی کے بعد اب آپ پاٹلی پتر روٹری کلب پٹنہ (بہار) کے زیرِ اہتمام کل ہند جشنِ ظرافت کے سلسلہ میں منعقدہ مزاحیہ مشاعرہ کی مختصر سی رپورٹ سے اخذ شدہ ان سطور کو بھی پڑھئے جو معاصر "پٹنہ" پٹنہ کی حالیہ اشاعت میں شائع ہوئی ہیں۔

"دوسری بات جو کسی حد تک عبرت ناک بھی ہے یہ تھی کہ پاکستانی شاعر دلاور فگار جو آج کل ہندوستان میں مقیم ہیں منتظمینِ مشاعرہ نے محض جذبۂ خیر سگالی کے تحت مشاعرہ کا دعوت نامہ بھیجا تھا۔ انھیں معقول معاوضہ کی پیش کش کی گئی تھی۔ دعوت قبول کرتے ہوئے انہوں نے لکھا تھا کہ معاوضہ میں ایک سو روپے کا اضافہ کر دیا جائے اور کچھ رقم پیشگی بھیجدی جائے

ان کا مطالبہ منظور کرتے ہوئے پیشگی رقم بھیجدی گئی۔

کچھ دن کے بعد دلاور فگار نے لکھا ۳ رفروری کو ایک دوسری جگہ بھی مشاعرہ ہے، لہٰذا روٹری کلب کے مشاعرہ کی تاریخ آگے بڑھا دی جائے تب وہ شرکت کریں گے۔ تاریخ بڑھانے کا موقع نہیں تھا لہٰذا منتظمین نے اُن سے درخواست کی کہ وہ وعدہ شکنی نہ کریں کیونکہ ان کی منظوری کا خط آ جانے کے بعد مسلسل ان کے نام کا اعلان اخبارات میں کیا جا رہا ہے۔ اس درخواست کا جواب یہ آیا کہ فلاں جگہ سے انہیں زیادہ رقم کا آفر ملا ہے۔ لہٰذا اگر روٹری کلب والے اب ان کا معاوضہ دوگنا کر دیں اور کل رقم پیشگی بھیجدیں تبھی وہ شرکت کریں گے۔ ایک غیر ملکی شاعر کا مشاعرہ کو کاروبارِ تجارت سمجھ کر اس طرح مول تول کرنا اور منافع خوروں جیسی ذہنیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے وعدے سے منحرف ہو جانا تاجرانِ اردو ... منتظمینِ مشاعرہ کو بہت گراں گزرا۔ اس گھٹیا اور غیر اخلاقی رویہ کے پیشِ نظر ان کا مطالبہ نامنظور کرتے ہوئے منتظمین نے یہ جواب دیا کہ جب آپ کے لالچ کی یہی رفتار رہی تو کسی دن کہیں سے اور زیادہ رقم کا آفر مل جائے گا تو آپ ہمارے یا دوسرے مشاعرہ کو

پس پشت ڈال کر اس تیسری جانب دوڑ جائیں گے۔ اس لئے ہم مزید دھوکہ میں پڑنا نہیں چاہتے۔ براہ مہربانی پیشگی وصول ہوئی رقم واپس کر دیا۔

ہمیں اس امر سے کوئی دلچسپی نہیں کہ دلاور فگار نے رقم واپس کی یا نہیں لیکن ہم اتنا ضرور عرض کریں گے کہ ایک طرف جہاں ہندوستان و پاکستان کے درمیان خوشگوار تعلقات بحال ہونے کی امید بندھ رہی ہے۔ ہمارے وزیر خارجہ پاکستان جا کر خیر سگالی جذبہ کا مظاہرہ بھی کر آئے ہیں۔ وہاں دوسری جانب ایک پاکستانی شاعر کا ہندوستان آکر اپنی تاجرانہ ذہنیت کی اس بھونڈے طریقے سے نمائش کرنی بڑی شرمناک بات ہے۔ خصوصاً اس حالت میں جبکہ مزاحیہ مشاعرہ کا اہتمام خالصتاً ایک غیر اردو داں انجمن نے کیا تھا۔ دلاور فگار نے اپنی اس حرکت سے پاکستان کے وقار کو ٹھیس پہنچائی ہے۔

دلی کی مشہور گانے والی طوائف کشمیری بائی جس کی آواز کا ڈنکا کسی زمانہ میں دور دور تک سنا جاتا تھا اور جس کے نام پر آگرے کا کشمیری بازار آباد ہے آج کل دہلی کی جی بی روڈ پر مقیم ہیں اور ان کی بیٹیاں، پوتیاں، نواسیاں اپنے آبائی فن کا مظاہرہ کر کے اردو شعراء کے مقابلہ میں کہیں باعزت طور پر گزر اوقات کر رہی ہیں۔ کچھ دن ہوئے کہ ان کا معاہدہ کسی تقریب میں مجرے کے پروگرام کا طے ہوا اور عین اسی روز دوسری جگہ بھی کسی تقریب میں انہیں گانے والیوں کی ضرورت محسوس کی گئی اور یہ دوسری پارٹی ہر شرط اور منہ مانگے معاوضہ پر اس پارٹی کو اپنے ہاں لے جانے پر مصر تھی مگر کشمیری بائی نے دو ٹوک جواب دیا کہ اگر آپ ایک لاکھ روپیہ بھی دیں تو بھی میں اپنے قول سے پھر نہیں سکتی۔ میری پارٹی وہیں پروگرام پیش کرے گی جہاں اس کا پہلے معاملہ طے ہو چکا ہے۔

اس لئے جناب شاداں گوالیاری اور [illegible] روٹری کلب پٹنہ کے منتظمین سے گزارش ہے کہ آئندہ وہ اپنے پروگراموں میں شعرائے کرام کی بجائے طوائفوں کو مدعو کریں۔ کیونکہ یہ طوائفیں آج کل کے وعدہ شکن شعراء کے مقابلہ میں کہیں زیادہ شریف، وعدہ کا پاس کرنے والی اور کم نخرے دکھانے والی ہیں۔

ایک متشاعرہ کے شوہرِ نامدار کا خط ایڈیٹر شانِ ہند کے نام

نام اور مقام حذف کر دیئے گئے ہیں۔ اصل خط موجود ہے۔ املا کی اغلاط درست کی جا رہی ہیں۔

مکرمی سرور تونسوی صاحب ایڈیٹر شان ہند

آداب و نیاز۔ آپ جیسے عظیم اور بیباک صحافی سچائی کو اسی طرح سامنے لاتے رہے تو میں یقین سے کہتا ہوں ایک دن ضرور اردو کو اس کا جائز مقام مل کر رہے گا ...... کا ماہنامہ شان ہند نظر سے گزرا آپ نے بہت صاف گوئی سے کام لیا ہے کہ محترمہ ...... یقیناً شاعرہ نہیں ہیں۔ تو میرے بھائی یہ درست ہے۔ آپ اور میں تو مان سکتے ہیں لیکن آپ ہندوستان کے سامعین کو کیسے سمجھائیں گے۔ ہندوستان کے مشہور مند شاعر کو کیسے سمجھائیں گے۔ آج کا ہندوستان خمار بارہ بنکوی سے لے کر نظیر ایڈوی تک محترمہ ...... کو اردو ادب کی شاعرہ سمجھتا ہے اور مشاعرہ میں بلانا اپنی عزت سمجھا جاتا ہے بلکہ مشاعرے کی کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا ہے۔ آپ کتنا بھی لکھیں کچھ بھی کہیں پھر بھی ...... تو لوگ بحیثیت شاعرہ کو مشاعروں میں بلاتے رہیں گے۔ آپ کو شاید معلوم نہیں محترمہ حضرت ...... کی بھتیجی ہیں اور ...... کی صاحبزادی اور ...... کی شاگرد۔ یہ الگ بات ہے ...... کے نام سے مشہور ہوئیں۔ لوگ جانتے ہیں۔ یہ جان کر آپ کو دلی مسرت ہوگی کہ محترمہ ...... کا جشن ...... اپریل کو ہونے جا رہا ہے۔ یعنی جناب ...... فائدے کرنے جا رہے ہیں اور [illegible] آج کا سامعین آواز اور [illegible] کے اتار چڑھاؤ کو شاعر سمجھتا ہے۔ [illegible]

نہ آپ کچھ کر سکتے ہیں اور نہ میں۔ خاکسار کو .... کے نام سب لوگ جانتے ہیں۔ انشاء اللہ آپ سے جلد ملوں گا۔"

یہ آپ نے قطعی صحیح فرمایا ہے کہ آپ کی منشاء یہی کو بلانے والے مبتلا رہیں گے اور اپنے مشاعرے کی کامیابی کی ضمانت سمجھیں گے یا خمار بارہ بنکوی سے لے کر نظر ایٹوی تک انہیں اردو ادب کی شاعرہ سمجھیں گے تو آپ ایسا کیا کرلیں گے مگر آپ یہ بھول جاتے ہیں کہ مشاعروں کے منتظمین یا سامعین کی پسندیدگی یا شراب نوشی کے باعث کڑھی کو پری کہنے والے شعراء کی جھوٹی تعریفوں سے آپ کی محترمہ کو شاعرہ تسلیم کیا جائے تو یہ قطعاً ممکن ہے۔ رہا آپ کی محترمہ کے مختلف مقامات پر جشن منائے جانے کے بارے میں تو اس سلسلے میں یہ مت بھولئے کہ اکثر بھیڑیئے بھیڑوں کی کھال پہن کر ہی شکار کیا کرتے ہیں۔ شاید آپ جے پور کا واقعہ بھول گئے جبکہ محلہ بساطیان کے ایک کمرہ میں آپ کا بچہ ایک شرابی شاعر نے بانوں باتوں میں ہی کہیں چھپا دیا تھا اور آپ رات بھر بچے کو تلاش کرتے رہے اور آپ کی محترمہ کا جشن نہیں بلکہ رات بھر عرس منایا جاتا رہا۔ اور صبح کو آپ کی محترمہ اور بچہ دونوں صحیح سلامت آپ کے حوالے کر دیئے گئے۔ ایسے جشن منانے والوں کی ملک بھر میں کمی نہیں ہے۔ اگر آپ اپنی تو ہرا تہ غیرت کو تھوڑی سی اور ڈھیل دیدیں تو خدا کی قسم آپ اور آپ کی محترمہ موٹروں میں اڑتے پھریں اور بریک فاسٹ اگر کریم نعمت کدہ میں نہاری سے ہو تو لنچ فائیو سٹار ہوٹلوں میں شام کی جائے کلبس چیمبر میں تو ڈنر اشوکا میں۔ اور دہلی میں شراب بندی کے باوجود آپ دونوں کو اسکاچ وسکی میں نہلایا جائے۔ رہے بچے تو ان کے لئے کسی آیا کا انتظام ہو جائے گا۔

اردو اکاڈمی راجستھان

جناب مولانا قمر واحدی صاحب کو اردو اکاڈمی راجستھان کا چیرمین مقرر کیا گیا ہے۔ ادارہ شان ہند مولانا قمر واحدی صاحب کو مبارکباد پیش کرتا ہے اور یہ امید رکھتا ہے کہ وہ اپنے فرائض کو نہایت دیانتداری کے ساتھ نبھائیں گے کیونکہ اس وقت اردو جس خطرناک دور سے گزر رہی ہے اس کے پیش نظر اب ایسے جانبازوں کی ضرورت ہے جو دل سے اردو کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔ امید ہے کہ اردو اکاڈمی راجستھان اردو کی بقا و حیات کے لئے ایسا لائحہ عمل اپنائے گی کہ جس پر دوسرے پردیشوں کی اردو اکاڈمیوں کے منتظمین بھی عمل پیرا ہو سکیں۔

راہی شہابی بلند شہری اور حق بنارسی کی ایک متنازعہ غزل

"شان ہند" کی کسی گزشتہ اشاعت میں ایک اداریہ شدہ میں یہ لکھا گیا تھا کہ راہی صاحب کی مخالفت میں کچھ حضرات کے خطوط دفتر شان ہند میں موصول ہوئے کہ انہوں نے جناب حق بنارسی کی ایک غزل کئی سال ہوئے اپنے نام سے مشاعروں میں پڑھی اور چھپائی۔ ایڈیٹر شان ہند کو جناب ہوش گاندھی صاحب نے بتایا کہ حق صاحب نے عالم قہوری صاحب اور شمیم جے پوری کی موجودگی میں یہ فرمایا کہ راہی صاحب نے اسی غزل جو غزل سنائی وہ ان کی نہیں ہے۔ لہذا یہ لکھا گیا کہ چونکہ اردو اکاڈمی راجستھان قائم ہونے والی ہے اور راہی شہابی صاحب وقتی طور پر ایڈہاک جنرل سکریٹری مقرر کئے جا چکے ہیں لیکن جے پور اور راجستھان کے اکثر شعرائے کرام یہ نہیں چاہتے کہ راہی صاحب کو اردو اکاڈمی کا جنرل سکریٹری مقرر کیا جائے۔ اس لئے انہیں بدنام کرنے کے لئے یہ تحریک شروع کی گئی ہے۔ کیونکہ اس حقیقت سے راہی صاحب کا بڑے سے بڑا دشمن بھی انکار نہیں کر سکتا کہ راہی راجستھان کے نوجوان شعرا کی صف اول میں شمار کئے جاتے ہیں اور انہوں نے یادِ ٹیپو سلطان بنگلور کے مشاعرہ میں ٹیپو سلطان پر بہت تھوڑے وقت میں جو نظم کہہ کر سنائی وہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے بہترین ہے۔ اسی طرح جے پور کے ۲۵۰ سالہ جشن پر جو نظم راہی صاحب نے سنائی وہ اس مقابلہ

میں سنائے گئے۔ تمام شعراء کے کلام پر بھاری تھی اور ایڈیٹر
شان ہند گزشتہ پندرہ سالوں میں راہی صاحب کو ملک بھر
کے قابلِ ذکر مشاعروں میں جس قدر دیکھتا آرہا ہے بعد امتحان
کے کسی دوسرے شاعر کو ان کے مقابلہ میں ایسا نہیں پایا
اس لئے ایڈیٹر شان ہند کے دل و دماغ نے یہ تسلیم کرنے
میں پس و پیش کیا کہ راہی صاحب نے حق بنارسی کی غزل
چرائی۔ اسی دوران ایڈیٹر شان ہند کو کسی ذاتی کام کیلئے جے پور میں
کئی روز قیام کرنا پڑا تو راہی صاحب کی اس مبینہ غزل کی
چوری کے بارے میں جو کچھ بتایا گیا وہ حسب ذیل ہے:

۱۔ یہ متنازعہ غزل راہی صاحب نے سب سے پہلے جے پور
کے ایک مشاعرے میں پڑھی۔

۲۔ اور اسی مشاعرے میں مکن پور کے دو شاعر جناب
ادیب اور نابینا شاعر جناب نیاز موجود تھے اور انہیں سے
شعرائے جے پور کو یہ معلوم ہوا کہ یہ غزل حق بنارسی کی ہے
اس سلسلہ میں ادیب مکن پوری کے مکتوب گرامی کا عکس
صفحہ ۴۳ پر ملاحظہ فرمائیں۔

۳۔ اس واقعہ کو اگرچہ سترہ برس کا طویل عرصہ گزر گیا
لیکن شعرائے جے پور اس تذکرے کو نہ بھولے۔ لہذا
راہی صاحب نے اس غزل کو پڑھنا بند کر دیا اور باوجود
فرمائش کے بھی انہوں نے یہ غزل کبھی نہ سنائی۔ ایک بار
جودھ پور کے کسی مشاعرے میں انہوں نے یہی غزل پڑھی
جس کی تصدیق شعرائے جودھ پور نے کی۔ اس تصدیق نامہ
کا عکس صفحہ ۴۳ پر دیکھا جا سکتا ہے

۴۔ راہی بلند شہری جے پور میں مشاعرے کراتے رہے اور
بیرونی شعرا کو بلاتے رہے لیکن انہوں نے کبھی حق بنارسی
کو جے پور کے کسی آل انڈیا مشاعرہ میں نہیں بلایا

۵۔ ۲۹ر اکتوبر ۱۹۷۰ء کو جشنِ تشکیل کے مشاعرے
میں حق بنارسی کو بلایا گیا کیونکہ یہ مشاعرہ راہی بلند شہری
کے ہاتھ میں نہیں تھا۔ اس مشاعرہ میں شرکت کے لئے
جہاں دیگر مقامی شعراء کو دعوت نامے بھجوائے گئے،
راہی بلند شہری کو بھی دعوت نامہ بھیجا گیا۔ لیکن عین

کے وقت مشاعرہ گاہ میں ان کا ایک خط آیا جس میں تحریر
تھا۔ میں آج سے جے پور کی ادبی دنیا سے سبکدوش ہو رہا
ہوں اور آج مشاعرے میں حاضری سے معذور ہوں۔
اس تحریر کا عکس سرورق کے اندرونی صفحہ پر دیا گیا ہے یہ
دراصل حق بنارسی کے سامنے آنے سے ایک قسم کا گریز تھا۔

۶۔ اس مشاعرے میں جب حق بنارسی صاحب کو کلام
سنانے کی زحمت دی گئی تو انہوں نے جو غزل پڑھی وہ بہت
مقبول ہوئی۔ سامعین کے اصرار پر حق صاحب نے کہا اب میں
وہ غزل آپ کو سنا رہا ہوں جو سترہ سال سے ایک صاحب
اپنے نام سے پڑھتے آرہے ہیں جس کا مطلع ہے ؎

شیشۂ ذوقِ حقیقت نگری ٹوٹ گیا
دَرِ حاضر میں غرورِ بشری ٹوٹ گیا

اور اس وقت راہی صاحب مشاعرہ گاہ کے بالکل قریب
نذیر صاحب جوہری کے مکان پر تشریف فرما تھے

۷۔ راہی صاحب نے جے پور کے ڈھائی سو سالہ جشن کے
مشاعرہ میں مدعو حق بنارسی صاحب کو نذیر صاحب کے کمرے
پر عالم صاحب فتحپوری۔ شمیم جے پوری اور دیگر حضرات کی
موجودگی میں اپنی بیس سالہ بیاض میں سے اپنی غزل سنائی تو
حق صاحب نے فرمایا کہ یہ غزل میری نہیں ہے جب پر عالم صاحب
فتحپوری نے ایک تصدیق نامہ لکھا کہ حق صاحب نے ان
حضرات کے سامنے یہ تسلیم کیا کہ یہ غزل ان کی نہیں ہے۔
اس تصدیق نامہ کا عکس صفحہ ۴۳ پر دیکھا جا سکتا ہے۔

۸۔ راہی صاحب نے چاہا کہ حق صاحب نے جو الزام
رام گنج بازار کے جشنِ تشکیل کے مشاعرے میں لگایا تھا
اس کی تردید آج کے مشاعرے میں حق صاحب کر دیں۔
مگر یہ مشاعرہ گورنمنٹ سطح پر تھا۔ اس لئے منتظمین مشاعرہ
نے یہ اجازت نہ دی کہ حق صاحب اس مشاعرے کے ڈائس
سے اس متنازعہ غزل کے بارے میں تردیدی اعلان
کرسکیں اور یہ بھی بتایا گیا کہ جے پور کے ڈھائی سو سالہ جشن
کے مشاعرے میں راہی صاحب اپنے حواریوں کے ساتھ
نکلے اور حق صاحب کو گھیر لیا گیا اور اس طرح کے

سوالات کرکے انھیں خوفزدہ کیا گیا جس کی وجہ سے حق صاحب خوفزدہ ہوکر یہ تردیدی اعلان کرنے پر آمادہ ہوئے۔

۲۔ جے پور کے جن شعرائے کرام نے راہی ملند شہری سے حق بنارسی کی یہ غزل سنی ہے۔ ان میں کیفی ابوبی، غلام احمد صاحب سحر، مختار الرحمٰن راہی، عبدالمغنی رہبر، خورشید احمد سحر، سید تقی حسین صاحب پیام۔ قبلہ مولوی حافظ محمد ایوب خاں صاحب قمر واحدی کے اسمائے گرامی لئے جاتے ہیں۔

قیامِ جے پور کے دوران ایڈیٹر شان ہند کی مختصر سی ملاقات راہی صاحب سے بھی ہوئی اور اس ملاقات میں اُنہوں نے ایڈیٹر شان ہند سے یہ سوال کیا کہ آپ ایمانداری سے کہئے کہ میں شاعر ہوں یا نہ۔ جواباً عرض کیا گیا کہ آپ کے شاعر ہونے میں کسی کو انکار نہیں۔ تو اس پر وہ فرمانے لگے کہ پھر مجھے غزل چوری کرنے کی کیا ضرورت تھی اور اُنہوں نے اپنی بیاض دکھائی جن پر نمبر وار صفحات لکھے ہوئے ہیں اور بغیر الٹ پھیر کے ان کی اس زمین میں ایک غزل درج ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ بیاض کے اس صفحہ کی جانچ کرائی جاسکتی ہے کہ یہ غزل تازہ سیاہی سے لکھی ہوئی ہے یا سترہ سال پرانی اور بیاض کے صفحات سلسلہ وار ہیں نیز لیبارٹری میں سیاہی قسم کی جانچ ہونے پر پتہ چل سکتا ہے کہ یہ تحریر کب کی ہے اور انہوں نے ہندی میں چھپا ہوا اپنا ایک مطبوعہ انتخاب کلام بھی دکھایا جو بارہ سال... قبل شائع ہوا تھا۔ اس میں اس غزل کا ایک شعر چھپا ہوا ہے۔

دلی آکر ایڈیٹر شان ہند نے جناب حق بنارسی اور جناب راہی صاحب کو خطوط لکھے کہ وہ اس متنازعہ غزل کے بارے میں اصل حالات سے ایڈیٹر شان ہند کو مطلع فرمائیں تاکہ کسی قسم کی ناانصافی یا زیادتی کا مرتکب نہ ہوسکوں۔ چنانچہ جناب حق بنارسی صاحب کا جو مکتوب گرامی موصول ہوا ہے وہ نقل مطابق اصل حسب ذیل ہے
اصل خط محفوظ ہے۔

محترم سرور صاحب آداب و نیاز

اُمید کہ مزاجِ گرامی بخیر ہوگا... یاد فرمائی کا بہت بہت شکریہ جس غزل کے متعلق آپ نے دریافت فرمایا ہے اس کی تفصیل یوں ہے۔ میں نے یہ غزل تقریباً سترہ سال پہلے کہی تھی۔ پہلی بار ایک ایسے مقامی مشاعرے میں پڑھی تھی جس میں راہی صاحب موجود تھے اور نہ دوسری بار مکن پور کے آل انڈیا مشاعرہ میں پڑھنے کا اتفاق ہوا۔

راہی صاحب نے یہی غزل جے پور میں پڑھی تھی اس کی اطلاع مجھے جناب ادیب مکن پوری نے دی۔ جے پور سے اس سلسلہ میں جناب کیفی جے پوری کا ایک خط بھی اسی زمانے میں ملا تھا جس میں دریافت فرمایا گیا تھا کہ کیا یہ غزل آپ کی ہے۔ میں نے جواب میں ان کے پاس "دھامی نگور دلی" کا وہ پرچہ روانہ کر دیا جس میں میری یہ غزل شائع ہو چکی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد مجھے حافظ منظور احمد صاحب ادیب جے پوری کا دستیاب ہوا۔ میں نے اس سلسلے میں انہیں بھی ایک خط روانہ کیا (اس خط کا عکس سرورق کے آخری اندرونی صفحہ پر ملاحظہ فرمائیے) چند ماہ پہلے جے پور میں ہونے والے جشنِ شکیب بنارسی میں شرکت کا شرف حاصل ہوا جہاں میں نے اپنی تازہ ترین غزل پیش کی جیسے ہی میں اپنی جگہ واپس آنے کا ارادہ کیا۔ اسٹیج سے متفقہ فرمائشوں کا شور سنائی دیا... حضرت وہ غزل بھی جس کی ردیف ہے

ٹوٹ گیا

فرمائشوں کے شور نے میرے ذہن کو جناب ادیب مکن پوری کی دی ہوئی اطلاع کی طرف موڑ دیا۔ مجھے یقین ہوگیا کہ یہ وہی لوگ ہیں جن کی موجودگی میں راہی صاحب نے یہ غزل پڑھی ہوگی۔ بہرحال میں نے اس اعلان کے بعد غزل سنائی۔

حضرات میں تو آپ کے شہر میں پہلی بار حاضر ہوا ہوں لیکن یہ غزل جس کی فرمائش کی جا رہی ہے شاید آپ دوسری بار سنیں جناب ادیب مکن پوری کی اطلاع کے مطابق جے پور کے ایک مشہور غزل یہ پڑھ چکے ہیں۔

قصداً ایک شعر چھوڑ کر میں نے غزل ختم کی۔ اتنے میں ایک صاحب نے آواز دی۔ محترم وہ شعر آپ نے چھوڑ دیا اور ایک مصرع سنایا۔ اُن کی یادداشت کی داد دیتا ہوں یہ وہی شعر تھا جس کو میں نے قصداً چھوڑ دیا تھا۔

مشاعرہ کے بعد میں ۰۰۰ دن جے پور میں رہا اور پھر کانپور آیا۔ چند روز بعد ہی میں نے جے پور شہر کے ڈھائی سو سالہ جشن کے مشاعرہ میں شرکت کی چونکہ میں کافی دیر سے پہنچا تھا۔ اس لئے اسٹیج پر سب سے پیچھے اس جگہ بیٹھا جہاں شعرائے کرام کی آوازیں تو کم لیکن پیچھے کے [illegible] بات کرنے والوں کی آوازیں زیادہ سنائی دیں۔ مسلسل میرے کانوں میں ملامت آمیز، پریشان کن اور ذہنی انتشار پیدا کرنے والے الفاظ آتے رہے۔ میں یونہی احساس قلب کا مریض ہوں۔ اس وقت میری کیا کیفیت تھی میں عرض نہیں کر سکتا۔ اسی کیفیت میں میں نے مشاعرے میں چند شعر سنائے اور اپنی جگہ آ بیٹھا۔ ذرا دیر کے بعد راہی میرے پاس آئے اور [illegible] نے خواہش ظاہر کی کہ میں تنہائی میں کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے عرض کیا کہ باہر کی اس ہنگامہ سازی [illegible] گفتگو [illegible] ہو۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اس وقت گفتگو نہ کر سکا۔ اتنے میں راہی صاحب کو کسی نے آواز دی اور وہ باہر چلے گئے۔

اب جناب عالم فتحپوری تشریف لائے اور انہوں نے آتے ہی پوچھا کہ حق صاحب آپ کا اور راہی صاحب کا کیا معاملہ ہے۔ آپ نے جشن شکیب میں کیا اعلان فرمایا تھا۔

میں نے عرض کیا کہ اس سلسلہ میں سر مشاعرہ کچھ عرض کرنا، اسٹیج کے لوگوں کا ذہن مشاعرے کی طرف سے موڑنے کے مترادف ہے۔

عالم صاحب اپنی ذمہ داری پر مجھے اس کمرے تک لے گئے جہاں جناب شمیم جے پوری، راہی شہابی اور ان کے بہت سے ساتھی موجود تھے۔

بیٹھتے ہی عالم صاحب نے دریافت فرمایا کہ جشن شکیب میں آپ نے کیا اعلان فرمایا تھا۔ جواباً میں نے کہا کہ راہی صاحب خود بیان فرمائیں تو اچھا ہے۔ راہی صاحب نے وہی بات بتائی جو مجھے بتائی تھی۔ پھر پوچھا گیا کہ آپ نے یہ اعلان کیوں کیا۔ میں نے عرض کیا کہ میرا مجموعہ کلام منظر عام پر آنے والا ہے۔ اگر جے پور پہنچے تو لوگ یہ نہ سوچیں کہ ان کے مجموعے میں راہی صاحب کی غزل کہاں سے آئی۔

کچھ دنوں پہلے شان ہند کے کسی پرچے میں یہ تحریر نظر سے گزری کہ دونوں حضرات نے عالم صاحب اور شمیم صاحب کو اپنی اپنی غزل سنائی جو غلط ہے۔

جناب راہی نے اپنی بیاض نکالی کہ میری غزل دیکھ لیجئے۔ کیا اس میں آپ کے اشعار ہیں۔ میں نے انہیں بصد اصرار کی درخواست کی اور انہوں نے غزل سنائی ۰۰۰

یہ وہ غزل نہیں تھی جس کے متعلق میں نے جشن شکیب میں اعلان کیا تھا۔ راہی صاحب اعلان کے دوسرے دن چاہتے کہ میں مشاعرے میں یہ اعلان کر دوں لیکن اس کا موقع نہیں مل سکا۔ اگر مجھے موقع ملتا تو میں یہی عرض کرتا کہ میرا سابقہ اعلان اس غزل سے متعلق نہیں ہے جو راہی صاحب کی بیاض میں ہے۔ بلکہ اس غزل سے متعلق ہے جو میری اپنی غزل ہے اور جس کے متعلق ادیب صاحب مکن پوری نے اطلاع دی تھی۔

اراکین مشاعرہ میں ایک صاحب نے عالم صاحب سے کہا کہ آپ لوگ حق صاحب کو اس سلسلہ میں اعلان کا موقع کیوں نہیں دیتے۔

انہوں نے جواب دیا عالم صاحب آپ بھی دلیپ [illegible] نہیں معلوم کہ یہ غزل جو آپ کو راہی صاحب نے دکھائی ہے بعد میں لکھی گئی ہے جس مشاعرے میں راہی صاحب نے حق صاحب کی غزل پڑھی تھی، میں خود موجود تھا۔

مجھے یقین ہے کہ عالم صاحب اس بات کو بھولے نہ ہوں گے اور اگر بھول گئے تو حیرت ہے۔ محترم سرور صاحب بیس بائیس گواہوں میں کس کس کو غیر معتبر

سمجھوں اور کیسے اس بات کا یقین نہ کروں۔

نیاز مند
حق بنارسی

جناب راہی راجستھان سرکار کے پبلک ریلیشنز آفیسر ہیں اور چیف منسٹر راجستھان کے پریس اتاچی کے فرائض بھی انہیں کے ذمہ ہیں۔ اس لئے ان کی سرکاری مصروفیات کے باعث میرے عریضے کا جواب جناب نذیر احمد صاحب جوہری نے تحریر فرمایا ہے۔ اور وہ اس وقت موصول ہوا ہے جبکہ یہ صفحات پریس میں جا رہے ہیں اور اپریل کے شمارہ میں بارہ صفحات معمول سے زائد بڑھائے جانے کے باوجود یہ طویل مکتوب اس اشاعت میں نہ جا سکا۔ نذیر صاحب کا یہ مکتوب شان ہند کی اشاعت آئندہ میں دیا جا رہا ہے۔ چونکہ راہی صاحب پر ایک بہت ہی گھناؤنا الزام عائد کیا گیا ہے لہٰذا اگر وہ چاہیں تو اپنی صفائی میں جو کچھ لکھنا چاہیں اسے شان ہند میں شائع کیا جائے گا۔ مگر کوئی بھی تحریر ان واقعات تک ہی محدود ہونی چاہیے۔ اس ضمن میں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ ایڈیٹر شان ہند سے جناب ادیب جے پوری نے دوران گفتگو فرمایا کہ انہوں نے اپنے کانوں سے راہی صاحب کی زبان سے یہ متنازعہ غزل کبھی نہیں سُنی۔

شان ہند کے گزشتہ بیس سال کے فائل دیکھے گئے تو ایسے مشاعروں کی تعداد ۳۱ ہے جن میں راہی صاحب نے شرکت فرمائی اور ان کی مفصل کارروائی شان ہند میں چھپی اور کسی بھی مشاعرے میں راہی صاحب نے یہ غزل نہیں سُنائی جس پر چوری کا الزام ہے۔ ان مشاعروں میں راجستھان کے بیس کے قریب مشاعرے ہیں جن میں جودھپور کا بھی ایک مشاعرہ شامل ہے۔ مدیر شان ہند نے انتہائی ایمانداری سے جو اُسے بتایا گیا۔ مختلف تحریروں کے عکس مہیا کئے گئے یا جو کچھ اس نے اپنے طور پر پہچانا۔ اُسکی تفصیل ناظرین کے سامنے رکھدی ہے اب اسکا فیصلہ ناظرین خود فرما سکتے ہیں کہ راہی صاحب نے حق صاحب کی غزل کہہ تھیا لیا یا نہیں۔

بزرگوار کے انتقالِ پُرملال پر

(اوم پرکاش نردوش پھگواڑہ)

کیا کہوں اُس کے چلے جانے سے کیا جاتا رہا
سچ اگر پوچھو تو جینے کا مزا جاتا رہا
رو گئیں اُمیدیں لپٹ کر حسرتوں کی خاک سے
دل نے سر پٹکا جگر سے جب سُنا جاتا رہا
خواب کے عالم میں ہوں یا بج رہے ہیں میرے کان
کیا کہا ہچکی لگی ہے؟ کیا کہا جاتا رہا؟
حادثہ جانکاہ یہ پہلے جانا وقت سے
یوں تو انساں ازل سے آتا رہا جاتا رہا
چھوڑ کر پُر پیچ راہوں میں بھٹکتا کارواں
تھا جو میر کارواں وہ رہنما جاتا رہا
حل طلب اُلجھے مسائل پر تھے جس سے مشورے
وہ مسیحا نفسِ دل وردہ آشنا جاتا رہا
شفقتِ پدری سے سر پر کون اب رکھے گا ہاتھ
سانس تھی جس کی مرے حق میں دُعا جاتا رہا
اُس کے ہی دم سے تھے سارے رشتے ناطے جُڑے
وہ کڑی ٹوٹی تو سارا سلسلہ جاتا رہا
کیسے لکھدوں اس کا نام اسلاف کی فہرست میں
دل تو اب تک بھی نہیں یہ مانتا جاتا رہا
تا ابد بھی پُر نہ ہو پائے گا اے ہمنشیں
چھوڑ کر دُنیا میں وہ ایسا خلا جاتا رہا
پھول کھلنے آئے ہیں ہم آج ایسے پھول کے
گلشنِ ہستی کی لے کر جو ضیا جاتا رہا
ہر طرف بڑھتی چلی ہے تیرگی ہی تیرگی
روشنی تھی جس کے دم سے وہ دیا جاتا رہا
تیری رحمت کا بھرم بھی ہو گیا ہے پاش پاش
اے خدا! میرے خدا وہ دیکھ کیا جاتا رہا
ویسے ہی نردوش کی قسمت میں تھی محرومی
اُس کے جانے سے مگر کچھ بھی تھا جاتا رہا

محمد یوسف ثاقی پالوی . . . .

مبارک اختر

کچھ دنوں کی بات ہے ثاقی صاحب سے ان کے بارے میں میں نے کچھ لکھنے کے لئے اصرار کیا۔ جواب زیرِ لب مسکراتے ہوئے میری بات کو ٹال گئے۔ ان کے بارے میں جو کچھ تھوڑی بہت معلومات مجھے ذاتی طور پر معلوم ہیں انہیں ذیل میں قلم بند کر رہا ہوں۔

بہ مقام سوجت۔ ۲ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو پالی کے قریش گھرانے میں ان کا جنم ہوا۔ ابتدائی اردو فارسی کی تعلیم مولانا محمد سالم اعظمی مفتی پالی مارواڑ سے حاصل کی۔ بعد ازاں پرائیویٹ طور پر میٹرک کیا۔ شاعری میں مولانا محمد ابراہیم صاحب ماہر جانشین خاک اجمیری سے شرف تلمذ حاصل ہے۔

ثاقی صاحب جسمانی اعتبار سے نحیف و کمزور نظر آتے ہیں۔ ان کا ہمیشہ کھویا کھویا رہنا ان کے شاعرانہ پن کی دلیل ہے۔ اکثر و بیشتر ان کا زہریلا تبسم ان کے ماحول کی عکاسی اشعار میں کرتا نظر آتا ہے۔

ثاقی صاحب نے ۱۰ سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا اس کم سنی میں ان کا یہ شعر خاصی داد حاصل کر چکا تھا ؎

جنونِ عشق کچھ تو کام کر جا
مرا بھی عاشقوں میں نام کر جا

ثاقی نے پہلے پہل رنگِ قدیم میں شعر کہے۔ مگر حالات کو دیکھتے ہوئے انہیں بھی جدید رنگ اختیار کرنا پڑا اور آج کل وہ جدیدیت کے بری طرح سے قائل ہیں۔ ان کے کلام کا نمونہ ملاحظہ فرمایئے۔

(۱)

سناؤں حالِ دل کس کو کوئی کامل نہیں ملتا
نہیں ملتا کہیں درمانِ دردِ دل نہیں ملتا
جہاں جاؤ جدھر دیکھو گلہ ہے بیوفائی کا
یہی شکوہ ہے دل کی سکونِ دل نہیں ملتا

ہماری کشتیٔ اُمید کو بحرِ حوادث میں
گماں ہوتا ہے ساحل مگر ساحل نہیں ملتا
نہ ہو پہچان کچھ اچھے بُرے کی جنکو اے ثاقی
ہم اُن سے کیا ملیں جن سے ہمارا دل نہیں ملتا

(۲)

عقل حیراں ہے جہاں جدت کا ساماں دیکھ کر
رو رہا ہے دل وہیں تخریبِ انساں دیکھ کر
مجھ سے دیوانے بہت تھے ان کی محفل میں مگر
چیخ اُٹھے سب مرا چاکِ گریباں دیکھ کر
تم نوازو اپنے قدموں سے مری خاکِ لحد
یوں نہ پلٹو دور سے گورِ غریباں دیکھ کر

---

(۳)

یہ واقعہ ہے حقیقت میں آج بھی ہم لوگ
خود اپنے شہر میں لگتے ہیں اجنبی ہم لوگ
خلوص و پیار سے جو بھی ملے وہ اچھا ہے
انہیں فریب کی راہوں میں ہیں ابھی ہم لوگ
ہمارے سامنے رہتی تھی جو جھکی ہر دم
اُسی نگاہ میں ہیں آج اجنبی ہم لوگ
زبانِ وقت بتا دے گی یہ کہ ہم کیا ہیں
تری نگاہ میں ناکام ہی سہی ہم لوگ
اندھیرے مکر و ریا کے نگل گئے ہیں جسے
خلوص و پیار کی لائے تھے روشنی ہم لوگ
صلہ وفا کا ہمیں یہ قبول ہے ثاقی
کہ تیرے شہر میں بدنام ہی سہی ہم لوگ

اپنے سٹیشن کو صاف رکھئے

- اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ صاف ستھرا ماحول ایک طرف کسی شخص کے کردار کا آئینہ دار ہوتا ہے اور دوسری طرف اس کردار کو نکھارتا ہے۔ صاف ستھرا گردو پیش خوشی اور مسرت بکھیرتا رہتا تھا۔
- ہم اپنے گھر کو صاف ستھرے رکھتے ہیں تو پھر ان جگہوں کو صاف شفاف کیوں نہ رکھیں جنھیں ہم سب استعمال کرتے ہیں۔
- ریلوے پلیٹ فارموں، ویٹنگ روموں، سواری ڈبوں اور درحقیقت ان تمام جگہوں کو جہاں بڑی تعداد میں لوگ اکٹھے ہوتے ہیں گرد و پیش کو صاف شفاف رکھنا بہت ہی ضروری ہے۔

ریلوے نے صفائی مہم شروع کی ہے جس کے بہت اچھے نتائج نکلے ہیں۔ اب ریلوے صاف ستھرے نظر آتے ہیں۔ لیکن ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس سلسلے میں ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ ہم زیادہ صفائی کے لئے اپنی کوششوں کا سلسلہ جاری رکھیں گے۔

آپ بھی اس سلسلہ میں ریلوے کی مدد کر سکتے ہیں۔ آپ صرف اتنا خیال رکھیں کہ آپ کے آس پاس کی جگہ بالکل صاف شفاف حالت میں رہے۔ اس طرح اسٹیشن اور منسلکہ مقامات صاف ستھرے رہ سکتے ہیں اور ہاں آپ ریلوے صفائی محکمہ کے کارکنوں کی خدمات سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ وہ صرف آپ کی خدمت کے لئے ہی رکھے گئے ہیں۔

آپ بھی ذرا خیال رکھئے کہ کوڑا کرکٹ آپکے ہاتھ سے اِدھر اُدھر نہ بکھرنے پائے بلکہ کوڑا دان میں پھینکا جائے آپ کا یہ معمولی سا کام ہمیں آپ کی بہتر خدمات کرنے میں کافی مدد دیتا ہے۔

ریلوے آپ کی پراپرٹی ہے۔ اسے صاف شفاف رکھئے

ناردرن ریلوے

مشاعرہ یومِ احسان رتلامی

کرمی الاحسانی

آیئے میرے ساتھ روئی فیکٹری رتلام کے وسیع میدان تک چلئے۔ حدِ نظر تک فرش اور روشنی وغیرہ کا معقول انتظام کیا گیا ہے۔ یہ مشاعرہ رتلام کے اُستاد شاعر حضرت احسان مرحوم کی یاد میں ۱۱ر مارچ ۱۹۸۰ء کی شب میں دس بجے منعقد ہو رہا ہے۔ سامعین نہایت خاموشی سے آکر فرش پر بیٹھتے جا رہے ہیں۔ جناب ای اے خان صاحب ڈی۔ ایس ویسٹرن ریلوے، جناب عباسی صاحب بیرسٹر، مسٹر شیو کمار جالانی صدر میونسپل بورڈ رتلام، جناب ڈپٹی کلکٹر صاحب وغیرہم معزز حضرات تشریف فرما ہیں۔ اب وہ خنکی ہے نہ تند و تیز ہوائیں چل رہی ہیں۔ ماحول نہایت خوشگوار اور پُرسکون ہے۔ ایک طرف خواتین بھی تشریف فرما ہیں۔ دانش صاحب عملی طور پر سیکریٹری بزم ادب جیسی ادبی تقریبات کے روحِ رواں ہیں اور سال میں ایک دو مشاعرے ایسے کرا دیتے ہیں کہ جن کی تعریف ہوتی ہے۔ اب آپ صدارت کے لئے اعلان فرما رہے ہیں جس پر تالیوں سے اظہارِ خوشنودی کیا جا رہا ہے۔ رشد لےتے ترام میں ہوچکا تھا۔ اور مظفر رزمی دیر تک تالیوں سے ہنگامہ کرتے رہے۔ اس وقت رتلام کے معزز شہری کئی برگزیدہ ہستیاں اور قابلِ احترام حضرات موجود ہیں۔ لیکن دانش صاحب کو داد دیجئے کہ انہوں نے ان حضرات کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک ایسے شخص کا نام پیش کر دیا جسے اُردو ادب اور شعر و شاعری میں کوئی درجہ حاصل ہے نہ مقام، نہ وہ سیاست میں شہرت رکھتا ہے۔ اور اس کی کوئی نمایاں شخصیت بھی نہیں لیکن آپ بھول رہے ہیں کہ جب بھی کسی تقریب وغیرہ کی صدارت کا انتخاب کیا جاتا ہے تو اس میں عوام الناس کی تائید بھی حاصل ہوتی ہے خواہ مخواہ یہ چنا و کبھی نہیں ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ چناؤ بھی عوامی اور کم از کم بزمِ ادب کے اراکین کی تائید سے ہی ہوا ہوگا۔ آپ یہ پڑھ کر اور سن کر نہایت ہی خوش ہوں گے کہ آج کے مشاعرہ کی صدارت کے لئے آپ کے جانے پہچانے دوست اور خادمِ اُردو کرمی الاحسانی کا نام پیش کر کے پھولوں کے ہار پہنائے جا رہے ہیں جس پر سب لوگ مبارکباد پیش کر رہے ہیں اور میں چپ ہوں اور دل ہی دل میں اپنا شعر برادرم دانش کا نام لے کر گنگنا رہا ہوں ؎

ہنستا ہوں میں اس بات پہ تنہائی میں پہروں

کیا لوگ مرے نام سے مرعوب رہے ہیں

پھر مہمان شعراء کی گلپوشی کی جا رہی ہے اور ساتھ ہی ساتھ جناب عزیز انصاری کارکن ریڈیو اسٹیشن اندور نظامت کے فرائض انجام دینے کے لئے مائک سنبھال کر فرما رہے ہیں اب وقت کا تقاضا ہے کہ مشاعرہ کی کارروائی شروع کی جائے۔ ہر کام کے لئے ایک رہبر کی ضرورت ہوتی ہے اور کیوں نہ اب میں رہبر رتلامی کو ہی زحمتِ سخن دوں اور وہ آکر اپنا کلام سنائیں۔ رہبر صاحب فرما رہے ہیں ؎

آج روداد غمِ ہجر سنا دی کس نے

میرے رِستے ہوئے زخموں کو ہوا دی کس نے

کیوں بھٹکتی ہے زمانے میں یتیموں کی طرح

میری تقدیر بتا تجھ کو سزا دی کس نے

داد کا شور کم ہوا تو ارشاد ہوا ہے ؎

ہمسفر کوئی نہ تھا اور کوئی رہبر بھی نہ تھا

پھر مجھے راہ ترے گھر کی بتا دی کس نے

رہبر صاحب خوب داد وصول کئے جا رہے ہیں اور

دلی میں جنتا انتظامیہ
نمایاں کامیابیاں

دیہی ترقی
- ★ ۴۳ کروڑ روپے کے تقاوی قرضوں کی تقسیم
- ★ پینے کے پانی کی اسکیم کے لئے ۴۵ لاکھ روپے
- ★ ۹۲ ٹیوب ویل کنکشن دیئے گئے ۵۰۰ جلد دیئے جائیں گے

ہریجن بہبود
- ★ ہریجنوں کے لئے ۵۰،۰۰ لاکھ روپے کے وظائف
- ★ ہریجنوں کو مکان بنانے کے لئے ۲۴،۵۰ لاکھ روپے کی مالی امداد
- ★ ہریجن طلبہ و طالبات کے لئے ہوسٹل۔ رہائش و خوراک مفت
- ★ مزدور طبقہ کے ٹریڈ یونین عہدیداروں کی بحالی

مزدور بہبود
- ★ صنعتی امن　　پیداوار میں اضافہ
- ★ ورکروں کی شکایتوں کے فوری ازالے کا بندوبست
- ★ ورکروں کے لئے تفریحات کے مواقع میں اضافہ۔ مزدور بہبود سنٹروں کا قیام

طب
- ★ شاہدرہ اور ہری نگر میں ۵۰۰-۵۰۰ بستروں والے دو اسپتالوں کی تعمیر پر ۲۲ کروڑ روپے کا صرفہ
- ★ آنکھوں کے جدید اسپتال کی تعمیر پر ایک کروڑ روپے کا صرفہ
- ★ دیہی علاقوں کے لئے ۱۰۰-۱۰۰ بستروں والے ۷ اسپتال اور ۱۸ ڈسپنسریاں۔

تعلیم
- ★ ۱۴۵۰۰ طلبہ کے لئے تکنیکی تعلیم و تربیت
- ★ غریب طلبہ و طالبات کے لئے مفت وردیاں و کتابیں
- ★ ۲۳،۵۰ لاکھ روپے کے وظائف
- ★ ۱۰۰۰ تعلیم بالغان کے سنٹروں کا قیام

صنعت
- ★ غیر منظور شدہ علاقوں میں ۲۴۰۰۰ صنعتی اکائیوں کے لئے لائسنس
- ★ ۴۴،۵ کروڑ روپے کی لاگت سے ٹول روم اور تربیتی مرکزوں کی تعمیر
- ★ نریلہ میں ۶۲۰ ایکڑ رقبہ میں صنعتی بستی کی اسکیم تیار
- ★ ۴۸ کمیونٹی ڈیولپمنٹ سنٹر: ۵۶۰۰ لوگوں کو روزگار

رہائشی مکانات کا انتظام
- ★ رہائشی مکانات کی تعمیر کے لئے ہاؤسنگ بورڈ بنانے کا فیصلہ
- ★ ہر سال ایک لاکھ مکانات تعمیر کرنے کا نشانہ
- ★ نو آباد کالونیوں میں بجلی کے کنکشن اور دیگر شہری سہولتیں

چار سال میں مکمل نشہ بندی
اس سمت میں پہلے مرحلے کا آغاز

جاری کردہ: محکمہ اطلاعات و اشاعت: دلی انتظامیہ - دلی

عزیز صاحب فرما رہے ہیں۔ یہ ہیں آپ ہی کے شہر کے ایک نوجوان شاعر جنہیں سن کر یہ اندازہ ہوا کہ مستقبل میں یہ ترقی کریں گے اور اب آپ ماہر رتلامی سے ان کا کلام سنئے۔ ماہر صاحب فرما رہے ہیں ؎

یہ نہ سمجھیں نہ سمجھیں گے زمانے والے
خود ہی مٹ جاتے ہیں اوروں کو مٹانے والے
دل کی بستی میں جلا کرتے ہیں یادوں کے چراغ
یوں تو جانے کو چلے جاتے ہیں جانے والے
انقلابات زمانہ ارے توبہ توبہ
راستہ بھول گئے راہ بتانے والے

ماہر صاحب بھی تالیوں کے شور میں داد لوٹتے جا رہے ہیں اور عزیز صاحب فرما رہے ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں لائٹ والے بڑی دیر سے کوشش کر رہے ہیں روشنی کے لئے آپ آگے سرک گئے جو حضرات پیچھے کھڑے ہوئے ہیں وہ بیٹھ جائیں اور ؎

حرم و دیر کے منظر نہیں دیکھے جاتے
اب نظر والوں سے پتھر نہیں دیکھے جاتے

اب میں جس منظر کو پیش کر رہا ہوں وہ پتھر کا منظر نہیں ہے اور وہ ہے منظر بھوپالی۔ منظر صاحب غزل سرا ہیں ؎

میں ہوں نادان ہر اک بات سمجھتا تو نہیں
مسکراہٹ مرے زخموں کا مداوا تو نہیں

شیخ نے نصیحت تو بہت ہی اچھا ہے ——— ہوش نعمانی ——— اور کے میم پر منظر صاحب پیش پڑھ رہے ہیں اور آپ فرما رہے ہیں

ذہن کی جھیل میں یادوں کے نہ کنکر مارو
دائرے اور بڑھیں گے کوئی اچھا نہیں

پھر داد لفظ عروج سے سوا ہے اور آپ فرما رہے ہیں ؎

ڈاکیئے سے یہی پوچھا ہے مہینوں میں نے
ام کا میرے کوئی آج لفافہ تو نہیں

پھر داد کا عالم ہے پھر آپ داد سمیٹے اپنی جگہ آ رہے ہیں اور عزیز صاحب فرما رہے ہیں۔ یہ تھے منظر بھوپالی

شعر و شاعری میں صرف شہزادوں ہی کا حق نہیں ہے۔ اس میدان میں شہزادیوں نے بھی نام پیدا کیا ہے۔ اس وقت دو شہزادیاں یہاں موجود ہیں ——— تالیاں ——— اور اب آپ ثریا سید خورشید دیواسی سے ان کا کلام سنئے۔ ثریا صاحبہ پُر وقار انداز میں فرما رہی ہیں

روٹی لے کر بیچ رہی ہے اک بیوہ تن سات گئے
روٹی دے کر بہلاتے ہیں دھن والے من رات گئے

آہ اور واہ کا ایک دھماکہ ہوا ہے اور میں سوچ رہا ہوں ثریا خورشید۔ ایم۔ اے ——— اور اسے روٹی اور بھوک سے کیا واسطہ اور مطلب ——— معزز خاندان کی شریف بیٹی اور پھر وہی کمیونسٹوں والی بات ——— ارشاد ہوا ہے ؎

وہ کیا جانے کعبہ کاشی وہ کیا جانے ملک کی خدمت
پیٹ کی آتش سے جھلسا ہو جس کا جیون رات گئے

ثریا صاحبہ کامران تالیوں کی جھنکار میں اپنی جگہ آ رہی ہیں اور عزیز صاحب فرما رہے ہیں۔ ثریا صاحبہ نے غریبی۔ بھوک۔ پیٹ اور اسی طرح کے کئی مسئلے ہمارے سامنے رکھتے ہوئے ہماری محفل کو سنجیدہ بنا دیا ہے۔ ماحول بڑی خشک ہو گیا ہے۔ چلے ایک شاعر انور بنادانی آپ کو تر کلام سنائیں گے۔ انور اس طرح محفل کو پُر نور بنا رہے ہیں

زندگی بے سر و سامان ہے قصہ کیا ہے
جس کو دیکھو وہ پریشان ہے قصہ کیا ہے
زلف [illegible] پریشان ہے قصہ کیا ہے
سایۂ کفر میں ایمان ہے قصہ کیا ہے

اس مطلع پر شاعرانہ داد دی جا رہی ہے اور آپ فرما رہے ہیں

اپنے انجام سے آج کا انسان اور
جانتے بوجھتے انجان ہے قصہ کیا ہے

انور صاحب داد وصول کئے چلتے بنے اور عزیز صاحب فرما رہے ہیں ابھی انور صاحب نے مقطع میں اپنے تجربات کی بات کہی جنہیں سب ہی انجان ملے اور اب میں بسمل رتلامی کو دعوت سخن دے رہا ہوں۔ بسمل صاحب فرما رہے ہیں ؎

تھے صاحب دل سیف بیاں حضرت احسان
اب ہو گئے مہانِ جناں حضرت احسان
ہر حال میں کرتے ہی رہے خدمت اُردو
تھے ایسے پرستار زباں حضرت احسان

داد کا شور کم ہوا تو ارشاد ہوتا ہے ؎

پہلے تو کپاس کے کھیتوں میں ہم خود ہی شرر سے بوتے ہیں
جل جاتا ہے جب دھرتی کا بدن تو خون کے آنسو روتے ہیں

داد کا عالم نہ پوچھئے اور آپ فرما رہے ہیں

یہ قبر کا سناٹا توڑ دو مستی میں کوئی نغمہ چھیڑ دو
مُردہ انہیں کہتی ہے دنیا جو تان کے چادر سوتے ہیں
اس شہر کے رہنے والوں سے اعزاز کی [illegible] رکھیں
جس شہر میں گلپوشی کے لئے تلوار وہاں بھی لیتے ہیں

پھر داد کا دھماکہ ہوا ہے اور آپ محفل کو گرما کر اپنی جگہ پلٹ رہے ہیں اور عزیز صاحب فرما رہے ہیں۔ یہ تھے بھائی بسمل رتلامی۔ ابھی انہوں نے قبر کا سناٹا والا شعر شاید اس لئے سُنایا کہ آپ سب سے زیادہ خاموش ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ شعراء کرام بھی خاموش رہیں۔ ایسی ہنسی مذاق میں ایک نومولود شاعرہ انجم زبیر کو دعوتِ موسیقی دے رہے ہیں۔ عزیز صاحب، انجم۔ احمد لحن طلعہ میں یوں الاپ رہی ہیں ؎

کوئی [illegible] نہ مسلمان بنایا جاتا
پہلے انسان کو انسان بنایا جاتا
دیر و کعبہ سے کلیسا سے بھلا کیا حاصل
قلب میں یار کو مہمان بنایا جاتا

[illegible] شعر و ادب نے ہنگامہ کا روپ دھار لیا ہے اور آپ [illegible] سے اعلیٰ موسیقی کا مظاہرہ فرما رہی ہیں ؎

غنچہ و گل ہی نہیں خار بھی [illegible]
ان کو گلشن کا نگہبان بنایا جاتا

انجم صاحبہ [illegible] کامراں جا رہی ہیں اور عزیز صاحب مسکرا کر فرما رہے ہیں۔ سامعین! قد کا چھوٹا ہونا اس کا مظہر نہیں ہے کہ وہ کچھ نہیں ہوتے بلکہ جن کا قد چھوٹا ہوتا ہے ان کا دماغ بڑا ہوتا ہے اور اب آپ نظر ایٹوی سے ان کی غزل سنئے۔ نظر صاحب غزل سرا ہیں۔

دُنیا تو چمکتی ہے دن رات اندھیرے میں
رہنے دو ابھی میرے حالات اندھیرے میں
افکار کے سورج پر بادل ہیں سیاست کے
ہیں آج بھی گلشن کے حالات اندھیرے میں

لیجئے داد دینے والے تالیوں پر اُتر آئے ہیں۔ ہر چند کہ غزل پرانی ہے لیکن یہاں کے لئے ہو سکتا ہے نئی ہو۔ اس لیے پھر پیش خدمت کر رہا ہوں سماعت فرمایئے ؎

اظہار تمنا پر چپ کیوں ہو زباں کھولو
اچھی نہیں لگتی ہے ہر بات اندھیرے میں
کیوں چاند سے چہرے کو زلفوں میں چھپاتے ہو
کچھ اور بھڑکتے ہیں جذبات اندھیرے میں
برباد اچانک یوں امیدیں ہوئیں اپنی
جیسے کوئی لُٹ جائے بارات اندھیرے میں

نظر صاحب محفل کو گرما کر جا رہے ہیں اور عزیز صاحب اعلان فرما رہے ہیں۔ ابھی ابھی یہ ٹیلیگرام ملا ہے بیکل صاحب کا۔ جس ٹرین سے مجھے رتلام پہنچنا تھا وہ ٹرین مس ہو گئی ہے۔ اس خبر سے سامعین اور ارکینِ بزم کو بڑی مایوسی ہوئی ——— اور مجھے کہنے دیجئے کہ اب شعراء کرام اپنے وعدہ اور زبان کا مطلق خیال نہیں رکھتے ان کو جس جگہ سے زیادہ رقم ملتی ہے وہ وہاں چلے جاتے ہیں۔ دوستی اور شناسائی کوئی نہیں جانتا

عزیز صاحب فرما رہے ہیں۔ جب بیکل صاحب کی بات چلی تو اب میں ایک ایسے ہی مترنم اور چاند سے چہرے کو پیش کر رہا ہوں اور وہ ہیں راحت اندوری۔ راحت صاحب کا نام سنتے ہی تالیاں شباب پر ہیں۔ راحت صاحب بھی پرانا کلام پیش کر رہے ہیں حالانکہ دوسرے دور میں کئی شعراء نے تازہ کلام سُنا کر رُوح خوش ہو گئی سُنئے

جب میں دنیا کے لئے بیچ کے گھر آیا تھا
اندنوں بھی میرے حصے میں صفر آیا تھا

۔ اد نظر صاحب اب تو اس غزل نے سارے ملک میں چکر لگا لیا ہے بیچاری تھک گئی ہوگی۔ اس کی جان بخشی کیجئے۔ (ادارہ)

لوگ پیپل کے درختوں کو خدا کہنے لگے
ہیں ذرا دھوپ سے بچنے کو

داد کا عالم نہ پوچھئے اور آپ گرج اور برس رہے ہیں) ؎

ہاں مری عمر تو چودہ سو برس ہے لیکن
اس سے پہلے میں کئی بار ادھر آیا تھا!

اختر صاحب محفل کو گرما کر تالیوں کے شور میں جا رہے ہیں اور عزیز صاحب اختر کو ابیاری کو یاد فرما رہے ہیں۔ اختر صاحب عنایت کر رہے ہیں ؎

دامنِ زیست کو اشکوں سے بھگو لیتے ہیں
جن کو ہنسنا نہیں آتا ہے وہ رو لیتے ہیں
ہم وہ وحشی ہیں کہ جب نیند نہیں آتی ہے
طوق و زنجیر کے پہلو میں بھی سو لیتے ہیں
تم بھی گذرے ہوئے حالات کا ماتم کر لو
ہم بھی اپنے دلِ مرحوم کو رو لیتے ہیں

اختر صاحب بھی داد لوٹے اپنی جگہ آ رہے ہیں اور عزیز صاحب فرما رہے ہیں۔ اب آپ اپنے محسن رتلامی سے ان کا کلام سنئے۔ محسن صاحب فرما رہے ہیں۔

کیا خوب تھے احسان خدا مغفرت کرے
موصوف اپنے شعروں سے ہم کو بنا گئے
ہم کو دیا یہ درس کہ غم سے ہے زندگی
اور خود غمِ حیات سے دامن بچا گئے

داد کے شور میں ارشاد ہوا ہے

رفتہ رفتہ بے تکلف گفتگو تک آ گیا
آپ سے تم اور پھر وہ تم سے تو تک آ گیا

داد مطلع ہی سے شباب پر ہے۔ میں بھی چچا غالب کے اس مشہور مطلع سے لطف اندوز ہو رہا ہوں ؎

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمہیں بتاؤ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

محسن صاحب فرما رہے ہیں ؎

اب خدا حافظ ہے ناموسِ وطن کا دوستو
ہاتھ گلچیں کا گلوں کی آبرو تک آ گیا

محسن صاحب داد پا کر مائک سے جدا ہو رہے ہیں اور عزیز صاحب سعید صحرائی ٹونکی کو زحمتِ سخن دے رہے ہیں۔ سعید صاحب فرما رہے ہیں ؎

کیا سرِ نیاز میرا ترے در پہ خم نہیں ہے
دیر پرست دنیا مجھے اس کا غم نہیں ہے
ترے آستاں کی رفعت تو خدا ہی جانتا ہے
وہ ہے آنکھ کونسی جو ترے غم میں نم نہیں ہے

سعید صاحب داد لوٹے اپنی جگہ پلٹ رہے ہیں اور عزیز انصاری صاحب عطا کر رہے ہیں ؎

نور ہی نور اندھیروں میں ہے دیکھا جائے
ان کی زلفوں کی گھنی چھاؤں میں بیٹھا جائے
میرے چہرے کو بڑے غور سے دیکھا تم نے
میرے دل میں بھی کبھی جھانک کے دیکھا تم نے

اس شعر پر داد نقطۂ عروج سے سوا ہے اور آپ عنایت کر رہے ہیں ؎

زیست ٹھہری کسی جھیل کا پانی جیسے
اس میں پتھر ہی اٹھا کر کوئی پھینکا جائے

پھر آہ اور واہ کا ایک دھماکہ ہوا ہے اور آپ اسی عالم میں اپنی جگہ آ کر جاوید ہوا کی کو یاد فرما رہے ہیں۔ جاوید صاحب رواں دواں سنا کر چلتے بنے۔ آئیے پھر مشہور مترنم اور غزل گو شاعر دانش علی گڑھی سے صرف چار مصرعے سنئے۔ بخل سے کام لے کر تالیوں کے شور میں جا رہے ہیں۔ یہ ان کی شرافت ہے ورنہ بزم کے سکریٹری کے ناتے سے وہ زیادہ سے زیادہ سناتے سنئے ؎

شامِ غم ہجر کے صدمات نہ جینے دیں گے
مجھ کو جلتے ہوئے جذبات نہ جینے دیں گے
اب کرم آپ کریں بھی تو نتیجہ کیا ہے
اب یہ بگڑے ہوئے حالات نہ جینے دیں گے

دانش صاحب داد پا کر پھر انتظام میں جٹ گئے ہیں اور عزیز صاحب دعوتِ غزل دے رہے ہیں ڈاکٹر رہبر کو۔ رہبر صاحب بور، موسیقی کا مظاہرہ فرما رہے ہیں۔

یہاں کوئی بھی اہلِ دل نہیں ہے
یہ شاید آپ کی محفل نہیں ہے
ابھی وہ ناآشنائے دردِ دل ہیں
ابھی میرا جنوں کامل نہیں ہے
اگر عزمِ سفر کامل ہے رہبر
تو فکرِ دوریٔ منزل نہیں ہے

رہبر صاحب محفل کو چونکا کر داد وصول کئے چلتے بنے اور عزیز صاحب رزاق انور دھولپوری کو زحمتِ سخن دے رہے ہیں۔ انور صاحب یوں ترنم گر عنایت کر رہے ہیں ؎

دنیا کی کسوٹی پہ پورے وہ اُترتے ہیں
جو لوگ زمانے کے ہر غم سے گزرتے ہیں
کیا سلسلہ باندھا ہے یاروں کی نوازش ہے
اک زخم نہیں بھرتا سو زخم اُبھرتے ہیں
اک سلسلہ چلتا ہے ذہنوں میں سوالوں کا
ہم آپ کی بستی میں دم بھر جو ٹھہرتے ہیں

انور صاحب خوب داد و تحسین پا کر جا رہے ہیں اور عزیز صاحب سلطان کلیم سے درخواستِ کلام کر رہے ہیں۔ کلیم صاحب یوں لحنِ داؤدی میں غزل سرا ہیں ؎

حادثے جیسے ہوتے ہیں موسمِ جوانی میں
سب سے بیش قیمت ہیں اپنی زندگانی میں
کوئی حضرتِ واعظ پارسا نہیں ہوتا
سب سے بھول ہوتی ہے موسمِ جوانی میں

داد کا ایک دھماکہ ہوا ہے کہ بار دوبارہ عنایت کر رہے ہیں ؎

ظالموں کے دھوکے میں [illegible] کے جو نکل آئے
ورنہ ہاتھ دھو لیتے ہم کبھی بہتے پانی میں

دوسرے مصرعے پر پھر ایک ہنگامہ سا ہنگامہ ہے — اللہ کرے یہ سچ ہو — ہوش — اس پر ایک قہقہہ بلند ہوا ہے اور بزرگوار فرما رہے ہیں ؎

ہنس کے پوچھنے والے حال ہم غریبوں کا
ہے ستم بھی پوشیدہ تیری مہربانی میں

کلیم صاحب محفل کو رنگ پر لا کر تالیوں کے شور میں کامران پلٹ رہے ہیں اور عزیز صاحب دعوتِ نغمگی دے رہے ہیں ہوش نعمانی کو۔ ہوش صاحب غزل سرا ہیں ؎

وہ دیکھنے میں تو شیشہ نہیں تھا لوہا تھا
مگر جو ہاتھ لگایا تو ریزہ ریزہ تھا
جو سبز پتوں پہ شبنم کو موتی کہتا ہے
وہ بچپنے میں بہت سیپیوں سے کھیلا تھا
بڑا ہجوم رفیقوں کا تھا قیام کے وقت
مگر سلام جو پھیرا تو میں اکیلا تھا
چودہ برس تک آگ میں جل کر میں جب اٹھا
قدموں پہ خشک ہو کے سمندر چلا گیا

ہوش صاحب محفل کو چونکا کر تالیوں کے ہنگم میں پلٹ رہے ہیں اور عزیز صاحب یاد فرما رہے ہیں ساحر بالسواڑوی کو۔ ساحر صاحب فرما رہے ہیں ؎

ہم اشکِ غم بہاتے رہے ہیں تمام رات
دل کی لگی بجھاتے رہے ہیں تمام رات
اس خوف سے کہ ان کی جبیں پر نہ بل پڑے
مونہہ یوں چھپاتے رہے ہیں تمام رات

ساحر صاحب ہوش کے بعد جمے تو گئے لیکن وہ بات نہ بنا سکے جس کا اس وقت تقاضا تھا۔ یہ الگ بات کہ نظام سے ادب نواز ہر شاعر کو مسکرا کر داد و تحسین سے نواز رہے ہیں۔ لیجئے اب اس جمود کو توڑنے کے لئے فرید ایوبی جے پوری اپنی نغمگی کا مظاہرہ فرما رہے ہیں ؎

جو زندگی میں کھلے تھے کبھی بہار کے پھول
غضب ہوا کہ وہی بن گئے مزار کے پھول
کھلے ہوئے جو گئے ہیں تو سارے ہار کے پھول
فسردہ ہو گئے رکھے ہی تھے اتار کے پھول

داد نے پھر بونگ کا روپ دھار لیا اور آپ اسی ہیچ سے محفل کو گرما رہے ہیں ؎

یہ سوچ کر کہ کہیں یہ بھی پائمال نہ ہوں
گلے اٹھا کے لگائے ہیں رہگزار کے پھول"

یہ محبت کا حق ادا نہ ہوا
کھلائے گی نہ اگر ہم دلوں میں پیار کے پھول

زخمی صاحب تالیوں کے شور میں مائک سے جدا ہو رہے ہیں اور عزیز صاحب مظفر رزمی کیرانوی کو دعوت نغمگی دے رہے ہیں۔ میری درخواست پر رزمی صاحب ایک تازہ اور شگفتہ غزل نہایت بانکپن سے یوں چھیڑ رہے ہیں ؎

سب کو انجام سے آگاہ کئے جاتا ہے
وقت آواز پہ آواز دیئے جاتا ہے
ناخدا اپنی بھی کوتاہی کا احساس کرے
کیوں مقدر ہی کو الزام دیے جاتا ہے
زندگی ٹھوکریں کھاتی ہوئی پھرتی ہے مگر
آدمی ہے کہ بہرحال جیئے جاتا ہے
اس سے کیا ہوگا کوئی دامن صد چاک رفو
وہ جو اپنے ہی گریباں کو سیئے جاتا ہے
ڈوبنے والے کو آواز کوئی دے کہ نہ دے
ڈوبنے والا تو آواز دیئے جاتا ہے

دو کا دھماکہ ہوا ہے کہ بس کچھ نہ پوچھئے رزمی صاحب کئی بار دہرا کر تالیوں کے شور میں شاداں پلٹ رہے ہیں اور ادھر عزیز صاحب حاذق احمد آبادی زحمت سخن دے رہے ہیں حاذق صاحب کو اہل رتلام نے قربانی کا بکرا نہ بننے دیا بلکہ شن ہی لیا ورنہ رزمی صاحب کے بعد کسی ایسے ویسے شاعر کا جمنا ذرا مشکل ہی ہوتا ہے۔ ہاں تو دیکھئے حاذق صاحب فرما رہے ہیں ؎

بزم ادب کو پھر وہ نگہباں نہیں ملا
سر دلعزیز ایسا تو انساں نہیں ملا
استاد فن تو سیکڑوں حاذق ہمیں ملے
لیکن جواب حضرت احساں نہیں ملا

آپ جا رہے ہیں اور اس عالم میں اپنے کریمی الاحسانی سے یہ تازہ اشعار سن کر ممنون کرم فرمائیے۔ ؎

ستم شعار ہیں ہم اس زمانے والے لوگ
ہمارے نام پہ تھوکیں گے آنے والے لوگ
وہ غمگسار و ہمدرد و جاں نثار و رفیق
وہی تھے وقت پہ آنکھیں چرانے والے لوگ
یہ جانتے ہیں کہ پتھراؤ ہونے والا ہے
وہ شیش محلوں سے بھاگے لڑانے والے لوگ
عجیب حال پریشاں سے آج ہیں دوچار
سرور و رقص کی محفل جمانے والے لوگ

اس وقت دو ہو چکے ہیں۔ پہلا دور نہایت سکون کے ساتھ سنا گیا ہے۔ دوسرا دور تقریباً سوا چار بجے تک جاری رہا۔ شعراء کرام ہی اسٹیج سے غائب ہوئے ورنہ سامعین جمے بیٹھے رہے اہل رتلام مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس نشست مشاعرہ کو کامیاب کرا کر یادگاری اور لاجواب بنا دیا اور ساتھ ہی اراکین بزم ادب اور شہر کے معزز حضرات بھی لائق صد تحسین ہیں کہ انہوں نے مہمان شعرا کے شایان شان خلوص و محبت اور مہمان نوازی کا ثبوت دیا۔ جناب دانش صاحب علی گڈھی کے ایک قریبی رشتہ دار کا ایک ہفتہ قبل انتقال ہو گیا تھا لیکن انہوں نے اس کا اظہار مشاعرہ کے بعد کیا اور اس مشاعرہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے اور کامیاب کرانے میں شب و روز ہمہ تن مصروف رہے۔ یہ ان کا ظرف ہے۔ دانش صاحب کی محنت اور جدوجہد پر ہزارہا سلام اور مبارکباد ــــ اور کیا عرض کروں ؎

اب بھی وہ منظر فردوس نظر میں گم ہے
بزم یاراں سے کہ جی کو چلے دیر ہوئی

ودیا پرکاش سرور تونسوی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے لیتھو کے صفحات خواجہ پریس جامع مسجد دہلی میں اور سرورق اور دیگر بلاک پائلٹ پریس میں چھپوا کر دفتر شان ہند فلیٹ ۵ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۰۰۰۱۱۰۲ سے شائع کیا۔

امتیاز جے پوری

میرا نام امتیاز حسین اور تخلص امتیاز ہے۔ اپنے نام ہی سے تخلص کا فائدہ اٹھایا ہے۔ اس وقت میں اپنی زندگی کی چھبیس بہاریں خزاں دیکھ رہا ہوں۔ خزاں اس لئے کہ کبھی مسرت افزا بہاروں کا منہ نہ دیکھا۔ زندگی بے مقصد گزرتی رہی۔ ابھی تک صنف شاعری میں میرا کوئی استاد نہیں۔ اور نہ ہی میں نے اس کی ضرورت محسوس کی۔ کیونکہ دنیا کی ٹھوکریں، احباب کی مطلب پرستی اور دنیا کی بے وفائی نے مجھے ایک خود ساختہ شاعر بنا دیا

شاعری کا شوق بچپن سے ہی سائے کی طرح میرے ساتھ ہے۔ میرا وطن جے پور ہے مگر کمسنی میں ہی والدین کے ہمراہ گجرات کی سرزمین احمد آباد میں آکر مقیم ہوا اور یہیں پروان چڑھا۔ سکول کے زمانہ میں ابھرتی تمناؤں کے سہارے ہر صنف شاعری میں لکھنا شروع کیا اور سکول کی تقریبات میں انہیں پیش کرتا رہا۔

ابتدا ہی سے مجھے ادبی ماحول، باذوق ساتھی اور شریف طبیعت کے لوگ اچھے لگتے ہیں۔ اس تعارف کے بعد نمونۂ کلام کے طور پر غزل پیش کرتا ہوں۔ ملاحظہ فرمایئے۔

غزل [1]

غیر ممکن ہے سزا دیں گے زمانے والے
کیا خدا ہیں جو مٹا دیں گے زمانے والے

جب بھی آئے گا بلا وقت کسی انساں پر
تو بچا ہوں سے گرا دیں گے زمانے والے

تشنگی عیش و مسرت و ہوس کی خاطر
اپنی جاگیر لٹا دیں گے زمانے والے

اپنی منزل کی طرف سوچ کے بڑھنا ہوگا
ورنہ دیوانہ بنا دیں گے زمانے والے

رہ کے باہوش کرو دورِ ترقی ورنہ
امتیاز ہوش اڑا دیں گے زمانے والے

[1] بلا انتخاب (ادارہ)

ایم۔ قمر مانجھوی

میری ابتدائی تعلیم اردو فارسی مدرسہ اسلامیہ اورنگ آباد ضلع گیا میں ہوئی اور انگریزی کی تعلیم پولیس ضلع اسکول سے میٹرکولیشن کرنے اور ملازمت کے لئے سرگرداں رہا اور ان دنوں میں ایک کولری میں بائیس سال سے ملازم ہوں۔ مگر مجھے ۱۹۲۵ء سے ہی جمشید پور میں تحصیل علم کے دوران ہی اپنے قبلہ محترم بزرگوار مرحوم رضا سہسرامی کی بلند پروازی تو میسر نہ ہوسکی مگر فن شاعری، ترکیب الفاظ، رنگِ تخیل، اندازِ شعور، جذبۂ فکری، سادگیِ کلام اور انتخابِ اشعار کا سلیقہ مجھے ترکہ میں ملا۔ اس لئے مجھے استاد والد محترم کی بلند پایہ شخصیت پر فخر حاصل ہے۔

ایک غزل ملاحظہ فرمایئے۔

غزل [1]

قسمت میں سیں رات اِدھر ہے نہ اُدھر ہے
اک شب کی ملاقات ادھر ہے نہ اُدھر ہے

اک جلوۂ بے نام کی اللہ رے نوازش
تاریکیِ لمحات ادھر ہے نہ اُدھر ہے

خاموشیِ ماحول میں سہمے ہیں نظارے
ساون کی حسیں رات اِدھر ہے نہ اُدھر ہے

اپنے ہی خیالات میں ہے کھوئی ہوئی کب سے
وہ چشم عنایات اِدھر ہے نہ اُدھر ہے

کیا بات ہے لو دینے لگے پیار کے دیپک
شکوے کی کوئی بات اِدھر ہے نہ اُدھر ہے

کیا حسن و محبت کی قمر گم ہوئی تصویر
آئینہ جذبات ادھر ہے نہ اُدھر ہے

[1] بلا انتخاب (ادارہ)

کاروانِ سخن

بی ایچ ای ایل بھوپال کا مشاعرہ

احمد شامل

بھوپال ہندوستان کے قلب میں بسا، شعر و ادب کا مرکز ہے اور بھوپال کی جدید تعمیر میں بی ایچ ای ایل کا کردار نمایاں حیثیت کا حامل رہا ہے۔ بی ایچ ای ایل ٹاؤن شپ اپنی گوناگوں خصوصیات کی بنا پر بذات خود ایک چھوٹا ہندوستان ہے جہاں مختلف تہذیبوں، زبانوں، رنگوں اور مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگ اکھٹے رہتے ہیں۔ آپس میں ملتے جلتے ہیں اور قومی ایکتا کی مکمل ہم آہنگی کے گیت گاتے ہیں۔ اس ٹاؤن شپ میں ہر زبان کے بولنے والوں نے اپنے کلچر اور تہذیب سے اٹوٹ پیار کے اظہار کے لئے مختلف ادبی انجمنیں تشکیل دی ہیں۔ بھوپال میں اردو کو ہمیشہ سے مرکزیت کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ شہر میں گوکہ مختلف ادبی انجمنیں ہیں لیکن یہاں کے ادب دوست حضرات نے ۱۹۶۶ء میں کاروانِ سخن کے نام سے بھیل میں بھی ایک ادبی انجمن کی نبیاد ڈالی۔ اس انجمن کے علاوہ ملک کی مشہور انجمن ترقی اردو ہند کی ایک شاخ بھی یہاں کام کر رہی ہے۔ کاروانِ سخن کا ماضی بہت ہی شاندار رہا ہے۔ اس ادارے نے نہ صرف آل انڈیا مشاعروں کے انعقاد کے ریکارڈ توڑے بلکہ اشاعتی کاموں میں بھی سرگرمی سے حصہ لیا۔ چند وجوہات کی بنا پر یہ انجمن کچھ دن کے لئے خاموش سی رہی لیکن آخر جذبہ بے اختیار اپنا کام کر ہی گیا اور شمع سخن کے پروانوں نے کاروانِ سخن کی از سر نو تجدید کی۔

۱۹ مارچ ۱۹۸۰ء کو اس کا افتتاحیہ مشاعرہ بی ایچ ای ایل کے کلچرل ہال میں ۷ بجے شام زیر صدارت جناب عبدالحمید خاں صاحب منعقد ہوا۔ اناؤنسر کے فرائض جناب رہبر جونپوری نے انجام دیئے۔ مہمانِ خصوصی تھے ہند و پاک کے جانے پہچانے شاعر جناب شعری بھوپالی۔ بھوپال کے ۵ شعرا نے جنہیں ہندوستان میں بھی ایک اہم مقام حاصل ہے اپنے کلام سے سامعین کو سرفراز فرمایا۔ آیئے ہم آپ کو اس صاف ستھری ادبی نشست میں لئے چلتے ہیں۔

سر زمین مالوہ کی حسین رات چاند کی روشنی اپنے سینے میں ڈبوئے ہوئے جوان ہو رہی ہے اور کلچرل ہال میں شعر و ادب کے پرستار جمع ہو رہے ہیں۔ بھیل کا کلچرل ہال نہ صرف بھوپال میں بلکہ پورے مدھیہ پردیش میں اپنا جواب نہیں رکھتا خوبصورت فرنیچر اور نفیس انداز سے ترتیب دیا یہ وہ دیدہ زیب ہال شائقین کی نگاہوں کو سامانِ کیف فراہم کرتا ہے۔ اسٹیج کا پردہ گرا دیا گیا ہے۔ مہمانوں کے استقبال کے لئے جناب آنند موہن اعجاز صدر کاروانِ سخن اپنے ساتھیوں جناب نصیر پرواز، مشہور افسانہ نگار جناب فضل جاوید، جناب صفی مجیدی، جناب ایس اے خاں کے ہمراہ صدر دروازہ پر کھڑے ہیں۔ مدعوئین کی رہنمائی کے لئے جناب مسعود صدیقی اور تاج الدین تاج ہمہ تن تیار ہیں۔ شعرائے کرام کو لانے کی ذمہ داری جناب ارمان اکبرآبادی کے سر ہے جو گاڑی لے کر شہر جا چکے ہیں اور ان کی واپسی کا شدید انتظار ہو رہا ہے۔ لیجئے گاڑی آگئی ہے مہمان شعرا تشریف لے آئے ہیں۔ لوگوں کا اشتیاق بڑھتا ہی جا رہا ہے ۷ بج چکے ہیں۔ اے۔ ایچ خاں صاحب جنہیں اس مشاعرے کی صدارت کرنی ہے ابھی تک نہیں آسکے ہیں۔ اعجاز انھیں فون کر رہے ہیں اور پانچ منٹ کے

بعد ازیں سیماب شیروانی میں انہوں نے عبدالحمید صاحب کی پُر خلوص
مسکراتی ہوئی شخصیت لگا ہوا کا مرکز بن گئی ہے۔ اسٹیج پہ
پردہ اٹھا دیا گیا۔ لوگوں نے اپنی نشستیں سنبھال لیں اور بجا کر
لیا ہے۔ اعجاز صاحب شعرا سے گزارش سے درخواست کرتے
ہیں کہ وہ اسٹیج پر تشریف لے آئیں۔ شعرا اسٹیج پر آگئے ہیں۔
اعجاز صاحب نے صدارت کے لئے طے شدہ پروگرام کے تحت
[illegible] حمید صاحب کا نام تجویز کیا ہے۔ رہبر جونپوری
تائید کرتے ہیں۔ حمید صاحب صدارت سنبھال چکے ہیں۔
[illegible] نے انہیں ہار پہنایا۔ اعجاز صاحب [illegible]
مشاعرے کے مہمانِ خصوصی ہیں جناب شعری بھوپالی [illegible]
نے انہیں ہار پہنایا ہے۔ رہبر جونپوری نے مائک سنبھال
لیا ہے اور فرما رہے ہیں۔ معزز سامعین یہ مشاعرہ کارواں سخن
کے زیر اہتمام اور انجمن ترقی اردو ہند شاخ بی ایچ ای ایل کے
تعاون سے ہو رہا ہے۔ اس مشاعرے کا آغاز بی ایچ ای ایل
کے نوجوان شاعر جناب تاج الدین تاج کے کلام سے ہو رہا ہے۔ مائک پر ترنم ریز ہیں۔

جس سے سائے بھی [illegible] کا سہارا
اب وہ دیوار بھی منہدم ہو گئی
[illegible] بھی [illegible] دار کہنے لگے
اک خطا تیرے سر کی قسم ہو گئی
صرف اندیشہ بر ہمی تھا مگر
تاج کی زندگی کم سے کم ہو گئی

تاج نے بڑی خوبصورت غزل سے مشاعرہ کا آغاز کیا۔ اب
رہبر صاحب نے دوا کر گپتا کا نام پکارا ہے۔ اردو غزل بھی
عجیب صنف ہے ترقی پسندوں نے اس پر خوب کیچڑ اچھالی
حالی نے بھی غزل پر اعتراضات کئے بلکہ مقدمہ شعر و شاعری لکھ
ڈالا۔ کلیم الدین احمد نے یہ فتویٰ صادر فرما دیا کہ غزل قابلِ گردن
زدنی ہے لیکن یہ بانکی چھیل چھبیلی اپنی تمام تر رنگینیوں اور
دل فریبیوں کے ساتھ آج بھی زندہ ہے اور [illegible]
[illegible] ہوا ہے جو اس کی بقا [illegible] کی زندہ مثال
ہے [illegible] چند دنوں کے لئے دل کو بھی لگی ہے۔ نیرج نے
پہلے ہی اس کا نام گیت رکھ دیا لیکن نام بدلنے سے کیا ہوتا ہے

غزل صنفِ شاعری میں ممتاز ہے اور غزل بہرحال غزل ہے اور
ہمیشہ غزل رہے گی۔ دوا کر گپتا بھیل اکاؤنٹس میں کام کرتے ہیں۔
انہوں نے ہندی میں بڑی خوبصورت غزلیں کہی ہیں۔ ملاحظہ ہو

بدن پہ تو ہمارے دھجیاں سی ہیں
وہ زندہ لاش کی پابندیاں ہیں
نہ جذبہ ہے نہ اب احساس کوئی
ذہن اور جسم میں حد بندیاں ہیں
وہی باتیں وہی حالات ہیں پر
خبر ناموں کی بدلی سرخیاں ہیں

اب رہبر صاحب نے کاوش جذباتی کو پکارا ہے۔ کاوش بھوپال
کے نوجوان شاعر ہیں تحت میں پڑھتے ہیں۔ جدیدیت کو برت رہے ہیں کہتے ہیں ؎

فوراً کٹ کر گر جاؤ گے شمشیر مری دو دھاری ہے
راہ میں لڑنا کھیل نہیں ہے ہر دھڑکن ہتھیار ہے
چھوٹا ہے پر پیٹ بہت ہے تھے ڈھول حقیقت کا جوکل تک
آج سنا ہے ہم نے اس کو سپنوں کی بیماری ہے

کاوش کے بعد افسر صہبائی کو دعوتِ غزل سرائی دی گئی۔
افسر صاحب کا نام کافی جانا پہچانا ہے۔ افسر صاحب غزل پڑھ رہے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

آنکھوں سے جذبات کے قصے کہنا سننا خوب نہیں
ماضی کی تہذیب ہے یہ تو اب ملنا معیوب نہیں
مجھ سے مل کر خوش ہوتے ہیں دل سے نالاں رہتے ہیں
پرچھائیں سے پیار ہے اُن کو آئینہ مرغوب نہیں

لوگ انہیں خوب داد دے رہے ہیں اور وہ خوبصورت انداز میں پڑھ رہے ہیں

یہ چمکیلی دھوپ ہمارے آنگن میں کیوں آئے گی
اپنا گھر ہے قطبِ جنوبی سورج سے منسوب
اپنے اپنے غم کی صلیبیں سب ہیں اٹھائے کاندھوں پر
کس سے کہو اپنے بارے میں کون یہاں [illegible]

افسر صہبائی کے بعد بی ایچ ای ایل کے ایک اور جانے پہچانے شاعر جناب افتخار آذر تشریف لائے ہیں

جدید یت کا قائل ہے وہ بہت سلیقے سے کہتے ہیں اور سلیقے سے پڑھتے بھی ہیں ؎

نجات کیسے ملے جسم کی فصیلوں سے
جُڑا ہوا ہوں کئی خواہشوں کی کیلوں سے

ظفر نکیا ہے سماعت میں نور بکھرے گا
اُبھر رہا ہوں ابھی روشنی کی جھیلوں سے

رہیں قدیب اگ نے شجر تھی اچھا تھا
نہ جانے کتنے مسافر رُکیں گے جنگلوں سے

اب رہبر صاحب نے ظفر صہبائی کا نام پکارا ہے۔ ظفر بالکل جدید ہیں لیکن ظفر اقبال کی طرح یا محمد علوی کی طرح جدید ترین نہیں ہیں۔ بھوپال کی تہذیب ان کے مزاج میں رچی بسی ہے۔ وہ قطعات پڑھنے کے بعد و غزل سنا رہے ہیں ؎

اشک [illegible] بھری آنکھ کے در پر
جیسے سورج [illegible] دیوار پر

[illegible] پر لیا
خواب [illegible] اس کے بھیگے رخسار پر

[illegible] کی کوئی صورت نہ تھی
گالیاں ہم نے لکھ دی ہیں دیوار پر

اور لیجئے غزل کا آخری شعر ؎

میں نے دانستہ توڑا ہے [illegible]
[illegible] نغمے کی قیمت [illegible]

[illegible] صاحب تشریف لا رہے ہیں [illegible] انجم [illegible] کے ملازم ہیں لیکن [illegible] بھوپال میں [illegible] ہیں [illegible] مزاج میں غزل کی تہذیب رچی بسی ہے۔ جتنا اچھا کہتے ہیں اتنا ہی اچھا پڑھتے بھی ہیں [illegible] گداز سوز ہے کس اعتماد اور سنجیدگی کے ساتھ [illegible] سنا رہے ہیں

[illegible] کی محبت بھی ہے خودی کی طرح
جنون ہوش بھی رکھتا ہوں آدمی کی طرح

سکون ملنے لگا ہے تری رفاقت میں
ملے حسین مجھے وصل کا نہ [illegible] کسی کی طرح

ہزار خواہشیں دل میں [illegible] کے [illegible]
مجھے جب آپ نے دیکھا تھا اجنبی کی طرح

قریب رہتے ہوئے آپ خود ستاتے تھے
اور اب فراق ستاتا ہے آپ ہی کی طرح

انجم صاحب مشاعرے کو انتہائی بلندی پر پہنچا کر واپس جا رہے ہیں اور اب رہبر صاحب نے بختیار ضیار صاحب کا نام پکارا ہے۔ بختیار صاحب بہت سوچ سمجھ کر شعر کہتے ہیں۔ ان کے کلام میں تفکر کی گہرائی بھی ہے اور شعور کی گیرائی بھی۔ لیجئے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

ٹوٹتی قدروں کا چہرہ پہلے گرد و غبار
میں صدائے نارسا کا بن گیا ہوں اشتہار

عہدِ ماضی اپنی تحریروں کے افسانے میں گم
عصرِ حاضر اپنی شائستہ مزاجی پر نثار

تجربوں کی دھوپ میں ہے فلسفہ [illegible] شجر
رُت بدل جاتی ہے تو جھڑ جاتے ہیں سارے برگ و بار

عکسِ پیراہن ہیں اس کے امتیازِ رنگ رنگ
بوئے پیراہن سے قائم خوشبوؤں کا اعتبار

ضیار صاحب واپس لوٹ رہے ہیں لوگ ان کے کلام کی داد جی کھول کر دے رہے ہیں اور اب باری ہے صابر نیازی صاحب کی۔ صابر نیازی نوجوان شاعر ہیں بہت اچھا کہتے ہیں۔ ترنم سے پڑھتے ہیں لیکن وہ آج گیت پڑھنے کے موڈ میں ہیں کچھ ماحول بدلنا چاہتے ہیں۔ لیجئے وہ گیت شروع کر چکے ہیں

پنگھٹ پہ آئے گوپال گوری اسے
پواں کی گگری سنبھال گوری لے

لوگوں نے انہیں تالیاں بجا کر خوب داد دی اور رہبر صاحب نے دبی زبان سے کہا حضرات فہرست کے مطابق اب مجھے پڑھنا چاہیئے۔ اگر آپ لوگ اجازت دیں تو میں بھی کچھ عرض کرنے کی جسارت کروں اور مجمع نے تالیاں بجا کر نہ صرف انہیں اجازت دی بلکہ انتہائی مسرت سے ان کا استقبال کیا۔

رہبر جونپوری ہندوستان کے جانے پہچانے شاعر ہیں۔ [illegible] کے ملازم ہیں۔ کاروانِ سخن کے سکریٹری اور روحِ رواں

رہبر کی شاعری اپنے سلگتے ہوئے ماحول کی عکاسی ہے جہاں لوگوں کے ماتھے سے پسینہ بہا کرتا ہے۔ جہاں زندگی خواب نہیں دیکھتی بلکہ محنت کرتی ہے۔ جہاں پھول نہیں کھلتے لوہا پگھلتا ہے۔ ان کا قطعہ دیکھئے۔

زندگی اداس سورج کو فکر کے بادلوں نے گھیرا ہے
گاؤں سے جا کے روشنی لاؤ شہر میں کس قدر اندھیرا ہے

رہبر صاحب یوں تو نظمیں کافی کہتے ہیں اور مشاعروں میں ایک خاص انداز سے نظمیں ہی پڑھتے ہیں لیکن آج ان سے غزل کی فرمائش کی گئی ہے۔ وہ غزل پڑھ رہے ہیں

سل گئے ہونٹ تو ہر سانس میں سرگوشی ہے
فرطِ اظہار سے بڑھ کر مری خاموشی ہے
تشنگی ساتھ رہی عمر کی ہر منزل تک
پھر بھی سرنامہ مرے الزامِ بلانوشی ہے
جس کی ٹھوکر میں تھی منزل اسے پتھر سمجھا
قافلے والوں پہ احسان فراموشی ہے

رہبر صاحب کے بعد بھوپال کے ہی ایک اور نوجوان شاعر جناب شجاع فرخی ڈائس پر تشریف لائے ہیں۔ شجاع کی شاعری کی عمر بہت ہے وہ تقریباً پچھلے بائیس سال سے شعر کہہ رہے ہیں لیکن اپنے ابتدائی دنوں میں خاموشی سے لکھتے رہے زمانۂ طالب علمی میں حمیدیہ کالج میگزین میں کچھ ان کی غزلیں طبع ہوئی ہیں۔ ادھر چند دنوں سے وہ پوری توجہ اور انہماک کے ساتھ افقِ بھوپال پر نمودار ہوئے ہیں۔ ان کی لگن قابلِ لحاظ بھی ہے اور قابلِ تعریف بھی۔ ان کے سینے میں یقیناً ایک خوبصورت دل چھپا ہے۔ غزل میں جس کا عکس پوری طرح جلوہ گر رہتا ہے سنئے وہ تحت اللفظ میں اپنی غزل شروع کر چکے ہیں ؎

ہر اک نقش یہاں کتنا اُجالا ہے
قدم قدم پہ مسائل کی دیو مالا ہے
قدم قدم پہ درخشاں نقوش چھوڑے ہیں
ہمارے بعد اندھیرا نہیں اُجالا ہے
زمانہ روشنی ہوگی کہ آگے بڑھے گا
سحر قریب۔۔۔ سورج نکلنے والا ہے

اور اب اناؤنسر نے نام پکارا ہے رضا رامپوری کا۔ رضا صاحب بھوپال میں نئے نئے ہی وارد ہوئے ہیں لیکن ان کی شاعری کی عمر بہت پرانی ہے۔ رضا صاحب نے بھوپال کے ادبی حلقوں کو اتنی تھوڑی سی مدت میں چونکا دیا ہے اور اپنے پرستاروں میں اچھا خاصا حلقہ بنا لیا ہے۔ رضا صاحب کے یہاں روایت کا احترام ملتا ہے۔ وہ جتنا اچھا کہتے ہیں اتنا ہی والہانہ انداز میں پڑھتے ہیں۔ لیجئے ترنم سے غزل سرا ہیں

اب ذکر بہاروں میں گلوں کا بھی نہ ہوگا
تو میں نے کہا آپ نے سمجھا بھی نہ ہوگا
اچھا ہے اگر غم کا مداوا بھی نہ ہوگا
اب دل کا کبھی ہم کو بھروسہ بھی نہ ہوگا
ہاں میری محبت کی حقیقت کو نہ پوچھو
جو تم نے سنا ہے وہ فسانہ بھی نہ ہوگا

اب محفل کا رنگ بدل رہا ہے۔ سامعین اب ہنسنا چاہتے ہیں۔ رہبر صاحب نے سامعین کے اس تقاضے کو ان کی صورتوں سے محسوس کر لیا ہے۔ اور ساجد سجنی کا نام پکارا ہے۔ ساجد سجنی ریختی کہتے ہیں یعنی وارداتِ قلب و نظر اور عورتوں کی زبان میں ساجد صاحب چونکہ لکھنوی ہیں۔ اس لئے "بڑی آپا" کا انداز بہر حال انھیں آ ہی گیا ہے۔ بڑی نزاکت سے فرماتی ہیں

مجھے گھور کر اس طرح سے نہ دیکھو ہم غیرت کے مارے موئی جا رہی ہوں
کیسی ہو صاحب نگاہوں میں گرمی پسینے پسینے ہوئی جا رہی ہوں

وہ اب ریختی پڑھ رہی ہیں ؎

وہ ایک لڑکا جو کالا دکھائی دیتا ہے
مجھے وہ قیس کا سالا دکھائی دیتا ہے
وہ مجھ سے روز پڑوسن کی بات کرتے ہیں
مجھے تو دال میں کالا دکھائی دیتا ہے
کہاں پہ دوسرا بھائی گھر لے کے آئی ہو
جو ایک کان میں بالا دکھائی دیتا ہے

تالیوں اور قہقہوں کے بیچ سجنی تشریف لے گئے ہیں اور ان کے بعد تشریف لا رہے ہیں منظر فراز دانش۔ دانش نہایت سنجیدہ شاعر ہیں۔ مطالعہ ان کی عادت ہے کتابیں

ان کی کمزوری۔ بہت کم کہتے ہیں۔ سوچ سمجھ کر کہتے ہیں۔
ہنگاموں کو زندگی نہیں بنایا۔ غزل میں تجربے کرتے ہیں
لیکن محدود دائرے کے اندر۔ روایت اور فن سمجھتے ہیں
اور اس کا احترام کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

میرے ہونٹوں پہ ہنسی ہے اب کے
آزمائش بھی کڑی ہے اب کے
شاخ پر ایک بھی پتا نہ رہا
یہ ہوا کیسی چلی ہے اب کے
لوگ موسم کا اشارہ سمجھیں
فصل زخموں کی ہری ہے اب کے
پختگی جس کو یقیں نے دی تھی
وہی دیوار گری ہے اب کے

انھوں نے دوسری غزل کے چند اشعار اور بھی سنائے
جو کافی پسند کئے گئے اور اب مائک پر تشریف لا رہے ہیں
کاروانِ سخن کے نائب صدر جناب ارمان اکبر آبادی۔
ارمان صاحب جتنا اچھا کہتے ہیں اتنا اچھا پڑھتے ہیں۔
روح کی گہرائیوں میں جو کرب پال رکھا ہے انھوں نے اس کا
اثر شعر میں بھی پیدا کیا ہے اور آواز میں بھی۔ ان کی شاعری ان کی
زندگی کی آئینہ دار ہے۔ ارمان صاحب کے کلام کی سب سے
بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ آندھی میں اڑنے نہیں چاہے
ترقی پسند تحریک کا زور ہو یا جدیدیت کا سیلاب، ارمان
نے ہمیشہ وہی کہا جو ان کی زندگی پر اثر انداز ہوا۔ اسی لئے
ان کے کلام میں صداقت ہے۔ سچائی ہے۔ متانت ہے
سنجیدگی ہے۔ ارمان بھیل کے ملازم ہیں لیکن بھوپال کے
باہر کافی قدر کی نگاہ سے دیکھے اور سنے جاتے ہیں۔ انھوں نے
رباعی پڑھی

اس دور کی تقدیر بنالیں یارو	ہر زخم کو تصویر بنالیں یارو
پی پی کے یونہی تلخیِ حالات کا غم	اب زہر کو اکسیر بنالیں یارو

ارمان صاحب کی غزل کے بھی چند انتہائی نفیس شعر
سنتے چلئے ؂

ہر اک ہوا کیلئے مشکل کشا ہوں	مگر اپنے لئے اک مسئلہ ہوں
مجھے وہ زخم اپنوں نے دیے ہیں	سراپا درد بن کر رہ گیا ہوں
مجھے ... چھیڑئیے سنگِ ستم سے	میں طوفاں ہوں کہ ٹھہرا ہوا ہوں
مرتب کیجئے تاریخ مجھ سے	میں اپنے دور کا اک آئینہ ہوں

ارمان صاحب بے پناہ داد کے ہجوم میں گھرے ہوئے ہیں
وہ واپس اپنی جگہ بیٹھ گئے ہیں اور اب رہبر صاحب کہہ رہے
ہیں۔ حضرات اب میں آپ کے سامنے ایک ایسے شاعر کا نام
لے رہا ہوں جن کا نام آپ لوگوں کے لئے نیا نہیں ہے جس نے
اردو رسائل کا مسلسل مطالعہ کیا ہے۔ وہ علی عباس اُمید
صاحب کے نام سے نہ صرف واقف ہے بلکہ دل سے ان کا
قدر دان بھی ہے۔ وہ مشاعروں سے بچتے رہے ہیں لیکن ہماری
درخواست انہوں نے مان لی ہے۔ یہ ان کا خلوص ہے۔ لیجئے
وہ قطعے کے بعد غزل پڑھ رہے ہیں ؂

دل کی آنکھوں میں تھا اک خوابِ گراں دیر ہوئی
برف کے پھیل سے اٹھتا تھا دھواں دیر ہوئی
ایک اک لمحہ پہ صدیوں کا گماں ہوتا ہے
زندگی کیسے بتائیں گے کہاں دیر ہوئی
ہمسفر دوریِ منزل ہے تمہارے غم کی طرح
کھو چکا راہ میں اک اک نشاں دیر ہوئی
نامرادی سے کہو آج یہاں سے گزرے
گروہ لیا رہیت پہ ہم نے بھی مکاں دیر ہوئی

علی عباس اُمید کے بعد اب مائک پر تشریف لا رہے ہیں
کاروانِ سخن کے صدر جناب آنند موہن اعجاز۔ اعجاز صاحب
رباعیات و قطعات بڑے خوبصورت انداز میں کہتے ہیں
ان کے قطعات کا مجموعہ دھنک کے نام سے کاروانِ سخن کے
زیرِ اہتمام شائع ہو چکا ہے۔ مجموعہ کلام زیرِ ترتیب ہے۔
اردو اور ہندی میں بیک وقت چھپوانے کا ارادہ کر رہے ہیں
اعجاز صاحب زندگی کے بارے میں دو اور چار کے قائل ہیں
ان کا یہ مزاج ان کی شاعری میں بھی پوری طرح کارفرما ہے
اعجاز صاحب بھیل میں سینئر پبلک ریلیشن آفیسر کے عہدے
پر فائز ہیں۔ بہت کم کہتے ہیں مگر کافی سوچ سمجھ کر کے بعد کہتے
ہیں۔ انہوں نے حسبِ معمول چند قطعات پڑھنے کے بعد

تازہ غزل کے شعر سماعت ملاحظہ ہوں ۔

جس کو کہتے ہیں غزل دل کا اک ہوتی ہے
پھول ہوتا ہے دریا میں نہا جاتی ہے
چاندنی رات ہے وابستہ ہیں یادیں کتنی
چاند کھلتا ہے تو بیتے ہوئے پل ہوتی ہے
شکوہ کیسا ۔ کیا اس نے ہیں کم ظرف بشر
خالی پیمانوں میں کثرت سے کھنک ہوتی ہے

۔۔۔ بھوپال کے کہنہ مشق شاعر جناب سید اختر علی اختر کو پالا ہے یہ بہت دنوں سے شعر کہہ رہے ہیں اور یہاں کے ادبی حلقوں میں ایک مخصوص مقام کے حامل ہیں۔ بھوپال کی غزل کا مزاج جن عناصر سے مل کر بنا ہے ۔ اختر صاحب کے یہاں وہ عناصر بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں ۔ وہ تحت میں غزل پڑھ رہے ہیں

۔۔۔ بڑھنے سے اپنا مداوا ہو گیا
اشک جب ۔۔۔ آگ وجی بھی ٹھنڈا ہو گیا
۔۔۔ ورب بیقرار ہو گیا
کیوں قرار آتا نہیں دل کو ۔۔۔ ہو گیا

اختر صاحب نے کافی داد حاصل کی ہے ۔ اب ۔۔۔ جو نپوری صاحب نے اپنا کلام صاف کیا ہے اور گویا ہوئے ۔
اب جگہ مقام کے بیٹھو مری باری آئی

حضرات اب آپ کے سامنے کاروان سخن کے ۔۔۔ ملک کے مشہور شاعر جناب نصیر ۔۔۔ نصیر پرواز صاحب ۔۔۔ پر تشریف لے آئے ہیں ۔ پرواز صاحب ۔۔۔ سے اردو طبقے میں عزت و احترام سے لیا جا رہا ہے ۔ انھوں نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے ۔ انہوں نے بہت کہا اور عمدہ کہا ۔ آج ۔۔۔ کے اس جنگل میں ۔۔۔ مختلف تحریکات پیدا ہو رہی ہیں ۔ لوگ ۔۔۔ کی طرح دوسروں کی نقالی کرنے لگے ۔ پرواز صاحب اپنا ایک منفرد اسلوب اور اپنا لہجہ ۔۔۔ بنا یا ہے انہوں نے رباعی سنائی ہے

۔۔۔ عرفانی پہ جھوٹا ۔۔۔ ۔ حالات کی پیشانی پہ مجھ کو لکھ دے
۔۔۔ تو سمجھتے ہو ۔۔۔ پانی ۔۔۔ مجھ کو لکھ دے
۔۔۔ ۔ اپنے سحر آفریں ۔۔۔
۔۔۔ خطا ۔۔۔ رہے ہیں

میں جہاں پہنچا متاع دیدۂ تر لے گیا
۔۔۔ تھی گہری تو خوابوں کا سمندر لے گیا
۔۔۔ ہوا محسوس قدموں میں ۔۔۔ جیسے کانٹا
۔۔۔ اپنے دل پہ میرا نام لکھ کر لے گیا
۔۔۔ ہیں گلیاں دیار فکر کی
غم مرا ۔۔۔ انگلی پکڑ کر میرے ہی گھر لے گیا
سارا ہال ہمہ تن گوش ہے اور مسحور کن آواز دلوں میں اتر رہی ہے
ہر قدم ۔۔۔ قہقہہ زن تھیں مری محرومیاں
کیا کہوں مجھ کو کہاں میرا مقدر لے گیا
۔۔۔ رہے روز و شب کی ۔۔۔ کو لیا کہو
زندگی ۔۔۔ مجھ سے دن ۔۔۔ میں بچھڑ گیا

پرواز صاحب ۔۔۔ دیرپا نقش دلوں پر ثبت کر کے واپس ۔۔۔ ۔ سامعین ۔۔۔ رہے ہیں ۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ پرواز صاحب نے جس خوبصورت انداز سے یہ بہترین غزل ۔۔۔ وہ واقعی قابل داد ہے ۔ پرواز صاحب کے بعد اب مائک پر تشریف لا رہے ہیں بھوپال کے ایک اور کہنہ مشق شاعر جناب عقیدت بھوپالی ۔ حفیظ صاحب نہایت مخلص اور خلیق ہیں مزاج کے اعتبار سے معصوم ۔ اردو کی خدمت کافی عرصہ سے ۔۔۔ ہیں ۔ ان کی غزل بھوپال کے مخصوص رنگ کی آئینہ دار ہے ان کی غزل جذبات اور احساسات کی عکاس ہے ۔ وہ تحت میں پڑھ رہے ہیں ۔

آداب گلستاں کے سانچے میں جو ڈھلتا ہے
پروان حقیقت میں وہ پھول ہی چڑھتا ہے
۔۔۔ نشو و نما جس کی آغوش ۔۔۔ کی
کب طوق و سلاسل کی جھنکار سے ڈرتا ہے
اس پھول سے آتی ہے خوشبوئے وفا یارو
۔۔۔ میرے گلستاں سے توڑا ہوا لگتا ہے

حفیظ صاحب کے بعد رہبر صاحب نے الحاج محمد موسیٰ بھائی کا نام لیا ہے آپ بزرگ اور قابل احترام شخصیت کے حامل کہنہ مشق شاعر اخلاص اور سراپا اخلاص۔ انہوں نے بھوپال میں تجدید ادب نام کی انجمن بناکر اور ایک سو طرحی مشاعرے کروا کر یہاں کی ادبی تاریخ میں نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ موسیٰ بھائی غزل کہتے ہیں اور تصوف کے رنگ میں کہتے ہیں تجربے کی آنچ بہرحال ان کے ہر شعر کو کندن بنا دیتی ہے۔ تحت میں غزل سرا ہیں ؎

عصرِ نو میں کس سے اُمیدِ مسیحائی کریں
زہر ہی سب دینے والے ہیں دوا دیتا ہے کون

وہ ہیں خود یا کوئی بھولی بسری یاد ہے
دل کے دروازے پہ رہ رہ کے صدا دیتا ہے کون

میرے قصرِ دل کی بربادی میں کس کا ہاتھ ہے
میں جو دیواریں بناتا ہوں گرا دیتا ہے کون

موسیٰ بھائی کافی داد وصول کرکے جا رہے ہیں رات کے ۱۱ بج رہے ہیں۔ کلچرل ہال بھرا ہوا ہے۔ لوگ ہر شاعر کو پوری توجہ دلچسپی اور انہماک کے ساتھ سن رہے ہیں۔ داد بھی خوب دے رہے ہیں۔ شعرا بھی اپنی بہترین تخلیقات پیش کر رہے ہیں۔ مشاعرہ اپنی بلندیوں پر ہے۔ رہبر صاحب کہہ رہے ہیں ان کی فہرست میں اب صرف ایسے شعرائے کرام بچ گئے ہیں جو اپنی جگہ بلند مقام کے حامل ہیں۔ ہند و پاک میں ان کی ادبی خدمات کا اعتراف جگہ جگہ ہوا ہے۔ ان کے بارے میں کچھ بھی کہنا اپنی کوتاہ نظری کا مظاہرہ کرنا ہے۔ لیجئے اب اس سلسلے کی پہلی کڑی جناب شاہد بھوپالی۔ شاہد صاحب غزل گو اور پختہ غزل گو بھوپال کے مخصوص رنگ میں کہتے ہیں۔ بھوپال کے باہر بھی جہاں گئے ہیں اپنے دیرپا نقوش چھوڑ کر آئے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں ؎

قدم قدم پہ سہارا دیا سنبھالا ہے
تری نگاہِ کرم نے تو مار ڈالا ہے

اُٹھائیں آنکھ تو مجرم جھکائیں تو مجرم
تمہاری بزم کا دستور ہی نرالا ہے

ثبوت اس سے زیادہ مرے جنوں کا
وہ میرا نقشِ وفا ہے جہاں اُجالا ہے

نفس نفس پہ مجھے جاری ہے قیامت
بس اب فسانۂ غم ختم ہونے والا ہے

جھجک ظلمتِ شب ابھی ابھی یارو
اسی طرف سے تو سورج نکلنے والا ہے

شاہد صاحب نے خوب داد حاصل کی ہے اور اب باری ہے جناب عشرت قادری کی۔ عشرت قادری کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اردو کی خوش قسمتی ہے کہ اسے عشرت جیسا پرستار نصیب ہوا۔ آج عشرت صاحب کا شمار بھوپال کے کہنہ مشق شعرا میں ہوتا ہے عشرت صاحب پہلے ترنم سے غزلیں پڑھا کرتے تھے۔ اب وہ تحت میں پڑھنے لگے ہیں۔ ان کی غزل ان کے داخلی احساسات کی آئینہ دار ہے۔

اک خواب اور نگاہوں میں بسائیں کیسے
صبح دیکھی تھی جو تعبیر بھلائیں کیسے

انگلیاں جلتی ہیں اوراق دھواں دیتے ہیں
اپنی آواز کے شعلوں کو بجھائیں کیسے

اور کچھ لب پہ نہیں تلخ تبسم کے سوا
روح کے زخم مسیحا سے چھپائیں کیسے

ذہن میں گونجتی ہے ٹوٹتے لمحوں کی صدا
ہم حدیثِ لب و رُخسار سنائیں کیسے

سبحان اللہ کیا بہترین غزل ہے بے پناہ ہجوم کے داد میں واپس جا رہے ہیں اور اب مائک پر تشریف لا رہے ہیں جناب ارشد صدیقی۔ ارشد صاحب کا نام لیتے ہی غزل کا خوبصورت آہنگ دل و دماغ میں بیدار ہو جاتا ہے وہ کہنہ مشق شاعر ہیں انہوں نے جس موضوع کو بھی چھوا اس کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا۔ وہ میدانِ ادب میں نہایت ثابت قدمی کے ساتھ آگے بڑھے ہیں۔ ان کے کلام میں متانت ہے سنجیدگی ہے خلوص ہے۔ ان کی غزل نے جو موڑ اختیار کیا ہے اور ان کے تجربوں کی آنچ میں تپ کر جیسی نکھری ہے اس سے اُردو کو یقیناً بہت کچھ ملے گا۔ گو کہ وہ پچھلے دو ماہ سے شدید بیمار تھے لیکن ہمارے اصرار پر مشاعرے میں تشریف لائے ہیں۔ ترنم سے غزل سنا رہے ہیں ؎

پتھروں کا یہ نگر جس نے بسایا ہوگا
وہ بھی دنیا میں ہیں جیسا اکیلا ہوگا

میں نہیں ہوں یہ کسی اور کا چہرہ ہوگا
یا کہیں آئینہ میرے گھر کا ہی جھوٹا ہوگا

ہنستے ہنستے ہوئے ٹوٹے ہوئے دل جوڑ دیے
میں نہ کہتا تھا وہ شیشوں کا مسیحا ہوگا

ہاں نظر تو وہی آتا ہے مگر کچھ نہ کہو
جانے کس کام سے بازار میں آیا ہوگا
بے سبب تو نہیں ملتے نگاہوں کے خطوط
زاویہ ہے تو یقیناً کوئی نقطہ ہوگا

ارشد صاحب غزل سنا کر واپس جا رہے ہیں اور مشاعرے کے آخری شاعر ہند و پاک کی جانی پہچانی شخصیت آج کے مہمان خصوصی حضرت شعری بھوپالی کو زحمت غزل سرائی دی جا رہی ہے جناب شعری کی عظمت یہ ہے کہ دنیائے ادب میں ان کے نام سے بھوپال کا نام روشن ہوا اور سرزمین بھوپال کو ناز ہے کہ اس کی خاک سے شعری جیسا شاعر پیدا ہوا شعری صاحب کی غزل حسن وعشق کی نکتہ آفرینیوں سے عبارت ہے اور زندگی کے بے شمار حقائق بھی اس میں موجود ہیں شعری صاحب اپنا ایک الگ لہجہ ہے۔ جیسا منفرد اور والہانہ ان کے پڑھنے کا انداز ہے۔ ویسے ہی دلکش اور اچھوتا ان کی غزل کا مزاج بھی، بھوپال کی غزل نے جو اپنا مخصوص لہجہ بنایا ہے اور دلی اور لکھنؤ کے فسوں سے اپنا دامن بچایا ہے اس کا سہرا شعری صاحب کے سر بھی بندھنا چاہیئے۔ آسان لہجہ میں حقائق حسن وعشق سنیئے اور سر دھنئے۔

میری تباہیوں کا عجیب اہتمام ہے
جلوے نثار ہے ہیں محبت کا نام ہے
آزادیوں کے دور کا یہ فیض عام ہے
جینا خلاف جرم ہے مرنا حرام ہے
جو دشمن حیات ہے وہ حاصل جہاں
ایسی حسین خلش کا محبت ہی نام ہے

پہلی غزل کے بعد اب دوسری غزل کی فرمائش ہو رہی ہے

راز الفت کے لئے اس دنیا سے جا سکتا ہوں میں
خود بھی چھپ سکتا ہوں ان کو بھی چھپا سکتا ہوں میں
ضبط غم میں مشورہ دیتے ہیں کیوں رونے کا لوگ
ایسی دولت کیسے پانی میں بہا سکتا ہوں میں
چل پڑا ہوں لیکے اپنے دوش پہ بار حیات
دیکھنا یہ ہے کہ کتنی دور جا سکتا ہوں میں

اور تیسری غزل سے

تنویر محبت میں گم ہو گیا نظارہ
تصویر تو ہے ان کی اور ہم نظر آتے ہیں

شعری صاحب کے بعد فرمائشاً دوسرا دور بھی ہوا۔ جس میں سیفی صاحب، عشرت قادری، شاہد بھوپالی، ارشد صدیقی اور شعری بھوپالی صاحبان نے اپنا کلام سنایا سامعین کا اصرار ابھی اور شعرا کو سننے کا ہے مگر ہال ۱۲ بجے خالی کرنا ہے۔ لہذا رہبر صاحب نے جناب صدر عبدالحمید خاں صاحب سے اجازت لے کر تمام سامعین اور شعرا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے مشاعرے کے اختتام کا اعلان کر دیا۔ لوگ جذبات اور احساسات کا سمندر سینے میں دبائے ہال سے نکل کر گھروں کی طرف جا رہے ہیں۔ اور جناب محمد ایوب صاحب نصیر احمد صاحب مسعود صدیقی صاحب اور رضی مجیدی صاحب شعرا کی تواضع کر رہے ہیں۔ انھیں چا، پان پیش کیا جا رہا ہے اور اس طرح یہ خوبصورت مشاعرہ ۱۲ بجے شب کو اختتام پذیر ہوا ؛

رضا کا ساقی و میخانہ

اعجاز سیابی

کالی داس گپتا رضاؔ اُردو کے مثالی محقق، زبان و بیان کے خوش فکر شاعر اور ایک کامیاب تاجر ہیں۔ موصوف اُردو کی آٹھ کتابوں کے مصنف ہیں۔ ایک انگریزی کتاب بھی انگریزی شاعری کی تصنیف کی ہے۔ جناب گپتا رضاؔ کا کتبخانہ دس ہزار کتب پر مشتمل ہے۔ جس میں نایاب مخطوطات بھی قابلِ ذکر ہیں اور سب سے اہم یہ کہ آپ کے کتبخانہ کا غالبیات سیکشن (غالب کلکشن) ہند و پاک میں منفرد ہے۔ اس کا جواب نہیں ہے۔ ا۔س۔

اُردو شاعری میں جن الفاظ کو ہمہ گیریت نصیب ہے یا جنکے دامن تفہیم میں اتنی گنجائش و وسعت ہے کہ وہ ایک عالمِ خیال کا احاطہ کر لیتے ہیں۔ اُن میں ساقی اور میخانہ بہت عام الفاظ ہیں شاید ایک فیصد بھی کوئی شاعر ایسا نہو جس نے ان الفاظ سے معنی و افہام کے خزانے پر ہاتھ نہ مارا ہو۔ اُردو کی اچھی شاعری میں زندگی کی بازگشت جس جھنکار کا نتیجہ ہوتی ہے اس کی نوک پلک سنوارنے میں ساقی کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ اسی طرح واعظ، ناصح، شیخ، رند، مست، الفاظ میں ہزارہا باتیں کہی جاتی ہیں۔ ساقی و میخانہ، پیمانہ، شیخ حرم، رندِ پاکباز اور بہت سے رونق بخشنے والے الفاظ ہیں۔ جو لمحہ بھر کے لیے ہی کہیں مسافرِ وقت کو ندرت، شادابی مسرت اور وقار و وفا کی گھنی چھاؤں میں دم لینے کو ٹھہراتے ہیں۔ اور اس طرح ایک احساسِ دوریٔ منزل شکوہ و شکایت کی راہوں سے گزر کر ذہن، دل اور نظر کا بوجھ ہلکا کر دیتا ہے۔ جانے کتنے شکوے ساقی کے نام سے وقت افسر، حالات، محبوب، حکومت کے خلاف کر دیئے جاتے ہیں۔ کتنے شکریے کے لفظی تحفے نازک اندام محبوباؤں کی گود میں ساقی کے نام پر پھینک دیئے جاتے ہیں۔ کتنی دل کی باتیں، گھاتیں، واتیں، حرکتیں اِن الفاظ میں سمیٹ دی جاتی ہیں۔ اسی طرح پیمانہ و پیمانہ کا حال ہے۔ جن کے بیانیہ سہارے کے باعث بہت بڑی ادبی خدمت ہو جاتی ہے۔ گویا یوں کہیئے کہ بہت کچھ صرف ایک لفظ کے آہنگِ معنی میں سمو لینے کے لیئے اُردو نے جو الفاظ فارسی شاعری سے منتخب کر لئے ہیں۔ اُن میں ساقی، میخانہ، پیمانہ، جامِ جم، ابرِ کرم، شیشہ و خم، خم بدوش، جام و مے، میکدہ، خمکدہ، خمستان، شراب، آتشِ سیال، چشمِ ساقی، مے کہنہ، قطرہ، جام، مینا، بادہ، گردشِ پیمانہ، دورِ جام لیکن دلپسند الفاظ ہیں۔ اور پھر اُردو شعرا تو غضب کی انگڑائیاں لیتے ہیں جب مضمون باندھنے پر آتے ہیں تو جنبشِ چشم کی قیامت کھڑی کر دیتے ہیں اور جنبشِ لب سے فتنے اٹھاتے ہیں۔

یہ سب کچھ دراصل اس دور میں بہت خطرناک حد تک آگیا ہے۔ کہ اب تو غیر مرئی اشیاء، یا تصوراتی خاکوں میں بھی حقیقت کا ایسا رنگ بھرا جانے لگا ہے کہ شبِ فراق میں اندھیرے کی سفید بلی کالا دودھ پی جاتی ہے اور بیچارے عاشق نامراد کی صحت پر بُرا اثر پڑ جاتا ہے۔ یا پھر دوپہر کو انگنائی کا پرہ ناچ یا پھر مرغے کی چونچ میں سورج کا پرندہ ایسے ایسے مضحکہ خیز مضامین پڑھنے کو ملتے ہیں۔ جو طلسم ہوشربا کے غیر مانوس جنگل سے بھی آگے نکال لے جاتے ہیں۔ جہاں دودھیا چاندنی نہیں ہے، بلکہ نیلی چاندنی ہے، ہونٹ گلابی نہیں ہیں، بلکہ سبز ہونٹ ہیں۔ قاتلانہ آنکھیں نہیں ہیں بلکہ تیسری آنکھ کا دھندلاپن گہرا ہے اور مزی

کہکشاں بہ ہیکس میں ملبوس ہوتا ہے، لیکن اندھیرے کا سورج بہت حسین ہے۔ جہاں فصل نہیں پکتی، جہاں لاوا اُگلتی ہے، گیہوں کی بالیاں یا دوسرے اناجوں کے خوشے نہیں اُگتے ہیں۔ اور کبوتری کے انڈوں کی شمشان بھومی میں کھیتی ہوتی ہے۔ خون کی سینچائی ہوتی ہے، بھوت ہل چلاتے ہیں۔ گویا علامتیں کیا علامتوں کا تحفہ ہے۔ جن کا آب و رنگ کی دُنیا سے دُور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ پانی کوئی شے ہی نہیں محض وقتی اظہار کی ایک لاحاصل علامت سمجھ لیا گیا ہے۔ جس کے تحت ایک اہم تقاضے کو پورا کیا جاتا ہے اسے کچھ بھی کہہ لیجئے۔ اس کو انگریز پانی کیوں کہیں، واٹر کہتے ہیں، یا پھر فارسی داں آب کہتے ہیں نہ پانی، نہ واٹر۔ آب وہ بھی خوردن کے ساتھ استعمال کر کے جس شے کے معنی کھانا ملتا ہے۔ لیکن ہیئت مافی الضمیر کے طور پر ہر جگہ ہر ادب میں پانی کی وہی ہے جو کلاسیکل اُردو ادب میں۔

اردو کی کلاسیکل شاعری کو دُنیائے ادب میں ایک اہم ادب کی حیثیت سے مقام دلانے والے الفاظ کی ہمہ گیریت کی فہرست میں جو ابہام کے تراشیدہ ہیرے شامل ہیں۔ اُن میں ساقی و میخانہ، جام و پیمانہ، گویا خمریات کا میدان بہت اہم اور وسیع ہے۔

ہم نے رضا کے ایسے اشعار منتخب کئے ہیں جہاں ان الفاظ نے دیکھئے کس خوبصورت ڈھنگ سے تہذیبِ حیات کی عدم شائستگی کا رونا اس طرح رو لیا ہے۔ اور ذمہ بھی اپنے اوپر لیا ہے۔

محفل بھی نور بار ہے ساقی بھی خم بدوش
میرے ہی نائو نوش کا معیار گھٹ گیا

اور پھر ان رضا کو غفلت شعاری سے میخانے کے لئے رو کا ہر

کہیں فریب نہ کھاتا یہی فدائے جام
بوقت کار عجب ہوشیار نکلے گا

یہ محض تصور کی کار فرمائی ہے وہ بھی بادہ کے دم سے ہے کہ بیخودی کا قائم ہے:

بادہ کے دم سے ہے جی خوش، ورنہ
بے خودی کا رکھتا ہے، جام جم کیا

اور دیکھئے وقت و دوران سے کس اعترافِ حقیقت کے ساتھ شکوہ سنج ہے۔

دلِ ساقی میں بھی فیاضیاں اب وہ نہیں باقی
مرے جوشِ طلب میں بھی کمی معلوم ہوتی ہے

یا پھر

کبھی تجارۂ دل سے اُٹھا کرتی تھی قلقل بھی
اب اُٹھتی ہے شکستِ شیشہ و خم کی صدا تنہا

لیکن رضار جیب یاری سے یوں طلبگارِ ترنم ہے۔

کیا ساقی جُز رس سے طلبگار رہوں ہر بار۔
اے ابرِ کرم تو کہیں نیت مری بھر جا

اس کی فطرت اب بھی ناموسِ "طاعت و زہد" ہے اگرچہ نائو نوش کا زمانہ بھی نہیں ہے۔

چھوڑ چکا ہوں میکدہ، توڑ چکا ہوں جام مے
وعظِ جنابِ شیخ کا اب بھی ہے بارِ گوش پہ

یہ شعر نہ جانے کتنے پیرانِ میکدہ کی زندگی پر پھبتی ہے۔

اب عوامی دور ہے، جمہوریت کا زور ہے۔ اسے کس طرح شگفتہ زمین میں فکر کرتے ہیں:

آثر اندازِ ناداں ہو رہے ہیں، قلبِ انساں پر
سُنا ہے ایک ناصح چھا گیا ہے بزمِ زنداں پر

لفظ "ناداں" "ناصح" اور بزمِ زنداں کی آڑ میں شاعر نے کتنی سیاسی شخصیتوں کی خبر لی ہے یہ حسنِ فکر و نظر کا مستحسن کام ہے۔ کتنے لوگ ایسے ہیں جو تغزل کی اتنی کامیاب چھاؤں میں زندگی کی تپتی ریتی کا ذکر کرتے ہیں۔

ایک ہی غزل کے تین اشعار پڑھیئے اور دیکھئے کہ آخر مے کہن، جام، شرابِ عیش، شرابِ غم سے زندگی کی کتنی عریاں حقیقتوں پر پردہ ڈال کر بھی ان پر کنایوں کی آخر فرمائی کا مظاہرہ کیا ہے۔

مے کہن نہیں، ساقی نہیں ہے جام نہیں
یہ اور کیا ہے اگر زندگی کی شام نہیں
شرابِ عیش نہیں تو شرابِ غم ہی سہی
یہ چیز میکدۂ دہر میں حرام نہیں

پلا نہ جامِ مے، حرص و آز اے ساقی
جو غرقِ حبِ وطن کر دے یہ وہ جام نہیں

ایک شعر میں شرابِ افلاس پہ رنگِ قناعت کی لطف فرمائی دیکھیے:۔

جب کبھی دو گھونٹ اُتر جاتے ہیں بے پیر حلق سے
زندگی کی منزلوں کو بے خطر پاتا ہوں میں

اس شعر میں اتنی زیادہ وضاحت نہیں بلکہ ایک جگہ تو انھوں نے "حسنِ طلب" کا کمال اس طرح دکھایا ہے کہ بات کی بات ہوگئی اور کھٹکی بھی نہیں۔

مجھ سے قیمت نہ مانگ اے ساقی
تنگدستی کی انتہا ہوں میں

اور پھر غم آشنا طبیعت کو کسی دوسرے جامِ شراب کی حاجت ہی کیا ہو سکتی ہے۔

جامِ مے کی رضاؔ نہیں حاجت
ساغرِ غم سے آشنا ہوں میں

ساری دُنیا میکدہ ہے۔ یہاں قدم قدم پر شرابِ ناب کے پیمانے گردش میں رہتے ہیں، ایسا کون ہے جو بے نیازانہ گزر جائے اس امتحان گاہِ پارسائی سے

میکدہ میں بھی پارسا رہنا
آزمائش ہے پارسائی کی

اب دو ساقی آپ کے سامنے ہیں، ایک ساقیٔ میخانہ ہے اور ایک ساقیٔ روزِ ازل۔ کس کو کس پر اوّلیت حاصل ہے ذرا دیکھیے کیا نادر خیال ہے۔

ساقیٔ میخانہ کی شہ پر نہ پیتی تھی تمہیں
ساقیٔ روزِ ازل کا بھی اشارہ دیکھتے

قافیہ "اشارہ" میں جو در پردہ شہ کا پہلو مضمر ہوتا ہے وہ یہاں لطف دے گیا ہے۔ یہ ہے قافیہ کا صحیح محلِ استعمال۔

تھا کمی حسنِ طلب کا عدم ہے
ورنہ طلبِ صادق ہو تو چند ساغر کیا کچھ نہیں ملتا

ضرور جوشِ طلب میں کمی رہی ہوگی
ملے نہ جام تو ساقی پہ کیوں گماں کرتے

۲۶ جولائی سنہ ۱۹۶۲ء کو امام باڑہ نیر دہلی میں میلاد النبی کے عظیم الشان جلسہ میں رضاؔ صاحب نے ایک نعتیہ غزل پڑھی جس نے ہر طرف تحسین و آفرین کا شور برپا کر دیا۔ یہ نعتیہ غزل اسلامی کلام "اُجالے" کے صفحہ ۳۹ پر درج ہے اس کے دو اشعار دیکھیے۔

ساقیٔ میخانۂ احمد کی ہے کتنی اچھی
جام اچھے ہیں، خم اچھے ہیں، صراحی اچھی
جام و مینا سے نہیں ہم کو سروکار مگر
آپ کے نام پہ آجائے تو مستی اچھی

شعلۂ خاموش کے صفحہ ۸۷ پر مستقل ساقی کی ردیف میں ایک غزل ہے۔

خمریات اُردو شاعری کا جتنا قدیم موضوع ہے، اتنا ہی محبوب بھی ہے۔ ریاضؔ خیر آبادی نے تو ساری شاعری اسی لال پری کی نذر کر دی۔ اُردو شاعری کا ایک عجیب المیہ یہ رہا ہے کہ اس کے نوّے فیصد شعراء دو اُفتادہ جام و مینا کے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ لیکن جانے کیوں وہ ریاضؔ خیر آبادی سے بہتر شعر خمریات کے ضمن میں آج تک نہیں کہہ پائے۔ حالانکہ ریاضؔ خیر آبادی نے آج تک، عملی طور سے بھی نہیں چکھی تھی۔ قصیدے میں تو اہتمام کے ساتھ ساقی نامہ درج کیا جاتا ہے یہ لفظِ ساقی کی فسوں گری ہے کہ اس نے ہر مزاج کو اپنا گرویدہ کیا ہے۔ ایک فرد کی ذات کیا پورا زمانہ، مستقل عہد کی بات ایک لفظ۔ اسی میں سمائی جا سکتی ہے۔

رضاؔ نے اس زمانہ کی شکوہ سنجی اور شکریہ گزاری پر بڑے لطیف اشاروں کے اشعار کہے ہیں۔ مثلاً

ہمیں دو گھونٹ پینے کی اجازت دی زمانے نے
رضاؔ کو کہیے خوش قسمت لبوں تک جب کہ جام آیا

چشمِ ساقی تو رہی مست اُسے کیا معلوم
کون ہشیار رہا کون ہے ہشیار رہا

اُٹھا میکش، اُٹھے شراب و سبو
بادہ خوار اُن کے سب نشاں گئے

وہ رند ہوں کہ نہیں حاجت خم و مینا
نظر کا جام ہی کافی ہے میکشی کیلئے

رضا اک شیخ پر الزام کیسا
شراب شہد اوروں نے بھی پی ہے

مختصر یہ ہے کہ رضا نے خمریاتی اشعار کسی سے موضوع یا عامیانہ پن کے فکر نہیں کہے ہیں۔ بلکہ اُن کا لہجہ سادہ، انداز دلربانہ اور معانی الضمیر اتنا گہرا ہے جس کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش جاری رہے گی۔ یہ اشعار خشک ہونے والے گلدان کے پھول نہیں ہیں۔ بلکہ سدا بہار مہکتے گلاب ہیں جنہیں وقت کی کڑی دھوپ بھی نہیں سکھا سکتی۔ ان اشعار کے موضوعات اگرچہ روایتی طرز پر ڈھالے گئے ہیں لیکن ان کا خاصہ منفرد ہے۔ چونکہ رضا نے ساقی، میخانہ، مے، جام و دیگر متعلقات خمریات کو محض علامتی حیثیت (SYMBOLIC STATUS) دی ہے۔ اور یہ علامتی اور صورے خاکے نہیں ہیں۔ بلکہ ان میں طلسماتی کیفیت کی بازیگری ہے۔ جن کے تانے بانے تعمیری و مصورانہ کم تاثراتی زیادہ ہیں۔ اس لئے انہیں دوام نصیب ہے۔ تاثر پیدا کرنا ہی دراصل شاعری کا کام ہے۔ خمریات کے شہ پاروں کا نشہ کبھی خمار نہیں بنتا، نشہ نشہ ہی رہتا ہے اور رضا کا خمریاتی کلام اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔

مع امثلہ مندرج ہے۔

ساتواں باب سال اصطلاحی ہجری اور سال قمری حقیقی کے تنقیدی جائزے، طولی غلطی اور مصنف کی مجوزہ اصلاح پر مشتمل ہے جس میں تنقیدی جائزے کی ضرورت، قمری حقیقی تقویم کو اپنانے میں اسلام کی انفرادیت، قمری حقیقی تقویم کی ناموزونیت، تقویم اصطلاحی کے سال ناقص و کامل کی وضاحت، اور مسیحی تقویم کا نام، تقویم اصطلاحی کے ۲۵۹۸ برس میں ایک دن کی کمی، گرادی اس اور وسٹن فیلڈ کی چوک اور ان کی مرتبہ جدولوں کی خامی، یورپی فاضلوں کی طولی تفاوت کی نشاندہی مگر تصحیح کی نشاندہی سے گریز، سال اصطلاحی ہجری کی طولی خطا اور مصنف کی مجوزہ اصلاح مجوزہ اصلاح کے نتیجے میں تقریباً ۵ بیج لاکھ، ۹۵ ہزار، ۸۰ برس میں ایک دن کا فرق، سال شمسی گریگوری اور سال شمسی فلکی یا شمسی حقیقی کے طولوں کا تفاوت اور سال شمسی گریگوری میں اصلاحی الحاقیوں کے باوجود تقریباً ۲۰ ہزار برس میں ایک دن کا فرق، اصلاحی الحاقیوں کے بعد تقویم اصطلاحی ہجری، ہجری اور تقویم گریگوری کی صحت کا موازنہ، رویت ہلال میں معین و مخل اسباب، ایک مقام کی رویت دوسرے مقام کے لئے نہ، مجوزہ اصلاح کا تقابلی جائزہ مع تقابلی جدول، یوم مدخل اور انٹرنیشنل ایسٹروفیزیکل یونین کی جنرل اسمبلی سے مصنف کی مجوزہ پیش رو اور پس رو الحاقی متعلیوں کو رسماً اپنانے کی تحریک شامل ہے۔
۱۹۷۶
ترتیب و تدوین اور موضوع کے لحاظ سے مفتاح التقویم تطبیق الیوم والسنین اردو ہی میں نہیں معصر زبانوں میں بھی اپنی مثال آپ ہے۔ مولوی حبیب الرحمٰن خاں صاحب صابری کی یہ اٹھارہ سالہ علمی کاوش نہ صرف علم تاریخ کے محققوں، استادوں اور طالب علموں کیلئے جنہیں ہجری سے عیسوی میں یا شک میں یا شک سے عیسوی میں یا ہجری تاریخوں میں بدلنے کی ضرورت ہوا کرتی ہے، بلکہ عوام کیلئے بھی نہایت کارآمد و مفید ہے۔

علمی اصطلاحوں سے قطع نظر طرز بیان سادہ، زبان صاف اور مثالوں سے سمجھانے کا ڈھنگ عام فہم ہے۔ ترقی اردو بورڈ کی اب تک کی علمی مطبوعات میں، بلا پس و پیش، مفتاح التقویم سرِفہرست ہے۔ ابتدائی بیس صفحے جن میں پیش لفظ، مقدمہ، انتساب اور فہرست مضامین شامل ہیں، شماروں سے عاری ہیں کہیں کہیں آفسٹ کی طباعتی خامیاں موجود ہیں۔ بہرحال کتابت و طباعت اچھی ہے۔ جہاں مفتاح التقویم کے مصنف مستحق مبارکباد ہیں وہاں ترقی اردو بورڈ، وزارت تعلیم، حکومت ہند بھی قابل ستائش ہے جس نے اسے چھپوا کر علمی مطبوعات کے سرمایے میں گراں ترین اضافہ کیا۔ اردو پڑھنے والوں کو مرحوم فانی علیم صبا کا ممنون ہونا چاہئے جنہوں نے اس عظیم تحقیق کو شائع کرانا منظور کیا۔

باقی ص ۵۱ پر

معیار کی کسوٹی پر

سرور تونسوی

مفتاح التقویم

اصطلاحی یا معینہ قمری ہجری تقویم مشرق کے فاضل ہیئت داں سلطان الغ بیگ کے مرتبہ قواعد پر مدوّن ہے۔ یورپی مستشرقین نے معینہ ہجری تقویم کو عیسوی تقویم میں بدلنے کیلئے جدولیں بنائیں۔ گرادی اس نے سلہ ھ مطابق ۶۲۲ء سے ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۹۰۰ء تک کے سالانہ مدخلوں کی اور وسٹن فلڈ مہلر نے سلہ ھ مطابق ۶۲۲ء سے ۲۰۰۰ھ مطابق ۲۵۷۶ء تک کے سالانہ اور ماہانہ مدخلوں کی تطبیقی جدول بنائی۔ آخرالذکر کی جدول کا اُردو ترجمہ انجمن ترقی اُردو (ہند) نے ۱۹۳۶ء میں شائع کیا۔ مؤرخین اور محققین اسی جدول سے اب تک کام لیتے رہے۔ ووسٹن فلڈ مہلر کی مترجمہ اُردو جدول میں متعدد طباعتی غلطیاں موجود ہیں۔ جن کی صحت اور جانچنے کا طریقہ جدول مذکور میں درج نہ ہونے کے باعث صاحبِ استفادہ جدول میں درج شدہ تاریخوں پر اعتماد کرنے پر مجبور رہے ہیں۔ اس کے علاوہ سالِ اصطلاحی یا معینہ قمری ہجری کی لمبائی میں سالِ قمری حقیقی کی لمبائی کے مقابلے میں چھبیس صدیوں میں ایک دن کا فرق ہے جس کا لحاظ مذکورہ تطبیقی جدولیں بنانے والوں نے نہیں رکھا ہے۔ اگرچہ موجودہ مروجہ شمسی عیسوی تقویم میں بھی، جو گریگوروی قواعد پر مدوّن ہے اور صحیح تر تقویم مانی جاتی ہے نیز دنیا کے بیشتر ملکوں میں رائج ہے، دو ہزار صدیوں میں ایک دن کی غلطی موجود ہے۔

مفتاح التقویم کے مصنف مولوی حبیب الرحمٰن خاں صاحب صابری نے تقویم اصطلاحی ہجری یا تقویم قمری معینہ کی اصلاح کے لیے صرف ایک آسان اور سادہ الحاقی طریقہ پیش کیا بلکہ اس غلطی کو جو چھبیس صدیوں میں واقع ہوتی، چھتیس ہزار صدیوں تک پہنچا دیا ہے۔ گویا قمری ہجری تقویم کو جو اب تک عوام ہی میں نہیں بلکہ خواص میں بھی ناقص تصور کی جاتی تھی، اپنے وقت کی صحیح ترین تقویم بنا دیا۔ اس کارِ نمایاں پر مصنف کی جس قدر بھی ستائش کی جائے وہ کم ہے۔

مفتاح التقویم کے سات باب ہیں۔ پہلے باب میں مصری، بابلی، یونانی، رومی، عبرانی، گریگوروی اور اسلامی تقویموں کا سرسری جائزہ ہے۔ دورِ التشریح، دورِ القمر، دورِ الشمس؛ اختلافاتِ مبدءِ تقویم، جولیانی زمانہ، مبدءِ تاریخ، ہفتہ، دن کے ذیلی حصے، پیمانۂ وقت، ایام شماری کا طریقہ، وقتِ فلکی و شمسی، وقتِ مقامی، وقتِ معیاری، وقتِ عالمی اور وقتِ تقویمی کی اصطلاحوں پر سرسری مگر سیر حاصل تبصرہ ہے۔

دوسرے باب میں عیسوی اور ہجری تقویموں کا تنقیدی جائزہ اور محاسبہ ہے، جس میں جولیانی شمسی تقویم کے اجراء کی تاریخ، اس کے مہینوں، مہینوں کے دنوں کی تعداد کا تعین، طریقۂ الحاق، تقویم کو نقطۂ اعتدالِ ربیعی سے منطبق کرنے کے لیے پوپ گریگوری کا حکم نامہ، جولیانی طریقۂ الحاق کی تصحیح ہونے کے طریقے، جولیانی سال میں باعتبار نقطۂ اعتدال وسطی آفتاب کی ارضی المرکز طولی حرکت، سالِ شمسی کے مقابلے میں اکمل طریقۂ الحاق جس سے ایک لاکھ برس میں ایک دن کی غلطی ہوتی، جولیانی اور گریگوروی حساب سے سلہ ھ کے مدخل کا تنقیدی جائزہ اور دونوں کے مدخلوں کا فرق، دورِ الشمس کے جاننے کا حسابی قاعدہ، تخریجی مساوات مع مثال، جولیانی تقویم کا حرفِ اصطلاحی معلوم کرنے کی مساوات مع سہ اشکال، گریگوروی تقویم کا سالِ بعد اصلاح کے حرفِ اصطلاحی کی تخریج اور مساوات و اشکال، سالِ معمولی اور سالِ کبیسہ کے مدخل اور ان کا تقسیمی جائزہ، عیسوی دوامی جدول ۲ اور ۳ کے فائدے اور طریقۂ استعمال مع سہ اشکال، جولیانی مدت مشمولہ دورِ القمر و دورِ الشمس

اور دونوں التصریح، پنجم: ارسالہ جدول ۳ کی مدد سے سال قبل مسیح اور بعد مسیح کو دونوں میں بدلنے کی تین تین مثالیں ہیں۔ ہجری یا اسلامی تقویم، وجہ تسمیہ تاریخ اجرا ہوا جولیائی اور گریگوریئی تقویموں، جولیائی مدت اور شک تقویم کے اعتبار سے سنہ ھ کا یوم مدخل، کبیسہ نہ ہونے کی وجہ، اسلامی مہینے کا شروع و اختتام، سال قمری حقیقی کا طول، اعتدال اوسط کے اعتبار سے چاند کی سالانہ اور ماہانہ گردش، قمری تاریخوں میں اختلاف اور شمسی تاریخوں سے نامطابقت کی وجہ، اہل ہیئت کا عمل، سال اصطلاحی کی وضاحت، فلکیوں کے نزدیک قمری برسوں کی تقسیم، دور صغیر و کبیر اور سال کامل و ناقص جاننے کی مساواتیں مع دو امثلہ، ہجری تقویم کا مدخل جاننے کی دو مساواتیں مع امثلہ، ہجری دوامی جدول ۶۵ کا طریقہ استعمال مع چار امثلہ، سال ناقص و کامل جاننے کا دوسرا ضابطہ مع سہ امثلہ، ہجری دوامی جدول ۷ مع طریقہ استعمال، سال اصطلاحی قمری کی طول خامی اور اس کی تصحیح کا مجوزہ، مصنف ضابطہ مصنف کی مجوزہ تصحیح کے مطابق ہجری دوامی جدول ۸ کا طریقہ استعمال مع امثلہ، سال ہجری کے مدخل سے ماہانہ مدخل معلوم کرنے کی جدول ۹ اور ہجری مدخلوں کو حسابی قاعدے سے جاننے کی مثالیں شامل ہیں۔

تیسرا باب تاریخ ہجری کو تاریخ عیسوی میں بدلنے اور اس کے عکس پر مشتمل ہے۔ جس میں طول سال شمسی گریگوروی اور طول سال قمری اصطلاحی کی باہمی نسبت، سال شمسی گریگوری کا منتقض اور رواں کے اعتبار سے سنہ مسیحی مدخل کی نسبت، سال شمسی گریگوروی اور سال قمری اصطلاحی کی دو تطبیقی مساواتیں اور تاریخ ہجری کو گریگوروی تاریخ میں بدلنے کا تفہیمی قاعدہ مع چار امثلہ، تاریخ ہجری کو تاریخ عیسوی قدیم و جدید میں بدلنے کی مساوات، قاعدہ اوّل مع چار امثلہ، قاعدہ دوم مع چار امثلہ، تاریخ عیسوی قدیم و جدید کو تاریخ ہجری میں بدلنے کی مساوات، قاعدہ اوّل مع چار امثلہ، قاعدہ دوم مع چار امثلہ، جدول ۱۰ کی افادیت اور اس کی مدد سے تاریخ ہجری کو تاریخ عیسوی میں اور تاریخ عیسوی کو تاریخ ہجری میں بدلنے کی چار چار مثالیں دی گئی ہیں۔

چوتھا باب ہندی قومی تقویم یا شک تقویم پر مشتمل ہے جس میں قومی تقویم کے نفاذ کی تاریخ، خصوصیت، متابعت، مہینوں کے دنوں کی تعداد، سال ناقص و کامل کے دنوں کی تعداد، تقویم کی ابتداء، شمار کرنے کا ہندی طریقہ، جولیائی مدت یا کلیگ یا سنہ گریگوروی کے لحاظ سے اس کے پہلے سال کا پہلا دن، معمولی اور لوند کے برسوں کا تعین، شک تقویم کو عیسوی میں اور عیسوی کو شک تقویم میں بدلنے کے طریقے، شک تقویم کے مہینوں کے نام، گریگوروی تقویم میں شک برس کی ابتدا و انتہا، شک تقویم کے حرف اصطلاحی نکالنے کی دو مساواتیں مع سہ امثلہ، شک مدخل کا حسابا جاننا مع دو امثلہ، شک دوامی جدول ۱۲ کا فائدہ، طریقہ استعمال مع دو امثلہ، دو تقویمی عیسوی شک دوامی جدول ۱۳ کی افادیت مع دو امثلہ درج ہے۔

پانچواں باب عیسوی یا ہجری تاریخ کو شک تاریخ میں بدلنے اور اس کے اُلٹ پر مشتمل ہے، جس میں جولیائی یا گریگوروی تاریخ کو شک تاریخ میں بدلنا مع مثال، شک تاریخ کو جولیائی یا گریگوروی تاریخ میں بدلنا مع مثال، ہجری تاریخ کو شک تاریخ میں بدلنے کا طریقہ، شک تاریخ کو ہجری تاریخ میں بدلنے کا طریقہ، دو ہزار چھ سو سال ہجری سالانہ یوم مدخل کی آسان ترین تقویمی جدول ۱۴ مع طریقہ استعمال و امثلہ، سہ تقویمی عیسوی شک ہجری دوامی جدول ۱۵ کی افادیت، طریقہ استعمال مع امثلہ، دو تقویمی شک عیسوی تطبیقی جدول ۱۶، دو ہزار چھ سو سالہ ہجری ماہانہ یوم مدخل کی آسان ترین سہ تقویمی تطبیقی جدول ۱۷ کی خصوصیات، افادیت اور طریقہ استعمال مع سہ امثلہ تحریر

چھٹا باب مشکوک تاریخوں کی صحت پر مشتمل ہے جس میں جولیائی، گریگوروی، ہجری اصطلاحی اور شک تقویموں کے دنوں کی واپسی، تقویم کی صحت کا مدار، دوامی جدولوں کی مشکوک تاریخوں کو جانچنے کے چار طریقے مع آٹھ امثلہ، سہ تقویمی تطبیقی جدولوں کی بنیاد، جدول ۱۸ یا جدول ۱۷ کی کسی تطبیقی تاریخ یا دن میں شبہ ہو تو اس کو جانچنے کے ۴ طریقے

بقیہ ص ۳۶ پر

دیال سنگھ کالج

کرنال

مُشترکہ پنجاب میں نصف صدی اور کرنال (ہریانہ) میں چوتھائی صدی سے اپنی شاندار روایات کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ دیال سنگھ کالج کرنال میں طلباء کو ہمیشہ ڈسپلن، قومی یکجہتی اور مُلک کی ہر طرح سے حفاظت کرنے کی تلقین کیجاتی ہے اور انھیں ایک اچھا شہری اور ایک ذمہ دار ہندوستانی بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اہلِ کرنال اور گرد و نواح کے طلباء کے لئے دیال سنگھ کالج ایک نعمت ہے۔ اپنے بچّوں کو اگر آپ اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ساتھ ایک اچّھا شہری بنانا چاہتے ہیں تو دیال سنگھ کالج کرنال کی خدمات سے فائدہ اُٹھائیے۔

دیال سنگھ کالج کرنال (ہریانہ)

اراکین منتظمہ کمیٹی

Adib Makanpuri ②

MAKANPUR
Distt. KANPUR
Dated 31 . 12 . 77

محترم حق بھائی ۔ سلام مسنون

نادم ہوں کہ آپکے خط کا جواب اس سے پہلے نہ دے سکا، آپکا خط
مجھے اُس دن ملا جب آپ جے پور جا رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ جس مقصد کیلئے
آپ میری تصدیق چاہتے تھے اُسکا موقعہ نکل چکا تھا۔ جشن سارہ کی بابت یہ ہے کہ
اُس میں میں اور نیاز بھائی دونوں موجود تھے۔ [illegible] راہی شہابی صاحب نے
یہ غزل پڑھی، میں نے چونکہ آپکی زبانی یہ غزل تازہ تازہ سنی تھی۔ اُسکے اشعار
مجھے اور نیاز بھائی دونوں کو یاد تھے۔ اسی لئے پہلا مصرعہ وہ پڑھتے تھے
اور دوسرے کی تکمیل میں یا نیاز بھائی کر دیتے تھے۔ تیسرے قریب ہی جے پور کے
ایک نوجوان شاعر کیفی صاحب بیٹھے تھے، میری زبان سے آپکے اشعار
سن کر انہوں نے فرمایا کہ غالباً آپ یہ غزل راہی صاحب سے اس سے پہلے بھی
سن چکے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ نہیں بھائی ایسا نہیں ہے دراصل یہ غزل
حق بنارسی صاحب کی ہے لہذا بہت مشہور ہے۔ وہ فرمانے لگے کہ آپ اس کا
ثبوت حق صاحب سے دلوا سکینگے۔ میں نے کہا جب یہ غزل حق صاحب ہی کی ہے
تو اُنہیں کیا تامل ہوگا۔ وہ جبھی خط لکھانے کیلئے مُصر ہو گئے۔ میں نے

(Contd. on page 42)

آپ کو خط لکھ دیا۔ انھوں نے یہ یاد ہو کہ آپ نے اسکے جواب میں لکھا تھا
کہ یہ غزل میری ہے اور اس سے قبل رسالہ عالمگیر میں شایع ہو چکی ہے۔
یہ قصہ بیس برس کا نا شروع پا گیا۔ میں کئی ایڈیشن آ گئی
بات آئی گئی ہو گئی۔ میں نے آپ سے ملاقات میں اسکا حوالہ بھی دیا تھا
منوا یا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے اسی زمین میں کوئی دوسری
غزل کہہ لی ہو مگر وہ کلاسیکی مشاعرہ میں انھوں نے آپ ہی کی غزل اپنے
تخلص سے پڑھی تھی۔ یہ بات مجھے اور ہمارے بھائی دونوں کو خوب یاد ہے
اگر ایسا نہ ہوتا تو میرا آپکو خط لکھ کر ثبوت طلب کرنا ہی غلط تھا۔

حضرت! اجازت دیجئے آجکل ادبی شخصیت ہی چرائی
جاتی ہے۔ چنانچہ ایک صاحب ہیں جو خود کو ادیب کمال پوری کہہ کر
میری نظمیں اور غزلیں غیر معروف مقامات پر پڑھتے ہیں۔ کیا کیا جائے
ان باتوں کا آپکی یا میری صحت پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ مگر حیرت
ضرور ہوتی ہے کہ "چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد"
امید ہے کہ مزاج بخیر ہوگا

والسلام

آپکا
ادیب

① ۲۵۷

محترم گرامی حافظ منظور احمد صاحب تسلیم و نیاز

آپکا پیغام ملا جس میں آپنے دریافت فرمایا ہے
کہ مندرجہ ذیل مطلع کیا کبھی جناب راہی شہابی نے
جودھپور کے کسی مشاعرہ میں پڑھا ہے؟
جواب عرض ہے کہ ہمیں مشاعرہ کی صحیح تاریخ
تو یاد نہیں مگر ایک مشاعرہ چھوٹی بچت اسکیم
کے تحت میونسپل ہال جودھپور میں ہوا تھا اور
اس مشاعرہ کو مرحوم افتخار احمد صاحب شمیم جے پوری
نے کنڈکٹ کیا تھا۔ اس مشاعرہ میں جناب
راہی شہابی نے اپنے تخلص سے مندرجہ ذیل مطلع
پڑھا تھا

مطلع: وقت کا سلسلۂ فتنہ گری ٹوٹ گیا
دورِ حاضر میں غرورِ بشری ٹوٹ گیا

اس کے علاوہ جو بھی اشعار شہابی صاحب نے
پڑھے ان میں مندرجہ ذیل مصرعے بھی ہمارے ذہنوں
میں محفوظ ہیں۔ ۱؎ حلقۂ دام وسیع النظری ٹوٹ گیا
۲؎ جس جگہ حوصلۂ بال و پری ٹوٹ گیا
از راہ کرم اگر مناسب سمجھیں تو مطلع فرمائیں کہ
آپنے مندرجہ بالا مطلع کے بارے میں ہم سے کیوں دریافت
فرمایا ہے۔ کیا اس مطلع کے متعلق کوئی اہم بات ہے؟

۱ نول جودھپوری ۳ یاس رومانی
۲ ا۔ج۔ا۔ اثر ۴ ممتاز سروش ٹکنوی
۵ حبیب کیفی

حضرات ۔

مجھے خاص طور پر معلوم ہوا تھا کہ اپنی مکرم حق بنارسی صاحب نے پونہ کے مشاعرہ میں مائک پر یہ اعلان کیا تھا کہ میں وہ غزل پیش کر رہا ہوں جو غزل سے لے کر ایک مشہور شاعر کئی سال سے اپنی غزل کہہ کر شہرت میں لئے پھرتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ ان کا اشارہ راجہ مہدی علی خاں کی جانب تھا۔ اس خبر سے مجھے اذیت ہوئی کیونکہ میں راجہ صاحب کو ایک اچھا شاعر مانتا ہوں اور ان کی تمام دلکش اور جو ادبی زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق اور مقبولیت مسلم ہے۔ ادھر میں حق بنارسی صاحب کی شاعرانہ عظمت اور سنجیدگی سے عرصہ سے واقف ہوں۔ چنانچہ مجھے آج کے جشن کے سلسلہ میں ہونے والے مشاعرہ میں شرکت کا موقعہ ملا اور خوش قسمتی سے اس میں جناب حق بنارسی اور راجہ صاحب دونوں شریک ہیں اللہ تعالیٰ ... عزیز جناب شمیم جے پوری بھی موجود ہیں۔ لہٰذا میں نے ہر دو حضرات کو تخلیہ میں بلا کر شمیم صاحب و دیگر دس معزز حضرات کی موجودگی میں معاملہ کی وضاحت چاہی۔ مجھے حق صاحب کی وضاحت سے یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ معاملہ کی بنیاد صرف غلط فہمی اور ادبی چشمک لڑائی کی دور از حقیقت خبر تھی (یہ بات خود حق صاحب نے اپنی زبان مبارک سے فرمائی) نیز راجہ صاحب اپنی غزل جو سنہ ۱۹۴۳ء کی ماہ جون ... میں شائع ہوئی تھی وہ پڑھ کر حق صاحب کو سنائی رئیس پیر شمیم صاحب جے پوری اور دیگر معزز حضرات جو لوگ کے ... حضرات کے روبرو۔ حق بنارسی صاحب نے افسوس کا اظہار فرمایا کہ دس برس کا ...

معاملہ معمولی غزل کا نہیں ہے۔ یہ تو صرف ادبی ... اور ... کا ... ہے۔ ... مجھے افسوس ہے اور ... فرمایا کہ میں آج ہی مشاعرہ میں مائک پر یہ بات کہہ دوں گا ... مناسب سمجھا کہ سب ... اس ... جو دو کمرے ... غلط فہمی ... اس سلسلہ میں ... کو ... کی اجازت ... ہے۔ ... مجھے خوشی ہے کہ حق صاحب نے اپنی ... اور ادبی عظمت کو ملحوظ رکھتے ہوئے ... تمام ... جیسے ... اور ... خادم ... غلط فہمی کے ... ۔

گلہائے رنگ رنگ

(گوشۂ عقیل)

تبرکات

حضرت ساقی سکروڈ ہوی مرحوم

سکونِ قلب سے ناآشنا معلوم ہوتی ہے
تمہاری یاد بھی کچھ بیوفا معلوم ہوتی ہے

بجھا ہی چاہتا ہے اب چراغِ زندگی شاید
صدائے دردِ آوازِ درا معلوم ہوتی ہے

یہ دنیا یہ بہشتی، نا حق کا تی ہوئی دنیا
کسی کمسن کا حُسنِ دلربا معلوم ہوتی ہے

خدا جانے فریبِ آگہی کا حشر کیا ہوگا؟
ابھی تو اس جنوں کی ابتدا معلوم ہوتی ہے

کچھ ایسا چھا گیا ہے دل پہ اب احساسِ ناکامی
کہ ہر منزل "فریبِ رہنما" معلوم ہوتی ہے

محبت بھی چھپائے سے کہیں چھپتی ہے دیوانے
تری صورت سراپا التجا معلوم ہوتی ہے

اِس دنیا سے تھا ساقی کبھی اپنا بھی یارانہ
یہی دنیا جواب ناآشنا معلوم ہوتی ہے

کتابیں

جناب لکشمی نارائن فارغ جے پور

کتابیں کوہساروں سے گراں تر
کتابیں آبشاروں سے رواں تر

کتابیں ہیں عظیم و بیکراں بھی
کتابیں لازوال و جاوداں بھی

کتابیں معرفت کا جام بھی ہیں
کتابیں دفترِ الہام بھی ہیں

کتابیں مخزنِ اسرار بھی ہیں
کتابیں مطلعِ انوار بھی ہیں

کتابیں قابلِ تردید بھی ہیں
کتابیں حاصلِ تائید بھی ہیں

کتابوں میں حقیقت کے ترانے
کتابوں میں ہیں جھوٹے بھی فسانے

کتابوں میں غمِ دوراں کی باتیں
کتابوں میں جنوں کی وارداتیں

کتابیں فتنۂ خاموش بھی ہیں
کتابیں میکدہ بر دوش بھی ہیں

کتابیں ہیں کلیدِ کامرانی
کتابیں ہیں متاعِ زندگانی

کتابیں زندۂ جاوید بھی ہیں
کتابیں شام اور رکوید بھی ہیں

کتابِ زیست ہے سرتاج سب کی
اسی کے ہاتھ ہے فارغ لاج سب کی

غزل

کوہلی اکبرآبادی

اندر لہو لہو ہے یہ باہر لہو لہو
غم سے ہمارا دل ہے سراسر لہو لہو

ساقی کی آنکھیں سرخ ہیں ساغر لہو لہو
ہے آج بادہ خانے کا منظر لہو لہو

آلودہ خوں سے تیغِ دو دم ہے چکس ریز
آئی نظر ہے چشمِ ستمگر لہو لہو

رخسار و لب کسی کے اِدھر چشمِ خونچکاں
کیا جانے کیوں ہیں دونوں برابر لہو لہو

کیا جانے ہوگا کیسا مآلِ شبِ فراق
جب ہے شروعِ شام کا منظر لہو لہو

اہلِ جنوں کی آبلہ پائی سے سر بسر
صحرا ہوا ہے رنگ بدل کر لہو لہو

کتنا ستم ظریف ہے قاتل بھی دیکھیے
نکلا ہے قتل گاہ سے ہنسکر لہو لہو

ارزاں ہوا ہے خون بھی انساں کا کسقدر
دھرتی لہو لہو ہے سمندر لہو لہو

سمجھو نہ محض شغلِ سخن گستری کو نور
ہوتا ہے اس میں قلبِ سخنور لہو لہو

غزل

حکیم شبیر علی خاں شبیر کانپوری

حسین اس قدر آپ کا پیراہن ہے
کہ جیسے ستاروں کا رنگیں چمن ہے

دھنک کہکشاں شاخِ گل چاند تارے
کہیں ان سے بڑھکر ترا بانکپن ہے

مری خستہ حالی پہ ہنس کر وہ بولے
غریب الوطن ہے غریب الوطن ہے

مجھے کام کیا گلستاں کی فضا سے
مرے پاس وہ چاند جیسا بدن ہے

کھلنے لگا غنچۂ عشق میرا
لبِ تار پر ایک رنگیں کرن ہے

ہر اک جسم ہے ریشمی پیرہن میں
مگر لاشِ تہذیب کی بے کفن ہے

مرے حوصلوں میں جوانی ہے یارو
وہ سب اور ہیں جن پہ طاری تھکن ہے

نہ شبیر یوں اشک ہر دم بہاؤ
کہاں اب کسی میں وفا کا چلن ہے

غزل

جناب توصیف علوی عاصی کرا

شمعِ دوراں پہ نظر آتے ہیں پروانے نئے
آج راہِ شوق میں نکلے ہیں دیوانے نئے

بزمِ زنداں میں ابھی تک ہیں وہی مایوسیاں
آ گئے ہیں گرچہ کچھ ہاتھوں میں پیمانے نئے

ہیں وہی پتھر وہی بت ہیں وہی ہیں بت تراش
صرف کہنے کو کھلے ہیں کچھ صنم خانے نئے

شورشِ ایام کے شاکی تھے جو اہلِ ہوش سے
ہیں وہ محوِ دست و گریباں آج دیوانے نئے

ترقیٔ پیراں کے لگی ہے اب زمانے کی نظر
وقت نے بخشے ہیں جنکو آج پیمانے نئے

باغباں کی ہے چمن بندی جہاں ماتم کناں
صحنِ گلشن میں کچھ ایسے بھی ہیں ویرانے نئے

دیکھ کر یہ دورِ نو ہونے لگا ایسا گماں
سرخیاں ہیں سب پرانی اور افسانے نئے

دیکھئے کب تک رہے قائم یہ پیمانِ وفا
سامنے دنیا کے آئے تو ہیں یارانے نئے

جو رہیں فصلِ بہاراں کی یہی نیرنگیاں
صحنِ گلشن میں نظر آئینگے ویرانے نئے

دیکھنا یہ ہے کہ کرتے ہیں عقدے اب حل ہونگے
لیکے عزمِ نو کچھ آئے تو ہیں فرزانے نئے

دیکھئے چلتا ہے اب کس طرح عاصی دورِ جام
ساقیٔ دوراں نے کھولے تو ہیں میخانے نئے

غزل

تسنیم صفی پوندری

اپنی ادا سے آپ ہی مسرور ہو گیا
وہ آئینے کو دیکھ کے مغرور ہو گیا

تجھ سے بچا کے شیشۂ دل کیوں نہ رکھ سکے
اک آئینہ تھا ٹھیس لگی چور ہو گیا

ہر وقت تیری یاد ہے ہر دم ترا خیال
میں تجھ سے مل کے خود سے بہت دور ہو گیا

علم و ادب میں فن کے قرینے کہاں تھے
جب علم و فن کا ذوق ہی کافور ہو گیا

کچھ اس طرح سے آپ نے اپنا لیا مجھے
دونوں کا نام شہر میں مشہور ہو گیا

احسان تیرا کم تو نہیں مجھ پہ زندگی
میں غم کے دائروں میں جو محصور ہو گیا

اس دور میں نظیر محبت اسی کی ہے
شیریں کی آرزو میں جو مزدور ہو گیا

غزل

آید سرہندی

کوئی نصیب کا مارا ہوا، ہوا نہ ہوا
غریب خود کا سہارا ہوا، ہوا نہ ہوا

دل حزیں کی نہ بر آئی آرزو پھر بھی
کسی کا لطف دوبالا ہوا، ہوا نہ ہوا

بلند و پست سے گزرا ہوں بے نیازانہ
نفع ہو کہ خسارہ ہوا، ہوا نہ ہوا

بغیر قیس بھی صحرا میں خاک اڑتی ہے
جنوں کا ختم اجارہ ہوا، ہوا نہ ہوا

قبول صبر کی زحمت نہ بن پڑی دل سے
غم جہاں بھی گوارا ہوا، ہوا نہ ہوا

وغم و ملال کی چلتی ہیں آندھیاں اکثر
وہ رخ حیات تمہارا ہوا، ہوا نہ ہوا

سنی جہاں نے مسیحا مگر نہ ایک بھی دل
فغان درد کا مارا ہوا، ہوا نہ ہوا

رہے گا رنج کہ غرقاب ہو گئی کشتی
مجھے نصیب کنارا ہوا، ہوا نہ ہوا

نگاہ و فیض کو دنیا ترس رہی ہے آید
رفاہ عام ادارہ ہوا، ہوا نہ ہوا

غزل

اخلاق سہسوانی

اشک گرتے ہیں جہاں، شمع سی جل جاتی ہے
میری آنکھوں سے یہ کیا چیز نکل جاتی ہے؟

تیری نظروں میں نہاں ہے یہ دنیا اے دوست
یہ بدلتی ہیں تو دنیا ہی بدل جاتی ہے

دیکھتا ہوں میں گلوں کو تبسم جو کبھی
منہ سے بیساختہ اک آہ نکل جاتی ہے

اف تصور وہ تری بزم کی رنگینی کا
دل کے ہر گوشہ میں اک شمع سی جل جاتی ہے

وہ تو محبت کی نظر سے نہ مجھے دیکھا کر
جرأت ضبط کی دنیا ہی بدل جاتی ہے

تم نے غم دے کے کیا مجھ پہ اک احسان عظیم
اب کسی وقت طبیعت تو بہل جاتی ہے

اضطراب ایک مصیبت ہی سہی اے اخلاق
کچھ نہ کچھ اس سے طبیعت تو بہل جاتی ہے

غزل

اخلاق سہسوانی

دکھائی کیوں نہیں دیں حوصلے اب بجلیاں اپنا
چمن میں کر لیا ہے ہم نے تعمیرِ آشیاں اپنا

ٹھہر جاتی ہیں نبضیں وقت کی بھی جا بجا آکر
ہزاروں بار گزرا ہے وہاں سے کارواں اپنا

یقیناً زندگی ہے نام جہد و جہد کا اے دل!
جو زندہ ہے تو اٹھ تعمیر کر کوئی جہاں اپنا

بہار و تازگی؟ یہ تو بہت پہلے کی باتیں ہیں
اب ان چیزوں سے بے بہرہ سا ہے یہ گلستاں اپنا

یہی ہے غالباً معراج میری سعیِ پیہم کی
میں ان کو ڈھونڈتا تھا اب نہیں ملتا نشاں اپنا

وہ منظر آہ اُس منظر کی مجبوری ارے توبہ
کہ اپنے سامنے ہی جل رہا تھا آشیاں اپنا

فضائیں نالہ زن، غنچے فسردہ، پھول پژمردہ
مرے اللہ کیا ہو گیا یہ گلستاں اپنا

اب آئے یا نہ آئے انقلاب اس کی خبر کیا ہے
ابھی موقع ہے دیوانے بدل لے تو جہاں اپنا

یہی اخلاقؔ ہے معراجِ ذوقِ بندگی شاید
وہیں کعبہ نظر آتا ہے سر رکھ دوں جہاں اپنا

غزل

سلام ساگری

میرا ذوقِ بندگی آخر کہاں لایا مجھے
جھوم کر کعبہ جہاں کرتا ہے خود سجدہ مجھے

ایک آنسو روشنی میں سجدے میں لایا مجھے
دیکھتا ہے مسکرا کر صبح کا تارا مجھے

دیکھئے اب تک سرِ چشمۂ آبِ بقا
جس مقامِ زندگی پر تم نے چھوڑا تھا مجھے

آنکھ میں آنسو نہیں باقی مگر اللہ رے غم
کتنے طوفانوں نے آ گھیرا ہے بے دریا مجھے

جب نفس کی آمد و شد میں ملا اُن کا پیام
خود بھی اپنے آپ کو کرنا پڑا سجدہ مجھے

اور ستاروں کی جبیں مجھ کو پکاریگا کوئی
دیکھتی کی دیکھتی رہ جائے گی دنیا مجھے

کر لیا ہے میں نے اپنا آپ خود ہی احترام
جب کبھی خود دیکھا ہو آپ کا دھوکا مجھے

زندگی کرنے کا پہلے تو سلیقہ ہی نہ تھا
ہاں مگر اب فیضِ غم سے آ گیا جینا مجھے

یک بیک دل میں ہوئے روشن امیدوں کے چراغ
بزم میں کس زاویئے سے آپ نے دیکھا مجھے

حسنِ عشق نے رہزنی کی چاہتیں کر ہوش و قرار
کیا دیا ہر رنگ و بو نے اپنی سمجھا مجھے

اک نگاہِ لطف کا طالب ہے کب سے میرا دل
آپ کی خدمت میں یہ بیتا تو کچھ نہیں کہنا مجھے

میں نہ سمجھا تھا کہ کہتے ہیں معراجِ جنوں
آپ کا دیوانہ اب کہنے لگی دنیا مجھے

بعدِ بانیؔ فیضِ نازش حیدری ہے اے سلامؔ
ورنہ فنِ شاعری میں کچھ نہیں آتا مجھے

تلاش

منصور سہسوانی

وہ شخص ہر گھڑی جو خرابوں میں ملے گا
ڈوبا ہوا ہزار ثوابوں میں ملے گا

دنیا میں اس کو ڈھونڈنے نکلے ہو تو ڈھونڈو
لیکن خلوص صرف کتابوں میں ملے گا

سمجھیں سکے ہم تو حاصلِ الفت بس اسی کو
وہ چہرہ چھپا ہوا جو نقابوں میں ملے گا

وہ غم کہ جس کو روگ سمجھتے ہیں یہاں سب
اس کا علاج صرف شرابوں میں ملے گا

ترکھا ہو تنہا پھر سمیٹ کے اس کو ہی خطوں میں جتنا خلوص ان کے جوابوں میں ملے گا
اے دل تلاش ایک زمانے سے ہے جس کی وہ پیار تجھ کو ان کے عتابوں میں ملے گا
رُخ سے حضور ان کے جو ہے رنگ جھلکتا
سچ تو یہ ہے کہ صرف گلابوں میں ملے گا

غزل

عقا رتنا بی

سورج کی طرح اپنے ہی محور میں قید ہوں صدیوں سے روشنی کے سمندر میں قید ہوں
میں ہوں صدف حفاظتِ گوہر میں قید ہوں دنیا سمجھ رہی ہے سمندر میں قید ہوں
سر سے گزرتی جاتی ہیں لمحوں کی آندھیاں میں ہوں کہ ماہ و سال کے چکر میں قید ہوں
کیا کیا یہ سوچتا ہوں میں فردا کے باب میں حالانکہ جانتا ہوں مقدر میں قید ہوں
چاہوں تو کائنات کے خرمن کو پھونک دوں تم کیا سمجھ رہے ہو کہ پتھر میں قید ہوں
کب تک نہ آؤں زیست کی یکسانیت سے تنگ روزِ ازل سے ایک ہی پیکر میں قید ہوں
ظاہر میں اک جزیرے کی مانند آج بھی
تشنہ دہن ہوں گو کہ سمندر میں قید ہوں

غزل

ڈاکٹر ساغر اعظمی

خودی کے ساتھ چلے بے خودی کے ساتھ چلے ہر ایک حال میں ہم زندگی کے ساتھ چلے
یہ کہہ کے چھوڑ دیا اس نے غم کی راہوں میں بھلا یہاں کوئی کب تک کسی کے ساتھ چلے
ہمیں نے سارے زمانے کو روشنی بخشی تمام عمر ہمیں تیرگی کے ساتھ چلے
کچھ اس طرح سے مرا زندگی کا ساتھ رہا کہ جیسے کوئی کسی اجنبی کے ساتھ چلے
بھلا نہ پاؤ گے ساغر پرانی قدروں کو
زمانہ لاکھ نئی روشنی کے ساتھ چلے

غزل

ازل دہلوی

آرزو جذبِ محبت کی جواں تھی پہلے یاس آمیزیِ زیست کہاں تھی پہلے
کیوں کر قسمت نے مجھے خون رلایا ورنہ زیست بیگانۂ اندوہ و فغاں تھی پہلے
اب جو جیتا ہوں تو جیتا ہی چلا جاتا ہوں تشنگی اتنی مرے دل میں کہاں تھی پہلے
درد اٹھتا ہے تو اب جان پہ بن جاتی ہے زندگی دوش پہ کب بارِ گراں تھی پہلے
اب تو ہر آہ میں ہے برقِ قیامت رقصاں آہِ دل میری کہاں شعلہ فشاں تھی پہلے
اب تری بزم میں گونگوں کی طرح بیٹھا ہوں بہرِ شکوہ مرے منہ میں بھی زباں تھی پہلے
کچھ منور کا ازل فیض ہے کچھ ثاقب کا
یہ غزل بس کا مرے روگ کہاں تھی پہلے

غزل

بسمل نقشبندی بانسوالہ

چلتا ہوں سر اُٹھا کے مخالف بہاؤ پر
عشق عرش ہے کائنات مرے رکھ رکھاؤ پر

انکارِ جرم کرنے سے پہلے یہ دیکھ لو
مہرِ ستم لگی ہے مرے گھاؤ گھاؤ پر

قصرِ حیات کرتے ہیں تعمیر تم سے اور
انسان کی ہڈیوں کے دہکتے الاؤ پر

کل پھر یہاں نہ ہوگی تماشائیوں کی بھیڑ
ہر شخص لوٹ جائے گا اپنے پڑاؤ پر

اک ایک کر کے چھوٹ گئے سارے ہم سفر
بسمل رہِ حیات کے مشکل گھماؤ پر

رؤف جاوید

یوں ہی الٹ پلٹ کے ٹٹولا تو کیجیے
فرصت میں اپنے آپ کو دیکھا تو کیجیے

ہو جائے گا پہاڑ بھی اک روز سرنگوں
دیوانگی کو کام میں لایا تو کیجیے

یوں بے سبب اُلجھنے سے کچھ فائدہ نہیں
اوروں کی بات غور سے سمجھا تو کیجیے

مشکل نہیں ہے تیرنا لیکن یہ شرط ہے
جاوید ہاتھ پاؤں چلایا تو کیجیے

غزل

ڈاکٹر ہنومان پرشاد جگر بستوی

جام سے محروم ہیں جو کچھ بشر ایسے بھی ہیں
جن کا ہے لبریز ساغر کچھ مگر ایسے بھی ہیں

تھوڑی سی پی کر جنھوں نے ہوش اپنا کھو دیا
میکدے میں آج کل کچھ بے خبر ایسے بھی ہیں

آج بھی محروم ہیں جو روشنی سے وقت کی
میرے قبضے میں کئی تاریک گھر ایسے بھی ہیں

دوستی کی آڑ میں جو دشمنی کرتے رہے
میرے ہی احباب میں کچھ فتنہ گر ایسے بھی ہیں

چلتے چلتے لوٹ لیتے ہیں جو اپنا کارواں
ہاں نگاہوں میں ابھی کچھ راہبر ایسے بھی ہیں

سینکڑوں اشجار گلشن میں پھلے پھولے مگر
جن پہ ہریالی نہ آئی کچھ شجر ایسے بھی ہیں

خون کے چھینٹے چمکتے ہیں شہیدوں کے جہاں
کھنڈروں کے بیچ کچھ دیوار و در ایسے بھی ہیں

جن کا پرسانِ حال اب کوئی نہیں وہ اے جگر
میرے جیسے تیرہ قسمت کچھ مگر ایسے بھی ہیں

غزل

نکہت شاہجہانپوری

پیار بن کر میرے احساس پہ چھانے والے
آ بھی جا پھر سے مجھے چھوڑ کے جانے والے

لے اڑی آپ نے برقی تو کسی دن ہم کو
اپنی نظروں سے گرا دیں گے زمانے والے

مسکراہٹ کو ذرا اپنی سمیٹے رہیے
ورنہ افسانہ بنا دیں گے زمانے والے

فصلِ گل بھی تو گلستاں میں پلٹ آئی ہے
کیوں نہیں آتے کبھی لوٹ کے جانے والے

نا خدا ہوتے ہوئے بھی تو یہ نکہت اکثر
ڈوب جاتے ہیں کناروں پہ سفینے والے

غزل

قدر انصاری سہسوانی

تاریک شام غم کو نہ رُسوا کریں گے ہم — دل کو جلا جلا کے اُجالا کریں گے ہم
دنیا مثال دے گی ہمارے بھی نام کی — اب وہ مقام عشق میں پیدا کریں گے ہم
دامن بہار آنے سے پہلے ہی چاک ہے — آئے گی جب بہار تو پھر کیا کریں گے ہم؟
مایوس ہو کے ہم نے یہی فیصلہ کیا — پیدا نہ کوئی دل میں تمنا کریں گے ہم
گو اب بھی دل میں چٹکیاں لیتا ہے اضطراب — الفت کو تیری پھر بھی نہ رسوا کریں گے ہم

لکھ لکھ کے نام قدر مٹاتا ہے تو مگر
لکھ لکھ کے تیرے نام کو چرچا کریں گے ہم

ضرورت ہے کہ مفتاح التقویم کے ہندی اور انگریزی تراجم بھی شائع کیے جائیں تاکہ خواص و عوام زیادہ سے زیادہ اس سے مستفید ہو سکیں۔ بڑے سائز کی اس ضخیم کتاب کی قیمت ۲۸ روپے ہے جو ناشر یا دفتر شان ہند نئی دہلی سے دستیاب ہے۔

۱۔ مفتاح التقویم کے مقدمے کے فقرہ ۳ کا تحتی فقرہ (۳)
۲۔ 〃 〃 〃 〃 (۱) و (۱۴۷)۔
۳۔ 〃 〃 〃 〃 (۲) و (۱۴۸)۔
۴۔ 〃 〃 〃 کا فقرہ (۹۹) و (۱۵۲)۔
۵۔ 〃 〃 〃 کا 〃 (۱۰۳) و (۱۵۰)۔
۶۔ 〃 〃 〃 کا 〃 (۵۱) و (۱۵۳)۔

ارمغان حجاز (فوٹو آفسیٹ)		۴/۵۰
تصورات اقبال	مولانا صلاح الدین احمد	۱۲/۲۵
اقبال ایک تجزیاتی مطالعہ	سیدہ معراج نیر	۱۵/-
سفرنامہ اقبال	حمزہ فاروقی	۲۵/-
خطوط اقبال	رفیع الدین ہاشمی	۳۰/-
اقبال شخصیت اور شاعری	رشید احمد صدیقی	۱۲/-
اردو زبان اور ادب	ڈاکٹر مسعود حسین خاں	۷/۵۰
مقدمہ تاریخ زبان اردو	〃 〃 〃	۱۰/-
جدیدیت کی روایت	ڈاکٹر عنوان چشتی	۲۰/-
شاعر اور شاعری کی تنقید	ڈاکٹر عبادت بریلوی	۳۶/-
غزل اور مطالعہ غزل	〃 〃 〃	۲۰/-
تہہ کا بوجھ	واجدہ تبسم	۲۰/-
اُترن	〃 〃	۲۰/-
آیا لعنت سکھی	〃 〃	۱۸/-
کیسے سمجھاؤں	〃 〃	۱۰/-
روزی کا سوال ہے	〃 〃	۱۲/-
اردو شاعری کا مزاج	وزیر آغا	۳۰/-
تخلیقی عمل	〃 〃	۱۲/-

نئی مطبوعات

کلیات اقبال باتصویر ایڈیشن (آفسیٹ)		۱۸/-
اقبال شاعر اور فلسفی	سید وقار عظیم	۱۲/-
بانگ درا (فوٹو آفسیٹ)	اقبال	۱۰/-
ضرب کلیم	〃	۷/۵۰
بال جبریل	〃	۷/۵۰

دفتر شان ہند فلیٹ ۸ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

شانِ نزول ——— نرگس سہسوانی

۳ مارچ ۱۹۲۶ء کی دوپہر کو بمقام پولس اسٹیشن "ایکہ" ضلع مین پوری یو۔پی میں نازل ہوا۔ جنوری ۱۹۴۵ء میں والد صاحب کے ملازمت سے ریٹائرڈ ہونے پر اپنے آبائی وطن سہسوان ضلع بدایوں یو۔پی آگیا۔ نومبر ۱۹۴۵ء میں شعری مذاق سوجھا جو آج تک برقرار ہے ۱۹۶۲ء تک شرف تلمذ جناب واحد حسین واحد سے رہا ۱۹۶۲ء میں انکے انتقال کے بعد سے دل چل رہا ہوں صرف مذاق سلیم ہی اب میرا رہنما ہے۔ والدین نے میرا نام ضمیر الحسن عرف لڈن رکھا جس کو میں نے تبدیل کرکے ثناء الحسن عرف لڈن بہ تخلص نرگس رکھا۔ میرے پاس تقریباً آٹھ ہزار اشعار کا اسٹاک ہے کاروباری زندگی ہے۔ عمر کی باون بہاریں دیکھ چکا ہوں ایک نظم ملاحظہ فرمائیے۔

آج کی بات:

ہم نے اک نیتا سے پوچھا ٹھیک ہیں عالی جناب
بولے ہم تو ٹھیک ہیں کچھ تم کہو اپنی جناب

ہنس کے بولے ہم کو اب بھگوان سب کر دیگا ٹھیک
ورنہ حالت تو یہ ہے کچھ روز میں مانگیں گے بھیک

شدھ گھی تو مدتوں پہلے ہی غائب ہو گیا
رہ گیا تھا تیل کڑوا وہ بھی غائب ہو گیا

پیٹ بھرنے کو میسر جس قدر بھی ہیں اناج
دیکھا دیکھی ہو گئے وہ بھی نہایت بد مزاج

جو کماتا ہوں وہ آٹے کے لئے رہتا ہے کم
دال لے بھی لیں تو پھر آٹا کہاں سے لائیں ہم

دال آٹا ہم اگر کھاتے تو یہ بھی جانتے
پھر تمہیں معلوم ہوتے بھاؤ کچھ بازار کے

سبزیوں کے ڈھیر میوہ جات کے انبار ہیں
کس طرح ان کو خریدیں جیب سے ناچار ہیں

ہم کو میوہ اور مکھن دودھ کی ہے اشتہا
پیٹ میں جنتا کے لیکن ہے ترا بھوسا بھرا

آج جنتا راج میں ہر شخص ہی آزاد ہے
شاہ تو پھر شاہ ہے اب چور بھی آزاد ہے

سیٹھ جی کی بھی لیاقت کام اپنا کر گئی
ریٹ پر راشن بکا نوٹوں سے غولک بھر گئی

کیسی جاکٹ کیسا سوئیٹر تن پہ بنڈی بھی نہیں
گرم کی چاہت میں ہاتھ آئی ہے ٹھنڈی بھی نہیں

لاکھ کوشش سے بھی تکیے پر نہ چڑھ پایا غلاف
رات بھر کرتے ہیں کوں کوں بیٹے نہیں کوئی لحاف

صرف دو بچے ہیں لیکن پیٹ بھر ملتا نہیں
شہر میں پھرتے ہیں مارے مارے گھر ملتا نہیں

چند دن پہلے بڑے عاقل تھے دانا تھے وزیر
جن کی نظروں میں برابر تھے امیر اور سب فقیر

ملک کی جیب سے ہوئی ہے ایک دم کایا پلٹ
سیکڑوں کے گھر میں اک دم آگئی مایا پلٹ

اور جو مفلس تھے وہ کنگال ہو کر رہ گئے
زندگی کے واسطے جنجال ہو کر رہ گئے

وہ زباں جس پر فدا ہیں ملک کے پیر و جوان
جس کے بل بوتے پہ نیتا [illegible] کرسیاں

ان کے بھاشن ٹیپ ہیں جب چاہئے سن لیجئے
فیصلہ جو جی میں آئے آپ کے وہ [illegible]

آج اسی کی تو وساطت سے بنے ہیں حکمراں
لطف تو یہ ہے کہ دیتے [illegible]

مٹ نہیں سکتی کسی صورت سے یہ اردو زباں
بولتے ہیں جس کو تارا چند اور [illegible] میاں

لکھ گئی اتہاس میں بھارت کے یہ پہلی نظیر
وقت پڑنے پر ہوئے ہیں ایک سب شاہ و فقیر

اب سیاست میں کسی صورت سے ہم بھی کم نہیں
چند سالوں بعد شاید تم نہیں [illegible]

تم عبث اترا رہے ہو دیکھ کر کرسی کی اور [illegible]
[illegible] اس کرسی کے مالک جو ہیں [illegible]

ٹیلیفون نمبر ۲۷۸۸۸ — رجسٹرار آف نیوز پیپر آف انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۶۳۴/۵۷ — رجسٹرڈ نمبر ۵۳۷۰

ایڈیٹر
سرور تونسوی

ماہنامہ
شانِ ہند
دہلی

قیمت سالانہ
بارہ روپے
فی پرچہ
ایک روپیہ پیسے

جلد نمبر ۱۴ — مئی سنہ ۱۹۶۸ء — شمارہ نمبر ۵

قطعات رئیس امروہی (کراچی)

قوالی سُنو
فلم کے نغمے نہیں سُنتے تو پھر گالی سُنو
بھول کر بھی اب نہ شعرِ غالب و حالی سُنو
ہیں ہر اک سازندے کے منتر ریڈیو والوں کے پاس
گیت گر تم کو نہیں بھاتے تو قوالی سُنو

بہرِ نمائش
شیخ فضلو نے خفا ہو کر کہا
بی بی فضلن جب نمائش کو چلی
اے نمائش گاہِ عالم رو دیے تو
تو کیا بہرِ نمائش ہی رہی؟

جرنلسٹ!
پڑھتے ہو میرا نامۂ اعمال کس لئے؟
سر تا قدم خود اپنے گناہوں کی لسٹ ہوں
کیسا رسالہ ہے؟ رسالے کا ہوں مدیر
جرنیل آپ لوگ ہوں میں جرنلسٹ ہوں

شہ نازجان!
چُنگی کے منشیوں کو جو کہتے ہیں کُند ذہن
دیکھیں وہ اُن کی علم و ذہانت کی شان کو
حُسنِ رقم میں نقطہ برابر کمی نہیں
شہ نازجان لکھتے ہیں شہ بازجان

بُوائے
اہلِ مے خانہ ہو گئے بدذوق
ہم انہیں خام راشے کہتے ہیں
بار کہتے ہیں مے کدے کے بجائے
مغ بچے کو بوائے کہتے ہیں

بیگم کی امّی
یہ خوش دامن مری فرما رہی تھیں
کہ امریکہ کی ایجادیں نئی ہیں
کہا میں نے کہ اے بیگم کی امّی
اک ایٹم بم کی موجد آپ بھی ہیں

مدیر، مالک سرور تونسوی ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے لیتھو کے صفحات خواجہ پریس جامع مسجد دہلی اور بلاک پلیٹ پریس دہلی سے چھپوائے اور دفتر شانِ ہند بلیماران انصاری مارکیٹ دریا گنج دہلی سے شائع کیا

افکار و واقعات

مشاعرۂ جشنِ جمہوریت لال قلعہ دلی میں

جناب گوپال متل آف "تحریک" اور بہار آونہ رودولوی کا دَرباری کردار

۱۹۵۱ء میں پہلا جشن جمہوریت منایا گیا۔ اور اس سہ روزہ جشن میں لال قلعہ کا مشاعرہ اپنی نوعیت کا ایک اچھا مشاعرہ تھا۔ مشاعرہ کمیٹی میں ڈیفنس منسٹری کے دو اعلےٰ درجہ کے افسران کے علاوہ اس وقت کے چیف کمشنر جناب شنکر پرشاد صاحب آئی۔ سی۔ ایس۔ جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ اور اُردو سے لگاؤ رکھنے والی کئی اور سرکردہ ہستیاں تھیں۔ اور یہ سلسلہ ہر سال جاری رہا۔ ۱۹۶۸ء تک کے جشن جمہوریت کے مشاعروں کا آنکھوں دیکھا اور کانوں سُنا حال ایڈیٹر شانِ ہند قلم بند کرتا رہا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مشاعرہ کمیٹی کے ارکان ہر سال اپنی اپنی پسند کے شعراء کو ان مشاعروں میں بُلانے کی کوشش کرتے رہے مگر اس انسانی کمزوری کے باوجود جب ہم حضرت بیخودؔ دہلوی۔ پنڈت دتاتریہ کیفیؔ۔ جناب نوحؔ ناروی، جناب جگرؔ مرادآبادی۔ جناب جوشؔ ملیح آبادی جناب سحرؔ۔ جناب فراقؔ گورکھپوری، جناب جوشؔ ملسیانی۔ جناب صباؔ جے پوری، ساحرؔ لدھیانوی، علی سردار جعفری، نشورؔ واحدی، جذبیؔ، حضرت علامہ زارؔ دہلوی۔ عرشؔ ملسیانی۔ جناب تدبیرؔ لکھنوی۔ جناب اثرؔ لکھنوی۔ نورؔ لکھنوی۔ مجروحؔ سلطان پوری۔ بسملؔ سعیدی۔ فناؔ نظامی نازشؔ پرتاب گڑھی۔ جناب یگانہؔ چنگیزی لکھنوی۔ جگرؔ بریلوی۔ جرمؔ محمد آبادی گوپال متل۔ ساحرؔ ہوشیارپوری۔ اور دیگر کئی قابلِ احترام اور اُردو شاعری کے محافظوں کا کلام لال قلعہ کے ان مشاعروں میں سُنتے تھے تو مشاعرہ کمیٹی کے ممبران کی چھوٹی چھوٹی فروگزاشتوں اور اقربا نوازی کو قابلِ معافی سمجھا جاتا تھا۔ تاہم شانِ ہند نے ہر موقع پر اپنی روایات کو برقرار رکھا۔ اور مشاعرہ کمیٹی کی ہر فروگزاشت کو طشت ازبام کرنے میں کوئی رعایت نہ برتی۔ ۱۹۶۸ء کے بعد اس مشاعرہ میں انحطاط شروع ہوا۔ اور نتیجتاً مشاعرہ۔ مشاعرہ کا کوئی امتیاز نہ رکھا گیا۔ اور گلے بازی کے ماہرین شعراء یا متشاعروں کا دَور دورہ اپنے شباب پر آگیا۔ تو ایڈیٹر شانِ ہند نے لال قلعہ کے ان تاریخی مشاعروں کی رُوداد لکھنا بند کر دی۔ بلکہ مشاعروں کا سُننا بھی ترک کر دیا۔ کبھی کبھار سال دو سال میں بمبئی، کلکتہ، مدراس، میں کوئی اچھا مشاعرہ ہوا تو اسے بھی محض سُنا۔ قلم بند نہیں کیا۔

۱۹۷۷ء کے سیاسی انقلاب کے بعد عوام کو کئی امیدیں بندھیں وہاں یہ بھی توقع تھی کہ اس سال جشنِ جمہوریت کا مشاعرے کا انتظام ایسے مشاعرہ کمیٹی کے سپرد ہو گا جو اس قومی اور تاریخی مشاعرہ کو صحیح معنوں میں جشنِ جمہوریت کے مشاعرے کے روپ میں پیش کرے گی۔ مگر جونہی ایمرجنسی کو گہری قبر میں دفنا دیا گیا تو ایک روزنامہ کے عدالتی خبروں کو سونگھنے والے نامہ نگار بہار آونہ رودولوی صاحب جنہیں دلی کے بہاگیہ جاگ اُٹھا۔ جناب من موہن تلخ کے فلمی دُنیا میں چلے جانے کے باعث اس موقر روزنامہ کے فلمی حصہ کا انچارج بنا دیا گیا تھا۔ اسی موقر روزنامے میں دربار شاعروں کے عنوان سے اُن شعرائے کرام کے خلاف زہر اُگلنا شروع کیا جنہوں نے محترمہ اندرا گاندھی کے دورِ حکومت یا اُن کی تعریف میں اشعار کہے تھے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس موقر روزنامہ "پرتاپ" کی پالیسی عام طور پر اندرا حکومت کے حق میں نہیں رہی تھی۔ مگر بہار آونہ صاحب نے جو یہ نیا شوشہ چھوڑا اس کی پیک گراؤنڈ میں جناب گوپال متل صاحب کا دماغ کام کر رہا تھا۔ اور متل صاحب نے بہار آونہ صاحب کے ذریعہ ملک کے ایک کثیر اشاعت رکھنے والے روزنامہ کے ذریعہ بعض شعراء کی چند غیر سیاسی و سیاست دوستوں کے عوض اپنی سطحی مطلب برآری میں قابلِ تعریف حد تک کامیابی حاصل کی۔ اور اس سطحی مطلب برآری کی تفصیل یوں ہے کہ گوپال متل صاحب کے مریدِ خاص مضامین کی اشاعت

اس روزنامہ میں ہو سکی حالانکہ اس روزنامہ کی اپنی پالیسی بھی امریکہ نوازی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہمارے یہ لکھنے سے بھی متل صاحب کو فائدہ پہنچے گا۔ اسی ضمن میں ایک لطیفہ بھی سُن لیجئے۔ رسالہ مستانہ جوگی کے مرحوم مالک اور ایڈیٹر صوفی انجمن پرشاد آنجہانی انگریزی حکومت کے بہت مداح تھے۔ ایک دن وہ لاہور میں اپنے دفتر سے باہر نکلے تو بارش کی وجہ سے کیچڑ میں ان کا پاؤں پھسل گیا اور اُن کے کپڑے کسی حد تک کیچڑ سے لتھڑ گئے۔ انھوں نے دیکھا کہ بارش کا پانی ایک جگہ جمع ہے اور محلے کے چھوٹے چھوٹے بچے اُس میں نہا رہے ہیں تو وہ ان بچوں کے پاس گئے اور اُن سے کہا کہ وہ ان پر بارش کا جمع شدہ گندہ پانی ڈالیں۔ بچوں کو ایسی پیش کش کی دعوت کا ملنا تھا کہ آناً فاناً صوفی صاحب کو اُس گندے اور کیچڑ سے بھرے ہوئے پانی سے تربتر کر دیا گیا۔ اس کے بعد صوفی صاحب تانگے پر بیٹھے۔ (اُن دنوں لاہور میں ٹیکسی نہیں چلتی تھی) سیدھے انگریز ڈپٹی کمشنر کے بنگلہ پر پہنچے اور حضورِ جارج پنجم کی حکومت کی دہائی دیتے ہوئے اردلی سے فوری طور پر ڈپٹی کمشنر سے فریاد کرنے کے لئے ملاقات کی درخواست کی۔ اردلی نے ڈپٹی کمشنر سے صوفی صاحب کی ایمرجنسی صورتِ حال کی اطلاع دی۔ تو انہوں نے فوراً صوفی صاحب کو اندر بُلا لیا۔ اور صوفی صاحب انگریزی حکومت اور انگریز بادشاہ کی دہائی دیتے ہوئے ڈپٹی کمشنر سے گویا ہوئے کہ حضور یہ دیکھئے۔ انگریزی حکومت کے دشمنوں نے میری یہ حالت اس لئے کی ہے کہ میں انگریزی حکومت کا خیرخواہ ہوں۔ آپ جانتے ہیں اس ڈرامے کا کیا نتیجہ رہا؟ آنے والے یکم جنوری کو حضور شہنشاہِ انگلستان و ہندوستان نے صوفی انجمن پرشاد صاحب کو "رائے صاحب" کے خطاب سے نوازا۔

لہٰذا متل صاحب بھی اپنی امریکہ نواز پالیسی کے جواز میں شانِ ہند کی اس تحریر کو اپنے وفادار ہونے کے ثبوت میں پیش کر سکتے ہیں۔

دوسرا مغالطہ متل صاحب نے یہ حاصل کیا کہ "درباری شعراء" کے بے بنیاد طعنے کے باعث اُنھوں نے جناب کیدارناتھ ساہنی کو غلط طور پر دوہرے شبہات اور کالے اُن حضرات کی طرف سے بدظن کر کے مشاعرہ کمیٹی میں گھس بیٹھ فرمائی۔ اور کیا غضب ہے کہ وہ شخص جو مشاعرہ کمیٹی کی کارروائی کی خبر حاصل کرنے کے لئے برآمدے میں پڑے ہوئے لکڑی کے بنچ پر بیٹھا او نگھتا رہتا تھا۔ اسے مشاعرہ کمیٹی کا ممبر بنائے جانے پر نے بھی ساہنی صاحب کو بہکایا گیا۔

تیسرا مغالطہ یہ اٹھایا گیا کہ متل صاحب اور پروانہ نے ملی بھگت کر کے اپنے احباب اور خصوصاً امریکہ نواز شعراء کو اس مشاعرہ میں مدعو کرا کے مشاعرے کو ناکام کرایا۔ تاکہ حکومت کو یہ کہنے کا جواز مل سکے کہ جب عوام ہی اُردو کو پسند نہیں کرتے تو حکومت اُردو کی ترقی کے لئے کیا کرے۔

مشاعرہ کمیٹی کے اُس رُکن نے یقیناً کمینگی اور کم ظرفی کا مظاہرہ کیا جس نے مشاعرہ کی کنوینر صاحبہ سے جناب بسمل آفسا ہی کے لئے کہا کہ وہ تو گویا ہے۔ بسمل آفسا ہی کو گویا کہنے والے اس ممبر مشاعرہ کمیٹی کے اسلاف پر اگر روشنی ڈالی جائے تو ساہنی صاحب اور قدوائی صاحبہ حیران رہ جائیں کہ کیسے کیسے لوگوں کو اس کمیٹی میں لیا گیا۔ ہمیں افسوس ہے کہ صرف اور صرف گوپال متل صاحب آن تحریک اور پروانہ نے جناب کیدارناتھ ساہنی اور محترمہ قدوائی صاحبہ کو غلط اور سراسر غلط مشورے دیئے۔ اور اس طرح ان دونوں دیانتدار اور اچھی شہرت رکھنے والی ہستیوں کو موضوعِ بحث بنایا۔

خدا بہتر جانتا ہے کہ ایڈیٹر شانِ ہند کو نہ تو گوپال متل صاحب سے کوئی کد ہے۔ اور نہ ہی پروانہ صاحب سے کوئی پرخاش، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ گوپال متل صاحب کو راقم الحروف نے ہمیشہ بڑے بھائی کا مقام دیا ہے۔ اور اُن کا احترام کرنا اپنا فرض سمجھا ہے۔ مگر اُردو کے مفاد کے خلاف کسی بھی ناپاک کوشش میں اگر میرا بیٹا بھی شریک ہوگا تو اس کے خلاف بھی آواز اُٹھانا شانِ ہند کا ایمان ہے۔

کیا اُردو اکاڈمی اُترپردیش اندرا نواز ہے؟

اس سال اُترپردیش اُردو اکاڈمی نے اُردو کتابوں پر جو انعامات دیئے ہیں ان میں سے اکثر و بیشتر کتابوں کے مصنفین محترمہ اندرا گاندھی کے مداح رہے ہیں۔ اور بعض انعام پانے والی کتابوں میں تو محترمہ اندرا گاندھی کی تعریف میں تحریریں موجود ہیں۔

اُترپردیش اکاڈمی کے اراکین نے جس طرح سیاسی طور پر غیر جانبداری کا مظاہرہ کیا ہے اسی طرح اگر کتابوں پر انعام دیتے ہوئے بھی غیر جانبداری سے کام لیا جاتا تو زیادہ بہتر ہوتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کانگریس کی حکومت تھی یا اب جنتا پارٹی کی حکومت ہے۔ مقصد دونوں حکومتوں کا ایک ہی ہے۔ اور وہ یہ کہ مسلم دانشوروں کو اُن کی تصانیف پر انعامات میں لُقمہ تر دیا جائے۔ تاکہ عام مسلمان حکومت کی اس فیاضی پر بے وقوف بن کر حکومتی ٹولے کو ووٹ دیں۔

اور مسلم دانشور انعام یافتہ بن کر سرکاری پالیسیوں کی حمایت کریں۔ اور اردو کی بقاو حیات کے لئے یہ انعام یافتہ کوئی آواز نہ نکالیں۔ کیونکہ سرکار نے اردو کی بقاو حیات کے بدلے ان کی ذہنی بقا و حیات کیلئے کچھ انتظام کر دیا ہے ـــــــ جن پانچ سات انگلیوں پر گنے جانے والے غیر مسلم ادیبوں اور شعراء کو انعامات سے نوازا گیا ہے وہ سو فیصد انعام کے حقدار ہونے کے باعث ہی یہ اعزاز پا سکے ہیں یقین نہ ہو تو ان انعام پانے والی کتابوں کا مطالعہ کر کے ہمارے اس دعوے کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔ بعض انعام پانے والی کتابوں کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں انعام کے لئے انتخاب کرنے والے حضرات یا تو جاہل مطلق ہیں اور یا پھر کسی دباؤ یا ذاتی مفاد کے تحت ایسا کیا گیا۔

کیا غضب ہے کہ ہائی کورٹ کے جج صاحبان کے فیصلے خلاف تو اپیل کی جا سکتی ہے۔ مگر اردو اکاڈمی کے نااہل اور ناانصاف ارکان کے غلط اور سفارشی فیصلوں کے خلاف کوئی چارہ جوئی نہیں ہو سکتی۔

اگر حکومت ہمارے مشورے پر عمل پیرا ہو سکے تو ہم یہ گزارش کریں گے کہ اردو اکاڈمیوں کے ذریعے جو لاکھوں روپیہ ہر سال برباد کیا جاتا ہے اس روپیہ سے ہر سال اگر غریب اور لائق مسلم طالب علموں کو اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے وظائف دیئے جائیں تو کہیں بہتر ہوگا۔ اور اس سے مسلمانوں میں حکومت کے اس ٹھوس کام کا خیر مقدم بھی کیا جائیگا۔

"ہماری زبان" اپنا سا کھو رہا ہے

انجمن ترقی اردو (ہند) کے ہفت روزہ آرگن "ہماری زبان" نے کچھ دنوں سے عجیب و غریب روش اختیار کر رکھی ہے۔ کیا غضب ہے کہ خلیق انجم صاحب، جناب مہتاب پسروری کے بے جا شور شرابے سے گھبراتے ہوئے غالب اور دوسرے مشہور شعراء کے کلام پر اُن کی قطعاً نامناسب اور جاہلانہ اصلاحیں شائع کر رہے ہیں۔ حالانکہ خلیق انجم صاحب اچھی طرح سے یہ جانتے ہیں کہ مہتاب پسروری صاحب ہمدانی کے نظم میں عروض کے معاملے میں ایک بہت بڑے دائرے کے سوا کچھ بھی نہیں ہیں۔ بقول مرحوم حضرت علامہ سحر عشق آبادی کہ بیچارے عروض کی کیا مجال ہے کہ مہتاب صاحب کے قریب بھی پھٹک سکے۔ خلیق انجم صاحب کو مہتاب صاحب سے خائف نہیں ہونا چاہئے بلکہ یہ ذہن نشین رکھنا چاہئے کہ جو شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ سب کچھ جانتا ہے وہ دراصل ـــــــ کچھ بھی نہیں جانتا۔

"ہماری زبان" میں ابہام سے بھرپور اور مہمل کلام شائع ہونا بھی کوئی تعریف کی بات نہیں اور مطبوعات پر جس جاہلانہ انداز میں تبصرے کئے جاتے ہیں اس سے بعض اوقات یہ شبہ گزرتا ہے کہ مبصر شائد تنقید اور تبصرے کے لغوی معنوں سے بھی واقف نہیں۔

"ہماری زبان" انجمن ترقی اردو (ہند) کا آرگن ہے اور اس پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں وہ اردو کے دوسرے رسائل و جرائد کے لئے ضروری نہیں ہیں۔ دوسرے رسائل و جرائد اگر اپنے پسندیدہ جاہل مطلق ادبا و شعراء کی تخلیقات فخر سے پیش کریں تو یہ اُن کے مالکان کا ذاتی معاملہ ہے۔ مگر "ہماری زبان" اس طریق کار پر عمل پیرا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ہم خلیق انجم صاحب سے یہ گزارش کریں گے کہ وہ "ہماری زبان" کے معیار کو نہ صرف قائم رکھیں بلکہ یہ ہفت روزہ دوسرے رسائل و جرائد کے لئے ایک مشعل راہ ہو۔ امید ہے کہ ہماری اس مخلصانہ گزارش سے کوئی غلط اندازہ نہیں لگایا جائیگا۔

بہ کوئے یار بہ انداز محرمانہ گزر

ایڈیٹر شانِ ہند ہارٹ اٹیک کے باعث شانِ ہند کی گزشتہ دو اشاعتوں میں "بہ کوئے یار بہ انداز محرمانہ گزر" کا سلسلہ جاری نہ رکھ سکا لہٰذا اس بارے میں متعدد خطوط موصول ہو رہے ہیں کہ یہ سلسلہ منقطع نہ کیا جائے۔ ایڈیٹر شانِ ہند کو دلی مسرت ہے کہ اس فیچر کو توقع سے بڑھ کر مقبولیت حاصل ہوئی آپ یقین رکھئے کہ اس فیچر میں زیب داستان کو کوئی دخل نہیں ہوگا بلکہ سو فیصد سچے واقعات پیش کئے جائیں گے۔ اردو ہی نہیں بلکہ دوسری زبانوں میں اس قسم کے فیچرز لکھنے والوں نے زیب داستان کے لئے غلط سلط واقعات کو محض اپنے ذاتی پروپیگنڈہ کی غرض سے اتنی اہمیت دی کہ اصل واقعات مسخ ہو کر رہ گئے۔ مگر اس فیچر میں ہر قسم کے ذاتی پروپیگنڈے، جھوٹ اور کسی کو دیدہ و دانستہ بدنام کرنے یا کسی کی تضحیک کے ناپاک جذبے کا دخل تک نہ ہوگا۔ اکثر خطوط میں یہ تجویز کیا گیا ہے کہ ان تمام واقعات کو کتابی شکل میں شائع کیا جائے۔ ادارہ شانِ ہند اس تجویز پر سنجیدگی سے غور کر رہا ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ ناظرین شانِ ہند میں سے ہی کوئی خدا کا بندہ اس کتاب کو چھپوانے کے جملہ اخراجات کا بوجھ اٹھانے کو تیار ہو جائے۔ آپ یقین رکھئے کہ ان صفحات میں آپ ایسے ایسے سچے حالات پڑھ سکیں گے کہ جو ابھی تک عوام و خواص کی نظروں سے اوجھل تھے اور خدا نے چاہا تو بہ کوئے یار بہ انداز محرمانہ گزر کتابی شکل میں شائع ہوئی تو یقیناً یہ کتاب اردو ادب میں اپنی نوعیت کی واحد کتاب ہوگی۔ انشاء اللہ ہم ... کہ آفسٹ پر طبع کرانے پر اس کتاب کی دس ہزار جلدوں کے ایڈیشن پر دس ہزار روپیہ خرچ ہوگا۔ خدا نے چاہا تو اس کے ایک اشتہار ... پر یہ انتظام ہو جائیگا۔

اہلِ سنبھل (ضلع مرادآباد) کے نام دردمندانہ اپیل

ہندو ہی مرے ہے نہ مسلمان مرے ہے
اس یگ کے فسادات میں انسان مرے ہے

کسی دل افگار کے مندرجہ بالا شعر کے مفہوم کو بھارت ماتا کی گود کے پالے ہمارے شریف انسانوں کے لئے پیش کرتے ہوئے اپنے ملک کی آزادی کی برقراری کی آشا کر رہا ہوں۔

امید ہے کہ سنبھل مرادآباد کے لوگ اس نویدن پر خاص توجہ فرمائیں گے۔ اور ایک لمحہ کے لئے اس اصلیت کو اپنے دل و دماغ میں بسا کر سوچیں گے کہ ہم سب اپنے دیش میں آزاد ہیں یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے منتخب کردہ نمائندوں کے بنائے ہوئے حکومت کے پلانوں کو سر تو تسلیم کریں۔ اور دیش کی تعمیر نو میں سب نے مل کر حصہ لیا ہے۔

اب ہم دراوڑ، گونڈ، بھیل، عراقی، ایرانی۔ افغانی یا عربی نہیں ہیں۔ ہم سب اس دیش کی مٹی سے پیدا ہوئے ہیں۔ ہر چند کہ مذہب کے لحاظ سے ہم ہندو، سکھ، مسلم، عیسائی یا پارسی ہیں۔ مگر ہم سب اول تا آخر بھارتی ہیں۔ اور ساری عربی وعجمی اور یوروپی برادری ہمیں ہندوستانیوں ہی کے طور پر جانتی ہے۔ اور ہم خود جب بھی کسی دوسرے ملک میں جاتے ہیں تو اپنے آپ کو ہندوستانی ہی کہتے ہیں۔ یاد رکھنے کی بات ہے کہ چین، جاپان، روس۔ امریکہ، پاکستان، ایران۔ افریقہ۔ یورپ۔ مکہ و مدینہ کسی بھی جگہ سے ہمیں بلایا نہیں جا رہا ہے۔ مگر یو۔ این۔ او کے سارے آزاد دیش ہماری قومی و معاشی ترقی کے لئے تو ہماری امداد کریں مگر ہماری حیوانیت اور مردم کشی پر کسی بھی دوسرے ملک کا سربراہ ہمارے اس باہمی کشت و خون پر کوئی توجہ بھی نہیں دیتا بلکہ ہمارا مذاق اڑایا جاتا ہے۔

ہم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ ہم سب ہندو، سکھ، عیسائی، مسلمان، پارسی۔ ہریجن۔ اور دوسری جاتیوں کے لوگوں کو اسی بھارت ماتا کی گود میں رہنا ہے ———

انسانیت و آدمیت کا سر بلند کرنا ہے۔ یہ دنگے فسادات، ہڑتالیں، اپنی ہی قیمتی املاک کو جلانا اور اپنے ہی بچوں، بہنوں۔ ماؤں، بیٹوں اور بھائیوں کا قتلِ عام انسانیت کا شیوا نہیں ہے سیاست کا کھیل ہر وقت نہیں کھیلا جا سکتا۔

جس طرح سماجی سینٹری پنچایت راج تنتری دوارہ عام شہریوں، دیہاتوں کے شبد بارک پروگرام چلتے ہیں کیا ہی اچھا ہوتا اگر امن و شانتی سمتی منترالیہ بھی ہو۔ اور کچھ اخلاقی اختیار والی ضلع و صوبہ و محلہ امن کمیٹیاں بنادی جاتیں اور ان میں ضلع کلکٹر کی خاص نگرانی میں خاص خاص چنے ہوئے بزرگ ممبران کے طور رکھے جاتے۔ ایسے ممبران امن کمیٹی کا ریکارڈ پولیس وغیرہ کے ذریعہ دیکھا بھالا ہونا ضروری ہے اور ممبران امن کمیٹیوں کی بیٹھکیں ہر پندرہ دنوں کے بعد سنٹرل کمیٹی کی اور ہفتہ وار محلہ و قصبہ کمیٹیوں کی سرکاری افسران کی موجودگی میں ہوتی رہتیں۔ تو بڑی حد تک جنگجو، لڑاکو اور بدامنی پھیلانے والے دماغوں پر بندش لگتی، اور محلہ و قصبہ و ضلع و صوبہ منترالیے بیکار دل کو کام پر لگنے اور پولیس اور قانون کے کام کو بھی کم کیا جا سکتا۔

ہم سب کو مل کر امن کو بڑھاوا دینا ہے۔ نفرت کو باہمی اتحاد اور پیار میں بدلنا ہوگا۔ اپنے اپنے مذہبی امور کی پابندیوں کے ساتھ اخلاقی اور عام شہری پابندیوں کو بھی سچائی اور ایمانداری سے پورا کرنا ہوگا۔

آپ سب کا خدمت گزار: حکیم رئیس احمد صدر ضلع امن کمیٹی (شانتی سمتی) محلہ میاں سرائے سنبھل (ضلع مرادآباد) یو، پی۔

غــزلیــات

سرؔور رضوی فتح گڑھ

دل میں جو آگ سُلگتی رہی ارماں بن کر
وہ جلاتی رہی سوزِ غمِ پنہاں بن کر

جب کبھی آپ کو فرصت ملے فرزانوں سے
آپ آجائیں مرے دل میں دلِستاں بن کر

آپ رخصت ہوئے امواجِ بہاراں کی طرح
دل میں ارمان مچلنے لگے طوفاں بن کر

جاں نثاروں سے تقاضائے وفا کی خاطر
بزم میں آئے ہیں وہ شمعِ فروزاں بن کر

جن کی صورت کو ترستی رہی آنکھیں برسوں
آج وہ گھر میں مرے آئے ہیں مہماں بن کر

ڈارون کا ہے مقولہ کہ یہ انساں ہے وہی
کوہساروں میں جو صدیوں رہا حیواں بن کر

چاہتے ہو کہ دُنیا میں رہیں سب مسرور
اپنے مرکز پہ یہ انسان رہے انساں بن کر

وقارؔ ظہری

کہاں سے ڈھونڈ کے لاؤں ترا پتا اے دوست
کہیں کہیں تو ملیں ترے نقشِ پا اے دوست

ہیں راہِ زیست پہ یوں گامزن رہا اے دوست
کہ حادثوں نے کہا مجھ کو مرحبا اے دوست

بلند و پست کی دیوار گر بھی سکتی ہے
یہ فاصلہ تو نہیں کوئی فاصلہ اے دوست

نہ چھیڑ نغمۂ دل وقت سازگار نہیں
ابھی دیا نہ جلا تیز ہے ہوا اے دوست

رُکا ہوا ہے وہیں کاروانِ زیست ابھی
کہ جس مقام پہ تو چھوڑ کر گیا اے دوست

اِک اجنبی کی رفاقت کا وہ حسیں لمحہ
مری حیات کو اک موڑ دے گیا اے دوست

نہ پوچھ شرحِ غمِ زندگی وقارؔ نہ پوچھ　　　نہ پوچھ مری تباہی کا واقعہ اے دوست

(نکہتؔ خاں ناگپور)

کچھ نہیں ہاں مرے احساس کا دھوکہ ہوگا
خواب میں تو نے میرا نام پکارا ہوگا

ہم تو جانتے ہیں کہ بکھرا ہے سب کچھ یونہی
آپ آئیں گے تو کمرے کو سجانا ہوگا

ہم تو سوتے نہیں برسات کی جلتی شب میں
تم پہ کیا بیت گئی رات بتانا ہوگا

ایک مدت سے کوئی خط نہیں لکھا تم نے
بھول جاؤ گے مجھے تم کہاں ایسا ہوگا

اس دفعہ موسمِ گل میں تمہیں اپنے ہاتھوں
میرے جوڑے میں کوئی پھول لگانا ہوگا۔

بقیہ صفحہ ۲ مگر مطلب براری نہ ہونے کے باعث سردار صاحب کی انتقامی خصلت غضبناک ہو اٹھی اور انہوں نے یہ پمفلٹ کئی ہزار چھپوا کر ہندوستان کے ہر سنیما ہاؤس کے مالکان، بمبئی کے ہر فلمی ادارے اور ہر فلمی ایکٹر اور ایکٹریس کو بذریعہ ڈاک بھجوایا۔ لالہ جگت نارائن کے تمام رشتہ داروں کو بھی یہ پمفلٹ بھجوایا گیا۔ مگر لالہ جگت نارائن کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی انہوں نے اپنے داماد، اپنے سمبندھی۔ اور دوسرے رشتہ داروں کو ایک پرتکلف دعوت پر مدعو کر کے سب حالات از خود بتا دیئے کہ انہیں بلیک میل کرنے کے لئے ایک پمفلٹ شائع کیا گیا ہے جو آپ تک پہنچے گا۔ لہٰذا سردار صاحب کو بلیک میلنگ کی مہم میں پہلی بد شکست پر بڑا افسوس تھا اور وہ کسی نہ کسی طرح لالہ جگت نارائن سے اس شکست کا بدلہ لینا چاہتے تھے۔ جس کی تفصیل اگلی قسط میں پڑھیئے گا۔ ہاں یہ پمفلٹ پڑھنے کے بعد پہلی بار ایڈیٹر شانِ ہند کے دل میں سردار پوران سنگھ موتون کے تئیں نفرت پیدا ہوئی کہ یہ شخص بلیک میلنگ کے لئے اس قدر بد اخلاقی اور گھٹیا پن کی نچلی سطح تک بھی آسکتا ہے۔ (جاری ہے)

بہ کوئے یار بانداز محرمانہ گزر

(سرور تونسوی)

سردار دیوان سنگھ مفتون جس قدر فراخ دل۔ بے باک۔ مقبول ترین۔ بہترین دوست اور بدترین دشمن تھے۔ اتنے ہی کینہ پرور۔ خودغرض۔ اور عورت کے معاملے میں لنگوٹ کے کچے تھے۔ چونکہ دو شادیوں کے باوجود وہ اپنی بیویوں سے نبھا نہ کر سکے۔ اس لئے عمر کا زیادہ تر حصہ بیویوں کی رفاقت اور قربت کے بغیر گزرا۔ جنسی بھوک ان پر غالب رہتی تھی۔ "ریاست" کی دھاک اور ہیبت اکثر ریاستوں کے راجاؤں اور نوابوں کے دلوں پر اس بری طرح بیٹھی ہوئی تھی کہ وہ سردار صاحب کو خوش رکھنے کے لئے انہیں روپیہ دیتے۔ بہتے تھے مفت ہاتھ آئے روپے کو بے دردی سے خرچ کرنا سردار صاحب کی عادت ثانیہ بن گئی تھی اور جونہی کوئی عورت ان کے قریب آتی وہ اس پر بے دریغ روپیہ خرچ کرتے، اور سعدی شیرازی کے فرمان کے مطابق "لطف کن لطف کہ بیگانہ شود حلقہ بگوش"، وہ عورت واقعی ان کی "حلقہ بگوش" بن جاتی۔ ویسے بھی عورت کی یہ فطرت ہے کہ وہ بہادر اور فراخ دل مرد کی قدر کرتی ہے اور خدا نے یہ دونوں صفات سردار صاحب کو وافر عطا کی تھیں لہٰذا انہیں عورتیں نہایت آسانی سے حاصل ہو جاتی تھیں اور ویسے بھی انہوں نے اس کام کے لئے ایک دلال رکھا ہوا تھا جو جاپانی اس خدمت کے باعث سردار صاحب پر بری طرح سے حاوی تھا اور یہ ایک حقیقت ہے کہ جہاں دیوان سنگھ مفتون کے نام سے راجے مہاراجے اور نواب گھبراتے تھے وہاں خود سردار صاحب اس دلال جس کا نام ظفر احمد تھا سے ڈرتے تھے۔ ظفر احمد۔ جوان اور خوبصورت تھا مگر کوئی کام کاج نہیں کرتا تھا۔ ہر وقت سردار صاحب کے یہاں پڑا رہتا تھا مفت کا روپیہ اور بھر پور عورتوں کی دلالی کے عوض حاصل شدہ روپیہ کہتے ہیں انسان کے خون کو پانی کی شکل میں بدل دیتا ہے۔ اور وہ شخص محنت و مشقت نہیں کر سکتا ہاں یہ ظفر احمد اس اعزاز پر خوش تھا کہ سردار صاحب نے "ریاست" کا پرنٹر پبلشر اسے بنا رکھا ہے۔ حالانکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ سردار صاحب اکثر ہتک عزت کے مقدمات میں گھرے رہتے تھے اور پکے کانگریسی ہونے کے باعث انگریزی حکومت انہیں پسند نہیں کرتی تھی۔

لہٰذا کب سردار صاحب جیل چلے جائیں اس لئے کہ قیام جیل کے دوران اخبار جاری رہے ظفر احمد صاحب کو ریاست کے پرنٹر پبلشر کے اعزاز سے نوازا گیا تھا۔

۱۹۴۷ء کے انقلاب کے باعث ظفر احمد پاکستان چلا گیا۔ ادھر راجے مہاراجے خود ریاستوں کے بجائے محض نام کے راجے مہاراجے رہ گئے تھے۔ اور سردار صاحب عمر کے لحاظ سے بھی اس زمرہ میں داخل ہو گئے تھے جہاں کوئی عورت صرف روپیہ بٹورنے کے لئے جنسی تلذذ کی جھک مارنے کو مل جائے تو مل جائے ورنہ کسی قسم کی جنسی کشش کا اب سوال ہی نہیں تھا۔ اور روپیہ کی اگر قدر نہ کی جائے تو وہ بھی انسان کی قدر کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ سردار صاحب کے پاس جب لاکھوں روپیہ تھا اس وقت انہوں نے ایک کوڑی بھی پس انداز نہیں کی تھی کیونکہ ہمیشہ گرم رہے خدا کا کوڑی نہ رکھ کفن کو" پر عمل پیرا رہے۔ اور اب ایسے ہو گئے تھے کہ ظفر احمد پاکستان چلا گیا۔ کسی ریاست کے راجے یا نواب سے روپیہ ملنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ عمر کے لحاظ سے سردار صاحب کے عملی طور پر پنچھی نچ چکے تھے مگر وہ کہتے یہی تھے کہ "ابھی تو میں جوان ہوں" تاہم شیر بوڑھا ہو جائے تو بھی گھاس نہیں کھاتا۔ اور اس کہاوت پر یوں ایمان لانا پڑتا ہے کہ خدا شکر خورے کو شکر دیتا ہے۔ لہٰذا کوئی نہ کوئی صاحبہ پرانے تعلقات کی بنا پر یا کسی مطلب براری کے باعث سردار صاحب کے چنگل میں آہی پھنستی تھی۔

راقم الحروف کے تعلقات سردار صاحب سے اس وقت ہوئے جب لالہ کرم چند مرحوم ایڈیٹر پارس نے لاہور میں سردار دیوان سنگھ پر مقدمہ دائر کیا۔ اور میں اُن دنوں ملتان سے ہفتہ وار شانِ ہند شائع کیا کرتا تھا شانِ ہند کے اداریے سردار صاحب کو پسند آتے تھے اور پھر یہ اداریے پسندیدگی ذاتی واقفیت میں یوں تبدیل ہوئی کہ اس مقدمہ میں سردار صاحب نے مجھے اپنے گواہان میں شامل کر لیا۔ اور میری اُن کی پہلی ملاقات لاہور ریلوے اسٹیشن کے سامنے ہوٹل بگھمز میں ہوئی کچھ ہی سالوں

تاہم پاکستان کے باعث مجھے بھی بادلِ ناخواستہ ملتان سے دہلی آنا پڑا۔ "شانِ ہند" اس وقت تھا تو ایک ہفتہ وار جریدہ مگر اس کے نام سے سرکاری افسران گھبراتے تھے اور وہ ہر جائز یا ناجائز طور پر شانِ ہند کو ڈراتے رہتے تھے۔ اس زمانے میں ملتان سے درجنوں ہفت روزے شائع ہوتے تھے۔ مگر شانِ ہند کی حیثیت "ملتان کی ریاست" کی سی تسلیم کی جاتی تھی۔ خواجہ عبدالکریم قاصف جو اُن دنوں ہفت روزہ ناموس کے ایڈیٹر تھے۔ اور شیخ عمر حیات چیدا، افسر علی مرحوم نگارِ ملتان جیسے احباب میں سے تھے۔ "شانِ ہند" کو سرکاری اشتہارات سے معقول آمدنی تھی کیونکہ سنگر ہو کہ مٹی کا تیل وغیرہ سب سول سپلائیز آفیسر سے پرمٹ لینے پڑتے تھے۔ اور یہ پرمٹ دلانا ایڈیٹر شانِ ہند کے لئے ایک بہت معمولی سی بات تھی۔ اس لئے اُس وقت ملتان چھاؤنی کے غریب مسلمانوں اور ہندوؤں میں ایڈیٹر شانِ ہند کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ جہاں اس کا پسینہ گرے وہاں یہ غریب لوگ اپنا لہو گرانے کو تیار تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ میرا ایک پیسے کا نقصان نہیں ہوا۔ اور کرفیو کے باوجود درجنوں مسلمان مجھے اُس ٹرین میں سوار کرانے اُس سپیشل پلیٹ فارم تک آئے جہاں ہمیں ہندوستان سے جانے کے لئے ٹرین کھڑی تھی۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ راقم الحروف پاکستان سے یہاں آنے کے لئے قطعاً تیار نہیں تھا۔ اور پاکستان بننے کے بعد ۱۵ اکتوبر تک شانِ ہند ہر ہفتہ شائع ہوتا رہا۔ اور سرکاری اشتہارات وغیرہ کی اشاعت پہلے سے زیادہ رہی۔ مگر حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ خود ڈپٹی کمشنر، راشنگ ڈائریکٹر سید صاحب اور دوسرے افسران نے خفیہ مشورہ دیا کہ میں اپنے اہل و عیال لے کر ہندوستان چلا جاؤں۔ لہٰذا ۲۱ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو میں نے اپنے وطن عزیز کو طوعاً و کرہاً خیرباد کہا۔ پاکستان سے ہندوستان آنے کا یہ بھی ذکر محض اس لئے کیا گیا ہے کہ میں نے پاکستان کو مجبوراً خیرباد کہا۔

ملتان سے دہلی پہنچا تو مرحوم منشی عبدالقدیر صاحب نے ایک خستہ سا مکان بلد چاندنی محل میں پچاس روپیہ کرایہ پر دلا دیا۔ اتفاق سے سردار دیوان سنگھ مفتون بالکل قریب ہی پھاٹک مفتی والان میں مقیم تھے۔ سردار صاحب کا دفتر اور رہائش گاہ ایک ہی مکان میں تھی۔ لہٰذا ہر شام کو ماسٹر امیر چند کھنہ (مرحوم) اور راقم الحروف سردار صاحب کے ہاں بلاناغہ آتے اور رات کا کھانا بھی سردار صاحب کے ہاں ہی کھاتے۔ یہ محفل رات کے ساڑھے دس بجے تک رہتی۔ حضرت جوش ملیح آبادی، جناب بہار لکھنوی (مرحوم)، نریش کمار شاد مرحوم، جناب مضطر ہاشمی، محترمہ شفیق بانو شفق، جناب مرزا صاحب اور ان کی بیگم محترمہ ممتاز مرزا صاحبہ۔ بیگم شاہ حکمت اور کئی دوسرے ادیب شاعر اور صحافی بھی کبھی کبھی تشریف لاتے اور یہ محفلیں اور بھی دلچسپ بن جاتیں۔

اُن دنوں ایک سکھ عورت جو ادھیڑ عمر کی تھی جب بھی سردار صاحب کے ہاں آتی تو سردار صاحب ہم سب سے یوں خاموشی اختیار فرماتے جیسے وہ ہمیں جانتے ہی نہیں۔ سردار صاحب سالن وغیرہ [illegible] خود پکاتے تھے اور روٹیاں تندور پر سے منگوائی جاتی تھیں۔ اس سردارنی جی کے آنے پر سردار جی یہ بھول جاتے کہ حسبِ معمول جمع شدہ احباب نے رات کا کھانا نہیں کھانا ہے۔ اکثر مرتبہ تو یہ بھی ہوا کہ سالن تیار ہو چکا ہے اور ملازم تندور سے روٹیاں پکوانے گیا ہوا ہے۔ مگر سردار جی کی جنسی حس اس قدر تیزی سے بھڑک اٹھتی تھی کہ وہ صاف الفاظ میں کہہ دیتے تھے کہ اچھا حضرات گڈ بائی۔ سردار صاحب کے اس سلوک پر ماسٹر امیر چند کھنہ برہم بھی ہوتے اور ہم دونوں یہ تہیہ کر لیتے کہ اب سردار صاحب کے ہاں رات کو نہیں آیا کریں گے۔ مگر دوسرے دن ہر شام سردار صاحب کا نوکر دروازے پر کھڑا دکھائی دیتا کہ سردار صاحب سردار جی نے کہا ہے کہ ایک بہت ضروری کام ہے جس حالت میں بھی ہو ویسے ہی چلے آؤ۔ کئی بہانے بنائے جاتے کہ سردار صاحب کے ہاں نہ جایا جائے مگر اُن کا ملازم ہے کہ خواہ رات کے بارہ بج جائیں دروازے پر کھڑا ہے اور بضد ہے کہ سردار صاحب نے کہا ہے کہ انہیں ساتھ لے کر ہی آنا اور ادھر ماسٹر امیر چند کھنہ کے ساتھ بھی یہی ہو رہا ہوتا کہ سردار صاحب انہیں کسی دوسرے آدمی سے فون پر کہلوا رہے ہیں کہ سردار دیوان سنگھ کی طبیعت بہت خراب ہے انہوں نے آپ کو فوراً بلایا ہے۔ اور جونہی میں یا ماسٹر امیر چند کھنہ ان کے ہاں پہنچے تو سردار صاحب اپنے مخصوص انداز میں زور زور سے قہقہے لگاتے اور گزشتہ رات کی [illegible] پر افسوس ظاہر فرماتے اور حسبِ معمول وہی محفلیں جمنے لگتیں۔ اس سردارنی کا شوہر بھی تھا معلوم نہیں وہ کچھ کرتا تھا یا نہیں مگر یہ سردارنی سردار صاحب سے اچھی خاصی رقم کشید کرتی تھی۔ ہر ہفتے چکر لگاتی۔ اور آپ کا شوہر شراب نوشی کرتے اور کھانا بھی کھاتے اور رات کے گیارہ بجے تک سردار صاحب جب ٹھنڈے ہو لیتے تو یہ میاں بیوی سو دو سو روپے دکشنا لے کر رخصت ہو جاتے۔

پھاٹک مفتی والان میں دو چار گھر غریب مسلمانوں کے تھے اور باقی

سب دیکھ ہی رہے ہوتے تھے۔ سردار صاحب شام کی چائے پر محلے بھر کے بچوں کو مدعو کرتے اُن دنوں دو پیسے کا سموسہ ملتا تھا۔ ہر بچے کو ایک ایک سموسہ اور چائے کا نصف گلاس ملتا۔ رفتہ رفتہ شاید ہی کوئی ایسا گھر بچا ہو جس سے کوئی بچہ سردار صاحب کے ہاں شام کی اس ٹی پارٹی میں شریک نہ ہوتا ہو۔ باتوں باتوں میں مفتون صاحب ان بچوں سے ہر گھر کے اندرونی حالات معلوم کر لیتے تھے انہیں یہ معلوم رہتا تھا کہ کس گھر کی لڑکی سکول جانے کے بجائے اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ سینما دیکھنے یا گھومنے جاتی ہے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ کون سی لڑکی کس لڑکے کے ساتھ محبت کی پینگیں بڑھا رہی ہے۔ اور انہیں یہ بھی پتہ چل جاتا تھا کہ کس گھر میں فاقہ کشی کی نوبت آ گئی ہے۔ اور کون کون عورتیں اپنے زیورات فروخت کر کے گزر اوقات کر رہی ہیں۔ معصوم بچوں کے ذریعہ اس سی۔ آئی۔ ڈی سے حاصل شدہ معلومات کی بنا پر وہ یہ اندازہ بخوبی لگا لیتے تھے کہ اُن کی دال کہاں گل سکتی ہے۔ سردار صاحب کے ہاں تبادلہ میں کم و بیش پانچ صد روزنامے ہفت روزے، ماہنامے وغیرہ آتے تھے۔ حالانکہ "ریاست" بہت کم تعداد میں زیادہ سے زیادہ پچاس ساٹھ جرائد و رسائل کو ہی تبادلہ میں بھجوایا جاتا تھا۔ مگر سردار صاحب کے یہاں ہر روز جرائد و رسائل کا ٹھیلا بھر کر آتا تھا۔ اکثر و بیشتر اخبارات و رسائل کے تو وہ ریپر بھی نہیں پھاڑتے تھے۔ وہ اپنے اندازے کے مطابق محلے کے بچوں کو تبادلہ میں آئے ہوئے ردی اخبارات دیتے تاکہ وہ خود یا اُن کے گھر والے ان کو ردی خریدنے والوں کے ہاتھ فروخت کر سکیں۔ محلے کے اکثر بچوں کی فیس ادا فرماتے۔ اور انہیں سکول کی کتابیں بھی خرید دیتے۔ لہٰذا ان کی یہ فیاضیاں بظاہر ان کی رحمدلی، کرم فرمائی اور شفقت کا نمونہ تھیں مگر ان سب کی آڑ میں کسی نہ کسی طرح اُن کی جنسی ضرورت بھی کسی حد تک پوری ہو ہی جاتی تھی۔

۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد سردار صاحب پر مالی انحطاط اکثر و بیشتر چھایا رہا۔ راجاؤں اور نوابوں کو اب اُن سے کوئی ڈر نہیں رہا تھا کیونکہ جب ان کی اپنی ریاستیں ہی ختم ہو گئی تھیں تو ان راجاؤں اور نوابوں کو اب اخبار ریاست کی کیا پرواہ تھی اور ادھر سردار صاحب گھاس کھانے پر تیار نہیں تھے۔ چنانچہ انہوں نے دلی کی مشہور علمی شخصیت لالہ جگت نارائن کے خلاف ایک پمفلٹ لکھا اور اُسے کرنال کے ایک پریس سے چھپوایا گیا مگر پرنٹ لائن لاہور (پاکستان) کے کسی پریس کی دی گئی۔ یہ پمفلٹ کیا تھا ایک ایسا بم تھا کہ جس کے دھماکے سے لالہ جگت نارائن کا ہارٹ فیل ہو سکتا تھا۔ بڑے ڈرامائی انداز میں یہ پمفلٹ لالہ جگت نارائن (مرحوم) تک پہنچایا گیا۔ اور انہیں کہلوایا گیا کہ کم از کم دس ہزار روپیہ دو تو یہ پمفلٹ آؤٹ نہیں ہوگا۔ ورنہ یہ پمفلٹ علمی دنیا کے ہر فرد کے ہاتھوں میں ہوگا۔ یہ پمفلٹ پڑھنے کے بعد لالہ جگت نارائن مرحوم نے لالہ کرم چند آف پارس۔ پنڈت ہری چند اختر اور دوسرے صحافیوں کو صلاح و مشورے کے لئے بلایا۔ صحافیوں نے لالہ جگت نارائن کو خوب ڈرایا اور یہ مشورہ دیا کہ سردار صاحب سے اونے پونے سودا کر لیا جائے اور یہ پمفلٹ آؤٹ نہیں ہونا چاہئے کیونکہ ان صحافیوں کی اپنی نیت صاف نہیں تھی۔ اور یہ چاہتے تھے کہ لالہ جگت نارائن نے اگر بلیک میل ہو کر روپیہ سردار صاحب کو دیا تو اُن کے ہاتھوں میں لالہ جگت نارائن کی یہ کمزوری آ جائے گی اور آئندہ وہ بھی لالہ جگت نارائن کو جب دل چاہے گا بلیک میل کیا کریں گے۔ پنڈت ہری چند اختر سے ایڈیٹر شان ہند کے تعلقات انتہائی نیازمندانہ تھے اور اختر صاحب جانتے تھے کہ اس معاملے میں سرور تونسوی کارآمد ثابت ہو سکے گا۔ لہٰذا صبح سویرے جبکہ ابھی میں سو رہا تھا غریب خانہ پر تشریف لائے اور انہوں نے حکم دیا کہ اسی وقت میرے ساتھ چلئے ایک نہایت ضروری معاملے میں تم سے مشورہ لینا ہے۔ دس پندرہ منٹ میں منہ ہاتھ دھو کر اُن کے ساتھ ہو لیا۔ دریا گنج پوسٹ آفس کے قریب آ کر ٹیکسی میں بٹھا کر مجھے لالہ جگت نارائن کی کوٹھی پر لے گئے۔ لالہ جگت نارائن سے میری یہ پہلی ملاقات تھی۔ پمفلٹ میں پڑھ ہی چکا تھا لالہ صاحب نے بڑے تپاک سے ہمارا استقبال کیا۔ پنڈت ہری چند اختر نے میرا تعارف کرایا اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ انہیں میں چھوٹا بھائی سمجھتا ہوں اس لئے ان پر پورا پورا اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ اور اس معاملہ میں جو مشورہ یہ دیں اس پر عمل کرنا آپ کے لئے واقعی مفید ہوگا۔ لالہ جگت نارائن نے بالکل فیصلہ کن انداز میں فرمایا کہ سرور صاحب آپ یہ مشورہ دیجئے کہ میں بلیک میل کے آگے سر تسلیم خم کروں یا نہیں۔ اور میری زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔ قطعاً نہیں۔ لالہ جی کو میرے اس جواب سے جیسے کہ ہر مُراد مل گیا ہو فرمانے لگے میں نے بھی یہی فیصلہ کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس پمفلٹ میں جو کچھ لکھا گیا تھا اس سے بڑے سے بڑے دل گردے والا بھی بلیک میل ہو جاتا۔ مگر آفرین ہے لالہ جگت نارائن کو جنہوں نے اپنے فیصلے اور میری طرف سے اس فیصلہ کی تصدیق پر اس پمفلٹ کو ردی کے ایک ٹکڑے سے زیادہ اہمیت نہ دی اور سردار دیوان سنگھ مفتون کے ایلچی سے کہہ دیا کہ سردار صاحب سے کہہ دیجئے کہ میں ایک آنہ بھی نہیں دوں گا آپ بیشک اس پمفلٹ کو آؤٹ کر دیجئے۔ یہ پمفلٹ محض ایک نسخہ کی تعداد میں چھپوایا گیا تھا کیونکہ سردار صاحب کو یہ یقین تھا کہ اس پمفلٹ کو پڑھتے ہی لالہ جگت نارائن دس ہزار روپیہ بھجوا دیں گے۔ (بقیہ ص [illegible])

ازہر لائل پوری (سورت)

۱۳ اپریل سنہ ۱۹۲۱ء کو تحصیل گوہانہ ضلع روہتک (ہریانہ) میں پیدا ہوا۔ اور بھٹی خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔ میرے پڑدادا جناب تہور علی خاں برطانیہ سرکار کی سروس میں تھے۔ اور برطانوی سرکار نے انھیں اعلےٰ خدمات کے سلسلے میں کافی زمین انعام میں دی۔ اور انہیں ستارۂ ہند کے خطاب سے نوازا گیا۔ انعامی زمین گردھانہ چک ۲۷ ضلع لائل پور (حال پاکستان) میں دی گئی اور تحصیل گوہانہ ضلع روہتک میں ہماری اپنی جدّی زمین تھی۔ انعامی زمین ملنے پر میرے پڑدادا وہیں جا آباد ہوئے۔ اور گوہانہ کا تمام کاروبار میرے دادا جناب اصغر علی کے سپرد کیا گیا۔ میرے دادا صاحب کے تین لڑکے تھے۔ ایک میرے والد جناب خان محمد صاحب دُوسرے چوہدری شافع علی جو کہ اُن دنوں ضلع روہتک ہی میں مجسٹریٹ تھے تیسرے چودھری خلیل الرحمٰن تھے۔ جو زمینداری کا کام سنبھالتے تھے۔ میرے والد صاحب سنہ ۱۹۱۴ء میں سندھ ہارس رسالے علا۔ کیپٹن کے عہدے پر تھے۔ ہم بھی تین بھائی تھے۔ جن میں ایک ممتاز علی نئی دہلی کے بڑے پولیس اسٹیشن میں تھے اور پھر عرصۂ دراز تک وائسرائے گارڈ میں رہے۔ دُوسرے بھائی مقصود علی راجپوت رجمنٹ میں تھے۔ میری پیدائش کے بعد دادا ابزرگوار نے ہمیں گردھانہ ضلع لائل پور بلوالیا۔ اس وقت میری عمر نو سال کی تھی۔ میں تین سال گردھانہ میں رہا اور تعلیم حاصل کرتا رہا۔ اس کے بعد میرے ماموں صاحبان نے مجھے واپس گوہانہ بلالیا۔ میرے والد سرکاری ملازمت سے ریٹائرڈ ہو چکے تھے۔ اور دادا ابزرگوار کا انتقال ہو چکا تھا۔ میرے والدین گردھانہ میں مقیم ہو گئے۔ اور میرے ماموں جناب عبدالحمید صاحب کا کوئی لڑکا نہ تھا اس لئے انہوں نے مجھے اپنے پاس رکھا اور میرے والدین سے کہدیا کہ نیاز محمد ہمارے بیٹے کی طرح یہیں رہے گا۔ میں نے میٹرک گوہانہ میں ہی کیا۔ اور رائل انڈین نیوی میں بھرتی ہو گیا۔ اور پانچ سال سروس کی اور میں لیڈنگ سی مین اور سیکنڈ کلاس گنر رہا۔ اور کورس پلیموتھ پورٹ سمتھ انگلینڈ میں کیا۔ عدن۔ نہر سویز۔ مالٹا۔ جبرالٹر۔ شیرنیس۔ پورٹ سمتھ۔ گلاسکو۔ لندن۔ چیاٹم۔ دارالسلام۔ ممباسہ۔ اٹلی۔ سسلی۔ جینوا۔ منیلا۔ پورٹ لینڈ۔ بوان ساوتھ۔ انڈونیشیا۔ جکارتہ۔ بالی۔ سنگاپور کے مقامات کا سفر ان پانچ سالوں میں رائل انڈین نیوی میں رہ کر کیا۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد میں نے بمبئی میں رہائش اختیار کر لی۔ قریباً دو سال تک حکمت سیکھی۔ اسی دوران ایک عمر رسیدہ بزرگ درویش سے ملاقات ہوئی۔ دن میں حکمت پڑھتا اور شب کو ان بزرگوار کی خدمت میں رہتا۔ انہوں نے بہت کچھ عنایت کیا اور حکم دیا کہ تم سورت چلے جاؤ اور وہیں رہو۔ یہاں آکر کافی جدوجہد کرنی پڑی اور امتحان دے کر R.M.P کا سرٹیفکٹ حاصل کیا۔

سورت کی مقدس ہستی قبلہ سید محمد بن عبداللہ العدروس جن کی اولاد آج بھی موجود ہیں۔ میرے پیرومرشد ہیں۔ اور اس وقت پیرومرشد کی جگہ ہی فقیرانہ زندگی بسر کر رہا ہوں۔ ذریعہ معاش حکمت ہے۔ میرے دو لڑکے عبدالقادر اور نور محمد اور ایک لڑکی ہے۔ اور گزشتہ تیئیس سالوں سے سورت میں ہی مقیم ہوں۔

شعر و شاعری کا شوق شروع سے ہی تھا۔ سورت کے ایک شاعر صاحب سے درخواست کی کہ میرے کلام پر نظرثانی فرمادیا کریں جو سنہ ۱۹۶۲ء سے یہ نوازش فرماتے رہے۔ مگر اب وہ مجھ سے رنجش رکھتے ہیں۔ اُن کی ناراضی کہاں تک صحیح ہے اس بارے میں حق و ناحق کا فیصلہ خدا کے اختیار ہے۔ ان صاحب نے صرف پانچ سات غزلوں پر ہی اصلاح فرمائی۔ ذیل میں دو غزلیں پیش کر رہا ہوں۔

(۱) ہر طرف پارہا ہوں خوشی ہی خوشی میں ترستا نہیں ہوں خوشی کیلئے
اے محبت ترا غم سلامت رہے اور کیا چاہئیے زندگی کیلئے
باغِ عالم میں ہوتا رہا ہے یہی اور ہوتا رہے گا یہی دیکھنا
شکوہ سنجانِ فصلِ بہاراں سنو پھول کھلتے نہیں ہر کسی کیلئے
وقت بدلا نگاہیں بدلنے لگیں دیکھتے دیکھتے کیا سے کیا ہو گیا
بھر رہے تھے جو دم دوستی کا ابھی وہ کمربستہ ہو گئے دشمنی کیلئے

ـــه بلا انتخاب (ادارہ)

بندگی کے حق نام لاکھوں ہی بندگی سے مگر کیا پتا نہیں
کس میں تپتا نہیں جذبۂ بندگی بندہ ہوتا چاہیے بندگی کیلئے
دوستی استوار سہل ہوتی نہیں اس کے پردے میں ہیں سیکڑوں مشکلیں
ہر کسی کے نہیں بس کی یہ بات کچھ حوصلہ چاہیے دوستی کیلئے
گو صحیح و سلامت نہیں غم نہیں میں بہرحال ساحل پہ آ تو گیا
کچھ [illegible] تیرے لئے اتنا کافی ہے شرمندگی کیلئے
او مری دل سے ہی خیر اس نے مگر آج پوچھا مرا حال اتنا بھی تو
ایک چھوٹی تسلی بھی اکثر بہت غم کے مارے ہوئے آدمی کیلئے

(۲)

جہاں تک آدمی غم سے پریشاں ہو نہیں سکتا
یقیناً ہو نہیں سکتا وہ انساں ہو نہیں سکتا
خزاں رکھے بڑا پُرکیف ہوتا ہے بیاباں بھی
کہا کس نے یہ ہم رنگِ گلستاں ہو نہیں سکتا
نہ تم چاہو تو [illegible] سکتے ہیں کیا مجھ سے جہاں والے
پریشاں کر نہیں سکتے پریشاں ہو نہیں سکتا
خدا برداشت کی توفیق دے مجھ کو مریضِ غم
یہ درد ایسا ہے جس کا کوئی درماں ہو نہیں سکتا
محبت ہی سے ہوتا ہے فروغِ زندگی ازہر
جسے یہ علم ہو ہرگز وہ ناداں ہو نہیں سکتا

نفیس احمد سراج

نام نفیس احمد۔ تخلص سراجؔ۔ والد ماجد کا اسم گرامی مولوی عبدالوحید صاحب۔ وطن ڈبائی، ضلع بلند شہر یو۔پی۔

ایک متوسط گھرانے میں ۱۴ راگست ۱۹۴۲ء میں پیدا ہوا ابتدائی تعلیم اسلامیہ اسکول ڈبائی میں حاصل کی۔ پڑھے لکھے گھر کا ماحول ملا۔ لیکن قبلہ محترم والد صاحب کی بیماری نے گھر کی حالت پر گہرا اثر چھوڑا۔ اور اقتصادی حالت پر کافی اثر پڑا جس کی وجہ سے پریشانیاں پیدا ہوئیں مگر بڑے بھائی جناب فرید احمد صاحب نے بڑی ہوشمندی سے پریشانیوں کا مقابلہ کیا اور حالات معمول پہ آگئے۔

شعر و شاعری کا شوق نعت خوانی سے شروع ہوا۔ ۱۹۶۱ء سے قبلہ نازش ہن اکبر احسن گنوری سے استفادہ حاصل کرنا شروع کیا انہیں کے توسل سے محترم متین بدایونی صاحب بھی سے نیاز حاصل ہوا۔ اور ان کے کرم نے شعر پہ تنہا گے کا کام کیا جو آج ہی [illegible] راہ کا کام دے رہا ہے۔

فنِ شاعری کے دائرے میں رہ کر ہی کچھ حاصل کرنے کا متمنی رہتا ہوں۔ اور حدِ فن میں کہنے والوں کی تعلیم و تکریم کو فرض سمجھتا ہوں۔ خود جو کچھ کہنے کی کوشش کرتا ہوں اس کے بارے میں آپ احباب ہی بہتر جان سکتے ہیں۔ ایک غزل ملاحظہ فرمایئے۔

زہر پینے دو مجھے دوستو مر جانے دو
زندگی بوجھ ہے یہ بوجھ اُتر جانے دو
ٹھہرو کچھ دیر ابھی اور سحر ڈھلتی ہے
کچھ ذرا اور نِدا اور نکھر جانے دو
اپنی اُلفت کا چمن ہوگا یقیناً سرسبز
پہلے طوفاں کو ذرا سر سے اُتر جانے دو
بھرے زخموں کو سِلے گا زمانہ ایک دن
دل کے تاروں کا ذرا ساز بکھر جانے دو
دوستو پند و نصیحت کا نہیں یہ موقع
سخت دشوار ہے اُلفت کا سفر جانے دو
میں ہوں فرقت کا ستایا ہوا غم کھایا ہوا
اپنی زلفوں میں مری عمر گزر جانے دو
ہر جگہ نقشِ قدم اُن کے نظر آتے ہیں صاف
اب مجھے راہ میں کیا خوف و خطر جانے دو
اہلِ فن ہیں جو سرِ بزم تو ہونے دو سراجؔ
میرے شعروں پہ کسی کی بھی نظر جانے دو

۱؎ بلا انتخاب (ادارہ)

نئے شعراء

عابد مناوری

(معذرت کے ساتھ)

دوستی مخمور و مثل سے بڑھانا چاہیئے
کرشن موہن کی طرح غزلیں چھپانا چاہیئے

وہ ندا ہو فاضلی کی یا نوا باقر کی ہو
کچھ سمجھ آئے نہ آئے جھوم جانا چاہیئے

ایک دو نظموں ہی سے مشہور ہو سکتے ہیں آپ
عادل و علوی سی بے پر کی اڑانا چاہیئے

یاد رکھنا چاہیئے راناؔ و رباؔنی کا کلام
میر و غالب بھی تھے شاعر بھول جانا چاہیئے

بے تکے الفاظ کو ترتیب دینے کا ہنر
زبیب و کومل کی طرح سب کو دکھانا چاہیئے

دو ہی شاعر ہیں علی گڈھ میں خلیل و شہریار
تیسرا ہو بھی تو گنتی میں نہ لانا چاہیئے

تجھ کو بھی آشنک اب مجروح و ساحر کی طرح
فلمی دنیا میں مقدر آزمانا چاہیئے

بد گماں صرف پاشی ہی بتا سکتا ہے یہ
ہر شریف انساں کو کیسے ورغلانا چاہیئے

اے مصور اپنی ایسی غزل سے باز آ
اہلِ اردو کو ہرگز یوں ڈرانا چاہیئے

دیکھئے چھلتے ہیں بحرِ مخمل پہ کیا مثلِ زبیر
ہر غزل ہر نظم فلمی دھن پہ گانا چاہیئے

شاعری الہام ہے آمد ہے جو کہتے ہیں یہ
مرغ منظور ان کے مرغوں سے لڑانا چاہیئے

حامدی نے بھی چھپا ڈالی ہے اک شعری کتاب
شاعروں میں اب تو اس کا نام آنا چاہیئے

شاعری کا کوئی مجموعہ اگر شائع کریں
شمس شب خونی سے دیباچہ لکھانا چاہیئے

بنے بھائی کب سے تھے خلد میں اختر یہ
جذبی و سردار کو پھر آگے آنا چاہیئے

دیکھ کر عابد نئے شعراء کا یہ جمِ غفیر
تجھ کو میدانِ سخن سے بھاگ جانا چاہیئے

(بشکریہ چٹنی پٹنہ)

غزل

شیداں ایرانی (رائے پور)

کسی در پر مرا سر خم نہیں ہے
جنوں کا یہ بھی احساں کم نہیں ہے

نہ تم کو گرد منزل کی ملے گی
تمہارا عزم جب محکم نہیں ہے

فراغت تھی کبھی زخم جگر کو
اسے اب حاجت مرہم نہیں ہے

بھنور چکرائے یا طوفان اٹھے
ہمارا حوصلہ بھی کم نہیں ہے

مداوائے غم دنیا میں کرتا
ترا غم ہے تو کوئی غم نہیں ہے

گھٹائیں چھا رہی ہیں میکدہ پر
تمہاری زلف تو برہم نہیں ہے

اندھیرا کیا مری دنیا میں ٹھہرے
وفا کی روشنی مدھم نہیں ہے

دو عالم کے بھی نظارے ہیں اس میں
یہ دل کیا رشکِ جامِ جم نہیں ہے

پری زادوں کی محفل ہے سلیماں
یہاں کوئی کسی سے کم نہیں ہے

ہم بھارت دیش کے باسی

(نازش پرتاب گڑھی)

عمارت اسی وقت مضبوط اور پائیدار ہو سکتی ہے جب اُس کی بنیاد ٹھوس زمین پر رکھی گئی ہو۔ آزاد ہندوستان میں ایک نئی قوم جنم لے رہی ہے۔ اور ایک نئے سماج کی تشکیل کی جا رہی ہے۔ ہم اپنے نیم پر تعمیر "سماج محل" کے لئے دروازے اور کھڑکیاں چاہے جس ملک کے طرز پر لگائیں، کمروں کی آرائش و زیبائش میں چاہے جو بھی انداز چاہیں اختیار کریں۔ اور یہ ہونا بھی چاہئیے کہ ہماری وسیع القلبی اور بالغ النظری کا تقاضا یہی ہے لیکن اپنے "سماج محل" کے استحکام کے لئے لازم ہے کہ ہم اس کی بنیاد اپنی ہی دھرتی کے صحت مند اقدار و روایات پر رکھیں۔ ذیل کی نظم میں مَیں نے اپنی تہذیب کی بعض اُن خصوصیات کی طرف اشارے کئے ہیں جن کے بغیر ہماری تمدنی اور تاریخی انفرادیت اُجاگر ہو نہیں سکتی۔ نازشؔ

ہم اہنسا کے پرستار کہے جاتے ہیں
امنِ عالم کے علمبردار کہے جاتے ہیں
زیست کے قافلہ سالار کہے جاتے ہیں
سنیِ عظمتِ کردار کہے جاتے ہیں

ہم سرافراز ہیں دنیا میں ہمالہ کی طرح
دوستی کرتے ہیں ہم کرشن و سُداما کی طرح

زیست کو فرض کا احساس دیا کرتے ہیں
باپ کے حکم پہ بن باس لیا کرتے ہیں
سچ کو ہر دور میں ہم زندہ کیا کرتے ہیں
پر ہلاد آگ میں جل کر بھی جیا کرتے ہیں

غلبۂ حق ہے یہاں فطرتِ انسانی پہ
راجہ مجبور ہے مرگھٹ کی نگہبانی پہ

گو تم بیکار ہوئے حسن بڑھانے کے لئے
اسلحہ ہم نے لیا حق کو جتانے کے لئے

جنگ اگر کی ہے تو راون کو مٹانے کے لئے
ہم لڑے بھی ہیں تو سیتا کو بچانے کے لئے

نکلے میدان میں دل سوزی و دلداری سے
ہم نے تلوار اُٹھائی بڑی مجبوری سے

مان اس درجہ کیا اپنے گرو کا ہم نے
دے دیا کاٹ کر خود اپنا انگوٹھا ہم نے
چھوٹے بھائی کے لئے راج کو چھوڑا ہم نے
بڑے بھائی کے کھڑاؤں کو بھی پوجا ہم نے

کبھی تاریخ کے اوراق پہ ڈالیں جو نظر
اپنے قربان ہوں اس دیش کے سنتیوں پر

ہم میں بھائی ہے بھرت کوئی تو کوئی لچھمن
کوئی بیٹا جو ہوا رام تو کوئی سشرون
بیوی کے روپ میں سیتا کی وفاؤں کا چلن
پیار کی آخری حد ہے دلِ رادھا کی لگن

عشقِ صادق کا ہم اس طرح پتہ دیتے ہیں
چیر کر سینہ ہنومان دکھا دیتے ہیں

حسن ہی حسن ہر اک پردۂ گل رازمیں ہے
پیار ہی پیار ہر اک لے، ہر اک آواز میں ہے
نغمہ ہی نغمہ ہر اک دل میں ہر اک ساز میں ہے
رقص ہی رقص یہاں زیست کے انداز میں ہے

کبھی پربت پہ، کبھی نیل گگن پر ناچے
موج میں آئے تو ہم ناگ کے پھن پر ناچے

ہر سوال رہ دشوار کو حل ہم نے کیا
خاکِ دنیا کو تر و تازہ کنول ہم نے کیا
زیست نوحہ تھی اسے حسنِ غزل ہم نے کیا
دھرتی پتھر تھی مگر تاج محل ہم نے کیا

کل بھی ہم لوگ اٹھے پیار کی خوشبو بن کر

آج بھی رہتے ہیں گاندھی و نہرو بن کر

اپنے اسٹیشن کو صاف رکھئے

• اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ صاف ستھرا ماحول ایک طرف کسی شخص کے کردار کا آئینہ دار ہوتا ہوتا ہے اور دوسری طرف اس کردار کو نکھارتا ہے صاف ستھرا گردوپیش خوشی اور مسرت بکھیرتا رہتا ہے

• ہم اپنے گھر صاف ستھرے رکھتے ہیں تو پھر ان جگہوں کو صاف شفاف کیوں نہ رکھیں جنھیں ہم سب استعمال کرتے ہیں

• ریلوے پلیٹ فارموں، ویٹنگ روموں، سواری ڈبوں اور درحقیقت ان تمام جگہوں کو جہاں بڑی تعداد میں لوگ اکٹھے ہوتے ہیں گردوپیش کو صاف شفاف رکھنا بہت ہی ضروری ہے۔

ریلوے نے صفائی مہم شروع کی ہے جس کے بہت اچھے نتائج نکلے ہیں۔ اب ریلوے صاف ستھرے نظر آتے ہیں۔ لیکن ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس سلسلے میں ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ ہم زیادہ صفائی کیلئے اپنی کوششوں کا سلسلہ جاری رکھیں گے آپ بھی اس سلسلہ میں ریلوے کی مدد کر سکتے ہیں۔ آپ صرف اتنا ہی خیال رکھیں کہ آپ کے آس پاس کی جگہ بالکل صاف شفاف حالت میں رہے۔ اس طرح اسٹیشن اور منسلکہ مقامات صاف ستھرے رہ سکتے ہیں اور یہاں آپ ریلوے صفائی محکمہ کے کارکنوں کی خدمات سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ وہ صرف آپ کی خدمت کے لئے ہی رکھے گئے ہیں۔

آپ بھی ذرا خیال رکھئے کہ کوڑا کرکٹ آپ کے ہاتھ سے اِدھر اُدھر نہ بکھرنے پائے بلکہ کوڑا دان میں پھینکا جائے۔ آپ کا یہ معمولی سا کام ہمیں آپ کی بہتر خدمات کرنے میں کافی مدد دیتا ہے۔

ریلوے آپ کی پراپرٹی ہے اسے صاف شفاف رکھئے

ناردرن ریلوے

ضیا غزل کے آئینے میں

ڈاکٹر وحیدہ ثانی

شاعرانہ صفت عطیہ الٰہی ہوتی ہے۔ جسے مشق و ریاضت سے نکھارا اور سنوارا جا سکتا ہے۔ زندگی کے تجربات اور مشاہدات سے رنگا رنگی اور گہرائی پیدا ہوتی ہے۔ اور خلاقانہ فکر کی پختگی سے حسن و معنویت کی جلوہ گری۔ شاعری کی بلندی و عظمت انفرادی مزاج اور جمالیاتی ذوق، وسعتِ مطالعہ اور تخیلِ رسا، مشاہدۂ فطرت اور انسانی نفسیات کی نباضی کی رہینِ منت ہوتی ہے۔

ضیا فتح آبادی کی غزلیں تقریباً نصف صدی پر پھیلی ہوئی ہیں پچاس سال کا عرصہ ریاضت و انہماک، مشق و مہارت اور مطالعہ و مشاہدہ کے لئے کچھ کم نہیں۔ اس پچاس سال کے طویل عرصہ میں اردو ادب مختلف موڑوں سے گزرا۔ ملکی، قومی اور سیاسی تحریکیں ادب پر اثر انداز ہوئیں، غیر ملکی اثرات ادب میں در آئے اور کلاسکیت اور جدیدیت کے امتزاج سے اردو ادب مالا مال ہوا۔ ان تمام رجحانات اور اثرات سے ضیا کی غزلیں مستثنیٰ نہیں۔ ان کی ابتدائی دور کی غزلوں میں کلاسیکی انداز کے ساتھ ساتھ زمانے کے تقاضے سموئے ہوئے ملتے ہیں، ملک کی آزادی کی جدوجہد کی تحریکوں کے اثرات نظر آتے ہیں، اسی طرح ترقی پسندی کے مثبت رجحانات کی نشاندہی ہوتی ہے۔ اور آج جدیدیت کے روشن پہلوؤں کو بھی ان کی غزلوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ہر قسم کی منفی انتشار کے لئے ضیا کے ذہن کے دریچے ہمیشہ کھلے رہے۔ ان کی غزلوں میں امید و رجائیت کی کرنیں، محبت کے نغمات ہندوستانی عناصر کی شمولیت، وطن دوستی، انسانی اقدار اور ما فوق الفطرت کا ذکر ملتا ہے۔ لب و لہجہ میں نفاست و لطافت الفاظ میں روانی اور سادگی قابلِ داد ہے۔ حضرت اعجاز صدیقی نے ان کے متعلق بڑی ہی متوازن رائے قائم کی ہے۔ فرماتے ہیں "ان کا نام ہمیشہ ایک پختہ کار اور سنجیدہ مزاج شاعر کی حیثیت سے ابھر

آتا ہے۔ جس نے اپنی شاعری کو افراط اور تفریط سے بچائے رکھا۔ جس نے ادب کے تمام نئے نظریات اور سامنے آتے ہوئے رجحانات کو قبول کیا لیکن اپنے سانچے میں ڈھال کر اور اپنے ذاتی تجربات سے متوازن کر کے"

ضیا مسلم تہذیب اور روایت سے متاثر رہے، اپنے مذہب سے وابستگی نے انھیں ولولہ بالائی شعور بھی عطا کیا۔ ان کی غزلوں میں جہاں آسمانوں کے تذکرے اور ماورائی محبت کا حسن ملے گا وہیں زمینی بیان اور اسی جہان کی محبت کے رس کا احساس بھی ہوگا۔ فارسی شاعری کی تخیل آفرینی ژرف بینی اور نکتہ سنجی کے ساتھ ساتھ ہندی شاعری کی غنائیت، ترنم اور محویت اور انگریزی ادب کی عالمگیری کے اثرات نے ان کے فکر شاعری کو ایک انوکھا رنگ روپ عطا کیا ہے۔ ضیا کی غزلیں شاعرانہ مذاق نکھرے ستھرے اندازِ بیان اور پاکیزہ خیالات کے حامل ہیں۔ وہ علامہ سیماب اکبرآبادی کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ انہوں نے اپنے استادِ محترم کے اثرات کو پوری طرح اور خلوص سے اپنی شاعری میں جذب کیا ہے۔ علامہ سیماب کے متعلق مشہور ہے کہ ان کے اشعار اس قدر پاکیزہ اور نکھرے ستھرے خیالات کے حامل ہیں کہ بلا جھجک بہو بیٹیوں کے سامنے پڑھے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ یہی تقدس اور پاکیزگی ضیا کی غزلوں میں بھی در آئی۔ فراق جیسے بالغ النظر نقاد اور مستند شاعر ضیا کے متعلق رقمطراز ہیں۔ "اس کے یہاں حکیمانہ اور شاعرانہ انداز کا حسین امتزاج ہے جس پر تغزل کی ہلکی سی پرچھائیں بھی نہیں پڑنے پاتی" حقیقت یہ ہے کہ جیسے شاعر کو تغزل کیفیت ہوتی اور منزل ... تقلیدی روش اختیار کرتا ہے، بلکہ قدیم و جدید ادب کے ... اعلیٰ کے شاہدے، انسانی فطرت کی ... اور ... سے وہ حسین شاہکار تخلیق کرتا ہے۔

"طلوع" اور "قدر شرق" ضیا کی نظمیہ شاعری پر مشتمل ہیں مجموعی طور سے سب سے پہلے ۱۹۵۵ء میں "نئی صبح" میں ان کی چند غزلیں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانے کے ساتھ ساتھ ان کے شعور میں پختگی آگئی ہے۔ انداز بیان ٹھہرا ہوا ہے اور اوپری سطح کی ہلچل کی بجائے زیریں لہریں زیادہ قوی ہیں اور اس وقت ہر طرف ضیا ہی ضیا انجمن میں ہے۔ یہ غزلیں جدت سے ہمکنار ہیں۔ ان میں روایتی حسن و عشق کا بیان نہیں بلکہ ہماری اپنی دنیا کے عشق کے تذکرے ہیں۔ مجھے کہنے دیجئے کہ مسرت کے بیان شادکامی کی جو جھلکیاں ہیں، وہی ضیا کی غزلوں کا امتیازی وصف ہیں۔ اس کی وجہ ان کی شادکام زندگی ہے۔ ان کے یہاں رجائی عناصر کی جلوہ نمائیاں قدم قدم پر ملتی ہیں۔ اور غزلوں میں انبساطی کیفیت پائی جاتی ہے۔ جب وہ کہتے ہیں ؎

غم چلے آئے تو ساری بے کلی جاتی رہی
زندگی میں تھی جو یک گونہ کمی جاتی رہی
نیرنگ ہے آئی وفا کوشی مری انجام کار
مجھ سے ان کی بے نیازی بے رخی جاتی رہی

تو وہ کامیاب عشق ہیں۔ سوز عشق کی نیم لو دہ شمعیں ان کے احساس کی برف کو پگھلا دیتی ہیں۔ مگر یہ سوز و کسک جان لیوا نہیں بلکہ ان کی وفاکوشی سے محبوب بے رخی اور بے نیازی ترک کر کے اپنے جلووں سے انہیں شادکام کرتا ہے۔ عشق کا یہ جذبہ ان کی زندگی کو بلندی اور طہارت عطا کرتا ہے۔ خود نمائی، خود دردی اور خود پروری جیسی انسانی کمزوریوں کو ختم کرتا ہے۔ اسی عشق سے انہیں روشنی ملتی ہے اور وہ شب تیرہ کو سلام کہتے ہیں۔ یقین ان کی شاعری کے ور د نام کو روشن کرتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ وسعت کائنات زندہ دلوں کی جیب میں ہے۔ ان کی غزلوں میں جذبے سکی ویسی دھیمی آنچ ہے۔ مگر ان کے عہد کے رجحانات بھی پائے جاتے ہیں۔ اور زندگی کے مختلف موڑ بھی نظر آتے ہیں۔ وہ صرف خفیہ نغمات ہی نہیں رلاتے بلکہ حادثات عالم پر مبصرانہ نظر بھی ڈالتے ہیں اور مفکرانہ انداز میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کو پیش کرتے ہیں۔ مثلاً

مختصر سے عکوں عشق لااعلمی آگہی فلسفہ تشبیہات ہی
جبر کا سب طلسم ٹوٹ گیا جب ارادوں کی کائنات بنی
کوشش اس نے تو کی ہے مگر آدمی فطرتاً فسادی ہے
تو نے کہا ہے زندگی صرف فریب ہوش ہے
مجھ کو جہانِ زیست پہ آگیا اعتبار دیکھ
درس جنوں نہ گمرہی خضر کی بات پر نہ جا
موت قیام کا ہے نام اور سفر حیات ہے!

بالیدگیٔ احساس اور پختگی فکر نے ضیا کے کلام کو نکھارا ہے ایک طرف ان کے کلام میں انبساطی کیفیت، سرخوشی، سرشاری اور البانہ پن ہے تو دوسری طرف حرمانِ غم کے عناصر بھی نظر آتے ہیں۔ ضیا نے غم جاناں نہیں غم دوراں کا مقابلہ پامردی سے کیا ہے اور یہیں سے ان کی غزلوں میں غم کی چنگاریاں در آئی ہیں۔ اسی طرح غم و انبساط کی متوازن آمیزش نے ان کی غزلوں کو دو آتشہ بنا دیا ہے۔ "گرد راہ" کی غزلوں میں المیہ عناصر کچھ زیادہ ابھر آئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس زمانے میں ضیا کو دہلی سے دور مدراس میں رہنا پڑا۔ جہاں ان کی اہلیہ سخت بیمار رہیں اور دفتری ذمہ داریوں کے علاوہ گھر کی ذمہ داریاں بھی ان کے سر آپڑیں اس دور کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

وہی ہے بے دردگی گلوں پر وہی ہوا دل کے لب پہ نالے
بہار اگر نام ہے اسی کا بہار نے کر میں کیا کروں گا
فردا کی فکر، حال کا غم، اضطراب شوق
دیوانے سنگ دہر کی محفل سے آگئے ہیں
گئی بہار مگر آج بھی بہار کی یاد
دل حزیں کا سہارا ہے دیکھیے کیا ہو

جیسا کہ بیان کیا گیا ضیا نے اپنے ذہن کے دریچے ہمیشہ کھلے رکھے۔ ۱۹۶۰ء کے بعد کی غزلوں میں آپ جدید غزل کی مثبت اقدار پائیں گے۔ وہ جدید غزلوں کو نئی زندگی کا نئی امیجری، نئے تخیلی پیکر، نئی علامتیں، نئی سنگی اختصار و ایجاز رمزیت و ایمائیت سے شیر و شکر ہوئے۔ موضوعات میں تنوع پیدا ہوا۔ ایک باشعور انسان کی طرح ضیا بھی نئے تقاضوں کا عرفان رکھتے ہیں وہ اپنی غزلوں میں بھی ان تقاضوں سے

پیش کیا ہے۔ آج انسانی زندگی غیر محفوظیت کی شکار ہے ایک طرف سائنس کی نت نئے ایجادات و انکشافات دوسری طرف اخلاقی گراوٹ، پھر دو جنگوں سے پیدا شدہ دہشت زدگی اور تیسری جنگ کا خطرہ۔ ہم ایک مجبوری موڑ پر کھڑے ہیں، ہمیں اپنے مآل کی خبر نہیں، ایک انتشاری اور اضطراری کیفیت ذہنوں پر مسلط ہے۔ ضیا اس کی عکاسی یوں کرتے ہیں ؎

کسے معلوم ہے اس زندگی کے بعد کیا ہوگا
نہ ہوگا آدمی تو آدمی کے بعد کیا ہوگا

عظمتِ رفتہ کے آثار پہ رونا آیا
کہیں در پر کہیں دیوار پہ رونا آیا

لیکن عظمتِ رفتہ کی بازیابی سے وہ مایوس نہیں، سوال ہے عمل اور جد و جہد کا، ہمت و جرأت کا، پامردی اور بہادری کا، آج ہم میں ذوقِ جنوں کا فقدان ہے۔ اسی لئے ضیا ذوقِ جنوں کی تلقین کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ناکامیابی ہی کامرانی کو جلا دیتی ہے۔ ؎

مری ناکامیوں نے کامرانی کو جلا بخشی

اور ؎

مقصدِ زندگی عمل آج نہ سوچ کل کی بات

اور اسی طرح ؎

نئے رہرو نئی منزل بنا دوں — نئی راہیں دکھانا چاہتا ہوں
اٹھو کم جوت چراغوں کو بجھا دو — نئی شمعیں جلانا چاہتا ہوں

ضیا کا ذوقِ موسیقی اور ذوقِ جمال نکھرا ہوا، مہذب اور شائستہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ذوق انہیں وراثتاً ملا۔ اسی ذوقِ موسیقی نے ان کی غزلوں کو کھردرے پن سے بچا لیا اور کلاسیکی گرفت نے انہیں منفی رجحانات سے محفوظ رکھا ؎

جس پہ چہرہ اور کوئی بھی نہ تھا
مجھ کو تو چہرہ وہی اچھا لگا

وہاں مجھ کو ضیا کون لے جائے گا
جہاں ہر شخص ہی بے چہرہ دکھائی دے ہے

جن جدید رجحانات سے غزل کو تازگی، اور توانائی، شادابی اور شگفتگی ملی۔ انہیں ضیا نے اپنایا۔ ان کی غزلوں میں امیجری بڑی عمدگی سے استعمال کی گئی ہے، خود کو تند ہوا کی زد میں اڑتی ہوئی پتنگ۔ سرِ آب سفینوں کی سسکی، صدائے برگ کا ٹہنی سے جدا ہونا، کچھ عمدہ امیجری کے نمونے ہیں۔ خیالات کی دلدل میں پھنسا، فٹ پاتھ پر خاموش پڑے رہنا، بیتے دنوں کی یادیں بہانا، ماحول سے بے جان و قالب ملنا، رگِ شب کا ٹوٹنا، یہ تمام متحرک پیکر، باصرہ، سامعہ اور لمسی قوتوں سے وضع کئے گئے ہیں۔ ان پیکروں سے ان کی بصیرت اور وجدان کا ثبوت ملتا ہے۔ ضیا کے یہاں کلاسیکیت کی گرفت ہے۔ مگر یہاں بھی جدت اور رعنائی کو مدِ نظر رکھا گیا ہے تشبیہات اور استعارات میں بھی تازگی و ندرت ملتی ہے ؎

اشک پلکوں سے یوں گرا جیسے خشک ٹہنی سے گُلِ تر ٹوٹا

ضیا کی غزلوں میں ہندی کے خوشگوار اثرات بھی ہیں ؎

پریتم کا سندیسہ لے کر — گھر آئے ہیں بادل کالے
باہیں جیسے کمل کی شاخیں — آنکھیں جیسے مد کے پیالے
صبح نے روشن تیر چلائے — شب کا درپن ٹوٹا جائے
جو گر جا پیاسی دھرتی پر — کاش وہ بادل برسا ہوتا

بعض غزلوں میں سائنسی حقیقتوں سے بھی علامتیں تراشی گئی ہیں ؎

مجھے محبت کا سوز دے دو یہ ایٹموں کا جلال لے لو
حریتِ خوں کی آرزو ہے شرارِ پیکر میں کیا کروں گا

زمانہ یہ ہے رقصِ ذرات کا — حکایاتِ شمس و قمر کچھ نہیں

ان کی غزلوں میں مافوق الفطرت عناصر کی شمولیت سے قاری استعجاب و حیرت میں ڈوب جاتا ہے۔ اور واقعی یہ حیرت انگیز بات ہے کہ اس سائنسی دور میں بھی ضیا مافوق الفطرت عناصر پر یقین رکھتے ہیں اور یہ رجحان ان کی غزلوں میں بھی نظر آتا ہے۔ یہ ان کا انفرادی رجحان ہے۔

ہوئی سحر تو کہاں کھو گیا اجالوں میں
جدا تو پھر مرا ایوان گوشہ گشتہ ملا

پہلے دل کی سب کھڑکیاں کھل گئیں
مجھے ڈر ہے [illegible]

شستہ و بے تابانہ میں خاموش گرا ہیں
گرتی ہوئی دیوار صد رنگ رہا ہوں

غرضیکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ضیا کی غزلوں میں زندگی کا تنوع اور رنگا رنگی انسانی اقدار کی پشت پناہی جذبات و احساس کی گہرائی و گیرائی، ملکی اور سیاسی رجحان عصر حاضر کے نئے تقاضے نئی آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ جبھی تو خواجہ احمد فاروقی فرماتے ہیں کہ "ان کے یہاں شوق کی بے باکی کے ساتھ انسانیت کی پابندی کا نرم نرم احساس بھی ہے .... ان کی شاعری میں پرکاری اور ہوشیاری سے زیادہ سادگی اور سرشاری ہے"
.... الغرض غزلوں میں ضیا کا ایک منفرد مقام ہے۔

زندگی

بشیر احمد بیتاب صادق آباد (پاکستان)

زندگی اک کشمکش ہے زندگی پیمان ہے
زندگی ہے بادو باراں زندگی طوفان ہے
زندگی چڑھتا ہوا سورج ہے، ڈھلتی شام ہے
تشنگی جس سے بڑھے یہ وہ نرالا جام ہے
وقت کی مقراض بن کر کاٹتی ہے زندگی
خونِ انساں کو ہمیشہ چاٹتی ہے زندگی
زندگی ہے ہر قدم پہ ٹھوکریں کھانے کا نام
زندگی ہر موڑ پہ گر کر سنبھل جانے کا نام
زندگی تجھ سے فقط آشفتگی، بر گشتگی
زندگی حیرانی و ویرانی و پسِ بستگی
زندگی کی کشمکش دو چار دن کی بات ہے
چاند کی چاندنی ہے پھر اندھیری رات ہے
زندگی بیتاب اس صورت میں ہے اک زندگی
زندگی میں کام آجائے کسی کے زندگی

غزلیات

جناب ذواکر راہی رام پوری

(۱)

کچھ ایسے بھی احساس والے ہوتے ہیں
جو خود بے حسی کے حوالے ہوتے ہیں
جہاں حق بیانی پہ پابندیاں ہیں
ہم اس انجمن سے نکالے ہوئے ہیں
بصد احتیاط ان کی بزمِ طرب میں
ہمیں ہیں جو خود کو سنبھالے ہوئے ہیں
وہ کیا خاک پہ لیں گے عنوانِ ہستی
جو مخصوص سانچوں میں ڈھلے ہوئے ہیں
نہ معروف ہے کچھ ان فسانوں کا واعظ
ہزاروں ورق جن سے کالے ہوئے ہیں
مرے دل کی تاریک گہرائیوں میں
وہ جب آ گئے ہیں اجالے ہوئے ہیں
جو حائل ہیں راہِ ترقی میں راہیؔ
وہ پتھر ہمارے ہی ڈالے ہوئے ہیں

(۲)

ایماں کو جس نے بیچ کے قیمت وصول کی
وہ بھی تو دے رہا ہے دہائی رسول کی
واعظ سے ہم نے بحث کی لیکن فضول کی
اس نے غرض کی بات کی ہم نے اصول کی
مردم شناس ہوں میں مگر اس کے باوجود
اک آدمی کو میں نے سمجھنے میں بھول کی
پوچھو نہ مجھ سے حالِ کتب خانۂ حیات
پرتیں جمی ہوئی ہیں کتابوں پہ دھول کی
شاعر ہوں جانتا ہوں میں راہیؔ اسی لئے
الہام کی بساط حقیقت نزول کی

مقتول کونوی

منیرؔ شکوہ آبادی کا معیارِ غزل

دیگر کئی خوبیوں کے ساتھ ہماری قدیم غزل فنی مہارت اور پختگی مشق کے اظہار کا ذریعہ بھی رہی ہے۔ صنائع و بدائع کی بہتات، استعارہ و تشبیہ کی کثرت لفظی و معنوی آرائش رعایات و مناسبات کا التزام، غزل کے ضروری عناصر رہے ہیں۔ اس سے قدرتِ بیان کا اظہار زورِ کلام کی نمائش اور افکار و خیالات کی رفعت و ندرت دکھانی مقصود ہوتی تھی۔ استادانہ کمالات انہیں میں مخفی تھے۔ سخت زمین اور مشکل قوافی کا انتخاب اور پھر اس میں سخن آرائی کرنا ہنرمندی اور فنکاری کا ثبوت پہنچاتا تھا۔ شاہ نصیر اسی میدان کے مرد تھے۔ لکھنوی اساتذہ نے اس انداز کو زیادہ گلے لگایا۔ آتش مرحوم فرماتے ہیں ؎

آتش زمینِ شعر ہو ہر چند سنگلاخ
لغزش سے آشنا نہیں مردِ سخن کے پاؤں

تعاقد میں ایسے ہی ردیف و قافیہ منتخب کئے گئے۔ اور زورِ سخن اور استادانہ کمال دکھایا گیا۔ غزل میں بھی اس جدت و ندرت کے مظاہرے کئے گئے۔ طرحی مشاعرے اول تو خود ہی آزمائش اور امتحان کے معرکے تھے۔ پھر اگر کسی سخت زمین اور مشکل قافیہ و ردیف والے مصرع کا انتخاب ہوگیا تو زورِ قلم دکھانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی جاتی تھی سخن سنجوں اور سخن فہموں کی دلچسپیاں بڑھ جاتی تھیں۔ منیر شکوہ آبادی مرحوم کی کئی غزلیں مشکل قوافی و ردیف کی حامل ہیں۔ یہ کمالِ سخن جولانئ طبع دکھاتا چلا گیا ہے۔ حروفِ تہجی سے دیوان کی ترتیب خود ہی مشکل قوافی و ردیف پیدا کر دیتی تھی۔ اور صاحبِ دیوان کو ہر حرف میں کم از کم دو چار غزلیں ضرور کہنی پڑتی تھیں۔ منیر مرحوم کو اپنے دواوین کی ترتیب میں اس کا پاس رکھنا پڑا ہے۔ لیکن اس مردِ سخن کے پاؤں لغزش سے آشنا ہو سکے۔ اور جہاں قدرتِ بیان حاصل ہو وہاں جبراً مشکل زمینیں پیدا کر کے بھی کامیاب غزلیں کہہ دینا کون سی بڑی بات ہے۔ منیر مرحوم کی غزلیں طویل بھی ہیں اور بالعموم سخت زمینوں میں بھی ان کا کمالِ فن اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب ان کے مصرع ثانی پر مصرع اولیٰ آپ خود لگانے کی کوشش کریں۔ جس طرح سادہ زمین میں معنوی گل بوٹے سجانے مشکل ہیں۔ اسی طرح سخت زمینوں کو باطنی و ظاہری آرائشوں سے نکھارنا، کارے دارد والا مضمون ہے۔ منیر مرحوم کا کلام موجود ہے۔ آپ آزمائش کر لیجئے۔ انہیں کامیاب پائیے گا۔ کوئی سی غزل لے لیجئے، اس میں کئی ثانی مصرعے آپ کو ایسے مل جائیں گے جن کے لئے مصرع اولیٰ بہم پہنچانا منیر جیسے مشاقِ سخن ہی کا کام تھا۔ مثال کے طور پر اگر ذیل کے اشعار کے ثانی مصرعوں پر اولیٰ مصرع خود لگانے کی کوشش کی جائے اور بعد میں منیر مرحوم کے اولیٰ مصرعے دیکھے جائیں تو سطورِ بالا کی حقیقت آشکارا ہو جائے گی۔ میں کسی کد و کاوش سے نہیں مجموعۂ کلام کے اوراق الٹ پلٹ کر چند ایسے اشعار لکھ دیتا ہوں ؎

چھپ چھپ کے دیکھتے ہیں بہت آپ گھر میں بال
پڑ جائیں گے حضور کی تیغِ نظر میں بال

پہنے نہا کے ہار جو تو نے پلنگ پر
دے بحرِ حسن نے بچھے ہوئے کس میں پھول

کس قدر ہے شعلہ افشاں آتشِ رنگِ حنا
بن گئے ہیں پوروں کے نگ تیرے ہاتھ میں

سیلِ سرشک سے تہ و بالا ہے مکاں
پانی پر اب پلنگ ہے پانی پلنگ پر

ہیبت سے داغِ دل کی تجلی دکھا ہے
رکھئے چراغِ چشم ہیگرین گو نہ ہے

دل پکایا گرمئ روزِ فراق یاد سے
آتشِ خورشید سے پکا مرا پھوڑا ہوا

سب کے نصیبوں میں ہیں وحشت کو یہ کثرت ہے

شاخ آہو پر بنے گا آشیانِ عندلیب
زلزلہ ہے بے قراری سے در و دیوار کو

غیر ممکن ہے کہ پھر سے گھو شہرِ پاؤں چوپ
تیرے حُسنِ تخت میں ہے حُسنِ نزاکت

کانوں کو ہوئی پنبۂ مہتاب کرائی بات
ہمارے پاس ہو کر روشنی پر صورت دکھاتے ہو

نظر آتے ہو تم نزدیک سے بھی دُور کیا باعث
عشقِ گیسو مری قسمت میں ازل سے ہے لکھا

حلقۂ مار ہیں سطرِ خطِ تقدیر کے پیچ
دیتے ہیں مجھ کو آنکھ پر اہلِ صفا مقام

میرا قدِ خمیدہ ہے ابروئے پیر صبح
لکھا گیا جو تیرے شبیہ ادا کا حال

ماتھے برگِ گل ہوئی فردِ حساب سرخ
دریا میں موج موج سے رہتی نہیں جُدا

بے جا ہے آشنا سے کرے آشنا گھمنڈ

اُردو شاعری کے ساتھ ہی ساتھ شاگردی و استادی کی رسم بھی چلی آرہی ہے۔ یہ ایک دوسرے سے بڑی قریبی وابستگی رکھتی ہیں۔ استاد اپنے تلامذہ کے خیال و بیان میں نکھار پیدا کرتا ہے۔ آدابِ شعر گوئی کی تربیت دیتا ہے۔ شعر گوئی کے طور طریق سکھاتا ہے۔ صنائع و بدائع، خامیوں اور خوبیوں، بلندیوں اور پستیوں سے آگاہی بخشتا ہے۔ ان کی فطری استعداد، ذاتی صلاحیت اور ادبی رجحانات کی فنی تراش خراش کر کے انہیں اُجالتا ہے۔ سنوارتا ہے اور جلا دیتا ہے۔ جذبات و خیالات کو پستی، سوقیت، عریانیت کے گرد و غبار سے صاف و مجلا کر کے ان میں بلندی متانت و وقار کی تابناکیاں پیدا کرتا ہے۔ اظہار و ابلاغ زبان و بیان خیال و افکار سب نکھار تے ہوئے ارتقائی منازل طے کرتے چلے جاتے ہیں۔ اور ایک دن شاگرد خود استادی کے منصب پر فائز ہو جاتا ہے استاد کی اس جگر کاوی، دماغ سوزی اور محنت و خدمت کا صلہ سعادت مند شاگرد اس کے ادب و احترام اس کی قدر دانی اور عظمت شناسی سے دیتے ہیں۔ تن من دھن اس کے لئے وقف رکھتے ہیں۔

منیر شکوہ آبادی مرحوم اس سلسلے میں بلند شخصیت کے مالک ہیں۔ انھوں نے نہ صرف اپنے اساتذہ کے فن اور کمال کو اجاگر کیا بلکہ ہمیشہ ان کی ہدایات اور روایات کی پابندی [illegible] چنانچہ نواب کلب علی خاں والی رامپور نے جن کی دربارداری میں منیر مرحوم تھے۔ جب اس زمین میں جس میں ناسخ مرحوم کا مشہور مطلع ہے ؎

میرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا
طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا

گریباں کا قافیہ بہتر سے بہتر لانے کی پابندی کے ساتھ اپنے درباری شعراء سے غزلیں لکھنے کے لئے کہا تو اپنے استاد رشک مرحوم کا حوالہ دیتے ہوئے منیر مرحوم نے یہی عذر کیا کہ میں ان کی ہدایت کے مطابق اس زمین میں بغیر عطف و اضافت کے [illegible] قافیہ کو نہیں لا سکتا۔ نواب صاحب کے اصرار پر منیر مرحوم نے غزل کہی۔ اور اس غزل میں ۲، گریبان کے قافیے کہے۔ لیکن [illegible] عطف و اضافت کے ساتھ۔ جتنی بار اس واقعہ کو دہرایا جائے شاگردی و استادی کا ربط باطنی اجاگر ہوتا چلا جاتا ہے۔ شاگرد کی عقیدت اور استاد کی عظمت دل پر اثر کرتی جاتی ہے منیر کے استاد اوّل ناسخ مرحوم تھے۔ انہیں کے ایماء سے انھوں نے جناب میر علی اوسط رشک کی شاگردی قبول کی تھی۔ ان کے یہاں فنی پابندی سخت تھی۔ منیر مرحوم نے اپنا ایک مطلع رشک مرحوم کو سنایا ؎

گنبدِ قبرِ عاشقاں ٹوٹے اے زمیں تجھ پہ آسماں ٹوٹا

استاد رشک نے مطلع کی داد دی۔ لیکن فرمایا، لوگ بولتے یوں ہیں، آسماں ر باعلانِ نون ٹوٹے آسماں (با خفائے نون یعنی نون غنّہ کے ساتھ) کوئی نہیں بولتا۔ دوسرا مصرع بدلا منیر مرحوم نے تعمیلِ حکم کی ؎

رِندِ دل ہائے مے کشاں ٹوٹے اے خدا جامِ آسماں ٹوٹے

دیکھی اس زمین کی دیکھو گنبدِ قبرِ دوستاں ٹوٹے

جناب منیر جہاں تک غزل کا سوال ہے اور اپنے استاد کی پابندی کا تعلق۔ غزل میں استاد کے ارشادات کی پابندی کو وضعداری، رواداری، اور سعادت مندی سمجھتے ہیں لیکن دیگر

حامیِ سخن میں وہ اپنے استاد مرزا دبیرؔ کے معتقد پیرو ہیں
مرثیوں اور قصیدوں میں، قطعوں اور رباعیوں میں وہ اس
رکھ رکھاؤ کو ضروری نہیں سمجھتے۔ اس واقعہ کا بار بار دہرانا
بھی موجودہ ماحول کی ساز گاری کا سبب ہوگا۔ اور اسی نے التفات
خصوصی برتا گیا۔ اپنے اساتذہ کے احترام میں ان کی غزلوں
کے کئی مقاطع موجود ہیں۔ جن میں یہ بڑی شیفتگی اور خوش
عقیدگی سے ان کی شفقت وعظمت کا ذکر کرتے ہیں۔ اُن میں
سے چند مقطعوں کا اندراج یہاں بے جا نہ ہوگا۔ ابتدا اس مقطع
سے کیجئے ؎

بے رہنما کے راہ نہیں سوجھتی منیرؔ ؛ نادان ہے جو کہے نہیں استاد سے غرض
ہمدوشِ رشک ایسی طرف کربلا چلا ؛ اے منیرؔ خدمتِ استاد کے لئے
نکلے استاد کے فیضِ تلمذ سے منیرؔ ؛ فکر صاحب مدح کے لائق ہماری ہوگئی
ملک ہے فیضِ تلمذ سے منیرؔ ؛ شاعروں میں تو بھی یکتا ہوگیا
قدردانی کی اصلاح اس غزل پہ منیرؔ ؛ آج رتبہ تری فکرِ لیست کا بالا ہوا
دم ہوا میں خدمتِ استاد سے منیرؔ ؛ کلکتہ مجھ کو گور سے بھی تنگ ہوگیا
پایا کمال منیرؔ استاد کے اجازت سے ؛ آج فرصت مل گئی، دیوان پورا ہوگیا
استاد کے احسان کا کوئی شکریہ منیرؔ آج ؛ کی اہلِ سخن نے تری تعریف بڑی بات
تھا مجھ کو بھی فیضِ سخن ہے جہاں میں ؛ صدقے منیرؔ حضرت ناسخؔ کے گور پر
استاد سے فرصت منیرؔ ؛ خاک سمجھا اکسیر کی یا زر کی چاہ
بعد رشکؔ کے استاد کی خدمت سے منیرؔ ؛ فرخ آباد میں کیونکر ملے آرام مجھے
پائیں منیرؔ شاعری ہم ؛ استادِ شفیق کا کرم ہے
ہے علم میں میرے استاد سے منیرؔ ؛ نسبت ہے انکی طبع کو بحرالعلوم سے

ہیں۔ جس طرح جناب دبیرؔ کے لئے ایک مدحیہ غزل ہے
اسی طرح جناب رشکؔ کے لئے بھی ایک مدحیہ غزل موجود ہے ؎

مظہرِ عالم فاضل جناب رشکؔ ؛ علامہ محقق کامل جناب رشکؔ
جامع دینی و دنیوی ؛ مجموعہ تمام فضائل جناب رشکؔ
طاقت تا معہ فنِ شاعری ؛ طے کرچکے تمام منازل جناب رشکؔ
آفتاب سپہرِ کمال کے ؛ بحرِ علوم کے مہِ کامل جناب رشکؔ
بے مثال ہیں یہ استاد بے نظیر حل کرگئے ہیں عقدۂ مشکل جناب رشکؔ

کیوں کر نہ میری قدر ہو دنیا وہ ہولئے منیرؔ
سکھا گئے تمام مسائل جناب رشکؔ

شاگرد و استاد کی عقیدت وعظمت کی ایسی تصویریں موجود
تھی اسی لئے اس تصویر کے تمام خدوخال مکمل تفصیل سے پیش
کئے گئے ہیں۔ اگرچہ یہ تسلیم ہے کہ جناب رشکؔ کے متعلق جو
مدحیہ غزل منیرؔ نے کہی ہے اس کے پورے اشعار درج نہیں کئے
گئے ہیں۔ تاہم انہیں اشعار سے شاگرد کی عقیدت وعظمت کا
اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

منیرؔ مرحوم غزلیں بڑی طویل طویل کہتے ہیں جب بھی سیری نہیں
ہوتی تو قافیہ بدل کر اسی زمین میں دوسری غزل شروع کردیا کرتے
ہے۔ مقطع میں اس امر کا اشارہ کردیتے ہیں ؎

بدل کر قافیہ تازہ غزل ایک اور بھی پڑھ دے
منیرؔ خوش بیاں شہرہ ہے تیری خوش بیانی کا

بدل کر گلچینیٔ مضمون رنگیں اے منیرؔ
طبع میں عالم ہے رنگِ گلشنِ شاداب کا

اب بدل کر قافیہ اک اور بھی پڑھیئے غزل
شاہدِ معنی کا ہے تدِّ نظارہ آج

ایک اور غزل پڑھتے ہیں اس بحر میں دیکھو
کیونکر نہ دُرِ الہام کے معدن نہ ہوئے ہم

ایک جگہ ردیف بدلی ہے ؎

بدلو ردیف اور پڑھو شعر اے منیرؔ
کیا فائدہ جو اس کے قوافی بدل گئے

ان کے دو مقطع اور ملاحظہ ہوں ؎

رہی سرقہ سے نفرت عرش سے مضمون لے آئے
منیرؔ اس طرح مشقِ شعر گوئی ہم نے حاصل کی

دوسرے شعر میں شوخی وندرت پیدا کی ہے ؎

سرقہ سے اس قدر مجھے نفرت ہے اے منیرؔ
مضمون باندھتا نہیں مضمون کے چور کا

لکھنؤ پر یہ فدا ہیں۔ اپنے مقطعوں میں جابجا اپنی پرستاری
کا اظہار کرتے ہیں ؎

با دامِ لکھنؤ ہے آباد اے منیرؔ ؛ مجمع ہے اس دیار میں اہلِ کمال کا
منیرؔ اس شہر میں اوجِ کمال نظم پر پہنچا ؛ الٰہی لکھنؤ کی خاک سے مضمون عالی کا
مرتا ہوں لکھنؤ کی تمنا میں اے منیرؔ ؛ اللہ شیش محل کا مجھ کو دکھائے رنگ

لکھنؤ کی تعریف میں جان دیتا ہوں منیر و سلطنت کا بھی زمانہ میں ثانی نہیں
اوقات کا ضرور میں ضائع ذکر منیر و ہیں لکھنؤ میں صحبت اہلِ کمال دیکھ
باقی نہ کا ہند میں گھر سے منیر ؛ پھر لکھنؤ میں جا کے کہیں جی لگا لیجے
لکھنؤ کا مجھ کو سودا ہے منیر ؛ دل حسین آباد پہ دیوانہ ہے۔
ان کے پہلے دیوان منتخب العالم سے کچھ مطلع پیش کر رہا ہوں جن
سے ان کی دشوار پسندی کا پتہ چل سکے گا۔ مطلعوں سے ہی ان
کی زورِ طبیعت اور قدرتِ بیان کا بھی اندازہ کر لیجئے ؎

رفتہ رفتہ پست اتنا مسکِ دوں ہو گیا
عقدۂ امساک قفلِ گنجِ قارون ہو گیا

گزر ہر بحر میں ہوتا ہے خضرِ طبعِ موزوں کا
ہمارا کالبد بجرا ہوا دریائے مضموں کا

طلسم تو بنے گا فکرِ مضمونِ سالی کا
پری بن کے اڑے گا رنگ تصویرِ خیالی کا

آئینے کے دیکھنے سے گل سا بدن میلا ہوا
صبح کے پرتو سے رنگِ یاسمن میلا ہوا

دے گا جو بوسہ دشمنوں کو پور پور کا
پیا جاؤں گا لہو تری مہندی کے چور کا

جلوہ فرما باغ میں جب وہ مسیحی بالا ہوا
طوقِ قمری نورِ مہتاب کا ہالا ہوا

تصویرِ زلف و عارضِ گل فام لے گیا
مرعابِ دہ سن سے صبح و شام لے گیا

جب ہم بغل وہ سرو قبا پوش ہو گیا
قمری کا طوق حلقۂ آغوش ہو گیا

سبزہ تمہارے رخ کے لئے تنگ ہو گیا
طوطی کا عکس آئینہ میں زنگ ہو گیا

تار بوسوں کا لبِ یار کے کیا کیا باندھا
شوق نے زخمِ دہن پر سرِ حلوا باندھا

کعبہ کا سجدہ شرف بخشِ جبیں ہو جائے گا
کاسۂ سر سا عزازِ زمیں ہو جائے گا

خود بولتا ہے وصفِ خطِ سبزہ رنگ کا
گویا ہے طوطی آئینۂ رخ میں زنگ کا

دیکھیں باغ میں جو ترا گل و سوسن پتا
جو بہار چمن اسے غیرتِ گلشن پتا

آبلہ سینہ پہ داغ کا کیا کیا ٹوٹا
آج باغ پر طاؤس کا میوا ٹوٹا

دوڑ تک صنعت میں چہرے کا مرے رنگ اڑا
اے پری طائرِ بے پر کئی فرسنگ اڑا

تصور تھا جو روئے لالہ گوں کا
ہوا اشک چشمِ تر پر داغ خوں کا

بسملوں سے بوسۂ لب کا جو وعدہ ہو گیا
خود بخود ہر زخم کا انگور میٹھا ہو گیا

فقیر ہوں میں کسی بت کی بولی ٹھولی کا
لب مسیح بھی ٹکڑا ہے مری جھولی کا

خاکساری سے جو غافل دلِ غمّاز ہوا
خاک کے پردہ میں پوشیدہ مرا راز ہوا

جلوہ ہے نیا بزم میں بتِ سیم بدن کا
کیوں چاندنی پہ شبہہ نہ ہو صبحِ چمن کا

راہ کر کے اس بتِ گمراہ نے دھوکا دیا
گر پڑے اندھے کنوئیں میں چاہ نے دھوکا

بڑھ چلا عشق تو دل چھوڑ کے دنیا اٹھا
خود بخود جوشِ مئے ناب سے شیشہ اٹھا

غم سہتے ہیں پر غیرتِ جانہیں اٹھتا
مرتے ہیں مگر نازِ مسیحا نہیں اٹھتا

ردیفِ الف کے مطلعے ہی بہت ہو گئے۔ آگے کیا پڑھا جائے۔ ہم
میں نے اس میں سہل قافیہ و ردیف کی غزلیں چھوڑ دی ہیں۔
ایک غزل میں کئی کئی مطلعے ہیں۔ میں نے صرف پہلا مطلع لکھا
میں پھر کہوں گا کہ منیر صاحب کی مشاقی، پختگی، مہارت ا
قدرت کا اندازہ لگانا ہو تو انہیں مطلعوں کے ثانی مصرعوں
اولیٰ مصرع لگانے کی کوشش کی جائے۔ اور پھر منیر مرحوم
نقدِ سخن آزما لیا جائے۔ یہ ضیغمِ ادب ہی کامیاب نظر آئے گا۔ آ
میں میں ایک غزل پیش کر رہا ہوں، تشبیہ و استعارہ کی جا
دیکھئے اور منیر مرحوم کی سوجھ بوجھ کا اندازہ لگائیے ؎

تمہاری زلف و رُخ کا لطف ہم اے مہ لقا سمجھے
اسے بال آئینے کا اور اس کو آئینا سمجھے
اِس صاف پھبتی پر ہوئے برہم تو جانے دو
کسوٹی زلف کو عارض کو ہم لوحِ طلا سمجھے
یہ قلبوں کی صورت کسوٹی باتیں کیوں کریں توبہ
پری چہرے کو سمجھے زلف کو کالی بلا سمجھے
دیوانہ ہے جو آسیب سے تشبیہ بھا دے
اسے ہم دولتِ حسن اور اس کو اژدہا سمجھے
خزانہ زر و در ہے سانپ ان پر زہر کھاتے ہیں
گہن زلفوں کو، عارض کو مہِ برجِ ضیا سمجھے
ایں داغ اس تشبیہ سے دونوں کو کیوں ناحق
دھواں سمجھے اسے اور اس کو شمعِ مدعا سمجھے
معاذ اللہ ہم کیونکر جلی چیزوں سے نسبت دیں
بنفشہ اس کو اور اس کو گلِ باغِ وفا سمجھے
اس تشبیہ سے بھی ہو پریشانی طبیعت کو
اسے کافور سمجھے اس کو مشکِ جانفزا سمجھے
نزاکت مزاجی سے نہ ہو منظور یہ نسبت
شبِ قدر اس کو سمجھے اور اسے بدر الدجیٰ سمجھے
گھٹتی ہو قدرِ حسن اس تشبیہِ نازک سے
اسے شامِ مراد اس کو چراغِ مدعا سمجھے
اندھیرے جی جل رہا ہے ایسی باتوں سے
اسے دریائے خوبی اور اسے موجِ صفا سمجھے
ہیں کچھ آبرو اس میں بھی زلف و روئے زیبا کی
اسے آئینۂ دولت اسے بالِ ہما سمجھے
یہ تشبیہ بھی گیسو و عارض پر نہ ہو صادق
شبِ معراج اس کو اور اسے نورِ خدا سمجھے
غزل یہ نظم کی فرمائش نواب سے میں نے
قصور اس کا ہے میری فکر کو جو نارسا سمجھے
مگر ان ساری تشبیہوں کے بعد اب اور کیا کہیے
اسے قرآں، اسے سطریں، اگر سمجھے بجا سمجھے

رُباعیات

جناب کالی داس گپتا رضاؔ

افلاس و عذاب ہے مئے دمِ غفل ہے
انسان کے افکار میں سب شامل ہے
گھنگرو کی صدا کہ آہ، کچھ فرق نہیں
ہنگامہ کائنات رقصِ دل ہے

(۲)

کانوں میں یکایک ان سنی صدا سی آئی
دامن میں نئی فکر و خبر بھر لائی
تہ خانوں سے لوٹ سی گئی تاریکی
تخییل میں یوں سما گئی گہرائی

(۳)

وسعت میں اپار ہے بیابانِ درد
پاتال سے بھی نیچے ہے پایانِ درد
صدیاں کٹ جاتی ہیں غم گساری کرتے
جب جا کے کہیں ہوتا ہے عرفانِ درد

(۴)

سچائی نے رکھا ہمیں غرقِ فریاد
گفتار کے زور پر ہیں اب ہم دلشاد
جاتے جو عدالت میں، گزرتی صدیاں
اے شورِ بے دلیل! پائندہ باد

(۵)

انسان، قیامت سے نہ ڈرنے والا
دریائے الم سے پار اُترنے والا
کیا کہیے اسے پھر، جو نہ دھوکا کھائے
بنتی ہے خرد امرت کو مرنے والا

(۶)

دیکھو، پرکھو نظر سے سب خال و خط
جو بات دلیل سے نہ ثابت ہو، غلط
مسحور نہ کر دے تجھے سحرِ آواز
ڈفلی، ڈفلی ہے اور بربط، بربط

کُل ہند مُشاعرہ بھوانی

اُردو اور ہندی ادب میں سرزمین بھوانی کا ایک خاص مقام رہا ہے۔ عرصہ دراز سے یہاں شام غزل متعدد مشاعروں اور گلی سیلنوں کا اہتمام کیا جاتا رہا ہے۔ یہاں ہندی کے تحت کاری مثلاً نیرج، سوم ٹھاکر، کاکا ہاتھرسی، اوم پرکاش آدتیہ اور کنور بیچین وغیرہ کوی سیلنوں میں تشریف لاکر اس سرزمین کو اپنے کلام سے محظوظ فرما چکے ہیں۔ اس کے علاوہ اردو کے مشاہیر ۱۹۵۸ء سے لے کر اب تک ہریانہ، پنجاب، دہلی، یوپی، اور ہند کے صوبہ ہائے متفرقہ کے علاوہ پاکستان کے بھی شرکت فرما چکے ہیں۔ جن میں جناب جوش ملیح آبادی، علی سردار جعفری، احسان دانش، ماہر القادری، مخمور جالندھری، شمیم کرہانی، شمشاد عثمانی، ڈاکٹر بشیر بدر، جاوید وششٹ، نریش کمار شاد، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر اور حسن نعیم کے اسمار گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

کچھ عرصہ پہلے یہاں کی بزم ادب، ساہتیہ سنگم اور آدرش نویوگ سبھا اس بات پر غور کر رہی تھیں کہ یہاں ایک عظیم الشان مشاعرے کا انعقاد کیا جائے۔ اگست ۱۹۷۷ء میں شعبائی ٹریننگ کے سلسلے میں حیدر آباد جانے کا میرا اتفاق ہوا وہاں ادبی ذوق کے باعث میری ملاقات وہاں کے ادباء سے ہوئی وہیں ایک مشاعرہ میں نے ٹریننگ سنٹر میں منعقد کروایا اس میں مقامی شعرا کرام کے علاوہ اُردو مجلس کے صدر اور بیرونی حضرات نے بھی شرکت فرمائی تھی، اس مشاعرے کی کامیابی کے بعد میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ بھوانی میں بھی ایک مشاعرہ منعقد کرایا جائے۔ اور حیدر آباد کے ہر دلعزیز شاعر جناب صلاح الدین نیر کو مدعو کیا جائے۔

بتاریخ ۱۳ جنوری ۱۹۷۸ء بروز ہفتہ بوقت ۸ بجے شب مجھے میرے خواب کی تعبیر بزم ادب بھوانی اور نویوگ سبھا کے مشترکہ اس عظیم الشان مشاعرہ کی صورت میں میسر آئی۔ اس مشاعرے کے اہتمام میں جناب کوکب گھرونڈوی، پروفیسر ستنام سنگھ خمار، غافل بھوانوی، شاہین بھوانوی اور شہباس کمرانہ صاحب نے بہت اہم رول ادا کیا۔ جناب چودھری پرتاپ سنگھ آئی۔ اے۔ ایس۔ ڈپٹی کمشنر بھوانی نے منتظمین کی کافی حوصلہ افزائی فرمائی اور منتظمین کی درخواست پر مسند صدارت پر بھی آخر وقت تک جلوہ افروز رہے۔

آیئے اب مشاعرہ میں چلا جائے رات کے ۸ بجنا چاہتے ہیں کرشنا کالونی کا چوراہا ادبی فضا سے معمور ہے۔ پنڈال برقی قمقموں سے نئی نویلی دولہن کی طرح جگمگا رہا ہے۔ حد نظر تک اہل ذوق حضرات کا مجمع بڑے ہی مہذب انداز سے ہمہ تن منتظر ہے۔ سامنے سے محفل کے صدر چودھری پرتاپ سنگھ جی ڈپٹی کمشنر تشریف لا رہے ہیں اور اسٹیج پر فنکاران ادب تشریف لا چکے ہیں۔ صدر بزم ادب ڈی، سی صاحب کے خیر مقدم کے بعد پروفیسر خمار صاحب نے نظامت کے فرائض سنبھالتے ہوئے لوہڑی اور سنکرانتی کے تہوار پر روشنی ڈالتے ہوئے اس تقریب پر منعقدہ اس مشاعرے کا آغاز بھوانی ہی کے نوجوان شاعر جناب غافل بھوانوی سے کیا ہے۔

غافل صاحب فرما رہے ہیں ؎

ہم سر پھرے تو تھے ہی خدا سے الجھ پڑے
حشر کے اہتمام میں تاخیر دیکھ کر
آیا مجھے بھی شوق شہادت کا پھر خیال
قاتل کے دست شوخ میں شمشیر دیکھ کر
غافل شعور عشق سے بیگانگی نہیں
پہلو بدل لیا کوئی تدبیر دیکھ کر

اب خمار صاحب، ایک اور مقامی شاعر جناب شاہین بھوانوی

درخواست کلام کر رہے ہیں ملاحظہ فرمایئے ؎

کنارے کے قریب آتے ہی کشتی ؛ ہوا کا رُخ بدل جاتا ہے اکثر
رہی ہوں میں مجھے پہچان لو تم ؛ بُرا جس کو کہا جاتا ہے اکثر
میں کب جاتا ہوں اس کی بزم میں خود ؛ مرا دل مجھ کو لے جاتا ہے اکثر
کرم کرتا ہے جب کوئی کسی پر ؛ مجھے شاہیں وہ یاد آتا ہے اکثر

شاہیں بھوالوی صاحب کے بعد اب ناظم صاحب محبوب کوی جناب نرودش حصاری صاحب کو دعوتِ نغمگی دے رہے ہیں۔ نرودش صاحب مائک کو قدرے بلند کرنے کے بعد جذبی مرحوم کی زمین میں نظم پیش کر رہے ہیں۔ آواز اور انداز کا امتزاج سبحان اللہ ؎

اپنے سُلگے ہوئے جذبات دبا لوں تو چلوں
اپنی جاگی ہوئی پیڑا کو سلا لوں تو چلوں
اپنے بیتے ہوئے جیون کو بھلا لوں تو چلوں
اپنے محبوب سے دامن کو چھڑا لوں تو چلوں
اے مری موت ٹھہر خود کو سجا لوں تو چلوں

نرودش صاحب شادمانی کے ساتھ واپس ہوئے تو خمار صاحب یاد فرما رہے ہیں۔ جناب بل کشن اشک کو اشک صاحب، خمار صاحب سے کچھ ادبی نوک جھونک کے بعد غزل سرا ہیں ؎

اُسے چھت پر کھڑے دیکھا ہے میں نے
کہ جس کے گھر میں دروازہ نہیں ہے
وہیں ہے گھونسلہ چمنی کے نیچے
مگر چڑیوں کا وہ جوڑا نہیں ہے
بدن کے اوج تک آزاد ہے وہ
اسے تہذیب نے باندھا نہیں ہے
سبھی انسان فرشتے ہو گئے ہیں
کسی دیوار میں سایا نہیں ہے
میں اس درجہ معزز ہو گیا ہوں
وہ میرے سامنے ہنستا نہیں ہے

خمار صاحب فرما رہے ہیں اب میں زحمت دے رہا ہوں بلکہ کوتری شریمتی نیر جاجی کو، وہ تشریف لائیں اور اپنے کلام سے نوازیں۔ نیر جاجی نے ایک گیت اور کویتا سنائی ہے۔ نیر جاجی کے بعد پروفیسر موہن سینٹھی جی نے ہندی کلام سُنا کر داد پائی ہے۔

اب خمار صاحب ایک حصار سے آئے ہوئے مہمان شاعر جناب زخمی حصاری صاحب کو دعوتِ سخن دے رہے ہیں زخمی صاحب ہریانہ کے اُستاد شعراء میں سے ہیں۔ ضعیف العمر ہونے کی وجہ سے سامعین سے معذرت کے ساتھ بیٹھ کر پڑھنے کی اجازت چاہی ہے۔ مجمع ہمہ تن گوش ہے اور زخمی صاحب کلام بلاغت نظام عطا فرما رہے ہیں ؎

کیوں رہے عالمِ بیکسی عمر بھر ؛ کیوں تڑپتی رہے زندگی عمر بھر
اپنے ظلمت کدوں میں جو بیٹھے رہے ؛ دیکھ پائے نہ وہ روشنی عمر بھر
زندگی کے مسائل نہ حل ہو سکے ؛ سوچتا ہی رہا آدمی عمر بھر
وسعتِ چشم دل کوئی دیکھے مری ؛ دشمنوں سے رہی دوستی عمر بھر
محوِ گلشن میں زخمی ہر ایک خار کی ؛ رنگ و بو سے رفاقت رہی عمر بھر

زخمی صاحب کو اس فصیح و بلیغ کلام پر داد سے خوب خوب نوازا گیا ہے۔ زخمی صاحب کے بعد سترل جی نے ہندی مزاحیہ کلام سُنا کر داد پائی ہے، سرل جی کے بعد جناب خمار ابناوی صاحب نے رباعیات سُنا کر داد پائی ہے۔ اب خمار صاحب، جناب ذاکر جعفری صاحب ذاکر صاحب کو زحمتِ سخن دے رہے ہیں۔ ذاکر صاحب شعبۂ فارسی پنجاب یونیورسٹی پٹیالہ سے منسلک ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے فرما رہے ہیں ؎

مر کر ملا ہے آج تو دلبر کا در مجھے	اب تو پھرا نہ گردشِ شام و سحر مجھے
میخانہ حیات نہیں کربلا سے کم	ساقی نے سب کو جام دیئے ہیں مگر مجھے
پیغمبرِ جنونِ محبت ہوں دوستو	ناداں ہیں وہ جو کہتے ہیں شوریدہ سر مجھے
ذاکر جنونِ عشق کی معراج ہو گئی	سب بے سبب پیدا ہوئے فکر و نظر مجھے

ذاکر صاحب کی اس کامیاب غزل کے بعد ناظم مشاعرہ جناب پروفیسر ست نام سنگھ خمار صاحب نے بذاتِ خود صدر مشاعرہ سے کلام سُنانے کی اجازت چاہی ہے۔ اس پر جناب کوکب صاحب نے خمار صاحب کا مناسب تعارف کرانے کے بعد ان سے کلام عنایت فرمانے کی گزارش کی ہے۔ سُنئے خمار صاحب ارشاد فرما رہے ہیں ؎

جو پوچھتے ہو کہ میں نے کبھی پی تو نہیں ؛ وہ بات آپ سے غلط ہے ابھی پی تو نہیں
کچھ احتیاط سے بیٹھی تھی میں نے تیرے قریب ؛ جو ایک پھول کو بیتاب ہیں لگی تو نہیں
ابھی بلند نہیں جھکتی ہے چھلک بن رہی ہے ؛ تمہاری یاد کی عادت لگی تو نہیں

حسینِ خیال کتنے تصورات کے رنگ ؛ ہمارے پاس کسی چیز کی کمی تو نہیں
کسی بھی جسم کا سایہ نظر نہیں آتا ؛ ہر ایک شخص فرشتہ ہے آدمی تو نہیں

یوں تو داد برابر دی جا رہی ہے لیکن اس شعر پر داد نے ہنگامے کی صورت اختیار کر لی ہے آپ ملاحظہ فرما رہے ہیں۔

جو اتنی جیبِ داکش ہے تیرے دل کے قریب ؛ وہ میرے خواب کے مقصد کی مورتی تو نہیں

مقطع عطا ہوا ہے۔

کروں شکایتیں میں کس کے حقوق پر چلے ؛ کہ میں خمار ہوں محمود غزنوی تو نہیں

اور اب خمار صاحب کے بعد ڈاکٹر آر۔ کے سنگھ صاحب، سنگھ صاحب نے کلام سنا کر داد پائی آپ بعد نوں زبانوں پر یکساں مہارت رکھتے ہیں مشہور فنکار ہیں۔

اب ایک ایسے شاعر کا نام پکارا جا رہا ہے کہ جن کی شخصیت اور کلام محتاجِ تعارف نہیں ہے ہیں ہندوستان کے مشہور شاعر جناب پروفیسر جاوید وششٹ۔ جاوید صاحب ان کے بارے میں اتنا بتا دینا کافی ہے کہ موصوف کی ادبی خدمات پر ہریانہ سرکار انہیں انعامات سے سرفراز کر چکی ہے ملاحظہ فرمائیے۔ ارشاد ہوا ہے ؎

وہ جو داغِ عشق تھا خوشنما، جو امانتِ دلِ زار تھا
سرِ بزم تھا تو چراغ تھا، سرِ راہ تھا تو غبار تھا

اُسے میں ہی تو جانوں ہوں دوستو، کسی وقت اپنا بھی یار تھا
کبھو توم تھا، کبھو سنگ تھا، کبھو پھول تھا، کبھو خار تھا

تری یاد ہے کہ بھی بھی، ترا ذکر ہے کہ رُکا رُکا یا
تری یاد سے تو سکون تھا ترے ذکر سے تو قرار تھا

یہ تو وقت وقت کی بات ہے، ہمیں ان سے کوئی گلہ نہیں
وہ ہیں آج ہم سے خفا خفا، کبھو ان کو ہم سے بھی پیار تھا

داد کا یہ عالم ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ سنیئے جاوید صاحب دہلی کی تصویر کھینچ رہے ہیں ؎

وہ نگر تو کب کا اُجڑ چکا یہ ہم اسی نگر سے تو آئے ہیں
کہیں معتبر تھا خلوص تھا تو کہیں وفا کا غرار تھا

جسے شوق تھا تری دید کا، جسے پیاس تھی ترے پیار کی
جو تری گلی میں مقیم تھا، وہی اجنبی طرحدار تھا

ترے دل سے میرا خلوصِ دل، نہ جھلک سکا تو میں کیا کروں
مرے عکس کی تو خطا نہ تھی، ترے آئینے پر غبار تھا

ایک اور ایک اور کی آوازیں بلند ہوتی رہیں اور جاوید صاحب شاعرہ لوٹ کر اپنی جگہ واپس لوٹ آئے۔ اور اب ماحول کی تازگی اور کیف کو برقرار رکھتے ہوئے خمار صاحب زحمت دے رہے ہیں۔ جناب صلاح الدین نیر صاحب حیدر آبادی کو جو حیدر آباد سے خصوصی طور پر تشریف لائے ہیں۔ نیر صاحب حیدرآباد کی کئی ادبی انجمنوں سے وابستہ ہیں متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں مترنم آواز میں مطلع پیش کر رہے ہیں ؎

متاعِ ہوش یہاں سب نے بیچ ڈالی ہے
تمہارے شہر کی تہذیب ہی نرالی ہے

ہم اہلِ درد ہیں تقسیم ہو نہیں سکتے
ہماری داستاں گلشن پہ ڈالی ڈالی ہے

نہ جانے بزم سے کس کو اٹھا دیا تم نے
تمام شہرِ وفا آج خالی خالی ہے

ہم اس سے پہلے یقیناً کہیں چلے ہوں گے
تمہاری بدلی ہوئی شکل دیکھی بھالی ہے

تعلقات کو ٹوٹے ہوئے زمانہ ہوا۔
وہ ایک نگاہ مگر آج بھی سوالی ہے

خلوص بانٹنے میں سب کے گھر گیا لیکن
تم آج آئے ہو جب میرا ہاتھ خالی ہے

داد ہے کہ بس کچھ نہ پوچھئے۔ مقطع ارشاد ہوا ہے ؎

کسی کی شمع سرِ شام بجھ گئی نیر ؛ کسی کے شہر میں لیکن ابھی دیوالی ہے

یہ تھے جناب نیر حیدر آبادی جو اپنے کلام سے محظوظ و مسرور فرما رہے تھے اور اب زحمتِ کلام دی جا رہی ہے مقامی شاعر جناب بی۔ ڈی۔ کالیہ ہمدم کو خمار صاحب فرما رہے ہیں کہ "ہمدم صاحب یہاں کی ادبی محفلوں کی روح ہیں" اور میں دم بخود سا ہو گیا ہوں۔ بہر حال حکم ناظم تھا مائک پر پہونچ کر غزل پیش کی گئی آپ بھی سماعت فرمائیں ؎

ساغرِ دل دردِ سے پیہم کوئی بھرتا رہا
کیا ستم کے نام پر کوئی کرم کرتا رہا

کیسے کل پرزے دن میں ہو اک آدمی ڈھلتا رہا
رفتہ رفتہ ہائے انساں کس لئے مرتا رہا

نسل نو کیسے چلے گی نقشِ پا کو دیکھ کر
آدمی تہذیب کو جو روند کر چلتا رہا
گرمیٔ حالات سے ہر آرزو جلتی رہی
عزم ہی تھا جو شگفتگی راہ پر چلتا رہا
کیا کرے گا دوستی اِک آدمی سے آدمی
اپنے ہی سائے سے جو خود بار ہا ڈرتا رہا
کیا نہیں دل نے کیا ہمدم ہجوم یاس میں
اِک دیا تھا آندھیوں کے دوش پر جلتا رہا

اور اب میرے بعد خمّار صاحب دعوتِ نغمگی دے رہے ہیں ہماری بزم ادب کے صدر جناب کوکبؔ بھوانوی صاحب کو، کوکبؔ صاحب سرزمینِ بھوانی کو عرصہ دراز سے اپنے کلام سے سیراب فرما رہے ہیں۔ کہنہ مشق شعراء اور ہریانہ کے اساتذہ میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے ؎

کس کس کو یہاں دیکھیں ہر گُل کے یہاں کوکبؔ
صورت بھی جُدا گانہ سیرت بھی جُدا گانہ
مجبوریاں تو دیکھو، کہ تیرے وصال کی
کرنی پڑی رقیب کے حق میں دُعا مجھے
سجدے کے لئے ضد کی وہ بھی سرِ میخانہ
کمبخت کہاں اُلجھا دیوانے سے دیوانہ

کوکبؔ صاحب کی کامرانی کے بعد زحمتِ سخن دی جا رہی ہے پھر ایک مہمان شاعر جناب چیت رام صاحب رہبرؔ کو فرما رہے ہیں ؎

کہنے اور کرنے میں فرق یہاں ہوتا ہے
عیاں ہوتا نہیں جو دل میں نہاں ہوتا ہے
اپنے سے بھی آتی ہے اب تو بیگانوں کی بو
ہر رہبر پر مجھے رہزن کا گُماں ہوتا ہے

آج کے مشاعرے کے پہلے دور کے آخری شاعر جناب ناشرؔ نقوی امروہی صاحب کو خمّار صاحب دعوتِ سخن دے رہے ہیں۔ ناشرؔ صاحب امروہہ یوپی کے نوعمر شعراء میں سے ہے سماعت فرمایئے ؎

کھنڈر ذرا دکھا دیتا رہا صبا مجھ کو ڈ مرے گھر کا پتا دے ذرا بتا مجھ کو
تمہارے شہر میں چھائی ہے کیسی تاریکی ڈ اُداس چہروں پہ کیوں دل دیا گیا مجھ کو
بجھے دفا کی چٹانوں پہ بہت چڑھا شیشہ کہیں گرا نہ دے یہ لمبا فاصلہ مجھ کو
رقیب بن کے مرے آنسو ذکتِ ناشرؔ ڈ ندامتوں کے کنوئیں میں گرا دیا مجھ کو

مناسب داد پا کر ناشرؔ صاحب اپنی جگہ آ گئے ہیں۔ اور اب صدر صاحب نے مشاعرے کی کارروائی کا اختتام سامعین کے شکریئے کے ساتھ فرمایا ہے یہ تمام کارروائی آل انڈیا ریڈیو روہتک کے کارکنان ٹیپ کر رہے تھے۔

اس سے پہلے کہ مشاعرے کا اختتام ہو ناظم صاحب نے صدرِ محفل جناب ڈی۔ سی صاحب کو زحمت دی ہے کہ وہ بھی اپنے کلام سے نوازیں اور ڈی۔ سی صاحب نے بیٹھے ہوئے مترنم لہجے میں دو شعر سنائے ہیں داد کا یہ عالم ہے کہ شاید ہی کسی شاعر کو اتنی داد ملی ہو۔ اس کے بعد راقم الحروف نے صدر موصوف کا شکریہ ادا کیا کہ نہ صرف انہوں نے اپنا بیش قیمت وقت اس مشاعرے کے لئے دے کر ممنون فرمایا بلکہ اپنے فصیح و بلیغ کلام سے نوازا۔ جناب صدر صاحب تشریف لے جا رہے ہیں۔ اور ناظم صاحب سامعین سے دوسرے دور کے لئے تشریف رکھنے کی درخواست کر رہے ہیں۔ رات کا ایک بج چکا ہے سردی اپنے شباب پر ہے اس کے باوجود اپنے محبوب شاعر نیرؔ صاحب کو سننے کے لئے سامعین ہمہ تن گوش ہیں۔ دو بجے اس عظیم الشان مشاعرے کو سامعین کی مرضی کے خلاف ختم کیا جا رہا ہے۔

غزل

گُل خلیقی جے پوری

کہہ رہی ہے مری چشمِ نم
اب تو کیجئے نگاہِ کرم
میری منزل ہے کوئے صنم
مجھ کو درکیں نہ دیر و حرم
تیری آنکھیں خدا کی قسم
غیرتِ میکدہ، جامِ جم
کوئی حسرت ہے دل میں نہ غم
بس تری یاد ہے اور ہم
لاکھ طوفان آئیں مگر
جذبۂ عشق ہوگا نہ کم
تیری ہر صبح، صبحِ طرب
میری ہر شام شامِ الم
آ بھی جا اب خدا کے لئے
اب سنبھلتا نہیں بارِ غم
خم نہیں یہ تری زلف کے
میری قسمت کے ہیں پیچ و خم
تم یوں ہی مسکراتے رہو
مجھ کو دے دو ہیں جتنے بھی غم
عشق کی یہ ہی معراج ہے
دردِ دل، سوزِ دل، چشمِ نم
ہر نفس گُلؔ کو درکار ہے
آپ کی اِک نگاہِ کرم

مثنوی مالوہ

نازش الہ آبادی (قسط نمبر ۱۲)

شبد پر پڑی پیک تھی لال لال   نظر آ تی تھی جو بدخشاں کا لعل
غرض اُٹھ کے اُن سے پہونچے وہاں   چمکتی تھی وہ پیک آخر جہاں

اسے چھُو کے پرکھا تو شرما گئے
ہوا ہاتھ گندہ تو جھنجھلا گئے

اُنھیں دل میں اس کا ہوا جو ملال   تو آیا انھیں خود بھی اپنا خیال
شکھوں سے تو آیا ہوں منھ موڑ کر   ہوں جنگل کا باسی محل چھوڑ کر
بھرا تھا خزانوں میں دھن بے شمار   بھرے جن میں لعل و گہر تھے ہزار
مجھے ان شکھوں سے ہے اب کیا غرض   ہوس کا ابھی تک ہے مجھ کو مرض
وہ اس غم میں تھے تو پریشان حال   مگر خود سے بھی ہو رہے تھے بد حال

انھیں اپنا حاصل جو درشن ہوا
تو دل کا بھی بے زنگ درپن ہوا

وہیں وہ ہوئے مست کامل فقیر   تصوّف کے سرتاج روشن ضمیر
وہ شاعر ہیں اس مالوے کے یہاں   جھکا جن کے چرنوں پہ سارا جہاں
مہا گرنتھ ہے "بھرتری" کا شتک   ہوا جس کا چرچا زمیں تا فلک
ہیں اُن کے شتک کے فقط تین بھاگ   وہ "سنگار" "ویراگ شتک" اور "ولاگ"
ہے سنگار رس کی حسیں وہ غزل   سیاست کا بھی ہے شگفتہ کنول
تصوّف کا اس میں بھرا ہے خمار   سخنور ہیں بھارت کے وہ نام دار

ادب میں جو بھارت کا پرچم اڑا
وہ دم تھا فقط شہر اُجین کا

اُجین میں ہر بارہ سال بعد "کنبھ" کا میلہ

ہیں اس "کنبھ" کے معنی ایسا گھڑا   کہ امرت ہو لبریز جس میں بھرا
ہوئی "کنبھ" میلوں کی کب ابتدا   پرانوں میں دلکش ہے برنن لکھا
کبھی چاند نے کر کے امرت کلش   تھا اجین سے ایک شب رو یہ کش
چنانچہ یہاں پر کچھ امرت گرا   جو بن کر کے "چھپرا" ندی ہے بہا
لہٰذا ہے اُجین ایسا نگر   جو ہے ہند و گرنتھوں میں بالکل اَمر
یہاں شنکر اچاریہ جوگی بھی   فلک سے ہیں آتے رشی اور منی
یہاں سنت آتے ہیں گیانی مہان   جو کرتے ہیں اُجین کا گن بکھان

یہاں دیوتا سار سے چھتیس لاکھ — چڑھاتے ہیں ماتھے پہ اجینی راکھ
عقیدہ ہے بس ہندوؤں کا یہی — کہ ہے مکتی داتا یہ (چھپرا ندی)
ہر اک بارہویں سال اجین کا — ہر اک ذرہ بن جاتا ہے دیوتا
یہاں کنبھ کا جب کہ آتا ہے ماس
تو کرتے ہیں اجین میں دیگر باس

دورِ نازک کی قسم

علامہ عشق آبادی (مرحوم)

> علامہ تحر عشق آبادی ماہ جنوری کے آخر میں دفتر شانِ ہند میں تشریف لائے اور یہ تازہ کلام برائے اشاعت مرحمت فرمایا۔ اسکے بعد بستر علالت پہ دراز ہو گئے۔ اور ادھر میں ہارٹ اٹیک کے باعث یہ مارچ کو داخل داخل ہسپتال ہو گیا۔ اور پھر ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ ان کا یہ تازہ کلام اب آخری کلام کے طور پر نذرِ ناظرین ہے (سرور تونسوی)

جو ہو بد پرہیز ایسے چارہ گر سے عار ہے — بے عمل واعظ سے ہر سامع کا دل بیزار ہے
بھائی سے بھائی کے دل میں کینہ ہے پیکار ہے — تکمیلِ ہوس کتنے دلوں میں خار ہے
جو یہ کہتے ہیں کہ ہر انساں سے ہم کو پیار ہے — اتحادِ باہمی رکھو تو بیڑا پار ہے
ایسا ہر ناصح مگر لٹنے کو خود تیار ہے — بھیڑ کا بچا یہ خوں آشام اک گلدار ہے
عدل اسیرِ ظلم مجروحِ ستم خوں بار ہے — قتل و غارت کی بدولت گرمیِ بازار ہے
دن دہاڑے عصمتیں لٹنے سے ہاہاکار ہے — جس کی تو کوتے سزا اس جرم کی بھرمار ہے
دوست بن کر جو دغا دے وہ بڑا مکار ہے — جو بغل میں جا گھسے مکار کی میّار ہے
جھکیوں سے جس کی ایک اک دیدہ دُر ہشیار ہے — شیر کی کھال اوڑھنے والا وہ گیدڑ یار ہے
جو خلافِ حق کہے وہ ملک کا غدار ہے — دو شو در ہے ہیں مناسب یا سزائے دار ہے
جس کا ہر وعدہ اُدھار اللہ کی سرکار ہے — خواب میں تعمیر ہے تعبیر میں مسمار ہے
دورِ نازک کی قسم اب زندگی دشوار ہے — شاعری دشواریوں پر مستقل آزار ہے

۱؎ بھرتری ہری۔ کے شاعرانہ کلام کے مجموعے کا نام بھرتری شتک ہے۔ اور یہ سنسکرت زبان میں ہے۔ ۲؎ ۔ بھرتری شتک، جس کے کل حصے ۳؎ (سنگار شتک) ۴؎ (نیتی شتک) ۵؎ (ویراگ شتک) ۶؎ اجین کی ندی کا نام چھپرا ہے) ۷؎ ہندوؤں کے چار آشرم بدری ناتھ) (جگناتھ پوری) (دوارکا) (رامیشورم کے مہنت شنکر اچاریہ کہلاتے ہیں۔

قمر ایلوی

جی ہاں میرا نام قمر الدین منشی عبداللہ ہے۔ اپنی زندگی کی ۷۵ منزلوں سے گزر چکا ہوں۔ سرکاری دفتر میں مجھے کے۔ ایم۔ اے۔ شیخ اور ادبی حلقے میں قمر ایلوی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ میرے والد مرحوم منشی عبداللہ سفیر ایلوی بڑے ہی منکسر مزاج، نیک طبع، سادہ لوح۔ اور زاہد و عابد تھے۔

طالب علمی کے زمانے میں ایلہ میں شانِ اسلام کلب کی طرف سے طرحی مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ اپنا کلام اپنے والد یا حضرت جمیل یا نور ایلوی کی اصلاح سے مشاعرے میں سنایا کرتا تھا۔ اکثر و بیشتر کلام پر حضرت نور ایلوی کے اصلاح لیتا رہا اور استفادہ حاصل کرتا رہا۔ میٹرک تک ایلہ ہی میں تعلیم پائی۔ اردو اور فارسی کے استاد مولوی بشیر الدین (تھانوی) تھے۔ جن کی ادبی نگارشات عالمگیر اور دیگر رسالوں میں شائع ہوتی تھیں۔ ان کے دستِ فیض سے گل ہائے معلومات فارسی اور اردو میں اپنے تہی دامنِ جستجو میں بھرتا رہا۔ اور انمول ادبی اور شعری معلومات مرحوم بشیر الدین سے حاصل کرتا رہا۔ مجھے میٹرک تک اسکالرشپ ملتی تھی۔ مرحوم کی ایماء سے کالج کا فارم بھر دیا اور انہیں سے پیسے لے کر زندگی میں پہلی بار تنہا ۱۹۳۸ء میں بمبئی آیا مجھے سر محمد اسکالرشپ ۴۵ روپئے اور گورنمنٹ اسکالرشپ ۱۵ روپئے ملنے لگے۔ اور سر محمد یوسف کالج اندھیری (اسماعیل یوسف) کا طالب علم ہو گیا۔ کالج کے پہلے روز ہی مرحوم ڈاکٹر بدل الرحمن پرنسپل کالج نے فرسٹ ایئر طلباء کو فارسی میں مضمون لکھنے کو کہا۔ مرحوم بشیر الدین سے فارسی کا استفادہ حاصل کیا تھا۔ بفضلِ تعالیٰ اتنا خوبصورت مضمون کئی صفحات کا لکھ کر ۵ منٹ میں مرحوم ڈاکٹر کو دکھایا۔ جب کہ دیگر طلباء ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔ مضمون پڑھ کر موصوف باغ باغ ہو گئے اور میں ان کا چہیتا طالب علم بن گیا۔ ۴۵ اور ۱۵ روپئے ماہانہ اسکالرشپ میں مجھے کالج کی پڑھائی کی تکمیل کرنی تھی اور وقتاً فوقتاً والد ماجد کی مالی امداد بھی کرنی تھی۔ لہٰذا ہاسٹل میں ٹھہرنا ناممکن تھا۔ میں نے مرحوم ڈاکٹر رحمن اور پروفیسر نقوی سے استدعا کی۔ انہوں نے بخوشی مسجد میں ایک کمرے میں ٹھہرنے کی اجازت دیدی۔ یہی کمرہ میرا دارالمطالعہ تھا۔ مسجد کی دینی لائبریری کی ادبی کتابوں سے مستفید ہوتا رہا۔ ہاسٹل سے قریب یہ بڑی خوبصورت وسیع مسجد ہے۔ جب تک تمام بلب نہ لگائیں اندھیرا سا رہتا ہے اس لئے کئی بار رات میں ۱۲ بجے ۲ بجے ہاسٹل کے شریر طلباء کالی چادریں اوڑھ کر دروازہ کھولتے۔ ڈراؤنی آوازیں نکال کر مجھے خائف کرانے اور ڈرانے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ میں یہی کہتا تھا کہ خانۂ خدا میں بھوتوں کا گزر کیسا؟ اس واقعے کی خبر موصوف ڈاکٹر رحمن کو ملتے ہی وہ ہاسٹل تشریف لائے اور تمام طلباء کو اس نازیبا حرکت پر تنبیہ دی۔ تب سے کوئی مجھے رات میں ڈرانے کے لئے نہیں آیا۔ ۱۹۴۰ء میں انٹر کے یونیورسٹی امتحان میں آپ کا یہ ناچیز قمر اور دیگر ۲ طلباء ہائر سیکنڈ کلاس میں کامیاب ہوئے۔ جس پر اور مزید ۱۵ روپئے ماہانہ کا اسکالرشپ میں اضافہ ہوا یہ بات قابلِ غور ہوگی کہ اس وقت فرسٹ کلاس میں کوئی طالب علم کامیاب نہ ہوا تھا۔ ۱۹۴۰ء میں والد صاحب ازحد علیل ہوئے اور ان کی خواہش کے مطابق میں مئی ۱۹۴۰ء میں ازدواجی رشتے میں منسلک ہو گیا۔ کالج کے احباب جو اس تقریبِ مسعود میں حاضر ہوئے انہوں نے یہ المناک خبر سنائی کہ ڈاکٹر رحمن نے داعی اجل کو لبیک کہا ہے۔ اور شادی کی خوشیاں ملیامٹ ہو گئیں۔ کچھ روز بعد فوراً کالج واپس لوٹا اور پہلے مرحوم کی قبر پر فاتحہ اور دعائے مغفرت کیلئے حاضر ہوا۔ مسجد کے دالان میں میرے کمرے سے قریب ہی مرحوم کی قبر ہے خدا مرحوم کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے آمین۔ ۱۹۴۲ء میں بی۔ اے ہوا ایم۔ اے نہ کر پایا کیونکہ راشننگ انسپکٹری چھوڑ کر میں مارچ ۱۹۴۶ء میں سنٹرل اکسائز انسپکٹر ہو گیا اور مجبوراً تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا۔ ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۸ء تک بمبئی میں رہا اور کبھی کبھار حضرت اعجاز صدیقی سے استفادہ حاصل کر لیا کرتا تھا۔ مجھے بھی فرصت کم ہی ملتی تھی۔ لیکن اس قلیل ملاقاتوں میں موصوف کے ادبی اور علمی کے مشورے اب تک میرے ذہن کو جلا بخشتے ہوتے ہیں۔ اجمیر میں تبادلے پر وہاں کے ادبی اور دینی محفلوں میں شریک ہوتا رہا۔ ۷ سال میرا قیام اجمیر میں رہا۔ وہاں حضرت خلیق، سراج اکبر، قمر ہاشمی، عشرت، رشید اور عارف القادری

جیسے شعراء کی صحبت سے مستفید ہوتا رہا۔ کئی مشاعروں ادبی تقریبوں کی صدارت کا بوجھ مجھ جیسے ادنیٰ کے شانوں پر رکھا گیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اربابِ اہلیتری کی ہمت افزائی۔ قمر نوازی کی وجہ سے بزمِ ادیب اہلیہ سے میرا پہلا شعری مجموعہ جلوۂ قمر سنہ ١٩٧٢ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اپ سپرنٹنڈنٹ ہوں۔ ذمہ داریوں کا بوجھ بڑھ گیا ہے۔ کلیان میں مقیم ہوں۔ اور ڈیوٹی پالگھر میں ہر وقت ڈونگ رہتی ہے۔ کبھی کبھار کلیان کے مخصوص اور بڑے مشاعروں میں حسبِ فرصت حاضر ہوتا رہتا ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ حسبِ توفیق و استطاعت جو کچھ لکھ لیتا ہوں۔ سُنا دیتا ہوں۔ اور کبھی شائع بھی کرا لیتا ہوں۔ اور وہ ادبی حلقے میں پسند بھی کیا جاتا ہے۔ یہ محض مخلصانِ ادب کی ذرّہ نوازی قمر نوازی اور ادب نوازی کے سوا کچھ بھی نہیں کیونکہ چالیس سالہ مشقِ سخن کے بعد بھی میں صحیح فنی مہارت حاصل نہ کر سکا۔ میں اپنے آپ کو طفلِ مکتب کے سوا کچھ نہیں سمجھتا اور ہر کسی کے نیک ادبی مشورے کو بہ دل و جان قبول کر لیتا ہوں۔ حضرت مرزا تونسوی کے توسط سے میرا مجموعۂ کلام جلوۂ قمر امریکن لائبریری کی زینت بن چکا ہے جس کے لئے میں موصوف کا مشکور ہوں۔ وقتاً فوقتاً میرا تازہ کلام شانِ ہند میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ یہ ادبی یا شخصی تعارف آپ تک پہنچانے کے لئے میں پھر حضرت مسرور تونسوی کا ممنون ہوں نمونہ کلام پیشِ خدمت ہے۔ حقیقت تو یہ ہے ....

سخن فہموں کا حُسنِ ظن ہے ورنہ
قمر کیا اور قمر کی شاعری کیا!

ذیل کی دو غزلیں نمونہ کلام کے طور پر ملاحظہ ہوں :-

(١) ٹھوکریں گردشِ دوراں کی سہا ہوں لوگو!
تب کہیں جا کے سرفراز ہوا ہوں لوگو!

شہرِ فردائی کی تمنا بھی غضب ہوتی ہے
مدتوں آتشِ حسرت میں جلا ہوں لوگو!

میں نے چھوڑا مگر دامنِ عزمِ ساحل
لاکھ گردابِ حوادث میں گھرا ہوں لوگو!

پھر بھی پتھر ہی سمجھتی رہی دنیا مجھ کو
خاتمِ زیست میں ہیرا سا جڑا اچھلا لوگو!

جذبۂ جہدِ مسلسل نہ ہوا سرد کبھی
گر کے سنبھلا ہوں، سنبھل کر میں اٹھا ہوں لوگو!

راستے راہ دکھائیں گے یقیں ہے مجھ کو
سوئے منزل میں اکیلا ہی چلا ہوں لوگو!

جانے کب آئیں گے کب برسیں گے گھنگھور بادل
دھوپ میں تشنہ دہن کب سے کھڑا ہوں لوگو!

ایک وہ ہیں کہ ہیں گلگشتِ قمر میں مصروف
ایک میں وہم کے دلدل میں پھنسا ہوں لوگو!

(٢)

داغوں کی سیاہی کا اثر معلوم ہوتا ہے
اندھیرا تا بہ حدِّ ہر نظر معلوم ہوتا ہے

الٰہی! خیر ہو اس کاروانِ اہلِ ہمت کی
جسے ہر راہ زن بھی راہبر معلوم ہوتا ہے

زمانہ ہے عجب سلطانیٔ جمہور کا یارو!
جسے دیکھو وہی اب تاجور معلوم ہوتا ہے

جو دل معمور ہوتا ہے خلوص و مہر و الفت سے
اُسے دشمن بھی منظورِ نظر معلوم ہوتا ہے

بہ فیضِ عزم و ہمت اب ہمیں ہر کارِ مشکل بھی
خدا کا شکر ہے آساں تر معلوم ہوتا ہے

یہ کس نے دیدۂ نرگس میں رکھ دی اپنی بینائی
چمن کا ذرّہ ذرّہ دیدہ ور معلوم ہوتا ہے

لبادہ فہم و دانش کا تماشا جب سے انساں نے
نگاہیں رکھ کے بھی یہ بے بصر معلوم ہوتا ہے

خلاء کے دَور میں انساں نے جب سے قدم رکھا
عقابِ زندگی بے بال و پر معلوم ہوتا ہے

سفینہ ایسا ہوا ہے نوعِ انساں کا تہو یارو!
کفِ افسوس ملتا چارہ گر معلوم ہوتا ہے

قمر جب سے خدا کو سونپ دی ہے زندگی میں نے
برابر نقشِ پا رشکِ قمر معلوم ہوتا ہے

من کہ مکتوب الیہ

نازش پرتاب گڑھی
بیگم وارڈ پرتاب گڑھ

برادرِ محترم! آداب،

آج کی ڈاک سے جنوری کا شمارہ ملا۔ کرم فرمائی کا شکریہ!

لال قلعہ کے مشاعرے سے متعلق پہلے تحریک میں محترم گوپال متل صاحب کا اداریہ پڑھا اور آج "افکار و واقعات" کے تحت آپ کا تبصرہ بھی نظروں سے گزرا اور کافی عبرت حاصل ہوئی۔

متل صاحب نے اپنے اداریے میں تحریر فرمایا ہے کہ شری کیدار ناتھ ساہنی نے مشاعرے کی صلاح کار کمیٹی کی پہلی میٹنگ ہی میں مشورہ دیا تھا کہ خوشامد پیشہ اور درباری قسم کے شاعروں کو حتی الوسع مشاعرے سے دور رکھا جائے" اور یہ کہ "خواہ وہ سابقہ حکومت کے خوشامدی ہوں یا نئی حکومت کے ـــــ خوشامدی بننے کے آرزومند"۔ ساہنی صاحب کے مذکورہ بالا مشورے کی آڑ لے کر مشاعرہ کمیٹی کے اراکین نے ایک طرف تو دل کھول کر احباب نوازی کی اور دوسری طرف اپنے سیاسی مسلک کے مخالفین کا پتا بھی جی بھر کر کاٹا۔

مذکورہ مشاعرے میں شرکت کرنے والے شعرائے کرام کی فہرست ابھی تک میری نظروں سے نہیں گزری لیکن صلاح کار کمیٹی میں متل صاحب اور ان کے حواریوں کی موجودگی ہی یہ سمجھ لینے کے لئے کافی ہے کہ فہرست میں سردار جعفری، اختر الایمان، ساحر لدھیانوی وغیرہ جیسے حضرات کے اسمائے گرامی یقیناً نہ رہے ہوں گے۔ ایمرجنسی کے زمانہ میں کمیونسٹ پارٹی نے کانگریس کی حمایت کی تھی اور یہ سارے حضرات اسی پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اب یہ حقیقت کس کس سے بتائی جائے کہ ان میں سے کسی بھی شاعر نے ایمرجنسی کی حمایت میں کوئی نظم نہیں لکھی پھر بھی ان کا یہی قصور کیا کم ہے کہ وہ کمیونسٹ پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں اور متل صاحب کسی قیمت پر بھی کمیونسٹوں کو برداشت کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتے۔ حالانکہ ادبی معیار پر یہی وہ سارے حضرات ہیں جن میں سے کسی ایک کی بھی موجودگی مشاعرے کو بھاری بھرکم اور باوقار بنانے کے لئے کافی ہوا کرتی ہے۔ مگر برا ہو اس سیاسی تعصب کا جس نے ادب اور مستند و معتبر ادبی شخصیتوں تک کو نہ بخشا اور ہمارے قومی تیوہار کے ایک جشن کو تیسرے درجے کے شاعروں اور گویوں کے سپرد کر دیا۔

سردار جعفری وغیرہ کے نام فہرستِ شعراء سے نکال دینے کی وجہ تو میری سمجھ میں آ رہی ہے اور جب میں ریڈیو کے مشاعرے کے سلسلے میں جنوری میں دلی حاضر ہوا تھا تو مجھے اطلاع بھی مل گئی تھی کہ امسال کے مشاعرے میں کسی بھی کمیونسٹ شاعر کو مدعو نہ کیا جائے گا خواہ اس کی ادبی حیثیت کتنی ہی بلند کیوں نہ ہو اور خواہ وہ درباری اور خوشامدی قسم کا شاعر ہو یا نہ ہو ـــ مگر میں خود اپنے نام کے اخراج کی کوئی معقول وجہ اب تک نہیں سمجھ سکا کہ میں نہ تو کمیونسٹ ہوں اور نہ پدم شری وغیرہ۔

مجھے جاننے والے حضرات یہ بھی بخوبی جانتے ہیں کہ سیاست اور مصلحت سے مجھے کبھی دور کا واسطہ بھی نہیں رہا ہے۔ "سیاست" کا لفظ میں نے برے سے برے معنوں میں استعمال کیا ہے اور یہ کہ ابتدا ہی سے "حق گوئی و بے باکی" میری فطرت میں شامل ہے۔ اپنے منہ میاں مٹھو بننا یقیناً نازیبا حرکت ہے۔ مگر بات چل نکلی ہے تو محض اظہارِ واقعہ کے طور پر عرض کر رہا ہوں کہ محض میری حق گوئی و بے باکی کے جرم میں کانگریس حکومت نے (ریاستی ہو یا مرکزی) کبھی میری طرف چشمِ کرم اٹھانے کی زحمت نہیں فرمائی بلکہ یو۔پی کے بعض متعصب وزراء کو تو مجھ سے اس درجہ نفرت اور عداوت تھی کہ جس مشاعرے میں وہ موجود ہوتے منتظمین کو ہدایت کر دیتے کہ ان کی موجودگی میں نازش کو پڑھنے کا موقع نہ دیا جائے۔ ان حالات میں اپنی ادبی اور قومی خدمات کا واسطہ دے کر کاسۂ گدائی بڑھانے کی نہ تو گنجائش تھی اور نہ میری خودداری گوارا ہی ہو سکتی تھی کہ میرا مزاج تو یہ ہے کہ:

کہیں دستِ طلب خالی پلٹ آیا تو کیا ہوگا
نہیں مانگی ہے اس ڈر سے دعا تک بھی کبھی میں نے

میرا سخت ترین دشمن بھی مجھ پر یہ الزام عائد نہیں کر سکتا کہ میں خوشامد پیشہ اور درباری قسم کا شاعر ہوں۔ میری ادبی زندگی کے چالیس برس ہو چکے ہیں

سینکڑوں موقع ایسے آئے جب سیاست اور مصلحت کو پس پشت ڈال کر میں نے اپنی بیباکی اور حق گوئی کا ثبوت دیا۔ اور اس "جرم" کی خاصی سخت سزائیں بھی بھگتیں، ان میں سے میں اس وقت صرف دو ہی واقعے مختصراً عرض کرتا ہوں اور دونوں ہی کا تعلق دلی سے ہے۔

ایمرجنسی سے چند ماہ قبل ترقی پسند مصنفین کے متوازی کانگریس کی ایما پر نیشنل رائٹرس ایسوسی ایشن کی داغ بیل ڈالی گئی جس کے سرپرستوں میں صدر کانگریس بروا جی اور بابو جگجیون رام وغیرہ جیسے کانگریس کے اکابرین شامل تھے اور کنوینر تھے یشپال کپور صاحب اس کے پہلے جلسے اور مشاعرے میں مجھے بھی مدعو کیا گیا تھا۔ شعراء کی [illegible]رف تھی جو یا تو غزل گا رہے تھے یا کانگریس اور اندرا کی شان میں قصیدہ پڑھ رہے تھے۔ سامعین میں کانگریسی رہنما اور وزراء کی خاصی تعداد موجود تھی۔ جب میری باری آئی تو سامعین کی صف سے اٹھ کر جب مائک پر پہونچا تو ڈائس پر بہت سے صف اول کے شعراء اور بڑے بڑے "شعر" تشریف فرما تھے۔ لہذا میں نے کہا میری نظم کا عنوان ہے "متاعِ قلم" ایک آواز آئی کہ یہ نظم سن چکے ہیں نئی نظم سنائیے، جواب دیتے ہوئے میں نے کہا کہ آج کے اس خصوصی جلسے اور مشاعرے کے لئے میرے پاس صرف یہی ایک نظم ہے آپ اسے سن چکے ہیں تو [illegible] ہی یہ کہہ کر میں نے نظم شروع کی اور نظم کے مندرجہ ذیل مصرعے خصوصیت کے ساتھ زور دے کر پڑھے اور کئی بار شعراء کو مخاطب کرتے ہوئے یہ مصرعے میں نے پڑھے۔

قلم کی گھات میں بازی گر سیاست بھی
قلم کا دشمنِ جاں نشۂ حکومت بھی
قلم خریدنے اٹھے ہیں اہلِ دولت بھی
قلم دبے گا تو پھر رات زہر بوئے گی
قلم بکے گا تو اک نسل خون روئے گی
قلم بچائے رہو شاعرو! قلم کارو!

نیشنل رائٹرس ایسوسی ایشن کے اس مشاعرے میں حقیقی قومی شاعر گنتی کے تین چار ہی تھے۔ بقیہ "صاحبزادگان" اور ابن الوقت قسم کے شعراء تھے۔ منتظمین کی اس حرکت کو "نیشنل رائٹرس" کے مقدس لفظ کی توہین تصور کرتے ہوئے دوسرے ہی دن میں نے استعفا پیش کر دیا جس کی نقلیں بہت سے اخبارات میں اشاعت کے لئے بھیج دیں اور وہ شائع ہوئیں۔ جس میں میں نے اپنے موقف کی وضاحت و صراحت کی تھی اور استعفا دینے کے وجوہات بیان کئے تھے۔ میرا استعفا نامہ پڑھ کر ایسوسی ایشن کے جنرل سکریٹری جناب گلزار دہلوی بے حد چراغ پا ہوئے اور مجھے ایک طویل خط لکھا جس میں مجھے "سستی شہرت کے طلبگار" جیسے خطابات سے بھی نوازا گیا تھا۔ گلزار صاحب کے خط کے جواب میں میں نے آٹھ دس صفحوں میں تفصیل کے ساتھ اور ادب کے ساتھ گلزار صاحب کے فرمودات کا جواب بھی دیا اور اپنے اعتراضات کی حمایت میں مزید معروضات بھی پیش کئے۔ گلزار صاحب نے میرے جواب کا جواب الجواب عنایت کرنے کی زحمت نہیں فرمائی البتہ اسی سال سے لال قلعے کے مشاعرے کی فہرستِ شعراء سے میرا نام نکال دیا گیا میں سمجھتا ہوں کہ میرے "جرم" کے مقابلے میں یہ "سزا" بے حد کم تھی اس لئے کہ اس زمانے میں یشپال کپور صاحب کا طوطی بول رہا تھا اور میں نے ان کی قائم کردہ ایسوسی ایشن کی ممبری سے استعفا دے کر اور اخبارات کے ذریعہ اس پر اعتراضات وارد کر کے خاصا "بڑا گناہ" کیا تھا۔ ورنہ ـــــ یہ بہت آسان تھا کہ گلزار صاحب کا "مخلصانہ مشورہ" قبول کرتے ہوئے میں اس ایسوسی ایشن کا ایک سرگرم رکن اور یو، پی کی شاخ کا صدر بن کر یشپال کپور کی خصوصی عنایت کا حقدار بھی بن جاتا اور دولت پیدا کرنے کے ذرائع بھی نکال لیتا لیکن ذاتی مفاد کو پس پشت ڈال کر اور "خداوندان کانگریس" کے عتاب سے بے نیاز ہو کر میں تن تنہا "نیشنل رائٹرس" کے لفظ کا تقدس برقرار رکھنے کے لئے میدان میں کود پڑا کیا یہ "اقدام" کوئی خوشامد پیشہ شاعر کر سکتا ہے؟

اس واقعے سے بھی زیادہ سخت و سنگین دوسرا واقعہ بھی سن لیجئے [illegible]ء کا ذکر ہے دلی کلاتھ ملز کے مشاعرے کا افتتاح مرحوم صدر جمہوریہ فخرالدین علی احمد صاحب نے فرمایا تھا اور میں نے اپنی غزل کے مندرجہ ذیل دونوں مطلع صدرِ محترم کو مخاطب کرتے ہوئے پڑھے تھے۔

پہلے سیاہ کار و ستم گر کہے گئے
مسند نشین ہوئے تو پیمبر کہے گئے

بے فیض و بے ضمیر جو اکثر کہے گئے
وہ لوگ عہدِ نو کا مقدر کہے گئے

مطلع ثانی کی زد میں کانگریس کے کتنے زعما اور اکابرین آتے تھے یہ بات ہر شخص بخوبی سمجھ سکتا ہے پھر یہ اشعار بھی اپنی تلخی و ترشی کے اعتبار سے

بکم نہ تھے۔

پھر تراشتے کہ گلے کاٹتے رہے ۔۔۔ تیشہ بدست ہوتے سب آئذر کہے گئے
نیزوں انگلیوں میں لگائے ہوئے لہو ۔۔۔ سمجھتے ہیں وہ شہیدوں سے بہتر کہے گئے

پنڈت پال جی کی قائم کردہ نیشنل رائٹرس ایسوسی ایشن کا ترجمہ اردو میں انجمن دانش وران قوم کیا گیا تھا چنانچہ میرا یہ شعر یقینی طور پر اُن کے پاس پہونچایا گیا ہوگا۔ اور میرے خلاف جی بھر کر زہر بھی اگلا گیا ہوگا۔

دانش وران قوم نے جب معجزہ کیا ۔۔۔ سب ریزہ ہائے سنگ جواہر کہے گئے

درباری سرکاری قسم کے لوگوں کا تو ذکر ہی کیا عام مصلحت پسند اور دور اندیش انسان بھی اس جرأت رندانہ کا مظاہرہ کرتے ہوئے گھبرائے گا۔ جس کا ثبوت میں نے پچیس تیس ہزار سامعین کے سامنے پیش کیا جس میں وزرا اور اعلیٰ سرکاری عہدے داروں کی بھی خاصی بڑی تعداد موجود تھی اور پھر ــــــ نتیجے کے طور پر میں "پدم شری" ہوتے ہوتے بچ گیا یہ اطلاع مجھے صدر جمہوریہ کے سکریٹریٹ ہی سے ملی تھی۔ انتہائی رازدارانہ طور پر۔ پھر یہ واقعہ تو دلی میں سبھی جانتے ہیں کہ گیان پیٹھ کا ایک لاکھ روپئے والا انعام ملنے کے بعد جب فراق صاحب کے اعزاز میں اشوک ہوٹل کے ہال میں مشاعرہ کیا گیا تو اپنی نظم متاع قلم پڑھتے پڑھتے فراق صاحب کی جملہ بازی کا جواب دیتے ہوئے میں نے مائک ہی پر کہا تھا کہ ــــ جی ہاں فراق صاحب اہلِ دولت قلم خریدنے یقیناً بازار نہیں جاتے وہ تو ایک لاکھ روپئے کا انعام دے کر قلم خرید لیا کرتے ہیں۔ اسی طرح اور بھی صدہا واقعات ہیں جنھیں پیش کر سکتا ہوں پھر بھی مشاعرہ کمیٹی والوں نے مجھے "خوشامد پیشہ" اور "درباری شاعر" قرار دے کر فہرست سے میرا نام خارج کر دیا تو یہ میری قسمت ہے۔

زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں

میری اس طول طویل تحریر کا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ میں بھی اور دل کی طرح مشاعرہ پڑھنے کا شائق ہوں میں نے تو صرف صلاح کار کمیٹی کی اس "بیر جانبداری" کا جائزہ لیا ہے جس کا ذکر محترم مثل صاحب نے اپنے اداریے میں شد و مد کیساتھ کیا ہے۔ میں حکومت کے ہر اچھے کام کو سراہتا ہوں اور اس کے تعمیری اقدامات سے متعلق نظمیں بھی لکھتا رہا ہوں اور عمر بھر اپنی زندگی کی آخری سانس تک کرتا رہوں گا، قوم، ملک اور عام انسانوں کی فلاح بہبودی اور ترقی کے لئے جو بھی اقدام کیا جائیگا خواہ ادھر کسی طرف سے بھی کیا جائیگا میں اسے ضرور سراہوں گا خواہ اسکے مذہبی یا سیاسی عقائد سے مجھے کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو اسلئے کہ مجھے ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا

(بقیہ خطوط صفحہ ۵۴ پر)

پیاسا ہوں ابھی

دلکش بدایونی

کیف شاکر ہیں رہِ شوق میں بیٹھا ہوں ابھی
ٹھہریئے آپ کے ہمراہ بھی چلتا ہوں ابھی

اُف وہ ہنگامِ جوانی، وہ جنونِ خیز نظر
ایک حسین خواب تھا جس خواب سے جاگا ہوں ابھی

ایک تو ہے کہ ترا پیار ہے ایک موجِ سراب
ایک میں ہوں کہ ترے پیار میں ڈوبا ہوں ابھی

دور کے ڈھول سہانے لگا کرتے ہیں
میں طرب گاہ کے نزدیک سے گزرا ہوں ابھی

جابرِ وقت، جفا دوست، وفا کے دشمن
ہے غنیمت ترے شہر میں زندہ ہوں ابھی

ایک خاموش سمندر ہے مرے دل کا سکوت
کتنے طوفان اٹھانے کو میں ٹھہرا ہوں ابھی

ساکن موجِ تلاطم ہوں مگر اے دلکش
کون تسلیم کرے گا کہ میں پیاسا ہوں ابھی

غزل

دانش علی گڈھی مرحوم

شامِ غم بجھکے صدمات نہ جینے دینگے
مجھ کو جلتے ہوئے جذبات نہ جینے دینگے

اب کرم آپ کریں بھی تو نتیجہ کیا ہے
اب یہ بگڑے ہوئے حالات نہ جینے دینگے

یادِ ماضی کی گھٹن سوزِ غمِ مستقبل
یہ سلگتے ہوئے دن رات نہ جینے دینگے

سامنے جب تھے تو سمجھتے تھے نظر کے ناوک
اب یہ دوری کے حجابات نہ جینے دینگے

اپنا غم دل سے بھلا بھی دوں اگر میں دلکش
مجھ کو اوروں ہی کے صدمات نہ جینے دینگے

ماہِ نو
لاہور

جناب سرورؔ تونسوی ۔ جناب والا
شانِ ہند ۔ ادبی موضوعات، تحریکات اور عصری مسائل پر کھل کر بات کرنے کا ایک انوکھا انداز پیش کر رہا ہے ۔ مگر فدا منزوں کی کمی کا احساس ہوتا ہے ۔ کیا اس جانب رخ کرنے کا ارادہ نہیں ہے ؟
اپنی دعاؤں میں یاد رکھیئے اور یاد کرنے والوں کی خدمت میں آداب کہئے گا۔ والسلام ۔ کشور ناہید

کراچی ۱۶ ر اپریل ۱۹۷۰ء
عزیزی سائرہ بانو ۔ دعائیں ۔ آپ کا محبت نامہ مورخہ ۵ ر اپریل ملا۔ برادرِ عزیز سرورؔ تونسوی کی علالت سے تشویش ہے ۔ بی بی! اس وقت اور ابھی میری طرف سے دعاؤں کا گلدستہ ان کی خدمت میں پیش کر دو۔ سرورؔ تونسوی صاحب نے اردو ادب اور صحافت کی جو گرانقدر خدمات انجام دیں ہیں ان کے سبب پوری اردو دنیا ان کی مداح اور معترف ہے ۔ مجھے اور میرے رفقائے ادب کو اس خبر سے سخت تشویش و اضطراب ہوا۔
سائرہ بانو! کیا یہ ممکن ہے کہ تم فوراً ان کی خیریتِ مزاج سے مطلع کرو۔ فروری اور مارچ کے شمارے نہیں ملے حافظ یوسف صاحب سے ملاقات ہو تو میرا اسلام [illegible] کردینا دل سے دعا ہیں رئیس امروہی

اسلوب ارسح ۔ فسٹ فلور
میپسن ی روڈ بمبئی ۱۲
پیارے سرورؔ بھائی [آداب]
بمبئی سے واپسی کے بعد آپ کی تحریر کو آنکھیں ترس گئیں ۔ آج آپکا گرامی نامہ ملا اسے پڑھ کر راحت ملی ۔ ایک مہینے سے زیادہ ہو گیا کہ شراب قطعاً بند ہے۔ اب تو مجھے بھی یاد نہیں ۔ ڈاکٹر سلیم تین ہفتے پیشتر فون کرکے تشریف لائے تھے، اپنے مخصوص انداز میں کہہ رہے تھے کہ وہ صرف مجھ سے ملنے آئے ہیں

مانگنے آئے ہیں ۔ میں نے کہا کہ مجھے تو رتی بھر شکایت نہیں ۔ کچھ لوگوں نے حال ہی میں انہیں فلم اسٹار کے گھروں کے چکر لگاتے دیکھا ہے ۔ (دنیا بھرے نالاں تھے) راجندر کرشن

جگن ناتھ پور
محترمی و مکرمی سرورؔ صاحب
تسلیم ۔ جنوری کا شمارہ تاخیر سے ملا ۔ مگر اسقدر علمی کہ شکایت دھل گئی ۔ دیر آید درست آید ۔ نقوی صاحب اس بار کمرے کے مترجم انیند سے شمع تک خوب پسند کیا گیا میری ان تک نیک خواہشات ضرور پہونچا دیں ۔ آل انڈیا مشاعرہ ، آندو سرکس کیلئے عزیز اندوری صاحب کو میرے حلقہ احباب کی طرف سے مبارکباد ۔ مشاعرہ اس ڈھنگ کا ہو تو کیا بات ہے ۔ افکار و واقعات میں آپکی بیباکی روح پہ ہے اور خوب ہے گویال متل صاحب کے متعلق پوچھ جھک گیا .... اچھا ہوا جو حقیقت سامنے آگئی ۔
اقبال دُرّانی

دیال سنگھ کالج

کرنال

مشترکہ پنجاب میں نصف صدی اور کرنال (ہریانہ) میں چوتھائی صدی سے اپنی شاندار روایات کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ دیال سنگھ کالج کرنال میں طلبار کو ہمیشہ ڈسپلن قومی یکجہتی اور ملک کی ہر طرح سے حفاظت کرنے کی تلقین کی جاتی ہے اور انہیں ایک اچھا شہری اور ایک ذمّہ دار ہندوستانی بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اہل کرنال اور گرد و نواح کے طلبار کے لئے دیال سنگھ کالج ایک نعمت ہے۔ اپنے بچوں کو اگر آپ اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ساتھ ایک اچھا شہری بنانا چاہتے ہیں تو دیال سنگھ کالج کرنال کی خدمات سے فائدہ اٹھایئے۔

دیال سنگھ کالج کرنال (ہریانہ)

اراکین منتظمہ کمیٹی

ٹیلیفون نمبر [illegible] رجسٹرار آف نیوز پیپرز آف انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۲۳۲۹۸ رجسٹرڈ نمبر ۲۷۰و

ایڈیٹر سرور تونسوی

قیمت سالانہ
بارہ روپے
فی پرچہ
ایک روپیہ دس پیسے

ماہنامہ

شانِ ہند
دہلی

جلد نمبر ۳ جون ۱۹۸۰ء شمارہ نمبر ۶

رُباعیات

رتن پنڈوروی

پستی میں بلندی کا نشاں ملتا ہے
مٹ کر ہی سکونِ دل و جاں ملتا ہے
ہوں خاکِ رہِ عشق رتنؔ میں جب سے
فردوس کا عیش جاوداں ملتا ہے

ہندو کو مسلمان سے یہ بیر ہے کیا
ہر وقت نزاعِ حرم و دیر ہے کیا
جب ایک ہی مالک کے ہیں یہ ہر دو فریق
پھر یہ بحثِ یگانہ و غیر ہے کیا

کہتے ہیں ہر فعل کا فاعل تو ہے
مقتول اگر کوئی ہے قاتل تو ہے
یارب یہ سزا اور جزا کیا معنی
جب دہر میں ہر عمل کا عامل تو ہے

پنڈت کا دھرم شیخ کا ایمان نہیں
قالب تو ہیں دونوں میں مگر جان نہیں
رہزن ہے کوئی اور ہے کوئی قاتل
انسان حقیقت میں اب انسان نہیں

سب لوگ غریبی کو بُرا کہتے ہیں
لقمان بلا تجھ سے خدا کہتے ہیں
میں دولتِ بادشہی سمجھتا ہوں اسے
حیران ہوں یہ کم فہم یہ کیا کہتے ہیں

ظالم ہے ستم کیش ہے خودکام ہے تو
احسان فراموش ہے عیار ہے تو
اس پر بھی تعجب ہے کہ اے عادل
عیبوں پہ پرستش کا طلبگار ہے تو

[illegible]

دلی میں جنتا انتظامیہ کی نمایاں کامیابیاں

دیہی ترقی

- ۴۵ء۱ کروڑ روپے کی تقاوی قرضوں کی تقسیم
- پینے کے پانی کی اسکیم کیلئے ۴۵ لاکھ روپے
- ۲۰ ٹیوب ویل کنکشن دیئے گئے ... ۵ جلد دیئے جائینگے

ہریجن بہبود

- ہریجنوں کے لئے ۵۰ء۱۰ لاکھ روپے کے وظائف
- ہریجنوں کو مکان بنانے کے ۵۰ء۲۳ لاکھ روپے کی مالی امداد
- ہریجن طلبہ و طالبات کے لئے ہوسٹل۔ رہائش و خوراک مفت

مزدور بہبود

- مزدور طبقہ کے ٹریڈ یونین عہدیداروں کی بحالی
- صنعتی امن —— پیداوار میں اضافہ
- ورکروں کی شکایتوں کے فوری ازالے کا بندوبست
- ورکروں کے لئے تفریحات کے مواقع میں اضافہ مزدور بہبود سینٹروں کا قیام

تعلیم

- ۱۷۰۰ طلبہ کے لئے ٹیکنیکل تعلیم و تربیت
- غریب طلبہ و طالبات کے لئے مفت وردیاں و کتابیں
- ۳ء۱۱ ۵ لاکھ روپے کے وظائف
- ... تعلیم بالغان کے سینٹروں کا قیام

ہسپتال

- شاہدرہ، امبیڈکر نگر میں ۵۰۰ — ۵۰۰ بستروں والے دو ہسپتالوں کی تعمیر پر ۲۲ کروڑ روپے کا صرفہ
- ... کے جدید ہسپتال کی تعمیر پر ایک کروڑ روپے کا صرفہ
- دیہی علاقوں کے لئے ۱۰۰ — ۱۰۰ بستروں والے ہسپتال اور ... ڈسپنسریاں

صنعت

- غیر منظور شدہ علاقوں میں ... ۴۰۰ صنعتی اکائیوں کیلئے لائسنس
- ۲۴ء۵ کروڑ روپے کی لاگت سے ٹول روم اور ترقی مرکزوں کی تعمیر
- نریلا میں ۱۶۲۰ ایکڑ رقبہ میں صنعتی بستی کی اسکیم تیار
- ۲۸ کمیونٹی ڈیولپمنٹ سینٹر۔ ۵۶۰۰ لوگوں کو روزگار

رہائشی مکانات کا انتظام

- رہائشی مکانات کی تعمیر کے لئے ہاؤسنگ بورڈ بنانے کا فیصلہ
- ہر سال ایک لاکھ مکانات تعمیر کرنے کا نشانہ
- نو آباد کالونیوں میں بجلی کے کنکشن اور دیگر شہری سہولتیں

چار سالوں میں مکمل نس بندی

اس سمت میں پہلے مرحلہ کا آغاز

جاری کردہ:- محکمہ اطلاعات و اشاعت، دلی انتظامیہ، دلی

افکار و واقعات

جناب لال کرشن ایڈوانی کے نام کھلا خط

محترم انفارمیشن منسٹر جناب ایڈوانی صاحب

آپ نے اخبارات میں سرکاری اشتہارات کی اشاعت کے سلسلے میں جو نئی پالیسی اپنائی ہے وہ اردو اخبارات کے لئے انتہائی خطرناک ہے۔ تاہم آپ نے جو شرائط عائد کی ہیں آپ کا محکمہ ڈی۔ اے۔ وی۔ پی۔ خود ان کی پابندی نہیں کر رہا ہے۔ اور ایسے اخبارات و رسائل کو اشتہارات دے رہا ہے جو آپ کی موجودہ پالیسی کے تحت حصول اشتہار کے مجاز نہیں ہیں۔ ہاں یہ دوسری بات ہے کہ آپ بھی سابقہ حکومت کے نقش قدم پر چلتے ہوئے محض ووٹوں کو محفوظ کرنے کے لئے ایسا عمل درست سمجھتے ہیں ورنہ آپ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ مہاتما گاندھی کی سمادھی پر حلف لے کر وزارت پر پہنچنے کے بعد ایسا طرز عمل اختیار فرمائیں کہ جس سے سچائی ایک کونے میں دم سادھے کھڑی ہو اور جھوٹ دندناتا ہوا مہاتما گاندھی کے اصولوں کا منہ چڑا رہا ہو۔

آپ نے جناب ...صاحب ڈائریکٹر ڈی۔ اے۔ وی۔ پی۔ کو اس عہدے سے ہٹا کر کہیں اور بھیج دیا ہے۔ آپ یقین فرمایئے کہ پچھلے کچھ مہینوں میں اکثر اخبارات نے جنتا پارٹی حکومت سے جو ایک قسم کا عدم تعاون سا کیا وہ سب انہیں ...صاحب کا ان اخبارات کے ساتھ عدم تعاون کا نتیجہ تھا۔ اخبارات خواہ وہ کتنے ہی چھوٹے کیوں نہ ہوں اپنی اپنی افادیت رکھتے ہیں اور انہیں پڑھنے والا ایک حلقہ ہوتا ہے ... اشتہارات ... [illegible] ... اور آپ کے ... صاحب ... اخبارات ... حکومت ... [illegible] ... ڈائریکٹر صاحب

آزمودہ کار ہیں وہ محترمہ اندرا گاندھی اور جناب گجرال صاحب کی طرز حکومت کو بھی دیکھے ہوئے ہیں اور شاہ کمیشن کے روبرو شہادت بھی دے چکے ہیں اس لئے موجودہ عہدہ کے لئے ان کا تقرر نہایت موزوں ہے۔

آپ موجودہ ڈائریکٹر ڈی۔ اے۔ وی۔ پی۔ کو اگر یہ ہدایت فرما سکیں کہ وہ ان اخبارات کے خلاف عملی قدم اٹھائیں جنہوں نے اپنی اشاعت میں غلط بیانی سے کام لیا ہے اور چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ کے جعلی یا جھوٹے سرٹیفکٹ دیئے ہیں۔ اس ضمن میں پریس رجسٹرار آف نیوز پیپرز کو یہ اختیارات حاصل نہیں کہ وہ اخبارات کی اشاعت کے بارے میں تصدیق کریں مگر یہ محکمہ اس ضمن میں انتہائی معصومیت کا شکار ہے۔ اگر اس محکمہ کو غلط اشاعت بتانے والے اخبارات کی نشاندہی کی جاتی ہے تو یہ پہلے شکایت کنندہ کو اپنے عتاب کا نشانہ بناتے ہیں جس سے شک ہوتا ہے کہ غلط اشاعت بتا کر سرکاری اشتہارات حاصل کرنے والے اخبارات سے پریس رجسٹرار کے محکمہ کے متعلقہ افسران کی ملی بھگت ہے۔ یا پھر انہیں اوپر سے یہ ہدایت ہے کہ چشم پوشی کی جائے۔ کیا غضب ہے کہ جو لوگ اپنے اخبارات میں ... اخلاق کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں وہ خود اپنے اخبارات کی اشاعت غلط بتا کر اور جھوٹے حلف نامے داخل کر کے عوام کا روپیہ ... طور پر ہڑپ رہے ہیں۔ لہذا آپ پریس رجسٹرار کو بھی ہدایت دیں کہ وہ اس سلسلے میں اپنی کارکردگی دکھائے۔ محکمہ ڈی۔ اے۔ وی۔ پی۔ ... اشتہارات ... کے لئے کسی بھی اخبار کی ... اشاعت کے بارے میں تحقیق کرنے کے لئے مناسب ... کر سکتا ہے۔ لہذا ڈائریکٹر ڈی۔ اے۔ وی۔ پی۔ ... اس ... [illegible] ... اخبارات کا ... کریں۔ ڈائریکٹر صاحب ... آپ ... [illegible]

سلسلے میں ایڈیٹر شانِ ہند ایسے کئی اخبارات کی نشاندہی کر سکتا ہے جنہوں نے یقیناً اس سلسلے میں سراسر جھوٹ اور غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ ہم نے ایسے کچھ اخبارات بھی اکٹھے کر رکھے ہیں کہ جن کی اشاعت فروختگی دیکھ کر لگتا ہے پچاس بھی نہیں ہے۔ مگر اس میں سرکاری اشتہارات موجود ہیں۔

ایڈوانی صاحب آپ کے بارے میں ہمیں جناب جاوید دھرمیندر ناتھ صاحب نے یہ بتایا ہے کہ آپ ہمیشہ سچائی کے حامی رہے ہیں۔ اور اپنے فرائض منصبی کو پوری ایمانداری کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔ اور آپ سرکاری ذمہ داریاں جس اچھے انداز سے نبھاتے ہیں وہ اجاریہ جی کے فرمان کی تصدیق کرتی ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہم آپ کے نام یہ کھلا خط لکھنے کی جسارت کر رہے ہیں۔ کیونکہ کرسی وزارت نے ابھی تک آپ میں وہ بے دردی پیدا نہیں کی جو عام طور پر اچھے اچھے فرض شناس ہستیوں کو بھی غلط راستے پر ڈال دیتی ہے۔ اور آپ اس میں بھی یقین رکھتے ہوں گے کہ اگر فریب کاروں، جھوٹے اور غلط کاروں کی حکومت پشت پناہی کرتی ہے تو سچائی اور اخلاق کی قابلِ تقلید قدریں بے شک کچھ وقت کے لئے ماند پڑ جاتی ہیں۔ مگر اس کا نتیجہ جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔ اس لئے انتہائی ادب کے ساتھ گزارش ہے کہ آپ جھوٹی اشاعت بتا کر سرکاری اشتہارات حاصل کرنے والے اخبارات و رسائل کے خلاف سخت ترین قدم اٹھائیں تاکہ ایسے ننگِ صحافت اخبارات و رسائل جس قدر جلد ازجلد دم توڑ سکیں بہتر ہے۔

اردو اخبارات کے سلسلے میں آپ اپنی پالیسی پر نظرِ ثانی فرمائیں کم ازکم فروختگی اشاعت اگر پانچ صد کر دیں تو یقیناً آپ سچائی کی اخبارات کے لئے ایک مناسب قدم اٹھائیں گے۔ اور آپ کے اس اقدام سے دھوکہ باز بیشتر اردو اخبارات و رسائل سچائی پر چلنا شروع کر دیں گے۔

غالبؔ کے معنوی اساتذہ

مالک رام صاحب کے ذاتی وقار کی نذر

جناب ظفر ادیب نے غالب اکاڈمی کے بانی جناب حکیم عبدالحمید صاحب آف ہمدرد دواخانہ کے ساتھ تبادلۂ خیال کرتے ہوئے غالب پر ایک کتاب لکھنے کی خواہش کا اظہار فرمایا۔ تو حکیم صاحب نے اس تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے فرمایا کہ چند موضوعات تعین کر کے ان سے مشورہ کیا جائے تو وہ کسی ایک موضوع کا انتخاب کر دیں گے۔ پھر اس پر کتاب لکھی جائے۔ جسے غالب اکاڈمی سے شائع کیا جائے گا۔ چنانچہ ظفر ادیب نے ۴۴ مختلف موضوعات کی فہرست حکیم صاحب کی خدمت میں پیش کی جن میں دو موضوعات کو انہوں نے پسند فرمایا اور کچھ دنوں بعد حکیم صاحب نے اپنے رفقاء سے مشورہ کے بعد غالبؔ کے معنوی اساتذہ موضوع پر کتاب لکھنے کے لئے ظفر ادیب کو اجازت دے دی۔ ظفر ادیب صاحب دو سال تک مختلف لائبریریوں میں کتب کا انتخاب کر کے مطالعہ کرتے رہے اور اس موضوع سے متعلقہ مواد کے بارے میں حوالہ جات نقل کرتے رہے۔ اور انہوں نے تین چار سال کی محنت کے بعد چھ صد صفحات پر کتاب کا مسودہ تیار کر کے حکیم صاحب کے حوالے کر دیا۔ دو سال تک تو حکیم صاحب ٹالتے رہے کہ انہیں وقت نہیں ملتا۔ جلد ہی وہ کتاب کا مسودہ پڑھ کر [illegible] گے۔ حکیم صاحب کو اس سلسلے میں وقت مل سکتا ہی نہ تھا چنانچہ انہوں نے کتاب کا مسودہ جناب مالک رام صاحب کے سپرد کر دیا۔ مالک رام صاحب نے مکان تبدیل کیا تو یہ مسودہ بھی ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ دو سال کے بعد [illegible] صاحب نے کسی نہ کسی طرح یہ مسودہ مالک رام صاحب کے ہاں سے تلاش کیا۔ اور مالک رام صاحب نے مسودہ پر یہ نوٹ لکھ کر حکیم صاحب کو واپس [illegible] مسودہ میں زبان کی غلطیاں پائی جاتی ہیں [illegible] مالک رام صاحب [illegible]

کتاب لکھے وہ ویسے کیسے ادا کر سکتے تھے۔ کیوں کہ مالک رام صاحب چاہے کچھ اور کیوں نہ ہوں مگر وہ نہ تو زبان داں ہیں اور نہ ہی اہلِ زبان۔ اس لئے اُن کا یہ اعتراض کہ مسودہ میں زبان کی خامیاں ہیں یقیناً بیہودہ تھا۔ حکیم صاحب نے ظفر ادیب سے کہا کہ وہ مسودہ پر نظرِ ثانی کریں جس کی تعمیل کی گئی۔ مگر انہوں نے مالک رام صاحب کے مشورہ کے مطابق کتاب کو چھاپنے سے انکار کر دیا۔ ظفر ادیب نے کتاب کا مسودہ جناب قاضی عبدالودود صاحب کو دکھایا جنہوں نے اسے پڑھنے کے بعد حکیم صاحب کو خط لکھا کہ کسی غیر جانبدار ادیب سے اس مسودہ کے بارے میں رائے طلب فرمائی جائے۔ مگر حکیم صاحب نے جناب مالک رام صاحب کی بات رکھنے کے لئے قاضی صاحب کو لکھا کہ انہوں نے خود کتاب کا مسودہ پڑھا ہے جو اشاعت کے قابل نہیں ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب کے مسودہ کو پڑھنے کے لئے حکیم صاحب کو آج تک وقت نہیں مل سکا۔

ظفر ادیب کی اس چھ سالہ ادبی محنت و کاوش کا جناب مالک رام کے ذاتی وقار کا مسئلہ بن جانا یقیناً قابلِ افسوس ہے ضرورت ہے کہ انجمن ترقی اردو ہند یا [illegible] اس مسودہ کو [illegible] کسی غیر جانبدار باحیثیت ادیب نقاد اور محقق کی بے لاگ رائے حاصل کرے اگر یہ محسوس کرے کہ یہ مسودہ قابلِ اشاعت ہے تو اسے کتابی شکل میں شائع کرے۔ اور ظفر ادیب صاحب کو اُن کی محنت کا مناسب معاوضہ ادا کرے۔

ٹیلیفون بلوں میں گھپلے کی وجوہات

اخبارات میں چھپا ہے کہ نئی دہلی سے ممبر پارلیمان [illegible] نے اپنے ایک ساتھی وزیر [illegible] لال [illegible] صاحب سے کہا ہے کہ [illegible] ٹیلیفون [illegible] کرتے ہوئے کہنے پڑے جب کئی ممبروں نے کھڑے ہو کر شکایت کی کہ ٹیلی فون ڈیپارٹمنٹ سے ملنے والے بلوں میں بہت گھپلا ہے۔ ان میں سے بعض ممبروں نے اپنے تجربے دہرائے کہ انہوں نے سب موصول ہونے والے بھاری بھرکم بلوں کی شکایت کی جو اس صورت میں دیئے گئے تھے جب وہ دہلی میں موجود نہیں تھے یا وہ ایس۔ ٹی۔ ڈی استعمال ہی نہیں کرتے تھے، تو ٹیلیفون حکام نے انہیں جواب دیا کہ بلوں کا تخمینہ قطعی طور سے درست ہے اور اگر بل ادا نہیں کئے گئے تو اُن کے ٹیلی فون کاٹ دیئے جائیں گے۔ اس مرحلہ پر پردھان منتری نے مداخلت کرتے ہوئے غصے میں بھرے ہوئے ممبروں سے کہا کہ ان کی شکایت نئی نہیں ہے یہ کئی برس پرانی ہے۔ تین چار سال پہلے مجھے بھی ایسے بل ملنے کا تجربہ ہوا تھا۔ پردھان منتری نے کہا کہ حال ہی میں اس مسئلہ پر میں نے وزیر مواصلات کی توجہ دلائی ہے۔ ہم اس کی چھان بین کر رہے ہیں۔ بل تیار کرنے میں جعلسازی قسم کی گڑبڑ ہو رہی ہے جسے وزیر نے منظور کیا ہے۔ اس کے لئے جو بھی قصوروار ہوگا اسے سزا دی جائے گی۔

اس سلسلے میں ہم عالیجناب وزیر اعظم ہند اور وزیر مواصلات جناب برج لال ورما سے مودبانہ گزارش کریں گے کہ ٹیلی فون کے بلوں میں اس گھپلے کے ذمہ دار ٹیلیفون کے وہ ملازمین ہیں جو ایسے بزنس مینوں سے گٹھ جوڑ کئے ہوئے ہیں جنہیں دن میں کئی کئی بار بمبئی وغیرہ کاروباری سلسلے میں ایس۔ ٹی۔ ڈی سہولیت کے ذریعہ فوری بات چیت کرنی ہوتی ہے۔ یہ ملازمین ایسے لوگوں کو دوسرے ٹیلی فون کے ساتھ ایس۔ ٹی۔ ڈی کا کنکشن جوڑ کر بات چیت کراتے ہیں۔ اور اس کے بدلے میں طے شدہ معاوضہ ایسے لوگوں سے وصول کرتے ہیں جو اس غیر قانونی سروس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

"شانِ ہند" کے ٹیلیفون سے بہت کم فون کئے جاتے ہیں جس کی وجہ سے گزشتہ تین سالوں میں کرایہ ٹیلیفون کے علاوہ لوکل کال کا بل بہت ہی معمولی ہوتا ہے۔ مگر گزشتہ

تین بلوں میں لوکل کالز کی تعداد میں یکدم بچاس گنا، سو گنا اور
اب کئی ہزار گنا کا اضافہ ہوگیا ہے۔ اور اب کی مرتبہ جو بل آیا ہے
اُسے ادا کرنے کی سکت ہی ہم نہیں رکھتے۔ محکمہ کو شکایت
کی جاتی ہے تو جواب یا جواب آجاتا ہے کہ آپ کے فون کا میٹر
چیک کیا گیا ہے وہ ٹھیک ہے اس لئے بل بالکل ٹھیک ہے
محکمے کے افسران یہ سوچنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے کہ جس
ٹیلی فون کا گزشتہ بیس سال سے بل معمولی طور پر آتا ہے اور ہر
بار پانچ دس روپیہ کی کمی بیشی رہتی ہے۔ اور بعض اوقات تو
محض کرایہ ٹیلی فون ایک سو پچاس روپیہ کا ہی بل ہوتا ہے۔ اس
فون پر یکایک کئی کئی ہزار لوکل کالز کا ہونا کیونکر ممکن ہوگیا۔ اور یہ
تعداد ہر سہ ماہی میں کئی کئی گنا زائد ہوتی جا رہی ہے۔

ہم نے اس سلسلے میں وزیر مواصلات سے بالمشافہ طور پر
شکایت کرنے کیلئے درخواست کی ہے۔ کیونکہ جو بل ہمیں اس مرتبہ
آیا ہے اُسے تو ہم ادا کرنے کی سکت ہی نہیں رکھتے۔

خدا کا شکر ہے کہ ہمارے وزیر اعظم صاحب کو ٹیلی فون کے
بلوں میں گھپلے کا یقین ہے اس لئے اُمید کی جا سکتی ہے کہ محکمہ
ٹیلی فون کے افسران اس دھاندلی کے خلاف کوئی موثر قدم
اُٹھائیں گے۔

حق بنارسی بنام راہی شہابی بلند شہری

ماہ اپریل کی اشاعت "شان ہند" میں حق بنارسی صاحب
اور راہی شہابی کی ایک متنازعہ غزل کے بارے میں لکھا گیا تھا۔
اس سلسلے میں راہی شہابی کے حق میں اور مخالفت میں خطوط کا
تانتا بندھ گیا ہے۔ ان خطوط میں بعض کی زبان کافی حد تک
توہین آمیز ہے۔ جو کسی طور پر بھی شائع نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ یہ طے
کیا گیا ہے کہ اس متنازعہ سلسلے میں جناب راہی شہابی صاحب کا
اپنا بیان ہی شائع کیا جائے۔ کیونکہ اصل معاملہ ان کا ہی ہے
اور انہیں اپنی صفائی میں کچھ کہنے کا پورا پورا حق ہے۔ مدیر شان ہند
نے نہایت دیانتداری سے وہ واقعات شائع کئے ہیں جو اُسے
معلوم ہو سکے۔ جناب راہی شہابی نے ابھی تک اس سلسلے میں
ہمارے خط کے جواب میں کچھ بھی نہیں لکھا۔ اُن کے تردیدی بیان
کے لئے شان ہند کے صفحات ہر وقت حاضر ہیں اور اس
متنازعہ معاملے کا حل جناب حق بنارسی اور جناب راہی صاحب جس
بہتر انداز میں کر سکتے ہیں کوئی تیسرا نہیں کر سکتا۔

مشاعرات طوائفیت کی زد پر

"شان ہند" مشاعرات کے معاوضے کے خلاف نہیں
کیونکہ جمہوریت کے اس دور میں کسی بھی طوائف زادی، کسی
بھی کال گرل، یا پرائیویٹ دھندہ کرنے والی خوش گلو یا
خوش شکل صاحبزادی کو یہ قانونی حق حاصل ہے کہ وہ بطور
شاعرہ کسی بھی مشاعرہ میں غزل گا کر یا تحت اللفظ پڑھ کر داد
کے علاوہ معقول معاوضہ حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ کسی
چاہنے والے کو لوٹ لے۔

ہاں "شان ہند" اس کے خلاف ضرور ہے کہ ان مشاعرات
اور ان کے حواری شرابی اور بدچلن شاعروں اور متشاعروں نے
مشاعروں کی آڑ میں جو بداخلاقی پھیلا رکھی ہے اس سے اردو
زبان کو نقصان پہنچ رہا ہے مشاعرے ہمارے معاشرے میں
ہمیشہ اعلیٰ اقدار کے حامل رہے ہیں نیز شاعر کو اخلاقی اور ادبی
روایات کا وارث سمجھا جاتا رہا ہے۔ مگر اب مشاعروں کے بدذوق
اور عیاش منتظمین نیز خود شعراء کی بداخلاقیوں اور کثرت شراب
نوشی نے ان اعلیٰ اقدار اور اخلاقی روایات کا جنازہ نکال کر رکھ
دیا ہے۔ جس کا اندازہ ذیل کے چشم دید واقعہ سے بخوبی لگایا جا سکتا
ہے۔

ایک کنواری شاعرہ (متشاعرہ) جو اپنے آپ کو تقریباً چھتیس سال
کی عمر میں بھی ابھی نابالغ سمجھتی ہیں نے اپنے ایک چاہنے والے کو
اس طرح بلیک میل کیا کہ جو اسے ناجائز حمل قرار پا چکا ہے۔ وہ انہی
صاحب کا ہے۔ لہٰذا اسقاط حمل کے اخراجات کے طور پر ان صاحب
سے خاصی موٹی رقم بتائی گئی۔ سننے میں آیا ہے کہ ان صاحبہ
اپنے ہر چاہنے والے پر یہی نسخہ آزما کر کئی ہزار [illegible]
اور اسقاط حمل کا [illegible]
آدھا حکومت کی طرف سے ہسپتالوں میں اسقاط حمل کے
لئے مفت سرکاری خدمات حاصل ہیں [illegible]
ایسی حرکات آئے دن ہوتی رہتی ہیں [illegible]

حرکت کا تعلق اُردو مشاعرے اور ہند ... مشاعرہ کی حیثیت سے عمل میں آتی ہے تو اس سے یقیناً اُردو کو نقصان پہنچا ہے کیا منتظمین مشاعرہ شنڈے دل سے ہماری اس گزارش پر دھیان دیں گے کہ وہ اپنی جنسی خباثت کو شاعروں سے دور رکھیں

طارق بدایونی کو مبارک باد

راشدہ باقی حیا اور طارق بدایونی نے باہمی رضامندی سے اپنے والدین کی اطلاع کے بغیر (بقول راشدہ باقی حیا) لکھنؤ میں نکاح کر لیا تھا اس کے بعد کئی ماہ تک یہ دونوں الگ الگ مختلف مقامات پر اور بدایوں میں طارق صاحب کے گھر میں مقیم رہے پچھلے دنوں راشدہ باقی حیا نے ایک لڑکے کو جنم دیا ہے۔ لہٰذا ادارہ شانِ ہند جناب طارق بدایونی اور راشدہ باقی حیا صاحبہ کو مبارکباد پیش کرتا ہے۔ طارق صاحب آج کل کراچی میں مقیم ہیں۔ اور سُنا ہے کہ وہ پاکستانی شہریت حاصل کرنے کی فکر میں ہیں۔ کیونکہ کراچی میں ان کے کسی عزیز کی فیکٹری ہے۔ اور طارق صاحب اسی فیکٹری میں کام کریں گے۔

راشدہ باقی حیا نے بتایا کہ ڈاکٹر بشیر بدر کے ہاں طارق صاحب کا خط آیا ہے جس میں انہوں نے فرزندِ ارجمند کے تولد ہونے پر خوشی کا اظہار فرمایا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ طارق صاحب اور راشدہ حیا نے ... کے زمانے میں کچھ وقت ڈاکٹر بشیر بدر کے دولت کدہ پر ... تھا۔

اگر طارق صاحب واقعی پاکستانی شہری بن رہے ہیں تو اُمید کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے ... بچے کو بھی پاکستان بلالیں گے۔ اور یہ پاکستان کی خوش قسمتی ہے کہ ہمیں ایک ہندوستانی محترمہ شاعرہ کے ساتھ ساتھ ایک زندہ شکن ایسی شاعرہ بھی مل رہی ہے جو پاکستان کی تمام شاعرات سے زیادہ خوبصورت ہے۔

نادر تحفہ حضرت ... کا تازہ ترین مجموعہ کلام
قیمت ... روپے
ملنے کا پتہ: شانِ ہند، دہلی ۶

بقیہ صفحہ ... کا

کہ تم بار بار کہتے ہو کہ میں ایک فرج "FRIGE" اور لونگا ... جملہ کو ادا کرنے والی صاحبہ ریہرسل میں بار بار یہی کہے "کہ تم بار بار کہتے ہو کہ میں ایک فرج اور لونگا" یہ آواز جب انور خاں صاحب نے سنی تو وہ بھاگے بھاگے ریہرسل روم میں گئے اور کہنے لگے کہ کیا بکواس لگا رکھی ہے۔ یہ لفظ فرج ہے۔ جب یہ مکالمہ بولنے والی صاحبہ کو پتہ چلا کہ فرج کے کیا معنی ہیں تو وہ گھنٹوں روتی رہیں"۔ مگر یہ لطیفہ ریڈیو اسٹیشن پر ہر ایک کی زبان پر ہے۔

بقیہ صفحہ ۳۲ کا

ذخواب آئی خیالات گذاری خوشی کیساتھ ؛ وہ ہر قدم پہ کھیلے میری زندگی کیساتھ
سر جھک کے پلنے نازپہ اٹھانہ پھر کبھی ؛ تکمیل بندگی کی ہوئی بندگی کیساتھ
معراجِ عاشقی کی سند مل گئی ہمیں ؛ بدلا نظامِ زیست کا وابستگی کیساتھ

محترمہ کے دلکش ترنم پہ ہزار ہا ترنم قربان۔ حالانکہ اس وقت کتنوں ہی پر غنودگی طاری ہے۔ لیکن ایسا نظر رہا ہے کہ ہر خوش قسمت اپنی جگہ پر چاک و چوبند اور بیدار ہے۔ کیا عرض کروں اس دم تو ملتی نورانی رات اور اس پر محترمہ کا ترنم۔ سبحان اللہ۔ آپ کے ساتھ ہی اس ورعلیشانہ و یادگار محفلِ شعر و سخن کے اختتام کا اعلان ... ۳ بجے کیا جا رہا ہے!

یہ مشاعرہ میں نے پہلی بار سُنا۔ بدلعصر محترم وارثی محترم چودھری رئیس الدین خاں جناب وحید ادیب صاحبان نے اس مشاعرہ میں مجھے یاد فرما کر ممنون کرم کیا۔ آنے والے شعراء اور مہمان کرام کی وہ خاطر مدارات ہوئی ہے کہ بزرگوں اور اگلے وقتوں کی یاد تازہ ہو کر رہ گئی ہے۔ مشاعرہ کو اس طرح سُنا جاتا ہے جیسے کہ یہ کوئی مجلس وعظ ہو بہر حال اہلِ قصبہ اور ... بہ ہر صاحب لائق صد تحسین اور مبارک باد کے مستحق ہیں کہ وہ ہر سال ایک یادگاری اور کامیاب مشاعرہ کرا کر سامعین اور حاضرین پر کرم فرماتے ہیں ... کیا عرض کروں

اب بھی وہ منظر فردوس نظر میں گم ہے
بزم میلاداں سے کریں گے کچھ دیر ہوئی

بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر

(سرور تونسوی)

اُن دنوں ایک فلم "شاعر" بنی۔ جس کے دہلی اور یو۔ پی کے تقسیم کار سیٹھ جگت نرائن تھے۔ دیوان متھرا داس آہوجہ فرحت کرنال میں ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تھے۔ باتوں باتوں میں انہوں نے پروفیسر ضیا مرحوم (جو انبالہ میں پڑھاتے تھے) سے کہا کہ جب وہ دیال سنگھ کالج لاہور میں ایم۔ اے کے سٹوڈنٹ تھے تو انہوں نے ایک فلمی کہانی "شاعر" لکھی تھی اور اپنے پروفیسر سید عابد علی عابد کو نظرثانی کے لئے دی تھی جسے وہ بمبئی لے گئے تھے۔ اور اس کے بعد اس کہانی کے بارے میں کچھ پتہ نہ چل سکا کہ کہاں گئی۔ قیامِ پاکستان کے باعث دیوان متھرا داس آہوجہ ہندوستان آ گئے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ سید عابد علی ان کی یہ کہانی بمبئی میں کسی فلم ساز کو دیکھنے کے لئے دے آئے ہوں۔ اور اب تقسیمِ ملک کے بعد اس فلم ساز نے وہی کہانی کچھ رد و بدل کے ساتھ کسی فرضی یا اصلی کہانی کار کے نام سے فلما دی ہو۔ پروفیسر ضیا نے یہ سب کچھ سردار دیوان سنگھ مفتون کو بتایا تو مفتون صاحب کے زرخیز دماغ نے فوراً سیٹھ جگت نرائن کے لئے ایک اور مشکل کھڑی کرنے کا پلان بنا لیا۔

ایڈیٹر شانِ ہند اور دیوان متھرا داس آہوجہ فرحت رشتہ دار ہونے کے علاوہ دوست بھی رہیں۔ اتفاقاً میں کرنال میں آہوجہ صاحب کے ہاں مقیم تھا کہ رات کے دس بجے کوتوالی کرنال کا ایک کانسٹیبل آہوجہ صاحب کے بنگلہ پر آیا اور کہنے لگا کہ دہلی سے کوتوالی میں فون آیا ہے کہ آہوجہ صاحب اس فون نمبر پر فوراً بات کریں۔ اس وقت آہوجہ صاحب کے بنگلہ پر فون نہیں تھا۔ آہوجہ صاحب نے فون نمبر پڑھا تو انہوں نے حیرانی کا اظہار فرماتے ہوئے کہا کہ دہلی میں میرے کسی جاننے والے کا یہ فون نمبر نہیں ہے۔ انہوں نے فون نمبر والے کاغذ کے ٹکڑے کو مجھ کو دکھایا تو میں نے نمبر پڑھتے ہی بے ساختہ کہا کہ یہ نمبر تو سردار دیوان سنگھ مفتون کا ہے۔

آہوجہ صاحب کے بنگلہ کے قریب ہی ایک سردار صاحب مجسٹریٹ کی کوٹھی پر فون تھا لہٰذا آہوجہ صاحب مجھے ساتھ لئے ان مجسٹریٹ صاحب کے ہاں گئے اور وہاں سے انہوں نے مفتون صاحب کے نمبر پر ٹرنک کال بک کرائی اور ٹیلیفون آپریٹر سے کہا کہ میں اے۔ ڈی۔ ایم کرنال بول رہا ہوں لہٰذا یہ کال فوراً ملا دی جائے۔ پانچ منٹ کے اندر اندر ٹیلیفون پر پروفیسر ضیا صاحب آہوجہ صاحب سے بات کر رہے تھے۔ یہ بات چیت پندرہ منٹ تک جاری رہی اور ضیا صاحب نے آہوجہ صاحب کو یہ یقین دلا دیا کہ انہوں نے ہر طرح سے یہ تحقیقات کر لی ہے کہ یہ فلم شاعر آپ ہی کی کہانی پر تیار کی گئی ہے۔ لہٰذا آپ فوراً عدالت سے حکمِ امتناعی حاصل کر کے سیٹھ جگت نرائن پر تعمیل کرائیں کہ وہ اس فلم کی نمائش نہیں کر سکتے۔ اور ادھر پانچ دن کے بعد یہ فلم ناولٹی سینما دہلی میں دکھائے جانے کا پروگرام تھا۔ دوسرے دن آہوجہ صاحب نے اپنی عدالت میں جاتے ہی سینئر سب جج کو بلوایا اور ان سے مشورہ کر کے ایک وکیل سے اس فلم کی نمائش کو روکنے کے لئے حکمِ امتناعی کی درخواست سینئر سب جج کی عدالت میں دے دی اور نصف گھنٹے میں حکمِ امتناعی مل گیا اور اس کی تعمیل کے لئے عدالتی کارندہ دہلی روانہ بھی ہو گیا اور اُدھر جگت ٹاکیز ڈسٹری بیوٹرز دہلی پر اس حکمِ امتناعی کی تعمیل گھنٹوں میں ہی ہو گئی۔

لالہ کرم چند آنند "پارس" سیٹھ جگت نرائن کے ہاں جانے والے حاضر باش قسم کے اخبار نویس تھے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ سیٹھ صاحب کے رحم و کرم پر ہی "پارس" کی زندگی کا دارومدار تھا تو بے جا نہ ہوگا۔ چنانچہ سیٹھ جگت نرائن صاحب نے لالہ کرم چند سے اس واقعہ کا ذکر کیا تو لالہ کرم چند نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کا ارادہ کیا اور سیٹھ صاحب کو یقین دلایا کہ وہ اس جھگڑے میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں کیونکہ اب تیسرے دن جبکہ یہ فلم ناولٹی سینما کے

علاوہ یو۔ پی کے کئی مقامات پر دکھائی جانے والی تھی۔ اس لئے سیٹھ جگت نارائن کی پریشانی کا اندازہ لگایا جانا مشکل نہ تھا۔

لالہ کرم چند مرحوم اور مرحوم پنڈت ہری چند اختر کی جوڑی لاہور میں بھی مشہور رہی تھی۔ اور یہ دوستی دہلی میں بھی حسبِ سابق تھی۔ لالہ کرم چند نے پنڈت ہری چند اختر سے اس معاملے کا ذکر کیا تو انہیں اس کا علم تھا کہ دیوان متھرا داس آہوجہ اور سرور تونسوی رشتہ دار ہیں۔ ویسے پنڈت ہری چند اختر آہوجہ صاحب سے ذاتی طور پر بھی واقف تھے۔ مگر انہوں نے موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے فوری طور پر ایڈیٹر شانِ ہند سے رجوع فرمایا۔

کرنال سے واپس آنے کے بعد ایڈیٹر شانِ ہند سردار صاحب کے یہاں حسبِ معمول شام کی محفل میں شرکت کر رہا تھا۔ پروفیسر ضیا صاحب خلافِ توقع تین چار دنوں سے سردار صاحب کے مہمان تھے۔ مگر سردار صاحب نے اس معاملے کے بارے میں ایڈیٹر شانِ ہند کے کانوں میں بھنک تک نہ پڑنے دی تھی۔ سازش کی تیاری اور اس کی رازداری کا کمال جو سردار صاحب کو حاصل تھا وہ بہت کم لوگوں میں ہو سکتا ہے۔ مگر سردار صاحب اور ضیا صاحب کو اس کا علم نہ تھا کہ جب انہوں نے کرنال آہوجہ کو فون کیا تو ایڈیٹر شانِ ہند وہاں موجود تھا۔ اور اسے سارے ڈرامے کے پلاٹ سے پوری پوری واقفیت ہے۔ پنڈت ہری چند اختر نے مجھے اتنا ہی بتایا کہ آہوجہ صاحب نے فلم "شاعر" کی نمائش رکوا دی ہے اور پرسوں فلم سارے ہندوستان میں ریلیز ہونی ہے۔ اس لئے سیٹھ جگت نارائن پریشان ہیں۔ آہوجہ صاحب تمہارے رشتہ دار ہیں اور دوست بھی لہٰذا کرنال چلو اور اتنا کرا دو کہ یہ حکم امتناعی منسوخ ہو جائے۔ سیٹھ جگت نارائن صاحب کا کہنا ہے کہ اگر واقعی یہ کہانی آہوجہ صاحب کی ہے تو وہ اس کا مناسب معاوضہ دے دیں گے۔

پنڈت جی کا یہ فرمان سننے کے بعد ان کی واقفیت کے لئے اس ڈرامے کا پس منظر ان کے گوش گزار کیا گیا تو وہ کانوں کو ہاتھ لگا کر سردار دیوان سنگھ مفتون کے سازشی دماغ کی تعریف کرنے لگے۔ پروفیسر ضیا سے پنڈت جی کے تعلقات بڑے ہی دوستانہ تھے۔ انہوں نے سردار صاحب کے ہاں فون کر کے ضیا صاحب سے بات کرنے کی کوشش کی تو ضیا صاحب نے وہاں موجود ہوتے ہوئے سردار صاحب سے کہلوا دیا کہ ضیا صاحب تو دو دن ہوئے انبالہ چلے گئے ہیں۔ کیونکہ ضیا صاحب کو یقین تھا کہ سیٹھ جگت نارائن اب ایسی مشکل میں ہیں کہ وہ آہوجہ صاحب انہیں اور سردار دیوان سنگھ مفتون کو ہزارہا روپیہ دینے پر مجبور ہوں گے۔ پنڈت ہری چند اختر صاحب پروفیسر ضیا کے اس کردار پر حیران تھے چونکہ پنڈت ہری چند اختر کا فرمان نہایت مناسب طور پر مصالحانہ تھا اس لئے میں نے ان کو یقین دلایا کہ آہوجہ صاحب بلیک میلنگ کی اس سازش میں قطعاً شریک نہیں ہیں۔ بلکہ پروفیسر ضیا نے انہیں اس سازش میں از خود شریک کر رکھا ہے۔ اور جب آہوجہ صاحب کو اصل واقعے کا علم ہو گا تو یہ حکم امتناعی پل بھر میں منسوخ ہو جائے گا پنڈت جی نے میرے ہاں سے ہی فون پر سیٹھ جگت نارائن سے بات کی تو انہوں نے کہا کہ سرور کو ساتھ لے کر ان کی رہائش گاہ لینڈ کوسیل پر آ جائیے۔

میں اور اختر صاحب جب سیٹھ جگت نارائن صاحب کی کوٹھی پر پہنچے تو انہیں کسی قدر ابھگی اور کافی حد تک پریشان پایا۔ مگر وہ ایک کامیاب کاروباری اور انتہائی سوجھ بوجھ کے مالک تھے۔ انہوں نے سو سو روپے کی دو گٹھیاں دس دس ہزار روپئے کی میز پر سامنے رکھتے ہوئے فرمایا کہ سرور صاحب یہ روپیہ کرنال لے جائیے اور اس معاملہ کو آج چار بجے سے پہلے پہلے ختم کرا دیجئے۔ اور یہ بھی فرمایا کہ اگر پانچ دس ہزار روپئے کی اور ضرورت پڑے تو وہ بھی دوں گا۔ اتنے میں میز پر چائے آ چکی تھی۔ چائے کی پیالی ختم کرتے ہی میں نے فیصلہ کن انداز میں سیٹھ صاحب سے گزارش کی کہ یہ روپیہ تو اپنے پاس رکھئے مجھے فلم "شاعر" کی مختصر چھپی ہوئی کہانی اور گانے وغیرہ دے دیجئے اور میرے ساتھ اپنا کوئی آدمی دیدیجئے۔ ہم یہ کہانی دیوان متھرا داس آہوجہ کو سنا آتے ہیں اور یہ باور کیجئے کہ اگر اُن کی کہانی نہیں ہو گی تو وہ اس کا صاف صاف اقرار کریں گے اور اگر یہ کہانی اُن کی ہے تو اس کے معاوضہ وغیرہ کی بات بعد میں ہو جائے گی مگر ہر حالت میں حکم امتناعی کی منسوخی کا آرڈر آپ کو شام تک مل جائے گا۔ سیٹھ صاحب نے فوراً جگت ٹاکیز ڈسٹری بیوٹرز کے جنرل منیجر اور اپنے بھتیجے کو حکم دیا کہ تم دونوں کار پر ان صاحب کے ساتھ کرنال جاؤ۔ اور فلم کی کہانی وغیرہ بھی ساتھ لے جاؤ۔ پندرہ منٹ کے بعد کار کرنال روڈ پر دوڑ رہی تھی اور ہم لوگ ۱۲ بجے کرنال آہوجہ صاحب کی عدالت میں جا پہنچے۔ آہوجہ صاحب کسی مقدمہ کی سماعت

فرما رہے تھے۔ فریقین کے وکلاء بڑے بڑے وکیلانہ انداز میں اپنا اپنا معاملہ پیش کر رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی آہوجہ صاحب نے چپراسی کو حکم دیا کہ انہیں ان کے ریٹائرنگ روم میں بٹھا دیا جائے۔ نصف گھنٹے کے بعد لنچ ہوتے ہی آہوجہ صاحب ہمارے پاس تشریف لے آئے اور فرمانے لگے بھائی کیسے آنا ہوا۔ میں نے اپنے ساتھیوں کا تعارف کرایا اور اُن کا مدعا بیان کیا تو کہنے لگے دکھائیے کہانی کہاں ہے۔ مختصر کہانی کی جلد اُن کے سامنے رکھ دی گئی۔ اور انہوں نے نصف گھنٹے تک کہانی اور اُس کے گانے وغیرہ پڑھنے کے بعد یہ فرمایا کہ یہ کہانی میری نہیں ہے۔ اور کہنے لگے کہ حضرات مجھے افسوس ہے کہ ضیا صاحب کی غلط بیانی کے باعث میں نے جلدی میں آپ لوگوں کو پریشان کیا۔ لنچ کا وقت ختم ہونے پر جیسے ہی سینیئر سب جج صاحب عدالت میں تشریف لے آئیں تو میں فوری طور پر حکم امتناعی کی منسوخی کی درخواست دے دیتا ہوں۔ آہوجہ صاحب نے چپراسی کو حکم دیا کہ فوراً فلاں وکیل کو بلا کر لاؤ۔ دس منٹ کے بعد وکیل صاحب تشریف لے آئے جنہیں آہوجہ صاحب نے ہدایت فرمائی کہ سینیئر سب جج صاحب کی عدالت میں ان کی طرف سے درخواست دی جائے کہ فلم "شالو" کی نمائش کے خلاف جو حکم امتناعی جاری کیا گیا ہے اُسے فوراً منسوخ کر دیا جائے کیونکہ وہ کہانی میری نہیں ہے۔ ابھی ہم لوگ چائے وغیرہ پی ہی رہے تھے کہ وکیل صاحب درخواست ٹائپ کرا کے لے آئے اور آہوجہ صاحب نے اس پر دستخط فرما دیئے۔ قریباً تین بجے حکم امتناعی کی منسوخی کا حکم ہمارے ہاتھ میں تھا۔ اور ہم تینوں آہوجہ صاحب کا شکریہ ادا کر کے دہلی کے لئے روانہ ہوئے اور نو بجے سیٹھ صاحب کے ہاں واپس آئے تو وہ ہمارے منتظر تھے۔ حکم امتناعی کی منسوخی کا سن کر سیٹھ جگت نارائن کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ فرمانے لگے سرور صاحب آج ڈنر روشن آرا کلب میں ہوگا۔ مگر میں نے کوئی بہانہ بنا کر ڈنر میں شرکت کے لئے معافی چاہی اور سیٹھ صاحب نے ڈرائیور سے کہا کہ سرور صاحب کو گھر پہنچا آئے۔

دوسرے دن فلم "شالو" پروگرام کے مطابق ریلیز ہوئی تو سردار صاحب اور ضیا صاحب کی شکست خوردگی کا منظر دیکھنے والا تھا۔ شام کو جب حسب معمول میں سردار صاحب کے ہاں پہنچا تو رات کے قریباً آٹھ بجے ضیا صاحب نے کرنال آہوجہ صاحب کو فون کر کے صورتِ حال جاننی چاہی۔ ٹیلیفون پر نصف منٹ کے قریب بات چیت ہوئی جس کے بارے میں بعد میں آہوجہ صاحب نے مجھے بتایا کہ انہوں نے ضیا صاحب کو صرف اتنا ہی کہا کہ تم نے میری سرکاری پوزیشن کا تو دھیان رکھا ہوتا۔ کیونکہ سرور صاحب نے یہ سارا ڈرامہ اپنے خیال اور یقین کے مطابق مجھ سے انتہائی طور پر خفیہ رکھ کر کھیلا تھا۔ اس لئے میں نے بھی THE END کو پردۂ راز میں ہی رکھا۔

دوسرے ہی دن جگت ٹاکیز ڈسٹری بیوٹرز کی طرف سے شانِ ہند کے لئے ایک سال کے لئے چار صفحہ اشتہارات ہر ماہ کا ریلیز آرڈر ملا۔ سیٹھ جگت نارائن صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان اشتہارات کی اشاعت سے معذوری کا اظہار کیا گیا تو سیٹھ صاحب نے حیرت سے فرمایا سرور صاحب یہاں اخبار والے اشتہار حاصل کرنے کے لئے میرے پاؤں پر پگڑیاں اتار کر رکھتے ہیں۔ اور ایک آپ ہیں کہ اشتہار چھاپنے سے انکار کر رہے ہیں۔ اس پر انہیں آگاہ کیا گیا کہ جگت ٹاکیز ڈسٹری بیوٹرز کے اشتہارات شانِ ہند میں شائع ہوتے ہی سردار دیوان سنگھ مفتون ہوا سونگھ کر ہی اندازہ لگا لیں گے کہ سیٹھ صاحب اور سرور تونسوی کا میل ملاپ ہے۔ اور سردار صاحب اپنے دشمن کے لئے اپنے مخلص سے مخلص دوست کو قربان کر دینا ایک معمولی بات سمجھتے ہیں۔ لہٰذا ان کی مخالفت کا رُخ آپ کی طرف سے ہٹ کر میری طرف ہو جائے گا۔ سیٹھ صاحب نے اس نزاکت کا احساس کیا اور اُن کے دل میں ایڈیٹر شانِ ہند کے لئے ایک جگہ بن گئی اور یہی وجہ تھی کہ سیٹھ صاحب جب تک زندہ رہے سرور تونسوی کے ساتھ اُن کے تعلقات انتہائی دوستی کے رہے اور وہ مجھے اپنے خیر خواہوں میں سمجھتے رہے جو دوسرے کئی صحافیوں کے لئے سوہانِ روح تھا۔

سیٹھ جگت نارائن کو بلیک میل کرنے کے لئے مفتون صاحب کی یہ دوسری کوشش بھی ناکام گئی تو انہیں اندازہ ہوا کہ ان تلوں سے تیل نکلنا مشکل ہے اور انہوں نے سیٹھ جگت نارائن کے خلاف پھر کوئی سازش نہیں کی گو یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کا یہ اقدام مجبوری کے تحت تھا ورنہ طبعاً وہ ایسا نہ کرتے۔

چلتے چلتے آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دہلی پر ہندی لپی کے باعث حال میں ایک لطیفہ ظہور میں آنے کی کیفیت سے لطف اندوز ہو جیئے۔ یہ لطیفہ محض لطیفہ ہی نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے۔ ہوا یوں کہ ایک اردو ڈرامہ کے سکرپٹ کو ہندی لپی میں لکھا گیا۔ اس میں ایک مکالمہ تھا۔

مشاعرہ عرس مبارک خانقاہ وارثیہ بچھراؤں

[illegible] الاحسانی

یہ عظیم الشان مشاعرہ خانقاہ وارثیہ بچھراؤں (مراد آباد) میں ہر سال یکم چیت تا پانچ چیت تک تقریبات عرس مبارک حضرت حاجی اوگھٹ شاہ صاحب وارثی علیہ الرحمۃ بچھراؤں منعقد ہوتا ہے۔ آج ۲۵ / مارچ ۸۴ء ہے میں شعراء کے ساتھ خانقاہ وارثیہ میں پہنچ گیا ہوں جہاں کا سماں دیدنی ہے۔ خانقاہ کا وسیع میدان بقعۂ نور بنا ہوا ہے۔ نہایت قرینے سے فرش وغیرہ بچھے ہوئے ہیں۔ سامعین اور حاضرین کا یہ عالم ہے کہ چھتوں پر خواتین کو جگہ ملی ہے۔ فرش کے بعد حدِ نظر تک عقیدتمندوں کے ٹھاٹھیں مارتا سمندر نظر آرہا ہے۔ روایت کے مطابق بعد نماز عشاء محفل میلاد صلعم۔ اور پھر ٹھیک دس بج کر دس منٹ پر یہ مشاعرہ شروع ہو رہا ہے!

جناب عزیز وارثی صاحب جنرل سکریٹری امدادی انجمن خانقاہ وارثیہ نے مائک سنبھال کر مختصر سی تقریر فرماکر میکدہ وارثی کی سربراہ محترمہ مستانہ جمال شاہ وارثی صاحب سے درخواست صدارت فرمارہے ہیں۔ اس اعلان پر پیارہ محترمہ تشریف لاکر شعراء کرام کے جھرمٹ ہی میں جلوہ افروز ہوگئیں ہیں۔ آپ پیلا احرام زیب تن کئے ہوئے ہیں۔ روئے مبارک پر علی نور اور صوفت نکھار گی، کیف و سرور دے رہا ہے بشتاقان دید نہایت ادب سے آگے بڑھ رہے ہیں اور آپ حضرات احسان دانش صاحب کے اس شعر کی تفسیر بنے ہیں سبحان اللہ ؎

دنیا نے رنگ و بو سے کنارا تو کر کے دیکھ

دنیا کھڑی ہے دولت دنیا لئے ہوئے

جناب مولانا محمد اسماعیل صاحب آپ کو شیشوں کے ہار پیش کر رہے ہیں۔ قصبہ ہی کے نہیں بلکہ علاقہ کے محبوب اور ہر دلعزیز قائدِ محترم چودھری رئیس الدین خاں صاحب متولی خانقاہ وارثیہ تشریف لاکر مسند صاحبہ کے پاس ہی بیٹھ گئے ہیں۔ محفل شعر و سخن پر ایک انوار کا عالم ہے سامنے مزار مبارک حضرت اوگھٹ شاہ صاحب اس شب ماہ میں نور کی بارش کر رہا ہے، سامعین ہیں کہ ادب و احترام اور قصبہ کی روایت کو پیشِ نظر رکھتے اپنی دلی عقیدت کا ثبوت دے رہے ہیں۔ ورنہ عرسوں اور مشاعروں میں کیا کچھ نہیں ہوتا لیکن یہاں بحمد اللہ کسی قسم کی بدنظمی دیکھنے میں آئی نہ بدتمیزی۔ یہاں کے حضرات ادب نوازی نہیں بلکہ سخن فہم بھی ہیں کسی بھی شاعر کا مذاق اڑایا نہ کسی قسم کی غلط بات کہی۔ ہر زبان شاعر کو بصد خلوص دل سن کر اس کو کامیاب کرایا۔ اہل قصبہ مبارک باد کے بجا طور پر مستحق ہیں۔ لیجئے ایک بلوغت کو چھوتا نوجوان حضرت اوگھٹ شاہ صاحب کی ایک نعت شریف دلکشی سے سنا رہا ہے ؎

مال و دولت نہ جاہ و حشم چاہئے تاج شاہی نہ باغ ارم چاہئے

اے حبیبِ خدا سرورِ انبیاء آپ کی بس نگاہِ کرم چاہئے

دل میں جینے کی حسرت لئے ہوں مگر سبز گنبد رہے میرے پیشِ نظر

موت آئے تو طیبہ میں دو گز زمیں زیر دامانِ شاہِ امم چاہئے

طاہر سلمہ نوشوں کا ارمبن کرداد ہی جگہ آرہا ہے اور اب عزیز صاحب فرما رہے ہیں۔ خالد قمر صاحب حضرت اوگھٹ شاہ وارثی کی ایک عارفانہ غزل پیش کریں گے خالد صاحب یوں ابھارتے ہیں ؎

بوسۂ رخ کا جو میں سائل ہوا

ہنس کے بولے تو بھی اس قابل ہوا

شہر بھر کا افسانہ و بیدل ہوئی

عاشقی میں یہ بیش حاصل ہوا

صبر کی گنجائش نہ ہو کر میں میں

اس کے [illegible] کان بیدل ہوا

خالد صاحب محفل کو نشگی میں خوش کر جارہے ہیں اور عزیز صاحب چودھری رئیس الدین خاں صاحب بچھراؤں کو یاد فرمارہے ہیں، [illegible] صاحب فرمارہے ہیں ؎

تشنہ لبی نے میری بڑا کام کردیا ساقی نے میکدہ ہی مرے نام کردیا

دوسرے مصرعہ پر داد نے ہڑبونگ کا روپ دھار لیا ہے کئی بار دہرا کر
فرما رہے ہیں ؎

جب راس ہم کو دن کا اُجالا نہ آسکا
خود ہم نے گل چراغ سرِ شام کر دیا

آپ بھی داد وصول کئے اپنی جگہ آرہے ہیں اور عزیز صاحب دعوت غزل
دے رہے ہیں۔ برقی اعظمی کو برقی صاحب فرما رہے ہیں ؎

پھر آج اُن کے لطف و کرم یاد آگئے
جن کو بھلا دیا تھا وہ غم یاد آگئے

یہ سنجیدہ محفل وارثی اور سخن فہم حضرات کی داد بس مزا آرہا ہے
اور آپ عنایت کر رہے ہیں ؎

ہر منزلِ حیات کو دشوار دیکھ کر
کچھ خاص دوستوں کے کرم یاد آگئے
کوئی اٹھا سکے گا بھلا کیا یہ بارِ غم
اچھا ہوا کہ آپ کو ہم یاد آگئے

برقی صاحب داد سمیٹے جا رہے ہیں ادھر عزیز صاحب ارشاد الدین
ارشاد کو زحمت سخن دے رہے ہیں، ارشاد صاحب فرما رہے ہیں ؎

مر گئے ہم تو اسی روز قیامت ہے یہیں
ہم نہیں جانتے ہوتی ہے قیامت کیسی
ہم کو معلوم ہے محشر کی حقیقت کیا ہے
تیرا فتنہ بھی قیامت ہے قیامت کیسی

ارشاد صاحب مناسب داد وصول کئے چلتے بنے اور عزیز صاحب
فرما رہے ہیں۔ مشتاق بچھرایونی سے ان کا کلام سنیئے۔ مشتاق صاحب
سنبھل رہے ہیں۔ گویا ہمارے بھی ہیں اور اُن کے بھی مشترکہ
ہیں ۔۔۔ کیا سفر طے ہو رہا ہے ۔۔۔ ہوش نعمانی ۔۔۔
اور مشتاق صاحب فرما رہے ہیں ؎

چوٹ جب لگتی ہے دل پر مسکرا لیتے ہیں ہم
اُن کے غم کو اس طرح دل میں چھپا لیتے ہیں ہم
کوئی کیا جانے نیاز و ناز کی سرگوشیاں
جانے کیا دیتے ہیں ہم جانے کیا لیتے ہیں ہم

مشتاق صاحب بھی داد لوٹے پلٹ رہے ہیں اور عزیز صاحب
وجیہ ادیب بچھرایونی کو زحمت سخن دے رہے ہیں۔ وجیہ صاحب
فرما رہے ہیں ؎

ہمارا درد یگانہ ہر ایک فرد سے ہے
ہمارے درد کا رشتہ تو آو سرمے سے ہے
ہمارا نام بھی لکھا ہے رُوحِ دل پہ مگر
ہمارے حال کا سودا ابھی فردِ فرد سے ہے
کوئی تو شوق سے دیکھے گا پیلے سورج کو
کسی کی آنکھ کا رشتہ تو رنگ زرد سے ہے
ہماری آنکھ سے ٹپکے ہیں کتنے ویرانے
شام وقت معطر ہے میرے درد سے ہے

وجیہ صاحب اس پر خوب داد پاکر کامراں آرہے ہیں اور عزیز صاحب
عدیل رضوی بھوجپوری کو یاد فرما رہے ہیں۔ عدیل صاحب فرما رہے ہیں ؎

کون سے جرم کا الزام ہے مجھ پر لوگو
پھینکتے ہو جو مری سمت یہ پتھر لوگو
تم مٹا دیتے زمانے سے مرا نام و نمود
ہاتھ میں ہوتا تمہارے جو مقدر لوگو
قافلہ وقت کا منزل پہ پہونچتا کیسے
راہ میں چھوڑ کے جب چل دیا رہبر لوگو

سہیل صاحب بھی داد وصول کئے مائک سے جدا ہو رہے ہیں
اور عزیز صاحب محمد حنیف بسمل سے درخواست غزل کر رہے
ہیں۔ بسمل صاحب فرما رہے ہیں ؎

داغ دل کے سجائے بیٹھا ہوں
زخم سینے پہ کھائے بیٹھا ہوں
آؤ میرے قریب پروانو
شمع کب سے جلائے بیٹھا ہوں

بسمل صاحب چلتے بنے۔ اور عزیز صاحب اسرار کٹھوروی کو یاد
فرما رہے ہیں۔ اسرار صاحب بہک رہے ہیں ؎

یہ اِس لئے تو ہوں مطمئن مری آہیں وہ اثر بھی ہے
کہ نہ چھٹ سکی یہ تیرگی مری دسترس میں سحر بھی ہے
بڑے غور و فکر کے بعد میرا زندگی پہ ہے تبصرہ
کہ شعور ہو تو گلاب ہے نہ شعور ہو تو شرر بھی ہے

اسرار صاحب اچھی داد پاکر مائک چھوڑ رہے ہیں اور عزیز صاحب

[آب]اد آباد کے سعید نعمانی کو دعوتِ نغمگی دے رہے ہیں۔ سعید [ص]احب لہک رہے ہیں ؎

کبھی سورج کبھی مہتاب میں ڈھلتے رہتے
گھر کی تاریک فضاؤں کو بدلتے رہتے
شہر میں گرم نگاہوں کا ہے طوفان بہت
اپنے چہرے کو چھپائے ہوئے چلتے رہتے
رازِ دل راز رہے راز سہی
اپنے افسانے کا عنوان بدلتے رہتے

[سع]ید صاحب محفل کو گرما کر داد سمیٹے جا رہے ہیں اور عزیز صاحب [ا]ہلِ محفل کو اسی نغمگی میں ڈبونے کے لئے خالد قمر کو دعوتِ موسیقی دے [ر]ہے ہیں۔ قمر صاحب یوں بانکپن سے غزل سرا ہیں ؎

گھورتے پھرتے ہیں کیوں خوگرِ غم آوارہ
ہو گئے کیا ترے اندازِ ستم آوارہ
گردشیں اس کی ہیں شام اس کی ہے رات اس کی ہے
جس کو کر دیں یہ تری زلف کے خم آوارہ
آپ اوروں پہ جو فرماتے ہیں تنقید قمر
آپ خود سوچئے کیا آپ ہیں کم آوارہ

[ق]مر صاحب محفل کو لوٹ کر کامراں پلٹ رہے ہیں اور عزیز [ص]احب مخمور لنہٹوری کو دعوتِ غزل دے رہے ہیں۔ [مخ]مور صاحب فرما رہے ہیں۔

[ع]جب تھا بیچارگی تھی بیکسی تھی اور میں
روٹھی روٹھی مجھ سے میری زندگی تھی اور میں

[مخ]مور صاحب گلوخلاصی کر کے چلتے بنے اور رنگِ محفل بدلنے کے لئے ندرت نواز امروہوی کو زحمتِ سخن دے رہے ہیں۔ [ندر]ت صاحب ایک شگفتہ غزل عنایت کر رہے ہیں ؎

کب نظر کی باتوں کو ایک دوسرا سمجھا
جانے کیا کہا تم نے جانے میں نے کیا سمجھا
[...]والشہاب سے ہے کئی بار دہرا کر ارشاد ہوا ہے ؎
مجھ کو بھول جانا بھی اک عذاب تھا لیکن
مجھ کو یاد رکھنا بھی دل نے اک سزا سمجھا
داستاں سنا ڈالی ہر نئی عمارت کی
پھر بھی ہم کو لوگوں نے شہر میں نیا سمجھا

داد ہے کہ سامعین کی سخن فہمی کا صاف پتہ دے رہی ہے۔ اور آپ داد میں گم جلوہ۔ شاداں پلٹ رہے ہیں۔ ادھر رضی ادیب [...] اور کامیاب نظم سنا کر داد وصول کئے چلتے بنے۔ پھر آپ کو اسی غزل کی محفل میں لئے چلتا ہوں۔ اور مولانا تسخیر فہمی سے یہ حسین اور شگفتہ غزل سنئے ؎

کسی کا غم ہے پریشاں مری تلاش میں ہے
پیرِ ظلمات کا عنوان مری تلاش میں ہے
بس اس خطا پہ کہ شیوہ ہے میرا حق گوئی
صلیب ایک میں زنداں مری تلاش میں ہے

مولانا ——— ترنم کا شعلہ اور اس پہ مستزاد شہر نگاراں کی تثلیث نے پھر ہڑبونگ کا روپ دھار لیا ہے پھر کئی بار دہرا کر مقطع سے نکر کرنے چلے ہیں ؎

مرے بغیر وہ رنگینیاں کہاں تھیں
کسی کی بزم ہے ویراں مری تلاش میں ہے

مولانا تسخیر صاحب محفل کو لوٹ کر کامراں پلٹ رہے ہیں اور عزیز صاحب فرما رہے ہیں۔ خالد قمر تو خالد قمر تھے اب ان کے آبا کو لے کر آ رہا ہوں اور آپ ہیں قمر بھیرا بونی دیکھا تو سیدھے سادے سے بزرگ مائک پر آ کر نہایت سنجیدگی سے عطا کر رہے ہیں ؎

ابھی یہی جو محبت شعار گزرے ہیں
ترے جمال کے آئینہ دار گزرے ہیں
اداس چہرے نظر مضطرب پریشاں حال
یہ کون لوگ سرِ کوئے یار گزرے ہیں
ہم ان سے ترکِ تعلق کے بعد بھی سو سو
ادھر سے گزرے ہیں اور بار بار گزرے ہیں

اسے میرا ایچری کہتے ہیں ——— ایک آواز ——— آپ خوب سمجھے ——— قمر صاحب ——— قمر صاحب داد لوٹے اپنی جگہ آ رہے ہیں۔ اور عزیز صاحب زحمتِ سخن دے رہے ہیں نفیس صنپوری کو۔ نفیس صاحب فرما رہے ہیں ؎

اے دوست کہاں جائیں شبِ یاس کے مارے
تنہائی کی پلکوں پہ لرزتے ہیں ستارے
اب دیکھنا یہ ہے کہ سفینے کہاں ڈوبیں

گو فاں کے تھپیڑوں سے الجھتے ہیں کنارے

نفیس صاحب بھی مناسب داد دے ہی گئے۔ بارگاہ حضرت ادگھٹ
شاہ سے محرومی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیجئے ایک جواں سال
شاعر الیاس انجم چاند پوری فرما رہے ہیں ؎

آیا نہ کوئی سوکھتی بوندوں پہ صدا بھی
تھک تھک کے لرزنے لگے اب دستِ دعا بھی
مدت میں ملا تجھ سے تو احساس ہوا ہے
اک رسم تھی ماضی کی مروت بھی وفا بھی
گم کر کے کہیں دور جزیروں میں دکھوں کے
تم نے نہ دیا مجھ کو کبھی میرا پتا بھی

انجم صاحب داد وصول کئے جا رہے ہیں اور اب اپنے کرتی الاحسانی سے
بھی سنئے ؎

وقت کے سانچے میں اس طرح سے ڈھلتے رہئے
ہر نئی صبح کو اک چہرہ بدلتے رہئے
روح کو دردِ بشر سے جو فراغت نہ ملے
پھر تو جنت میں بھی رہتے ہوئے جلتے رہئے
منصب و عہدہ کے خوش رنگ کھلونوں کے لئے
آپ بچوں کی طرح خوب مچلتے رہئے
ہر کوئی اپنے ہی حالات کا مارا ہے یہاں
اپنے حالات کو خود اٹھ کے بدلتے رہئے

اب عزیز صاحب رئیس نیاز بچھرایونی کو یاد فرما رہے ہیں۔ نیاز صاحب
عنایت کر رہے ہیں ؎

گدا گری ہے یہ دورِ خود خوشی ہے میاں
مگر حقیر نہ جانو کہ آدمی ہے میاں

دوسرے مصرعہ پر داد نے ایک دھماکہ کا کام دیا ہے۔ اور آپ محفل کو لوٹنے
چلے ہیں ؎

تمہارے در سے اٹھے بھی تو ہم کہاں جائیں
یہ بات ٹھیک ہے کہ دنیا بہت بڑی ہے میاں

اس شعر پر ادب کی تمام قیود اس ہنگامہ کا ستہ دیکھ کر چپ ہیں دوسرے
مصرعہ پر شعراء سر دھن رہے ہیں کئی بار دہرا کر عطا کر رہے ہیں ؎

ہم اپنے گھر میں بھی جیسے سڑک پہ بیٹھے ہیں
ہمارے پردہ کی دیوار گر گئی ہے میاں

پھر کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی ہے اور میں سوچ رہا ہوں کہ کیا
لکھنے والے اور چپ چاپ خدمتِ ادب کرنے والے کیسے خاموش شاعر
پڑھ رہے ہیں ارشاد ہوا ہے ؎

جگہ جگہ یہاں دل دفن ہیں سنبھل کے قدم
دیارِ عرس نہیں یار کی گلی ہے میاں
نہ آگ کھا کے اگلنا پڑیں گے انگارے
یہ بات اپنی جگہ پر بنی ٹھنی ہے میاں

رئیس صاحب خوب محفل کو چونکا دیکر ماکر شاداں جا رہے ہیں اور رام
رنگ و فضا کو بدلنے کے لئے عزیز صاحب دلکش آفریدی سے
درخواست کلام کر رہے ہیں۔ دلکش صاحب یوں گرج اور برس رہے ہیں ؎

دل عشق یہ نبار ادھر بھی ہے ادھر بھی
اللہ کی پھٹکار ادھر بھی ہے ادھر بھی
کچھ اہلِ محلہ کا خیال آتا ہے ورنہ
ٹوٹی ہوئی دیوار ادھر بھی ہے ادھر بھی

قہقہوں کا ایک ریلا سا آیا ہے اور آپ فرما رہے ہیں ؎

تم آؤ نہ میرے گھر تو ذرا دیکھ کے آنا
پہرہ مری ساس کا ادھر بھی ہے ادھر بھی

دلکش صاحب محفل کو قہقہہ زار بنا کر کاموان پلٹ رہے ہیں اور اب بچھرایوں کا
کے نہیں بلکہ ملک کے ہر دلعزیز محبوب اور بانکے شاعر عزیز وارثی یوں محفل پر
چھانے چلے ہیں۔

چمن میں شور بپا ہے وہی بہار نئے — خدا کرے کہ زمانے کو سازگار نئے
نہ پوچھ مجھ سے نئے انقلاب کی تفصیل — ستم شعار گئے ہیں جفا شعار نئے

آہ اور واہ کا ایک بھونچال سا آیا ہے کئی بار دہرا کر عنایت کر رہے ہیں ؎

قدم قدم پہ یہاں بیشمار ہیں رہبر
مسافروں کو وہاں کس پہ اعتبار نئے
یہ اور بات ہے ان پر کوئی اثر نہ ہوا
پکارنے کی حدوں تک تو ہم پکار نئے

اس شعر پر صوفیائے کرام بھی داد دے رہے ہیں اور آپ داد کے ولولہ
اپنی جگہ اگر مولانا قدیر قاسمی کو لئے فرما رہے ہیں۔ دیکھا تو ایک نوجوان
دوڑ سمہ لیش مبارک سفید شیروانی زیب تن کئے یوں اطلاق بخشا کا کوشش

اُڑ گئے چراغوں کو صبح تک جلانا ہے
زندگی کے وعدوں کو موت تک نبھانا ہے
کیوں سنبھال کر رکھیں جانتے ہیں جب دل کو
ایک پل دھڑکنا ہے اور ٹوٹ جانا ہے

دوسرے مصرع پر شاعرانہ داد دی جا رہی ہے اور آپ ہزار نگیں سے

اپنی دوستی کشتی شرین کے مسافر ہیں
کون کب کہاں اُترے کس کا کیا ٹھکانا ہے
بھولی بسری یادیں کیا جاندار البم میں
سادے سادے کاغذ کی دھجیاں لگانا ہے

مولانا صاحب داد وصول کئے جا رہے ہیں اور عزیز صاحب شام سندر شام بچھرایونی کو زحمتِ سخن دے رہے ہیں شام صاحب فرما رہے ہیں سے

کرم تمہارا تو ہم بھی دیکھیں جو ظلم ڈھاؤ تو ہم بھی جانیں
کسی کو تم نے ستایا ہوگا ہمیں ستاؤ تو ہم بھی جانیں

شام صاحب رواں دواں سُنا کر اپنی جگہ آ رہے ہیں اور عزیز صاحب اختر اعظمی کو دعوتِ غزل دے رہے ہیں اختر صاحب فرما رہے ہیں سے

دل کشمکش تیرے دھڑکنے کا مقام آتا ہے
اُن کے ہاتھوں سے میرے ہاتھ میں جام آتا ہے
دل جسے چاہے وہی لے کے بہاریں آئے
سب کی قسمت میں کہاں ایسا مقام آتا ہے

اختر صاحب جیسے نہیں پھر بھی منہ دیکھے کی واہ واہ کرا کے جا رہے ہیں اور عزیز صاحب نشاط نہٹوری کو یاد فرما رہے ہیں۔ نشاط صاحب فرما رہے ہیں سے

اس فصل نے کچھ اور دیا ہو نہ دیا ہو
ہر شخص کو اک بوجھ دیا خود نگری کا

داد شروع ہو گئی ہے اور آپ فرما رہے ہیں سے

آوارہ و بیگانہ ہوں چالیس برس سے
کس کس کو خطا کار لکھوں کم نظری کا

نشاط صاحب داد وصول کئے جا رہے ہیں اور میں چچا سعدی کے اس مطلع پر ہنس رہا ہوں سے

چہل سال عمرِ عزیزت گذشت
مزاج تو از یار طفلی نگشت

دیکھا تو آفتاب حسن پوری جمے ہوئے ہیں سے

جو نلر واہے جیناں کو ہیں روا ہے میاں
ہم اہلِ عشق کا مُلک ہی دوسرا ہے میاں

دوسرے مصرع پر داد نے ہنگامہ کا رُوپ دھار لیا ہے اور آپ داد سے بے نیاز بیٹھے ہوئے ہیں سے

نمودِ زخمِ جگر دمبدم ہوا ہے میاں
میں ہنس رہا ہوں یہ میرا ہی حوصلہ ہے میاں
قدم قدم پہ کرو گے میری کمی محسوس
یہ تم نے ساتھ میرا چھوڑ تو دیا ہے میاں
جہاں میں اور بہت آسرے ہیں لوگوں کو
مجھے تو آپ کے دَر کا ہی آسرا ہے میاں

اب داد کا عالم نہ پوچھئے یا وارث یا وارث کا نعرہ بلند ہوا ہے اور مزارِ مقدس جگمگا رہا ہے اس سماں کا عالم ہی جُدا ہے میاں سبحان اللہ اور آپ عنایت کر رہے ہیں سے

ہمارے دَرد و الم کا اُڑ ا رکھا تھا مذاق
جب اپنے دِل میں لگی ہے پتا چلا ہے میاں

پھر داد ہے کہ ہنگامہ کا منظر ہے اور خوب خوب داد و تحسین پاکر کاغذ پلٹ رہے ہیں ادھر عزیز صاحب جمیل ہلوری کو دعوتِ غزل دے رہے ہیں جمیل صاحب غزل سرا ہیں سے

جو محبت میں اسیرِ غمِ جانانہ بنے
زندگی اس کی غم دہر سے بیگانہ بنے
میں اس شرط پہ تیار ہوں پینے کے لئے
میرے پینے کے لئے آنکھوں کا پیمانہ بنے

جمیل صاحب بھی داد لوٹے چلتے بنے اور عزیز صاحب صمد بچھرایونی کو زحمتِ سخن دے رہے ہیں۔ صمد صاحب فرما رہے ہیں سے

اے حسنِ نظر تیرا یہ حسن تماشا بھی
کیا کہہ گیا دیوانہ کچھ آپ نے سوچا بھی
اک طرفہ تماشا ہے اب ان کی تمنا بھی
پردہ ہے نہ جلوہ ہے پردہ بھی ہے جلوہ بھی

سمندؔ صاحب بھی دادلوٹ کے چلتے بنے۔ اور عزیزؔ صاحب درخواستِ کلام کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر ماہرؔ چاندپوری سے۔ قبلہ ماہرؔ صاحب عنایت کر رہے ہیں ؎

صحنِ چمن سے دُور ہوئے ہیں کتنے ہم مجبور ہوئے ہیں
عہدِ نو میں کچھ مت پوچھو پتھر کو وہ نُور ہوئے ہیں
سب نے محبت کی ہے لیکن کچھ قصے مشہور ہوئے ہیں

قبلہ ماہرؔ صاحب داد وصول کئے کامران پلٹ رہے ہیں دیکھا تو اب امیر سیفؔ حسن پوری ایک طویل نظم سُنا کر چلتے بنے اور ساتھ ہی فیضیؔ لدھیانوی بھی ۔۔۔ اب علیم الدین دردؔ بھچرایونی فرما رہے ہیں ؎

بے رُخ اڑا رنگِ شفق کس کی جوانی کا لہو
خون میں ڈوب گیا شام کا آنچل کیسے
یہ بھی سوچا ہے مرے دل کے خریداروں نے
تاش کے بھاؤ میں بِل جائیگا مخمل کیسے

دردؔ صاحب اپنے درد کا مظاہرہ کر کے جا رہے ہیں اور اب اس جمود کو توڑنے کے لئے عزیزؔ صاحب دعوتِ نغمگی دے رہے ہیں۔ مولانا قمرؔ شاہجہانپوری کو مولانا نہایت بانکپن سے غزل سرا ہیں ؎

نہ قطب تھا نہ ولی تھا نہ میں پیمبر تھا
گدائے کوئے ملامت فدائے دلبر تھا

مطلع کیا تھا نور اور پھر مولانا کا شعلہ سا لپکتا ہوا ترنم۔ کچھ نہ پوچھئے کیسا شامیانہ شکن دھماکہ ہوا ہے اور آپ اسی دلکشی سے لہک رہے ہیں ؎

برا بھلا تھا برا درد تھا مرا خنجر تھا
کل اس دیار میں یار عجیب منظر تھا

پھر داد نقطۂ عروج سے ہوا ہے اور آپ اسی سج دھج سے ہرا رہے ہیں ؎

وہاں مکان بھی ڈوبے تو کچھ کمی نہ ملی
یہاں خیال کے ہر لفظ میں سمندر تھا

پھر آہ اور واہ نے ہنگامہ کا روپ دھار لیا اور آپ ہیں کہ محفل کو گرما رہے ہیں؎

تعینات کے پتھر نہ مجھ کو روک سکے
میں ایک جست میں دونوں جہاں سے باہر تھا

مولانا قمرؔ صاحب محفل کو گرما کر خوب خوب داد کی جھولیاں بھرے کامران جا رہے ہیں اور عزیزؔ صاحب نورؔ بدایونی کو محفل میں لا رہے ہیں نورؔ صاحب یوں انوار برسانے چلے ہیں۔

سالہا سال کی عادت نہیں چھوڑی جاتی
ہم عبادت بھی کریں گے تو گناہوں کی طرح

دوسرے مصرع پر شاعرانہ داد دی جا رہی ہے اور آپ فرما رہے ہیں ؎

دُوسروں کو بتاتے رہے منزل کا پتہ
اور ہم لوگ بھٹکتے رہے راہوں کی طرح

نورؔ صاحب داد بیٹھے مانگ سے کھسک رہے ہیں اور عزیزؔ صاحب یاد فرما رہے ہیں شیداؔ امروہوی کو۔ شیداؔ صاحب یوں گلوخلاصی کرا رہے ہیں؎

اُن کے تو ہر اک لمحہ انداز نرالے ہیں
جو بات کرو اُن سے ہنس کر اسے ٹالے ہیں
ڈس لیتے ہیں دُوری سے معصوم نگاہوں کو
تم نے جنہیں آنچل میں یہ ناگ جو پالے ہیں

اور اب اس جمود کو توڑنے کے لئے رئیسؔ رامپوری ایک غزل خالص رامپوری اسکول کی یوں لیکر آ رہے ہیں۔ آپ بھی جب جی چاہے ملاحظہ فرمائیے ؎

اِمکانِ زیست پر بھی نظر اپنی ڈالیئے
آپ آج میری بات کو کل پر نہ ٹالیئے
یہ حوصلہ بھی دیکھئے تو اک خواب ہو گیا
غم حد سے بڑھ گئے تھے ہم مسکرا لئے
رُسوا کیا ہے خوب ہمیں تم نے دوستو
اور ہم نے سارے عیب تمہارے چھپا لئے

رئیسؔ صاحب داد میں ڈوبے اپنی جگہ آ رہے ہیں اور عزیزؔ صاحب مظہرؔ حسینی کو دعوتِ غزل دے رہے ہیں۔ مظہرؔ صاحب اس طرح حالِ دل بیان کر رہے ہیں ؎

تباہ ہو کے بھی اے دوست خوش ہوا ہوں میں
ترے فسانے کا عنوان بن گیا ہوں میں
چڑھاؤ یارو مجھے طنز کی صلیبوں پر
یہ جرم کم نہیں میرا کہ حق نما ہوں میں

مظہرؔ صاحب بھی چلتے بنے اور عزیزؔ صاحب بزرگ اور محترم شاعر اعجازؔ وارثی سے درخواستِ کلام کر رہے ہیں۔ اعجازؔ صاحب عطا کر رہے ہیں؎

یارو جنازہ اب تو اٹھاؤ حیات کا
مرتے تھے نام پر جو دغا کے وہ مر گئے

بقیہ صفحہ پر

مشاعرہ میلہ نوچندی میرٹھ

از: کریم الاحسانی

میرٹھ میلہ نوچندی میں ہر سال ایک آل انڈیا مشاعرہ بھی منعقد ہوتا ہے لیکن یہ مشاعرہ کئی سال سے کسی نہ کسی ہنگامہ یا مقامی سیاست کی نذر ہو کر رہ جاتا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ یہ مشاعرہ بڑا بدنام ہو کر رہ گیا تھا کیونکہ شہر کے وہ حضرات جو مشاعرہ کراتے آ رہے تھے کسی مصلحت یا مقامی سیاست کی وجہ سے اس مشاعرے سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ امسال یہ مشاعرہ منا بھی گیا اور جما بھی۔ اگر اردو باری شعراء کرام کو غلامی کر کے نہ بھاگتے تو یہ مشاعرہ اور کامیاب ہوتا۔ اور دوسرے دور تک بھی چلتا، ان پیشہ ور شعراء کے جانے سے بھی اس مشاعرہ پر بُرا اثر پڑا کیا ستم ہے کہ استاد کنور صاحب ہی میدان چھوڑ کر بھاگ گئے نظر آتے اور اس مشاعرہ کے پٹنے یا خراب ہونے سے انہیں کوئی واسطہ نہ تھا مطلب کیونکہ اُردو زندہ رہے یا مرے یہاں کی بلا سے۔ انہیں اس بات سے کوئی سروکار نہیں ان کو صرف پیسہ چاہئے۔ سب ہی حضرات نے ان کی اس حرکت پر برہمی کا اظہار کیا۔ یہ اُردو کے دوست ہیں مطلب اردو ان سے زندہ رہے گی۔ یہ اُردو کے محافظ ہیں جنہیں جامعہ اُردو کے امتحانات کی تاریخوں کا علم نہیں ہوتا پھر بھی یہ اُردو کے علمبردار ہیں۔

پنڈال میں داخلہ کے لئے پاس سسٹم ہے۔ اس سے پہلے ٹکٹ ہوا کرتا تھا یہ طریقہ بھی غلط ہے اور وہ بھی۔ پاس نہ ہونے کی وجہ سے ہزاروں مشاعرہ زدہ ادھر اُدھر مارے مارے پھرتے رہے اگر یہ پابندی نہ ہوتی تو شاید امسال پنڈال میں جگہ نہ ملتی۔ اگر کرسیوں کا سسٹم ختم کر دیا جاتا اور فرش ہی پر اکتفا کر لیا جاتا تو لٹھ بند پولیس سے بھی نجات مل جاتی۔

بہت ہی بڑا پنڈال بنایا گیا ہے اسی طرح اسٹیج بھی اتنا بڑا ہے کہ جس پر کئی صد حضرات تشریف فرما ہیں۔ اسٹیج کے سامنے صوفہ سیٹ پر برقع پوش خواتین اور معزز حضرات تشریف فرما ہیں۔ ان میں کئی خواتین مشاعرہ لوٹ رہی ہیں۔ یہ مشاعرہ جناب ... کے زیر اہتمام منعقد ہو رہا ہے پونے گیارہ بج چکے ہیں۔ اس مشاعرہ کا افتتاح عالیجناب فضل الرحمٰن صاحب مرکزی وزیر مملکت برائے توانائی اور جناب مسٹر ... سنگھ صاحب مرکزی وزیر مملکت اطلاعات و نشریات نے فرمائی۔ مسٹر ... ملک نے بھی اُردو کی حمایت میں پُرزور تقریر فرمائی جناب ملک زادہ منظور احمد صاحب نے مائک سنبھال کر بیدلی اور جلد بازی میں خلافِ معمول تقریر نہ فرماتے ہوئے عنبر دہلوی سے مشاعرہ کا آغاز کرا دیا ہے۔ عنبر صاحب لحن داؤدی میں یوں غزل سرا ہیں ؎

کونین کی دولت بھی ٹھکرا دیں وفا والے
بدلے میں ترے غم کے ہرگز نہ خوشی لیں گے
بازار میں آئے ہیں نقدِ دل و جان لے کر
ہم اُن کے لئے کوئی سوغات نئی لیں گے
ہم صاحبِ تقویٰ ہیں پیتے تو نہیں ساقی
اب تیری محبت کی تقدیس میں پی لیں گے

دلوں کا عالم نہ پوچھئے عنبر صاحب نے مشاعرہ کی بسم اللہ ہی خوب کی ہے آپ خوب خوب پنڈال کو گرما کر اپنی جگہ لانے جا رہے ہیں عنبر صاحب نوجوان ہیں اور نابینا بھی ہیں منظور صاحب حامد بھوپالی کو دعوتِ نغمگی دے رہے ہیں۔ حامد صاحب غزل سرا ہیں ؎

ناخدا جن کو بھروسہ خود سنبھالے ہوں گے
وہ سفینے بھی تلاطم کے حوالے ہوں گے
وہ کنارا ہو کہ طوفان کوئی فرق نہیں
غرق ہو جائیں گے جو ڈوبنے والے ہوں گے
تیرگی جن کی سیاست ہے گلشن جن کا مزاج
اُن چراغوں کو بجھا دو تو اُجالے ہوں گے

حامد صاحب نغمگی بکھیر کر داد میں ڈوبے اپنی جگہ آ بیٹھے ہیں اور منظور صاحب مینر کا تعارف کرا کر دعوت دے رہے ہیں۔ ... کلام ہماری ... ... کئے ہیں۔ باوجود کوشش کے آپ کا ایک شعر بھی ... نہ کر پایا۔ ... آپ کے ... ترنم ... اسٹیج ہی پر ... مشاعرہ ... سے ... نیلا ... ہیں۔ ... ... آپ ... ہیں اور ... صاحب ... ... کو یاد فرما رہے ہیں ... صاحب ... گرما کر ... کے ... ...

رہے ہیں ؎

بڑی ہی اندھیری ڈگر ہے میاں
جہاں مفلسوں کا گھر ہے میاں
ہے فرصت تو کچھ دیر یاں بیٹھئے
جدائی ہے کس کو مفر ہے میاں
کبھی بت شکن تھے مگر اب خود شکن
یہ الزام بھی اپنے سر ہے میاں

اب داد کا عالم اور ہی ہے اور آپ کامراں پلٹ رہے ہیں ادھر منظور صاحب ملک کے مشہور مزاح نگار شاعر اُستاد رامپوری کو دعوتِ طنز و مزاح دے رہے ہیں۔ اُستاد صاحب یوں اپنی اُستادی کے ہاتھ دکھا رہے ہیں ؎

ہمیں افلاس نے ایسی جگہ پہنچا دیا یارو
جہاں مہمان کی نیّت بھی بُری محسوس ہوتی ہے
کسی بھی رات کوئی چور آجاتا ہے دم بھر میں
غریبی کی قسم فرمندگی محسوس ہوتی ہے

یا ڈھو کے شعر میں ارشاد ہوا ہے ؎

کل اک پنڈت نے مسجد کے مولانا سے فرمایا
اسے مُجرم نہیں پیسے کمانے کا سبب بن جا
ہمارے شہر میں کل ایک دنگل ہونے والا ہے
میں کیسری ہند بنتا ہوں، تو شیرِ عرب بن جا

اُستاد صاحب آبِ حیات بہ تضیعِ اوقات کر کے محفل کو بزلہ بازی سے بحال کر جا رہے ہیں، اور منظور صاحب یوسف گنگوہی کو پکار رہے ہیں۔ یوسف صاحب فرما رہے ہیں ؎

اب گلستاں کے بھی، سنا دستور ہو گئے
کانٹوں کے دام پھولوں سے مشہور ہو گئے
اللہ رے شوخیٔ حسن یہ رنگینیٔ مزاج
فطرت سے اپنی شیخ بھی مجبور ہو گئے

یوسف صاحب ... داد وصول کر کے چلتے بنے اور اب منظور صاحب جستہ جستہ ڈاکٹر ساغر خیامی کو دعوتِ سخن دے رہے ہیں۔ ساغر صاحب ... مسکرائے، کرآئے ہیں اور ... آواز کے جادو سے ... اور ساغر صاحب یوں بانکپن سے غزل سرا ہیں ؎

کیا میری خطائیں ہیں اتنا تو بتا دیجئے
پھر آپ کی مرضی ہے جو چاہے سزا دیجئے
کیوں قتل ہیں کیجئے مر جائیں گے ہم خود ہی
بس ہم پہ محبت کا الزام لگا دیجئے

پہلی بار جو داد کا دھماکہ ہوا ہے کہ کچھ نہ پوچھئے اور آپ اسی سج دھج سے برا رہے ہیں ؎

بدنام نہ ہو جائے میخانے کا میخانہ
کم ظرف ہیں جو اُن کو محفل سے اُٹھا دیجئے

ساغر صاحب محفل کو رنگ پر لاکر تشنگی بڑھا کر تالیوں کی جھنکار میں کامراں پلٹ رہے ہیں۔ اور منظور صاحب ذائقہ بدلنے کے لئے ناظر ضیائی کو دعوتِ تفریح دے رہے ہیں۔ ناظر صاحب اچھے وہی سُننے سُنانے قطعات سُنا کر محفل کو ہنگامہ کے سپرد کر کے جا رہے ہیں تعجب ہے کہ ناظر صاحب وہی پُرانا کلام سُنا کر چلتے بنے ہیں۔ اور اب اس تفریح کی محفل سے منظور صاحب آپ کو بہیرِ غزل کی بزم میں لے جا کر راجو موہن شاد آب میرٹھی سے ایک حسین غزل سُنوا رہے ہیں۔

سماعت فرمائیے ؎

گلشن کی بہاروں سے جسے پیار نہیں ہے
وہ پھولوں کی خوشبو کا بھی حقدار نہیں ہے
دشوار ہے طوفان سے کشتی کا بچانا
ملاح کے ہاتھوں میں بھی پتوار نہیں ہے
کیوں اتنی توجہ سے مجھے دیکھ رہے ہو
چہرہ ہے میرا صبح کا اخبار نہیں ہے

شاد آب صاحب تالیوں کے شور میں جا رہے ہیں۔ ناظر صاحب فرما رہے ہیں ناظر صاحب واپس رہے ہیں میں نے ساغر صاحب سے عرض کیا کس خوبصورتی سے پی جا رہی ہے ——— اور یہ ادب سے اخلاق کے دعویدار بھی ہیں حضرت ——— دیکھا تو بھونت کو چھوتی ہوئی ایک نوعمر شاعرہ انجم رہبر مائک پر آرہی ہیں اور ساتھ ... حالات نے آپ کو بقیۃ اللہ بنا دیا ہے۔ آپ یوں موسیقی کا مظاہرہ فرما رہی ہیں ؎

بوق پر برق گرا آسماں ٹکتا کیا ہے
آشیاں ... بنا لیں گے بھتا کیا ہے

چھین لے بڑھ کے چمن والوں سے خوشیاں اپنی
تیرا حق بھی ہے بہاروں پہ جھجکتا کیا ہے

داد کا دھماکہ ہوا ہے اور آپ ای دلربائی سے محفل کو لوٹ رہی ہیں ؎

وحشتِ دل کہوں اس کو یا کہوں جوشِ جنوں
دیکھ کر آپ کو پہلو میں دھڑکتا کیا ہے

انجم صاحبہ خوب خوب محفل کو گرما کر داد لوٹتے اپنی جگہ آ رہی ہیں اور منظور صاحب منظور ہاشمی سے درخواستِ کلام کر رہے ہیں۔ منظور صاحب جو مائک پر آئے تو جانِ محفل تقریر میں شئی فرما رہے ہیں۔ مائک اونچا کردو، دو منزلہ شاعر آیا ہے۔ اس پر یار لوگ مسکرا رہے ہیں اور منظور صاحب فرما رہے ہیں ؎

ہر نئے موسم میں گھر کی کچھ کہتے رہے
رُت جو اس کے بعد آئیگی سہانی آئے گی

لیجئے لائٹ غائب ہوگئی ہے آپ بیٹھ گئے ہیں۔ تھوڑے سے توقف کے بعد روشنی آنے پر ارشاد ہوا ہے ؎

میں بے قصور تھا لیکن قصور اتنا تھا
گناہگار کی تقدیر لے کے آیا تھا
تھکن سے چور پرندہ نہ جانے کب سے تھے
لہو میں ڈوبا ہوا تیرے کے آیا تھا

منظور صاحب داد و تحسین پاکر پلٹ رہے ہیں۔ ادھر اُدھر کوئی پاپولر ہی نیم مزاحیہ اشعار سُنا کر صاف گئے۔ اور ساتھ ہی نظر ایڈوی ایک ٹرپلی غزل سنا کر جا رہے ہیں۔ تو زنانہ وری کے ساتھ ہی T.V. والے پھر آ دھمکے ہیں۔ اور نور صاحب یوں موسیقی کا مظاہرہ کر رہے ہیں ؎

کہیں بھی وفا کی نشانی نہیں ہے
یزیدوں کی بستی ہے پانی نہیں ہے

دوسرے مصرعہ پر داد نے ہنگامہ کا روپ دھار لیا ہے اور آپ کی جان لیوا ترنم سے الاپ رہے ہیں ؎

جو تجھ سے بچھڑ کر چلے جا رہے ہیں
یہ اک قرض ہے زندگانی نہیں ہے

بڑا کام جنتوں کو ڈبونا ہے مشکل
سمندر میں اب اتنا پانی نہیں ہے

نور صاحب پنڈال کو گرما کر کامران جا رہے ہیں۔ اور منظور صاحب درخواستِ کلام کر رہے ہیں۔ مُلک کے منفرد مزاح نگو حفیظ میرٹھی سے حفیظ صاحب کا نام سن کر T.V. والے سو گئے سامعین تالیوں سے حفیظ صاحب کا خیر مقدم کر رہے ہیں اسی عالم میں آپ غزل سرا ہیں

دُنیا کو بچائے گی خود دار کرے گی
اب عقل ادا کون سا کردار کرے گی

داد مطلع ہی سے پنڈال شکن ہے اور آپ داد و داد سے بے نیاز یوں محفل کو گرما رہے ہیں ؎

خود دار ہوں دُنیا کی خوشامد نہ کروں گا
دُنیا ہی خوشامد مری سو بار کرے گی
نفرت کی یہ دیوار یہاں کس نے اُٹھا دی
برباد مرے گھر کو یہ دیوار کرے گی

پھر داد کا ایک دھماکہ ہوا ہے۔ کئی بار دُہرا کر عنایت کر رہے ہیں ؎

جو کارِ نمایاں کئے دنیا میں قلم نے
وہ کام نہ ہرگز کبھی تلوار کرے گی
اربابِ حکومت کی جو موجودہ روش ہے
وہ بھی کسی انجام سے دوچار کرے گی

پھر داد بھی کچھ نہ پوچھئے اور T.V. والے ان حقائق کو کیسے فلماتے ہر دم میں ریڈیو۔ T.V. والے مصلحت سے کام لیتے ہیں لہٰذا حفیظ صاحب کو کل کی طرح آج حق گوئی کی پاداش میں نظرانداز کر دیا گیا۔ یہ سراسر زیادتی اور ظلم ہے۔ آخر T.V. والے کیوں آئے تھے اور کیوں بہ عجلت تمام چند تصاویر لے کر نو دو گیارہ ہوگئے۔ جن حضرات کی تصاویر لینا چاہتے تھے یہ ایسا نہ کر سکے۔ یہ ایسا کیوں ہوا؟ کون ہے جو اس بات کا جواب دیگا۔ ؟ ہاں تو دیکھئے حفیظ صاحب یوں حق گوئی کا [illegible] رہے ہیں ؎

ہک دمِ حفیظ آپ کی آزاد کلامی
پھر آپ کو زنداں کا سزاوار کرے گی

حفیظ صاحب تالیوں کے شور میں محفل کو لوٹ کر شادمان پلٹ رہے ہیں [illegible] منظور صاحب یوں مقطع کو پیش کر رہے ہیں ؎

زندگی میں پہلے اتنی تو پریشانی نہ تھی
تنگ داماں تو تھی لیکن چاک دامانی نہ تھی
جام خالی تھا مگر مے خانہ تو آباد تھا
چشم ساقی میں تغافل تھا پشیمانی نہ تھی
جن سفینوں نے کبھی توڑا تھا موجوں کا غرور
اس جگہ ڈوبے جہاں دریا میں طغیانی نہ تھی

منظور صاحب تقدیم و تاخیر کی تاویل پیش کرتے کرتے وقت شہر یار غزل خمار بارہ بنکوی کو دعوت سخن دے رہے ہیں خمار صاحب ایک نئی سنائی غزل سے

نوجوانوں سے زلفو خانوں سے اللہ بچائے

سُنا کر یہ چادر وہ جا۔ آج فرمائش بھی نظر انداز کی جا رہی ہے اور اب خلیل سنبھلی یوسف قربانی کا سماں باندھتے چلے ہیں فرماتے ہیں سے

اٹھائیں آپ نہ زحمت نظر اٹھانے کی
میں خود مٹاؤں گا آشیانے
چمن میں دیکھ رہی ہے مآل خندۂ گل
کلی کو پھر بھی جرأت ہے مسکرانے کی

پیچھے سامنے والے ہر ونگ پر اتر آئے ہیں میرے پاس ایک صاحب بیٹھے ہوئے مجھے سننے نہیں دے رہے ہیں بس ایک ہی رٹ ایک ہی نعرہ ہے۔ نسیم میرٹھی کو بلوایئے ہر شاعر کے جانے کے بعد منظور صاحب کو بار بار ٹوکتے یا پھر شعراء کو اس بری طرح سے داد دیتے تھے کہ لکھنا دوبھر ہو رہا تھا۔ ایک موڑ پر آکر سامنے سے ایک صاحب نے ان کو منظومات سنائیں اور وہ باقاعدہ مارنے کو لپکا لیکن اس معرکہ آرائی سے ان کو روکے ہی رکھا۔ آئیے پھر نسیم میرٹھی ہی سے سالہا سال کے سنائے قطعات و غزل سنئے سے

کبھی دل کسی سے لگاؤ تو جانیں	چراغ محبت جلاؤ تو جانیں
اکھاڑا تھا آسان محل سے مجھ کو	محبت کے صدمے اٹھاؤ تو جانیں

تمہارے لئے ابھی ہے یہ دنیا	بڑا سمجھے کہ کیسا جا رہے ہو
تمہارا ایمان بھی تسلیم لیکن	سمجھ تو رہا ہوں کہاں جا رہے ہو

نسیم صاحب نہ جانے کیا کیا سنا کر جا رہے ہیں اور منظور صاحب بھی کھسک گئے ہیں۔ اب مشیر جھنجھانوی صاحب یہ فرض ادا کر رہے ہیں اور گلشن بھارتی کو سرِ محفل لا رہے ہیں۔ آپ ایک طویل نظم سنا کر خوب خوب وصول کرکے کامران پلٹ رہے ہیں دیکھا تو ڈاکٹر بشیر بدر نے فاروق بخشی میرٹھی الاپ رہے ہیں سے

وہ خود اپنا دامن بڑھانے لگے	چلو آج آنسو ٹھکانے لگے
ہمارا برا وقت جب ٹل گیا	پھر احباب ملنے ملانے لگے
مزا دے گیا یار دورِ فراق	ہمیں تو یہ دن بھی سہانے لگے

فاروق صاحب منہ دیکھے کی داد وصول کئے جا رہے ہیں اور مشیر صاحب بزرگ و اسم سلطان نظامی کو دعوت سخن دے رہے ہیں۔ آپ کو مائک پر دیکھ کر قیصر صاحب فرما رہے ہیں فقیر کا چہرہ سوال ہے تعارف کی کیا ضرورت ہے ــــ آپ انہیں بھی کہئے ــــ مشیر صاحب فرما رہے ہیں اس بہار لوگ شکرار ہے ہیں اور قبلہ کچھ اس انداز سے سنا گئے کہ میں سننے میں ایسا محو ہوا ایک بھی مصرعہ نوٹ نہ کر سکا آئیے پھر ایک شگفتہ غزل سنئے۔ خالد قمر بھیرا یونی سے

تم میری دعاؤں کا شاید یہ صلا دوگے
اک روز مجھے اپنی نظروں سے گرا دوگے

دوسرے مصرع پر شاعرانہ داد دی جا رہی ہے اور آپ اس بانکپن سے لہرا رہے ہیں سے

یہ تاج محل جیسا شفاف بدن توبہ
اے برف جسے پانی میں تم آگ لگا دوگے
میری ہی طرح شاید ہو جائے گا دیوانہ
جس شخص کو تم اپنے آنچل کی ہوا دوگے

قمر صاحب خوب خوب داد لوٹ کے اپنی جگہ آ رہے ہیں اور مشیر صاحب زحمت سخن دے رہے ہیں افضل کرتپوری کو۔ افضل صاحب کا ایک شعر سن لیجئے گا سے

کیا تم نے یہ پیمان وفا توڑ دیا
دل سا اک شہر فنا ہو گیا آناً فاناً

افضل صاحب اس استادانہ غزل کو اس مشاعرہ میں سنانے چلے تھے۔ ایسے مشاعروں میں ہلکی پھلکی غزلیں چلتی اور سنی جاتی ہیں۔ آپ جا رہے ہیں اور مشیر صاحب دعوت سخن دے رہے ہیں ملک کے مشہور مترنم شاعر ظفر ہاشمی گرانوی کو ... کا جائزہ لے کر یوں بانکپن سے غزل سرا ہیں سے

سب کو انجام سے آگاہ کئے جاتا ہے

وقت آواز پہ آواز دیئے جاتا ہے
ناخدا اپنی بھی کوتاہی کا احساس کرے
کیوں مقدر ہی کو الزام دیئے جاتا ہے
زندگی ٹھوکریں کھاتی ہوئی پھرتی ہے مگر
آدمی ہے کہ بہرحال جیئے جاتا ہے
ڈوبنے والے کو آواز کوئی دے کہ نہ دے
ڈوبنے والا تو آواز دیئے جاتا ہے

ندیؔ صاحب داد و تحسین وصول کئے شاداں پلٹ رہے ہیں۔ [illegible] جیندر سنگھ پرواز کو یاد فرما رہے ہیں۔ پرواز صاحب فرما رہے ہیں ؎

انقلابات تو اخباروں کی سرخی تک ہیں
چھاپ کر روز انہیں دیش میں لاتے جاؤ
لوگ مرتے ہیں اگر بھوک سے مر جانے دو
تم ہواؤں میں نقطہ کا نشہ لگاتے جاؤ
قصر تعمیر کرو ریت کی بنیادوں پر
اور افسانۂ رنگیں کو حقیقت سمجھو
دل سے نفرت کا چلن ختم نہ ہونے پائے
صرف اندازِ تکلم کو محبت سمجھو
خوب کھا پی کے کرو بھوک کے موضوع پہ بحث
تن سنور کر کسی مفلس کے بدن کو دیکھو
آگ پھر آگ ہے دامن پہ لپک آئے گی
اپنی کوٹھی کے جھروکوں سے چمن کو دیکھو

پروازؔ صاحب محفل کو گرما کر جا رہے ہیں اور مشیرؔ صاحب جناب عاصمؔ دہلوی کو دعوتِ نغمگی دے رہے ہیں۔ عاصمؔ صاحب ایک گیت سنا کر داد وصول کئے جا رہے ہیں۔ آیئے پھر ایک پرانی غزل محترم فناؔ نظامی سے سنیئے یہ غزل میرٹھ ہی کے کسی مشاعرے میں کئی سال پہلے سنا چکے ہیں۔ شاید آپ کے لئے نئی ہو سنیئے ؎

اک تشنہ لب نے بڑھ کے جو ساغر اٹھا لیا
ہر بوالہوس نے میکدہ سر پر اٹھا لیا
اب اور کیا ملے گی مری وحشتوں کی داد
اس نے بھی مجھ کو دیکھ کے پتھر اٹھا لیا
موجوں کے اتحاد کا عالم نہ پوچھیے
قطرہ اٹھا اور اٹھ کے سمندر اٹھا لیا

داد کا عالم نہ پوچھئے اور قبلہ فناؔ صاحب اس شعر کا پس منظر جنتا پارٹی کا اتحاد بتلا رہے ہیں شاید یہ بھول رہے ہیں کہ [illegible] پہلے یہ غزل آپ سنا چکے ہیں سنیئے ؎

قاتل نے پہلے دیکھی حقارت سے میری لاش
پھر جانے کیوں زمیں سے مرا سر اٹھا لیا

فناؔ صاحب داد پا کر اپنی جگہ آ رہے ہیں اور اب محترم مشیرؔ صاحب عطا کر رہے ہیں ؎

مقتل بنی ہوئی ہے تری انجمن تمام
پھر بھی نہیں ہے قصۂ دار و رسن تمام
کانٹوں کو مل گئی ہے گلِ تر کی ہر ادا
پھولوں سے چھن گیا ہے مگر بانکپن تمام
لوٹا گیا ہوں راہِ محبت میں اس قدر
پہچاننے لگے ہیں مجھے راہزن تمام
کس طرح چھپ سکے گی تری انجمن کی بات
مہکا ہوا ہے آج مرا پیرہن تمام

قبلہ مشیرؔ صاحب ہر شعر پر داد و تحسین لوٹے اپنی جگہ آ کر مشہور مترنم اور استاد شاعر حقؔ بنارسی کو دعوتِ کلام دے رہے ہیں۔ قبلہ حقؔ صاحب بڑے ترنم سے یوں حقِ ترنم و شاعری ادا کر رہے ہیں ؎

دوستو چراغوں کی لویں تیز کرو   تیرہ بختوں کی گلی تک تو اجالا جائے

داد کا عالم نہ پوچھئے اور آپ عنایت کر رہے ہیں ؎

چوٹ پڑتی ہے تو پتھر سے نکل آتی ہے آگ
ہم تو ہیں صاحبِ دل ہم کو نہ چھیڑا جائے
جس کو شک ہو ہمیں آپ پرکھتے ہیں ندیم
کیا نتیجہ ہو اگر آپ کو پرکھا جائے

قبلہ خوب خوب داد وصول کئے جا رہے ہیں چونکہ آپ کی طبیعت خراب ہے اس لئے دوسری غزل عنایت نہ کر سکے۔ اور آپ کے ساتھ ہی مشاعرہ بھی توقع کے خلاف [illegible] نہایت کامیابی سے ہمکنار ہو کر دوسرے دور میں پہنچ رہا ہے۔ [illegible] اپنے خیالات [illegible] کر کے چلتے ہیں پھر [illegible] آیا اور دیر تک یہ [illegible] رہی!

اس مشاعرہ کو کامیاب بنانے میں جوان سال ایڈوکیٹ مسٹر اقبال صاحب کنوینر مشاعرہ ہذا نے جہاں جدوجہد فرمائی وہاں پروفیسر محمد احمد ہاشمی ایم۔ اے۔ علیگ۔ جناب حفیظ میرٹھی، جناب آفتاب احمد۔ جناب چودھری خورشید عالم۔ جناب عبدالعلیم عرف لالہ میاں۔ جناب عتیق الرحمٰن صاحبان۔ اور جملہ ممبران مشاعرہ کمیٹی نے اس مشاعرہ کے لئے شب و روز بڑی محنت کی اور یہ حقیقت ہے کہ کئی سال کے بعد یہ مشاعرہ کامیاب ہوا ہے تمام ارکان مشاعرہ کمیٹی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اچھا خدا حافظ

میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں۔

بقیہ صفحہ ۲۳ کا :-

راسخ کا شعر

ہوئی جارح پنجم تیغ تلخ پوشی
رہے کس طرح منہ پہ مہر خموشی

اعتراض یہ ہے کہ جارح کی جیم گرتی ہے

جواب سے ہی ہے جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ جیم حرف ساکن ہے جس کا گرنا کوئی عیب نہیں بلکہ فصیح ہے لیکن دبیر کے یہاں کا تد پر اعتراض صحیح ہے

شوقِ نجم ہے کہ کاتد نہ دکھا دو اس کو
ذبح کے پہلے قضا سے نہ ڈرا دو اس کو

قہقہے

کرگس سہسوانی

مولوی و متقی و دیندار میرے شہر میں
عشق والے سیکڑوں اور حسن والے بھی بہت
ملک میں چکر چلا پیسا کا جب سے اور بھی
پیل بائم کا زمانہ لاکھ آجائے مگر
مذہبی ہنگامے ہوں، میں بھی دیکھوں گا ضرور
جب کرپشن کا زمانہ ہے تو پھر شکوہ ہی کیا
عشق میں کچھ تو میر فرہاد بن کر رہ گئے
بھنگ، گانجہ، اور چرس، تاڑی، شراب بار نواں
چھٹے عاشق تھے سبھی لم لیٹ ہو کر رہ گئے
مغربی آندھی سے سارے ہی دوپٹے اڑ گئے
یہ پنچایتی کی خوبی ہے کہ روزی نئی نئی کی ہے
مذہب و ملت کا جھگڑا ہو نہیں سکتا کبھی
دیکھنے میں فرق ملک سے جا تی رہی

اور ہیں کچھ چور اور مکار میرے شہر میں
ہر طرح کا ہے غرض اشرار میرے شہر میں
بڑھ گیا افیون کا بیوپار میرے شہر میں
چل رہی ہے آج بھی شلوار میرے شہر میں
جب لگے گی تجھیں کے اُس پار میرے شہر میں
رشوتوں کا گرم ہے بازار میرے شہر میں
اور کچھ بی۔ بی کے ہیں بیار میرے شہر میں
سب ملے گی جو بھی ہو درکار میرے شہر میں
جب رقابت کی چلی تلوار میرے شہر میں
عام ہے اب دعوتِ دیدار میرے شہر میں
مکھی و مچھر کی ہے بھرمار میرے شہر میں
ہندو و مسلم میں ہیں دونوں یار میرے شہر میں
پھر رہے ہیں سیکڑوں بیکار میرے شہر میں

ہاں ادب شعر و سیاست بالکل کچھ بھی ہو
ہے غرض ہر طرح کا طومار میرے شہر میں

عطیۂ علّام سحرؔ عشق آبادی

مرحوم علّام عشق آبادی کی کچھ تحریریں میرے پاس محفوظ ہیں جنہیں شانِ ہند میں شائع کیا جانا ضروری ہے تاکہ ناظرینِ شانِ ہند ان فنی تحریروں سے مستفید ہو سکیں
(مرحد تونسوی)

میرے ایک بھائی تحریر فرماتے ہیں کہ ذوقؔ کے شعر میں پارس بحرکت (ر) ہی آیا ہے۔ اُن کا فرمان بجا ہے۔ یعنی پارس اگر (پارسگر ہا م) بروزن فعلاتن آیا ہے ؎

بنی اکسیر کی اُو پارس اگر ہاتھ آئے
بل بے ہمت ترے نزدیک یہ پتھر ہے وہ گھاس

یہ شوخ لفظ اگر نے کھلایا ہے۔ اسی قسم کا ایک طلسمی منظر نجم الغنی صاحب بحر الفصاحت نے دکھایا ہے۔ یعنی یہ دو شعر دیکھئے۔ منیرؔ شکوہ آبادی

اگرچہ گندمی رنگوں کو پیسا اس جزیرے نے
نہ پائی ایک دن بھی آردِ گندم کی ارزانی
اشتر کی جاتے تھے اُدھر سے
پڑا آرد در دامن دشکر سے

نجمی صاحب فرماتے ہیں کہ منیرؔ کے شعر میں آرد کی را کو مفتوح باندھا ہے حالانکہ ساکن ہے اور مفاعیلن کی میم کے مقابل واقع ہوئی ہے جو متحرک ہے دوسرا شعر گلزار نسیم کا ہے فرماتے ہیں کہ آرد کی را متحرک باندھی ہے کیوں کہ مفعولک کے لام کے مقابل ہے جو متحرک ہے

سلمان ہوں یا خلیل۔ توسی ہوں یا فردوسی۔ نجمی ہوں یا فیضی۔ بہر حال انسان مرکب بخطا و نسیاں ہے۔ نجمی صاحب بھی بھول گئے کہ دوسرا ساکن حرف (علاوہ عروض و ضرب کے) ہمیشہ حرفِ متحرک کے مقابل آتا ہے۔ یہ کلیہ ہے اور۔ کی را دوسرا حرف ساکن ہے اور دال جو تیسرا حرف ساکن ہے۔ وہ شعر میں اضافت اور عطف کی وجہ سے متحرک ہو گیا ہے (ورنہ ساقط ہو جاتا) کیوں کہ عروض میں کوئی رکن ایسا نہیں جس میں تین ساکن متوالی ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عروض عرب کی پیداوار ہے اور عرب میں کوئی لفظ ایسا نہیں جس میں تین ساکن ہوں۔

اعتراض کا لطف جب تھا کہ نجمی صاحب آرد گندم یا آرد و روغن کی شعر میں بسکون را پیش کرتے۔ (کرتے کہاں سے!؟)

منیرؔ کے شعر میں ایک دن آیا ہے۔ یہاں ایک کا کاف دوسرا ساکن ہے اور مفاعیلن کے میم کے مقابل بہ اجماعِ ہے۔ اسی طرح آرد کی را بھی ساکن ہی ملفوظ ہوگی۔

اب چند نمونے خطا و نسیاں کے پیش کرتا ہوں جو تکملۂ بشری کیلئے لازم ہیں۔ شعرِ حالیؔ

شودر کہلائے راکشش کہلائے
رنج پردیش کے مگر نہ اٹھائے

اعتراض یہ ہے کہ راکشش کا شین تقطیع میں گرتا ہے

جواب۔ اوّل تو راکشش کوئی لفظ نہیں۔ دوم اگر فرض کریں کہ کوئی لفظ ہے تو شین تیسرا ساکن ہے جو کسی گوشۂ عروض میں سما ہی نہیں سکتا۔ پھر اس کے سقوط پر اعتراض کیا معنی!

اسی طرح شودر میں بھی تین ساکن ہیں لیکن قابلِ اعتراض ہرگز نہیں ——— سوم۔ حالیؔ کا یہ مطلع کاتب کو نہ سوادی نے غلط لکھ دیا اور معترض نے یہ غور نہ کیا کہ اس صورت میں قافیہ ہی درہم برہم ہو گیا۔ اٹھائے قافیہ مترادف ہے اور لائے قافیہ متواتر ہے۔ اس طرح عروض و ضرب غلط ہو گئے۔ یعنی پہلے مصرع کا آخری رکن فعلن اور دوسرے مصرع کا آخری رکن فعلان ہے۔ اور یہ سخت عیب ہے حالیؔ جیسا اوستاد شاعر نہیں۔ اصل شعر اس طرح ہے ؎

شودر کہلائے راکشس کہلائے
رنج پردیس کے مگر نہ اٹھائے

راکشس بہت مشہور لفظ ہے۔

نجم طباطبائی فرماتے ہیں "میں نے ایک شعر بتکلف اس عیب کو سمجھانے کے لئے بنایا ہے ؎

تمہیں وہ ہے کہ مرد سے جلائے
پھر تیا ہے کس طرح قرار آئے

آگے ان دو شعروں پر شیخ الشعراء نے اعتراض کیا ہے۔ یعنی اعتراض برائے اعتراض۔ بالفاظ دیگر بربنائے سہو بشری ؎ اور جہاں مضمون

آگ ہے وہ مسند آرائے جہاں
جا رہا ہے نجم قیصرِ ہندوستاں۔

بقیہ صفحہ

اپنے اسٹیشن کو صاف رکھئے

• اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ صاف ستھرا ماحول ایک طرف کسی شخص کے کردار کا آئینہ دار ہوتا ہے اور دوسری طرف اس کردار کو نکھارتا ہے۔ صاف ستھرا گردوپیش خوشی اور مسرت بکھیرتا رہتا ہے

• ہم اپنے گھر صاف ستھرے رکھتے ہیں تو پھر ان جگہوں کو صاف شفاف کیوں نہ رکھیں جنہیں ہم استعمال کرتے ہیں

• ریلوے پلیٹ فارموں، ویٹنگ روموں، ریل ڈبوں اور درحقیقت ان تمام جگہوں کو جہاں بڑی تعداد میں لوگ اکٹھے ہوتے ہیں گردوپیش کو صاف شفاف رکھنا بہت ہی ضروری ہے

ریلوے نے صفائی مہم شروع کی ہے جس کے بہت اچھے نتائج نکلے ہیں۔ اب ریلوے صاف ستھرے نظر آتے ہیں۔ لیکن ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس سلسلے میں ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ ہم زیادہ صفائی کے لئے اپنی کوششوں کا سلسلہ جاری رکھیں گے۔

آپ بھی اس سلسلہ میں ریلوے کی مدد کر سکتے ہیں۔ آپ صرف اتنا خیال رکھیں کہ آپ کے آس پاس کی جگہ بالکل صاف شفاف حالت میں رہے۔ اس طرح اسٹیشن اور منسلکہ مقامات صاف ستھرے رہ سکتے ہیں۔ اور ہاں آپ ریلوے صفائی محکمہ کے کارکنوں کی خدمات سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ وہ صرف آپ کی خدمت کے لئے ہی رکھے گئے ہیں۔

آپ بھی ذرا خیال رکھئے کہ کوڑا کرکٹ آپ کے ہاتھ سے ادھر اُدھر نہ بکھرنے پائے بلکہ کوڑا دان میں پھینکا جائے۔ آپ کا یہ معمولی سا کام ہمیں آپ کی بہتر خدمات کرنے میں کافی مدد دیتا ہے۔

ریلوے آپ کی پراپرٹی ہے اسے صاف شفاف رکھئے

نادرن ریلوے



خدا کیا؟

صابر دہلوی
(ملاڈ بمبئی)

صورت کے ساحلی علاقہ کے ایک قصبے میں ایک کافی ہاؤس تھا جہاں بہت سے ملکی اور غیر ملکی سیاح آرام کے لئے رکتے تھے اور تروتازہ ہوکر اپنی منزلوں کے لئے روانہ ہوجاتے۔ ایک بار ایک پارسی مذہبی پیشوا کو اس کافی ہاؤس میں قیام کرنے کا اتفاق ہوا۔ اس کے ہمراہ اس کا افریکی غلام بھی تھا۔ کافی ہاؤس میں تازہ دم ہونے کے بعد اس نے افریقی غلام سے پوچھا کیا تم بتا سکتے ہو خدا کیا ہے؟

افریقی غلام نے فوراً میان سے تلوار نکال کر کہا۔ یہ ہے میرا خدا جو ہر وقت میری حفاظت کرتی ہے۔ افریقی غلام کے اس جواب نے کافی ہاؤس میں موجود سب ہی لوگوں کو چونکا دیا۔ ان میں سے ایک برہمن نے غلام سے مخاطب ہوکر کہا، صرف برہما ہی سچے بھگوان ہیں۔" ایک یہودی نے دہرایا: "اسرائیل کا خدا ہی سچا خدا ہے۔" کیتھولک فرقہ سے تعلق رکھنے والے ایک عیسائی نے زور دے کر کہا: "ایک انسان صرف پوپ کے ذریعہ ہی میں ہی خدا کو دیکھ سکتا ہے۔" اس کی تردید کرتے ہوئے پروٹسٹنٹ فرقہ سے تعلق رکھنے والے ایک عیسائی نے سب کو سمجھایا۔ "جو لوگ خدا کو بیبل کے تحت جانتے ہیں وہی قیامت کے دن بخشے جائیں گے۔"

ترکی کے ایک باشندے نے کہا: "ہمارا یقین ہے شریعت محمدی ہی راہ نجات ہے۔" مختصر یہ کہ ہر ایک نے اپنے یقین اور اعتقاد کے مطابق کہنا شروع کیا۔ لیکن چین کے مشہور عالم کنفیوشیش کا ایک چیلا کافی ہاؤس کے ایک کونے میں بیٹھا سب کی گفتگو سنتا رہا۔ جب لوگوں کی نظریں چینی باشندے پر پڑیں تو سب نے اس سے درخواست کی کہ وہ بھی اس پیچیدہ مسئلہ پر اپنے خیالات کا اظہار کرے۔ چینی باشندہ کنفیوشیش کا چیلا تھا اپنی آنکھیں بند کیں [illegible] کے لئے کچھ سوچنے لگا۔ پھر آنکھیں کھول کر اپنے [illegible] [illegible] اس نے ہلکی سی آواز میں سب کو کہا حضرات! [illegible] ایسا لگتا ہے کہ ہر انسان کا [illegible] [illegible] نہیں، کیونکہ ہر انسان کا اپنا یقین اور اعتقاد [illegible] سے مطابقت رکھتا ہو۔ اگر آپ توجہ [illegible] آپ کو ایک [illegible] سنا سکتا ہوں جو اس پیچیدہ مسئلہ پر [illegible] ڈال سکے گی۔

میں چین سے ایک برطانوی جہاز میں سوار ہوا تھا۔ یہ جہاز دنیا کا چکر کاٹ کر یہاں آیا ہے۔ ہمیں کچھ صاف اور تازہ پانی کی ضرورت تھی۔

اس نے یہ جہاز سماترا کے مشرق میں ایک ساحلی علاقہ پر کچھ دیر کے لئے رُکا تھا۔ کچھ مسافر جہاز سے اُتر کر سمندر کے کنارے ناریل کے درختوں کے سائے میں آرام کے لئے لیٹ گئے۔ سب مسافر ایک ہی ملک کے باشندے نہیں تھے۔ بلکہ مختلف ملکوں سے متعلق تھے۔ جن کی زبان۔ تہذیب اور مذہب مختلف تھے۔ جیسے ہی ہم لوگ ناریل کے درختوں کے نیچے آرام کرنے کے لئے لیٹے، ایک اندھا آدمی ہمارے نزدیک آیا۔ بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ وہ آدمی اندھا کیوں ہو گیا ہے۔ دراصل بات یہ تھی کہ وہ آدمی یہ جاننا چاہتا تھا کہ آخر سورج کی روشنی کیا ہے؟ کیا سورج کی روشنی کو پکڑا جا سکتا ہے؟ اس بات کی پوری تحقیقات کرنے کے لئے وہ گھنٹوں تک سورج کی طرف دیکھتا رہا۔ آخر نتیجہ یہ ہوا کہ سورج کی تیز روشنی نے اس کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا۔ اور وہ بینائی سے ہمیشہ کے لئے ہاتھ دھو بیٹھا۔ تب اس نے اپنے دل سے پوچھا۔ سورج کی روشنی کوئی سیال چیز تو نہیں ہے۔ کیونکہ یہ سیال ہوتی تو اسے ایک برتن سے دوسرے برتن میں انڈیلا جا سکتا تھا۔ اور نہ یہ آگ ہی ہے اگر یہ آگ ہوتی تو سمندر کے پانی سے بجھ جاتی۔ اور نہ یہ کوئی ٹھوس چیز ہے جس کو انگلی سے چھوا جا سکے۔ یا کسی چیز میں بند کیا جا سکے۔ چنانچہ نہ یہ سیال ہے۔ نہ آتش ہے اور نہ کوئی ٹھوس چیز ہے۔ گویا کچھ بھی نہیں۔ اس اندھے آدمی کے ساتھ اس کا ایک غلام بھی تھا جس نے اسے ناریل کے درختوں کے نیچے بٹھا کر ایک ناریل توڑا۔ اس نے ناریل کے اوپر کے سخت ریشوں سے ایک بتی بنائی اور ناریل کو پوری طاقت سے بھینچ کر اس کا تیل نکالنے لگا۔ اس کے بعد اس نے اس بتی کو ناریل کے تیل میں بھگویا۔ جب وہ سب کچھ کر رہا تھا تو اندھے آدمی نے اس سے پوچھا، اچھا غلام تم یہ بتاؤ کیا میرا عقیدہ ٹھیک نہیں ہے۔ کہ سورج کوئی چیز نہیں ہے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ یہاں کتنا اندھیرا ہے۔ پھر بھی لوگ کہتے ہیں کہ سورج نام کی کوئی چیز اس دنیا میں ہے۔ اگر ہے تو پھر یہ سورج کیسا ہے۔

غلام نے جواب دیا۔ میں یہ تو نہیں جانتا۔ کہ سورج کیا ہے؟ کیونکہ اس پر غور و فکر کرنا میرا کام نہیں ہے۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ روشنی کیا ہے۔ یہاں میں نے مکانات کی تاریکی کو ختم کرنے کے لئے ایک دیا جلایا ہے۔ جس کی مدد سے جھونپڑی میں رکھی ہوئی ہر چیز کو دیکھ سکتا ہوں۔ پھر غلام نے ناریل کے دیے کو ہاتھوں میں لے کر کہا۔ یہ ہے میرا سورج۔ ایک لنگڑا آدمی جو ایک چھوٹی سی چھڑی کا سہارا لے کر وہاں سے گزر رہا تھا۔ اس کے کانوں نے اس کی گفتگو سن لی۔ اور وہ کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ تم بھی ساری عمر اندھے ہی رہو گے تم اتنا بھی نہیں جانتے کہ سورج کیا ہے؟ دراصل سورج ایک آگ کا گولا ہے۔ جو روز صبح کو دور پہاڑیوں سے نکلتا ہے۔ اور روز شام کو ہمارے جزیرے سے میلوں دور پہاڑیوں میں چھپ جاتا ہے۔ ہم تو مدت سے یہی دیکھتے آئے ہیں۔ اگر تمہاری آنکھیں ہوتیں تو تم بھی دیکھتے۔ ایک مچھیرا جو ان کے پاس یونہی آ کر کھڑا تھا۔ اُن کی گفتگو سن کر بولا۔ ایسا لگتا ہے تم کبھی اپنے جزیرے سے باہر نہیں گئے اگر تم لنگڑے نہ ہوتے اور تم کو ہماری طرح دوسرے جزیروں میں جانے کا اتفاق ہوتا۔ جیسے ہم کو مچھلیاں پکڑنے کے سلسلہ میں دوسرے جزیروں میں جانے کا اتفاق پڑتا رہتا ہے۔ تو تم یہ جانتے کہ سورج روز صبح کو سمندر سے طلوع ہوتا ہے۔ اور روز شام کو سمندر میں غروب ہو جاتا ہے۔ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں۔ بالکل صحیح ہے۔ میں روز آنکھوں سے یہی دیکھتا ہوں۔

پھر ہم سے ایک ہندوستانی سیاح نے جو ہمارے عملہ کا ایک تھا۔ مچھیرے کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ تعجب ہے کہ آپ لوگ کیسی بے بنیاد باتیں کر رہے ہیں۔ بھلا ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ آگ کا گولا سمندر میں ڈوب جائے اور سمندر کا پانی اُسے نہ بجھائے۔ دراصل یہ آگ کا گولا نہیں ہے۔ یہ تو ایک دیوتا ہیں۔ ان کا نام دیوا ہے۔ یہ روز سویرے سونے کے پہاڑوں سے رتھ میں سوار ہوتے ہیں۔ اور روز شام کو سمیرو کے چاندی کے پہاڑوں میں چھپ جاتے ہیں۔ ہندوستانی باشندے کی یہ عجیب و غریب بات سن کر ہمارے جہاز کے ایک ملاح نے کہا۔ نہیں نہیں آپ بالکل غلط فرما رہے ہیں۔ سورج ایک دیوتا نہیں ہے۔ میں نے ایک جہاز کا ملاح ہونے کی حیثیت سے ان گنت سمندری سفر کئے ہیں۔ میں یہ اچھی طرح جانتا ہوں کہ سورج صرف ہندوستان ہی کو نہیں بلکہ ساری دنیا کو اپنی روشنی سے روشن رکھتا ہے۔ یہ صرف کسی ایک پہاڑی یا ایک جزیرے کا نہیں نکلتا۔ بلکہ مشرق میں جاپان کے جزیروں سے طلوع ہوتا۔ اور انگلینڈ کے آس پاس کے جزیروں میں غروب ہو جاتا ہے۔ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں سو فیصدی صحیح ہے۔ میرے دادا بھی یہی کہا کرتے تھے۔ ہمارے جہاز کا ملاح یہ سب کچھ کہہ کر چلا گیا۔ لیکن برطانوی

ایک ملاح کو جوش آگیا۔ اس نے کہا۔ کسی بھی ملک کے باشندے زمین کے بارے میں اتنا نہیں جانتے جتنا انگلینڈ کے لوگ جانتے ہیں۔ انگلینڈ کا بچہ بچہ بتا سکتا ہے۔ کہ سورج کہاں سے نکلتا ہے۔ اور کہاں چھپتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے۔ یہ نہ کہیں سے نکلتا ہے اور نہ کہیں چھپتا ہے۔ یہ تو ہمیشہ سے زمین کے چکر لگاتا رہا ہے۔ اور ہمیشہ لگاتا رہے گا۔ پھر اس برطانوی ملاح نے ایک چھوٹی سی لکڑی کی مدد سے ریت پر ایک نقشہ بنا کر اُن کو سمجھانے کی کوشش کی کہ سورج کس طرح زمین کے چاروں طرف چکر لگاتا ہے۔ لیکن وہ اس تھیوری کو ٹھیک طرح سے سمجھا نہ سکا اس لئے اس نے اپنے دوسرے ساتھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میرے یہ ساتھی آپ کو اچھی طرح سمجھا سکتے ہیں۔ یہ ملاح جو کافی ذہین معلوم ہوتا تھا خاموشی سے ان کی اختلاف آمیز گفتگو سن رہا تھا۔ جب اس سے کہا گیا کہ وہ بھی اس مسئلہ پر روشنی ڈالے۔ تو اس نے کہنا شروع کیا۔ آپ لوگ بڑے بڑے مغالطے میں مبتلا ہیں۔ سورج زمین کے چاروں طرف چکر نہیں لگاتا۔ بلکہ زمین سورج کے چاروں طرف گردش کرتی ہے سورج کے چاروں طرف پورا ایک چکر لگانے میں زمین کو چوبیس گھنٹے لگتے ہیں۔ سورج صرف ایک پہاڑی یا ایک جزیرے یا ایک ملک کو نہیں بلکہ کہنا چاہئے۔ کہ یہ نہ صرف اس دنیا کو روشنی دیتا ہے۔ بلکہ چاند ستاروں اور دوسرے سیاروں کو بھی تابانی بخشتا ہے۔ چینی باشندے نے خیالات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ جیسے لوگ سورج کے بارے میں غلط سمجھتے ہیں۔ بالکل اسی طرح لوگ خدا کو بھی ٹھیک طرح سمجھا نہیں پائے کیونکہ وہ لوگ خود ہی معاملات پر بہت تنگ نظری سے سوچتے ہیں اور مذہبی اختلافات کے پیش نظر جھگڑے فساد کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا خدا الگ ہے۔ ہر شخص چاہتا ہے کہ اس کی قوم مذہب کا خدا الگ ہو۔ ہر قوم اسے اپنی عبادت گاہ (مسجد، مندر، گرجا، شوالے) میں بند کر دینا چاہتی ہے۔ سب مذاہب کی عبادت گاہیں بہت تنگ اور چھوٹی ہیں۔ خدائے تعالیٰ اتنے بڑے ہیں کہ ان کو کسی بھی عبادت گاہ میں بند نہیں کیا جا سکتا۔ ہندو کہتے ہیں کہ مندر بھگوان کا گھر ہے۔ مسلمان کہتے ہیں کہ مسجد میں کسی کافر کے پیر نہیں آنے چاہئے۔ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ انسان (God) کا ذکر صرف گرجا میں ہی دیکھ سکتا ہے۔ سب عبادت گاہیں اس عبادت گاہ کے برابر ہو سکتی ہے۔ جو خدا نے سب لوگوں کو ایک ہی یقین اور اعتقاد کے موتیوں کے ہار میں پرونے کے لئے بنائی ہے۔ وہ عبادت گاہ یہ دنیا ہے یہ چھوٹی سی دنیا — یہ بڑی سی دنیا، یہ عبادت گاہ خدا نے اس لئے بنائی ہے کہ سب لوگ اسے اپنا مشترکہ گھر سمجھ کر اس میں امن اور سکون کے ساتھ رہیں۔ اور ایک دوسرے سے پیار و محبت کرنا سیکھیں اور اپنی زندگی کو خوشیوں سے پُر کریں۔ ہمیں کبھی دوسرے مذاہب کو اپنے مذہب سے کم تر سمجھ کر ان پر حرف زن نہیں ہونا چاہئے۔ دوسرے مذاہب کی تنقیص انسان کو انسانیت کی راہ سے گمراہ کر دیتی ہے۔ اس لئے ہم سب کا یہ مقدس فرض ہے کہ ہم سب مذاہب کا ادب و احترام کریں کیونکہ سب مذاہب انسان کو انسان سے محبت کرنا سکھاتے ہیں نفرت کرنا نہیں۔

چینی باشندے کی بات سن کر کافی ہاؤس میں موجود سب حضرات جو "خدا کیا ہے"؟ جیسے پیچیدہ مسئلہ پر اپنے اپنے اعتقاد کے تحت اظہار خیال کر رہے تھے خاموش ہو گئے۔ اور پھر ان میں اس بات پر جھگڑا نہیں ہوا کہ ان میں سے کس کا اعتقاد غلط ہے۔ اور کس کا صحیح —!

مثنوی مالوہ

اُجین کے عوام اور اُن کی عبادت گاہیں

(قسط نمبر ۱۱)

نیز اُجین کی مشاہیر ہستیاں

ناوک آلہ آبادی

یہاں مارواڑی ہیں آکر بسے　　جو دلشنو دھرم کے ہیں حامی بڑے
ہیں گجراتی بھائی بھی کافی یہاں　　ہے جن کی تجارت کا سکہ رواں
یہاں پر ہیں بوہرے مسلمان بھی　　ہے بیوپار میں جن کی شہرت بڑی
یہاں آغاخانی ہیں مسلم جُدا　　فقط جن کے ہیں آغا خاں رہنما
مؤذن الگ جن کی ہیں مسجدیں　　الگ جن کے مُلّا کی ہیں منطقیں
غنی ان میں ہیں اور تاجر بھی ہیں　　بڑے نرم دل نیک دھارمک ہیں
بڑے سیٹھ ہیں ملوں کے مالک　　تجارت میں رہتے ہیں جو منہمک
مہادیوی ورما کا ہے یہ وطن　　سخنور جو ہندی کی ہیں چمپین
ہے اُجین میں بکرم یونیورسٹی　　شری ستمن، کو ملی جس کی ہے رہبری
شری ستمن، جی ہیں بھارت کوی دہمان　　جو ہندی ادب کی انوکھی ہے شان
شری ستمن، ہی کی ہے یہ بھی جادوگری　　شری ستمن، بن گئی بکرم یونیورسٹی

سن عیسوی سے بھی اوّل صدی
یہیں سے چلا سمت بکرمی

رہی اس پہ اہلِ دھرم کی نظر　　ہے اُجین اِک مندروں کا نگر
یہاں، شری کال بھیروں، ہے مندر قدیم　　پرانوں میں ہے جس کی عظمت عظیم
قدیمی ہے اِک بھدر کالی، کا دیر　　ہے اُجین میں جو سلامت بخیر
بتاتے ہیں اُجین کے بام و در　　کہ یہ شہر ہے بتکدوں کا نگر
سرِ شام بت خانوں کی آرتی　　سراپا نظر آتی ہے بھارتی
ہے مسجد یہاں مرمریں اِک حسیں　　جو ہے قابلِ دید خُلدِ بریں
یہاں ہندو مسلم ہیں باہم رفیق　　ملنسار و مخلص نہایت شفیق
صنم خانوں کے مختلف نام ہیں　　سبھی وصف میں رشکِ گلفام ہیں
مذاہب میں ہیں مختلف سب ہیں ایک　　سماجی منافق نہیں سب ہیں نیک

یہاں میومناتوں، کی ہے انجمن
نہیں ہے تو بس عزتِ بُت شکن

مہادیوی ورما ہندی کی وہ شاعرہ ہیں جن کی ہندوستان میں کافی شہرت ہے اور جو پریاگ مہلا ودیا پیٹھ کی پرنسپل ہیں۔ وہ اُجین کی رہنے والی ہیں۔
ڈاکٹر شیو منگل سنگھ سمن ہندوستان کے ہندی کے بہت بڑے شاعر ہیں سمن کے تخلص سے مشہور ہیں۔ کاکال بھیروں یعنی وقت کا مندر ہے

آپ بیتی

شیلمان ایرانی

جی ہاں یہ ۱۹۴۸ء کا خون آشام ابتدائی دور تھا۔ جب میں حیدرآباد دکن سے ناگپور پہنچا چونکہ بچپن ہی سے طبع سلیم اچھے ماحول بزرگوں کی صحبت میں سنورتی نکھرتی رہی۔ حیدرآباد کی بہ نسبت ناگپور میرے لئے بالکل نیا شہر تھا۔ محرم کا زمانہ تھا۔ اور میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرنے لگا۔ اتفاقاً میری ایک دیرینہ شناسا سے ملاقات ہوئی اور انہیں کی رہنمائی میں مومن پورہ ناگپور کے حیدری مسجد کے پاس پہنچا جہاں میری ملاقات چند منتخب ہستیوں سے ہوئی۔

جن شہادت حسین کربلائی۔ آغا جیکن آغا مرحوم۔ حیدر علی سلطان۔ مرحوم نسیم ناگپوری۔ پاگل انصاری۔ اور پیر مغان خمخانۂ سخن حضرت مولانا سید ابوالحسن ناطق گلاوٹھی مرحوم جیسی شخصیتوں کی خدمت کا موقع ملا۔ یہ میری شاعری کی ابتدائی منزل تھی۔ نوحہ اور سلام میرا عزیز مشغلہ تھا۔ ابھی یہ راز فاش نہیں ہوا تھا کہ شب عاشورہ محمد علی چوک مومن پورہ میں بزم مسالمہ منعقد کی گئی تھی۔ جس وقت میں بزم مسالمہ میں پہنچا۔ اس وقت مائک پر ضمیر الشعراء ابوالمختار طرفہ قریشی بھنڈاروی اپنی نظم تحت اللفظ میں سنا کر بزم مسالمہ کو گہوارہ بنائے ہوئے تھے تمام محفل جھوم رہی تھی۔

اور میرے جذبات احساسات بھڑک رہے تھے۔ غلط نہ ہوگا اگر یوں کہوں کہ حضرت طرفہ قریشی کی یہ نظم میرے طبع سلیم اور جذبات کو بیدار کرنے کی محرک تھی جس نے مجھے شاعری کی طرف ہمہ تن رجوع کیا۔ اسی رو میں میں نے ایک سلام کہا اور دوسرے دن حسب دستور حیدری مسجد کے پاس پہنچا۔

جہاں ان بزرگوں کی نشست و برخاست رہا کرتی تھی۔ ان بزرگوں میں میرے محسن و مشفق کرم فرما حضرت شہادت حسین کربلائی تھے۔ جو بہت ہی پیار سے مجھے شاہ سلیمان کہا کرتے تھے اپنے قریب بٹھالیا۔ بہرا ترنم انہیں بہت پسند تھا۔ اس لئے انہوں نے بے ساختہ مجھ سے کہا کہ کچھ سناؤ۔ میں اس فرمائش پر سہم گیا۔ اور جو سلام میں نے کہا تھا آخر بری طور پر ان کے روبرو رکھ دیا۔ حضرت شہادت حسین کربلائی اس سلام کو پڑھ کر واہ شاہ سلیمان واہ کہتے رہے۔ اور میں تھا کہ سراپا بت بنا بیٹھا تھا حضرت شہادت حسین کربلائی نے یہ پرچہ حضرت مولانا ناطق گلاوٹھی کے سامنے رکھ دیا۔ حضرت مولانا ناطق نے گرجدار آواز سے کہا۔

کیا میاں! "یہ آپ ہی نے کہا ہے" میں نے ڈرتے ہوئے اقرار کیا۔ جی ہاں" مولانا فرمانے لگے۔ کیا آپ کو مصرع دیا جائے تو آپ اس طرح پر کہو گے۔ میں نے برجستہ جواب دیا۔ جی حضور کوشش کروں گا۔ حضرت مولانا فرمانے لگے کتنے دن میں کہہ لوگے۔ میں نے عرض کیا آٹھ دس روز لگ جائیں گے۔ مولانا فرمانے لگے پندرہ دن لگ جائیں تو کوئی بات نہیں۔ شرط یہ ہے کہ آپ خود کہیں؟ حضرت مولانا کو یقیناً میری شاعری اور میرے شاعر ہونے پر شبہہ ہوا تھا۔ بہرحال مولانا حضرت کربلائی کی طرف مخاطب ہوئے اور کہا کربلائی انہیں ایک مصرع دیجیے۔ کربلائی صاحب نے مجھے ایک مصرع دیا۔ اور میں نے مصرعہ لکھ لیا۔ اور جی حضور کہتا ہوا اس شب کی نشست سے رخصت ہوا۔ استادانِ فن کی محفل سے اٹھا تھا اس لئے ایک اچھا اثر لے کے چلا۔ گھر پہنچنے تک راہ میں میں نے تقریباً ۱۲ شعر کہے۔

گھر پہنچ کر آرام کیا صبح اپنی تجارتی سلسلے میں مصروف ہوگیا شام کو گھر لوٹ کر میں نے ان سولہ شعروں میں سے چھ کا انتخاب کیا۔ اور حسب دستور ویسے رات حیدری مسجد پہنچا۔ دیکھا وہی نورانی چہرے موجود ہیں۔ قریب پہنچا سلام و آداب بجا لایا۔ حضرت شہادت حسین کربلائی نے پُر خلوص انداز سے ہاتھ تھام کر اپنے قریب بٹھالیا۔ میں اپنے خیالات میں گم دل ہی دل میں سوچتا

آج میرا امتحان ہے۔ آج میرا امتحان ہے۔ اور نظریں نیچی کیے ہوئے میں قبلہ مولانا ناطق کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر مولانا نے فرمایا کیوں میاں آپ نے "ان" کی طرح پر کچھ کہہ لیا ہوگا۔ میں نے گھبراتے ہوئے جیب سے پرچی نکالی، کہ حضرت کربلائی صاحب کی طرف بڑھانا چاہا کہ قبلہ مولانا فرمانے لگے اپنا کلام آپ سنائیے۔ یہاں اختصار سے کام لیتے ہوئے میں صرف مقصد بیان کرنا چاہتا ہوں۔

بہرحال میں نے حسب فرمائش کلام پڑھا، حضرت مولانا نے مجھے دو شعروں پر بہت داد دی۔ اور کربلائی کی طرف مخاطب ہو کر فرمانے لگے۔ کربلائی صاحب اس لڑکے کی اگر صحیح رہنمائی کی جائے تو یہ اچھا مستقبل پیدا کر سکتا ہے۔ انہیں بزرگوں کی حوصلہ افزائی اور داد نے مجھے غزل کی طرف رجوع کیا۔ جو آج بھی میرا حسین مشغلہ ہے۔ وقت گزرتا گیا اور میں غزل گوئی کی رو میں بہتا رہا۔ وقت کے ساتھ اب طبع سلیم کو کسی رہنمائی کی تلاش تھی۔ دل کا تقاضا تھا کہ کسی سے ادبی بیعت کر لی جائے۔ جن بزرگوں کے سامنے میری شاعری نے آنکھ کھولی تھی اُن سے میں اس قدر متاثر تھا کہ ان کے روبرو کچھ کہنا میری جرأت ہی نہ تھی۔ اس لئے میں ایسے رہنما کی تلاش میں تھا جس سے میں کھُل کر درس حاصل کر سکوں۔ تجارت کے سلسلے میں مجھے دور دراز کا سفر کرنا پڑتا تھا۔ اس تجارتی سلسلہ میں میرا کارنجہ جانا ہوا۔ جہاں اتفاقاً مرزا اسرار بیگ مرحوم کے ذریعہ قبلہ حضرت مصوّر کارنجوی مدظلہ العالی سے میری ملاقات ہوئی۔ قبلہ حضرت مصوّر کارنجوی برار کے ان چند اساتذہ میں ایک منفرد ہستی ہیں۔ جو آج بھی اردو ادب کی خدمت ان کی زندگی کا مقصد ہے۔ یہ میری پہلی ملاقات تھی حضرت مصوّر سے؛

آپ کی صاف گوئی صوفیانہ مزاج اور شفیقانہ آرا میرے دل میں اُتر گئیں۔ میں نے یہ تہیہ کر لیا کہ آپ ہی کے روبرو زانوئے ادب تہ کر لیا جائے۔ دورانِ گفتگو میں نے ایک غزل کا مطلع پیش کیا جس کو حضرت مصوّر نے سُن کر غور کیا، ابھی آپ زبان سے شاید واقف نہیں ہیں۔ یہ جملہ حضرت مصوّر کا میرے دل و دماغ پر چھا گیا۔ اور میں نے زبان و ادب کی تلاش میں حضرت مصوّر کارنجوی کو اپنا رہنما چُن لیا۔ اور آج انہیں کی رہنمائی میں میرا کاروانِ ادب رواں دواں ہے۔ آج میرا مشغلہ صرف غزل ہے۔ چند احباب کے تقاضوں نے مجھے نوحہ و سلام کی توجہ دلائی۔ اور میں بھی اِک زمانے سے اس فکر میں تھا۔ کہ سب سے پہلے ایک مجموعہ معصومین علیہم السلام کی نذر کروں۔ اور یہ میری دیرینہ خواہش "شعاعِ نجات" کی صورت بارگاہِ حسینی میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔ "شعاعِ نجات" یہ میری پہلی تصنیف ہے۔ جس میں نوحہ سلام نظمیں قطعات شامل ہیں۔ زیرِ نظر مجموعہ کے ذریعہ سید الشہدا حضرتِ امام حسین علیہم السلام اور ان کے بہتر جانثاروں کی خدمت میں بصورتِ سلام نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کی سعادت حاصل کی گئی ہے۔

"شعاعِ نجات" میری شعری ریاضتوں اور فکر و فن کے مظاہرے کا نام نہیں ہے۔ بلکہ "شعاعِ نجات" امام مظلوم اہلِ بیت اطہار چودہ معصومین علیہم السلام سے میری والہانہ عقیدت اور بے پناہ محبت کا منظوم عکس ہے۔

یہ بات بڑی ذمہ داری اور بھرپور اعتماد کے ساتھ کہوں گا کہ میں شعر و ادب کے سلسلے میں کبھی کسی قسم کی خود فریبی میں مبتلا نہیں رہا اور نہ آئندہ اس کا امکان ہے۔

بحمد للہ میں نے جو کچھ بھی بصورت نظم و نثر کہا وہ سب میرے اپنے واردات محسوسات اور مشاہدات کا نتیجہ ہے۔ یا پھر فیض ہے اُن معصومین علیہم السلام کا جن کی مدح گوئی اور آستاں بوسی میری زندگی کا اعلیٰ نصب العین ہے۔

نمونۂ کلام ملاحظہ فرمائیے۔

راز ہستی سمجھ میں آنے تک — عشق مجبور تھا زمانے تک
عشق اک لفظ کے سوا کیا تھا — بات پہنچی مگر فسانے تک
وہ خفا ہم سے ہم خفا اُن سے — یہ زمانہ رہا زمانے تک
تم کو خوشی پسند مجھے غم پسند ہے — اب یہ بتاؤ حوصلہ کس کا بلند ہے
ہر بار چرخ اس پہ گراتا ہے بجلیاں — شاید ہماری شاخِ نشیمن بلند ہے
ساقی خدارا کھول دے اب تو میکدہ — رندوں کی جان تیری صراحی میں بند ہے
پتہ پتہ جہاں گستاخ نظر آتا ہے — ایسے گلشن سے تو بہتر ہے بیاباں کوئی
آشیاں برق جلاتی ہے جلا دے لیکن — سر چھپانے کو نہ جائیگا زنداں کوئی
لو کہاں بھی خلاف ہیں ہوا تو کیا — پھر بھی ہیں کامیاب سکندر بات ہے
ٹھکرانے والے میں چلا جاؤں گا مگر — سر کی نہیں فکر تیرے در کی بات ہے

قبر میں تڑپ کے رہ گئیں قدموں کی چاپ کو
مایوس ہو کے کتنے ہی بیچارے مر گئے

قبلہ حجاز صاحب خوب داد لئے اپنی جگہ آ رہے ہیں اور عزیز صاحب ہوش نعمانی رامپوری کو دعوت[1] سخن دے رہے ہیں ہوش صاحب یوں محفل کو گرمانے چلے ہیں ؎

پیاس بجھ جائے گی پیارے تو لئے
پی نہیں ہے تو ہونٹوں کا رس گھولئے
کیا اسی کو محبت کہا جاتا ہے
تم جدھر کو چلے ہم ادھر ہو لئے
جانے کیا سوچ کر ہم نے تھے ابھی
جانے کیا سوچ کر خود بخود رو لئے

داد نے ہڑبونگ کو جنم دیا ہے۔ قدرے سکوت کے بعد اسی بانکپن سے ابرا رہے ہیں۔

گنگنا کر ذرا آپ میری غزل
کاغذی پھول میں نکہتیں گھولئے
بس کسی دن یہ کہہ کے رُو دُ گے تم
ہوش کچھ بولئے۔ آنکھ تو کھولئے

(خدا نہ کرے) ہوش صاحب محفل کو چونکا کر داد سمیٹے شاداں پلٹ رہے ہیں اور عزیز صاحب واحد القادری رامپوری کو محفل میں لا کر غزل سُنوا رہے ہیں ارشاد ہو رہا ہے ؎

اتنا تو ربطِ دیدۂ حیراں دکھائی دے
دامن کسی کا تیرا گریباں دکھائی دے
اس بزم میں بہتر اگر زہو مری طرح
مجبور تو بھی گردشِ دوراں دکھائی دے

واحد صاحب داد وصول کئے صیغۂ واحد غائب بن گئے ہیں اور عزیز صاحب کسی ظفر صاحب کو یاد فرما رہے ہیں۔ ظفر صاحب رواں دواں سُنا رہے ہیں ؎

چھپ چھپ کے سہمے سہمے اشاروں کی اوٹ میں
کتنا مزا تھا کچے دواروں کی اوٹ میں
پتوں سے پیپلوں کے ابھرتی تھی تالیاں
ساون کی نرم نرم پھواروں کی اوٹ میں

ظفر صاحب جا رہے ہیں اور اب عبدالماجد وارثی آ کر فرما رہے ہیں ؎

تجھے داہبر جس نے ملنا نہیں ہے　　اسے اپنی منزل پہ آنا نہیں
کرم کیجئے گا یا ستم کیجئے گا　　کبھی آور سے دل لگانا نہیں

عبدالماجد صاحب بھی داد وصول کئے چلتے بنے اور عزیز صاحب درخواست کلام کر رہے ہیں محترم شفیق وارثی بدایونی سے۔ تو شفیق صاحب عطا فرما رہے ہیں ؎

رازِ ہستی میں نہاں ہے غیب کی آواز بھی
کیا تماشہ ہے کہ ہم انسان بھی ہیں راز بھی

بڑی دیر کے بعد پھر داد کا دھماکہ ہوا ہے کئی بار دہرا کر پھر ارشاد ہو رہا ہے ؎

مجھ کو کرنے لگا تکلف کا آگیا انداز بھی　　اب نیازِ عشق سے سیکھے تمہارا ناز بھی

محترم شفیق صاحب داد کی جھولیاں بھرے جا رہے ہیں اور شاد بدایونی آ کر فرما رہے ہیں ؎

لمحاتِ زیست جو بھی ملے تھے گنوا دیئے
دُنیا سے جا رہے تیری آرزو لیے

ایسا نظر آ رہا ہے کہ اب ادب نواز حضرات اس درجہ تھک گئے ہیں کہ چہروں سے تھکن اور پپوٹوں سے نیند جھلک رہی ہے پھر بھی داد دیجئے اہلِ قصبہ کو کہ خوب جم کر سُن رہے ہیں لیجئے اب نانک سنگھ ناز بدایونی فرما رہے ہیں ؎

کہا کرتے ہیں کیوں کر مقصدِ دل بھول جاتا ہوں
جنونِ عشق میں آدابِ محفل بھول جاتا ہوں

ناز صاحب گلو خلاصی کر کے چلتے بنے اور ساتھ ہی منشی عبداللطیف طالب بدایونی عطا کر رہے ہیں ؎

آج او گھٹ میاں عرس ہے آ کا رُخ سے پردہ اُٹھاؤ تو کیا بات ہے
شوقِ دیدار میں دل کی ہے التجا دے زیبا دکھاؤ تو کیا بات ہے

قبلہ جا رہے ہیں اور اب عزیز صاحب نہایت ادب و احترام سے درخواست اور التجا کر رہے ہیں صدرِ محترم شانہ جہاں وارثی صاحبہ سے چونکہ محترمہ کی طبیعت خراب ہے پھر بھی یہ سامعین اور مشتاقانِ دید کی خوش قسمتی ہے کہ بہ نفسِ نفیس مشاعرہ میں جلوہ افزائی فرما کر سب پر نظرِ عنایت اور کرم کیا کلام الملوک ملوک الکلام کا مصداق آ گئے۔ بتر کا بے گوہر بے بہا اور معارفانہ غزل لوٹئے اور سُنئے

نیاز و ناز وہ دونوں رہے زندگی کے ساتھ، حشر آیا یاں ہوا آگیں تبرک غم کا

[1] کریمی صاحب بہر سے نزدیک تو دعوت سخن کا یہ مطلب ہے کہ سامعین حرم ہی کا ہار ہے مگر ہوش صاحب تو شاعر نہیں ان کیلئے دعوت سخن استعمال ہوا ہے مرقد تو سنئے

گوشۂ عقیل

گلہائے رنگ رنگ

اکثر شعراء حضرات کا کلام اصلاح طلب ہوتا ہے۔ اور اگر کسی شعر میں رد و بدل کیا جاتا ہے تو صاحبِ کلام یہ سمجھتا ہے کہ اس کی توہین کی گئی ہے۔ ذیل میں جو غزلیات شائع کی جاری ہیں ان میں سے چند غزلیں اصلاح شدہ ہیں۔ اور کچھ ایسی ہیں جو ہر طور فنی اعتبار سے قابلِ اشاعت ہیں۔ جو شعراء کسی شعر کی اصلاح سے ناراض ہوتے ہیں اُن کے مہمل اشعار حذف کر دیئے گئے ہیں اور باقی کے اشعار بلا انتخاب شائع کئے جارہے ہیں۔ (ادارہ)

غزلیات

رتِ مروج زیدی

خود جرمِ محبت کی سزا مانگ رہا ہے
دل کتنے سلیقے سے دُعا مانگ رہا ہے

عشق ان سے وفا کرکے، وفا مانگ رہا ہے
جو مانگ رہا ہے یہ بجا مانگ رہا ہے

بے غرضِ طلب گوہرِ مقصود ملیں گے
ناواقفِ دستورِ عطا! مانگ رہا ہے

اچھا یہ گرفتارِ قفس ہے کہ قفس میں
شادابیٔ گلشن کی دعا مانگ رہا ہے

بیگانۂ تاریخِ محبت اُسے کہیے
جو شوخیٔ مضمونِ وفا مانگ رہا ہے

دامانِ طلب بھر کے دعا مانگنے والے!
قسمت کے لکھے سے بھی سوا مانگ رہا ہے

جو قافلہ اوروں کے لئے قبلہ نما تھا
وہ اپنے لئے قبلہ نما مانگ رہا ہے

دل خون کا قطرہ ہے مگر ظرف تو دیکھو
ہر موج سے طوفانِ بلا مانگ رہا ہے

زاہد! یہ خدا پر کوئی احسان کیا تھا!
ناکردہ گناہی کی جزا مانگ رہا ہے

زنجیر کی جھنکار سے پابستۂ زنجیر
کلیوں کے چٹکنے کی صدا مانگ رہا ہے

دیوانہ عجب چیز ہے گھر بار لٹا کر
معمورۂ عالم کی دعا مانگ رہا ہے

کیا اس کو مروج اپنا وفادار کہیں گے
جو دوست سے انعامِ وفا مانگ رہا ہے

رحمی حصاری

زمانے میں کوئی دلِ درد کا حامل نہیں ملتا
یہاں پتھر تو مل جاتے ہیں لیکن دل نہیں ملتا

ترے نقشِ کفِ پا کی نہیں کچھ جستجو جن کو
کبھی اُن گمرہوں کو جادۂ منزل نہیں ملتا

ہزاروں ملنے والے یوں تو رحمی آپ کے ہیں
زمانے میں نہیں ملتا تو دل سے دل نہیں ملتا

غمِ الفت کی لذت سے رہی ہے آگہی جن کو
انہیں اکثر مذاقِ زیست کا حاصل نہیں ملتا

حقیقت دیر و کعبہ کی حقیقت یہ کھلی ہم پر
کبھی ان منزلوں میں حاصلِ منزل نہیں ملتا

اُبھر سکتا نہیں جو ڈوب کر بحرِ محبت میں
تلاطم خیز موجوں میں اسے ساحل نہیں ملتا

اسے شانِ خودی کہئے کہ عکسِ اوجِ انسانی
ہر اک جا ہے اب تو کوئی سائل نہیں ملتا

نقوشِ رفعت و ارفعی تو اب بھی ملتے ہیں
مگر ہم کو نشانِ پردۂ محمل نہیں ملتا

انھیں اسرارِ الفت سے کبھی ہوگی نہ آگاہی
جنھیں بے سعیِ لاحاصل میں اک حاصل نہیں ملتا

نہ جانے عالمِ دیوانگی میں کس کو سونپ آئے
ہوئی مدت کہ اسے زخمی سراغِ دل نہیں ملتا

پارساؔ گوہری جے پوری

جس جگہ اہلِ نظر پہنچے نہ فرزانے گئے
اُن مقاموں پر گئے تو تیرے دیوانے گئے

اُن کی محفل میں مرے جتنے بھی نذرانے گئے
خونِ دل سے جو لکھے تھے وہ ہی افسانے گئے

کون سے میکش ہیں ساقی آج یہ جن کے لئے
خم گئے شیشے گئے لبریز پیمانے گئے

وہ تو دیوانے ہیں لیکن یہ تو دیوانے نہ تھے
کس لئے اہلِ خرد پھر اُن کو سمجھانے گئے

کون کہتا ہے کہ مانگا غیر سے ہم نے کبھی
کب ترے در کے سوا دامن کو پھیلانے گئے

اُلجھنوں میں خود اُلجھ کر رہ گئے وہ بدنصیب
جو تری اُلجھی ہوئی زلفوں کو سلجھانے گئے

اب نہ وہ دلداریِ ساقی نہ رندوں میں خلوص
کچھ روش ہی اور دیکھی ہم جو میخانے گئے

اس سے بڑھ کر اور کیا ملتی ہمیں دادِ وفا
ہم ترے ہی نام سے دنیا میں پہچانے گئے

پارساؔ دعویٰ بہت تھا پارسائی پر جنھیں
میکدے میں آج وہ بھی دل کو بہلانے گئے

مولانا ایس۔ نورالدین صاحب انورؔ بھوپالی

نہ لائے دیکھنے کی تاب جلوہ دیکھنے والے
تماشا بن گئے خود ہی تماشا دیکھنے والے

تو اپنے منصبِ عالی سے بھی آگاہ و واقف ہو
یہ حسرت جانبِ اوجِ ثریا دیکھنے والے

ابھی پردے تعین کے کہاں اُٹھے ہیں اے غافل
ابھی دیکھا ہی کیا ہے تو نے دنیا دیکھنے والے

سراپا طنز ہوں اور طنز بھی منشائے فطرت کا
مجھے کیا دیکھتا ہے جا گزر جا دیکھنے والے

مسرت ہی مسرت تھی مرے عہدِ جوانی میں
ابھی موجود ہیں وہ میری دنیا دیکھنے والے

کہیں تیری نظر افسانہ ہو کر ہی نہ بن جائے
ذرا ہشیار رہنا دل کی دنیا دیکھنے والے

کمالِ حسن کا نظارہ ناممکن سہی مگر انورؔ
مگر کچھ دیکھ ہی لیتے ہیں جلوہ دیکھنے والے

اُمیدؔ آدری

ذرا آنکھوں سے آنکھوں کو ملاؤں پھر چلے جانا
تمہاری شکل کو دل میں بٹھالوں پھر چلے جانا

ترس آئے نہ آئے میرے حالِ زار پر تم کو
میں اپنی داستانِ غم سنا لوں پھر چلے جانا

محبت نے ترے سینے میں کیا کیا گل کھلائے ہیں
ذرا ان دل کے داغوں کو دکھالوں پھر چلے جانا

لگا دو چوٹ وہ دل پر کہ اشک آنکھوں میں بھر آئیں
بھڑکتے غم کے شعلوں کو بجھا لوں پھر چلے جانا

دمِ آخر چلے آؤ ذرا میری عیادت کو — یہی اک حسرتِ دل ہے منالوں پھر چلے جانا
تمہاری خاکِ پا تقدیر سے اب ہاتھ آئی ہے — سمجھ کر سرمہ آنکھوں میں لگالوں پھر چلے جانا
دلِ امید کی اجڑی تمنا ہے کہ الفت ہے
میں اس اجڑے ہوئے گھر کو بسالوں پھر چلے جانا

نظیر صفی پوری

اب بھی وہ بے خبر سا لگتا ہے — مدعا بے اثر سا لگتا ہے
ہم تو اس راہزن پہ مرتے ہیں — ہم کو جو راہبر سا لگتا ہے
آج کی رات تم جو ہو ہمراہ — چاند بھی ہمسفر سا لگتا ہے
میری پرچھائیاں ہیں عالم پر — ہر جگہ مجھ کو گھر سا لگتا ہے
پھول سے کم نہیں ہے اس کا مزاج — اس کو چھونے سے ڈر سا لگتا ہے
کھل گئی بات ان نگاہوں کی — رازداں کم نظر سا لگتا ہے
زندگی تھک کے سو نہ جائے کہیں — لمحہ لمحہ سفر سا لگتا ہے
دیکھئے جو بھی ہو رہا ہے نظیر
منہ سے کچھ کہتے ڈر سا لگتا ہے

واحد پریمی

دوشیزگیٔ صبح حسین بن کے رہے ہیں — ہم اہلِ جنوں جانِ چمن بن کے رہے ہیں
جب چہرۂ گیتی پہ ملے شام کے سائے — ہم وقت کے ماتھے کی کرن بن کے رہے ہیں
وہ اور ہیں آئینہ گری کام ہے جن کا — ہم تیشہ گرِ کوہ شکن بن کے رہے ہیں
ہر عہد میں ظلمت کے نشاں ہم نے مٹائے — ہر عہد میں تنویرِ وطن بن کے رہے ہیں
تہذیب و تمدن کا اجالا ہمیں کہئے — تابندگیٔ گنگ و جمن بن کے رہے ہیں
وہ قابلِ تعظیم ہیں میرے لئے واحد
جو اہلِ سخن، ماہرِ فن، بن کے رہے ہیں

ظفر سنبھلی (بی۔ اے)

ہمیں سنا کے حسینوں کی گلرخوں کی بات — اندھیری رات سے کرتے ہو جگنوؤں کی بات
فلک پہ کالی گھٹا آب آب ہوتی ہے — کہے ہے جب بھی کوئی تیرے گیسوؤں کی بات
غمِ حیات کا دکھڑا کسے سنائیں ہم — سنے ہے کون بھلا دل جلے ہوؤں کی بات
کسی کی مست و سیاہ آنکھ کے تعلق سے — بہت عزیز ہے وحشی کو آہوؤں کی بات
کہیں وفا نہ ہو بدنام، دیدۂ نم سے — زباں زباں نہ چلے میرے آنسوؤں کی بات
حسین رقص تو محفل میں سب نے دیکھا ہے — کسی نے کی بھی ہے پائل کے گھنگروؤں کی بات
تمہیں کسی کے بھروسے پہ کیا ملے گا ظفر
ہمیشہ لب پہ رہے اپنے بازوؤں کی بات

سحر سعیدی

آرزو شعر و سخن کی پھر درخشندہ ہوئی
ذہن کے گوشے میں جو فکرِ رسا تھی زندہ ہوئی

زندگی خود کو سمجھتا ہوں میں تیرا آئینہ
تو سمجھتی ہے کہ تو میری نمائندہ ہوئی

صاف گوئی اُس کی مثلِ آب تھی تا زندگی
شخصیت وہ اس لئے دنیا میں تابندہ ہوئی

وہ نظر جس سمت اٹھی رنگینی کا سیل تھا
اُس کی زلفیں کھل گئیں تو رات شرمندہ ہوئی

پھر گلاب اُس کے لبوں کا ذہن کو مہکا گیا
پھر خوشی سوچ کے آنگن میں رقصندہ ہوئی

بعد مدت اُس کو جو دیکھا اچانک روبرو
نیم جاں تھی مجھ میں جو اک آرزو زندہ ہوئی

جب کوئی تصویر اُبھری ہے تصور میں سحرؔ
جسم کے دریا کی اک اک موج رقصندہ ہوئی

حضور سہسوانی

فضا میں بن کے دھواں ہم بکھر گئے ہوتے
اگر شراب نہ ہوتی تو مر گئے ہوتے

کسی کا پیار نہ ہوتا شریکِ زیست اگر
ہم اپنی جان سے کب کے گزر گئے ہوتے

ملا نہ دیر و حرم میں کوئی مقام جنہیں
جو مے کدہ بھی نہ ہوتا کدھر گئے ہوتے

اگر نظر سے نہیں دور دور رہنا تھا
تو ذہن و دل میں ہمارے اُتر گئے ہوتے

فضا پہ پھر نہ گھٹائیں محیط ہو پاتیں
جو مجھ سے آپ کے گیسو سنور گئے ہوتے

جو اپنے ساتھ نہ حالات عشق کا ہوتا
اندھیری رات کی آہٹ سے ڈر گئے ہوتے

یہ کیا کہ گھر سے نکلتے ہی ساتھ چھوڑ دیا
ذرا سی دور تو کچھ ہم سفر گئے ہوتے

کسی نے ساتھ ہمارا اگر دیا ہوتا
حضورؔ نام زمانے میں کر گئے ہوتے

غیاث عارف

مضطرب جب حیات ہوتی ہے
اک نئی واردات ہوتی ہے

دیکھتا ہوں میں تیری آنکھوں کو
جامِ جم کی جو بات ہوتی ہے

حسبِ وعدہ جب آپ آتے ہیں
رقص میں کائنات ہوتی ہے

تیری قامت کے بانکپن کی قسم
فنِ آزر کو مات ہوتی ہے

سوچتا ہوں یہ زندگی آخر
اتنی کیوں بے ثبات ہوتی ہے

زندگی میں اُمنگ کا باعث
نگہِ التفات ہوتی ہے

اُس کو پانا کوئی مذاق نہیں
وہ تو عارفؔ کی ذات ہوتی ہے

یونس مخمور

جلے مدت ہوئی برقِ تپاں سے
دھواں اُٹھتا ہے اب تک آشیاں سے

ہمیں معمار ہیں اس گلستاں کے
ہمیں ہیں آج تک بے آشیاں سے

حرم ہو دیر ہو یا ہو کلیسا — تجھے آواز دی ہر آستاں سے
یہی دُکھ درد میرے ساتھ ہوں گے — ملے گا کیا حیاتِ جاوداں سے
جسے دیکھو فریبی، مطلبی ہے — وفا اُٹھ سی گئی ہے اس جہاں سے
کریں مخمورؔ اب تدبیر ایسی
اُٹھیں پردے تعصب کے جہاں سے

چمپا غنیؔ پالوی

لاکھ حالات کروٹ بدلتے رہے — راہ پر اپنی ہم تن کے چلتے رہے
اشک یوں آنکھ سے مری ڈھلتے رہے — سیپ سے جیسے موتی نکلتے رہے
اُن کی زلفوں میں پڑتے رہے پیچ و خم — میری تقدیر کے بل نکلتے رہے
عاصمت [illegible] کوئی کیسے راس آئی تھی
راہِ حق پر ہمیں تن کے چلتے رہے

گلؔ خلیقی جے پوری

کہہ رہی ہے مری چشمِ نم — اب تو کیجے نگاہِ کرم
میری منزل ہے کوئے صنم — مجھ کو روکیں نہ دَیر و حرم
تیری آنکھیں خدا کی قسم — غیرتِ میکدہ، جامِ جم
کوئی حسرت ہے دل میں نہ غم — بس تری یاد ہے اور ہم
لاکھ طوفان آئیں مگر — جذبۂ عشق ہوگا نہ کم
تیری ہر صبح صبحِ طرب — میری ہر شام شامِ الم
آبھی جا اب خدا کے لئے — اب سنبھلتا نہیں بارِ غم
خم نہیں یہ تری زلف کے — میری قسمت کے ہیں پیچ و خم
تم یونہی مسکراتے رہو — مجھ کو دے دو یہاں جتنے بھی غم
عشق کی یہ ہی معراج ہے — دردِ غم، سوزِ دل، چشمِ نم
خضرِ منزل ہیں گُلؔ کے لئے
تیرے تابندہ نقشِ قدم

رازؔ لائل پوری

اگر حسینوں سے دنیا میں دوستی نہ ہوئی — وہ زیست موت ہوئی، کوئی زندگی نہ ہوئی
کسی کے پرتوِ رخ سے چمک اُٹھی دنیا — چراغ ہم نے جلائے تو روشنی نہ ہوئی
جو خوش نصیب تھے اُن کے وہ دوست بن کے رہے — ہمیں بدنصیب ہیں، اُن سے دوستی نہ ہوئی
جہاں میں ہونے کو لاکھوں حسین تھے لیکن — کسی سے حسنِ مقدس کی ہمسری نہ ہوئی
وہ ہم اپنی نظر میں تو کوئی جرم نہیں — وہاں نہ دیکھئے، جو تحریکِ میکشی نہ ہوئی
وہ بندگی کہ جسے ہیں کو غرض پنہاں — وہ تاجری تو ہوئی، رسمِ بندگی نہ ہوئی

ترے بغیر چمن میں بہار آئی، تو کیا — ہمارے دل کو تو حاصل شگفتگی نہ ہوئی
گئی عدو کی طرف آپ کی نظر سو بار — ہماری سمت مگر اک نگاہ بھی نہ ہوئی

شراب پی کے بہکنا نہیں مناسب راز
یہ میکشی کی ہے توہین مے کشی نہ ہوئی

رہبر جونپوری

گھول کر ساغر میں روز و شب کے خنجر پی گئے — ہم وہ میکش ہیں جو آتش کا سمندر پی گئے
کتنی وحشت ناک تھی ماحول کی سنجیدگی — کیا وہ سناٹے تھے جو شہروں کا منظر پی گئے
اب یونہی بھٹکا کریں گے عمر بھر یہ قافلے — منزلِ نو کے نشاں میلوں کے پتھر پی گئے
ہو سکے ہم خضر کب منت کشِ آبِ حیات — ہنستے ہنستے موت کا ساغر اٹھا کر پی گئے
اب کہاں افسانۂ طوفاں و کشتی کا وجود — پیاس میں جلتے ہوئے ساحل سمندر پی گئے
دیکھتے ہی رہ گئے نبضِ فلک انجم شناس — خوشنما تارے زمینوں کا مقدر پی گئے

ہر قدم پر زندگی کے سامنے تھے جو حادثے
رفتہ رفتہ اپنی ساری عمر رہبرؔ پی گئے

ظفر اکبرآبادی

بیگانگیٔ عیش کا امکاں کہیں نہ تھا — لیکن چمن میں جشنِ بہاراں کہیں نہ تھا
ہم نے بہت تلاش کیا کائنات میں — انسانیت ہو جس میں وہ انساں کہیں نہ تھا
بے نور سی فضا میں بھٹکتی پھری حیات — ظلمت کدے بہت تھے چراغاں کہیں نہ تھا
اپنے جنونِ عشق کے حالات کیا کہوں — دامن جو بچ گیا تو گریباں کہیں نہ تھا
ہم اُن کی بزمِ ناز میں بھی مضطرب رہے — دل کے لئے سکون کا ساماں کہیں نہ تھا
اس دورِ بے حسی پہ میں تنقید کیا کروں — میرے سوا جہاں میں غزلخواں کہیں نہ تھا

ساحل پہ آگیا ہے سفینہ تو اے ظفرؔ
معلوم ہو رہا ہے کہ طوفاں کہیں نہ تھا

شبیر احمد شبنم کرنیل گنج (گونڈہ)

تیری آنکھوں کو یوں نیم واد یکھ کر — لٹ گیا میں تجھے دل رُبا دیکھ کر
وقت بیت جہود بھی آکر ٹھہر جائے گا — اُن کو پھولوں پہ سوتا ہوا دیکھ کر
چاند بھی شرم سے چھپ گیا ابر میں — کالی زلفوں میں مکھڑا ترا دیکھ کر
بادِ صرصر میں بھی پیڑ رُکتے نہ تھے — لوگ چلتے ہیں اب تو ہوا دیکھ کر
ہو بُرا تیرا اے شورشِ مے کدہ — شیخ جی لوٹ آئے فضا دیکھ کر

دل بھی شبنمؔ کا مخمور ہونے لگا
رُخِ روشن پہ کالی گھٹا دیکھ کر

ٹیلیفون نمبر [illegible] — رجسٹرار آف نیوز پیپرز آف انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۲۲۲۹۶ — رجسٹرڈ نمبر D ۲۷۰

ایڈیٹر: سرور تونسوی

قیمت سالانہ بارہ روپے — فی پرچہ ایک روپیہ پچیس پیسے

ماہنامہ
شانِ ہند
دہلی

جلد نمبر [illegible] — جولائی سنہ ۱۹۹۰ء — شمارہ نمبر [illegible]

قطعاتِ رئیس امروہوی (کراچی)

دجّال
بڑی چیز ہے نامور بن کے جی
بڑا نام پائے گا دجّال بن جا
اگر شاعری تیرے بس میں نہیں ہے
تو فن کار و رقاص و قوّال بن جا

گھستا جا رہا ہے
مشینی عہد کی چکی میں انساں
بہت باریک پستا جا رہا ہے
مشینوں کی مرمت ہے شب و روز
مگر انسان گھستا جا رہا ہے

بڑی بات
بندے نے کہی کل ایک بڑی بات
کہنے میں ہے [illegible] ہزار الجھن سی
سب [illegible] تمام مُلک ہے
سب [illegible]

جبر سہنا
نہ پوچھو اپنی اولادوں کے ہاتھوں
ہمیں کیا جبر سہنا پڑ رہا ہے
گدھوں کا باپ بن کر آخر کار
گدھوں کو باپ کہنا پڑ رہا ہے

ہر بلا سے؟
سیاست سے سیاسی رہنما سے
قیادت سے لیڈری کی ہوا سے
حکومت سے حکومت کی ادا سے
خدا محفوظ رکھے ہر بلا سے

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

اپنے اسٹیشن کو صاف رکھئے

- اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ صاف ستھرا ماحول ایک طرف کسی شخص کے کردار کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اور دوسری طرف اس کردار کو نکھارتا ہے۔ صاف ستھرا گردو پیش خوشی اور مسرت بکھیرتا رہتا ہے۔
- ہم اپنے گھر صاف ستھرے رکھتے ہیں تو پھر ان جگہوں کو صاف شفاف کیوں نہ رکھیں جنہیں ہم سب استعمال کرتے ہیں،
- ریلوے پلیٹ فارموں، ویٹنگ روموں، سواری ڈبوں اور در حقیقت ان تمام جگہوں کو جہاں بڑی تعداد میں لوگ اکٹھے ہوتے ہیں، گردو پیش کو صاف شفاف رکھنا بہت ہی ضروری ہے۔

ریلوے نے صفائی مہم شروع کی ہے جس کے بہت اچھے نتائج نکلے ہیں۔ اب ریلوے صاف ستھرے نظر آتے ہیں۔ لیکن ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس سلسلے میں ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے ہم زیادہ صفائی کے لئے اپنی کوششوں کا سلسلہ جاری رکھیں گے۔

آپ بھی اس سلسلے میں ریلوے کی مدد کر سکتے ہیں۔ آپ صرف اتنا ہی خیال رکھیں کہ آپ کے آس پاس کی جگہ بالکل صاف شفاف حالت میں رہے۔ اس طرح اسٹیشن اور منسلکہ مقامات صاف ستھرے رہ سکتے ہیں۔ اور ہاں آپ ریلوے صفائی محکمہ کے کارکنوں کی خدمات سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ وہ صرف آپ کی خدمت کیلئے ہی رکھے گئے ہیں۔

آپ بھی ذرا خیال رکھیئے کہ کوڑا کرکٹ آپ کے ہاتھ سے ادھر ادھر نہ بکھرنے پائے بلکہ کوڑا دان میں پھینکا جائے آپ کا یہ معمولی سا کام ہیں آپ کی بہتر خدمات کرنے میں کافی مدد دیتا ہے۔

ریلوے آپ کی پراپرٹی ہے اسے صاف شفاف رکھئے

ناردرن ریلوے

افکار و واقعات

ہندوستانی مسلمانوں سے مؤدبانہ گزارشات

محترمہ اندرا گاندھی کے دورِ حکومت (ایمرجنسی) کے زمانے میں نس بندی کے پس پردہ مسلمانوں پر جو زیادتیاں ہوئیں ضلع مظفر نگر کے دیہی علاقے میں تمام مرد جن میں چودہ پندرہ سال کے بچے اور ساٹھ ستر سال کے بوڑھے شامل تھے راتوں کو کھیتوں میں سوتے تھے تاکہ ان کو پولیس سوتے ہوئے اٹھا کر گھروں سے پکڑ کر نس بندی کے لئے نہ لے جائے ترکمان گیٹ دہلی پر جو قیامت مسلمانوں پر گزری اور مسلمان جوان بچیوں کی جو بے حرمتی ہوئی، دیگر کئی جگہوں پر فائرنگ ہوئی۔ میوات کے علاقہ میں نس بندی کے لئے مسلمانوں پر جو قیامت توڑی گئی اور اس قسم کے سینکڑوں واقعات شاہ کمیشن کے روبرو پیش ہو چکے ہیں۔

مگر کس قدر حیرت کا مقام ہے کہ ہندوستانی مسلمان ان سب واقعات کو ایک سال میں ہی بھول گیا ہے اور پھر اندرا گاندھی کے دامن میں پناہ لینے کے لئے بے قرار ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ کانگریس کے تیس سالہ دورِ حکومت میں مسلمانوں کو وہ مقام حاصل نہ ہو سکا جو جنتا پارٹی کی حکومت نے مسلمانوں کو دیا جنتا پارٹی حکومت میں [illegible] [illegible] جا سکتے ہیں مگر یہ ماننا پڑے گا کہ اس حکومت نے مسلمانوں کے سامنے ہی ملک کی اکثریت کو اپنے خلاف کر لیا ہے مگر یہ ستم ظریفی ہے کہ اس پر بھی مسلمان جنتا پارٹی کی حکومت کے خلاف ہے تاریخ میں کسی بھی مغلوب قوم کی ایسی احسان فراموشی کی مثال [illegible] [illegible] [illegible] ہندوستانی مسلمان [illegible]

مسلمان [illegible] [illegible] وزیر اعظم [illegible]

[illegible]

لگی لپٹی کے یہ کہہ دیا کہ وہ اردو کو دوسری علاقائی زبان بنانے کو تیار نہیں ہیں۔ اور اس کے جواز میں جو وجوہات انہوں نے بیان فرمائی ہیں اُن کو بے معنی قرار نہیں دیا جا سکتا۔

مسلمانوں کو وزیر اعظم کی اس سچائی کی تعریف کرنا چاہیئے کیونکہ انہوں نے کانگریسی حکومت کی طرح جھوٹے وعدوں کا سلسلہ جاری رکھ کر اردو والوں کو غلط فہمی میں مبتلا نہیں رکھا۔ وزیر اعظم کے اس فرمان پر ناراض مسلمانوں میں کیا یہ جرأت ہے کہ وہ اس بارے میں بتا سکیں کہ ان کی محبوب سابق وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی نے اپنے [illegible] [illegible] حکومت میں اردو کو وہ مقام کیوں نہ دیا جسے حاصل کرانے کے لئے آج مسلمان مرارجی سے ناراض ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اردو کے قاتل خود مسلمان ہیں۔ کیا کوئی بھی مسلمان اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ دل سے اردو کو ہندوستان [illegible] کی مشترکہ زبان سمجھتا ہے؟ جب جب اردو کے نام پر کسی مسئلہ کا مطالبہ [illegible] جاتا ہے۔

[illegible]

شانِ ہند اور اس کے مدیر نے گزشتہ چالیس سال میں کی ہے اُس کی نظیر میں ہندوستان بھر میں کوئی مسلمان یا غیر مسلمان ادارہ پیش نہیں کیا جاسکتا۔ دوسروں نے اردو کی خدمت کی آڑ میں اپنی خدمت پہلے کی ہے۔ اور شانِ ہند کی صورت میں دوسری مات ہے روپیہ کما کر اردو کی خدمت کے لئے صرف کیا گیا۔ مگر کیا مجال کہ کسی مسلمان کی زبان سے یا قلم سے شانِ ہند یا اس کے مدیر کی اردو خدمات کا ذکر تک بھی کیا گیا ہو۔ کیا غضب ہے کہ اردو کا بہترین ناول نگار غیر مسلم، بہترین افسانہ نویس غیر مسلم، مشہور شاعر غیر مسلم اور انعامات کی بارش مسلمانوں پر۔

مولانا بالا تحریر سے یہ نہ سمجھئے کہ شانِ ہند یا اس کے مدیر کو ان ناانصافیوں پر کوئی شکایت ہے۔ یا خدانخواستہ کوئی خند ہے۔ بلکہ رونا تو یہ ہے کہ اس طرح حکومت وہ کانگریس کی تھی یا اب جنتا پارٹی کی اس نے ثابت کر دیا ہے کہ اردو زبان مسلمانوں کی زبان ہے۔ اور ایسا ہونا اردو کے ساتھ نا انصافی ہونے کے مترادف ہے۔ اس ناپاک سازش کو پروان چڑھانے میں جس قدر مسلمان دانشوروں نے اور جاہ پسند محض مالی مفاد، اعزازات یا ملازمتیں حاصل کرنے کے لئے حکومت کا ساتھ دیا وہ یقیناً افسوسناک ہے۔

حال ہی میں راجستھان اردو اکاڈمی کے چیئرمین کا معاملہ تھا۔ دہلی کے چند مسلمان ادیبوں اور شاعروں نے وزیر اعلیٰ راجستھان کو یہ میمورنڈم بھجوایا کہ اس سلسلے میں اچاریہ دھرمیندر ناتھ صاحب ایک موزوں شخصیت نہیں۔ جناب چیف منسٹر راجستھان نے اپنی پریس کانفرنس میں بتایا کہ اس سلسلے میں جناب شاہی امام جامع مسجد سید عبداللہ بخاری صاحب نے بھی انہیں لکھا کہ راجستھان اردو اکاڈمی کی چیئرمین شپ کے لئے اچاریہ جی موزوں شخصیت نہیں۔ وزیر اعلیٰ راجستھان نے بتایا کہ جے پور کے مسلمان شعرا اور ادیبوں کا وفد جن میں جے پور یونیورسٹی کے دو اردو پروفیسر صاحبان (فضل امام اور فیروز احمد) بھی شامل تھے۔ اُن سے کہا کہ اردو مسلمانوں کا معاملہ ہے۔ چنانچہ اردو اکاڈمی کا چیئرمین کسی غیر مسلم کو ہم برداشت نہ کریں گے۔ اور تو اور یہ تجویز کہ اردو اکاڈمی کے چیئرمین ایک مسلمان ہی ہو۔ راجستھان وزارت کے ایک مسلمان وزیر محبوب علی نے وزیر اعلیٰ کے پاس بھجوائی۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ جناب محبوب علی صاحب اردو کی الف۔ ب سے بھی ناواقف ہیں۔ وزیر اعلیٰ نے کھلے بندوں پریس کانفرنس میں فرمایا کہ میں حیران ہو گیا ہوں اگر میں ایک غیر مسلم کو اردو اکاڈمی کا چیئرمین بنا دیتا تو مسلمانوں کے ساتھ ساتھ اندرا گاندھی بھی بیٹھ کے الکشن میں یہ اعتراض فرمائیں کہ ایک جن سنگھی نے ہندو کو جگہ دی۔ لہٰذا انہوں نے شاہی امام سے معافی چاہی کہ وہ اُن کے فرمان کی تعمیل اس وجہ سے نہیں کر سکتے۔ حالانکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر اچاریہ دھرمیندر ناتھ کو راجستھان اردو اکاڈمی کا چیئرمین بنایا جاتا تو سارے ہندوستان میں راجستھان کی اردو اکاڈمی ایک مثالی اردو اکاڈمی ہوتی۔

مندرجہ بالا ایک مثال سے ہی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جہاں اردو کے نام پر کچھ بھی مفاد حاصل ہو سکتا ہے وہاں مسلمان اردو کو اپنی واحد ملکیت سمجھتے ہیں۔ آپ کو یہ سن کر حیرانی ہوگی کہ انجمن ترقی اردو ہند کے دفاتر میں چپراسی بھی غیر مسلم نہیں رکھا جاتا۔ اور حکومت جو گرانٹ اس ادارے کو دیتی ہے اُس میں یہ شرط بھی شامل ہے۔ یعنی گورنمنٹ اور مسلم دانشور دونوں مل کر اردو کو مسلمانوں کی ہی زبان قرار دینے کے لئے کوشاں ہیں۔ حکومت چند مراعات مسلمانوں کو دے کر ان کے دلوں میں یہ جذبہ پختہ کر رہی ہے کہ اردو تو مسلمانوں کی زبان ہے تاکہ اس طرح اردو کے غیر مسلم حمایتی خود بخود اس سے کنارہ کش ہو جائیں اور جو غیر مسلم ایڈیٹر شانِ ہند کی طرح سخت جان ہیں اُن کے اشتہارات وغیرہ بند کر دئے جائیں تا کہ آپ خود مجبور ہو کر چپ ہو رہیں گے۔ اور حکومت ان چالوں سے اردو کو خود مسلمانوں کے ہاتھوں سے دفن کرا رہی ہے۔ کانگریس کی حکومت میں اتر پردیش کانگریس کے چیئرمین غیر مسلم تھے مہاجتی اکاڈمی راجستھان کے چیئرمین غیر مسلم تھے۔ انجمن ترقی اردو ہند کے صدر غیر مسلم تھے۔ مگر اب جنتا حکومت میں کہیں بھی اور کسی بھی [illegible] کا چیئرمین کوئی غیر مسلم نظر نہیں آتا۔ اس [illegible] کی جنتا پارٹی کی [illegible] میں پھر

ناشکراپن کہہ کر جا سکتا ہے ۔

مہنگائی اور اقتصادی میں کمزوری وغیرہ باتیں بھی محض جنتا پارٹی کی مخالفت کے سلسلے میں کی جاتی ہیں ۔ ایمرجنسی کے زمانے کو چھوڑ کر مہنگائی نے اپنے وہ جلوے دکھائے ہیں کہ اگر عوام بھول گئے ہیں تو دوسری بات ہے ورنہ اس وقت مٹی کا تیل گھنٹوں لائن میں لگنے کے بعد دو لیٹر دستیاب ہوتا تھا ۔ بناسپتی آئیل کی جگہ لوگوں نے موبل آئیل کھایا ۔ چینی پانچ روپیہ اسی پیسے کلو تک گئی ۔ اب جنتا حکومت کے زمانے میں چینی کے دام مقابلتاً بہت کم ہیں ۔ بناسپتی آئیل بھی مناسب قیمت پر مل رہا ہے ۔ گیہوں بافراط اور ایک روپیہ اکتیس پیسے کلو دستیاب ہے ۔ مہنگائی کا رونا رونے والے مسلمان شاید یہ نہیں جانتے کہ اُن کی ارضی جنت پاکستان میں ہندوستان کے مقابلہ میں زیادہ مہنگائی ہے ۔

ہندوستانی مسلمانوں کی خدمت میں مودبانہ گزارش ہے کہ وہ اردو کے معاملہ میں حکومت کے اس موقف کو ہرگز تسلیم نہ کریں کہ اُردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے ورنہ اردو کی قبر خود مسلمان کھودنے میں حکومت کا ساتھ دیں گے ۔

جنتا پارٹی حکومت کو تعاون دینا انتہائی ضروری ہے یاد رکھیئے کہ اگر خدانخواستہ اندرا گاندھی پھر برسرِ اقتدار آگئیں تو آپ آزادی کی ہوا میں سانس لینے کے لئے کم از کم اُن کی زندگی تک تو ترس جائیں گے ۔

جناب اچاریہ دھرمیندر ناتھ صاحب نے جے پور میں اپنے ہندو اور مسلمان ساتھیوں کے ساتھ " ادب نواخت " نام سے ایک انجمن بنائی ہے جو ۲۵ دسمبر کو سارے راجستھان میں اُردو ریلی کا انتظام کر رہی ہے ۔ اندازہ ہے کہ جے پور میں ایک لاکھ اشخاص اس ریلی میں شرکت کریں گے ۔ اور اباز خاں ہندو مسلم ریلی میں شریک ہوگا ۔ راجستھان کے ۲۶ اضلاع کے صدر مقامات پر بھی ایسی ریلیاں نکلیں گی ۔ اور مطالبہ کریں گی کہ راجستھان میں اُردو میں لکھی ہوئی درخواستیں قبول کی جائیں تمام سرکاری دفاتر سے سرکاری احکام اور اطلاعات اُردو میں بھی شائع ہوں ۔ ریلوے اسٹیشنوں پر اُردو میں بھی نام لکھے جائیں ڈاکخانوں میں اُردو میں لکھے ہوئے پتوں والے خطوط کو ڈلیور کرنے کا خاطر خواہ انتظام ہو ۔ اور گاؤں گاؤں جہاں کم از کم دس طلباء اردو پڑھنا چاہیں وہاں اُردو پڑھنے کا انتظام کیا جائے ۔

ہندوستان کے غیر مسلم اُردو دوستوں کا فرض ہے کہ وہ اس قیمتی زبان کو زندہ رکھنے کے لئے اپنے تمام وسائل کو صرف کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ رکھیں اور حکومت پر ثابت کر دیں کہ اُردو صرف مسلمانوں کی ہی زبان نہیں ہے بلکہ اس کی آبیاری میں غیر مسلموں نے بھی زندگیاں صرف کر دی ہیں ۔ اور اس وقت بھی اُردو غیر مسلموں کے ہاتھوں میں جس قدر محفوظ ہے اس کا عشرِ عشیر بھی مسلمان اس کے لئے کچھ نہیں کر رہے ہیں ۔

ہمیں یقین ہے کہ مسلمان حضرات ان مودبانہ گزارشات پر ٹھنڈے دل سے سوچیں گے اور جہاں وہ اُردو کے لئے دلی لگاؤ سے کام لیں گے وہاں جنتا پارٹی حکومت کے خلاف بلا وجہ گامزن نہیں ہوں گے ۔ ہندوستانی مسلمانوں کا بھی اتنا ہی ہے جتنا کسی دوسری قوم کا ہے اسی لئے ہر ہندوستانی کو ملک کی سالمیت ، قومی یکجہتی ، ہر قسم کی مذہبی آزادی اور انسانی حقوق کے لئے ملک کی حکومتوں سے ایماندار ہونا ضروری ہے ۔ آخر میں ہم ہر بھائی سے یہ گزارش کریں گے کہ وہ ادب نواخت کے زیر اہتمام ۲۵ دسمبر کو ہونے والی ریلیوں میں بلا تفریق مذہب و ملت شریک ہو کر حکومت کو اس کا احساس دلا دیں کہ اُردو ہم سب کی مشترکہ زبان ہے ۔ راجستھان کے ہر ضلع کے اُردو دوستوں کا ایک اجتماع بہت جلد جے پور میں ادب نواخت انجمن کی طرف سے بلایا جا رہا ہے تاکہ اُردو ریلیوں کا پروگرام مرتب کیا جا سکے ۔

[illegible]

ہوئی تھی مگر بہر رانی اپنے ہاں اولادِ نرینہ چاہتی تھی، اس لئے وہ اپنے کسی رشتہ دار کا لڑکا گود لے لیتی تھیں۔ کیونکہ کسی رانی میں یہ ہمت نہیں تھی کہ کسی ملازم یا کاریدار سے ناجائز جنسی رشتہ قائم کر کے صاحبِ اولاد بن سکے۔ کیونکہ ایسے جرم کی سزا موت تھی۔ رانیاں جانتی تھیں کہ جو مہاراجہ اپنی ماں کے چال چلن پر شک ہونے پر اُسے قتل کرا سکتا ہے۔ وہ اپنی کسی رانی کو کیسے معاف کر سکتا ہے۔

لہٰذا جب بھی کوئی رانی کسی رشتہ دار کے لڑکے کو گود لیتی تو چوبدار بہ آوازِ بلند مہاراجہ کی خدمت میں یہ عرض کرتا کہ مہاراج فلاں محل میں راجکمار نے جنم لیا ہے تو مہاراجہ فرماتے اوے ہلا اے غیبی گولہ کتھوں آیا اے — (بہت خوب یہ غیبی گولہ کہاں سے آیا ہے) ("اوے ہلا") کے ترجمہ کے لئے مناسب الفاظ نہیں مل سکے)

دہلی میں ایک صاحب سیاسی مخالفت کے علاوہ ذاتی عناد کے باعث اپنے مفروضہ یا واقعی مخالفین کے خلاف پوسٹر شائع کرنے میں خاصی شہرت رکھتے ہیں۔ جس طرح غنڈا کسی غنڈے کے ہاتھوں ہی قتل ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ پوسٹر باز حضرت بھی مقابلتاً پوسٹر بازی کے باعث ہی دلی بھر میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے ہیں۔ حال ہی میں ایک پوسٹر شائع ہوا ہے جس میں اس پوسٹر باز سے دریافت کیا گیا ہے کہ اپنے والدِ محترم کے اسمِ گرامی سے تو عوام کو آگاہ فرمائیں۔

یہ پوسٹر شائع کرنے والے صاحب اگر اپنے پوسٹر کے موجودہ عنوان کی بجائے "غیبی گولہ عنوان" رکھتے تو زیادہ موزوں ہوتا کیونکہ ایسے لوگوں کا علاج ہی یہ ہے کہ سیر کو سوا سیر کی نسبت سے جواب دیا جائے۔ ہم اس عادی پوسٹر باز سے امید رکھیں گے کہ وہ اس سلسلہ کو بند کر کے اپنی سیاسی موت پر خاموشی سے آنسو بہائیں۔

شاعرہ یا ٹوننگ طوائف

ماہ اپریل کے شانِ ہند میں ایک شاعرہ کے شوہرِ نامدار کا خط شائع کیا گیا تھا۔ اس شاعرہ کے بارے میں یہ عام چرچے ہو رہے ہیں کہ اُنہوں نے شاعری کے پردے میں مُلک بھر میں اپنے چاہنے والوں کی ریسرچ کر کے باقاعدہ ٹوننگ طوائف کا پیشہ اختیار کر لیا ہے۔

پچھلے دنوں ایڈیٹر شانِ ہند جے پور گیا تو وہاں ایک دوست کے ہاں اِن شاعرہ کا ایک رقعہ دیکھنے میں آیا کہ میں فلاں صاحب کے ساتھ آپ کے دردولت پر حاضر ہوئی تھی مگر آپ جے پور میں موجود نہیں تھے۔ (یہ رقعہ ایڈیٹر شانِ ہند کے پاس ہے) جے پور یا گردونواح بلکہ سارے راجستھان میں اُن دنوں کوئی مشاعرہ نہیں تھا اور پھر جن صاحب کے ساتھ یہ ایڈیٹر شانِ ہند کے دوست کے ہاں تشریف لے گئیں وہ صاحب شریف لوگوں کی نظروں میں ان شاعرہ صاحبہ کو بڑے بڑے لوگوں کے ہاں لے جانے کا دھندہ فرماتے ہیں — ان صاحب کے بارے میں اخلاق سہوانی اور دوسرے کئی شعرائے کرام نے متعدد واقعات لکھے ہیں جنہیں ہم اس شاعرہ کے شوہرِ نامدار کے پاس بھجوا رہے ہیں تاکہ یہ حضرت اپنی شاعرہ بیوی کا جشن منوانے کے لئے ان خطوط کی روشنی میں مزید مقامات کا بھی انتخاب فرما سکیں۔ مشاعروں کے منتظمین حضرات سے درخواست ہے کہ وہ مشاعروں کو اس قسم کی طوائفیت کے جراثیم رکھنے والی شاعرات سے پاک رکھیں تو اُردو پر احسان ہوگا۔ اس سلسلے میں ہم راہی شہابی بلند شہری سے بھی درخواست کریں گے کہ وہ ایسی شاعرات کو اپنے گھر میں مہمان ٹھہرا کر بدنامی کے علاوہ جو طرح طرح کی باتیں اپنے بارے میں مشہور کرا رہے ہیں وہ ان کی شان کے شایاں نہیں ہیں اگر راہی صاحب چاہیں تو کسی غیبی گولے بھیج کر ان شاعرات کے منہ سے اپنے بارے میں وہ باتیں کہلا لیں جو کوئی بھی شریف آدمی سن کر اُن کے بارے میں اچھی رائے قائم نہیں کر سکتا — راہی صاحب کو یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ عشق کی نمائش کرنے والے اکثر پیشہ ور عورتوں کے دلال بنے دیکھے گئے ہیں۔

"ادب نواخت" جے پور

محترم المقام جناب اچاریہ دھرمیندر ناتھ نے جو کہ فارسی اور سنسکرت کے فاضل اور متعدد فارسی اور سنسکرت کتابوں کے مصنف ہیں جے پور (راجستھان) میں "ادب نواخت" نام کی ایک انجمن کی بنیاد رکھی ہے۔ جس میں ہر مذہب و ملت کے اُردو دوستوں کی شمولیت کی دعوت دی گئی ہے۔ انجمن "ادب نواخت" کے اغراض و مقاصد حسب ذیل ہیں۔

۱۔ اس انجمن کے قیام کا مقصد اُردو زبان، اردو ادب اور اُردو کے ادیبوں اور شاعروں کی خدمت کرنا ہے۔

۲۔ اُردو ہماری قومی اور ملکی زبان ہے اس لئے اپنی قومی زبان کی حیثیت سے اُردو کی زیادہ سے زیادہ اشاعت و فروغ کی کوشش کرنا اس انجمن کا بنیادی مقصد ہے۔

۳۔ یہ انجمن اُردو زبان کو تعلیمی زبان کی حیثیت سے تسلیم کروانے اور سرکاری دفاتر اور عدالتوں میں نافذ کرانے کے لئے نیز سبھی محکموں اور شعبوں میں اُردو کو جائز مقام دلانے کے لئے عوام کی رہنمائی کرے گی۔

۴۔ یہ انجمن اُردو زبان کے لئے نستعلیق رسم الخط کے ساتھ ساتھ دیوناگری رسم الخط کو بھی تسلیم کرتی ہے۔ اور اس انجمن سے شائع ہونے والی جملہ تحریریں دونوں رسم الخط میں شائع ہوں گی۔

۱۰ر مئی ۱۹۷۰ء کو جناب اچاریہ دھرمیندر ناتھ صاحب کی قیام گاہ پر ایک خصوصی جلسہ انجمن "ادب نواخت" کے قیام کے سلسلے میں طلب کیا گیا جس میں راجستھان اسمبلی کے سابق اسپیکر نیز ساہتیہ اکاڈمی، راجستھان کے سابق صدر جناب رام کشور ویاس، جناب منشی اودھ بہاری لال صاحب ایڈوکیٹ خلف الرشید طوطیٔ راجستھان جناب چاند بہاری لال صاحب صبا جے پوری، جناب پریم ناتھ پریم سابق ڈسٹرکٹ سول اینڈ سیشن جج، علامہ عبدالحی صاحب فائز [illegible] بیگم صاحبہ اُردو، جناب [illegible] صاحب [illegible] خلیق جے پوری، جناب کشور [illegible] [illegible] صاحب کے علاوہ [illegible]

اُردو دوستوں نے شرکت کی۔ دہلی سے ایڈیٹر "شانِ ہند" اور رودی صاحب دہلوی نے بطور مہمان خصوصی حاضری دی۔ فائز صاحب نے انجمن کے اغراض و مقاصد پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ ازاں بعد جناب رام کشور ویاس نے بڑے دلنشین انداز میں اُردو کی اہمیت اور مقبولیت پر تقریر فرمائی۔ اور غیر مشروط طور پر اُردو کی ہر خدمت کے لئے عملی تعاون کا یقین دلایا۔

انجمن "ادب نواخت" کے بانی اچاریہ دھرمیندر ناتھ صاحب نے جملہ شرکاء جلسہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے دلائل دیتے ہوئے فرمایا کہ اُردو کا مستقبل صرف ہمارے پیارے ملک ہندوستان میں ہی روشن نظر آتا ہے۔ اُردو ہمارے وطن عزیز میں پیدا ہوئی اسی سرزمین پر پلی اور پروان چڑھی، اور اُردو ہی وہ زبان ہے جس پر ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی ہر قوم کو برابر کا حق حاصل ہے۔ اور اُردو کی آبیاری میں ہندوستان کے ہر فرقے اور ہر قوم کا برابر کا حصہ ہے۔ اس لئے اُردو ہر ہندوستانی کی مشترکہ میراث ہے۔ اور اُردو کی فروغ و ترقی کے لئے ہر ممکن عملی جدوجہد کرنا ہمارا قومی فرض ہے۔

جلسہ میں یہ طے پایا کہ ۵ر دسمبر ۱۹۶۹ء کو نہ صرف جے پور بلکہ راجستھان کے تمام اضلاعی مقامات میں یوم اُردو منایا جائے۔ اور اُردو ریلیوں کا انتظام کیا جائے۔ جے پور میں اُردو ریلی میں کم از کم ایک لاکھ اُردو دوستوں کا شریک ہونا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں ابھی سے مناسب تیاری اور ضروری اقدامات کئے جائیں تاکہ راجستھان میں یوم اُردو کو زیادہ سے زیادہ کامیاب بنایا جا سکے۔

جلسے کی کارروائی کے بعد بزم شعر و سخن کا دور چلا۔ جس میں گل خلیق، فائز، آبرو صاحب اور رودی نے کلام سنایا۔ جناب اودھ بہاری لال صاحب نے اپنے [illegible] طوطیٔ راجستھان صبا صاحب کا کلام سنایا۔ "ادب نواخت" کے سلسلے میں راجستھان کے اضلاعی مقامات پر [illegible] [illegible] [illegible]

ایڈیٹر شانِ ہند بھی جو بینک کی اس ریلی میں شریک ہوں گا۔

جناب حافظ محمد یوسف دہلوی کی صحت یابی

جناب حافظ محمد یوسف دہلوی آف "شمع" جو پچھلے دنوں تشویشناک حد تک ایک آپریشن کے سلسلے میں علیل رہے۔ خدا کے فضل و کرم اور لاکھوں بہی خواہانِ شمع و یوسف دہلوی کی دلی دعاؤں سے صحت یاب ہو کر ایک ماہ کے بعد ۱۲ جون ۱۹۸۰ء کو "دفاتر شمع" میں تشریف لائے۔ تو دفاتر شمع کے کارکنان نے جس خلوص اور دلی عقیدت سے حافظ صاحب کا شایانِ شان استقبال کرتے ہوئے اُن کی صحت کے لئے خدا سے دعا مانگی وہ سماں قابلِ دید تھا: مالک اور کارکنان کا یہ دل خوش مظاہرہ دوسرے مالکان دفاتر و کارخانہ جات کے لئے ایک مثالی حیثیت کا حامل تھا۔ اگر مالک اپنے کارکنان کے دکھ درد میں برابر کا شریک ہو تو کارکنان بھی دل و جان سے اپنے مالک کے تئیں وفادار اور اس کی جان و مال کی سلامتی کے لئے دعاگو رہتے ہیں۔ تمام کارکنان کی طرف سے حافظ صاحب کی صحت یابی پر دعائیہ سپاس نامہ حافظ صاحب کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ جناب عزیز اندوری صاحب اور جناب وقار صاحب نے منظوم اظہارِ عقیدت فرمایا۔ اس کے بعد کارکنان کی طرف سے پُرتکلف ناشتہ حافظ صاحب کے اعزاز میں دیا گیا۔ جناب محمد یونس صاحب دہلوی نے قبلہ حافظ صاحب کی صحت یابی کی خوشی میں تمام کارکنان کو ایک ہفتے کی تنخواہ زائد دیئے جانے کا اعلان فرمایا جس پر طویل تالیوں سے اظہارِ خوشنودی کیا گیا۔ دفاتر شمع کی سیڑھیوں پر قدم رکھتے ہی ایڈیٹر شانِ ہند نے حافظ صاحب کی گل پوشی کرتے ہوئے ان کی درازیٔ عمر اور صحتمند رہنے کی دُعا کی۔ اس کے بعد کارکنانِ دفاتر شمع نے حافظ صاحب کو پھولوں کے ہاروں سے لاد دیا۔ اور دروازے سے ان کے کیبن تک چلتے چلتے گلاب کی پتیوں کی بارش حافظ پر ہوتی رہی۔

دعا ہے کہ قبلہ حافظ صاحب صحت مند رہیں اور ان کا سایہ ہمایونی مدتوں قائم رہے۔

دی نیشنل مرکنٹائل کوآپریٹو بینک لمیٹڈ دہلی

دی نیشنل مرکنٹائل کوآپریٹو بینک لمیٹڈ نے پچھلے سال کے آخر میں دریا گنج دہلی میں اپنی برانچ کھولی۔ جناب نسیم کاظم صاحب دہلی برانچ منیجر کی قابلانہ رہنمائی کی کوششوں سے اس بینک نے جو کامیابی دہلی میں حاصل کی وہ راجدھانی کے دوسرے بینکوں کے لئے قابلِ رشک ہونی چاہئے۔

بینک کے کسی بھی کارکن سے بات کیجئے تو اخلاق اور تہذیب کے نمونے آپ کے سامنے ہوں گے۔ بینک کے ہر شعبہ میں گاہکوں کی رہنمائی نہایت خوش خلقی سے کی جاتی ہے۔ اور ہر ممکن راحت بہم پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ اس بینک نے سات آٹھ ماہ میں ہی اتنی مقبولیت حاصل کر لی ہے کہ اب کسی بھی پرانے سے پرانے بینک کے مقابلہ میں کھاتہ داروں کی تعداد میں یہ بینک پیچھے نہیں ہے۔ نئے کھاتے کھلوانے والوں اور دیگر ضروریات کے بارے میں متعلقہ کاغذات کی خانہ پُری بینک کی طرف سے نہایت خندہ پیشانی سے کی جاتی ہے۔ اور کھاتہ داروں کو ہر ممکن سہولیت بہم پہنچانا اس بینک کا طرۂ امتیاز ہے۔ یہ واحد بینک ہے جس نے دریا گنج کے علاقہ میں شام کے تین بجے سے ساڑھے چار بجے تک کے لئے بھی لین دین کی سہولیت بہم پہنچائی ہیں جس سے کاروباری حضرات کو بڑی راحت ملی ہے اس بینک نے آٹومیٹک طور پر ٹوکن نمبر کا اعلان کرنے کا طریقہ راجدھانی میں پہلی بار شروع کیا ہے جس سے روپیہ لینے والوں کو آسانی رہتی ہے۔ بینک کے مینجنگ ڈائریکٹر جناب زین جی رنگون والا کی دُوررس نظر داد کی داد دی جانی چاہئے جنہوں نے جناب نسیم کاظم صاحب ایسی بہترین منتظم اور عوام و خواص میں رسوخ پیدا کرنے والی ہر دلعزیز شخصیت کو اس شاخ کے لئے بطورِ منیجر مقرر فرمایا۔ ضرورت ہے کہ دہلی کے دوسرے علاقوں میں اس بینک کی شاخیں کھولی جائیں تاکہ دہلی کے عوام راجدھانی کے فرسودہ انتظام رکھنے والے دوسرے بینکوں کے مقابلہ میں اس بینک کی خدمات سے فائدہ اٹھا سکیں۔ اگر جناب زین جی رنگون والا مراد آباد، سہارنپور، بریلی، رامپور، لکھنؤ ایسے شہروں میں بھی برانچیں کھولیں تو یقینی طور پر ان مقامات پر بھی بینک کامیابی حاصل [illegible]
[illegible]

یہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر

سرور تونسوی

یادش بخیر جناب گوپال متل صاحب مدیر ماہنامہ "تحریک" انتہائی سلیقہ مند۔ اچھے شاعر، قابلِ قدر صحافی۔ اور [illegible] اور امریکن نواز ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ بااخلاق، خوش طبع، حاضر جواب اور کسی حد تک "آگ لگا کر جمالو دور کھڑی" کی صفات کے مالک ہیں۔

جب گوپال متل صاحب روزنامہ "تیج" کے ایڈیٹوریل سٹاف میں کام کرتے تھے تو اُن دنوں آپ کا بیگم صاحبہ کے ہاں آنا جانا تھا۔ گوپال متل صاحب میں بظاہر کوئی ایسی کشش نہیں کہ کوئی عورت اور پھر بیگم صاحبہ ایسی سیماب صفت خاتون اُن سے عشق کر سکے۔ آج کل تو خدا کی نظرِ کرم اور امریکن نواز ہونے کے باعث گوپال متل صاحب کی مالی حالت صحافی حلقوں میں قابلِ رشک حد تک ہے مگر اُن دنوں آپ محض زندگی کی گاڑی چلانے تک ہی کما پاتے تھے۔ اور یہ ناممکنات میں سے تھا کہ بیگم صاحبہ ایسی فراخ دل، در فضول خرچ خاتون پر اُن کی مالی آسودگی اثر انداز ہو سکتی کیونکہ ان کی مہینہ بھر کی تنخواہ کے برابر تو بیگم صاحبہ کے ہاں ایک روز میں ہی اُٹھ جاتا تھا۔ مگر گوپال متل بھی اہلِ دل ہیں۔ انہیں بھی کسی سے عشق کرنے کا حق حاصل ہے خواہ وہ دن دے شریک کے مصداق ہی کیوں نہ ہو۔

گوپال متل صاحب نے ایک دو ملاقاتوں میں ہی یہ اندازہ لگا لیا کہ بیگم صاحبہ کو شاعرِ مشرق ڈاکٹر سر محمد اقبال کے کلام سے والہانہ لگاؤ ہے۔ اور بیگم صاحبہ کو اقبال کے سینکڑوں اشعار یاد ہیں۔ بیگم صاحبہ کی اقبال شناسی ہی انہیں ڈاکٹر کاٹجو مرحوم جو اُن دنوں ہوم منسٹر حکومتِ ہند تھے، کے نزدیک سے نزدیک تر لائی۔ اس اجمال کی تفصیل یوں ہے کہ جامع مسجد کے میدان [illegible] کے سامنے ایک مشاعرہ ہو رہا تھا جس کی صدارت ڈاکٹر کاٹجو فرما رہے تھے اور ڈاکٹر موصوف کو اقبال کی نظم [illegible] بہت پسند تھی۔ منتظمین مشاعرہ صدر صاحب کی پسندیدگی اور خوشنودی کے لئے یہ چاہتے تھے کہ مشاعرہ کا آغاز اقبال کی اس نظم سے ہو۔ بیگم صاحبہ شاعرہ کی حیثیت سے اس مشاعرہ میں مدعو تھیں۔ جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کی موقع شناس نظروں نے بیگم صاحبہ سے کہا کہ وہ اقبال کی اسی نظم سے مشاعرہ کا آغاز فرمائیں۔ بیگم صاحبہ کا ترنم، حسن اور اس وقت چائے کی کیتلی میں کوکا کولا کی شراب کے دو چار فنجان پیٹ میں جانے کے باعث ہلکا سا سرور، موسیقی، حسن اور شراب کی اس تثلیث نے وہ قیامت ڈھائی کہ ڈاکٹر اقبال کی روح بھی جھوم کر رہ گئی ہوگی۔ ڈاکٹر کاٹجو کا یہ حال تھا کہ ہر مصرع پر لمبی لمبی بھوؤں سے ڈھکی ہوئی آنکھوں کو بار بار اٹھا کر بیگم صاحبہ کو دیکھتے اور زبان سے تو ڈاکٹر اقبال کے کلام کی داد دے رہے تھے۔ مگر آنکھوں اور دل کی گہرائیوں میں بیگم صاحبہ کی تصویر اتار رہے تھے۔ بیگم صاحبہ نظم سنا کر اور ہزار ہا دلوں پر بجلی گرا کر مائک سے الگ ہوئیں تو ڈاکٹر کاٹجو نے انہیں اپنے پہلو میں بڑی عزت و تعظیم سے بٹھایا۔ اور جی بھر کر داد دی۔ اس کے بعد ڈاکٹر کاٹجو ہوم منسٹری میں اپنے دفتر میں ہوں یا اپنی رہائش گاہ پر بیگم صاحبہ بلا جھجک اور بغیر وقتِ ملاقات مقرر کئے ڈاکٹر کاٹجو کے ہاں جانے لگیں۔ ڈاکٹر کاٹجو کے بارے میں پھر کسی وقت تفصیل سے انہی صفحات میں ذکر کیا جائے گا۔

جب گوپال متل صاحب کو بیگم صاحبہ کی اس اقبال پسندی کا یقین ہو گیا تو انہوں نے ڈاکٹر اقبال کے کلام کو تقریبِ ملاقات کا ذریعہ بنا لیا اور بیگم صاحبہ کے ہاں ان کا آنا جانا شروع ہو گیا۔ اور یہ سلسلہ قریباً ایک سال تک رہا۔ اس عرصہ میں [illegible] کا یہ اقبالی عشق محض بیگم صاحبہ سے اشعار [illegible] اور دل کے سرور تک ہی [illegible]۔ ان کی [illegible] تیج کے مالکان میں سے ایک صاحب [illegible] بیگم صاحبہ کے ہاں ہر [illegible] ہو۔ مگر کیا مجال کہ وہ [illegible] صاحب بیگم صاحبہ کے ہاں

عین وقت مقررہ پہ حاضری نہ دیں۔ مالک اور ملازم میں رقابت
پیدا ہو گئی۔ دھرم پال گپتا وفا کو گوپال متل صاحب کا بیگم صاحبہ کے
ہاں آنا جانا دخل در معقولات محسوس ہو رہا تھا۔ اور ویسے بھی وفا صاحب
گوپال متل کے مقابلے میں ادبی اور شعری لحاظ سے ایک صفر سے زیادہ
حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ بیگم صاحبہ اور گوپال متل گھنٹوں کلامِ اقبال پر
گفتگو کرتے رہتے۔ اور وفا صاحب اس گفتگو کو محض بکواس سمجھتے
تھے اور وہ جس طرح دلی کے شرفا کی طرح خاموش عشق کے خواہاں
تھے گوپال متل کی شاعرانہ گفتگو اس میں سدِ راہ تھی۔ لہٰذا دھرم پال
گپتا وفا نے بیگم صاحبہ سے پرزور استدعا کی کہ کسی طرح گوپال متل صاحب
کا اپنے یہاں آنا بند کر دیں۔ ورنہ ان کا دل و دماغ جذبۂ رقابت سے
بیکار ہو جائے گا۔ اس پر ایک روز بیگم صاحبہ نے گوپال متل صاحب
سے کہا کہ اچھا متل صاحب آپ یہ بتائیے کہ میں آپ کو کیسی لگتی ہوں لیلےٰ
اگر مجنوں سے یہی پوچھتی تو مجنوں کا جو حال ہوتا عین وہی حال گوپال
متل صاحب کا تھا۔ تعریفی کلمات پوری طرح زبان سے ادا نہیں کر
پا رہی تھی) ایک تو ویسے ہی متل صاحب قدرے لکنت سے بولتے
ہیں اس پر حسن کی یہ نوازش جس سے متل صاحب کی لکنت اور
بھی بڑھ گئی۔ جب متل صاحب لغات کے تمام تعریفی الفاظ
بیگم صاحبہ کی تعریف میں ختم کر چکے تو بیگم صاحبہ نے فرمایا کہ میں چاہتی
ہوں کہ آپ کی شاگردہ بن جاؤں کیونکہ کامل قریشی صاحب کی
اصلاحیں بے جان ہیں اور میں کسی اچھے استاد کی تلاش میں تھی
آپ سے بہتر استاد نہیں مل سکتا لہٰذا میری یہ گذارش قبول فرمائیے
اس کے ساتھ ہی بیگم صاحبہ نے یہ بھی فرمایا کہ استاد اور شاگردہ
کے تعلقات باپ بیٹی کے ہوتے ہیں۔ اس لئے آئندہ ہمارے
اور آپ کے تعلقات ایسے ہی ہوں گے۔ بیگم صاحبہ کا یہ کہنا تھا کہ
گوپال متل صاحب ایک لمحہ میں ساری شیریں گفتار بھول گئے
اور ڈاکٹر اقبال انہیں جگن ناتھ آزاد محسوس ہونے لگے۔ بیگم صاحبہ
کے ایک جملے نے ہی گوپال متل صاحب کے دل کے ہزار ٹکڑے
کر دیئے تھے۔ اور وہ فوری طور پر وہاں سے چلے آئے۔ اور اس
کے بعد بیگم صاحبہ کے ہاں نہیں گئے۔

ایک شاعر تھے غالباً ان کا تخلص جوہر تھا۔ آج کل یہ صاحب
گیسو اور داڑھی بڑھائے پیری مریدی کا دھندا نہایت خوش
اسلوب سے چلا رہے ہیں۔ تعویذ گنڈے بھی دیتے ہیں۔
جہاں تک یاد پڑتا ہے ہندو تھے بعد میں اسلام قبول کر
کے پیری مریدی کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ان صاحب کا یہ ایمان
تھا کہ بیگم صاحبہ کے ہاں ہر روز گھنٹوں حاضری دیتے دل کی
باتیں تو خدا ہی جانتا ہے مگر بظاہر یہ صرف چائے اور کھانے کے
لالچ میں آیا کرتے تھے اور ان کا بیگم صاحبہ سے یہ مطالبہ اکثر
رہتا تھا کہ انہیں مشاعرے دلوائے جائیں۔ بیگم صاحبہ کا طوطی
بول رہا تھا کوئی مشاعرہ ان کے بغیر مشاعرہ نہیں کہلاتا تھا لہٰذا
منتظمین مشاعرہ کو ان کا ایک اشارہ ہی جوہر صاحب کی شرکت
کے لئے کافی تھا۔ بیگم صاحبہ نے صرف کنور مہندر سنگھ
بیدی سحر صاحب کو کہہ کر سینکڑوں مشاعرے جوہر صاحب
کو دلوائے ہوں گے۔ ایک دن کسی کام کے باعث ایڈیٹر شانِ ہند
بیگم صاحبہ کے ہاں دوپہر کو گیا تو دیکھا کہ جھوٹے برتنوں کا ایک
ڈھیر ہے جسے جوہر صاحب نہایت چابکدستی سے صاف
کر رہے ہیں ــــ بیگم صاحبہ سے راقم الحروف نے اشارے
سے جوہر صاحب کے اس فنکارانہ مظاہرے کا سبب پوچھا تو
فرمانے لگیں۔ سرور صاحب میرا ملازم کل سے نہیں آیا گھر کی
صفائی وغیرہ کرنے والی مائی بھی بیمار ہے۔ دو دنوں سے جھوٹے
برتنوں کا ڈھیر لگ گیا تھا۔ ابھی جوہر صاحب آئے تو میں نے باتوں
کے سلسلے میں ہی ان سے کہا کہ مجھ سے مشاعرے تو روزانہ مانگتے
ہو آج ذرا ان برتنوں کو صاف کر دو۔ لہٰذا انہوں نے سعادتمندی
کا ثبوت دیا ہے۔ اور جس بہتر انداز میں یہ برتن صاف کر رہے
ہیں اس سے میرا دل خوش ہو اٹھا ہے۔ اور میں انہیں آج
ہی ایک اچھا مشاعرہ دلواؤں گی جہاں سے انہیں کم از کم ایک سو
روپیہ مل جائے گا (ان دنوں سو روپیہ کافی اہمیت رکھتا تھا)
برتن صاف کرتے ہوئے جوہر صاحب نے جھینپ مٹانے
کے لئے کہا۔ سرور صاحب بیگم صاحبہ کے گھر کو میں اپنا ہی
گھر سمجھتا ہوں۔ لہٰذا اپنے گھر کا کام کرنے میں کیا شرم ہے
بیگم نے دعائیں دیتے ہوئے کہا کہ خدا آپ کو ایسا ہی سعادتمند
اور برخوردار بنائے رکھے۔

بیگم صاحبہ کے ہاں ایک صاحب جنہیں بیگم صاحبہ اپنا

بہنوئی کہا کرتی تھیں رہتے تھے بیگم صاحبہ کی ایک ملازمہ جو بچپن کے بعد جوانی کی حد میں داخل ہو چکی تھی۔ بڑی طرار اور عشوؤں اور غمزوں کا مظاہرہ کرتی رہتی تھی۔ ایکدن سننے میں آیا کہ بیگم صاحبہ اور اُن کے اس مبینہ بہنوئی کو اس ملازمہ کے اغوا میں گرفتار کر لیا گیا ہے۔ فوری طور پر بیگم صاحبہ اور اُن کے بہنوئی کی ضمانت ہو گئی اور مقدمہ عدالت میں آگیا۔ جناب ڈھلوں صاحب ایس۔ ڈی۔ ایم دہلی کے ہاں یہ مقدمہ چل رہا تھا ڈھلوں صاحب کو بعد میں فیروزپور میں اُن کے لڑکے نے ہی پستول کی گولی سے سوتے میں ہلاک کر دیا تھا۔ کشمیری گیٹ رٹز سینما کے عقب میں اُن دنوں دلی کی فوجداری عدالتیں تھیں۔ ہر پیشی پر راقم الحروف عدالت میں مقدمہ کی کاروائی سننے جاتا۔ اور پیشی کے بعد بیگم صاحبہ کے ساتھ ہی ان کے دولت کدہ پر جاتا اور مقدمہ کے بارے میں صلاح مشورہ کیا جاتا۔ ایک شام سردار دیوان سنگھ مفتون کے ہاں سردار ڈھلون ایس۔ ڈی۔ ایم تشریف لائے۔ سردار صاحب نے پاس بیٹھے دو چار شعرا کو ڈھلوں صاحب سے متعارف کرایا تو ڈھلوں صاحب فرمانے لگے کہ ایک شاعرہ کا مقدمہ تو میری عدالت میں چل رہا ہے۔ ڈھلوں صاحب باتوں باتوں میں کہہ گئے کہ مقدمہ کے سب گواہان نے استغاثہ کی مرضی پیش کئے ہیں اور کہ مقدمہ میں کوئی جان نہیں ہے چونکہ یہ بات سردار صاحب کے مکان پر ایک ایس۔ ڈی۔ ایم کی زبان سے نکلی تھی۔ اب اگر یہ بات باہر جاتی ہے تو یہی سمجھا جائے گا کہ اس وقت جو حضرات سردار صاحب کے ہاں موجود تھے انہوں میں سے کسی نے یہ بات باہر پہنچائی۔ باقی شعراء کو تو اس مقدمہ سے کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی۔ البتہ راقم الحروف کو اس معاملہ میں گہری دلچسپی تھی۔ لہٰذا میں نے یہ بات بیگم صاحبہ کو بھی نہ بتائی کیونکہ اگر انہیں بتا دیا جاتا تو وہ شراب کے نشے میں کسی وقت بھی یہ راز اگل دیتیں اور میرا سردار صاحب کے ہاں آنا جانا ہمیشہ کے لئے بند ہو جاتا اور دشمنی مفت میں ہو جاتی۔ یہ مقدمہ دو سال تک چلتا رہا۔ آخر فیصلے کا دن آپہنچا مجھے تو یہ معلوم ہی تھا کہ بیگم صاحبہ اور ان کے بہنوئی دونوں باعزت بری ہوں گے۔ لہٰذا میں نے چاندنی چوک سے گلاب کے پھولوں کے دو ہار خریدے اور انہیں اپنے بریف کیس میں رکھ لیا۔ اور سیدھا ڈھلوں صاحب کی عدالت میں پہنچا۔ بیگم صاحبہ سراسیمگی کے عالم میں تھیں اتنے میں پتہ چلا کہ غازی آباد اور مراد نگر کے درمیان ایک ہوائی جہاز گر گیا ہے۔ جس کی تفتیش کے لئے۔ ایس، ڈی۔ ایم صاحب موقع پر تشریف لے جا رہے ہیں۔ عدالت کے چپراسی سے ریڈر تک کو بیگم صاحبہ نے کرنسی نوٹوں سے سب کو خوش کر رکھا تھا۔ ڈرائیور کو بھی پانچ کا نوٹ بیگم صاحبہ نے دیا۔ چند منٹ بعد ڈھلوں صاحب ریڈر اور سٹینو گرافر کو ہمراہ لئے جائے واردات کی طرف روانہ ہو گئے۔ قریباً چار بجے ڈھلوں صاحب واپس تشریف لائے اس درمیانی وقت میں بیگم صاحبہ اُن کے بہنوئی وکیل اور میں کارلٹن ہوٹل کشمیری گیٹ میں بیٹھے کھاتے پیتے رہے۔ جوں ہی چپراسی نے ہوٹل میں آکر اطلاع دی کہ صاحب آگئے ہیں ہم سب فوری طور پر عدالت کے باہر پہنچ گئے۔ ڈرائیور نے آتا بتایا کہ صاحب نے راستہ میں فیصلہ لکھوا دیا ہے۔ اور سٹینو گرافر اُسے ٹائپ کر رہا ہے بیگم صاحبہ نے تمام انتظامات کر رکھے تھے کہ اگر عدالت نے سزا سنا دی تو ضمانت کی درخواست دی جا سکے۔ اور اگر عدالت، ضمانت نامنظور کر دے تو فوراً ٹیکسی پر وکیل سیشن جج کے ہاں جاکر ضمانت کی درخواست پیش کر سکے۔ مگر یہ سب انتظامات دھرے کے دھرے رہ گئے کیونکہ پانچ بج چکے تھے اور دیگر سب عدالتیں بند ہو رہی تھیں۔ پانچ بج کر پانچ منٹ پر عدالت کے چپراسی نے ملزمان کے نام پکارے تو بیگم صاحبہ کچھ ورد کرتی ہوئیں عدالت میں داخل ہوئیں۔ میں بھی عدالت میں فیصلہ سننے گیا۔ ڈھلوں صاحب نے بڑے وقار کے ساتھ حکم سنایا، کہ جائیے آپ دونوں کو باعزت بری کیا جاتا ہے۔ بس پھر کیا تھا بیگم صاحبہ نے دعاؤں کی بھرمار کر دی خدا آپ کو ڈپٹی کمشنر بنا دے یہ کر دے وہ کر دے۔ ڈھلوں صاحب مسکراتے رہے۔ ایڈیٹر شانِ ہند نے بریف کیس سے دونوں ہار نکالے ایک بیگم صاحبہ کے گلے میں اور دوسرا اُن کے بہنوئی کے گلے میں ڈال دیا۔ ڈھلوں صاحب کرسی عدالت سے اُٹھ کر اندر چلے گئے

اور بیگم صاحبہ نے پرس کھول کر پانچ پانچ روپے کے نوٹوں کی بارش شروع کر دی۔ عدالت کا ہر اہلکار ان نوٹوں کو چیت رہا تھا۔ یہ ہنگامہ ختم ہوا تو کمپری کیٹ بس اسسٹنٹ چیف ایڈیٹر نشان بیگم نے بیگم صاحبہ کو پھر مبارکباد دیتے ہوئے رخصت چاہی تو بیگم صاحبہ فرمانے لگیں ارے آپ کہاں جا سکتے ہیں سرور صاحب میرے حسن اور جوانی پر لوگوں نے ہزاروں من پھول قربان کئے ہوں گے۔ مگر خدا کی قسم آج عدالت میں آپ کے گلاب کے پھولوں کے بارے جو مزا دیا اس ایک ہار پر ہزاروں من پھول نچھاور۔ آپ کارلٹن ہوٹل چلئے اور گھر پر فون کر دیجئے کہ آج رات آپ گھر نہیں آئیں گے۔ بلکہ میرے ہاں جشن میں شریک ہوں گے۔ کارلٹن ہوٹل سے بیگم صاحبہ نے وسکی اور بیئر کی بوتلوں سے ٹیکسی بھروالی۔ اور مجھے اپنے بہنوئی اور دیں کو ساتھ لے کر اپنے مکان پر آگئیں۔ رات بھر جو جشن منایا گیا اس کی تفصیل پھر کبھی لکھوں گا۔ کس کس شاعر نے کیا کیا حرکتیں کیں آپ پڑھیں گے تو اپنے ان ملک گیر شہرت رکھنے والوں شاعروں کی اصلیت سے واقف ہو سکیں گے ———

غزل

امتیاز بجے پوری

آرزوئیں کالے کر سہارا اہنیے دشمن بھی اس در کے آگے
ایک ہم تھے کہ تڑپا کئے ہیں ہر قدم پر اپنے مقدر کے آگے

تو جو چاہے تو ہم کو مٹا دے، ہاں مگر بے وفا یہ بتا دے
دولتِ دل کو ٹھکرا دیا کیوں نامرمی دولت وزر کے آگے

یوں ثبوتِ وفا دے رہے ہیں ضبط سے کام ہم لے رہے ہیں
اس کے ہر ظلم کو سہہ رہے ہیں، سر جھکایا ہے خنجر کے آگے

اُن کی تقریب تھیں پتھر سے بڑھ کر، دل بھلا تھا شیشے سے نازک
ٹکڑے ٹکڑے ہوئے دل کے لیکن، مسکرائے ہیں دلبر کے آگے

انتہا یہ ہوئی آرزو کی، ہر قدم پر تری جستجو کی
ہم نے کعبے کی طرح سجدہ کر کر جھکایا ترے در کے آگے

امتیاز اشک اس کے نہیں گے، جا کے احباب جب یہ کہیں گے
دیکھ لے تیرے عاشق کی میت آرہی ہے ترے گھر کے آگے

غزل

(صاحبزادی انوار النسا بیگم صاحبہ آرزو فائزی ٹونکی)

ہوتا ہے جب ان سے تصادم کبھی کبھی
جلوے نظر میں ہو گئے خود گم کبھی کبھی

میری نگاہ خوفِ مآلِ وصال سے
رہتی ہے شب کو زینتِ انجم کبھی کبھی

یارب سکوتِ غنچہ کا معصوم واسطہ
دل کو عطا ہو تابِ تکلم کبھی کبھی

اشکِ وفا کے ظرف کی رعنائیاں نہ پوچھ
قطروں میں ڈوب جاتے ہیں قلزم کبھی کبھی

آ آ کے رک رہی ہیں لبوں پر شکایتیں
ساحل کو چھو رہا ہے تلاطم کبھی کبھی

خود موت رقص کرتی ہے سازِ حیات پر
تارِ نفس کا سن کے ترنم کبھی کبھی

کیا حسنِ التفات میں ہو جاتی کچھ کمی
مجھ کو نواز لیتے اگر تم کبھی کبھی

شبنم کے اشک پھولوں کے رخ پر تھے آرزو
شعلوں کے لب پہ دیکھا تبسم کبھی کبھی

حضرت رتن پنڈوروی

شکستِ ناروا

اُردو فارسی میں بعض بحریں ایسی ہیں کہ ان میں ترنم موسیقی اور مصرع کی روانی کے لئے ہر مصرع کو دو برابر حصّوں میں تقسیم کرنا پڑتا ہے۔ اگر مصرع کے دو برابر ٹکڑے نہ ہوں بلکہ ایک ٹکڑے کا ایک حصّہ بلحاظ تقطیع دوسرے ٹکڑے چلا جائے تو اس کو شکستِ ناروا کہتے ہیں۔ مثلاً اقبال سے

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

تقطیع کی جائے تو مصرع ثانی میں "ہیں" کا لفظ مصرع کے دوسرے ٹکڑے میں چلا جاتا ہے۔ اس کو شکستِ ناروا کہتے ہیں مصرع ثانی کی تقطیع ملاحظہ ہو۔

وہ مری جبی	ڑپ رہے ہیں	کہ ہزار سج
متفاعلن	متفاعلن	متفاعلن

نِ نیاز مے
متفاعلن

گویا پہلا ٹکڑا "رہے" کے لفظ تک ختم ہو جاتا ہے۔ اور فعل (رہے ہیں) کا دوسرا جزو دوسرے مصرع میں چلا جاتا ہے۔ یہی شکستِ ناروا ہے۔

اس عیب کی کئی صورتیں ہیں۔ جو استفادۂ شائقین کے لئے نیچے درج کی جاتی ہیں۔

۱۔ (اجزائے فعل کا دو حصّوں میں بٹ جانا) یعنی ایک جزو پہلے نصف میں اور دوسرا جزو مصرع کے دوسرے نصف میں آئے۔ جیسے مندرجہ بالا مثال میں "رہے ہیں" کے دو حصّے ہو گئے ہیں۔ رہے مصرع کے پہلے نصف حصّے میں اور "ہیں" دوسرے نصف حصّے میں آیا ہے۔

۲۔ (جار مجرور میں ایک جزو کا ایک نصف حصہ میں ہو جانا اور دوسرا جزو دوسرے نصف حصہ میں چلے جانا) جیسے

خرابِ دل کا میں خلش حال لکھا

سو بار بند کرنے پہ بھی کھل رہا ہے

مصرع ثانی کا پہلا نصف حصہ "بند کرنے" تک ختم ہو جاتا ہے۔ اور "پہ" حرفِ جار مصرع کے دوسرے نصف میں چلا جاتا ہے۔

۳۔ مضاف مضاف الیہ میں مضاف الیہ اور حرفِ اضافت مصرع کے پہلے نصف میں اور مضاف دوسرے نصف میں آ جائے۔ م بلکہ کئی دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ حرفِ اضافت بھی دوسرے نصف کے شروع میں جا رہتا ہے۔ یہ نہایت قبیح صورت ہے۔ مثلاً

وہ بھی وقت تھا جب وہ میرے دل میں سمائے بیٹھے تھے

"میرے دل" (مرکبِ اضافی ہے) "میرے" پہلے نصف میں اور "دل" دوسرے نصف میں ہے۔ شکستِ ناروا کی یہ صورت نہایت قبیح ہے یا یہ مصرع۔

پھر داغِ جگر کو آتشِ گل کی یاد نے آتشا کیا

۴۔ (ایک ہی لفظ کا کچھ حصہ پہلے نصف حصے میں اور باقی لفظ دوسرے نصف کے شروع میں واقع ہو) مثلاً

راتے گو تاریک مگر سُورج چمکانے بیٹھا ہوں۔

سُورج کا لفظ دونوں طرف بٹ گیا ہے (رات ہے فعلن) (گو تا فعلن)۔ (ریک م فعلن) (گر سُو فعلن) "سو" کے لفظ تک پہلا نصف ختم ہو گیا اور "رج" دوسرے نصف میں چلا گیا۔ اس طرح ایک ہی لفظ "سورج" کے دو ٹکڑے جُدا جُدا ہو گئے۔

۵۔ (مرکب عطفی میں معطوف الیہ پہلے نصف حصے کے آخر میں اور معطوف دوسرے نصف کے شروع میں آئے۔ م مثلاً

چاہتے ہیں دل و جان سے ہم آپ کو

چاہتے (فاعلن) ہیں دلو (فاعلن) جان سے ہم (فاعلن)

آپ کو (فاعلن) ۔ اس مصرع میں "دل" معطوف الیہ ہے اور واؤ حرفِ عطف ہے۔ یہ دونوں مصرع کے پہلے نصف میں آ گئے اور معطوف (جاں) مصرع کے دوسرے نصف میں چلا گیا ہے۔

۶۔ (اگر صفت پہلے نصف میں آئے اور موصوف دوسرے نصف میں تو وہ بھی شکستِ ناروا ہے) مثلاً ع

اہلِ دل کے دل میں گہرا نقش جمائے بیٹھا ہوں

"گہرا نقش" مرکبِ توصیفی ہے۔ گہرا صفت ہے اور نقش موصوف۔ مصرع کے پہلے نصف میں صفت (گہرا) اور موصوف (نقش) دوسرے نصف میں ہے۔

۷۔ مرکبِ عددی میں شکستِ ناروا کا عیب واقع ہو جاتا ہے۔ مثلاً ؎

آئینہ ہم پہ سارے جذبات ہیں تمہارے
پیشِ نظر ہمارے خدشات ہیں تمہارے

"سارے جذبات" مرکبِ عددی ہے۔ شعر میں "سارے جذبات" کا ٹکڑا بٹ گیا ہے۔ "سارے" پہلے نصف میں اور "جذبات" مصرع اولیٰ کے دوسرے نصف میں آیا ہے۔

۸۔ جملۂ شرطیہ میں بھی حرفِ جزا اگر جملہ اجزا سے الگ ہو جائے تو شکستِ ناروا کا عیب واقع ہوتا ہے۔ مثلاً ع

ویران ہیں گلشن تو آباد ہیں ویرانے

"تو" حرفِ جزا مصرع کے دوسرے نصف کا حق ہے۔ لیکن یہاں پہلا نصف "تو" پر ختم ہو جاتا ہے۔

۹۔ "نے" علامتِ فاعل اگر اسمِ فعل سے الگ ہو جائے تو بھی شکستِ ناروا ہے۔ مثلاً ع

کسی جوانِ خوب رُو نے لوٹ لیں جوانیاں

"نے" علامتِ فاعل پہلے نصف کا حق ہے لیکن "خوب رُو" سے الگ ہو کر دوسرے نصف میں چلا گیا ہے "جوانِ خوب رُو" صفت موصوف ہو کر اسمِ فاعل ہے "نے" علامتِ فاعل اس کے ساتھ چاہیئے۔

۱۰۔ "کو" علامتِ مفعول کا الگ ہو کر دوسرے نصف میں چلا جانا بھی شکستِ ناروا ہے۔ مثلاً ع

میدانِ امتحان ہے کہتے ہیں جس کو دنیا
اللہ اپنے بندوں کو آزما رہا ہے

مصرعِ ثانی میں "بندوں" مفعول ہے اور "کو" علامتِ مفعول۔ لیکن مصرع کا پہلا نصف حصہ "بندوں" پر ختم ہو جاتا ہے۔ اور "کو" دوسرے نصف میں جا پڑتا ہے۔

۱۱۔ ندا منادیٰ میں حرفِ ندا پہلے نصف کے آخر میں اور منادیٰ دوسرے نصف کے شروع میں آئے۔ مثلاً ع

کہتا ہوں تم سے میں اے ہندوستان والو

"اے" حرفِ ندا پہلے نصف میں اور منادیٰ (ہندوستان) دوسرے نصف میں چلا گیا ہے۔

۱۲۔ فارسی اضافت میں مضاف کے بعد مضاف الیہ دوسرے نصف کے شروع میں واقع ہو تو شکستِ ناروا ہے۔ مثلاً ع۔

شام و سحر نمائشِ سوزِ نہاں گناہ ہے۔

مصرع کا پہلا نصف حصہ مضاف یعنی (نمائش) تک ختم گیا ہے اور مضاف الیہ (سوزِ نہاں) دوسرے نصف میں واقع ہوا ہے۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ فارسی عطف میں پہلا نصف حرفِ عطف پر ختم کرنا بھی اسی قبیل سے ہے۔

۱۳۔ محاورے کا کچھ حصہ مصرع کے پہلے نصف میں اور باقی حصہ دوسرے نصف میں لانا بھی شکستِ ناروا ہے مثلاً ؎

بھلا مجھ پہ ڈھائیں تو ڈھائیں کیا ستم اب زمانہ کی آندھیاں
میں بجھا ہوا سا چراغ ہوں میں لٹا ہوا سا غبار ہوں

اس شعر کے مصرع اولیٰ میں "ستم ڈھانا" محاورہ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے۔ ڈھانا سے ڈھائیں۔ فعل مضارع مصرع کے پہلے نصف میں اور "ستم" دوسرے نصف میں واقع ہوا ہے۔

اب ناظرین و شائقین فن کی دلچسپی اور فائدے کے لئے ان خاص بحور کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جو اس ستم سے تعلق رکھتی ہیں

(۱) بحر مضارع اخرب سالم۔

ارکان۔ مَفعُولُ فاعِلَاتُن مَفعُولُ فاعِلَاتُن

مثال۔ تکمیل بندگی کی دستورِ عاشقی ہیں

ایسا بھی اِک زمانہ گزرا ہے زندگی میں۔

۲۔ بحر کامل مثمن سالم

ارکان۔ متفاعلن متفاعلن۔ متفاعلن۔ متفاعلن

مثال۔ یہی سوچتا ہوں کہاں گئے یہی سوچتا ہوں کدھر گئے
مری راحتوں کے وہ چار دن جو بہنی خوشی میں گزر گئے

۳۔ بحر رمل مثمن مشکول سالم۔

ارکان۔ فعلاتُ فاعلاتن فعلاتُ فاعلاتن

مثال۔ ترے عکس کا جو قاتل کبھی مجھ پہ وار ہوتا
تو نثار ہونے والا بھی جاں نثار ہوتا

۴۔ بحر متدارک مخبون شانزدہ رکنی

ارکان۔ فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن

مثال۔ ترے ہاتھوں سے کچھ ہر حق میں ذرا نہ بھی بھلا ہی ہوا نہ برا ہی ہوا
کہا مجھ سے رقیبوں نے گرچہ بُرا نہ بھلا ہی ہوا نہ برا ہی ہوا۔

۵۔ بحر متدارک مخبون مسکن (با اذال) شانزدہ رکنی

ارکان۔ فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن

مثال۔ میں محو خدا تو شان خدا میں اور نہیں تو اور نہیں
تو جلوہ ہے میں جلوہ نما میں اور نہیں تو اور نہیں

۶۔ بحر متقارب مثمن اثلم

ارکان۔ فعلن فعولن فعلن فعولن

مثال۔ شرط وفا کی کیسی بے وفا سے
آتش سا عارف آگاہ بھولا

۷۔ بحر رجز مثمن سالم

ارکان۔ مستفعلن مستفعلن مستفعلن مستفعلن

مثال۔ جب مشک بھر کر نہر سے عباس غازی گھر چلے
اِک جام کوثر بھر لیا اور خلد سے باہر چلے

۸۔ بحر رجز مطوی مخبون

ارکان۔ مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن

مثال۔ دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں

روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں رلائے کیوں

۹۔ بحر ہزج مثمن مقبوض

ارکان۔ مفاعلن مفاعلن مفاعلن مفاعلن

مثال۔ قفس میں یاد آگئیں تمہاری خوش بیانیاں
مگر کسے سناؤں میں یہ دکھ بھری کہانیاں

۱۰۔ بحر متدارک مثمن مخبون اخذ

ارکان۔ فعلن فعلن فعلن فع۔ فعلن فعلن فعلن فع

مثال۔ آئی گھٹا جب ساون کی اِک افسردہ دل ڈول اٹھا
جس میں دل کھل جاتے ہیں وہ برکھا کب ہوتی ہے

۱۱۔ بحر منسرح مثمن مطوی مکسوف

ارکان۔ مفتعلن فاعلن مفتعلن فاعلن

مثال۔ یار کو قاصد مرے جا کے اگر دیکھنا
میری طرف سے بھی تو اِک نظر دیکھنا

۱۲۔ بحر ہزج مثمن اخرب سالم

ارکان۔ مفعول مفاعیلن مفعول مفاعیلن

مثال۔ لے جائے کہاں وحشت اب مجھ کو خدا جانے
اِک سمت گلستاں ہیں اِک سمت ہیں ویرانے

۱۳۔ بحر متقارب مثمن مقبوض اثلم

ارکان۔ مفعول فعلن مفعول فعلن مفعول فعلن مفعول فعلن

مثال۔ نوید راحت نہیں ملے گی یہ ناامیدی پکارتی ہے
امید لیکن یہ کہہ رہی ہے ابھی ملے گی ابھی ملے گی

۱۴۔ بحر ہزج مثمن اشتر سالم

ارکان۔ فاعلن مفاعیلن فاعلن مفاعیلن

مثال۔ عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا
درد کی دوا پائی دردِ لادوا پایا

۱۵۔ بحر مدید مثمن سالم۔

ارکان۔ فاعلاتن فاعلن فاعلاتن فاعلن

مثال۔ ہجر میں یہ حال ہے زیست کی صورت نہیں
آ دَجائی اب ہمیں طاقتِ فرقت نہیں

دیدہ بھیگے رہو مسکراتے رہو
بزم کو بزمِ جم بھی سجاتے رہو
رونقِ میکدہ بھی بڑھاتے رہو
اپنے مذہب کے دامن میں [illegible]
مفتیٔ دوراں کو بھی گدگداتے رہو

واقف صاحب وہ رنگ دکھا گئے جس کا آپ سے تقاضا تھا آپ جا رہے ہیں اور قمر صاحب ایک نوعمر مترنم شاعر عبدالحق سحر مظفرنگری کو یاد فرما رہے ہیں سحر صاحب بڑی دل کشی سے غزل سرا ہیں ــ

کبھی جب کی آتش [illegible] کی روانی
بہت مختصر ہو گئی ہے کہانی
ہمیں لانے سے تھے میکدہ پر جوانی
ہمارے ہی حصے میں ہے آج پانی

سحر صاحب داد پا کر چلے گئے اور اب قمر صاحب مشہور غزل گو شاعر کمال جائسی کو دعوتِ سخن دے رہے ہیں کمال صاحب یوں اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے ہیں ــ

کبھی رخصت جو ترے خیال کی انجمن سے چلی گئی
تو بہارِ حسنِ کلام بھی مرے شعر و فن سے چلی گئی

داد کا شور کم ہوا تو کمال صاحب ایک شعر توصیف صاحب کی نذر کر رہے ہیں اس پر علامہ صاحب فرما رہے ہیں برابر کے معرکے ہیں دونوں اس فنِ مذاق میں کمال صاحب ایک رہے ہیں ــ

تو کرم سے رنگِ ستم نہ دے نہ بدل سکے گا جنوں مرا
وہ ادائے عہدِ وفا جو تھی ترے پیرہن سے چلی گئی

کمال صاحب داد وصول کئے بیٹھ رہے ہیں اور قمر صاحب ذائقہ بدلنے کے لئے مقرب حسین مقرب کو دعوتِ طنز و مزاح دے رہے ہیں مقرب صاحب سبزی والا اور مولانا ایک طویل نظم سنا کر داد سے غریب محفل کو قہقہوں میں ڈبو کر مائک سے جدا ہو رہے ہیں۔ اور آپ کے ساتھ ہی محترم صدر صاحب بھی تشریف لے جا رہے ہیں اور اب صدارت کے لئے مسٹر نرلشی صاحب کا نام نامی پیش کیا جا رہا ہے۔ قمر صاحب پھر اسی غزل کی شمع لئے ہوئے ہیں اور [illegible] کو پیش کر رہے ہیں [illegible] صاحب یوں حقِ ترنم ادا کر رہے ہیں ــ

نہ بنا سکے گا اپنا کوئی مستقل ٹھکانہ
وہ غریب جس کی قسمت نہ قفس نہ آشیانہ

داد کا پہلی بار یہ عالم ہوا ہے کئی بار دہرا کر اسی رنگ و ڈھنگ سے ہر کوئی

اسے کہتے ہیں مقدر یہی چیز ہے بہانہ
میں لگا جو سانس لینے وہیں رہ گیا زمانہ
یہ جنوں نہیں تو کیا ہے کہ زمیں پہ انگلیوں سے
مرا نام خود ہی لکھنا مرا نام خود مٹانا [1]

پھر دادِ شباب پر ہے اور سکندر حیات [illegible] رہے ہیں مسروقہ مصرع ہے اور طرفی صاحب محفل کو گرما کر شاداں ہو رہے ہیں اور پھر محفل کا رنگ بدلنے کے لئے سردار سرجن موہن لدھیانوی کو آواز دے رہے ہیں ــ

میرے آگے گھر مرے سینہ سے
کاش وہ جانِ آرزو لگ جائے
اور پھر حفظِ امن کی خاطر
ساٹھ گھنٹے کا کرفیو لگ جائے

ایک طرفہ بازی اور ہنگامہ سا ہنگامہ ہے یہ شور خوشگوار کم ہو ارشاد ہوا ہے ــ

کار اُس بت کی اڑی تختِ سلیماں ہو کر
ہم کھڑے رہ گئے انگشت بدنداں ہو کر
نہ رہی تن پہ لنگوٹی بھی تری الفت میں
رشکِ گاندھی ہوئے ہم بے سر و ساماں ہو کر

آپ محفل کو قہقہہ زار بنا کر داد وصول کئے اپنی جگہ آ رہے ہیں [illegible] صاحب اسی رنگ کو برقرار رکھنے کے لئے چاند بدایونی کو دعوتِ غزل دے رہے ہیں۔ چاند صاحب فرما رہے ہیں ــ

ہو گیا ختم مرا گھنڈی سڑک کا جانا
میں نے جب سے ترے کوچے کی ہوا کھائی ہے
اے ذرہ جس نے تراشے ہیں ترے پیچھے
کھوپڑی میں نے اسی نائی سے گھٹوائی ہے

واہ واہ کا ایک پنڈال شکن شور ہے۔ اب آپ چاروں طرف کو تسلیم بجا لا رہے ہیں اور [illegible]

[1] مسروقہ ترمیم کا [illegible] (ایڈیٹر)

عشق چھوتی ہے حسن ہاتھی ہے
قبلہ پلے وہ گا ہو گا یہ دلیل
چوزہ کے سیڑھی پہ بات کرتا ہیں
ان کا قد ہے کہ ریل کا سگنل

ماہر صاحب محفل کو ہنسی بازی پہ آمادہ کر شادان پلٹ رہے ہیں اور قمر صاحب اس ہنسی بازی کو فروکش کرنے کے لئے مشہور ترنم اور نغز گو شاعر ڈاکٹر ساغر اعظمی کو دعوت نغمگی دے رہے ہیں ساغر صاحب تالیوں کی جھنکار میں آکر غزل سرا ہیں ؎

وہ دھوپ ہی بہتر تھی اس چھاؤں گھنیری سے
وہ جسم جلاتی تھی یہ جان جلائے ہے
وہ گھر نہ بھلا کیوں کر آسیب زدہ ہوگا
جس گھر میں کبھی کوئی آئے ہے نہ جائے ہے

داد لفظ عروج سے ہو ا ہے اور آپ اسی سج دھج سے بہک رہے ہیں ؎

جب آپ نہیں آتے پھر کس کی یہ پرچھائی
ہر شب مرے کمرے میں مجھ کو نظر آئے ہے

ساغر صاحب ایک دوسری پرانی غزل سنا کر کامراں آ رہے ہیں اور قمر صاحب ایک منفرد غزل گو شاعر واقف اندوری کو یاد فرما رہے ہیں۔ واقف صاحب تالیوں کے شور میں یوں گرج اور برس رہے ہیں ؎

کشتیاں موجوں میں طوفان میں لنگر ڈوبے
ہم بچے تھے تو کنارے پہ پہنچ کر ڈوبے
میں تو قطرہ تھا نظر کیسے ملاتا ان سے
ایسی آنکھیں کہ سمندر کے سمندر ڈوبے

[illegible] بھی دل کھول کر دی جا رہی ہے اور پھر محفل کو گرما رہے ہیں ؎

جب میں دنیا کے لئے بیچ کے گھر آیا تھا
ان دنوں بھی مرے حصے میں صفر آیا تھا
لوگ ملتے گئے درختوں کو خدا کہنے لگے
میں [illegible] کو [illegible] کیا تھا

[illegible] آپ [illegible] رہے ہیں ؎

ہاں مری عمر توجیہ سو برس ہے لیکن
[illegible] میں کئی بار ادھر آیا تھا

اب داد دینے والے بھی بے حال ہو چلے ہیں۔ یہ اہل علم کی محفل اور شہر ادب ہے۔ داد بیداد ہو کر رہ گئی ہے۔ آپ تالیوں کے شور میں اپنی جگہ آ رہے ہیں اور عادل لکھنوی رواں دواں ہنستا کر چلتے بنے۔ آئیے پھر ایک بار ایک شگفتہ غزل نظر اطہوی سے سنئے ؎

ہونٹوں پہ خوشی ہے آنکھوں میں اداسی ہے
اب ان کی طرح مجھ سے قسمت بھی خفا سی ہے

دوسرے مصرعہ پر آہ اور واہ کا ایک دھماکہ ہوا ہے اور آپ اسی بانکپن سے غزل سرا ہیں ؎

تکرار کی گنجائش کب عرض طلب میں تھی
جو تم نے بڑھا دی ہے وہ بات ذرا سی ہے
اس شہر کے [illegible] باتوں میں نہ آ جانا
اس شہر کے لوگوں کی ہر بات سیاسی ہے

نظر صاحب خوب خوب داد تحسین پا کر اپنی جگہ آ رہے ہیں اور قمر صاحب کرگس سہسوانی کو دعوت غزل دے رہے ہیں کرگس صاحب فرما رہے ہیں ؎

آیا جو دیوبند کا پڑھنے مشاعرہ
مونہہ میں ایک اچھی فضیلت گئی
ایسا مزے میں مست ہوا کچھ نہ پوچھئے
[illegible] کھلا کہ مری جیب کٹ گئی

کرگس صاحب ایک طویل نظم سنا کر محفل کو قہقہوں سے بہار کر چلتے بنے اور قمر صاحب رنگ محفل بدلنے کے لئے [illegible] کو دعوت نغمگی دے رہے ہیں [illegible] غزل سرا ہیں ؎

میرے خواب وحشت کی جانے کیا ہوں تعبیریں
دار ہے زنداں طوق ہے نہ زنجیریں
لوگ جانے کیوں اس کو [illegible] ہیں دیوانہ
[illegible] کی [illegible] ہے تصویریں

[illegible] صاحب [illegible] ترنم کی [illegible] صاحب [illegible] بھارتی کو دعوت غزل دے رہے ہیں بھارتی صاحب [illegible] سنا کر محفل کو [illegible] جا رہے ہیں [illegible]

سے خدا [illegible] قمر صاحب نہ میرے [illegible] غزل نہیں مل سکی (ایڈیٹر)

پنجاب سے چراغ جلا کر دکھائیے

ادھر محفل کا رنگ بدلنے کے لئے مشہور مترنم شاعر راز الٰہ آبادی کو دعوتِ سخن دی جا رہی ہے۔ راز صاحب ہونٹ نے ترنم سے غزل سرا ہیں ؎

وہ زلف جو بکھری ہے ممکن ہے سنور جائے
اب گردشِ دوراں سے کہہ دو کہ ٹھہر جائے
عکس رخِ جاناں آنکھوں میں لئے رکھو ہوں
بیٹھا ہوں دعا ہے کہ کس گھر میں اتر جائے

ادھر کالیکٹ دھاکہ ہوا ہے دیکھا تو شکی علیگڈھی ادھر شکی کاظمی خواہ مخواہ مصرعوں اور شعروں پر بحث کرتے بیٹھے رہے ہیں ان کی علمیت اور اصلاحوں سے ہم محروم ہی ہوں اسے چھوڑیئے توشی کاظمی صاحب اکثر مشاعروں میں اس قسم کا مظاہرہ کیوں کرتے رہتے ہیں۔ راز صاحب فرما رہے ہیں ؎

ہم کوچۂ قاتل میں کچھ سوچ کے بیٹھے ہیں
اب فکر نہیں اس کی دل جائے یا سر جائے

راز صاحب محفل کو گرما کر مائک چھوڑ رہے ہیں۔ اور نمبر صاحب آنند سروپ بجشاگر راز بلند شہری کو پکار رہے ہیں راز صاحب رواں دواں سنا کر چلتے بنے۔ قمر صاحب اکبر آباد کے نظیر ثانی عالم فتح پوری سے درخواست کلام کر رہے ہیں عالم صاحب یوں گرج اور برس رہے ہیں ؎

ایسا قاتل ہاتھ میں جس کے خنجر کل تلوار لگے
ایسا مسیحا آنکھ جس کی دیکھو تو بیمار لگے
وقت حاضر کے انسان کی ہستی بے صورت کچھ
پھول لگے گر دور سے دیکھو پاس سے دیکھو خار لگے
عرض طلب پر کتنا معنی خیز ہے ان کا جواب
بے سمجھے اقرار لگے ہے سوچو تو انکار لگے

عالم صاحب خوب خوب محفل کو گرما کر شاداں مائک چھوڑ رہے ہیں اور قمر صاحب ایک ابھرتے خوش فکر غزل گو شاعر جگدیش رام پوری کو یاد فرما رہے ہیں مرتاج صاحب یوں غزل سرا ہیں ؎

گھر کا اندر وازہ کھلا چھوڑ دیا میں نے
شاید آ جائے کبھی روٹھ کے جانے والا

داد کا شور کم ہوا تو راز شادانی بجا ہے ؎

اے مرے دوست تری بندہ نوازی کو سلام
شہر میں ہے تو کوئی دل کو دکھانے والا

پھر داد کا عالم نہ پوچھئے اور موج صاحب تشنگی بڑھا کر اور محفل سے کام لے کر چلتے بنے اور قمر صاحب درخواست کلام کر رہے ہیں جانِ غزل کرشن بہاری نور لکھنوی سے۔ نور صاحب کا مائک پر آنا سے خیر مقدم ہو رہا ہے۔ اور آپ عطا کر رہے ہیں ؎

یہ حقوق اور فرائض کی یہ کیسی تقسیم
چند قطروں کے لئے سارا سمندر جاگے
مقصد نیت ہو کچھ بھی یہ سزا لگتی ہے
روح خوابیدہ ہے جسم برابر جاگے
کس کو آرام کی خواہش نہیں اور مان نہیں
میں بھی سو لوں کہ ذرا میرا مقدر جاگے
ہم ہی تنہا نہ ہوئے ترکِ تعلق کے بعد
[۴] تو وہ خود بھی مری نیند اڑا کر جاگے

نور صاحب محفل کو لوٹ کر شاداں و فرحاں جا رہے ہیں۔ اور قمر صاحب ایک اور ابھرتے اور انقلابی شاعر شباب میرٹھی کو یاد فرما رہے ہیں۔ شباب صاحب لہرا رہے ہیں ؎

کچھ لوگ جن کے پاس چراغوں کے ڈھیر ہیں
وہ لوگ ڈھونڈتے ہیں بہت لمبی رات ہو
کھلتی نہیں ہیں جب تو مکانوں کی کھڑکیاں
[۵] اس شہر میں برات ہو یا واردات ہو

داد کا ایک ہنگامہ ہے اور آپ اسی دلکشی سے فرما رہے ہیں ؎

کل ریت جن کے پاؤں کے نیچے کھسک گئی اس کو بھی ہوتے تو زمانہ گزر گیا
خنجر کی پیاس تازہ ہو سے بجھانے
اس کو مرے ہوئے تو زمانہ گزر گیا
اب تو ہر ایک شخص سے ... رہتے
میں نے بھی آج آئینہ دیکھا تو ڈر گیا

---

[۳] اگر کوئی نہیں ملا نہ مجھے ... (ایڈیٹر)

[۴] کریم صاحب معاف فرمائیے ... (ایڈیٹر)

[۵] اگر چراغوں کے ڈھیر ... (ایڈیٹر)

شباب صاحب داد و تحسین پاکر اپنی جگہ آ رہے ہیں۔ اور قمر صاحب نسیم میرٹھی کو یاد فرما رہے ہیں نسیم صاحب غزل سرا ہیں ؎

خدا جانتا ہے کہ تجھ سے بچھڑ کر
کہاں دن کٹے گا کہاں رات ہو گی
مجھے کیا خبر تھی کہ محفل میں تیری
زباں کھولنا بھی بڑی بات ہو گی

نسیم صاحب بھی داد وصول کیے چلتے بنے اور نابینا شاعر تمکین قریشی رواں دواں سنا کر چلتے بنے دیکھا تو عرشی علیگڈھی فرما رہے ہیں ؎

ٹی۔ بی ہو کینسر ہو کہ نزلہ زکام ہو
ہو کوئی لاعلاج مرض اتنا کیجیے
ہو گی شفا ہر ایک کو بحکم مرارجی
چھ اونس اٹھ کے صبح کو پیشاب پیجیے

ایک غل غپاڑہ ہے اور آپ فرما رہے ہیں ؎

پرانے ہو گئے رخصت بفیض نسبندی
مقام ان کو ملا ہے جو تم بھی پاؤ گے
میں جوتشی تو نہیں ہوں مگر یہ دعویٰ ہے
شراب بندی کے چکر میں تم بھی جاؤ گے ١؎

عرشی صاحب محفل کو زعفران زار بنا کر اپنی جگہ آ رہے ہیں اور قمر صاحب سلیم سہارنپوری کو دعوت موسیقی دے رہے ہیں۔ سلیم صاحب نے آتے ہی غزل کا پہلا مصرعہ کچھ اس انداز سے الاپا کہ گلا اور سانس ساتھ نہ دے سکا پانی بھی پیا مگر بات نہ بنی اور چپ چاپ الٹے پاؤں پلٹ آئے میں نے کہا بھی دوسری غزل سناؤ۔ لیکن وہ اب بوکھلا گئے تھے کیا پرلطف بات ہے کہ ایسے مترنم شاعر اپنی ہر غزل کا ترنم پہلے ہی سیٹ کیے رکھتے ہیں اور وقت پر صاف اڑ جاتے ہیں کئی دن کی محنت شاقہ ریت کی دیوار ثابت ہوتی ہے۔ آیئے پھر ایک لہجہ ایک انداز ایک منفرد غزل حفیظ میرٹھی سے سنیے ؎

آباد رہیں گے ویرانے شاداب رہیں گی زنجیریں
جب تک دیوانے زندہ ہیں پھولیں گی پھلیں گی زنجیریں
آزادی کا دروازہ بھی خود ہی کھولیں گی زنجیریں
ٹکڑے ٹکڑے ہو جائینگی خود ہی کھولینگی زنجیریں
لب سب کے سل جائینگے ہاتھوں سے قلم چھن جائینگے
باطل سے لوہا لینے کا اعلان کریں گی زنجیریں
اندھوں بہروں کی نگری میں یوں کون توجہ کرتا ہے
ماحول سنے گا دیکھے گا جس وقت بجیں گی زنجیریں
جو زنجیروں سے باہر ہے آزاد انہیں بھی مت سمجھو
جب ہاتھ کٹیں گے ظالم کے اس وقت کٹیں گی زنجیریں
زنجیریں تو ہٹ جائیں گی ہاں ان کے نشاں رہ جائینگے
میرا کیا ہے ظالم تجھ کو بدنام کریں گی زنجیریں

حفیظ صاحب محفل کو انقلاب کے موڑ پر لا کر تالیوں کے ہنگامہ شور میں اپنی جگہ پلٹ رہے ہیں اور اس عالم میں خالد قمر بچھرایونی غزل سرا ہیں ؎

کیوں ہم پہ تعجب ہے کل پی کے جو ہم بہکے
ہم سے تو سوا شاید ارباب حرم بہکے
مجرم ہیں مگر ہم بھی تنہا تو نہیں مجرم
پہلے وہ نظر بہکی پھر اپنے قدم بہکے

قمر صاحب داد وصول کیے جا رہے ہیں اور قمر صاحب درخواست کلام کر رہے ہیں مولانا شاہین جمالی سے۔ ارشاد ہوا ہے ؎

چند تنکے جو بگولوں کی بدولت اڑ کر
رفعت چرخ پہ لہرانے میں اتراتے ہیں
یہ بلندی ہے بس ایک پل کا تماشا اے دوست
رخ ہوا کا جو بدل جائے تو گر جاتے ہیں

مولانا شاہین داد وصول کیے جا رہے ہیں اور اب مجھ سے بھی ایک مطلع سن لیجیے گا ؎

فصیل شہر سے کیوں رہبروں پہ پتھراؤ
یہ راہزن تو نہیں ان پہ پھول برساؤ

آیئے صہبا ادیب بچھرایونی سے یہ حسین شعر سنیے ؎

چشم ساقی میں ہیں ایوار کے پیکر کتنے
اور ہر قطرے کے سینے میں ہیں خنجر کتنے
[illegible] نہ رہے گا شکوہ
جب یہ سوچوں کا کہ دنیا [illegible]

١؎ کیا زمانہ آگیا ہے غیر مسلم وزیر اعظم شراب بندی چاہتا ہے لیکن ایک مسلمان شراب بندی کے خلاف ہے۔ ایسی شاعری پر ہزار لعنت۔ (ایڈیٹر)

وجیہ صاحب داد دیتے جاتے تھے اور اب مشہور قلندر شاعر رشید قمر لکھنوی صاحب گلو خلاصی کر کے مائک سے جدا ہو کر دولت سام بلاغت نظام فرما رہے ہیں حضرت علامہ انور صابری صاحب قبلہ سے جب علامہ صاحب عطا کر رہے ہیں سے

بظاہر اُجالے بباطن اندھیرے
لباس رفیق سفر میں لٹیرے
خدا کے لئے ان سے بچ کر گزرنا
یہ اہل سیاست نہ تیرے نہ میرے

ہر چند کہ علامہ صاحب کا وہ مطلع گونجانے والا ترنم نہیں ہے پھر بھی کتنے ہی متشاعروں اور گلوکار شاعروں پر بھاری ہے ارشاد ہوا ہے سے

روح احساس مسرت سے بھی گھبرانے لگی
زندگی کی آخری منزل قریب آنے لگی

اِدھر اُدھر یہاں وہاں ہیں بجلیاں ہی بجلیاں
چمن چمن کہاں پھروں میں آشیاں لئے ہوئے
آ گئے سب شاعر و فنکار میرے شہر میں
بڑھ گیا اُردو کا اب معیار میرے شہر میں

علامہ صاحب کے ساتھ ہی پہلا دور ۳ بجے ختم ہو رہا ہے اور ساتھ ہی فرمائشیں شروع ہو گئی ہیں اس دور میں کئی شاعروں کو خوب خوب سنا گیا دیر تک یہ دور چلتا رہا۔

امسال مشاعرہ میں شعراء کرام والا تبار کی ایک کھیپ بن بلائے اسٹیج پر پہونچ کر منتظمین مشاعرہ کے لئے دیر تک درد سر بنے رہے اور آخر تک مجبور کرتے اور لمبے چوڑے سفارشی خطوط ان کو دباتے رہے گویا اسٹور خیر میں بن بلائے احمق پھوہڑی آتے رہے اس طرح آنے والے جہلاء اور نمائشی متشاعروں نے یہ تک نہیں سوچا کہ اساتذۂ کرام اور مشاہیر کے بعد اب ان کا سُننا حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔ اِدھر قبلہ رشید صاحب جز بز ہو کر رہ جاتے تھے۔ جب ان کی نظامت میں کسی صاحب کا پرچہ کسی صاحب کے نام کی چٹ پہونچی اور وہ بھی خندہ پیشانی سے ان صاحب بلاؤں کو فہرست میں درج فرماتے رہے۔ کیا ضرورت ہے کہ ہر شاعر بن بلائے آکر مشاعرہ کے منتظمین کو مجبور اور پریشان کیا جائے کہ وہ ضرور پڑھے گا۔ کیوں ضرور پڑھے گا؟ یہ ذرا اس سے ہی دریافت کیا جائے اس سے اگر پوچھا جائے کہ حضور والا کو مدعو کیا ہے؟ کوئی دعوت نامہ بھیجا ہے۔ سرکار عالیجاہ کی خدمت عالیہ میں ہے؟ شعراء کی فہرست میں جناب والا کا نام ہے؟ تو یقیناً اس شاعر خود پسند کے پاس کوئی جواب نہ ہوگا۔ کیا اس طرح ایک اچھے مشاعرہ کو خراب کرنا یا بدنظمی پیدا کرانا ایسے ہی بے ادب شعراء کی حماقت نہ کہیں گے ط

شرم ان کو مگر نہیں آتی

ہر سال مشاعرہ کو کامیاب کرانے میں جناب توصیف صاحب مولانا اعجاز قاسمی صاحب خصوصی دلچسپی لیتے ہیں اور پورے ایک ماہ تک مراسلات میں منہمک رہتے ہیں۔ اس طرح بابائے دیوبند محترم مولانا [illegible] صاحب فنیلہ ایم۔ ایل۔ اے بنفس نفیس مشاعرہ میں شرکت فرما کر مشاعرہ کے ہر کام پر کڑی نظر رکھتے ہیں اور ہدایات جاری فرماتے رہتے ہیں۔ سب حضرات مبارکباد کے مستحق ہیں کہ وہ میلہ میں ہر سال ایک کامیاب آل انڈیا مشاعرہ کرا کر اہل دیوبند اور ضلع کے ادب نواز حضرات کو روحانی اور علمی غذا بہم پہونچاتے ہیں۔ اچھا اب میں چلا خدا حافظ! میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں۔

بقیہ صفحہ ۲۶ سے آگے

مجسمہ بے جان نہ ہوتا۔ کبھی کبھی وہ سوچتا کہ بظاہر مہذب اور ایڈوانس سوسائٹی کے لوگ بھی شک اور بد اخلاقی کے گہرے غار میں کس قدر دھنس چکے ہیں آج اگر تھوڑی سی بھی واقفیت پر کسی لڑکی کو بہن یا لڑکے کو بھائی کہہ دیا جاتا ہے تو لوگ فوراً سے پیشتر کہہ دیتے ہیں ——— "آج کل یہی دستور ہو گیا ہے عشق کا ——— آج کل وہ پہچی لوگوں کی آنکھوں میں دھول ڈالنے کے لئے ہی ڈرامہ کھیلتے ہیں" اور جنہیں معلوم کیا کیا کہہ دیتے ہیں۔ یہ ماڈرن سوسائٹی کے شریف لوگ ———!

(سیف و قلم کا ایک ورق)

انگریز اور ہندوستانی

(مرحوم سردار دیوان سنگھ مفتون
ایڈیٹر "ریاست" دہلی۔)

میں لکھنؤ کے زمانہ قیام میں جب الہ آباد گیا اور وہاں تین چار روز تک مرحوم سید اکبر الہ آبادی کی خدمت میں ہر روز کئی کئی گھنٹے حاضری دینے اور باتیں کرنے کی مجھے سعادت نصیب ہوئی تو ایک روز مرحوم نے فرمایا۔

"روپیہ سے اتنی محبت کرو جتنی انگریز اپنے بیرے سے کرتا ہے۔ یعنی جب ضرورت ہو تو بوائے کہہ کر بیرے کو آواز دی اور بلا لیا۔ اور جب اس سے کام لے لیا گیا تو اس کو کمرے میں کھڑے رہنے کی بھی اجازت نہیں۔ کیونکہ انگریز بیرہ سے کام لیتا ہے اس سے محبت نہیں کرتا۔ اسی طرح روپیہ سے کام لو مگر اس سے محبت نہ کرو۔"

انگریزوں کے ہندوستانیوں سے کام لینے اور ان سے محبت نہ کرنے کے سلسلے میں چند واقعات سنئیے:۔

مرحوم قاضی سر عزیز الدین احمد ایک سیلف میڈ شخصیت تھے۔ آپ غالباً بطور نائب تحصیلدار سرکاری ملازمت میں شامل ہوئے۔ اس کے بعد تحصیلدار، ڈپٹی کلکٹر، کلکٹر اور پھر ریٹائر ہونے کے بعد دھولپور اور دتیا وغیرہ ریاستوں میں وزیر اعظم رہے اور یہ واقعہ ہے کہ نظام دکن، مہاراجہ پٹیالہ، مہاراجہ بیکانیر، اور نواب صاحب بہاولپور وغیرہ درجنوں والیان ریاست نے چاہا کہ آپ ان کے ہاں وزیر اعظم ہوں۔ مگر آپ نے انکار کر دیا کیونکہ آپ ان والیان ریاست کے گہرے اور ذاتی دوست تھے۔ اور دوستوں کے ہاں ملازمت کرنا غیر مناسب سمجھتے تھے۔ قاضی صاحب مرحوم کی اس ترقی کی وجہ کیا تھی صرف یہ کہ آپ بے حد محنتی تھے۔ صبح تین چار بجے جاگتے اور اپنے کام میں مصروف ہو جاتے۔ بے حد مخلص ہمدرد ایماندار، انگریزوں کے بے حد وفادار۔ میں اپنے تجربے سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اپنی زندگی میں ہندوستانیوں میں کوئی ایک بھی دوسرا شخص نہیں دیکھا جو قاضی صاحب مرحوم سے زیادہ انگریزوں کا مخلص اور بے ریا دوست ہو۔ مگر بعض انگریز ان کو ہندوستانی ہونے کے باعث کیا سمجھتے تھے اس کا اندازہ صرف اس واقعہ سے ہی کر لیجئے جو قاضی صاحب نے مجھے خود سنایا تھا۔

قاضی صاحب مراد آباد میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ جب وہاں کا کلکٹر جو انگریز اور انڈین سول سروس کا ایک ممبر تھا۔ تین ماہ کی رخصت پر لندن گیا تو آپ اس کی جگہ تین ماہ کے لئے قائم مقام کلکٹر مقرر ہوئے۔ اس انگریز نے جاتے ہوئے قاضی صاحب کو کام کا چارج دیا تو اس کے ساتھ ہی اپنی کوٹھی کی اس آہنی الماری کی چابیاں بھی دے دیں جن میں حکام کی سروس بکیں تھیں۔ (ان سروس بکوں میں سروس والے افسر کے متعلق ریمارک ہوا کرتے تھے جو سروس بک میں وقتاً فوقتاً لکھے جاتے تھے) اس انگریز افسر کو رخصت پر گئے اور قاضی صاحب کو کلکٹری کا چارج لئے ایک ماہ ہو گیا تو آپ کو خیال آیا کہ ان سروس بکوں میں بہا سروس بک تو دیکھیں کہ ان کے متعلق افسروں نے کیا کچھ لکھا ہے کیونکہ یہ الماری کا نفی ڈنشل تھی اسے کوئی دوسرا کھول نہیں سکتا تھا۔ اور نہ اس کے کاغذات دیکھ سکتا تھا۔ قاضی صاحب کو قائم مقام کلکٹر ہونے کے باعث اس کو دیکھنے کا موقع مل گیا تھا۔ قاضی صاحب نے جب اپنے متعلق کانفی ڈنشل فائل دیکھی تو اس میں بعض کلکٹروں اور کمشنروں نے تو آپ کی بہت تعریف کی تھی۔ اور اپنی ذاتی رائے لکھتے ہوئے قاضی صاحب کو نہایت نیک، انتہائی دیانتدار اور انگریزوں کا انتہائی مخلص [illegible] لکھا۔ مگر ایک کلکٹر نے ان کے متعلق لکھا تھا۔

"ویری کلیور، کننگ اینڈ فیتھ فل ڈاگ"
(بہت ہوشیار چالاک اور وفادار کتا)

قاضی صاحب نے بتایا کہ آپ نے اپنے متعلق جب یہ ریمارک دیکھے تو آپ کو بہت صدمہ ہوا کہ بعض انگریزوں کی ان کے متعلق کیا رائے ہے اور ان کے اخلاص اور وفاشعاری کے کیا معنی لئے جاتے ہیں۔ آپ صبر کر گئے کیونکہ انگریزوں کی ہندوستانیوں کے متعلق فی الحقیقت ایسی ہی رائے تھی۔ یہ حکمران قوم ہندوستانیوں سے کام لیتی تھی ان سے محبت نہ کرتی تھی۔

جنگ کا زمانہ تھا مسٹر سبھاس چندر بوس جاپانیوں کے ساتھ مل کر برما پہنچ چکے تھے۔ برما میں جاپانی افواج کا مقابلہ جنرل الگزینڈر کی کمان میں انگریزی افواج کر رہی تھیں جاپانیوں کے قدم بڑھتے چلے جاتے تھے، انڈمان کے جزیرے پر جاپانیوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ اور ہر لمحہ توقع تھی کہ جاپانیوں اور جرمنوں کے ہوائی جہاز کلکتہ اور مدراس پر حملہ کر کے ہندوستان کو میدان جنگ بنا دیں گے، چنانچہ دہلی کے چاندنی چوک اور دوسرے بازاروں میں پناہ کے لئے خندقیں کھودی جا چکی تھیں۔ اور دہلی سے باہر اونچے مقامات پر ہوائی جہازوں کو گرانے والی طیارہ شکن توپیں بھی نصب کر دی گئی تھیں، دہلی کے ڈپٹی کمشنر مسٹر لیرڈ نے دہلی کے مقامی رائے بہادروں کے دلوں کو ٹٹولنا شروع کیا کہ اگر انگریز مصیبت میں گرفتار ہوں تو سرکار کے ان وفاشعاروں سے کس حد تک امداد کی توقع کی جا سکتی ہے،

یہ رائے بہادر خان بہادر اور سردار بہادر ڈپٹی کمشنر کی خدمت میں حاضر ہوتے، کانگرسیوں سے نفرت کرتے ہوئے اپنی وفاشعاری اور انگریزوں کی مصیبت میں امداد کرنے کا یقین دلاتے۔ دہلی کے خطاب یافتہ انگریز پرست اور سرکردہ اصحاب سے انٹرویو کا سلسلہ جاری تھا۔ ایک ہمارے ([illegible]) رائے صاحب کو بھی طلب کرنے پر ڈپٹی کمشنر کی خدمت میں حاضر ہوئے اُن کے اور ڈپٹی کمشنر مسٹر لیرڈ کے درمیان یہ بات چیت ہوئی۔

مسٹر لیرڈ۔ ویل رائے بہادر صاحب ہندوستان پر جاپانی افواج کے حملے کا بہت بڑا خطرہ پیدا ہو چکا ہے، جاپانی برما اور انڈمان تک پہنچ چکے ہیں۔ اگر جاپان کی فوج نے ہندوستان پر حملہ کر دیا تو آپ ہماری کیا امداد کریں گے۔

رائے بہادر:۔ حضور ہم کیا امداد کر سکتے ہیں اور ہمارے بس میں بھی کیا ہے کہ ہم امداد کریں۔ ملک کانگریس کے ہاتھوں میں ہے، لوگ ہماری بات سننے کے لئے تیار نہیں، ہم تو زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتے ہیں کہ اپنی جائیداد گورنمنٹ کی نذر کر دیں۔

مسٹر لیرڈ:۔ ہم پوچھتا ہے کہ جاپان کی فوجیں ہندوستان پہنچ گئیں تو آپ کیا کرے گا۔

رائے بہادر:۔ حضور ہم کیا کرے گا۔ جیسے آپ کو سلام کرتا ہے، ویسے جاپانیوں کو سلام کرے گا۔ ہمارا کام تو سلام کرنا ہے۔

مسٹر لیرڈ نے جب رائے بہادر سے یہ الفاظ سنے تو اُن کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ ڈپٹی کمشنر کی پیشانی کے ان بلوں کو دیکھ کر اور یہ محسوس کرتے ہوئے کہ ڈپٹی کمشنر اس جواب سے ناراض ہیں۔ رائے بہادر نے کہا "حضور اصل بات تو یہی ہے جو میں نے آپ سے کہی نہ حضور ہندوستانیوں کے خیرخواہ ہیں اور نہ ہندوستانی انگریزوں کے، سب غرض کا سودا ہے۔ ویسے اگر کہیے تو میں بھی دوسرے خطاب یافتہ لوگوں کی طرح آپ سے جھوٹ کہہ دیتا ہوں"

مسٹر لیرڈ نے رائے بہادر سے یہ الفاظ سنے تو آپ نے انگریزوں کے بلند کیرکٹر کا ثبوت دیتے ہوئے رائے بہادر سے کہا:

"رائے بہادر صاحب ہم آپ کی صاف بیانی سے بہت خوش ہوں۔ اصل بات یہی ہے جو آپ نے اب کہی، ہم انگریز لوگ بھی آپ سے کام لیتا ہے۔ آپ سے محبت نہیں کرتا اور آپ لوگ بھی اپنے مطلب کے لئے ہمارے پاس آتا ہے"

ٹوٹی کڑیاں

بیدل سرحدی (رامپور)

پیارے دوست ... خوش رہو!

خط تمہارا ملا۔ تمہاری مانگ بھی عجیب سی ہوتی ہے۔ اور یہ کہانی والی مانگ تو بس....... بہرحال میں اس کی گہرائی میں نہیں جانا چاہتا کیونکہ تم ناراض ہو جاؤ گے اور میں بھلا اپنے اکلوتے دوست کی ناراضگی کیسے برداشت کر سکتا ہوں؟

دیکھو مجھے جس ماحول میں یہاں لکھنا پڑ رہا ہے وہ بہت ہی عجیب سا ہے۔ ماموں جی ٹھیک دس بجے بتی بند کرنے کا حکم صادر فرما دیتے ہیں جب کہ یہی وقت لکھنے لکھانے کا ہوتا ہے۔ اس لئے آج کل نوشت و خواند قریب قریب بالکل بند ہے۔ لیکن آج تمہاری خواہش سے مجبور ہو کر پڑوس والے بڑھئی سے التجا کی ہے۔ اور اب اس کی دوکان میں جہاں چاروں طرف لکڑیاں اور برادہ ہے برادے میں دھنسا بیٹھا ہوں۔ اور تمہیں لکھ رہا ہوں۔ تو آج میں تمہیں ایک نئی کہانی سناتا ہوں۔ یہ کہانی ایک زندہ حقیقت ہے۔ لیکن پھر بھی گمنام۔ لوگ مر جاتے ہیں مگر ان کی یاد امر ہو جاتی ہے۔ آج اگر کروڑوں نہیں تو لاکھوں انسان ایسے ضرور ہیں جن کی زندگیاں گمنامی کی غاروں میں سسک رہی ہیں۔ اور یہاں تک کہ جن کے مرنے کی کسی کو خبر تک نہیں ہوتی جنھیں لوگ جانتے ہوئے بھی نہیں پہچانتے۔ حالانکہ ان کی زندگیاں کڑی آزمائشوں سے نکلی ہوتی اور پُراز معلومات ہوتی ہیں۔ جو اپنے راز اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ ایسی شخصیات کے نقوش کبھی ابھریں بھی تو ہم انھیں حقیقت ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ اس کہانی کے کردار بھی کم و بیش انھیں میں سے ہیں۔ انہیں جاننے والے تو بہت ہوں گے مگر پہچاننے والا شاید ایک بھی نہ ہوگا۔ حالانکہ یہ آج کے انسان کی کہانی ہے

حسب معمول یہ کہانی عورت سے شروع ہوتی ہے اس عورت سے جس کا جوانی میں لوگ صرف ایک ہی رُخ دیکھتے ہیں یہاں تک کہ اکثر لوگ تو خود عورت تک سے پیار کرتے ہیں اور حسن و محبت کی حالت تو کم و بیش اس ناگن کی سی ہوتی ہے جس کے نام سے ہی لوگ دہشت زدہ ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ ہر ناگن زہریلی نہیں ہوتی۔ اور بعض تو ڈستی بھی نہیں۔ پھر بھی لوگ اس کا نام سن کر خوفزدہ ہو جاتے ہیں اس کہانی کی ہیروئن تارا کی بھی حالت کچھ ایسی ہی ہے۔ تارا ایک سادہ لڑکی تھی۔ اس نے ایک اونچے اور معزز گھرانے میں پرورش پائی تھی۔ اور اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی گو وہ غیر معمولی خوبصورت لڑکی نہیں تھی لیکن اس کے نقش و نگار اور ظاہری انداز اتنے متناسب تھے کہ اس میں غیر معمولی جنسی کشش پیدا ہو گئی تھی۔ اس کے تکلم و تبسم اور رفتار و کردار کی حسن آفرینی بڑے سے بڑے پرہیزگار کی نظروں کو سجدۂ احترام کرنے پر مجبور کر دیتی وہ ایسی آزاد خیال مگر مہذب لڑکی تھی جس کی ذات اور صفات پر فخر کیا جا سکتا تھا..... لیکن جیسے چاند کے پاس وہ سرمایہ ہے جسے لٹا کر وہ ساری دنیا کو فرحت بخشتا ہے اور پھر اپنے اسی نور سے قائم ہے تو بلاشبہ اس میں ایک داغ، ایک خلا بھی ہے۔ ایسا داغ، ایسی خلا جہاں کی چمک، جہاں کا سرمایہ وہ شاید کسی کو سونپ چکا ہے، کھو چکا ہے اسی طرح ایک وقت آیا جب تارا انسانی فطری جذبہ کے تحت اپنا دل کسی کو دے بیٹھی اسے ڈاکٹر شکیل سے محبت ہو گئی اور ایسی والہانہ محبت جس نے دونوں کو ایک اٹوٹ رشتے میں باندھ دیا۔

تارا کو ڈاکٹر شکیل کی بیوی ہونے کا فخر تھا۔ ویسے بھی کسی چیز کی کمی نہ تھی ——— رہنے کو بہترین کوٹھی، سیر و تفریح کے لئے بہترین کاریں، خدمت کے لئے نوکر چاکر، غرضیکہ دنیا کی ہر نعمت اسے حاصل تھی اور اب تو آنگن میں اس کے دل کے بہلانے کا سامان بھی ہو گیا تھا۔ اور وہ اپنا بیشتر وقت اپنے ننھے منے بچے کی دیکھ بھال میں گزارا کرتی تھی۔ اسے اپنے بچے کی صحت کا بہت خیال تھا۔ وہ خود وقت پر اسے دودھ دیتی وقت پر اس کی مالش کرتی اور خود ہی اسے نہلاتی دھلاتی تھی [illegible] کے دائرے میں محدود رہ جانے پر بھی وہ اپنی زندگی سے خوش تھی

اس کی وجہ یہی تھی کہ سوشیل فطری طور پر سنجیدہ اور کام کاج میں سخت مصروف رہنے کے باوجود تارا کا بہت خیال رکھتا تھا۔ اس سے ہنستا کھیلتا اور فرصت کا ہر لمحہ اس کے ساتھ گزارتا۔ غرضیکہ دونوں کی زندگی ایک پُرمسرت اور شادکام زندگی تھی۔

ایک دن چاند کی چودھویں کے پرکاش نے پُرسکون لہروں میں ایک ہلکا سا ہنگامہ پیدا کر دیا اور ایک اجنبی شخص آن کی زندگی میں آیا اور یہ تھا پرکاش! —— ایک متوسط اور معزز گھرانے کا خوبرو چشم ایک غیر معمولی جاذبِ نظر نوجوان، ایک فلسفی اور سادہ فطرت طالب علم پرکاش۔۔۔ پرکاش ایسی دل آویز عادات کا مالک تھا جس کے لئے اگر کہا جائے تو ایک حقیقت ہوگی کہ شاید ہی کوئی ایسی لڑکی ہو جس نے ایک مرتبہ پرکاش سے بات کرنے کے بعد اس میں گہری دلچسپی نہ لی ہو جس کے دل میں اس سے گھل مل جانے کے جذبات نہ مچل اٹھے ہوں جس نے یہ نہ چاہا ہو کہ وہ ہمیشہ کے لئے پرکاش کی ہو کر رہ جائے وہ لڑکیوں کو مقناطیس کی طرح کھینچ لیتا لیکن کسی کو اپنا نہ سکا۔ یہ واقعی ایک عجیب اتفاق تھا کہ جس لڑکی سے وہ ایک دفعہ ملتا اس سے دوبارہ نہ مل سکتا اور اگر اتفاقاً دوبارہ مل بھی جاتا تو اس کے دامِ الفت میں گرفتار نہ ہوتا کیونکہ اس کی ایک عجیب سی تمنا تھی وہ چاہتا تھا کہ دنیا کی ہر لڑکی اُسے چاہے، اُسے پسند کرے۔ اور ساتھ ہی ساتھ اس کی بلند کرداری کا بھی گن گائے اُس کی تمنا کرشن بھگوان کی طرح گوپیوں میں رہ کر بھی بااخلاق رہنے کی تھی۔ ویسے بھی اس کا کہنا تھا کہ وہ لڑکی جسے وہ اپنی رفیقۂ حیات بنا سکے اس نے آج تک نہیں دیکھی اور اس کے خوابوں کی شہزادی کاش کہ اس دنیا میں وجود ہی نہ ہو گو وہ خود بھی نہیں جانتا تھا کہ اُسے کس قسم کی لڑکی چاہئے؟ لیکن اُسے ہر لڑکی میں روحانی کمی معلوم ہوتی تھی۔

جوں جوں پرکاش تارا کے قریب آنے لگا اُسے اُس میں وہ صفات محسوس ہونے لگیں جو اس کے ارمان مدت سے ہر جگہ تلاش کر چکے تھے۔ لیکن تارا شادی شدہ ہی نہیں ماں بھی تھی ——— ہاں!! پرکاش کو تارا سے بے پناہ محبت ہو گئی

لیکن اس محبت میں ہوس نہ تھی۔ پرکاش کے دل میں ایک دفعہ بھی یہ خیال نہ آیا کہ کاش تارا میری رفیقۂ حیات ہوسکے اسے تو ان تمام اوصاف رکھنے والی عورت کی ضرورت تھی ایک دیوی کی ضرورت تھی اور وہ خوش تھا۔ یہاں اس بات کی وضاحت کوئی خاص معنی نہیں رکھتی کہ تارا کو بھی پرکاش کی روحانی .... کشش نے کھینچ لیا تھا۔ تارا کو بھی پرکاش سے پیار ہو گیا تھا لیکن ہوس سے بالاتر ٹھیک ایسے ہی جیسے کبھی کبھی ایک ماں کو اپنے پتی سے زیادہ بیٹے سے ہوتا ہے اور بہن کو اپنے پتی سے زیادہ اپنے بھائی سے .... وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر ایک عجیب سی روحانی خوشی محسوس کرتے اور چاہتے کہ زیادہ سے زیادہ دیر تک ایک دوسرے کے قریب رہیں اور خصوصاً پرکاش تو اس میں کھو کر رہ گیا تھا۔ وہ جب اسے سفید کپڑوں میں ملبوس دیکھتا تو اُسے تارا کے پیکر میں ایک پاک روح نظر آتی اُسے ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہو اور خواب میں یہ روح جنت کی تمام مسرتیں لئے اس کے پاس آئی ہو۔ وہ اس سے لپٹ جانا چاہتا لیکن یکایک اسے خیال آتا کہ جس کی وہ پرستش کرتا ہے وہ فقط روح ہے اور روح سے لپٹا نہیں جا سکتا۔

ادھر کچھ دنوں سے ڈاکٹر سشیل کی جائزہ لینے والی تیکھی اور مشکوک نظروں کی تاب نہ لا کر تارا سہم سہم جاتی اور بتدریج ذہنی تذبذب اور تشکیک کا شکار ہوتی جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ تمیز نرہوتے ہوئے بھی پتھر بنتی جا رہی تھی۔ بدلے ہوئے ماحول اور حالات نے پرکاش کو بھی پتھر بنا دیا۔ وہ بھی گم صم رہنے لگا تھا۔ منہ میں زبان رکھتے ہوئے بھی کچھ نہ کہہ سکتا تھا۔ سینے میں دل اور دل میں پاک امنگیں رکھتے ہوئے بھی کچھ نہ کہہ سکتا تھا۔ جب بھی اس کے تصورات تخیل کے بھنور میں پھنس کر رہ جاتے تو وہ سوچتا کہ وہ اپنا سر اس بے داغ روح کی آغوش میں چھپا کر خوب روئے اور اس لئے روئے کہ ...... کاش تارا پتھر کا بت ہوتی تاکہ وہ بلاخوف اسے دیوی تو کہہ سکتا مگر ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی سوچتا کہ اگر تارا پتھر کی دیوی ہوتی تو بھی روتا۔ کہ کاش یہ مورتی

باقی صفحہ ۔۔ پر

گوشۂ عقیل

نعتیہ طرحی مشاعرہ نصیر آباد

(صلاح الدین غازی سکریٹری بزمِ انور نصیر آباد)

دفتر شانِ ہند میں کسی شاعر کے نعتیہ کلام کا مجموعہ تبصرہ کی غرض سے موصول ہوا تو حضرت علامہ محمد عشق آبادی مرحوم سے گزارش کی گئی کہ اس مجموعہ پر تبصرہ فرمادیں انہوں نے مجموعہ کو سرسری نظر سے دیکھا اور فرمایا کہ کلام میں فنی اسقام کی بھرمار ہے۔ اور مثال کے طور پر پندرہ بیس اشعار کے فنی اسقام کی نشان دہی کرتے ہوئے اس نعتیہ مجموعہ پر تبصرہ لکھ دیا۔ دفتر شانِ ہند سے گھر جاتے ہوئے بس پر چڑھتے ہوئے گرے اور دایاں ہاتھ ایسا متاثر ہوا کہ مہینوں تک بیمار رہا۔ گھر پہنچ کر فون پر فرمایا کہ سرور صاحب وہ تبصرہ شائع نہ کرنا۔ شاعر نے جس قلبی خضوع و خشوع سے رسولِ اکرمؐ کی شان میں اشعار کہے تھے میں نے اس کی دلی کیفیت اور جوشِ عقیدت کا دھیان نہ رکھا اور فنی اسقام دیکھتا رہا۔ جس کی سزا مجھے یہ ملی ہے کہ میرا دایاں ہاتھ لکھنے سے ہی جاتا رہا ہے چنانچہ اس نعتیہ مشاعرہ کو محض اس عقیدت سے شائع کیا جا رہا ہے کہ یہ مشاعرہ سیرتِ پاک کے سلسلے میں منعقد ہوا شعرائے کرام کے دلی جذبات کی قدر کی گئی ہے۔ اسلئے قارئین کرام سے گزارش ہے کہ وہ شعراء کے نعتیہ کلام میں فنی اسقام کی طرف توجہ نہ دیں۔ (سرور تونسوی)

آج ۸ / مارچ بروز ہفتہ ناگوری محلہ چوک، نصیر آباد میں، بزمِ انور کے زیرِ اہتمام بھوپال سے آئے ہوئے خصوصی مہمان حضرت مولانا ایس۔ نورالدین صاحب انور بھوپالی کی صدارت میں ایک عظیم الشان طرحی نعتیہ مشاعرہ منعقد ہو رہا ہے۔

چونکہ طرحی مشاعروں میں بحر اور قافیہ پیمائی کی یکسانیت سامعین کو بور کر دیتی ہے اس لئے اس مشاعرے میں کچھ جدت سے کام لے کر مصرعِ طرح کی جگہ مختلف بحور کے اوزان بطور طرح دیئے گئے ہیں تاکہ سامعین کو رنگا رنگ کلام سننے کو ملے۔

(۱) مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن (۲) فعلن فعلن فعلن فعلن (مثمن یا مثمن زدہ رکھی) (۳) مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن

اس اجازت کے ساتھ کہ شعراء حضرات ان میں سے کسی ایک وزن پر طبع آزمائی فرمائیں گے۔ نیز اپنی پسند کا ردیف قافیہ از خود منتخب کر کے اختیار کریں۔

خواجہ معین الدین سلطان الہند حضور غریب نواز نور اللہ مرقدہ کی آرام گاہ، اجمیر شریف کے پڑوس میں (صرف ۲۴ میل کے فاصلے اور ایک گھنٹے کی مسافت پر) نصیر آباد (راجستھان) پچیس ہزار آبادی کی ایک چھوٹی سی بستی اور فوجی چھاؤنی ہے۔ یہاں اردو داں طبقہ ایک بہت ہی محدود دائرے میں ہے فوجی چھاؤنی اور شعر و نغمہ دو متضاد چیزیں ہوتے ہوئے بھی ۸ / مارچ کا یہ طرحی نعتیہ مشاعرہ بہت کامیاب رہا۔ یہ کسی معجزہ سے کم نہیں ــــ سامعین کی تعداد اور ان کی مشاعرہ سے دلچسپی اردو زبان کی ہر دلعزیزی اور لافانیت کا ثبوت ہے۔

ناگوری محلہ چوک میں رنگین شامیانوں سے نہایت خوبصورت پنڈال بنایا گیا ہے جس میں معزز مہمان اور شعراء کے لئے کافی وسیع اسٹیج بنایا گیا ہے جس پر سفید چاندنیاں بچھی ہوئی ہیں گاؤ تکیے لگے ہوتے ہیں۔ شامیانے کے اندر اور باہر صد ہا رنگ برنگ بتی قمقمے جگمگا رہے ہیں۔ جابجا ٹیوب لائٹ روشن ہیں گلدان اور طغرے قرینے سے سجائے گئے ہیں۔ نفیس خوشبودار

اگر بتیاں سلگ رہی ہیں۔ عجب منظر کیف و نور ہے۔

حالانکہ مشاعرہ کا وقت ۹ بجے شب کا ہے۔ لیکن لوگ مغرب تبھی سے جوق در جوق آنا شروع ہو گئے ہیں۔ اس وقت ساڑھے آٹھ بجے ہیں۔ مشاعرہ گاہ میں تل دھرنے کی جگہ نہیں ہے۔ مستورات کے لئے پردے کا انتظام کیا گیا ہے شعراء حضرات اسٹیج پر آ کر بیٹھتے جا رہے ہیں۔ لوگ جلد مشاعرہ شروع کئے جانے کے لئے بیتاب ہیں ــــ ٹھیک ۹ بجے معززین اور مقبول نصیر آبادی کی معیت میں مولانا انور بھوپالی اسٹیج پر تشریف لے آئے ہیں۔ شعراء نیز سامعین کی جانب سے پُر جوش استقبال کیا گیا ہے۔

جناب مضطر سہبانی نے کنوینر مشاعرہ مقبول نصیر آبادی کا نام نظامت کے لئے تجویز فرمایا ہے۔ مقبول صاحب نے مائک پر آ کر مشاعرہ کی غرض و غایت پر مختصر الفاظ میں روشنی ڈالنے کے بعد صدارت کے لئے حضرت مولینا انور بھوپالی صاحب کا نام نامی تجویز فرمایا ہے۔ جس کی تائید کی ہے یوسف شالی پاوی نے۔

حضرت مولانا انور بھوپالی صاحب نہایت ہی ذہین و فطین اور صاحب علم و فضل بزرگ ہیں۔ آپ کی ذات مجمع کمالات ہے۔ آپ بہت ہی خوش خلق، متواضع، منکسر المزاج اور سادگی پسند انسان ہیں۔ لیجئے مولانا موصوف مائک پر تشریف لے آئے ہیں۔ ناظم مشاعرہ مقبول نصیر آبادی گلپوشی کر رہے ہیں حضرت مولانا نے حاضرین پر مشکراکر محبت بھری نظر ڈالی ہے۔ مشاعرہ کا افتتاح کرتے ہوئے اپنی صدارتی تقریر میں مشاعرہ کمیٹی کے کنوینر مشاعرہ اور اہالیان نصیر آباد کو سیرت پاک کے اس مشاعرہ کے سلسلے میں مبارکباد دی اور فرمایا کہ " اردو کے اس کسمپرسی کے دور میں قابلِ ستائش و مبارکباد ہیں وہ لوگ جو اردو کی بقا اور فروغ کے سلسلے میں جد وجہد کرتے ہیں۔ انہی میں بانی مشاعرہ میرے شاگرد مقبول نصیر آبادی بھی ہیں کہ جن کی یہی لگن، انتھک محنت، اردو سے والہانہ لگاؤ اور عقیدت و محبت رسول کے باعث کئی دہائیوں کے بعد سرزمین نصیر آباد پر آج یہ مشاعرہ منعقد ہو رہا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ نصیر آباد کی اس مختصر آبادی میں جہاں اردو داں طبقہ محدود سے چند نفوس پر مشتمل ہے۔ مشاعرہ گاہ میں سامعین کی بھیڑ دیکھ کر میں اردو کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوں۔ سامعین کی دلچسپی اور جوش و خروش اس بات کا بین ثبوت ہے کہ اردو ایک ہر دلعزیز اور شیریں زبان ہے۔" آخر میں آپ نے مشاعرہ کمیٹی کے ارکان اور کنوینر مشاعرہ کو بطورِ خاص مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ نصیر آباد کے داعیانِ اردو کو فروغِ اردو کے سلسلے میں ٹھوس اقدامات کرنا چاہئیں۔ مختصر مگر جامع صدارتی تقریر پر حاضرین نے اظہارِ خوشنودی فرمایا ہے۔

صدرِ مشاعرہ مسندِ صدارت کی طرف تشریف لے جا رہے ہیں اور مقبول صاحب نے نظامت کے فرائض انجام دینے کے لئے مائک سنبھال لیا ہے چونکہ یہ سیرتِ پاک نعتیہ مشاعرہ ہے اس لئے آپ نے احمد الدین صاحب ریٹائرڈ اکاؤنٹنٹ کنٹونمنٹ بورڈ نصیر آباد سے تلاوتِ کلام پاک کی درخواست کی ہے۔ احمد الدین صاحب مائک پر تشریف لے آئے ہیں۔ اور لحنِ داؤدی میں سورۂ یٰسین شریف شروع کی ہے۔ ماحول پر ایمان افروز اور روح پرور ماحول چھایا ہوا ہے۔ اور آپ وجد آفریں مترنم آواز میں تلاوت فرما رہے ہیں۔ حاضرین نہایت ادب و احترام اور خشوع و خضوع کے ساتھ سن رہے ہیں۔ ہلکی ہلکی سبحان اللہ، ماشاء اللہ کی صدائیں آ رہی ہیں۔ احمد الدین صاحب تلاوت فرما کر اپنی جگہ تشریف لے جا رہے ہیں۔ اور مقبول صاحب نے حمد باری تعالیٰ کے لئے سردار احمد صاحب سردار پاوی کو بلایا ہے سردار صاحب نے نہایت مترنم و شیریں آواز میں مقبول نصیر آبادی کی لکھی ہوئی حمد پاک پڑھی جو بے حد پسند کی گئی چند اشعار آپ بھی سنئے

مسجود حقیقی ہے خدا تیری شان جل جلالہٗ
معبود میرا تو ہی مولا تیری شان جل جلالہٗ
بس ایک ترے لطف کی تفسیر ہے بزمِ کون و مکاں
اے ربِ قدیر ارض و سما تیری شان جل جلالہٗ
یہ برق و رعد یہ شمس و قمر یہ جن و ملک یہ جن و بشر
کرتے ہیں تری حمد و ثنا تیری شان جل جلالہٗ
اوصافِ حمیدہ کو تیرے کیا لکھے یہ مقبول عاجز

اے لوح و قلم کے پیارے خدا تیری شان جلّ جلالہٗ

حمد باری کے بعد مقبول صاحب نے طرحی نعتیہ مشاعرہ کے
لئے نصیرآباد کے بزرگ شاعر جناب عظیم اللہ جوشش
آبادی کو زحمتِ سخن دے رہے ہیں، جوشش صاحب نے
بہت پرانی نعت پیش کی۔

میں اُس کو چوم لیتا ہوں میں اس کو پیار کرتا ہوں
زباں پر جب مری آتا ہے نامِ سرورِ عالم
کلامِ سرورِ عالم، کلامِ ربِّ اکبر ہے
کلامِ ربِّ اکبر ہے کلامِ سرورِ عالم

جوشش صاحب کو کافی اچھی داد دی گئی ہے۔ اور اب محمد علی جند
نصیرآبادی کو آواز دی گئی ہے۔ اثر صاحب نعت پیش کر
رہے ہیں۔

تمنا ہے کسی دن آپ کی سرکار دیکھیں گے
جہاں رحمت برستی ہے وہ ہم دربار دیکھیں گے
ہمارے واسطے کھل جائیں گے جنت کے دروازے
سرِ محشر ہیں جب پیارے سرکار دیکھیں گے

اثر صاحب واہجی داد وصول کئے جا رہے ہیں اور مقبول صاحب
فرما رہے ہیں عبدالستار صاحب مخمور نصیرآبادی کو مخمور صاحب
نے نعت میں نعت پیش کی ہے۔ آپ کا مطلع اور ایک شعر کافی
پسند کیا گیا سنیئے۔

زمیں خوش ہو کے بولی سبزہ زار آتے ہیں
رسولِ ہاشمی کونین کے سردار آتے ہیں
یہ جی کہتا ہے تیرے پہلو تو ابھی اُڑ کر چلا جاؤں
تصور میں مرے طیبہ کے جب گلزار آتے ہیں

مقبول صاحب فرما رہے ہیں کہ آپ لوگ یہ سوچ رہے ہوں گے
کہ ناظمِ محفل سے کام لے رہا ہے اسی لئے مقامی شعراء ہی کو پڑھوا
رہا ہے تو لیجئے باہر سے آئے ہوئے مہمان شعراء میں سب سے
پہلے جناب شمس سائل بدایونی کو سنیئے۔ مائل صاحب بڑے
اچھے شعر کہتے ہیں۔ حالانکہ کہ سہرے میں تمام نعت و منقبت وغیرہ
بھی کہتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

وہاں نور برستا ہوگا   شہرِ مدینہ کیسا ہوگا

مائل صاحب کو مطلع پر کافی داد ملی ہے کئی مرتبہ دہرا کر اپنے
مخصوص انداز میں عنایت فرما رہے ہیں

جو سایہ ہو نورِ خدا کا   اس کا بھی کیا سایہ ہوگا
محبوبِ ذاتِ باری کا   صلِّ علیٰ کیا چہرہ ہوگا
مائل جو رہتا ہے سکوں سے   نامِ نبی کا لیتا ہوگا

مائل صاحب خوب خوب داد وصول کئے کامران جا رہے
ہیں اور مقبول صاحب یاد فرما رہے ہیں محمد عثمان صاحب
عثمان بیاوری کو، عثمان صاحب نے کچھ اس طرح سرپٹ
پڑھا کہ میں صرف دو ہی شعر نوٹ کر سکا۔

تمہارے ہجر میں آقا جو پیہم بڑھتا جاتا ہے
اگر چاہو تو مٹ جائے ابھی یہ داغ سینے کا
بھنور کی سمت ہی لے جا رہی تھی میری بدبختی
تری چشمِ کرم نے رُخ بدل ڈالا سفینے کا

یہ تھے عثمان بیاوری اور اب مقبول صاحب نصیرآباد کے
بہترین مترنم جمال الدین صاحب کو اذنِ لب کشائی دے رہے ہیں
اور جمال صاحب مائک پر کہہ رہے ہیں کہ اگر آپ حضرات
اجازت دیں تو میری دلی خواہش ہے کہ مقبول صاحب
کی نعت پیش کروں — ضرور پڑھیئے۔ بسم اللہ کیجئے
کی آوازیں — اور جمال صاحب نے نہایت سلجھے ہوئے
دلکش ترنم میں جھوم کر مطلع پڑھا ہے۔

کونین ہوئی ہے جن پہ کرم سلطانِ بطحیٰ آتے ہیں
خوشبو ہے مجسّم ہر گلشن سلطانِ بطحیٰ آتے ہیں
فاران کے ذرّے ذرّے پر اک نور کا عالم طاری ہے
گلزار بنے ہیں دشت و دمن سلطانِ بطحیٰ آتے ہیں
کلیاں بھی خوشی سے جھوم اٹھیں پھولوں نے کہا ہنس ہنس کر
وہ جانِ بہار و حسنِ چمن سلطانِ بطحیٰ آتے ہیں
وہ شمعِ ہدیٰ وہ بدرِ دُجیٰ وہ ختمِ رسُل وہ فخرِ ورِیٰ
وہ شاہِ اُمم وہ فخرِ زمن سلطانِ بطحیٰ آتے ہیں
چلّا کے گرے یہ کہتے ہوئے وہ صحنِ حرم کے بت سارے
دلدارِ خدا اصنام شکن سلطانِ بطحیٰ آتے ہیں
معراج کی شب یہ چرچے تھے افلاک کے رہنے والوں میں

مہمانِ خدا وہ شاہِ زمن سلطانِ بطحٰی آتے ہیں
مقبولؔ خدا را ہوش میں آ یہ ابرِ کرم تو دیکھ ذرا
چھائی ہے گھٹا پھیلا دامن سلطانِ بطحٰی آتے ہیں

ایک اور ایک اور کے بے ہنگم شور میں جمال صاحب محفل کو لطفی میں ڈبو کر کامراں پلٹ رہے ہیں۔ اور مقبول صاحب درخواست کلام کر رہے ہیں ضیا قادری اجمیری سے ضیا صاحب سے ان کے استاذ حضرت عرشی اجمیری مرحوم کی نعتیہ غزل کا ایک مطلع سنیئے۔

ساقی حرم سے اُٹھ کے مدینے میں آگیا
مے خانے کا نظام قرینے میں آگیا

اور اب آ رہے ہیں نصیر احمد اختر نصیر آبادی

مدینے سے صبا پیغامِ رحمت لے کے آئی ہے
زمیں سے آسماں تک اک بہارِ عیش چھائی ہے
جلا کر شمعِ ایماں کفر کی تاریک راہوں میں
حبیبِ حق نے ہم کو راہ وحدت کی دکھائی ہے

اختر صاحب کو ان کی حیثیت کے مطابق اچھی داد مل گئی ہے اور مقبول صاحب فرما رہے ہیں کہ اب آپ کے سامنے ایک ایسے شاعر کو پیش کر رہا ہوں جو خوش رو بھی ہے خوش گلو بھی، اور خوش کلام بھی ہے۔ جس کے ترنم میں جادو کا اثر ہے۔ اور وہ ہیں جواں سال وجواں فکر شاعر سردار احمد سردارؔ پالوی۔ سردار پالوی آج ہی مقبول نصیر آبادی کے توسل سے حلقۂ انور میں داخل ہوئے ہیں یعنی مولانا انور بھوپالی کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا ہے۔ سردار صاحب نے مقبول صاحب سے جھک کر کچھ کہا ہے۔ اور پھر اپنے مخصوص انداز اور بہترین ترنم میں مطلع عنایت فرمایا ہے ؎

کھلی ہے یہ اک آرزو رہ کے سینے میں
پڑھوں نعت نبی میں خود بھی جا کر مدینے میں
مری نظروں سے اوجھل ہیں وہاں کی چاندنی راتیں
بتا اے چاند تو تو روز جاتا ہے مدینے میں
لکھا ہے عرش پر جو نام ان کی ضو کا کیا کہنا
چمکتا ہے وہی سرکار اس دل کے نگینے میں

سامعین پر وجدانی کیفیت طاری کر کے سردار صاحب داد وتحسین میں ڈوبے ہوئے جا رہے ہیں۔ اور مقبول صاحب آواز دے رہے ہیں خورشید احمد صاحب شمسی اجمیری کو شمسی صاحب کا کلام بھی بہت پسند کیا گیا خصوصاً یہ دو شعر

تری محفل کے رنگ و نور کا عالم خدا جانے
بیاباں جو ترے دیکھے جواب گلستاں نکلے
زبور، انجیل اور توریت کی تحریر وصند لائی
ترے قرآن کے زیر و زبر تک جاوداں نکلے

شمسی اجمیری کے بعد مقبول صاحب نے یاد کیا ہے وزیر احمد صاحب انجم نصیر آبادی کو مشاعرہ پورے شباب پر ہے اور لوگ بھی سننے کے موڈ میں ہیں۔ شعراء کی حوصلہ افزائی کے سلسلے میں بخل سے کام نہیں لیا جا رہا ہے۔ بلکہ ہر شاعر کو اس کے اچھے اشعار پر دل کھول کر داد دی جا رہی ہے۔ انجم صاحب کو بھی خوب خوب داد وتحسین سے نوازا گیا ہے۔ آپ بھی ان کے چند اشعار سنیئے۔

محمد مصطفٰے آئے جہاں کے رہنما بن کر
شفیع المذنبیں، خیر الورٰی، نور الہدیٰ بن کر
اتر سے اس کے حق نے نعمتِ عظمٰی ہمیں بخشی
صدا جو قلب ابراہیم سے نکلی دعا بن کر
منور کر دیا سارے جہاں کو نورِ ایماں سے
کبھی شمس الضحیٰ بن کر کبھی بدر الدجیٰ بن کر
پکارا جب انہیں انجمؔ کبھی انساں نے مشکل میں
مدد کے واسطے وہ آ گئے مشکل کشا بن کر

انجم صاحب اچھی داد پا کر چلے گئے اور مقبول صاحب پیامی لکھنوی سے درخواست کلام کر رہے ہیں۔ پیامی صاحب تحت اللفظ میں اپنی نعت پیش کر رہے ہیں اور کسی حد تک کافی اچھی داد پا رہے ہیں چند شعر ملاحظہ فرمائیے۔

تمہی محبوب رب العالمیں ہو یا رسول اللہ
تمہی لاریب ختم المرسلیں ہو یا رسول اللہ
تمہی ہو ساقیٔ کوثر تمہی ہو شافعِ محشر
تمہی تو رحمۃ للعالمیں ہو یا رسول اللہ

نلک شیدا، زمیں شیدا ہے، ربِ دو جہاں شیدا
خدا جانے کہ تم کتنے حسیں ہو یا رسول اللہ

یاتی لکھنوی کے بعد مقبول صاحب اذنِ کلام دے رہے ہیں
یم پادری کو۔ کریم صاحب مسکراتے ہوئے مائک پر آتے
ہیں۔ اور اپنے مخصوص انداز، پاٹ دار آواز اور سحر آفریں
رنم میں مطلع عنایت فرما رہے ہیں۔

جب بھی جہاں بھی اے حضور آپ کے نقش پا گئے
پھر تو غلام آپ کے پوری طرح سے چھا گئے
اب تو خدا کے واسطے در پہ بلا ہی لیجیے
دیدۂ دل میں آج تو خون کے اشک آ گئے
کیف بھی چھا گیا کریم دل بھی مرا مہک اٹھا
بزمِ تصورات پر جب بھی وہ آ کے چھا گئے

یم صاحب داد سے لدے ہوئے مائک چھوڑ رہے ہیں
اور مقبول صاحب آواز دے رہے ہیں احمد مریم بہیا زوی
و، مریم ترنم میں اپنی نعت پیش کر رہے ہیں مگر اس قدر دھیمی
آواز میں کہ میں ایک شعر بھی نہ سن سکا۔ اور مجھے وقت تنگی ہے سنیے

نامِ حسیں گیسوئے احمدؐ	صبحِ مسرت روئے احمدؐ
گلشن گلشن جنت جنت	پھیلی ہے خوشبوئے احمدؐ
یر برکت ابرِ رحمت	بیشک ہر اک موئے احمدؐ
قاسین ہیں یا دو مبین کی	یا ہیں دو ابروئے احمدؐ

مقبول صاحب اب دعوتِ نغمگی دے رہے ہیں بھوپال کے
شاعر جاوید انور کو۔ جاوید صاحب کیف پرور ترنم میں مطلع
پیش کر رہے ہیں۔

تم مظہرِ عرفاں شمعِ ہدیٰ یا سیدنا یا مولانا
تم نورِ مجسم نورِ خدا یا سیدنا یا مولانا

مطلع ہی سے داد نقطۂ عروج پر ہے اور جاوید صاحب اسی وجد
آفریں ترنم میں عنایت فرما رہے ہیں۔

تم جانِ جہاں ایمانِ جہاں محبوبِ خدا مطلوبِ خدا
انگلی والی پھر لیتے تم پہ فدا یا سیدنا یا مولانا
تم صدر نشینِ بزمِ کرم ... تم شاہِ امم تم ختمِ رسل
تم زینتِ بزمِ اللہ صمد تھا یا سیدنا یا مولانا

کیا حور و ملک کیا جن و بشر ارض و فلک کیا شمس و قمر
ہر ایک کے تم ہو قبلۂ نما یا سیدنا یا مولانا
اے قاسمِ سوز و ساز و ولا جاوید کو بھی ہو سوز عطا
تم ابرِ کرم تم بحرِ سخا یا سیدنا یا مولانا

جاوید انور داد کا سیلاب رکا رکا توڑ کر کامراں اور شادماں
پلٹ رہے ہیں اور مقبول صاحب یوسف ثاقی پالوی سے
درخواست کلام کر رہے ہیں۔ ثاقی پالوی بھی آج ہی حضرت
مولانا انور بھوپالی کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہوئے ہیں۔
ثاقی صاحب تحت میں خوب پڑھتے ہیں سنیے مطلع پیش
کر رہے ہیں ؎

نعتِ نبی کی بزم ہے لطف کا یہ مقام ہے
دل میں اُنہی کی یاد ہے لب پہ اُنہی کا نام ہے

ثاقی صاحب کو مطلع پر اچھی داد مل رہی ہے فرماتے ہیں ؎

گنبدِ سبز کے عکس ناز کرے نہ کیوں زمیں
عرشِ عظیم جیسی شے آپ کے زیرِ گام ہے

اس شعر پر داد کا ایک دھماکہ سا ہوا ہے کئی مرتبہ شعر دہرانے
کے بعد ثاقی صاحب ارشاد فرما رہے ہیں۔

آپ کے ذکرِ پاک کا یہ بھی ہے ایک معجزہ
ذہن کو مل رہی ہے ضو روح بھی شاد کام ہے
وجہِ وجودِ دو جہاں مالکِ کائنات کُل
صدقے میں ذاتِ پاک کے سارا یہ اہتمام ہے

ثاقی صاحب داد سے جھولیاں بھر کے رخصت ہو رہے ہیں اور
مقبول صاحب کہہ رہے ہیں کہ میرے عزیز دوست رمضان خاں آ
نصیر آبادی نے بعد میں دیدار ہے وفا ملک پوری کی نعت بذریعہ
ڈاک ارسال فرمائی ہے۔ وفا صاحب کی نعت مضطر صبائی سے
سنیے ؎

یہ کس کے عکسِ رخ کی ضو سے عالم میں اُجالا ہے
یہ کس کا نقشِ رفعت کی بلندی سے ہویدا ہے
یہ کس کی آمد آمد ہے کہ ہیں اصنام سجدے میں
یہ کس کی ضو سے ہر گز شہ میں اب وحدت کا جلوہ ہے
فلک سے تا بہ زمیں ہم صاحبِ لولاک کی نسبت

جسے پیدا کیا اوّل اسے آخر میں بھیجا ہے
یہی نازِ شیّت ہے یہی نازِ رسالت ہے
یہی وہ ہے کہ جس پہ کبریائی ناز فرما ہے
فلک پر چاند نے دو ٹکڑے ہو کے رفعت کی گواہی دی
زمیں کیا آسماں پر بھی رسولِ حق کا قرضا ہے

رفعا صاحب کی نعت بے حد پسند کی گئی اور خوب خوب داد و تحسین سے نوازی گئی۔ اچھا کلام اور اس پر مضطر صاحب کا دلکش ترنم سونے پر سہاگا اور اب مضطر صاحب فرما رہے ہیں کہ بانیٔ مشاعرہ، ناظم مشاعرہ مقبول صاحب سے ان کا کلام مقبول سماعت فرمائیے۔ یہ حضرت کب سے دوسروں کو پڑھوا رہے ہیں اور خود صاف بچ کر نکلے جا رہے ہیں۔ مقبول کہہ رہے ہیں کہ جو لطف سننے میں ہے وہ سنانے میں کہاں مگر مضطر بھائی کا حکم ٹالنا بھی تو میرے بس کی بات نہیں۔ لیجئے چند اشعار پیشِ خدمت ہیں اور مقبول صاحب فارسی زبان میں اپنی نعت کا مطلع پیش کر رہے ہیں۔

زبندِ غم بکش آزاد ما را یا رسول اللہ
بچشمِ لطف و رحمت یک اشارہ یا رسول اللہ

مطلع پر اتنی شدت سے داد ملی ہے اور آپ ارشاد فرما رہے ہیں۔

منم بے چارہ و بے بس منم آوارہ و بے کس
دلے دارم و لیکن پارہ پارہ یا رسول اللہ
بہ ہر جا سے کہ می نوشم بہر ما ہے کہ می بینم
نمی بینم بجز روئے شمارا یا رسول اللہ
بہ ہجر تو صبوری از کجا آرم نمی دانم
بہ وصلِ تو بیارم تاب دیارا یا رسول اللہ
منم مقبولِ انور از سگانِ کوچۂ اطہر
نگاہِ لطف کن بر من خدارا یا رسول اللہ

مقبول صاحب کو ہندال سے معمولی مگر اسٹیج سے بے انتہا داد ملی ہے۔ اور اب لوگوں کے پُر زور اصرار پر آپ اپنی ردیف و قوافی میں اردو میں نعت کا مطلع پیش کر رہے ہیں ہے۔

حرم کا ذرہ ذرہ جھوم اٹھا یا رسول اللہ
کہا جبریلؑ نے جس وقت اقرا یا رسول اللہ

داد کا ایک ریلا سا آیا ہے۔ آہ اور واہ کے شور میں کئی بار دہرا آپ فرما رہے ہیں ہے

بڑھا ارِید ہو گیا بڑھ کر محیطِ محفلِ امکاں
سرِ فاراں جو چھوٹا تھا اُجالا یا رسول اللہ
قسم قرآں کی عظمت کی رُخِ زیبائے وحدت سے
نقاب پاک اٹھایا تم نے پردا یا رسول اللہ

داد پورے شباب پر ہے اور آپ اسی سج دھج سے مخصوص انداز میں ارشاد فرما رہے ہیں

زمیں سے آسماں تک آسماں سے عرشِ اعلیٰ تک
نظر آتا نہیں ہے کوئی تم سا یا رسول اللہ
ہجومِ نور میں آخر کسی کو کیا نظر آتا
تمہارے قامتِ رعنا کا سایا یا رسول اللہ
کلیم طور دل تم ہو خلیلِ داد کی جاں تم
تمہی لاریب ہو قبلے کا قبلہ یا رسول اللہ
قریبِ عرش ہے در آپ کا جب تو فرشتوں کا
لگا رہتا ہے تمدن شب ہی تانتا یا رسول اللہ
جہاں جاتے ہوئے جلتے ہیں جبریل جبیں کے
فنا فی اللہ پہنچے آپ اس جا یا رسول اللہ
پئے حسنین و زہرہ اک نگاہِ لطف مجھ پر بھی
میں ہوں مقبولِ انور آپ ہی کا یا رسول اللہ

مقبول صاحب کو داد قابلِ رشک حد تک دی گئی ہے اور اب مقبول صاحب نے یاد کیا ہے محمد صابر صاحب صابر اجمیری کو۔ دیکھا تو ایک موٹی منحنی بزرگ، متبسم صورت، ہونٹوں پر پان کا لاکھا جمائے کوٹ بردوش مائک پر تشریف لائے ہیں اور کچھ اسی طرح رواں دواں سنا کر یہ جادو جگا کہ میں منہ دیکھتا ہی رہ گیا اور صرف مطلع ہی نوٹ کر پایا۔

نبی کی سرکار اللہ اکبر ۔ پناہ گنہگار اللہ اکبر

مقبول صاحب کہہ رہے ہیں کہ اب میں ایسے علیم حکیم ہستی بھاری بھرکم شاعر کو بلا رہا ہوں جو خصوصی بنیادی جرم کا نہیں اور جو خوش قسمتی سے میرے دوست بھی ہیں۔ اور بلی تعطف ہے

فرض اور محبت

حسن ساہو
معرفت حاجی گلو۔ ایرا کدل
(سری نگر۔ کشمیر)

دو [illegible] کی جان ہو اجازت کا بدف بنے پاس پڑی فائلوں کے ڈھیر سے ہٹ کر میں ڈاک سے موصول شدہ کاغذات کی ورق گردانی میں محو تھا کہ چپراسی کمرے میں گھس اپنے مخصوص انداز میں چلایا۔ "جناب دو عورتیں آئی ہیں۔ آپ سے ملنا چاہتی ہیں" دو عورتیں۔ اور دفتر میں بھلا ان سے کیا کام ہو سکتا ہے۔ میں نے چپراسی اس بابت پوچھ تاچھ کرنا مناسب نہ جانتے ہوئے انہیں اندر چھوڑ دینے کو کہا۔

دیکھتے ہی دیکھتے دو عورتیں برقعہ پوش کمرے میں گھس گئیں۔ ایک معمر قسم کی سفید برقع میں ملبوس تھی اور دوسری لکھنوی انداز کا سیاہ رنگ کا برقع پہنے نوجوان عورت لگتی تھی ... میں نے کچھ جاننے کی چاہ میں زبان کھولنے ہی والا تھا کہ بوڑھی عورت کہہ اٹھی۔

"یہ میری بیٹی ہے صفیہ۔ بی۔ اے پاس کر لیا ہے۔ اور آپ بھی جانتی ہے۔ کوئی بڑا بیٹا نہیں اور خود بیوہ ہوں! خدا کے لئے اسے کسی کام پر لگا دیجئے" تاکہ ہمارا گزر چل سکے۔

"لیکن ہمارے یہاں کوئی جگہ خالی نہیں۔ اور ہاں نوکری کے معاملے میں آپ کو متعلقہ بورڈ کی طرف رجوع کرنا پڑے گا" میں یہ سب کچھ غیر ارادی طور پر کہہ گیا۔

"وہاں درخواست دیدی ہے۔ تین ماہ گزر گئے لیکن کوئی خاطر خواہ جواب نہ ملا۔ اب خدا کے لئے ہماری مدد کیجئے" اب کی بار لڑکی کی زبان کام کر گئی اور ساتھ میں اپنے برقع کا دامن بلند کر کے اس نے واضح انداز میں اپنے بے مثال حسن کی نمائش کر دی۔

مرعوب ہوتے ہوئے میں نے معاملہ ٹالنے کی غرض سے کہہ دیا کہ ہمارے یہاں کوئی جگہ خالی نہیں ہے۔ بہر حال وہ بڑے صاحب سے مل لیں۔ ممکن ہے وہ کچھ مدد کر سکیں۔ خود میں کاغذات میں کھونے لگا۔ نہ جانے کس اثر کے تحت ماں بیٹی دونوں یکے بعد دیگرے کمرے سے نکل گئیں۔

دن گزر رہے۔ کچھ ہفتے بیتے۔

دفتر میں کام کی بہتات ہے۔ اس اُس طرح کے معاملات سننے۔ اور وابستگان کو تسلی بخش جواب دینے میں دن کا بیشتر حصہ گزر جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنے کچھ حواریوں کے سروں سیاست کا بھوت بُری طرح سوار ہے۔ اس لئے کام سے نپٹنے کی خاطر کبھی کبھی چھٹی کے روز بھی دفتر آنا پڑتا ہے۔ آج تیرہ جولائی تھی۔ شہیدوں کی یاد منانے والا دن۔ سُننے میں آیا ہے کہ ۱۹۳۱ء میں اسی روز شخصی راج کے کرتا دھرتاؤں کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے کی پاداش میں کچھ لوگوں کے سینے گولیوں سے چھلنی کئے گئے تھے۔ اس روز عام تعطیل رہتی ہے۔ اور شہداء کی ارواح کو ثواب پہنچانے کی نیت سے ان کے قبروں پر فاتحہ خوانی کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ میں اس روز دفتر آیا تھا۔ اکیلا ہی کبھار دفتر کھولے کسی ذاتی کام سے چلا گیا۔ میں کام میں مشغول تھا کہ وہی سیاہ برقع پوش لڑکی کمرے میں داخل ہو گئی۔ اسے دیکھ کر میں ہکا بکا رہ گیا۔ "یہاں کس لئے آئی ہو۔ آج تو چھٹی کا دن ہے۔"

جواب میں لڑکی نے برقع کا الٹا پٹ پیچھے کی جانب پلٹ دیا اور دلکش آنکھوں سے معنیٰ خیز انداز میں مجھے گھورنے لگی۔

"میں نے آپ کی ماں سے کہا تھا کہ بڑے صاحب سے مل لو۔" "آئے تو کل شام کو بنگلہ پر ملے تھے" اتنا کہہ کر اس نے میز کے [illegible] شدہ درخواست نکالے میرے سامنے دراز کر دی۔ "بڑے صاحب نے میرے نام [illegible]"

* آن کی ایک [illegible] ہو جاتا ہے

میں درخواست کی عبارت پڑھنے میں محو تھا کہ دفتر میں کام کرنے والے کلرک قادر کمرے میں آدھمکے! آتے ہی مجھے یہ اندازہ لگانے میں دقت درپیش نہ آئی کہ ابھی کچھ دیر پہلے صفیہ چھٹی کے روز مجھ سے دفتر ملنے آئی ہے

• یہ بہت غریب لڑکی ہے۔ احمد صاحب! چھوٹے بہن بھائی ہیں۔ اور بوڑھی ماں۔ اسے کام دے کر آپ عظیم کام کیجئے: قادر برجستہ کہہ گیا۔ اور میں نے اس موضوع پر زیادہ بولنا مناسب نہ جانتے ہوئے لڑکی سے دو روز بعد آنے کو کہا۔ لڑکی کے چلے جانے پر قادر نے پھر صفیہ کو کام دینے کی سفارش زور و شور سے کر دی!

دو روز بعد صفیہ کا ٹیسٹ لینے اُسے عارضی طور پر ٹائپسٹ کی حیثیت سے کام پر لگا دیا گیا۔ بہت ہی شرمیلی لڑکی نظر پڑتی تھی بولتی بہت کم تھی۔ اُس کی یہ کم بولنے کی عادت مجھے پسند تھی ابھی ایک ماہ ہی گذرا تھا کہ سننے میں آیا کہ قادر صفیہ کے ساتھ دفتر سے چھٹی لینے پر پھرا کرتا ہے۔ میں نے پہلے اس قصے کو اَن سُنا کر دیا لیکن بات آگ کی طرح پھیل گئی تھی۔ اور میں نے ایک روز کمرے میں بلا کے قادر سے اس بابت پوچھ تاچھ کی۔

• احمد صاحب میں اتنا کمینہ نہیں ہوں۔ کہ صفیہ کی مجبوری کا ناجائز فائدہ اٹھانے کی سعی کروں میں تو صفیہ کو اپنی بہن تصور کرتا ہوں۔ اب اس رشتے کے ناتے ہم ایک دوسرے سے کھل کر بات بھی نہیں کر سکتے۔

قادر کی اس یقین دہانی کے بعد میں نے معاملہ کو طول نہیں دیا۔ کچھ ماہ گذرنے کے بعد میں نے اندازہ لگایا کہ صفیہ میں اب وہ پہلے جیسی شرم و حیا نہیں رہی تھی اب وہ ہر ایک کے ساتھ آزادی کے ساتھ باتیں کرتی تھی۔ اور گاہے گاہے کسی نہ کسی بحث میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگی تھی۔ میں اس کی غیر متوقع تبدیلی پر حیران ہوا اور ایک روز صفیہ کو بلا کر اس کے مستقبل کے بابت استفسار کیا تو وہ کہنے لگی۔

• احمد صاحب! میں اپنی زندگی بنانے۔ سنوارنے کی بات کیسے سوچ سکتی ہوں۔ جب کہ میرے کاندھوں پر ایک ضعیف العمر ماں، چھوٹی دو بہنوں اور ایک چھوٹے بھائی کا بوجھ آن پڑا ہے ابا حضور کی رحلت کے بعد اب میں ہی ان کا واحد سہارا ہوں میں ہی اُن کی زندگیوں کو خوشگوار موڑ سے وابستہ کر سکتی ہوں میں تو ماں کے لئے بیٹا بننا چاہتی ہوں۔ ان حالات میں اپنی خوشی یا راحت کی بابت سوچنا بھی میرے لئے گناہ سے کم نہیں"

یقین کیجئے صفیہ کے اس درجہ شستہ و اونچے خیالات جان کے مجھے بے حد خوشی حاصل ہوئی۔ اُس کے ارادوں میں اس طرح کی مضبوطی پا کے میں دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ ایسی لڑکیاں ہر گھر میں جنم پا جائیں تو مانگ جلی عورتوں کو درد و کلفت سے واسطہ نہ پڑے . . . جب بھی دفتر میں کسی ساتھی نے صفیہ کو زندگی بنانے کا مشورہ دیا تو وہ بگڑ بیٹھتی . . . ماں اور بھائی بہنوں کی خوشنودی و درخشاں مستقبل کے تصورات میں غرق وہ اپنی حسرتوں کے چراغ کو گل کرنے لگی۔ ویسے اگر دیکھا جائے تو صفیہ کی عمر جوانی کے اس دہلیز پر کھڑی تھی جہاں کوئی ایک ہاتھ نہ تھامے تو گرنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ اپنا جذبات کا گلا گھونٹے صفیہ ایک فاتح کی طرح فرض کی راہ پر گامزن تھی۔ میرے دل میں اس کے لئے عزت و احترام بڑھ گیا۔

ابھی مشکل سے چھ ماہ کا عرصہ ہی گذرا تھا کہ ایک روز دفتر گھستے ہی سننے میں آیا کہ صفیہ نے شادی رچائی ہے۔ وہ بھی اپنے منہ بولے بھائی قادر کے ساتھ۔ دونوں نے عدالت میں جا کے سول میرج کو ترجیح دی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ نوکری کو خیرباد کہکے صفیہ خاوند کے ساتھ سرینگر چھوڑ کر جموں چلی گئی۔ یہ بھی سننے میں آیا کہ دونوں کو کسی فرم میں کام ملا ہے۔ صفیہ نے چپ چاپ قادر سے منسلک ہو کے گھر کے ساتھ ساتھ اس وادی کو خیرباد کہنے میں اپنی عافیت جان لی۔

اس کے بعد صفیہ اور قادر سے میری ملاقات نہیں ہوئی بلکہ اس وقت میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ جب کہ یہ جانکاری حاصل ہوئی کہ اس کے چھوٹے بھائی کو چھوٹی سی چوری کرنے کے عوض جیل جانا پڑا۔ بوڑھی ماں گھر گھر بھیک مانگا کرتی ہے اور چھوٹی بہنیں یتیم خانہ کو آباد کر گئیں ہیں

گو اس حادثہ کو ہوتے قریب ایک سال کا عرصہ گزر گیا ہے لیکن اب بھی میں اکثر اکیلے میں سوچا کرتا ہوں کہ تعلیم کو بے معنی

باقی صفحہ [illegible] پر

مثنوی مالوہ

اِندور (مالوہ) اُس کا قیام (اندریشور) کا مندر

قسط ۱۲

نازک الہ آبادی

نگر جس کا ہے آج اندور نام
ہوا کیسے کب سنیئے اس کا قیام

ہے اندور سے متصل ایک گرام
کہ جس کا کہیں مشہور نام

جو ہاں رہتے تھے نامور منڈلیک
جو ایمانداری کے تھے خود پہ ٹیک

جو کھی تھی اُن منڈلیکوں کی شان
تھا تحصیلنا کام جن کا لگان

کوئی راجہ بدلے کوئی حکمراں
یہ تھے حاکم الوقت کے قدرداں

یہ راجوں کے حق میں وفادار تھے
اُنھیں کے بھی یہ نمک خوار تھے

شہنشاہِ دلی ہو یا پیشوا
کہ ہو چھتری راج یا مرہٹا

وہ نجے پور ہو یا کہ ہو جودھپور
کہ نواب ہوں کوئی اعلیٰ حضور

بیک وقت کرتے تھے یہ سب کو پیار
کہ راجوں میں تھا ان کا اچھا وقار

تھے اک راؤ صاحب شری نندلال
جو تھے منڈلیکوں میں اہلِ کمال

انھیں کا تھا دم خم انھیں کا کرم
کہ اندور کو جس نے بخشا جنم

تھا سترہ سو پندرہ سن عیسوی
کہ بنیادِ اندور کی جب پڑی

تھے نندلال ہی فرد عالی جلیل
نگر کی تھی کھدوائی جس نے فصیل

نگر کا پڑا نام تھا (اندرپور)
وہی آج اندور کا ہے ظہور

ہے تعمیر کردہ انھیں کا بخیر
شری "اندریشور" کا مشہور دیر

ہے اندور کا اب جو پیارا نگر
نشاں منڈلیکوں کا ہے وہ اثر

ستارہ (دکن) کی پیشوا حکومت، اور ہندوستان کے بارے میں اُس کا تصوّر

ستارہ مہاراج تھے پیشوا
بہادر جو تھے جنگجو مرہٹا

ہوا اُس کے دل میں یہ پیدا خیال
کہ مغلوں کو بھارت سے دیں ہم نکال

فقط دل میں تھے کرکے حبِّ وطن
پریشان تھا پیشوائے دکن

سلہ منڈلیکے: یا منڈلوی، جن کی آبادی اندور میں اب تک موجود ہے۔ ان میں سے سر ہیگوت راؤ منڈلوی ہیں جو کہ [illegible]
ملحق مسند گلزارہ کے ہیں۔

شیدائے ادب سیٹھ داؤد احمد میمن سورت

سہروردی تونسوی

بمبئی کے مقام حاجی علی ایسی مقدس سرزمین پر جنم لینے والا داؤد اپنے والدین کی سرپرستی میں سورت میں پلا بڑھا۔ اور تعلیم حاصل کی، مگر صحبتِ بد نے انہیں پینے کی لت ڈال دی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ کلکٹر سورت نے داؤد کو تڑی پار یعنی گجرات کی حدود سے باہر نکال دیا۔ اور وہ بمبئی میں مقیم ہوگئے۔ جب خدا کسی کو سیدھے راستے پر لانا چاہتا ہے تو اُن کے لئے صحبت صالح کے ذرائع پیدا کر دیتا ہے۔ لہٰذا قیام بمبئی کے دوران داؤد کی ملاقات ایک عامل پروفیسر عسکری جاذی سے ہوئی۔ جنہوں نے داؤد کی کایا پلٹ دی۔ اور حاجی علی بابا کی سرزمین پر پیدا ہونے والا داؤد پھر سے ایک اچھا شہری بن گیا۔ اور تڑی پار کی مدت ختم ہونے پر پھر سورت لوٹ آیا۔

سورت کے مشہور اور نامور تاجر نور ادوسا کے خاندان کا یہ فرد مہذب اور عالموں کی صحبت میں رہنے لگا۔ اور شعراء اور ادیبوں سے رابطہ رکھنے لگا۔ اور شعر و شاعری کے شوق میں دلچسپی لینے لگا۔ اردو اور انگریزی میں اچھی خاصی دسترس حاصل تھی۔ پھر ہی دنوں میں اچھے شعر کہنے لگا۔ مگر نام و نمود سے ہمیشہ ہی دور رہا۔ خوب کمایا اور اچھا کمائی پر نوابانہ زندگی بسر کی، فراخدلی کا یہ عالم تھا کہ کوئی بھی حاجت مند ان کے دروازے سے کبھی خالی نہ گیا۔ غریب بچوں کو نصابی کتابیں لے کر دینا اور ان کی اسکول فیس ادا کرنا ان کا ایک محبوب مشغلہ تھا۔ بیواؤں کے وظیفے مقرر کر رکھے تھے۔ اور کئی بے سہارا اور غریب بچیوں کی شادیاں کرائیں۔ دوست نوازی کا یہ عالم رہا کہ دوست نما دشمن خوب طرح طرح سے انہیں فریب دے کر روپیہ حاصل کرتے رہے اور یہ سب جانتے ہوئے بھی ان نما دوستوں کو مایوس نہ ہونے دیتے اور وہ کے ساتھی تھے۔ اردو کا جو بھی رسالہ انہیں پسند آیا اُس کی خریداری اس طرح کرتے کہ پانچ چھ سال کا چندہ سالانہ اکٹھا ہی بھجوا دیتے گو اور وہ نہ تک بادجود گجراتی زبان سے قطعاً نابلد تھے۔ ہاں انگریزی میں بات چیت کرنے کا خاص ملکہ حاصل تھا۔ اور اردو پر فدا تھے۔

خوش کلام، خوش پوش، داؤد نے اپنی زندگی کو خود بنایا اور لاکھوں کمائے۔ آباد اجداد کے ورثہ کو ہاتھ تک نہ لگایا بلکہ وہ اپنے اس شعر کے قائل تھے ؎

بن اپنے آپ سفینے کا ناخدا اے دوست
بلند عزم ہواؤں کا رُخ بدلتے ہیں

دوستوں کی فریب کاریوں پر وہ جھنجھلاتے تو نہیں تھے مگر اپنے دل جذبات کا اظہار یوں کرتے تھے ؎

جب کسی کی وفا کا یقین آیا ہے
قسم خدا کی اُسی سے فریب کھایا ہے

بلاتخصیص مذہب و ملت ہر شخص کا خیر خواہ اور ضرورت مند کا مددگار، داؤد موت و حیات کے فلسفے سے بھی بخوبی واقف تھا جبھی تو اس نے یہ شعر کہا ؎

موت دانا تھی جو حاصل کر لیا راز سکوں
زندگی نادان تھی جو ٹھوکریں کھاتی رہی

افسوس صد افسوس کہ یہ شعر کہنے والا داؤد ۲۰ رمئی کی شب جمعہ کو حرکت قلب بند ہو جانے کے باعث اس دار فانی سے رحلت کر گیا۔ داؤد کو گزشتہ بارہ سال سے دردِ شکم تھا جس کے باعث ان کا آپریشن کیا گیا۔ آپریشن کامیاب رہا مگر وقت آگیا تھا اور ملک الموت ہارٹ اٹیک کی شکل میں نمودار ہو کر انہیں اپنے ساتھ لے گیا۔ سورت کے ادبا و شعراء جو سیٹھ داؤد کے دروازے پر پڑے رہتے تھے انہیں خدا نے اتنی سکت نہیں دی کہ وہ داؤد کے ماتم میں ایک ماتمی جلسہ ہی منعقد کرتے۔ حالانکہ موت تو ان شعراء اور ادیبوں کو بھی آنی ہے جو اپنے محسن کو اتنی جلدی بھول گئے ہیں ضرورت ہے کہ سورت میں یوم داؤد بڑے اہتمام سے منایا جائے۔ اس سلسلے میں ایک آل انڈیا مشاعرہ کے لئے ایڈیٹر شانِ ہند اپنے اثر و رسوخ سے چند اچھے شعراء کو محض آمد و رفت کے اخراجات پر سورت لے جائیگا۔ اس سلسلے میں شری بھول چند سیٹھ کو اپنے فرض کو سمجھنا چاہیئے کہ جس طرح سیٹھ داؤد نے ہندو مسلم اتحاد کا زندہ جاوید ثبوت یوں دیا کہ اپنے کاروبار میں انہیں حصہ دار بنایا۔ اب بھول چند سیٹھ کو چاہیئے کہ وہ اپنے مسلمان شریک کار کی یاد میں یوم داؤد منائے جانے کا اہتمام کریں۔ مرحوم کے بھتیجے ظفر کی توجہ بھی اس طرف مبذول ہونا ضروری ہے۔

ایڈیٹر شانِ ہند بیگم داؤد اور ان کے جملہ لواحقین کے اس صدمے میں برابر کا شریک ہے۔ اور دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

بقیہ صفحہ ۲۱ کا

ترا فیضان ساقی پھر اترا فیضان ہے ساقی
اگر ایمان کی پوچھو تو یہ ایمان ہے میرا
ترا فرمان بھی اللہ کا فرمان ہے ساقی
اسے بھی سوز و سازِ زندگی سے آشنا کر دے
ترے انور کو مدت سے یہی ارمان ہے ساقی

حضرت مولانا کو نہایت ہی ادب و احترام کے ساتھ سُنا گیا اور بے پناہ داد و تحسین سے نوازا گیا۔ صدر مشاعرہ کی اس ایمان افروز نعت شریف کے ساتھ ہی تقریباً ڈھائی بجے شب کو یہ طرحی نعتیہ مشاعرہ ختم ہوا۔ ہزار ہا سامعین جن میں مسلم بھی تھے اور غیر مسلم بھی۔ بخل ہوگا اگر اس امر کا اعتراف نہ کیا جائے کہ یہ مشاعرہ صرف اور صرف انور صاحب کی جد و جہد دلچسپی اور محنت سے منعقد ہو پایا اور مقبول صاحب نے مشاعرہ کو چلایا بھی بہت ہی اچھے انداز سے۔

آخر میں کنوینر اور ناظم مشاعرہ جناب مقبول نصیر آبادی نے مشاعرہ کا اختتام کرتے ہوئے فرمایا کہ "اللہ رب العزت کا لاکھ احسانِ عظیم ہے کہ سیرت پاک کا یہ طرحی نعتیہ مشاعرہ بحسن و خوبی کامیابی کے ساتھ انجام پذیر ہوا۔" آپ نے مزید فرمایا کہ "اس نعتیہ مشاعرہ کی نمایاں خصوصیت یہ رہی کہ ہر مکتبۂ فکر و خیال کے لوگوں نے نہایت ذوق و شوق اور کمال دلچسپی سے مشاعرہ سُنا۔ مشاعرہ ہذا میں غیر مسلم حضرات نے کثیر تعداد میں شرکت فرمائی اور اپنے مسلم بھائیوں کے شانہ بشانہ ابتدا تا انتہا پورے ادب و احترام اور خضوع و خشوع کے ساتھ مشاعرہ سماعت کیا اور کامیاب بنا کر جہاں یہ ثابت کر دیا کہ اردو کسی مخصوص فرقے یا قوم کی زبان نہیں ہے بلکہ بلا امتیاز مذہب و ملت کروڑوں ہندوستانیوں کی عوامی زبان ہے۔ وہیں باہمی اخوت، مذہبی رواداری اور یکجہتی کی بھی اعلیٰ ترین مثال قائم کر دی۔

آخر میں آپ نے شعرائے کرام نیز سامعین حضرات کا خلوصِ دل سے شکریہ ادا کرتے ہوئے اس امید کا اظہار فرمایا کہ "آئندہ بھی "بزمِ انور" کی طرف سے اسی طرح شعری اور ادبی اجتماعات کا اہتمام ہوتا رہے گا انشاء اللہ العزیز۔"
اور اب میں بھی آپ سے رخصت چاہوں گا۔

بقیہ صفحہ ۲۲ کا :- کی کیا ضرورت تھی۔ کہ صفیہ اُس کے لئے بہن کے برابر ہے۔ صفیہ کیونکر اپنے فرائض سے تغافل اپنا سکی۔ ایک ایسا راستہ اپنا گئی جس کے باعث اُس نے چار زندگیوں کو تباہ و برباد کر دیا۔۔۔۔ وہ آخر صفیہ کے ارادوں میں یہ کمزوری کیوں کر سما گئی کیونکر اس کے فرائض کی مورتی پاش پاش ہو کے رہ گئی۔۔۔۔ سوچتا ہوں کہ کیا محبت فرض پر غالب آ سکتی ہے

کیا آپ کا مجموعۂ کلام

اشاعت کے لئے تیار ہے؟

تو اس سلسلے میں ہم سے رجوع کیجئے۔ شاید آپ کے خواب پورے ہو سکیں۔ اور آپ کا مجموعہ نہ صرف شائع ہو کر قبولیتِ خاص و عام پا سکے بلکہ سرکاری طور پر اس پر انعام بھی مل سکے۔

آپ "شانِ ہند" کو پسند فرماتے ہیں تو پھر نہ صرف آپ خود اس کی مستقل خریداری قبول کیجئے بلکہ اپنے احباب کو بھی "شانِ ہند" کا خریدار بنائیے اس حقیقت کو قطعاً فراموش نہ کیجئے کہ ملک بھر میں صرف "شانِ ہند" ہی ایسا ماہنامہ ہے جو صدق دلی سے اردو کی بقا و حیات کے لئے کوشاں ہے۔

(ادارہ)

عاشق چھندواڑوی

قمرالدین برتر
(گوالیار)

ضلع چھندواڑہ مدھیہ پردیش کا ایک آدی واسی علاقہ ہے اسی آدی واسی علاقہ میں سید عاشق علی صاحب عاشق کا نام یوں بجھئے جیسے ریگستان میں تازگی بخش جھرنے کا نام۔ اُن کی شاعری ایسی ہے جیسے کہ جنگل میں بھٹکے ہوئے من کو سکون بخش مدھوبن مل جائے۔

شاعری کے لئے کسی ڈگری یا سند کا ہونا ضروری نہیں شاعرانہ صفت عطیۂ الٰہی ہوتی ہے۔ سید عاشق علی صاحب عاشق کی ابتدائی تعلیم گھر آنگن تک محدود رہی کتابیں اخبارات اور رسائل کا مطالعہ کرتے رہنا معلومات کا ذریعہ بنے۔ اور بزرگی کے عالم میں بھی یہی شغل جاری ہے آزاد چوک چھندواڑہ میں مدینہ بک اسٹال کے مالک ہیں ان کے والد بزرگوار سید اکبر علی مرحوم شہر کے بہت بڑے سوداگر تھے۔ عاشق صاحب کو بچپن سے ہی شعر گوئی سے عشق رہا آپ نے شروع میں تا حفظ لکھنوی سے مشورۂ سخن کیا۔

نمونۂ کلام — یہ میرے لئے بڑا عجیب مسئلہ ہے کہ ان کے نمونۂ کلام کے لئے کیا دوں اور کیا نہ دوں۔ عاشق صاحب سے جتنا میں نے سُنا ہے وہ سبھی اشعار دلکشی کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔ خیر چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

اپنے کیا غیر کے بھی کام ہمیشہ آئے
روشنی بخشی زمانے کو چراغوں کی طرح

سفینہ موجِ تلاطم میں ڈالتے ہیں ہم
وہ اَور ہوں گے جو کناروں کی بات کرتے ہیں

یہ سوچ حشر کیا ہوگا ملے گی کس طرح منزل
اگر رہزن ہی اے عاشق امیرِ کارواں ہوگا۔

وقت پڑا اپنے ہی دھوکہ دے گئے
کون آتا ہے کسی کے کام، سوچ

ہے یہی غنیمت اے عاشق جو آج چمن میں مل بیٹھے
کیا اس کی خبر کل کیا ہوگا ہم ہوں گے کہاں معلوم نہیں

کام ہمت سے ہے تو ذرا شوق دلا ہے
ہو گی آسان مشکل کہیں نہ کہیں

سامنے کارواں ہے بڑھو تو سہی
ہو ہی جائیں گے شامل کہیں نہ کہیں

دوسروں کے جو درد کو سمجھے
ہے وہ اِنساں کہاں؟ نہیں معلوم

غم سے اِنسان نہ گھبرائے کبھی دُنیا میں
زندگی میں بڑے [illegible] بھی آجاتے ہیں

ظلم راون کی طرح جس جگہ بڑھ جاتا ہے
ایسی لنکا کے لئے رام بھی آجاتے ہیں

مجھے یقین ہے گونجے گی یہ زمانے میں
نہ دب سکے گی کسی طور بھی مری آواز

عاشق صاحب کی آواز ضلع چھندواڑہ میں اور مدھیہ پردیش کے دیگر اضلاع میں کافی گونج رہی ہے عاشق صاحب نے نظمیں بھی خوب کہی ہیں۔ جن میں مقبول ترین ہیں۔ ہمارا ہندوستان، شہیدِ وطن، آزادی انقلاب، ہماری زبان؛ وغیرہ۔

آل انڈیا مشاعرہ یوم متھرا اپریل ۱۹۸۰ء میں آپ گوالیار تشریف لاتے اور اپنے خوش کلام سے سامعین کی بھاری بھیڑ کو محظوظ فرمایا۔

آپ ایک کہنہ مشق شاعر خلیق اور ملنسار انسان ہیں۔ اور اچھی شخصیت کے مالک ہیں ———

اُردو

ہم سب کی مُشترکہ زبان ہے۔ اس مُشترکہ سرمایہ کو حکومت صرف مُسلمانوں کی زبان قرار دیکر اُردو کے کروڑوں غیر مُسلم بہی خواہوں کو اس قومی زبان سے دُور کرنا چاہتی ہے۔ اِس لئے ہندوستانی مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ حکومت کی اس چال سے ہوشیار رہیں، خصوصاً مُسلم دانشوروں کو انتہائی طور پر محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ حکومت مُسلم دانشوروں کو مالی امداد۔ اُن کی تصانیف پر انعامات اور دیگر مراعات دے کر یہ ثابت کرنا چاہتی ہے کہ اُردو صرف مسلمانوں کی زبان۔

یاد رکھیئے کہ اُردو نے ہندوستان میں جنم لیا، یہیں اس کی پرورش ہوئی۔ اور اس وقت اُردو ہی یہاں کی عام فہم اور مقبول زبان ہے۔ بنگلہ دیش نے اُردو کے سوال پر ہی جھگڑے شروع کئے تھے۔ پاکستان میں اُردو کا مستقبل روشن نہیں ہے۔ پاکستانی اردو شعرا اور ادیبوں نے پنجابی کو اُردو رسم الخط میں لکھنا شروع کر دیا ہے۔ یعنی وہ اُردو رسم الخط کے ذریعہ پنجابی کو فروغ دے رہے ہیں اس وقت صرف ہندوستان ہی واحد ملک ہے جہاں اُردو زندہ ہے۔ اور رہ سکتی ہے مگر اس کی بقاء حیات کے لئے ہم سب کی دلی کوششوں کی ضرورت ہے۔

ہر گاؤں، قصبہ، قریہ، شہر میں سکولوں میں اُردو پڑھنے والے طلباء کی اشد ضرورت ہے تاکہ حکومت اپنے وعدے کے مطابق اُردو پڑھانے کے انتظامات کر سکے، اپنے بچوں کو اُردو پڑھایئے۔ تعلیم بالغان کے تحت اُردو کے شبینہ مدرسے جاری کرایئے، ہر پبلک لائبریری، ہر کالج لائبریری میں اُردو کتب کی خریداری کے لئے منتظمین کو مجبور کیجئے، حکومت کو مجبور کیجئے کہ سرکاری اطلاعات اور احکامات اُردو میں بھی شائع ہوں ڈاکخانوں، عدالتوں اور سرکاری محکموں میں اُردو میں لکھے خطوط، درخواستیں وغیرہ کو قبول کیا جائے کالجوں کے شعبہ اُردو کے ارباب بست و کشاد اُردو کی کتابوں کی خریداری کی طرف خصوصی ...... توجہ دیں پبلک لائبریریوں میں کتابیں اور رسائل و جرائد پڑھنے والے حضرات منتظمین کو مجبور کریں کہ وہ اُردو کی کتابیں اور اُردو کے رسائل و جرائد کی خریداری کریں۔ آپ اپنی ذاتی لائبریریوں میں اُردو کتب بھی رکھیئے۔ اگلے صفحات پر اُردو کی کچھ اچھی کتابوں کی فہرست دی گئی ہے اُردو کی بقاء حیات کے لئے اُردو مطبوعات کی خریداری کے سلسلے میں "شانِ ہند" آپ کی ہر طرح سے خدمت کے لئے ایک موزوں ادارہ ہے۔ کالجوں کی لائبریریوں کو یونیورسٹی گرانٹ کمیشن کی ہدایات کے مطابق کمیشن دیا جاتا ہے۔ پبلک لائبریریوں کو لائبریری کمیشن دیا جاتا ہے یقین ہے کہ آپ ماہنامہ "شانِ ہند" نئی دہلی ۲ کی اس خالص خدمت اُردو سے مستفید ہوں گے۔

خط و کتابت کا پتہ:۔ ماہنامہ شانِ ہند۔ فلیٹ ۳ انصاری مارکیٹ دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

کتاب	مصنف	قیمت	کتاب	مصنف	قیمت
ہشتِ نظر	رتن پنڈوری	۱۵-۰۰	کالا دیم	کاوش بدری	۲۴-۰۰
انداز نظر	"	۱۰-۰۰	دیوانِ مصحفی	مصحفی	۲۰-۰۰
تاریخ ادب اُردو	جمیل جالبی	۶۰-۰۰	گلدستۂ انیس	سید صفدر حسین نقوی	۱۲-۰۰
ارسطو سے ایلیٹ تک	"	۴۰-۰۰	کلیاتِ شادؔ عارفی	ڈاکٹر مظفر حنفی	۴۰-۰۰
ایلیٹ کے مضامین	"	۲۵-۰۰	آئینہ	حیرت بدایونی	۱۵-۰۰
اُترن	واجدہ تبسم	۲۰-۰۰	سحر نغمہ	ساحر ہوشیارپوری	۱۰-۰۰
نتھ کا بوجھ	"	۲۰-۰۰	گردشِ رنگ	مختار ہاشمی	۱۰-۰۰
آیا بسنت سکھی	"	۲۰-۰۰	تلاش	حسرت شوری	۱۰-۰۰
پھول کھلنے دو	"	۱۲-۰۰	بشارت	اظہار اثر	۱۰-۰۰
زخم دل اور مہک اور مہک	"	۲۰-۰۰	کفرستان	کرشن موہن	۲۰-۰۰
روزی کا سوال	"	۱۰-۰۰	گیان نارنگ کی نظمیں	"	۱۰-۰۰
کیسے سمجھاؤں	"	۷-۰۰	کوئے ملامت	"	۱۰-۰۰
شہر ممنوع	"	۲۵-۰۰	روزنِ خواب	حفیظ النبیمی	۱۰-۰۰
اُردو املا	رشید حسن خاں	۳۰-۰۰	فرمودات	حمید الماس	۱۰-۰۰
اقبال کے خطوط	رفیع الدین ہاشمی	۳۰-۰۰	عروجِ آدم	رفعت سروش	۱۰-۰۰
اقبال ایک تجزیاتی مطالعہ	سید معراج نیر	۱۵-۰۰	محراب	عزیز وارثی	۱۰-۰۰
سفرنامہ اقبال	حق نواز	۲۵-۰۰	سیرت اقبال	مولوی محمد طاہر فاروقی	۱۸-۰۰
اقبال شخصیت اور شاعری	رشید احمد صدیقی	۱۲-۰۰	اُردو اور ہندی کا لسانیاتی رشتہ	ڈاکٹر رام آسرا راز	۱۲-۰۰
قرآن اور اقبال	ابو محمد مصلح	۱۸-۰۰	عکس آئینے کے	ہرچرن چاولہ	۸-۰۰
نصابِ فارسی	ڈاکٹر سید ظہیر علی	۲-۰۰	بازگشت	امیر آغا	۶-۰۰
کلیات میر (حصہ دوم)	مرتبہ [illegible] رضوی	۴۰-۰۰	انکار	"	۱۰-۰۰
جدید اُردو تنقید اصول اور نظریات	شارب ردولوی	۴۰-۰۰	امکان	[illegible]	۱۰-۰۰
اُردو ادب میں سکھوں کا حصہ	امام مرتضیٰ نقوی	۴۰-۰۰	بدلتے رنگ	منظور الامین	۱۰-۰۰
میرے لہو کی آگ	نشتر خانقاہی	۱۰-۰۰	اُجالے	[illegible]	۱۰-۰۰
شامِ میکدہ	یکتا انوری	۸-۰۰	مضامین میر	میر مشتاق احمد	۱۰-۰۰
جامِ شعور	سید اطہر حسین	۱۲-۰۰	چار چہرے	سہیل عظیم آبادی	۸-۰۰
تنقید کے بنیادی مسائل	آل احمد سرور	۷-۰۰	مشعل	اسلم لکھنوی	۵-۰۰
نگارشات	ریاست علی تاج	۱۰-۰۰	اہل سیف	[illegible]	۵-۰۰
مطالعہ ولی	ڈاکٹر شارب ردولوی	۱۰-۰۰	[illegible]	اقبال متین	۱۲-۰۰
کلیات ہزار رنگ	سید بہار الدین احمد	۳۰-۰۰	کاغذ کی لڑکی	شہزادہ احمد صدیقی	۵-۰۰
[illegible]	حافظ عبدالرزاق	۷-۰۰	[illegible]	[illegible]	۲-۲۵

دفتر ماہنامہ شانِ ہند پبلیکیشنز انصاری مارکیٹ دریا گنج - نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

مکاتیب احتشام		۸-۰۰
ذوق طلب و جستجو	اخلاق اختر	۱۰-۰۰
خواب بیداری	اخلاق حسین عارف	۳-۰۰
تنقیدی مطالعے	صغریٰ بیگم	۳-۵۰
گربھ شاستر	انور سیوانی	۶-۰۰
پریم شاستر	خوشتر گرامی	۶-۰۰
لہو پکارے گا آستین کا	رتن پنڈوی	۶-۷۵
افکار سودا	ڈاکٹر شارب ردولوی	۶-۰۰
ہماری شاعری	مسعود حسن رضوی	۷-۵۰
سب سے چھوٹا غم	عابد سہیل	۸-۰۰
دلدل کا کنول	سلیم رضا	۲۰-۰۰
ہو کے مول	شکیلہ اختر	۷-۵۰
دلی جو ایک شہر تھا	راجندر لال	۵-۰۰
۴۳ برس	دت بھارتی	۱۰-۰۰
ایم کی کہانی	اندرجیت لال	۵-۰۰
کتاب کا کفن	کرشن چندر	۷-۰۰
دائیلن کا تار	بالکرشن دو کل	۲-۲۵
شہنشاہ ایڈیپس	سمیع الحق	۶-۰۰
بال جبریل مع شرح	پروفیسر محمد اسلم چشتی	۱۲-۰۰
مطالعہ داغ	ڈاکٹر زیدی	۲۴-۰۰
عشق پر زور نہیں	"	۵-۰۰
دوشیزہ پاکستانی	ایم۔ اسلم	۱۰-۰۰
رنگ سیاہ	ذکاء الدین شایاں	۵-۰۰
مثنوی گلزار نسیم	دیا شنکر نسیم	۲-۵۰
طغیانیاں	طوفان	۳-۵۰
مشاہدات	ڈاکٹر راج کمنیا	۷-۰۰
اوراق زندگی	نبیل سعیدی	۱۵-۰۰
ناؤ و نوش	سیر قناعت	۸-۰۰
طلوع صبح	رہبر جدید	۵-۰۰
چودس رات	گلزار	۳-۰۰
جانم	گلزار	۳-۰۰

بال جبریل	اقبال	۷-۰۰
دلہن	نیاز فتح پوری	۸-۰۰
آتشیں	نسیم اُردی	۴-۰۰
۱۹۶۷ء کی منتخب شاعری	کمار پاشی	۴-۰۰
سب رس کا تنقیدی جائزہ	احسان الحق	۴-۵۰
میشی گھوڑا	اظہر پرویز	۵-۰۰
نیا ہندوستان	اندرجیت لال	۸-۰۰
یادوں کی برات کا خصوصی مطالعہ	صابر کمال	۱۲-۰۰
ایک دن کا بادشاہ	اظہر پرویز	۵-۵۰
گل افشانیٔ گفتار	نشور احمدی	۵-۰۰
مغلوں کا نظام مالگزاری	نعمان احمد صدیقی	۹-۰۰
مکتوبات جوش ملسیانی بنام کالی داس گپتا	کالی داس گپتا	۱۹-۰۰
فاصلے	مدہوش بلگرامی	۳-۰۰
غالب شخص اور شاعری	مجنوں گورکھپوری	۱۰-۰۰
ہند آریائی اور ہندی	سنتی کمار چٹرجی	۱۳-۵۰
اقبال شاعر اور فلسفی	وقار عظیم	۱۴-۰۰
شاعری اور شاعری کی تنقید	ڈاکٹر عبادت بریلوی	۱۹-۰۰
ادب کسے کہتے ہیں	اظہر پرویز	۴-۰۰
سات تحریریں	عبدالقوی دسنوی	۱۴-۰۰
رشید احمد صدیقی	مالک رام	۱۲-۰۰
[illegible]	[illegible]	۴-۰۰
انتظار کی رات	کمار پاشی	۴-۰۰
وجدان	نریش کمار شاد	۶-۰۰
احسان اللہ عباسی حیات اور کارنامے	فیروز احمد	۸-۰۰
نقش فریادی	فیض	۲-۰۰
راز و نیاز	راز کرچوی	۵-۰۰
نمائندہ مختصر افسانے	محمد طاہر فاروقی	۳-۰۰
رنگ حیات	منور کار نجوی	۵-۰۰
آواز کا جسم	محمود سعیدی	۱۰-۰۰
ندی کی کرنیں	ندی بہار	۶-۰۰
عبدالعلیم حیات اور ادبی خدمات	ڈاکٹر مظفر عباس نقوی	۹-۰۰

دفتر ماہنامہ شان ہند۔ فلیٹ ۳ انصاری مارکیٹ ، دریا گنج دہلی ۶

عکس غالب	آل احمد سرور	۸ — ۰۰
مقالات الشعراء	نثار احمد فاروقی	۸ — ۰۰
ہندوستانی مشرقی الفرقہ میں	کالی داس گپتا رضا	۱۰ — ۵۰
افکار و نظریات	ڈاکٹر وفضل امام	۱۲ — ۰۰
یاروں کے سائے	ممتاز مرزا	۲ — ۰۰
تجربات اور تجزیہ	محمد یوسف ٹینگ	۸ — ۰۰
محکانگ	حضرت علامہ سحر عشق آبادی	۵ — ۰۰
شرح ضرب کلیم	پروفیسر یوسف سلیم چشتی	۱۲ — ۰۰
غبار خاطر کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد	۲ — ۰۰
قاعدہ بیدی ریختہ عرف رسالہ گل کرسٹ، ڈاکٹر احمد انصار اللہ		۲ — ۲۰
پطرس کے مضامین	پطرس بخاری	۳ — ۵۰
خراشیں	مادھو کرشن	۱۰ — ۰۰
کیا مسافر تھے	عرفان خلیلی	۲ — ۵۰
پرانوں کی کہانیاں	ڈاکٹر گوپی چند نارنگ	۸ — ۲۵
مجلہ بشارت	شبیر علی صدیقی	۴ — ۰۰
بکھرے ہوئے موتی	"	۸ — ۰۰
دیپک راگ	مظفر حنفی	۲ — ۰۰
جنبش لب	ایاز جھانسوی	۴ — ۰۰
دھنک	عزیز اندوری	۲ — ۰۰
بھوپال ایک خواب	عبدالرحیم	۴ — ۰۰
اردو کا المیہ	مسعود حسن خاں	۱۰ — ۰۰
دیس دیس کی کہانیاں	اظہر پرویز	۲ — ۲۵
تلاش فن	سید شاہین صدی	۲ — ۰۰
داستان ایمان فروشوں کی	التمش	۲۵ — ۰۰
۱۹۵۸ء کی منتخب شاعری	راج نرائن راز	۲ — ۰۰
بادہ وجام	شارق میرٹھی	۲ — ۵۰
نظم جدید کی کروٹیں	وزیر آغا	۱۷ — ۰۰
ادب کا مطالعہ	اظہر پرویز	۱۰ — ۰۰
مضامین رشید	پروفیسر رشید احمد صدیقی	۱۰ — ۰۰
زرگل	حفیظ الرحمن واصف	۱۰ — ۰۰
گوپال متل ایک مطالعہ	محمد عبدالحکیم	۱۵ — ۰۰

کیفیہ	برج موہن کیفی دہلوی	۱۲ — ۰۰
رخت وپابس	ظفر اقبال	۴ — ۰۰
اردو تحقیق افسانہ کے نام	شاہد اعظمی	۱۲ — ۰۰
شگوفہ راز	خواجہ عبدالغفور	۱ — ۰۰
کلیات صاحب	مولانا غلام علی صاحب	۷ — ۰۰
انسانی ارتقا	نواز ام۔ آر۔ سامی	۱۳ — ۷۵
چار درویشوں کا قصہ	نور الحق نقوی	۲ — ۲۵
حیدر علی	نرنیدر کرشن سنہا	۱۱ — ۰۰
نغمات مہتاب	مہتاب پسراوری	۱۷ — ۰۰
نگارشات ادیب	مسعود حسن رضوی	۹ — ۰۰
نشیب و فراز	نگین	۵ — ۰۰
تاروں کی چھاؤں میں	عزیز عالم	۲ — ۰۰
پیکر خیال	اختر بستوی	۲ — ۰۰
عقل مند مچھیرا	ایم ۔ ندیم	۲ — ۰۰
لفظوں کا پیرہن	بدیع الزماں خاور	۷ — ۰۰
بحر بیکراں	اختر بستوی	۵ — ۰۰
ضیائے کوکب	کوکب گھرونڈوی	۳ — ۵۰
آدم کے بیٹے	نند گوپال	۳ — ۰۰
لال قلعہ	ڈاکٹر صفدر	۸ — ۰۰
ہٹ دھرم	ملکہ متین	۱۳ — ۰۰
شبیہ	سلمیٰ اعوان	۱۷ — ۰۰
ایک زخم سہی	شبنم قیوم	۴ — ۰۰
خاندان	رضیہ بٹ	۴ — ۰۰
اچانک	سرور جہاں	۱۰ — ۰۰
ریشم کے تار	عارف	۸ — ۰۰
ابن بطوطہ کے تعاقب میں	ابن انشا	۴ — ۰۰
مہاتما گاندھی کا پیغام	موہن راز	۴ — ۰۰
کلیات اقبال	ڈاکٹر اقبال	۱۸ — ۰۰
بیسویں صدی کے نثر نشتر	خوشتر گرامی	۱۵ — ۰۰
فردوس نظر	دنیا تا قصہ مست	۱۵ — ۰۰
ناقابل فراموش	دیوان سنگھ مفتون	۱۲ — ۵۰

دفتر شان ہند۔ خلیفہ مت انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی نمبر ۱۱۰۰۰۲

جذباتِ مشرق	دیوان سنگھ مفتون	۷۰—۰۰
کلیاتِ اقبال (اردو) عکسی	صدی ایڈیشن	۱۸—۰۰
فکرِ اقبال	خلیفہ عبدالحکیم	۲۰—۰۰
اقبال کی کہانی کچھ میری کچھ ان کی زبانی	ظہیر الدین احمد جامعی	۱۰—۰۰
انوار و تجلیات	مولانا قمر واحدی	۱۰—۰۰
تصوراتِ اقبال	مولانا صلاح الدین احمد	۱۲—۵۰
بانگِ درا عکسی	علامہ اقبال	۸—۰۰
ضربِ کلیم "	"	۷—۰۰
ارمغانِ حجاز	"	۴—۵۰
فرہنگِ آصفیہ	مکمل چاروں حصے	۱۵—۰۰
اقبال البم	[illegible] ناشد آزاد	۵—۰۰
غالب شخص اور شاعر	مجنوں گورکھپوری	۱۰—۰۰
اطرافِ غالب	ڈاکٹر سید عبداللہ	۱۵—۰۰
فلسفیٔ غالب	احمد رضا	۶—۰۰
اردو لسانیات	ڈاکٹر شوکت سبزواری	۸—۰۰
اردو زبان و ادب	ڈاکٹر مسعود حسین خاں	۷—۵۰
اردو مثنوی کا ارتقاء	عبدالقادر سروری	۶—۰۰
انتخابِ مثنویاتِ اردو	مغیث الدین فریدی	۳—۵۰
مثنوی گلزارِ نسیم	ظہیر احمد صدیقی	۳—۰۰
اردو کے تیرہ افسانے	مرتبہ ڈاکٹر اطہر پرویز	۱۰—۰۰
منٹو کے نمائندہ افسانے	"	۹—۰۰
نیا افسانہ	وقار عظیم	۱۰—۰۰
اردو شاعری کا مزاج	وزیر آغا	۳۰—۰۰
تخلیقی عمل	"	۱۴—۰۰
تنقید اور احتساب	"	۱۰—۰۰
نظمِ جدید کی کروٹیں	"	۱۲—۰۰
اردو ڈراما۔ تاریخ و تنقید	عشرت رحمانی	۱۵—۰۰
ایمائی ڈراما	عتیق احمد صدیقی	۱۶—۰۰
مضامینِ نو	خلیل الرحمٰن اعظمی	۱۶—۰۰
جنگ آمد	کرنل محمد خاں	۱۴—۰۰
[illegible] ادب	ابنِ فرید	۱۶—۰۰

بہارستانِ اولیاء	حضرت آرزو	۱۰—۰۰
ظہورِ قدسی	"	۱۰—۰۰
باغ و بہار	سلیم اختر	۱۰—۰۰
اسلوب	سید عابد علی عابد	[illegible]—۰۰
انسان اور آدمی	محمد حسن عسکری	۸—۰۰
ستارہ یا بادبان	"	۱۴—۰۰
تنقیدیں	پروفیسر خورشید الاسلام	۲۰—۰۰
آج کا اردو ادب	ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی	۱۱—۰۰
غزل اور مطالعۂ غزل	ڈاکٹر عبادت بریلوی	۲۰—۰۰
جدید شاعری	"	۲۵—۰۰
غزل اور درسِ غزل	اختر انصاری	۵—۰۰
غزل کی سرگزشت	"	۷—۰۰
حالی اور نیا تنقیدی شعور	"	۵—۰۰
اردو ادب کی تاریخ	عظیم الحق جنیدی	۷—۵۰
مقدمہ شعر و شاعری	مقدمہ از ڈاکٹر وحید قریشی	۶—۰۰
تنقیدی سرمایہ	عبدالشکور	۳—۵۰
شعاعِ ادب	شرافت حسین مرزا	۳—۷۵
تحقیقی مطالعۂ انیس	ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی	۱۰—۵۰
گلدستۂ مضامین و انشا پردازی	ڈاکٹر محمد عارف خاں	۵—۹۵
ہائر سیکنڈری بک کیپنگ حصہ اول	ڈاکٹر محمد عارف خاں	۲۰—۰۰
" " " حصہ دوم	"	۲۰—۰۰
ایڈوانسڈ اکاؤنٹس	"	۲۵—۰۰
جدید طریقۂ تعلیم تجارت (بزنس، مختصر، آرگنائزیشن)	"	۲۰—۰۰
دنیا کی حکومتیں (ورلڈ کانسٹی ٹیوشن)	ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی	۱۲—۰۰
تاریخ افکارِ سیاسی (پولیٹیکل تھاٹس)	"	۶—۹۵
جمہوریہ ہند (کانسٹی ٹیوشن آف انڈیا)	"	۷—۵۰
مبادی سیاسیات (ایلیمنٹس آف پالیٹکس)	"	۶—۵۰
مبادیاتِ علمِ مدنیت (ایلیمنٹس آف سوکس)	"	[illegible]—۷۵
تاریخ تہذیبِ عالم (ورلڈ ہسٹری)	اے۔ اے۔ ہاشمی	۱۴—۰۰
اسلامی تاریخ	"	۵—۰۰
تعلیمی نفسیات کے نئے زاویے	مسرت زمانی	[illegible]—۵۰

علم قانہ داری	مسرت زمانی	۷-۵۰
فیروز اللغات (جیبی) مکمل		۷-۰۰
اُردو صرف	ڈاکٹر محمد انصار اللہ	۲-۹۵
جدید تعلیمی مسائل	ڈاکٹر ضیاء الدین	۲-۷۵
انگلش ٹرانسلیشن کمپوزیشن اینڈ گرامر		۴-۵۰
اُردو نحو	ڈاکٹر محمد انصار اللہ	۱-۹۵
سرسید پال ریویو	ملک خالد حسین	۸-۰۰
غالب، مدح، قدح کی روشنی میں	سید صباح الدین عمر	۱۵-۰۰
مولانا محمد علی کی یادمیں	" "	۵-۰۰
مولانا حسرت موہانی خاں	مولانا عبدالسلام قدوائی	۳-۰۰
زبان اور قواعد	رشید حسن خاں	۱۷-۰۰
ہندوستانی خارجہ پالیسی	ڈاکٹر بمل پرشاد	۱۲-۲۵
ابتدائی علم شہریت	شریف الحسن نقوی	۴-۵۵
سنگریزے	سعید سہروردی	۵-۰۰
ازسرنو شعری مجموعہ	دلاور فگار	۵-۰۰
سلسلاتی مصدر نامہ	حفیظ الرحمٰن واصف	۲-۵۰
غزل پس منظر، پیش منظر	ساحل احمد	۲۸-۰۰
طبیعیات کے بنیادی تصورات	آرتھر بیرز	۲۵-۰۰
تاریخ فلسفہ اسلام	ٹ دو بوائر	۷-۵۰
تاریخ تمدن ہند	پروفیسر محمد مجیب	۱۲-۰۰
تاریخ فلسفہ سیاست	"	۱۸-۰۰
ہمارا قدیم سماج	سید یحییٰ حسن	۱۰-۰۰
تاریخ تعلیم ہند	سید نوراللہ جے پی نائک	۲۰-۰۰
انقلاب ۱۸۵۷ء	مرتبہ پی، سی جوشی	۱۲-۷۵
ہندوستانی معاشرہ عہد وسطیٰ میں	مترجم کنور اشرف	۱۸-۲۵
لسانی مطالعے	ڈاکٹر گیان چند جین	۱۲-۵۰
شرح بھگوت گیتا	مترجم حسن الدین احمد	۴-۷۵
خسرو شناسی	مرتب ظ انصاری	۲۷-۵۰
ہندوستانی معیشت	ازمالک گھوش	۲۷-۷۵
بچے شف	ڈاکٹر ظ انصاری	۱۱-۰۰
تالستائے	ڈاکٹر محمد یٰسین	۹-۲۵

جدید ہندوستان میں ذات پات،	ایم ایس سری نواس	۱۰-۰۰
آبادی	ترجمہ مخمور جالندھری	۵-۲۵
پنڈت وشنو دگمبر	" ش قدوائی	۲-۲۵
عظیم باغی	" ڈاکٹر رپا تھاسرن	۲-۲۵
قاضی نذرالاسلام	" عرش ملسیانی	۲-۲۵
کچھوا اور خرگوش	ڈاکٹر ذاکر حسین	۲-۰۰
کبیر	" ایم کے درانی	۲-۲۵
گرونانک	" مخمور جالندھری	۳-۰۰
مٹتی بنتی تصویریں	" رضیہ سجاد ظہیر	۵-۰۰
تاش کے محل (ناول)	" زینت ساجدہ	۵-۵۰
سفید خون	" رتن سنگھ	۸-۰۰
گرو گوبند سنگھ	" مخمور جالندھری	۴-۰۰
زندگی ایک ناٹک	" کشور سلطانہ	۱۰-۰۰
رنجیت سنگھ	" مخمور جالندھری	۲-۷۵
جدوجہد آزادی	" غلام ربانی تاباں	۵-۵۰
بگڑا وارڈ سے	" عرش ملسیانی	۵-۲۵
شاعر	" پریش کمار ڈے	۸-۷۵
موت کے بعد	" محمود سروس	۸-۷۵
آدمی کے روپ	" سہیل عظیم آبادی	۱۲-۰۰
اکبر	" رضیہ سجاد ظہیر	۲-۵۰
انشائیات	ڈاکٹر سید عابد حسین	۱۵-۰۰
قطرے خوش گزرے	بیگم انیس قدوائی	۱۲-۰۰
مجیب صاحب کی ڈرامہ نگاری	قمر اعظم ہاشمی	۵-۰۰
فکر و ریاض	علی جواد زیدی	۱۲-۰۰
رموز غالب	ڈاکٹر گیان چند	۱۸-۰۰
اقبال اور مغربی مفکرین،	جگن ناتھ آزاد	۱۰-۵۰
ذکر غالب	مالک رام	۱۵-۰۰
کچھ نثر میں بھی	آنند نرائن ملا	۱۶-۰۰
بازگشت	ڈاکٹر ظہیر احمد جالسی	۱۱-۰۰
جدید اُردو	ڈاکٹر محمد حسن	۱۵-۰۰
ہیرانیس سے تعارف	صالحہ عابد حسین	۶-۰۰

دفتر شان ہند، ہندہ میگزین، انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی

اردو کیسے لکھیں	رشید حسن خاں	۴—۰۰
مشاہیر کے خطوط	عبداللطیف اعظمی	۱۲—۵۰
جانے والوں کی یاد آتی ہے	صالحہ عابد حسین	۱۸—۰۰
مسالک و منازل	ضیاء احمد بدایونی	۲۲—۰۰
نگارشات	پروفیسر محمد مجیب	۱۶—۰۰
غالب اور شاہان تیموریہ	خلیق انجم	۹—۵۰
ہوا کے دوش پہ	غلام ربانی تاباں	۵—۵۰
قدیم دلی کالج	مالک رام	۴—۵۰
مسرت سے بصیرت تک	آل احمد سرور	۱۲—۵۰
طنزیات اور مضحکات	رشید احمد صدیقی	۱۰—۵۰
اشخاص و افکار	ضیاء الحسن فاروقی	۷—۵۰
تجزیے	ڈاکٹر گیان چند	۱۲—۵۰
اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ	ڈاکٹر محمود الٰہی	۱۴—۰۰
[illegible] کربلا کلام انیس کے آئینے میں	صالحہ عابد حسین	۱۴—۰۰
حسرت کی شاعری	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	۲—۵۰
[illegible] فکر	"	۳—۷۵
[illegible]کے خطوط	مجنوں گورکھپوری	۲—۷۵
[illegible]وں کے سائے	عتیق احمد صدیقی	۱۸—۰۰
نقش میر	نثار احمد فاروقی	۱۱—۰۰
آشفتہ بیانی میری	رشید احمد صدیقی	۵—۰۰
[illegible] صورتیں الٰہی	مالک رام	۱۰—۰۰
[illegible]رے ذاکر صاحب	رشید احمد صدیقی	۹—۰۰
[illegible] بر تعلیم	سعید انصاری	۱۲—۰۰
[illegible] معاصرین اول	مالک رام	۱۶—۰۰
" " دوم	"	۱۴—۰۰
ہندوستانی مفسرین اور ان کی عربی تفسیریں	سالم قدوائی	۳۰—۰۰
[illegible]چند کے خطوط	مدن گوپال	۷—۵۰
[illegible]کا مزدور	"	۵—۰۰
[illegible]ہائے گراں مایہ	رشید احمد صدیقی	۸—۰۰
ذاکر حسین	عبداللطیف اعظمی	۶—۵۰
[illegible]محبوب	نعیم احمد	۸—۵۰

شراب کہنہ	رشید نعمانی	۳—۰۰
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں	غلام السیدین	۴—۵۰
کیا خوب آدمی تھا	ڈاکٹر عابد حسین	۲—۵۰
تاریخ کیسے پڑھائیں	مسرور ہاشمی	۸—۰۰
تعلیم اور سماج	سعید انصاری	۵—۰۰
گاندھی جی کے تعلیمی خیالات	"	۱۶—۰۰
تعلیم فلسفہ اور سماج	ڈاکٹر سلامت اللہ	۱۲—۵۰
بنیادی استاد کے لئے	"	۸—۵۰
ہم کیسے پڑھائیں	ڈاکٹر سلامت اللہ	[illegible]—۵۰
موجودہ تعلیمی مسائل	عبداللہ ولی بخش قادری	۴—۵۰
تعلیمی خطبات	ڈاکٹر ذاکر حسین	۸—۰۰
عربوں میں تاریخ نگاری کا آغاز و ارتقاء	محمود الحسن	۱۵—۰۰
دین الٰہی اور اس کا پس منظر	میر محمد خاں شہاب مالیرکوٹلوی	۴—۰۰
دنیا اسلام سے پہلے اسلام کے بعد	عبدالسلام قدوائی	مجلد ۴—۲۸، غیر مجلد ۳—۰۰
اسلامی عقائد و مسائل مذہب	جمال الدین	۴—۰۰
مسلمان اور سیکولر ہندوستان	ڈاکٹر مشیر الحق	۷—۰۰
مذہب اور جدید ذہن	"	۷—۵۰
ہماری تہذیبی میراث	سفارش حسین رضوی	۷—۰۰
مسلمان اور عصری مسائل	ڈاکٹر عابد حسین	۶—۵۰
سماجی تبدیلیاں	رام شرن شرما	۲—۰۰
اسلام کی اخلاقی تعلیمات	امام غزالی	۹—۵۰
امریکہ کے کالے مسلمان	مشیر الحق	۲—۵۰
مسلم پرسنل لا کے تحفظ کا مسئلہ	طاہر محمود	۴—۰۰
تاریخ الامت اول	مولانا اسلم جیراجپوری	۳—۵۰
" دوم	"	۵—۰۰
" سوم	"	۴—۲۵
" چہارم	"	۴—۲۵
" پنجم	"	۴—۲۵
" ششم	"	۴—۲۵
" ہفتم		۴—۰۰
ہشتم		۳—۵۰

دفتر شان ہند، فلیٹ نمبر انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی

کچھ پرانے خط (دوم)	جواہر لال نہرو	۱۰-۰۰
یادگار شخصیتیں	"	۷-۰۰
پچھلے پہر	جاں نثار اختر	۷-۰۰
بیاض مریم	سکندر علی وجد	۳-۰۰
ضبط شدہ نظمیں	مرتبہ خلیق انجم	۲۱-۰۰
ہندوستان ہمارا (اول، دوم)	جاں نثار اختر	۲۴-۰۰
نئی نظم کا سفر	خلیل الرحمٰن اعظمی	۱۲-۵۰
آتش گل	جگر مراد آبادی	۸-۰۰
نئی دنیا کو سلام	سردار جعفری	۸-۰۰
انتخاب حالی	سفارش حسین رضوی	۶-۵۰
ہیروئن کی تلاش (دنیا ایڈیشن)	محمد مجیب	۱-۵۰
آذر کا خواب	قدسیہ زیدی	۴-۰۰
خانہ جنگی	پروفیسر محمد مجیب	۲-۲۵
انجام	" "	۱-۵۰
کھیتی	" "	۱-۵۰
اوپر کی منزل	کرتار سنگھ دگل	۵-۰۰
آئینہ ایام	ترجمہ: خلیق احمد	۴-۵۰
پردۂ غفلت	ڈاکٹر سید عابد حسین	۲-۲۵
سراج الدولہ	ترجمہ: اشفاق حسین	۲-۲۵
ہاتھ ہمارے قلم ہوئے	راجندر سنگھ بیدی	۱۰-۰۰
ایک چادر میلی سی	" "	۴-۵۰
دل دل	ترجمہ: رضیہ سجاد ظہیر	۵-۵۰
سات سال	" " "	۶-۰۰
ڈنگو	" قرۃ العین حیدر	۲-۰۰
پت جھڑ کی آواز	" "	۷-۰۰
ایک تھی انیتا	امرتا پریتم	۷-۰۰
باپ بیٹے	انور عظیم	۶-۰۰
واردات	پریم چند	۵-۰۰
پیار کا موسم	مہندر ناتھ	۴-۵۰
دلی کی شام	بلقیس جہاں	۸-۰۰
اپنے دکھ مجھے دے دو	راجندر سنگھ بیدی	۷-۰۰

چراغوں کا سفر	رام لال	۴-۰۰
ایوان غزل	جیلانی بانو	۱۷-۰۰
آرزو	سراج انور	۱۲-۰۰
دھند	صغرا مہدی	۸-۰۰
دھوپ چھاؤں	مسرور جہاں	۱۱-۵۰
خاک تمنا	سراج انور	۱۱-۵۰
منزلیں پیار کی	سلمیٰ پریمی	۸-۰۰
چلیس	انور کمال حسینی	۵-۰۰
اللہ میگھ دے	رضیہ سجاد ظہیر	۷-۵۰
ابھی دھند	صالحہ عابد حسین	۵-۵۰
پا بہ جولاں	صغرا مہدی	۶-۰۰
دوسرے کنارے تک	عزیز قیسی	۳-۵۰
اپنی اپنی صلیب	صالحہ عابد حسین	۹-۰۰
کالا شہر گورے لوگ	احسان الحق	۴-۰۰
راستے اور کھڑکیاں (افسانے)	انور خاں	۵-۰۰
پتھر کا شہزادہ (افسانے)	صغرا مہدی	۴-۰۰
جہاں آرا (اوپیرا)	رفعت سروش	۵-۵۰
تنہائی (ڈرامہ)	ساگر سرحدی	۴-۰۰
دس افسانے	صغرا مہدی	۲-۵۰
حیات سعدی	رشید حسن خاں	۵-۳۰
انتخاب اکبر الہ آبادی	ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی	۲-۰۰
دیوان ذوق	رشید حسن خاں	۱۱-۰۰
امراؤ جان ادا	ڈاکٹر محمد حسن	۸-۵۰
مجالس النسا	صالحہ عابد حسین	۴-۳۰
انتخاب مضامین شبلی	رشید حسن خاں	۱۱-۰۰
یادگار غالب (حصہ فارسی)	مالک رام	۱۰-۰۰
مثنوی گلزار نسیم	رشید حسن خاں	
گزشتہ لکھنؤ	" "	۱۲-۵۰
فسانۂ مبتلا	ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی	۵-۵۰
افادات سلیم	خلیق انجم	۷-۵۰
توبۃ النصوح	مالک رام	۶-۵۰

[illegible] فلیٹ ۶ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی



NIKHAT KHAN
(Nagpur)



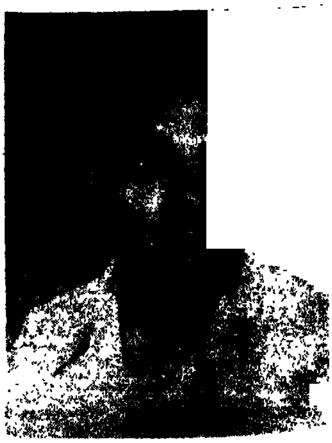
SYED 'ASHAQUE'
(Chandwara)



'ZAFFAR' Sambhali



'DILDAR HASHMI'
(Poona)



Prakash Narain Saxena
JOHARY Jaipur



QUAMAR-UD-DIN
'Bartar'



NAZEER FATEHPURI
(Poona)



'MUKHLIS (Pusad)



MEHTAB TABAN
(Lukhnowi)



'HANIF' Sojati



'HAIRAT' Durgul

ٹیلیفون نمبر ۲۷۸۸۸۰

رجسٹرار آف نیوز پیپر آف انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۶۲۲/۵۷

رجسٹرڈ نمبر ڈی ۰، ۱۰۵

ایڈیٹر سرور تونسوی

قیمت سالانہ پندرہ روپے
فی پرچہ ایک روپیہ پچاس پیسے
اس شمارہ کی قیمت دو روپے

ماہنامہ شانِ ہند دہلی

(آزادی ایڈیشن)

جلد نمبر ۲۹ | اگست ۱۹۷۸ء | شمارہ نمبر ۸

۱۵ اگست

ہندوستان کا یہ ۳۱واں یوم آزادی ہے اور جنتا پارٹی حکومت کا دوسرا یوم آزادی یعنی ہندوستان نے اپنی ہی حکومت کانگریس کے ہاتھوں جمہوریت کی تمام قدریں کھونے کے بعد تقریباً ڈیڑھ سال قبل عملی طور پر ان کھوئی ہوئی جمہوری قدروں کو دوبارہ حاصل کیا اور ایک شخصی حکومت سے نجات پانے کے بعد ہندوستانی عوام نے ملک کی باگ ڈور کما حقہٗ جنتا پارٹی کے ہاتھوں میں دیدی۔ اس حقیقت سے انکار کفران نعمت ہوگا کہ جنتا پارٹی نے ہندوستانی عوام کو جملہ جمہوری حقوق از سر نو دیکر صحیح معنوں میں ایک قومی حکومت کا دور شروع کیا۔ گویا جسطرح ۱۵ اگست جہاں ہمیں انگریزی حکومت سے آزادی حاصل کرنے کی یاد دلاتا ہے ٹھیک اسی طرح اب یہ یادگاری دن کانگریس کی جمہوریت سوز، عوام دشمن اور شخصی حکومت کے خاتمے کا بھی مبارک قومی تہوار ہے۔

آئیے ہم سب ملکر یہ عہد کریں کہ ہندوستان میں جمہوری قدریں قائم رکھیں گے۔ کسی شخصی حکومت کو برسر اقتدار نہ آنے دینگے اور ملک کو داخلی وخارجی ہر خطرے سے محفوظ رکھیں گے۔ اور ہر ہندوستانی بلا تفریق مذہب و ملت ہندوستان کا وفادار رہے گا۔ اور ہم حکومت کو بدنام کرنے کی بجائے اپنے اعمال کا جائزہ لیں گے کہ کیا واقعی ہم ایک آزاد ملک کے آزاد شہری ہیں اور اپنے فرائض کا احساس کرتے ہیں یا نہیں۔

یاد رکھیئے مہنگائی، بدنظمی، بھرشٹاچار، بھائی بھتیجا واد۔ اور قانون شکنی کے ہم خود ذمہ دار ہیں اور دوش دیتے ہیں حکومت پر۔

کاش اگلی بار ۱۵ اگست کا یہ قومی تہوار ہمیں اپنا جائزہ لینے کی توفیق دے۔ (ادارہ)

محمد یار کاش سرور ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے ... پرنٹنگ پریس ... جامع مسجد دہلی اور ... سے چھپوا کر دفتر شان ہند ... دریا گنج دہلی سے شائع کیا

پانچصد روپے انعام

حضرت محمدؐ پر ہزارہا تصانیف نظم و نثر شائع ہوئیں نیز کروڑہا فارسی اور اردو میں نعتیں کی گیئں

اولیاء کرام پر فارسی اور اردو میں ہزارہا شاعروں نے مناقب کہیں

ظہورِ قدسی جو رسول اللہ حضرت محمدؐ پر کہی گئی نعتوں، سلام و مناجات کا مجموعہ ہے

بہارستانِ اولیاء جس میں ۵۵ اولیائے کرام پر مناقب کہی گئی ہیں۔

حضرت آرزو سہارن پوری کی ایسی تصانیف ہیں جن کے متعلق یہ

دعوےٰ

سے کہا جا سکتا ہے کہ ان موضوعات پر اردو زبان میں آج تک ان تصانیف سے بہتر تصانیف شائع نہیں ہوئی ہیں۔ اگر ان تصانیف سے بہتر کتابیں ان موضوعات پر اردو زبان میں کوئی صاحب پیش کریں تو انھیں پانچ صد روپے نقد انعام پیش کیا جائیگا

ہر کتاب کی قیمت مجلد دس روپیہ ہے۔ ریکسین کی بہترین پختہ خوشنما جلدوں پر سنہری ڈائی سے کتابوں کا نام کندہ ہے۔
آپ یہ کتابیں منگائیے۔ اگر پسند نہ ہوں تو دوسرے ہی دن واپس بھجوا کر قیمت واپس لے لیں۔
دونوں کتابیں یک مشت خریدنے پر محصول ڈاک چار روپے معاف کر دیا جائے گا۔
ماہِ رمضان المبارک میں ان کتابوں کو پڑھنا ذریعہ نجات ہوگا۔

پہلی فرصت میں فرمائش بھجوائیے

دفتر ماہنامہ شانِ ہند۔ فلیٹ ۸ ۔ انصاری مارکیٹ۔ دریا گنج۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

15 اگست

خوشیوں کا دن ـــــ قدروں اور نصب العین کے لئے اپنے آپ کو پھر وقف کر دینے کا دن۔

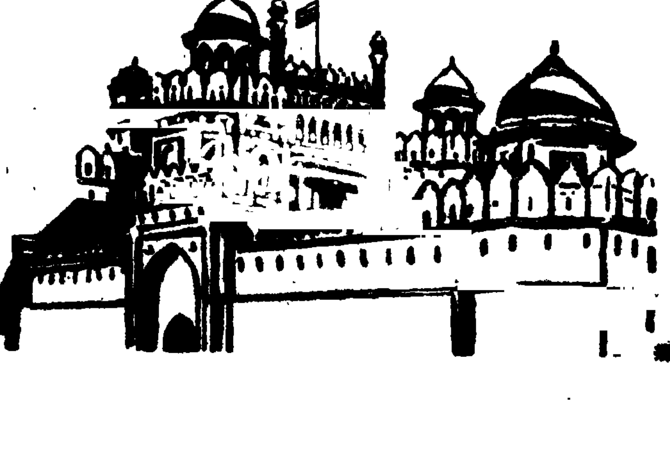
آج کے دن ہم یاد کرتے ہیں:

— مہاتما گاندھی کی راہنمائی میں آزادی کی تاریخی جدوجہد۔
— ہمارے لاکھوں کروڑوں ہموطنوں کی قربانیاں اور مصائب۔
— آزادی کا استحکام، ملک کی یکجہتی اور اقتصادی ترقی کی نیو رکھنے کے عظیم کام۔

آج ہم عہد کرتے ہیں:

— ہم ملک سے بے روزگاری، بیماری اور ناخواندگی دُور کریں گے۔
— ہم اپنے 5 لاکھ 76 ہزار گاؤوں کے لوگوں کو پینے کا پانی مہیا کریں گے اور ان کی صحت، تعلیم اور سڑکوں کی کم سے کم ضرورتوں کو پورا کریں گے۔
— ہم سماج کے کمزور طبقوں کو اپنے ساتھ برابر کے حصہ دار بنا کر سماجی اور اقتصادی ترقی کی راہ پر آگے بڑھیں گے۔

آزادی کی اس اکتیس ویں سالگرہ پر آیئے ہم عہد کریں کہ ہم مہاتما گاندھی کے سپنوں کا بھارت تعمیر کریں گے ـــ آیئے! ہم ہر آنکھ سے آنسو پونچھنے کی کوشش کریں۔



davp 78/207

دلی شاہراہِ ترقی پر گامزن

صاف ستھرا انتظامیہ :-

عام لوگوں کو بنیادی شہری سہولیتں مہیا کرنے اور انسدادِ بدعنوانی کے لئے دلی انتظامیہ کے موثر اقدامات۔

ہریجنوں اور پسماندہ طبقوں کی فلاح و بہبود :-

۵۰ لاکھ روپے ہریجن بہبودی اسکیموں پر صرف ہو چکے ہیں۔ اس سال کے لئے ایک کروڑ روپے سے بھی زیادہ مخصوص ٹیکنیکل تعلیمی اداروں میں تمام ہریجن طلبہ کے لئے وظائفِ خصوصی۔ نوآباد کالونیوں میں بسنے والے کمزور طبقوں کی حالت بہتر بنانے پر خصوصی توجہ۔

سب کے لئے تعلیم :-

تعلیم کے قومی نشانہ کو پورا کرنے میں دلی سب سے آگے۔ تمام بچوں کو تعلیم دینے کے لئے مزید ۲۱ اسکول کھولے گئے۔ اور اس سال مزید ۹، کھولے جائیں گے۔ برسرروزگار لوگوں کو بھی تعلیم کی سہولیات۔ دیہی طالبات کے لئے مفت ٹرانسپورٹ، تمام غریب بچوں کو مفت کتابیں اور مفت وردیاں۔

طبی سہولیات :-

گھر کے نزدیک غریبوں اور گاؤں والوں کو طبی سہولیتں مہیا۔ دین دیال اپادھیائے اسپتال میں ۵۰۰ بستروں کا بندوبست۔ شاہدرہ میں اسپتال اور میڈیکل کالج کی تعمیر شروع۔ دیہات اور دور دراز کالونیوں میں ۱۰۰ بستروں والے اسپتالوں کی تعمیر جلد شروع ہوگی۔ لوک نایک جے پرکاش نارائن اسپتال میں گرونانک آئی سینٹر کا قیام۔

خوراک و رسد :-

دالیں، سبزیاں، چائے، صابن وغیرہ سستے داموں پر۔ راشن کارڈ ہولڈروں کو پہلے سے زیادہ گیہوں، اور آٹا۔ بدعنوان بیوپاریوں کے خلاف سخت کاروائی۔

جاری کردہ:- محکمہ اطلاعات و اشاعت، دلی انتظامیہ دلی۔

افکار و واقعات

جناب محمد عظیم صاحب کا مکتوب گرامی اور اس کا جواب

جناب محمد عظیم صاحب فیروزآباد (یوپی) کی ایک مشہور کاروباری ہستی ہیں۔ خدا نے انہیں جس قدر زر و دولت سے نوازا ہے۔ اس سے کہیں زیادہ علم و ادب کی دولت سے مالا مال کیا ہے۔ آپ کی اردو اور انگریزی ادب پر جو گہری نظر ہے اس کی مثال خال خال ہی مل سکتی ہے۔ موصوف اپنے مکتوب گرامی میں لکھتے ہیں۔

"پچھلے دو تین شماروں سے دیکھ رہا ہوں کہ آپ بھوٹے بار... کے ہت بڑی جرأت اور بے باکی سے اپنے خیالات کا اظہار کر رہے ہیں۔ میں سمجھتا تھا کہ آپ پنجابیوں کے لئے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتے ہیں لیکن ان مضامین نے مجھے آپ کی صاف گوئی اور جرأت گفتار کا اعتراف کرنے پر مجبور کر دیا۔ آپ نے لکھا ہے حقیقت یہ ہے کہ کانگریس کے تیس سالہ دور حکومت میں مسلمانوں کو وہ مقام حاصل نہیں ہو سکا جو جنتا حکومت نے مسلمانوں کو دیا ہے۔ مجھے مسرت ہوگی اگر آپ اگلے شمارے میں جنتا حکومت نے مسلمانوں کے سلسلہ میں جو کارنامہ انجام دیا ہے اس پر تفصیل سے روشنی ڈال سکیں بغیر دلیل یا ثبوت کے محض دعویٰ کرنے سے آپ کسی سے اپنی بات نہیں منوا سکتے ...."

عظیم صاحب آپ کا استفسار طویل بحث چاہتا ہے اور اپنی حالت یہ ہے کہ حضرت دل کے ہاتھوں اس قدر مجبور ہیں کہ اس ماہ کا شمارہ بھی وقت پر شائع نہ کر سکے۔ خدا نے چاہا تو صحت بحال ہونے دیجئے پھر اس موضوع پر سیر حاصل بات ہو سکیگی اس وقت آپ کے اس تفصیلی استفسار کے چند نکتوں پر سرسری تبصرہ حاضر ہے۔

فرقہ وارانہ فسادات کانگریسی دور حکومت میں فرقہ وارانہ فسادات ہوتے رہے۔ اور جنتا پارٹی کی حکومت میں بھی ہوئے۔ کانگریس والے کہتے تھے کہ یہ فسادات جن سنگھ کراتا ہے حالانکہ حقیقت کچھ اور ہی تھی۔ انگریزی حکومت کے دوران ہندو مسلم فسادات جب بھی ہوئے انگریزوں نے اپنے مفاد کے تحت خود کرائے ۱۹۲۲ء میں پہلا ہندو مسلم فساد ملتان (پاکستان) میں عاشورہ کے جلوس پر انگریز ڈپٹی کمشنر نے ایک مسلمان کے ہاتھوں تعزیئے پر ایک چھت سے اینٹ پھینکوا کر کرایا اور اس ڈپٹی کمشنر کے طنبوروں نے یہ افواہ پھیلائی کہ کسی ہندو نے یہ حرکت کی ہے بس پھر کیا تھا نتیجہ دنیا جانتی ہے۔ انگریز نے حکومت کانگریس کے حوالے کی اور کانگریس نے وراثت میں انگریزی حکومت کی جملہ "صفات" بھی اپنی گرہ میں باندھ لی۔

یہاں یہ بات صاف کر دینا ضروری ہے کہ جن سنگھ نے یا راشٹریہ سیوک سنگھ نے کبھی بھی ہندو مسلم فساد نہیں کرائے اور جنتا پارٹی کے عہد میں تو جن سنگھ ایسی غلطی بھولے سے بھی نہیں کر سکتا۔ اور اس کا ثبوت "سنبھل" کا فساد آپ کے سامنے ہے۔ اور یہ کہنے میں کوئی خدشہ نہیں کہ سنبھل کا فساد مسلمانوں نے شروع کیا۔ میں نے اپنے کانوں سے سنبھل سے آنے والے کئی مسلمانوں سے سنا کہ اس دفعہ کسر پوری کر دی گئی ہے۔ یہ مسلم حضرات سرو زام کے باعث، جیسے بھی مسلمان، کہتے رہے۔ اور پوری آزادی اور بیباکی سے بات چیت کرتے رہے۔ کیا آپ جنتا پارٹی حکومت کو اس سلسلے میں تعریف کے قابل نہیں سمجھتے کہ اس نے سنبھل کے فساد پر کس ہوشیاری سے سارے ملک میں امن و امان قائم رکھا۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ کوئی ہندوستانی مسلمان اس قسم کا خطرہ مول لینا پسند نہیں کرے گا۔ مگر جنتا پارٹی کو بدنام کرانے کے لئے یہ فسادات کرانے والے وہی لوگ ہیں جو مسلمانوں کی جھوٹی خوشامد کر کے انہیں ہری جن بنانے کے درپے ہیں۔ اور ان کے دوٹوں کا حصول اپنے لئے آب حیات سمجھتے ہیں۔ عظیم صاحب یہ اتنی کی بات آپ کو بتائی جا رہی ہے کہ ہندو مسلم فسادات کے بارے میں موجودہ حکومت اپنی پیش رو حکومت کے مقابلہ میں کہیں زیادہ محتاط ہے اور اس کی نیت پر شک کرنا کفران نعمت ہے۔ یہ حکومت کانگریسی حکومت کی طرح اپنی مضبوطی ہندو مسلم فسادات کی بنیاد پر قائم رکھنا نہیں چاہتی۔ بلکہ یہ دل سے چاہتی ہے کہ ہندو مسلم اتحاد ہو۔ جن سنگھ اور جماعت اسلامی کی کوششیں جیل میں ہوئیں اور اب یہ دونوں انگریزی محاورے کے مصداق اجنبی کے ساتھ ہمبستری کرتا

پر عمل پیرا تھی۔ کانگریسی حکومت میں جمعیت العلماء ہند اپنے آپ کو مسلمانوں کا نمائندہ گردانتی تھی۔ حالانکہ مسلمان ان سے نفرت کرتے تھے۔ اور اس حکومت میں جماعت اسلامی جت پرستی کے ناک کا بال بنی ہوئی ہے گو بظاہر مسلمانوں کا جاہل طبقہ جماعت اسلامی کو بہتر سمجھتا ہے مگر جس قدر مذہبی طور پر جماعت اسلامی تمام عقلی حدود کو پار کر چکی ہے اُسے پڑھا لکھا مسلمان شدت سے محسوس کرتا ہے۔ اس جماعت کے مذہبی جنون کا یہ عالم ہے کہ اس کے فارم ممبری میں پہلی شرط یہ تحریر ہے کہ اس جماعت کا ممبر بننے والے کو پہلے کلمہ طیبہ پڑھنا ہوگا یعنی اس جماعت کے نا خدا مسلمانوں کو بھی اپنے سامنے کلمہ پڑھوا کر پھر مسلمان بناتے ہیں۔ اس لئے یہ بات تو آپ کو یہ ماننی ہوگی کہ کانگریس اپنے عہد میں ہندو مسلم فسادات کو اپنی حکومت کی پختگی کے لئے ضروری سمجھتی تھی اگر موجودہ حکومت اس کیٹیگری پر ایمان نہیں رکھتی۔ کانگریس والے اس قسم کے فسادات کا باعث بنتے تھے اور بعد میں مسلمانوں کو پچکارتے تھے۔ ہمدردی جتاتے تھے۔ مفت راشن دیتے تھے اور اس قسم کے ہتھکنڈوں سے مسلم ووٹ اپنے لئے پکے کرتے تھے۔

اور اب موجودہ حکومت مسلمانوں کے ساتھ برابری کا سلوک کر کے اور صحیح معنوں میں غریب مسلم طبقہ کو دوسرے ہندوستانی غرباء کے ساتھ اونچا اٹھانے کے لئے کوشاں ہے۔ صرف راجستھان میں وہاں کے وزیر اعلیٰ جناب بھیروں سنگھ شیخاوت نے انتودے سکیم ۲ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو (مہاتما گاندھی کے جنم دن پر) شروع کی (اور اس سکیم کے تحت جن ایک لاکھ ۵ ہزار کنبوں کو مالی امداد حاصل ہوئی ہے اس میں بیس ہزار کے قریب مسلم اقلیت کے کنبے شامل ہیں۔ جن بے یار و مددگار بوڑھوں کو پنشن دینے کا سلسلہ شروع کیا گیا ان بیس ہزار بوڑھے افراد میں مسلم افراد کی تعداد ساڑھے تین ہزار ہے۔ جن کو چالیس روپیہ ماہانہ پنشن دی جاتی ہے۔ اور اب راجستھان کی یہ سکیم سارے ملک میں ۲ اکتوبر ۱۹۷۸ء سے جاری کی جارہی ہے جس سے ملک بھر کے لاکھوں مسلمانوں کو ٹھوس فائدہ پہنچے گا کیا آپ سابق کانگریسی عہد کا کوئی ایسا کارنامہ پیش کر سکتے ہیں سوائے اس کے کہ مسلم دانشوروں کو ہر سال یو۔ پی۔ اُردو اکادمی کے تحت تین لاکھ روپیہ ردی کے بھاؤ بکنے والی کتابوں پر انعامات کا لقمہ تر دیکر بالواسطہ طور پر زر خرید کر لیا گیا۔ شانِ ہند کی اسی اشاعت میں "ترقی کا ایک سال" پڑھیئے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ راجستھان میں جناب بھیروں سنگھ شیخاوت کس طرح بلا تخصیص مذہب و ملت غریبوں کو اوپر اٹھانے کے لئے کوشاں ہیں۔

جس طرح مسلمانوں کی مذہبی جائداد کے لئے وقف بورڈ قائم ہیں اسی طرح ہندو مذہبی جائداد کیلئے بھی اسی قسم کے ادارے مقرر ہیں۔ وقف بورڈ اور یہ ہندو ادارے جس طرح سے مذہبی جائدادوں کے ذریعہ آنے والے وارے نیارے کر رہے ہیں اس سے شائد آپ پوری طرح واقف نہیں ہیں کانگریسی حکومت نے دیدہ و دانستہ وقف بورڈ کے اداروں کو کھلی چھوٹ دے رکھی تھی کہ جو چاہو کرو خواہ پانچ صد روپیہ ماہوار کرایہ والی جگہ اپنے کسی رشتہ دار کو پانچ روپیہ کرایہ پر دیدو مگر مسلمانوں کے ووٹ ہمارے لئے پکے رکھو۔ مگر موجودہ حکومت اس دھاندلی کو مٹانے کے لئے کوشاں ہے۔ راجستھان میں وزیر اعلیٰ نے مسلم وقف بورڈ اور ہندو مذہبی جائداد کے بورڈ کے کان کھینچ دیئے ہیں اور اس لوٹ کو ختم کرنے کے پورے پورے انتظامات کئے جا رہے ہیں۔

مسلمانوں کی محبوب اندرا گاندھی (جسے اب پھر مسلمان اپنی نجات دہندہ سمجھنے لگے ہیں) کے زمانہ ایمرجنسی میں جو مظالم ترکمان گیٹ کے مسلمانوں پر ڈھائے گئے ان کے نشانات اب بھی موجود ہیں اگر آپ دہلی تشریف لا کر اپنی آنکھوں سے اس تباہی کا نقشہ دیکھتے تو آپ راقم الحروف سے یہ استفسار نہ کرتے مگر جنتا پارٹی نے اُن مسلمان کنبوں کو جنہیں کانگریسی حکومت نے بارش کے دنوں میں یہاں سے اجاڑ کر تیرہ میلوں دور ۲۵-۲۰ گز کا پلاٹ دیکر پھینک دیا تھا۔ انہی مصیبت زدہ مسلم کنبوں کو اس حکومت نے منٹو روڈ کے ان سرکاری کوارٹروں میں جگہ دی ہے جن میں سرکاری گزٹیڈ آفیسر رہتے ہیں اور ریجنٹ ہوٹل (نزد ترکمان گیٹ) کے سامنے سیکڑوں مکانات ان اُجڑے ہوئے کنبوں کے لئے بن کر تیار ہو چکے ہیں۔ ترکمان گیٹ کا جو حصہ تباہ کرایا گیا ہے اس پر مسلمانوں کو بسانے کیلئے تعمیر کا کام شروع ہے اور وزیر اعظم نے اس نیک کام کا افتتاح اپنے ہاتھوں سے کیا۔ جناب سکندر بخت صاحب وزیر تعمیرات دن رات ایمرجنسی کی اس بدترین یاد کو مٹانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ دہلی سے باہر رہنے والے مسلمان اُس ظلم و تشدد کا تصور بھی نہیں کر سکتے جو کانگریس کی حکومت نے ترکمان گیٹ کے رہنے والوں پر روا رکھا۔

__اُردو__ کے سلسلے میں اس حکومت نے نیک نیتی سے احکامات جاری کئے ہیں۔ ابھی ادب نواحت جے پور کی میٹنگ میں جناب عبد اللہ آزاد جو سیکریٹری راجستھان اور جناب منظور چودھری جو جوپور میں اُردو ٹیچر ہیں، بہت سے ان

حکلات پر روشنی ڈالی جو حکومت راجستھان نے اُردو کی تعلیم کے سلسلے میں جاری کئے ہیں اور جن پر عمل پیرا بھی ہوا جا رہا ہے۔ مگر جب کوئی اپنے بچوں کو اُردو پڑھائے ہی نہ تو حکومت یا اسکول کیا کریں۔ اس سلسلے میں بھی "ادب نواخت" نے کئی تجاویز پر غور کیا ہے کہ کس طرح والدین کو تیار کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اُردو پڑھائیں۔ ان تجاویز پر جلد ہی مفصل طور پر شانِ ہند میں پڑھیئے گا۔

کانگریس نے مسلمانوں کو خوش رکھنے کے لئے راشٹرپتی مسلمان بنائے جانے اور مرکزی اور صوبائی وزارت میں ہر ماسٹر مس اسی قسم کے مسلمانوں کو وزارت کی کرسی پر بٹھائے رکھنے کی چال چلی مگر اس حکومت نے ایسا کرنا ضروری نہیں سمجھا بلکہ مسلمانوں کو قابلیت کے لحاظ سے رکھا گیا۔ کانگریس حکومت کو یہ جرأت کبھی نہ ہو سکی کہ فوجی لحاظ سے کسی مسلمان کو فوج کے کسی شعبہ کی کمان پوری طرح سونپی۔ مگر یہ حکومت ایسا کر رہی ہے۔ بے شک لطیف صاحب اپنی سینیارٹی کے لحاظ سے اس عہدۂ جلیلہ پر متمکن ہو رہے ہیں۔ مگر یہ مت بھولئے کہ اگر کانگریس راج ہوتا تو لطیف صاحب کو یہ مقام حق دار ہونے کی صورت میں بھی نہ ملتا۔

شراب اسلام نے حرام قرار دی ہے۔ کانگریسی شراب بندی کا ڈھول بجاتے رہے۔ اور در پردہ شراب نوشی کو بڑھاوا دیتے رہے اُن دنوں آپ اگر پنجاب اور ہریانہ کا سفر کرتے تو آپ کو ہر شاہراہ پر ہر دو میل پر شراب کی دوکان ملتی۔ اور ان دونوں پردیشوں کے ہر قریہ۔ گاؤں اور شہر میں شراب کی دوکانوں کی اتنی بھرمار تھی کہ ہر چوتھی دوکان شراب کی تھی۔ مگر جنتا پارٹی حکومت دل و جان سے شراب بندی چاہتی ہے۔ راجستھان کے متعلقہ وزیر نے تو اعلان کر دیا ہے کہ اگر ایک سال میں راجستھان میں مکمل شراب بندی نہ ہوئی تو وہ وزارت سے الگ ہو جائیں گے۔ ہمارے وزیر اعظم وزارت عظمےٰ کی گدی کو تو لات مار سکتے ہیں مگر شراب بندی کے سلسلے میں اپنی بات سے پھر نہیں سکتے۔ کیا یہ مسلمانوں کی خدمت نہیں جب کہ آپ جانتے ہیں کہ ہندوستان کا مسلمان سکھوں کے مقابلے میں زیادہ شراب نوش ہے۔ کانگریسی اور جنتا پارٹی کی حکومت میں اگر فرق ہے تو یہ کہ مرارجی ڈیسائی اپنے پیش رو اندرا گاندھی کی طرح جھوٹی مسکراہٹ سے اور جھوٹے وعدوں سے مسلمانوں کو بہلانے کا گر نہیں جانتے۔ وگرنہ حقیقت یہ ہے کہ دیانت داری، ایمانداری۔ صداقت۔ اور کفایت شعاری، اور ملکی مفاد میں نیک نیتی کے لحاظ سے مرارجی کے سامنے اندرا گاندھی ایک طفلِ مکتب کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور باقی باتوں میں مرارجی اندرا گاندھی کے سامنے بونے نظر آتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جنتا پارٹی کی حکومت کے کچھ ارکان اپنی ضد اور حماقتوں کے باعث پارٹی میں انتشار پیدا کئے ہوئے ہیں۔ جن سے ملک کا نقصان بھی ہو رہا ہے اور جنتا پارٹی کے اکثر وزراء عوام کے سامنے آنے سے کتراتے ہیں۔ مگر بحیثیت مجموعی ہمیں برائیوں کے مقابلہ اس حکومت کی ان اچھی باتوں کو بھولنا نہیں چاہیئے اوّل یہ کہ حکومت کے ارکان بددیانت نہیں ہیں اور دوسرے متعصب نہیں ہیں۔ تیسرے دل سے عوام کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ اور خصوصاً مسلم اقلیت کی اہمیت سے ناواقف نہیں ہیں۔


15th AUGUST

بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر[1]

سرور تونسوی

بیگم شاہدہ سلطانہ نکہت

ذرا غور سے سنیئے جناب صدر اعلان فرما رہے ہیں کہ اب شاہدہ سلطانہ صاحبہ نکہت اپنا کلام بلاغت نظام عطا فرمائیں گی۔ وہ دیکھئے نکہت صاحبہ پورے نسوانی جلوؤں کے ساتھ کرسی سے اٹھ کر ایک خاص ادائے ناز سے مائکروفون پر تشریف لے آئی ہیں۔ غرارہ پہنے ہوئے ہیں۔ سفید جارجٹ کا دوپٹہ جس کے کناروں پر سنہری پائپنگ لگ رہی ہے۔ گلے میں عجب بہار دے رہا ہے۔ ہلکے نیلے رنگ کا بلاؤز زیب تن کئے ہوئے ہیں۔ اور زلف مشکیں لال رنگ کی ربن میں نہایت سلیقے سے بندھی ہوئی ہیں۔ نکہت صاحبہ نے غزل پڑھنا شروع کی ہے غزل کیا ہے سننے والوں پر ایک جادو کر دیا ہے۔ بہترین اشعار منجھا ہوا ترنم۔ اور پڑھنے والی ایک شاعرہ۔ غزل۔ موسیقی اور حسن کی یہ تثلیث اسقدر سحر کن نظارہ پیش کر رہی ہے کہ میں بھی غزل کا کوئی شعر نوٹ نہیں کر سکا۔ واہ واہ۔ خوب خوب اور داد و تحسین کے قیامت خیز شور میں نکہت صاحبہ نے غزل ختم کی تو اس جادو کا اثر دل و دماغ سے یکدم ہٹا تو نکہت صاحبہ کو دوسری غزل سناتے پایا۔ مطلع فرماتی ہیں ؎

اگر اس میکدے میں مبتلائے غم بھی پیتے ہیں
تو ساقی یہ رہے ملحوظ آنسو ہم بھی پیتے ہیں

داد و تحسین کے شور میں نکہت صاحبہ نغمہ سرا ہیں ؎

ہماری موج ہے عادت نہیں ہے روز پینے کی
کبھی برسوں نہیں پیتے کبھی پیہم بھی پیتے ہیں

سنیئے نکہت صاحبہ کس والہانہ انداز میں فرماتی ہیں ؎

خدا مالک ہے اب جیسی بھی گزرے پیر مے خانہ
کسی کا نام لے کر تو بھی پی اور ہم بھی پیتے ہیں

بس کچھ نہ پوچھئے کہ داد کا کیا عالم ہے اور نکہت صاحبہ پیہم پینے کی ضد میں فرما رہی ہیں ؎

نظر ساقی کی جانب چشم تر ٹوٹا سا پیمانہ
بایں صورت بایں حالت بایں عالم بھی پیتے ہیں

داد ہے کہ شاید ہی اب کسی اور شاعر کو اسقدر مل سکے اور نکہت صاحبہ ہیں کہ ضد کئے ہوئے ہیں کہ وہ آج پینے کی نئی راہیں کھول کر ہی دم لیں گی۔ چنانچہ فرما رہی ہیں ؎

برائے ترکِ غم تو پینے والے ہیں بہت لیکن
تمہارے دور میں وہ اک برائے غم بھی پیتے ہیں

داد کا وہی عالم ہے ہر مصرع اور ہر شعر پر ہال میں کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی ہے۔ اور نکہت صاحبہ مقطع فرما رہی ہیں ؎

پیئے لیتی ہوں نکہت جیسی ہو ساقی کے کہنے سے
وہ کہتا ہے کہاں بھی سے مریضِ غم بھی پیتے ہیں

غزل ختم کرنے کے بعد نکہت صاحبہ اپنی جگہ تشریف لے جا رہی ہیں نکہت صاحبہ کے ہر قدم پر ہزاروں نظریں مچل رہی ہیں اور بڑی بڑی داڑھیوں والے حضرات کی نظریں تو نکہت صاحبہ کے ہر گام پر بلائیں لے رہی ہیں (مشاعرہ ہارڈنگ لائبریری دہلی ۳۰ راپریل ۱۹۶۱ء)

گوپال متل

۹ راگست ۱۹۶۱ء کو لال قلعہ کے دیوانِ عام میں اردو سبھا دہلی کی طرف سے جشن آزادی کے سلسلہ میں ایک کل ہند مشاعرہ منعقد ہوا۔ گوپال متل صاحب ایڈیٹر تحریک نے اسٹیج پر بیٹھے ہوئے جناب عرش ملسیانی سے مذاق میں فرمایا کہ آپ کو اپنے تخلص عرش کے ساتھ ملسیانی کی بجائے فرشی لکھنا چاہیئے۔ عرش صاحب نے جواباً فرمایا کہ میں تو ایسا کر لوں گا لیکن جب آپ کو گوپال متل کے بجائے گوپال مَتلی کہا جانے لگے تو پھر کیسا رہے گا۔ متل صاحب ہنستے ہوئے کہنے لگے کہ بابا تم ملسیانی ہی رہو۔

لال قلعہ کا غیر ذمہ دارانہ استعمال

لال قلعہ کے ایک مشاعرہ میں اسٹیج دیوانِ عام میں شہ نشین پر بنایا گیا۔ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی

[1] حالات کے باعث اب کی مرتبہ یہ نمبر کچھ مشہور مشاعروں کی روداد سے ترتیب دیا جا رہا ہے (سرور تونسوی)

(مرحوم) نے امن صاحب لکھنوی سکریٹری انجمن اردو سبھا سے فرمایا کہ کیا آپ کی مشاعرہ کمیٹی میں سے کسی کو بھی یہ علم نہ تھا کہ یہ کون سا مقام ہے اور اس کی کیا اہمیت ہے۔ جہاں پہلی جنگ آزادی کے ہیرو بہادر شاہ ظفر اور خلد آشیاں شاہجہاں جلوہ افروز ہوا کرتے تھے وہاں آپ نے اسٹیج بنا رکھے ہیں۔ کیا غضب ہے کہ جشن آزادی کے مشاعرے میں پہلی جنگ آزادی کے ہیرو بہادر شاہ ظفر کی توہین کی جا رہی ہے۔ علامہ نے نہایت غصے میں فرمایا کہ امن صاحب مجھ سے یہ امید نہ رکھیئے کہ میں اس توہین میں حصہ دار بن سکوں گا۔ لہٰذا میں آپ کی اس اسٹیج پر نہیں بیٹھوں گا۔ مشاعرہ کمیٹی کے ارکان نے گڑگڑا کر علامہ کیفی سے گزارش کی اب وقت نہیں کہ اسٹیج کا کوئی دوسرا انتظام کیا جا سکے۔ اگر آپ اس مسئلہ کو چھیڑتے ہیں تو بدنظمی ہو جائے گی۔ لہٰذا کوئی ایسا راستہ نکالیے کہ آج کا مشاعرہ بخیر و خوبی ختم ہو جائے آئندہ ہم خیال کریں گے۔ اس پر علامہ فرمانے لگے کہ میں جب تک اسٹیج پر رہوں گا کھڑا رہوں گا اور بیٹھوں گا نہیں۔ کیفی صاحب نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا کہ حکومت بھی کیسے کیسے غیر ذمہ دار لوگوں کو قلعہ کے استعمال کی اجازت دے کر غیر ذمہ داری کا ثبوت دیتی ہے۔

ڈنر کارڈ

جیمسفورڈ کے انڈو پاکستان مشاعرہ منعقدہ ۵ نومبر ۱۹۵۸ء میں شعراء کے رات کے کھانے اور پینے کا انتظام بھی کلب ہی میں تھا۔ اور شعراء کے لئے ڈنر کارڈ جناب ساحر ہوشیارپوری کی تحویل میں تھے تاکہ جنہیں وہ مناسب سمجھیں یہ ڈنر کارڈ دے دیں اور یہ ڈنر کارڈ دکھا کر ہی کلب کے بیروں سے کھانا لیا جا سکتا تھا۔ لہٰذا جب ساحر ہوشیارپوری شعراء کو ڈنر کارڈ تقسیم کرنے لگے تو ہفتہ وار اخبار "اتالیق" کے ایڈیٹر مسٹر رام نگری نے بھی ڈنر کارڈ حاصل کرنے کے لئے ساحر صاحب سے لجاجت آمیز گزارش کی جس پر ساحر صاحب فرمانے لگے کہ جن احباب کے خطوط میں کھانے کی دعوت کا ذکر تھا ان کو ہی ڈنر کارڈ دیا جا سکتا ہے مگر رام نگری صاحب کہاں پیچھا چھوڑنے والے تھے وہ بدستور ساحر صاحب کے ساتھ ساتھ چلے جا رہے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ آپ نے "تعلیم" کے ایڈیٹر سردار جگت سنگھ کو شراب بھی پلائی اور ڈنر کارڈ بھی دیدیا ہے۔ مجھے شراب بھی نہیں پلائی اور اب ڈنر کارڈ بھی نہ دیا تو میری بدنامی ہو جائیگی۔ اور ساحر صاحب اپنی مجبوریاں بتا رہے ہیں۔

مسٹر رام نگری کی یہ حالت دیکھ کر افسوس ہوا کہ میں نے صحافی بن کر غلطی کی ہے۔ اور دل میں آیا کہ رام نگری کو پانچ روپیہ پیش کر دوں کہ لیجیے اس سے قیمتاً کھانا کھا لیجیے (اُس زمانہ میں پانچ روپیہ میں کھانا کھایا جا سکتا تھا) مگر خدارا یہ بھیک مانگ کر اخبار نویسوں کی توہین کرائیے کہ اتنے میں ساحر صاحب نے میرے چہرے کے آثار چڑھاؤ دیکھتے ہوئے رام نگری صاحب کو ڈنر کارڈ کی بھیک دیدی۔ اور وہ مسکراتے ہوئے کھانے کی میز پر چلے گئے۔ کھانے کی میز پر اکثر شعراء اور مسٹر رام نگری ایسے مدعوئین کھانے پر اس طرح جھپٹ رہے ہیں جیسے کئی دنوں سے فاقہ زدہ ہیں۔ کلب کے بیرے ان حضرات کا مذاق اڑا رہے ہیں اور روزنامہ "ملاپ" کے شاعر خصوصی مسٹر رام کرشن مضطر ککوڑوی (جن کا دعویٰ ہے کہ ان کا کلام ہر روز صبح سویرے دو لاکھ اشخاص کی نظر سے گزرتا ہے) شکایت کر رہے ہیں کہ ایک تو انہیں شراب کم ملی ہے اور اب کھانے کی کوئی چیز ان تک پہنچنے نہیں پاتی کہ راستہ ہی میں اُچک لی جاتی ہے۔ بعض حضرات پنڈ ۔ کو جگالی کی جگہ کھا رہے ہیں اور ان کا ہاتھ اس تیزی سے چل رہا ہے جیسے اونٹ دانستہ آئندہ کے طور پر اپنے کوہان میں ہفتہ بھر کی خوراک بھر لیتا ہے۔

بیٹی کا مربع

مشاعرہ یوم چکبست ۲ اگست ۱۹۵۰ء میں جب اناؤنسر نے اعلان کیا۔ جناب نوح ناروی کے نواسے سہیل ناروی کلام سنائیں گے تو گوپال متل صاحب نے پنڈت ہری چند اختر سے پوچھا کہ نواسے فلاں کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس پر پنڈت ہری چند اختر فرمانے لگے کہ چونکہ نواسہ بیٹی کا مربع ہوتا ہے۔ یعنی بیٹی ضرب بیٹا مساوی ہے نواسہ کے۔ اختر صاحب کے ریاضی دان ہونے کا سکہ پاس بیٹھے تمام شعراء مان گئے ہیں اور ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے ہیں۔

ایطائے جلی

مشاعرہ یوم چکبست میں ہی جب جناب [illegible] محروں نے یہ مطلع سنایا —

بقدر سوز بھی ہے ساز بھی ہے
یہ ترا انداز جب رہ ساز بھی ہے

پنڈت ہری چند اختر فرما رہے ہیں کہ مطلع میں ایطائے جلی ہے

مرحوم اختر صاحب نے اس: مرگوذہن میں کیوں نہیں رکھا کہ لیلیٰ آ چلی
تب ہوتا ہے جب کہ قافیہ ہم معنی ہو جائے۔ اور اس مطلع میں دونوں
کے معنی جُدا جُدا ہیں لہٰذا اعتراض غلط ہے۔

داد کا اسقاط

مشاعرہ چیمسفورڈ کلب نئی دہلی ۱۰ر جنوری ۱۹۵۲ء
میں کسی سفارشی شاعر ممتاز شاہجہانپوری نے
یہ شعر پڑھا ہے

کیوں فریبِ عشق دے کر اب انہیں رُسوا کریں
خود تو دھوکا کھا چکے ہیں آرزوئے دل ہم

ممتاز کو داد بالکل نہیں مل رہی تھی اس پر بسمل شاہجہانپوری شعرا سے
کہہ رہے ہیں کہ بھائی داد دو۔ روشن دہلوی فرما رہے ہیں کہ کس کو داد
دیں پنڈت ہری چند اختر فرمانے لگے کہ ہماری اپنی داد کا اسقاط
ہو گیا ہے۔ ذرا دیکھئے تو دل کا قافیہ کیا مزے کے سے تکرار
سے آیا ہے۔

حاضر جوابی

مشاعرہ محولہ بالا میں کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ نے
گلزار دہلوی کا نہایت موزوں الفاظ میں تعارف
کراتے ہوئے فرمایا کہ آپ پروفیسر ہیں جس پر پنڈت ہری چند اختر
فرما رہے ہیں کہ محض پروفیسری نہ کہئے بلکہ پروفیسر دہلی کالا تھوطنہ کہئے۔
کنور صاحب مسکراتے ہوئے فرما رہے ہیں کہ آپ خاندانی شاعر ہیں آپ
کے والد محترم دہلی کے ایک مشہور شاعر ہیں۔ اور ان کے بھائی بہن
اور والدہ محترمہ بھی شعر کہتی ہیں۔ پنڈت ہری چند اختر فرما رہے ہیں بلکہ
محلہ والوں پر بھی ان کی وجہ سے شاعری کا دورہ پڑنے لگا ہے۔ ابھی
قہقہے لگ ہی رہے تھے کہ گلزار صاحب نے یہ قطعہ پڑھا ہے

پھر سے اُلفت کا ہائے دے کے فریب
دامِ گیسو میں کس لیا مجھ کو
پی کے بادہ مرے ہی ساغر سے
ایک ناگن نے ڈس لیا مجھ کو۔

اس پر کنور صاحب فرما رہے ہیں حضرات قبلہ داغؔ فرما گئے ہیں

خدا دراز تمہارا کچھ اور بس تو کرے
تم کے تو بھی ہو قابل خدا وہ دن تو کرے

کنور صاحب نے گلزار پر چوٹ کی ہے۔ اس پر سامعین میں
ہنسی کا ایک طوفان بپا ہو گیا ہے۔ ذرا خاموشی ہوئی تو اتنے میں
گلزار صاحب سنبھل چکے تھے فرمانے لگے حضرات
ہمارے ایک ساتھی جو اخبار پرتاپ میں کام کرتے ہیں
(خان غازی کابلی) اُن کا ایک شعر ہے ؎

واسطہ ہم کو فقط ہندو مسلم سے نہیں
ہم محبت کی نظر رکھتے ہیں مردار پہ بھی

گلزار کی اس حاضر جوابی نے محفل کو دیوار قہقہہ بنا دیا ہے
ہنسی کا دورہ کچھ رکا تو کنور صاحب فرمانے لگے کہ خیر مجھے تو
کیا البتہ میرے سکھ بھائیوں کو جن کی خدا کے فضل
سے اس کلب کے ممبران میں بہت زیادہ تعداد شامل
ہے خوشی ہونی چاہیئے کہ اُن پر بھی کوئی عاشق ہے۔
کنور صاحب کے اس فرمان پر ہنسی پھر عروج پہ
پہنچ گئی ہے۔
اب کنور صاحب نے سر جگن ناتھ آزاد کو
کلام سنانے کی گزارش کی ہے کنور صاحب فرما رہے
ہیں کہ دہلی میں تین خاندانی شاعر ہیں۔ گلزار، عرش اور
آزاد۔ آزاد صاحب کی لحن میں سوز ہے۔ پنڈت
ہری چند اختر کہہ رہے ہیں کہ سوز ہے یا نہیں البتہ ساز ضرور ہے
اس اعلان کے ساتھ ہی کنور صاحب نے وسکی کا ایک
گھونٹ پی کر گلاس رکھا ہی تھا کہ آزاد صاحب نے گلاس
اٹھا کر وسکی پینی شروع کر دی ہے۔ اس پر کنور صاحب
فرمانے لگے۔ اسے کہتے ہیں سرقہ بالجبر۔
مسٹر کول سپرنٹنڈنٹ پولیس فرما رہے ہیں حکم ہو تو سرقہ
بالجبر پر ہتھکڑی لگا دوں۔ آزاد صاحب نے ایک قطعہ پڑھا
ہے اور پھر کنور صاحب کے گلاس سے ایک گھونٹ
وسکی کا پیا ہے۔ جس پر ہری چند اختر فرما رہے ہیں کہ کنور صاحب
اور آزاد صاحب باری باری مصرع کہہ رہے ہیں۔
کنور صاحب میکروفون کو ہاتھ میں کچھ عجیب انداز سے
تھامے ہوئے ہیں جن پر جناب شنکر پرشاد چیف
کمشنر دلی فرما رہے ہیں کہ دیکھئے اس وقت کنور صاحب
کے ہاتھ میں پیچوان ہے۔

سید عاشق علی عاشق

سرور تونسوی

مدھیہ پردیش کے علاقہ گونڈوانہ کے مشہور مقام چھندواڑہ کے مشہور اُردو شاعر جناب سید عاشق علی عاشق کی ذاتِ گرامی اُردو شاعری کی تاریخ میں اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ شانِ ہند کی کسی سابقہ اشاعت میں عاشق صاحب کا مختصر تعارف سرور صاحب کرا بھی کرا چکے ہیں۔ ذیل کے اشعار میں آپ عاشق صاحب کی استادانہ اور فنکارانہ مہارت کے مختلف زاویئے ملاحظہ فرمایئے۔

پیش ہے عاشق صاحب کی غیر منقوطہ غزل کے کچھ اشعار ؎

حوصلہ دل کا ہمارا، اگر کامل ہوگا
دل کا ہر مدعا، ہر طور سے حاصل ہوگا

مدعا موسیٰ کا کس طور سے حاصل ہوگا
طور سے دور اگر وہ مہ کامل ہوگا

معاملہ اور ہی ہوگا رہے اس کا احساس
گر عدو آ کے۔ ہمارا کوئی حائل ہوگا

آدمی کام کرے، اور وہ ہر کام کرے
وہ اگر دور رہے، کام سے، کاہل ہوگا

سر ہمارا ہو، دمِ مرگ، کسی کا در ہو
ماحصل، دل کا اسی طور سے حاصل ہوگا

اور اس غزل کے اشعار میں تمام نقطے نیچے کی جانب ہیں ؎

کسی بے راہ کو گر راہ دکھائی ہوگی
ہوگی چھوٹی ہی مگر یہ بھی بھلائی ہوگی

آدمی جائے گا اس راہ سے بچ کر ہر دم
جس جگہ بھول کر ٹھوکر کبھی کھائی ہوگی

آئیگی کب وہ گھڑی اور کرم کب ہوگا
آپ کے در پہ ہماری بھی رسائی ہوگی

معاملہ آپکا ہے، اور ہمارا الجھا
دوسرا کوئی اگر ہوگا برائی ہوگی

اور اس غزل کے اشعار میں تمام نقطے اوپر کی جانب ہیں
مصرعِ مطلع کو اسی طور سے راحت ہوگی

کاش ہاتھوں سے اگر ان کے شہادت ہوگی
دوسرا کون خدا کے، وہاں منصف ہوگا
آخری حشر کے دن اس کی عدالت ہوگی

فخر دولت کا نہ کر، عقل اگر رکھتا ہے
ماسوا، ساتھ کفن، ساتھ نہ دولت ہوگی

وقت درکار ہے، حاصل ہو فنِ شعر و سخن
رفتہ رفتہ ہی ذرا، ہم کو مہارت ہوگی

ہم گرفتارِ قفس، ہوں گے کسی دن آزاد
کوئی حد، اور کوئی ظلم کی مدت ہوگی

اس زمانے کو کسی روز فنا ہونا ہے
کوئی ہوگا نہ شہنشاہ نہ حکومت ہوگی

تو گرفتارِ قفس کس طرح ہوں گے مانوس
رفتہ رفتہ ذرا ماحول کی عادت ہوگی

تم کرو خوش سے ہر ظلم، کرو خونِ وفا
حشر کے روز مگر تم کو ندامت ہوگی

گر مخالف ہے کوئی، اور ہے دشمن عاشق
سامنے آنے ہمارے کہاں ہمت ہوگی

اب اس کے ایک عام غزل کے کچھ اشعار ملاحظہ فرمایئے ؎

اسے احساس ہوگا دردِ دل کا
کوئی دردِ الم کا گر ہو مارا

عدو کو وہ لئے ہمراہ گھومے
کرے دل کس طرح اس کو گوارا

الم کا کوئی مارا مر رہا ہے
مگر احساس ہے کس کو ہمارا

اگر ڈر ہے لگا کر ہم سے رکھ لو
ہے وعدہ ہر طرح وعدہ ہمارا

کھلے دل سے ہمارے گھر وہ آئے
کھلا اس کے لئے ہے در ہمارا

تعارفُ الشعراء

ظفرؔ سنبھلی

اپنے بارے میں آپ ہی کچھ کہنا اپنے منھ میاں مٹھو بننے کے مصداق ہے۔ لیکن میں خودستائی کا قائل نہیں ہوں۔ اس لئے اپنی انا کے مدمقابل آئینہ رکھتے ہوئے اپنا تعارف پیش کر رہا ہوں۔ زندگی کے سفر کے اس مسافر کا نام ظفراللہ خاں ہے اور شاعری کی دنیا میں جس کا تخلص بھی ظفرؔ سنبھلی ہے۔ والد محترم کا اسمِ گرامی جناب عزت اللہ خاں ہے۔ اپنے آباؤ اجداد کے کہنے کے مطابق میری قوم مسلم راجپوت ہے۔ اس مرنے والی دنیا میں مورخہ ۹ جولائی ۱۹۴۳ء کو میں اپنی قسمت پر اسی طرح رونا ہوا آیا جس طرح جنت سے نکالے جانے پر حضرت آدمؑ۔ میرا وطن ہندوستان اور پیدائش سرزمین سنبھل ضلع مرادآباد ہے۔

حالاتِ زندگی بچپن کی منزلیں اور تعلیم کے مدارج طے کرتا ہوا جب میں جوانی کی سرحد میں داخل ہوا تو ۱۹۶۲-۶۳ء میں میں نے ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا اس کے بعد ۱۹۶۵-۶۶ء میں آئی۔ ٹی۔ آئی رام پور سے الیکٹریشن Electrician ٹریڈ کا ڈیڑھ سال کا ڈپلومہ پاس کیا بعد ۱۹۶۶ء میں محکمۂ ہائیڈل میں سروس مل گئی۔ اور جنوری ۱۹۷۰ء کو میری شادی ہوئی۔ چونکہ بیگم صاحبہ گریجویٹ اور اسکول مسٹریس ہیں۔ اس لئے میری انا اور خودداری نے تعلیمی برابری حاصل کرنے کا بیڑہ اٹھایا ۱۹۷۳ء ہی میں میں نے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا بعد ۱۹۷۵ء میں بی۔ اے کا امتحان ہند گاندھی میموریل ڈگری کالج سنبھل سے سیکنڈ ڈویژن پاس کیا انہیں تینوں سندوں کے ساتھ ساتھ قدرت نے مجھے تین بچوں کی شکل میں تحفے عنایت کئے جن میں ایک لڑکی اور دو لڑکے ہیں اور اب اچھی گھریلو ماحول میں زندگی سکون سے گزر رہی ہے

وجہِ شاعری مجھے اُردو ادب سے لگاؤ مادری زبان ہونے کی وجہ سے بچپن ہی سے تھا ہے لیکن اس دوران میں جب میں ہائی اسکول کا طالب علم تھا اس وقت میری زندگی کے ساتھ ایک ایسا واقعہ پیش آیا جسے میں زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔ کیونکہ یہی واقعہ میری شاعری کا سبب ہے جس کی صحیح اور حسین تصویر الفاظ کے رنگوں سے پیش کرنے کے لئے میں قاصر ہوں۔ ہاں اس کی صحیح مثال "چاند اور چکور" کی محبت یا ندیا کے ان دو کناروں سے دے سکتا ہوں جو ایک دوسرے کو دیکھ تو سکتے ہیں لیکن کبھی آپس میں مل نہیں سکتے۔ میں بھی چکور کی طرح اپنے اس زمین کے چاند کو نہ پا سکا۔ سماج کے جھوٹے رسم و رواج بے درد اور بے رحم فاصلوں نے مجھے اس سے دور ہی رکھا اور جب اس کی جدائی کا جنون جو سر سوار ہوتا۔ تو میں دل کے جذبات اپنے سینہ سے ٹوٹے پھوٹے اشعار میں پرونے کی کوشش کرتا۔ جو اب تراشتے تراشتے آبگینے بن گئے ہیں۔ اس فن میں اپنی خامیاں دور کرنے کے لئے سنبھل کے بھی اساتذہ سے مجھے اصلاح کا شرف حاصل رہا ہے جن کے اسماء گرامی اس طرح ہیں۔ جناب مجبزؔ سنبھلی۔ جناب مغفورؔ سنبھلی (مرحوم) جناب اشکؔ سنبھلی (مرحوم) ان حضرات سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ ان کے علاوہ جناب اظہر احمد صاحب کمالؔ بدایونی سے بھی مجھے کئی سال تک اصلاح کا شرف حاصل رہا ہے

جس طرح دنیا میں ہر شخص کا اپنا کوئی نہ کوئی شوق ہوتا ہے اسی طرح میرا بھی محبوب شوق شاعری ہے۔ میں اردو، ہندی دونوں ہی زبانوں میں اپنی تخلیقات پیش کرتا ہوں۔ اور ہر صنفِ سخن پر طبع آزمائی کی کوشش کرتا ہوں۔ لیکن مجھے غزل سے زیادہ لگاؤ ہے مجھے ہندی سے بھی اتنا پیار ہے جتنا اُردو سے۔ کیونکہ دونوں اسی دلیش کی زبانیں ہیں۔ مگر مجھے ان لوگوں پر تعجب اور افسوس ہوتا ہے۔ جو خود اُردو کے الفاظ بولتے ہیں لیکن اُردو کے ساتھ سوتیلا برتاؤ کرتے ہیں۔ جن کا تلفظ اور گفتار کی شیرینی کا باعث صرف اُردو ہے جسے ہندوستان کی بہت بڑی آبادی استعمال کرتی ہے۔ مجھے اُن تنگ نظروں سے یہی کہنا ہے کہ اُردو کو صرف مسلمانوں کی ہی زبان نہ سمجھیں۔ بلکہ ہندوستان کی سبھی قوموں کو اس سے وابستہ سمجھیں۔ ہندی کی طرح ہندوستان ہی اُردو کا ٹھیکہ ہے۔ ہیں دوسری زبان کی شکل میں اُردو کی قدر کرنا

کرنا چاہئے۔ اُردو ہندی، پنجابی، دیپتیا، مادھا، پاردتی کی طرح بھارت ماتا کی تین حسین بیٹیاں ہیں۔

نمونۂ کلام کے طور پر چند اشعار ملاحظہ فرمائیے

نثر

ملا فراق یار جہنم سے کم نہیں ٭ جنت کے لطف بھی تو ملے ہیں وصال کر
دوسروں کو کہنے والا آدمی ہے خود بُرا ٭ لیکن اپنے طرف کو آئینہ دکھلاتا ہے کون

اس سے دنیا میں تو آجاتا ہے جینے کا شعور
اور ستم یار سے کیا چاہتے ہو؟
ہو دوق نظر کا بھلا، اہل وفا نے
کب ہاتھ میں اس شوخ کا دامان نہیں دیکھا
یہ بات الگ تجھ کو رسوا نہ کریں ورنہ
ہم اپنے فسانے کا عنوان تو رکھتے ہیں
اور بھی رنگین نظر آئے گی تصویر شباب
آپ میرا نام لے کر آئینہ دیکھا کریں
اُن کے حضور راز محبت نہ چھپ سکا
آنسو ٹپک پڑے مرے ضبط و فغاں کے ساتھ
میں اس کو بھول جاؤں، یہ دنیا کی بھول ہے
بے کیف زندگی سے تو مرنا قبول ہے
یوں تری یاد سے اب دل میں کسک ہوتی ہے
جیسے کچھ آنکھ میں گرنے سے کھٹک ہوتی ہے
سایۂ زلف میں گزرے ہوئے وہ شام و سحر
آج بھی یاد ہیں ٹوٹے ہوئے خوابوں کی طرح
اُس البیلی، نرموہی سے اب بھی ہے مجھ کو اتنا پیار
دیپ کو جیسے چاہے پتنگا، چاند کو جیسے چاہے چکور
ٹوٹ گئی ہے من کی بینا، ڈوب گئے ہیں سُر کے گیت
جب سے اس بیری ونیلی نے چھین لیا ہے میرا میت

حنیف سوختی

میرا نام محمد حنیف، مقام پیدائش سوخت روڈ۔ تعلیم اردو عربی مقامی اسلامی مدرسہ میں مولانا سید مقصود حسین ٹونکی سے حاصل کی۔

شاعری میں خلوت کشن گڑھی سے استفادہ حاصل کیا۔ اور ویسے بھی شاعری مجھے ورثہ میں ملی ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ فرمائیے

تری محفل سے ہو کر آج ہم با چشم نم نکلے
خوشی کی بھیک مانگی تھی مگر قسمت میں غم نکلے
اُٹھے دستِ کرم تلوار بن کر خستہ حالوں پر
جنہیں اہلِ کرم سمجھا تھا وہ اہلِ ستم نکلے
اُدھر شور اذاں تھا، اس طرف تھی قلقلِ مینا
درِ پیر مغاں سے جس گھڑی شیخ حرم نکلے
ہوئی مہنگی جو مئے تو چھوڑ دی بادہ کشی میں نے
غریبی کے ستم میرے لئے وجہ کرم نکلے
حنیف زار ایسی بھی گھڑی آئی ہے الفراق
دوا دل سے بجنگل بدگماں جب دم بدم نکلے

دلدار ہاشمی

۱۹۳۲ء میں کرناٹک ضلع دھارواڑ کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوا۔ والدین نے عبدالرحیم نام رکھا۔ تقریباً ۱۹۳۴ء میں والدین نے پونہ کا رُخ کیا۔ یہاں کی آب و ہوا اس قدر راس آئی کہ پورا خاندان مستقل طور پر یہیں مقیم ہو گیا۔

والدین اور ہم بہن بھائیوں کے گھر کے اخراجات وسیع تھے اس لئے اعلیٰ تعلیم و تربیت کا انتظام نہ ہو سکا۔ ہوش سنبھالتے ہی روزی روٹی کی جستجو کا احساس بیدار ہوا اور بہت جلد زندگی کے نشیب و فراز سے روشناس ہونا پڑا۔ والد جنگ آزادی کے سپاہی تھے۔ پرانی تہذیب و تمدن کے دلدادہ۔ ہمت کے دھنی۔ حیا اور نڈر، زندگی کا حوصلہ دینے والے، بلند عزائم کے مالک۔ البتہ والدہ بالکل والد صاحب کی ضد طبعاً ہوئی اور نرم دل کی۔ سرد مزاج، نا آشنائے نشیب و فراز لطف و عنایات کا پُرسکون سمندر۔ سادگی کا پیکر۔

۱۹۵۲ء میں انتہائی کوشش اور تگ و دو کے بعد ۔۔۔ سینٹرل ورکشاپ دھا پوڑی پونہ میں ملازمت ملی اور یہیں سے میری شاعری کا آغاز بھی ہوا۔ میں نے پہلا شعر کب کہا اور کیوں کہا۔ اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ ۔۔۔

عنواں نئے ملے مجھے عنواں سے کھیلتے
شاعر بنا ہوں میں غمِ دوراں سے کھیلتے
دنیا کے حادثات کی پروا نہیں مجھے
گزری ہے زندگی مری طوفاں سے کھیلتے

میں چونکہ مزدور ہوں، مزدوروں میں رہتا ہوں، مزدوروں میں شب و روز گزارتا ہوں اسی لئے مزدوروں کی سسکتی اور سرکتی زندگی کا میں نے بغور مطالعہ کیا ہے اور اسی لئے میری شعری تخلیقات میں مزدور کے مسائل اور اس کے دکھ درد کا تذکرہ بدرجہ اتم ملتا ہے۔ میں ادب کو نا گزیر حیثیت کا حامل سمجھتا ہوں اسی لئے ادب برائے زندگی کا قائل ہوں۔ جو ادب انسانی زندگی کا عکاس نہ ہو وہ محض ذہنی عیاشی کے سوا کچھ نہیں۔

مجھے عبد الرحیم سے جو لدار ہاشمی بنانے کا سہرا استاد محترم رند ہاشمی کے سر ہے۔ آپ کے بعد عکاسِ فطرت حضرت عکسی بری میرٹھی مرحوم کے روبرو میں نے زانوئے ادب خم کیا۔ اور ان سے باقاعدہ اصلاح لی۔ پرنسپل حضرت عزیز نصری کی ذات گرامی سے مجھے بار بار مستفیض ہونے کا موقع ملا۔ مرحوم منوہر لال شفق پردیسی اور جناب قمر القادری نے بھی مجھے گاہ بگاہ ادبی نکات سے روشناس کرایا۔ میرا پہلا مجموعہ کلام ۱۹۷۳ء میں "سنگرش ہمارا نعرہ" عنوان سے دیوناگری لپی میں شائع ہو کر قبول عام کی سند حاصل کر چکا ہے۔ اب دوسرا کلام کا مجموعہ "لہو کے رنگ ہزار" عنوان سے میرے عزیز دوست نذیر فتحپوری نے ترتیب دیا ہے جو جلد شائع ہونے والا ہے۔ آکاش وانی پونہ سے میرا کلام متعدد مرتبہ نشر ہو چکا ہے۔ دیگر ہندوستان کے متعدد رسائل و اخبارات میں بھی اکثر و بیشتر میرا کلام شائع ہوتا رہتا ہے۔

قسمت کے تغیرات بھی عجیب ہیں۔ کل جن محفلوں سے اٹھا دیا جاتا تھا آج انہیں محفلوں کی زینت بنایا جاتا ہوں۔ اپنی گھریلو زندگی میں بھی ہر طرح مطمئن ہوں، خدا کے فضل سے شریکِ حیات بھی باشعور اور عمدہ رہائش ملی ہے، بچوں کی بھی افراط ہے۔ میں اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا تاہم گزری ہوئی زندگی کے بارے میں اتنا عرض ہے ؎

دلدار مصائب دنیا کے کیا خاک ڈرائیں گے ہم کو
جب آنکھ کھلی ہے شعلوں میں، پروان چڑھے طوفانوں میں

ایک غزل نمونۂ کلام کے طور پر ملاحظہ فرمائیے ؎

حسینوں کے حسیں پیغام تھے کل شب جہاں میں تھا
وہاں دشمن مرے ناکام تھے کل شب جہاں میں تھا
جنونِ عشق نے وہ کون سا جادو جگا یا تھا
مرے سر سینکڑوں الزام تھے کل شب جہاں میں تھا
اگر کی بیکسوں نے آہ تو انجام کیا ہوگا
کشاکش میں وہ صبح و شام تھے کل شب جہاں میں تھا
کہیں تھی ذاتِ مستی اور کہیں عصمت فروشی تھی
غمِ دوراں کے یہ انعام تھے کل شب جہاں میں تھا
انہیں کے حسن کی رعنائیاں تھیں جلوہ گر شاید
مقدس جلوے ہر اک گام تھے کل شب جہاں میں تھا
کبھی تھا ذکرِ جنت اور کبھی دنیا کے افسانے
مرے واعظ کے یہ دو کام تھے کل شب جہاں میں تھا
مہکتی انجمن میں تم نہ تھے ورنہ سبھی کچھ تھا
صراحی تھی، سبو تھا، جام تھے کل شب جہاں میں تھا
تمہاری بزم میں فرہاد و مجنوں کے ہی چرچے تھے
فقط دلدار ہی گمنام تھا کل شب جہاں میں تھا

نذیر فتحپوری

لمحہ لمحہ بدلتی زندگی کے حالات احاطۂ تحریر میں قید کرنا نہایت مشکل کام ہے۔ پھر بھی میں اپنی زندگی کے مختصر حالات قلمبند کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں اپنے بھائی اور بہنوں میں سب سے بڑا ہوں۔ مجھے اپنے خاندان سے بے انتہا محبت ہے۔ والدین کا سایۂ شفقت بفضلِ تعالیٰ سر پر موجود ہے۔ میری پیدائش ۱۹۴۳ء میں بمقام فتح پور شیخا واٹی ضلع سیکر محلہ خانجی کی حویلی۔ راجستھان میں ہوئی۔

بچپن انتہائی کسمپرسی اور بے بسی میں گزرا۔ تعلیمی اعتبار سے میرے پاس کوئی ڈگری نہیں۔ اسلامیہ اسکول فتحپور میں دسویں جماعت تک تعلیم حاصل کر سکا۔ اس کے بعد تلاشِ معاش کی غرض سے پونہ آئی ۱۹۶۲ء میں پونہ آیا۔ جو اس دکن کی زرخیز زمین سے مستقل وابستہ ہو ...

کہ اسی کا ہو کر رہ گیا۔

پونہ آنے کے بعد علم و ادب کی دولت بیش بہا حافظ سلطان حسین اور عکاسِ فطرت حضرت عکسی برلی میرٹھی سے حاصل کی۔

شعر گوئی کے ابتدائی مراحل دلدار ہاشمی کی سرپرستی اور رہنمائی میں طے کئے گو آج میں ان کی اصلاح کا محتاج نہیں تاہم ان کے مشورے کے بغیر کوئی کام نہیں کرتا۔ میں ان دنوں کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا جن دنوں میں دلدار صاحب نے مجھے شعر و ادب سے روشناس کرایا تھا۔

پرنسپل عزیز قیصری کی ذات بابرکات سے بھی میں نے استفادہ حاصل کیا ہے۔ میرے ادبی ذوق اور تخلیقی ذہن کی ترقی میں مولانا عبد اللہ فاروقی اور جلیس سہسوانی کا بہت بڑا ہاتھ ہے مذکورہ دونوں حضرات کے رسائل میں مسلسل میری تخلیقات شائع ہوتی رہتی ہیں۔ محترم جلیس سہسوانی کی زیرِ نگرانی میرا دوسرا ناول "زخم اور آئینہ" شائع ہوا ہے۔ پہلا ناول "چٹانوں کے بیچ" ۱۹۸۸ء میں بمبئی کے ایک ادارے سے شائع ہوا تھا تخلیقی، تعمیری اور ادبی ذہن قوم کی امانت ہوتا ہے۔ میں اس ادب کو ادب نہیں مانتا جو انسانی زندگی کا عکاس نہ ہو۔ ادیب چونکہ بذاتِ خود سماج کا ایک رکن یا حصہ ہوتا ہے اس لئے سماج اور ادب کو ایک دوسرے سے قریب کرنے کا کام ایک ادیب ہی انجام دے سکتا ہے۔ میں کھلے ذہنوں کے ادیبوں کا پسند کرتا ہوں خصوصاً کرشن چندر، اور سعادت حسن منٹو کو جنہوں نے اپنی ہر کہانی سماج اور ادب کو ایک دوسرے کے قریب سے قریب لانے کی کوشش کی اور لوگوں کو یہ بتا دیا کہ ادب محض ذہنی عیاشی یا لفاظی کا نام نہیں۔ بلکہ یہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں سماج کا ہر فرد اپنا چہرہ دیکھ سکتا ہے۔ میرے دوستوں کی فہرست کوئی طول طویل نہیں۔ مخلص دوستوں میں صرف ایک ہی نام بار بار نوکِ قلم پر آتا ہے اور وہ ہے الحاج عبد القدیر قریشی (صدر جمعیت القریش پونہ) کا۔ موصوف ایک ایک اچھے دوست ہی نہیں بلکہ ادب نواز بھی ہیں (پہلے ادب پرور بھی تھے) میرے دو ناولوں کے علاوہ غیر شائع شدہ کتب کی فہرست طویل ہے۔ جو جلد ہی شائع ہو رہی ہیں۔

نمونۂ کلام ملاحظہ فرمایئے ؎

ڈھونڈنے والو! ادھوری جستجو لے جاؤ گے
پتھروں کے شہر میں انساں کہاں سے پاؤ گے
مطمئن ہو گا نہ دل اک مرکزِ تخیل پر
جس قدر سوچو گے اتنا ہی بھٹکتے جاؤ گے
دورِ حاضر کے خداؤ! پوچھتا ہوں تم سے میں
جلتے جسموں پر کہاں تک آگ تم برساؤ گے
آئینہ، میخانہ، پتھر، شہر، شعلے، روشنی
تم نئے عنوان تم میری غزل میں پاؤ گے
آئینہ سچ بولتا ہے سوچ لو پہلے ندیم!
آئینے میں دیکھنے کے بعد پھر پچھتاؤ گے۔

ع۔ م۔ حیرت ڈرگوی

کہتے ہیں کہ ۱۹ اپریل ۱۹۴۲ء کو صبح صادق میں عالم فانی میں وارد ہوا۔ لیکن کیوں ؎

میں کون ہوں کیا ہوں میں کہیں ہوں کہ نہیں ہوں
کیوں ڈال دیا آپ نے پردہ مرے آگے

چونکہ قریب عید اور بچھڑا ماحول تھا۔ لہٰذا تلاش نام سے بچنے کے لئے عید محمد نام کی مہر ثبت کر دی گئی، جو ... کے بعد گھٹتے گھٹتے آج ع۔ م۔ حیرت کی شکل اختیار کر گیا ہے کہنا پڑا کہ ؎

حیرت تماشا گاہِ جہاں میں بنا دیا
اک زندگی کے روپ میں بہرو پیا مجھے

تعلیم کمتی۔ چار جماعت ہندی۔ گھریلو زبان چھتیس گڑھی۔ فطرت میں فرمانبرداری تھی چنانچہ پھوپھی زاد بھابھی محترمہ ... صاحبہ کی بے لوث کاوش و شفقت نے بدولت اردو سے روشناس کرایا۔ اور آج بھی وہ میری ہمدرد و شفیق ہیں جن کا میں ممنون ہوں ؎

کسی سے فیض پھر ملتا نہیں اس کو قیامت تک
بزرگوں سے عقیدہ جس کا حیرت خام ہو جائے

شاعری کی ابتدا: رمضان المبارک کے تقاضے

ہوئی جسے میں بعید از ادب سمجھتا ہوں۔
محترمی بدر القریشی بدرؔ صاحب کے زیرِ سایہ ۱۹۸۲ء تا
۱۹۸۵ء کے درمیان یہ راز کھلا کہ
بات میں کر بات پیدا ہے یہی تو شاعری
ہو نہ جب دم بات میں حیرتؔ تو وہ بیکار ہے
لہٰذا ۱۹۸۶ء میں طبیعت فن کی جانب مائل ہوئی۔ چونکہ بدرؔ صاحب فن و اختراع میں اتنے بیباک نہیں تھے جو میری تشنگی رفع ہوتی اور نہ ہی ننگ میں کوئی ایسے استاد تھے جنہیں مکمل فن پر عبوریت حاصل ہو۔ لہٰذا دوستوں کے مشورے پر بنگاراالواسحٰق سلیم احمد زخمی صاحب بالودی سے شرفِ تلمذ حاصل ہوا۔ اور میں یہ محسوس کرنے لگا ہوں کہ
ہائے یہ علمِ عروض علمِ زحاف علمِ بیان
داتی منزل سامنے ہے اور پھر منزل نہیں
قید و بند قافیے کے ساتھ ہے قیدِ ردیف
ہم تو سمجھے تھے کہ حیرتؔ شاعری مشکل نہیں

غزل

اب نہ وہ صبحِ بہاری ہے نہ شامِ زندگی
ہو گیا ہے درہم و برہم نظامِ زندگی
تلخ و شیریں بھی ہوا کرتا ہے جامِ زندگی
کام رکھ پینے سے اپنے تشنہ کامِ زندگی
زہد و تقویٰ ہی کو ہے سب کچھ اگر سمجھے ہوئے
تو نے سمجھا ہی نہیں زاہد مقامِ زندگی
آدمی نادان تھا بہکے گا بہکا ہی رہا
دینے والا دے گیا کب کا پیامِ زندگی
بے عمل افسردہ دل افراد ہوں جس قوم کے
وہ بھلا کیا دیں زمانے کو پیامِ زندگی
دل میں ہو نورِ بصیرت چشم بینا چاہیے
ہے درخشاں آج بھی ماہِ تمامِ زندگی
جس جگہ اہلِ خرد ہیں اُس جگہ مست و خراب
یہ مقامِ بندگی ہے وہ مقامِ زندگی

جینے والوں کو سمجھنا چاہیے رازِ حیات
مرنے والا کیا کرے گا احترامِ زندگی
زندگی کو لا رہے ہیں اہلِ بینش زیرِ دام
بوالہوس آئے ہوئے ہیں زیرِ دامِ زندگی
ہے حیاتِ جاوداں حیرتؔ فنا ہونے کے بعد
ابتدائے زندگی ہے اختتامِ زندگی

حال وقال

نام خواجہ معین الدین المتخلص بہ مخلص، سن پیدائش یکم مئی ۱۹۴۵ء۔ والد محترم کا اسم گرامی قبلہ رحیم الدین ابن صدر الدین صاحب۔ آبائی وطن حیدرآباد۔ حیدرآباد میں موسیٰ ندی کو سیلاب آگیا تھا اور پلیگ شباب تھا۔ اس لئے حیدرآباد چھوڑ کر موضع قلم نوری میں قیام پذیر ہوگئے جو آج پربھنی ضلع کا تعلقہ کہلاتا ہے۔
حالات کی ستم ظریفی کی وجہ سے تعلیم کا سلسلہ قائم نہ رہ سکا۔ بہ ایں سبب ۱۹۶۳ء میں درجہ ہفتم کامیاب ہوا۔ اور ترکِ وطن کر کے ثانوی تعلیم کے لئے پوسد میں آگیا۔ اس اثناء میں ہائی اسکول کے صدر مدرس جناب سید ضیاء الحسن صاحب ضیاؔ ایم۔ اے۔ دعلیگ تھے۔ جو نہایت منکسر المزاج اور کئی خوبیوں کے مالک تھے۔ انہوں نے میری تعلیم سے لگن دیکھ کر کلاس میں بیٹھنے کی اور ہفتہ واری بیت بازی کے مقابلہ میں شرکت کی اجازت دی۔ بیت بازی کا مقابلہ میرے شعری رجحان کو ابھارنے کے لئے بہترین مشغلہ ثابت ہوا۔ یہیں سے شعر و شاعری کا چسکا پیدا ہوا۔ ابتداء میں قافیہ پیمائی کر کے استاد محترم ضیاؔ صاحب سے اصلاح لیا کرتا تھا۔ پرائیویٹ طور سے میٹرک کا امتحان ۱۹۶۸ء میں دیا۔ ۱۹۷۰ء میں ایک معلم کی حیثیت سے نگر پریشد کی اردو اسکول میں میرا تقرر عمل میں آیا۔ نو ماہ بعد ڈی۔ ایڈ کی ٹریننگ کے لئے اردو ڈی ایڈ کالج اکولہ بالاپور چلا گیا۔
وہاں ماحول سازگار نہ ملنے کی وجہ سے میں نے اپنی مشقِ سخن جاری رکھی۔ رسائل میں چھپتا رہا اور مشاعروں میں شرکت

کرتا رہا۔ لیکن مجھے اپنے کلام پر کبھی اطمنان نہ ہوا۔ جوں جوں مطالعہ وسیع ہوتا گیا مشق بڑھتی گئی۔ اپنے کلام میں فنی خامیاں نظر آنے لگیں۔ جن کو دور کرنے کا احساس ہمیشہ دل کو مجبور کرتا رہا۔ کسی کامل استاد کے آگے زانوئے ادب تہہ کرنے کا اشتیاق روز بروز بڑھتا گیا لیکن ناکامی رہی۔

۱۹۶۲ء میں اچانک میرا رشتہ تعلیم یافتہ گھرانے میں طے ہو گیا۔ اور ۶ رمئی ۱۹۶۲ء سے ایک معلمہ سے ازدواجی زندگی کا آغاز ہوا۔ میری اہلیہ بھی شعر و ادب کی دلدادہ ہیں۔ مختصر یہ کہ میرا شعری ذوق ہر لمحہ بڑھتا گیا۔ خوش قسمتی سے ۱۹۶۲ء میں ماہرِ سخن مرزا احمد بیگ مضطر کار نجوی سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ ہم ایک دوسرے سے متعارف ہوئے۔ صاحب موصوف کے ۱۱ برس کی عمر میں تین دیوان منظر شہود پر آچکے ہیں۔ جن کو پڑھ کر میں کافی متاثر ہوا۔ موصوف کو چائے نوشی کے لئے اپنے گھر لے آیا۔ چائے نوشی کے بعد شائع شدہ غزلوں کی چند پرچیاں فخریہ انداز سے انھیں دکھائیں۔ تو موصوف نے کہا۔ "میاں کب سے شاعری کر رہے ہو؟" میں نے کہا سات آٹھ سال کی مشق ہے جناب حضرت موصوف نے میری غزلوں میں فنی اور قواعد کی غلطیاں دکھائیں اور مجھ کو بہت زیادہ مشق کرنے کی ہدایت کی اور اساتذہ کا کلام پڑھنے کی بھی تاکید کی۔ بس اسی وقت ... جامع الصفات حضرت مضطر صاحب سے بیعت کر لی۔ بیعت کرنے کے بعد میری ذہنی کیفیت بدلی اور اسلوب بیان بھی بدل گیا۔ نمونۂ کلام ؎

دین دنیا میں اُجالا ہی اُجالا ہو جائے
"چاند کا نور ستاروں کی ضیا بن جاؤ"

پھر بھی چمن میں آشیاں اپنا بنا لیا
واقف تھا خوب سازشِ برق و شرر سے میں

صرف سنتی ہے اسے تشنہ لبی ہی اپنی
جو پیمانے سرِ بزم صدا دیتے ہیں

شورِ طرفانِ کشتی کا جب سن لیا
موج رہ رہ کے ساحل سے ٹکرا گئی

وقت ملا تو بدلتے ہوئے دیکھا سب کو
کوئی محسن کوئی مونس کوئی ہمدم نہ بنا

بُرا کہے تو کہے کوئی مجھ کو اے مطلق
بُرا ہوں اس لئے کہتا ہوں بات بات کھری

کیسے کیسے سوال کر بیٹھے
آج وہ بھی کمال کر بیٹھے

پاس بیٹھے بھی وہ تو کیا حاصل
اپنا دامن سنبھال کر بیٹھے

آدمی جب فرشتہ بن جائے
شیخ صاحب گناہ کون کرے

جان کر رسم و راہ کا انجام
آپ سے رسم و راہ کون کرے

قمرالدین برتر

نام :۔ قمرالدین صدیقی۔ تخلص برتر۔ ولدیت: مولانا حسین بخش صدیقی مرحوم۔ سن پیدائش: ۱۹۴۰ء تعلیم: انٹر کامل۔ جی۔ ڈی۔ آرٹ۔ ذریعہ معاش: ڈی۔ سی ہائر سیکنڈری اسکول گوالیار میں معلم اردو۔ تلمیذ: استاد الشعراء حضرت اثر احسنی گنوری مرحوم۔ ان کے بعد مشورۂ سخن ممتاز شاعر جناب شمیم فرحت سے کیا۔

افسانوں کا مجموعہ بعنوان خونی لکیریں گوالیار سے ہندی زبان میں شائع ہو چکا ہے اور تقریباً ۲۰ سال سے اردو ادب کی خدمت میں گامزن بزم اُردو گوالیار کا سیکریٹری ہوں۔ نمونۂ کلام

آزاد زندگی کی غزل گا رہے ہیں لوگ
اب ہر نظامِ فکر سے ٹکرا رہے ہیں لوگ

ہوگی یہاں پہ دفن کوئی زندگی کی موت
یہ کس کی قبر ہے جسے کھدوا رہے ہیں لوگ

سچائیوں کے چہرے پہ ڈالے ہوئے نقاب
سچائیوں سے آج بھی کترا رہے ہیں لوگ

تبدیلیوں کو لوگ سمجھتے ہیں انقلاب
برتر یہی فریب ہے جو کھا رہے ہیں لوگ

پرکاش نارائن سکسینہ جوہری جے پوری

پیدائش : ۱۵ راگست ۱۹۲۰ء تعلیم : بی ۔ اے ۔ ایل ایل ۔ بی ۔ ملازمت ۱۹۵۲ء سے اکاؤنٹنٹ جنرل راجستھان جے پور میں سلیکشن گریڈ آڈیٹر ۔ اُردو زبان بچپن سے اُردو کی تعلیم گھر سے شروع ہوئی ۔ والد مرحوم منشی سورج نرائن اُردو و فارسی میں فاضل تھے ۔ آپ کو اُردو اور فارسی کے ہزارہا اشعار یاد تھے ۔ اور روزآنہ کی بول چال میں بھی اکثر استعمال کرتے تھے اکثر شعر یاد کرواتے تھے ۔ اسی وقت سے شوق ہوا ۔ اوّل شعر یاد کرنے کا ، سمجھنے کا ، اور بعدہٗ خود کہنے کا ۔

آغازِ شعر :۔ چھٹی جماعت کی تعلیم کے دوران اپنی فلمی گیتوں کی پیروڈی لکھنی شروع کی ۔ اسکول کے پروگراموں میں پڑھا کرتا تھا یہیں سے شعر کہنے کا آغاز ہوا ۔ ۱۹۴۳ء میں دربار ہائی اسکول جے پور میں ایک کوی سمیلن میں ایک نظم پڑھی اور بہت داد پائی ۔ ۹ ور جنوری ۱۹۵۰ء میں مہاراجہ کالج جے پور میں آل انڈیا مشاعرہ ہوا جس میں بیرونی شعراء حضرات نے کافی تعداد میں شرکت کی تھی مجھے بھی اس میں ایک غزل پڑھنے کا موقعہ ملا ملازمت میں آنے پر ۔ اے ۔ جی ریکریشن کلب کے سالانہ میگزین میں میری غزلیں شائع ہوتی رہیں ۔ میری شعری دلچسپی سے متاثر ہو کر میرے دفتر کے احباب مجھے شاعرِ اعظمؔ سے منسوب کرنے لگے اور اسی نام سے پکارتے ہیں ۔

۱۹۵۳ء سے طوطیٔ راجستھان جناب منشی چاند بہاری لعل صاحب صباؔ جے پوری سے نیاز حاصل ہوا اور شاگردی کا شرف ملا ۔ آپ نے ازراہِ کرم میری غزلوں میں اصلاح دینا منظور فرمایا ۔ جے پور کے عام اور آل انڈیا مشاعروں میں ، کوی سمیلنوں میں گاہے گاہے شرکت کا موقعہ ملتا رہا ہے ۔ کئی بار جے پور سے باہر بھی مشاعروں میں شرکت کی ہے ۔ (نمونۂ کلام)

ہر بات پہ لوں ہم پہ بگڑنا نہیں اچھا ⁂ ہر وقت کی ضد دیکھئے اچھی نہیں ہوتی
انسان میں اگر عشق کا جذبہ نہیں ہوتا ⁂ پھر حسن کی ہستی کوئی ہستی نہیں ہوتی

گذرے تری تلاش میں جا بجا بھٹکتے ہم ⁂ آگے نکل گئے ہیں جو دونوں جہان سے ہم
پہنچے ہی جا کے ہیں مگر یہ خبر نہیں ⁂ ہیں کتنے پیچھے اور ابھی کارواں سے ہم
ٹکرا کے لوٹ آتی ہے تو دل فلک کو ہے ⁂ جو تیر چلے لینے ہیں تیرِ کماں سے ہم
ہے دردِ عشق جان سے بھی ہم کو یوں عزیز ⁂ لیکر کے اس کو آئے ہیں کوئے بتاں سے ہم
کیونکر کہیں یہ جوہری جائیں گے ہم کہاں ⁂ جب یہ خبر نہیں ہے کہ آئے کہاں سے ہم

آنکھیں بھی میری نم رہیں دامن بھی تر رہا ⁂ یوں ہی فراقِ یار کی دنیا سے گزر رہا
مجھ سا بھی خوش نصیب ہوگا جہان میں ⁂ میں نے نگاہ ڈالی جدھر تو ادھر رہا
دنیا کی دلفریبیاں کچھ بھی نہ کر سکیں ⁂ دل تو اسی کی یاد میں شام و سحر رہا
ڈرتا تھا کہ سوزِ عشق سے یہ جل نہ جائے دل ⁂ سینے سے یوں لگائے میں دامانِ تر رہا

مہتاب تاباں لکھنوی

میرا آبائی وطن قصبہ بڑا مچھوڑہ خورد ضلع جونپور یوپی ہے میری پیدائش شہر لکھنؤ میں ہوئی میری ابتدائی تعلیم عربی فارسی اُردو مدرسہ مدینۃ العلوم پوسٹ براکر (بردوان) میں ہوئی ۔ انگریزی اور ہندی کی تعلیم ہٹنر کاشی ضلع بردوان اسکول میں میٹریکولیشن کیا ۔ ان دنوں میری گھڑی کی ایک دُوکان ہے ۔

میری پیدائش ایک مہذب ادب نواز اور تعلیم یافتہ خاندان میں ہوئی ۔ میرے والد محترم جناب قیام الدین احمد صاحب قادری الہ آبادی خود اہلِ علم ہیں ۔ ۱۹۵۰ء میں براکر میں تحصیلِ علم کے دوران ہی ایم ۔ قمر سنبھلی صاحب کی شاگردی کا فخر حاصل ہوا ۔ جن کی دیکھ ریکھ میں فنِ شاعری میں میرا کچھ شمار ہونے لگا ہے نمونۂ کلام کے طور پر ایک غزل کے چار اشعار ملاحظہ فرمائیے

سنگِ ستم تمہارے نہ ہو جائیں پاش پاش
اب ڈر رہے ہیں دیکھ کر وہ آئینے مرے
صیاد قید کر نہ قفس میں تو زندگی
ہیں گلشن و بہار سے اب سلسلے مرے
بجز غمِ حیات بھی لرزاں ہے دوستو
موجِ بلا سے دیکھے ہیں جب حوصلے مرے
تاباںؔ خموش رہنا ہی بہتر ہے اس گھڑی
مشہور ہیں زمانے میں اب قہقہے مرے

میرا مکمل پتہ یہ ہے ۔ معرفت قیام الدین احمد قادری الہ آبادی معرفت اسٹیشن روڈ ۔ پوسٹ براکر ۔ ضلع بردوان (مغربی بنگال)

گوشۂ عقیل صدیقی

حاصلِ مطالعہ

بیمار کا حال اچھا ہے

(ابن انشا کا آخری مضمون)

شان ہند کی ہر اشاعت میں گوشۂ عقیل کے تحت حاصل مطالعہ کے مستقل عنوان سے پاکستانی ادیبوں اور شعرا کے ادبی اور شعری شہ پاروں کا انتخاب دیا جائے گا۔ جو پاکستانی رسائل اور جرائد سے اخذ کیا جائے گا۔ کیونکہ پاکستانی رسائل و جرائد عوام کی دسترس سے باہر ہیں۔ اور ہندوستانی اردو دوست پاکستانی رسائل و جرائد کے مطالعہ کو ترس رہے ہیں۔ اس انتخاب سے قارئین کرام کی یہ تشنہ لبی کسی حد تک ضرور دور ہو سکے گی۔ (ادارہ)

اسپتال میں جن صاحب سے سب سے پہلے ہماری علیک سلیک ہوئی سامنے کے بستر کے بڑے میاں تھے — مسٹر لوئیس — اسپتال میں آدمی اس طرح ایک دوسرے سے اس کا مرض پوچھتا ہے۔ جس طرح اسپتال سے باہر خیریت دریافت کرتا ہے۔ وہاں یہ کہ راضی باضی بھلو چنگو، مزاج شریف، یہاں یہ کہ مرض مبارک کیا ہے ؟ ماشاءاللہ — بیماری کون سی ہے ؟ اللّٰھم زد فزد — روایت کا تقاضا یہ ہے کہ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش کی جائے باتوں باتوں میں مخاطب پر واضح کیا جائے کہ تیرا مرض تو کچھ بھی نہیں، جانے کیسے اسپتال میں آ گیا۔ سفارشی ہوگا۔ دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو۔ ایک صاحب کہتے ہیں مجھے دمہ ہے۔ کھانستا ہوں تو لگتا ہے ابھی دم نکل جائے گا دوسرے صاحب کہتے ہیں دمہ بھی کوئی چیز ہے! مجھے دیکھو، میرے دونوں پھیپھڑے نکالے جا چکے ہیں۔ مصنوعی نالیوں سے سانس لیتا ہوں۔ اصل مرض تو گٹھیا ہے۔ اور میرا گٹھیا تو بہت اعلیٰ نسل کا نقرس ہے۔ قریب قریب لا علاج۔ فلاں فلاں مشاہیر کا انتقال اسی میں ہوا۔ اس پر تیسرے مریض سے نہیں رہا جاتا فرماتے ہیں۔ ہاں گٹھیا بھی نامراد مرض ہے لیکن پھر ایسا بھی نہیں ہے مجھے تو بچپن سے ہے۔ مرضوں میں مرض ہے بھگندر۔ یہ دیکھو پورے گھٹنے پر پھیل گیا ہے۔ چوتھا مریض بڑی دیر سے ٹُک ٹُک دیکھ رہا ہے کہ میری باری ہی نہیں آتی۔ آخر دل پہ دو ہتڑ مار کر ایک طرف کو لُڑھک جاتا ہے کہ خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں — فوراً بھگدڑ مچ جاتی ہے۔ اہل کار و نرسیں کیطرف بھاگتے ہیں کہ رجسٹر دیکھیں اس کے ذمہ اسپتال کی رقم تو نہیں، معقول زرِ ضمانت رکھوا لیا تھا۔ یہ ڈوب گیا تو اس کی جگہ دوسرا آ جائے گا، اسپتال کے پیسے نہ ڈوبنے چاہئیں۔ اگر پیسے نکلتے ہیں تو بڑے جذبے سے دل کی مالش شروع کر دیتے ہیں۔ ایک فقیہ ذہن تو مصنوعی تنفس دینے کے لئے مریض کے لبوں پر لب بھی رکھ دیتی ہے۔ وہ تھوڑی دیر میلا پڑا رہتا ہے۔ پھر کھڑھتا ہوا اٹھ بیٹھتا ہے۔ وہ کون سا مر گیا تھا۔ اور اس قسم کے علاج سے تو سنا ہے سچ مچ کے تنِ مردہ میں بھی جان پڑ جاتی ہے۔ ہمارے بعض دوست جو اسپتال میں رہے ہیں رات میں کئی کئی بار مصنوعی تنفس لیا کرتے تھے۔ بلکہ ایسے ماہر ہوئے کہ خود نرسوں کو دیا کرتے تھے۔ بتاتے ہیں اس سے بڑا فائدہ ہوتا ہے۔ اب تک ہونٹ چاٹتے ہیں — اب اپنے — کوئی کام کا سیما نظر آیا تو ہم بھی یہ علاج کر کے دیکھیں گے۔

(۲)

القصہ مسٹر لوئیس نے ہم سے پوچھا، کیوں آئے ؟ کس مرض میں آئے ؟ ہم نے کہا "پہلے آپ"

بولے "سمجھ میں نہیں آتا کیا مرض ہے ؟ مجھے ایک ایک کے دو نظر آتے ہیں، مثلاً تمہاری میز پر ایک گلاس رکھا ہے مجھے دو نظر آ رہے ہیں۔"

ہم نے کہا "لوئیس صاحب دو ہی تو ہیں۔ یہ رہا ایک۔ یہ رہا دوسرا۔ یہ اسپتال کا ہے۔ یہ میں گھر سے لایا ہوں۔"

بولے "تمہاری پلنگ کے پاس اسٹول بھی دو دکھائی دے رہے ہیں حالانکہ ایک ہے۔ ہر پلنگ کے ساتھ ایک ہوتا ہے۔"

ہم نے کہا اسٹول بھی دو ہی ہیں۔ ایک یہ ساتھ والے مریض کا معلوم ہوتا ہے کوئی ادھر رکھ گیا ہے۔"

اب فرمانے لگے مجھے تو تم بھی دو دو نظر آنے ہو۔"

اب ہم چپ ہو گئے۔ ان سے کیا کہتے کہ ہم بھی دو ہی ہیں تم ہیں غلط نہیں نظر آرہا ہے۔ بلکہ حقیقت پوچھو تو دو سے زیادہ ہیں سے

ہم جب دیکھیں بہروپ نیا ہم کیا جانیں تم کیا کیا ہو۔

اب انھوں نے ہمارا پوچھا ہم نے کہا" ...... ہمیں کچھ نہیں ہوا تھوڑا سا ہم جاناں ہے۔ یہ مرض ایشیا میں خاص کر ہمارے ملک میں زیادہ ہوتا ہے۔ اور دہائی ہے۔ آپ کی سمجھ میں نہ آئے گا۔ اس کی علامات بھی نثر میں بتانے میں لطف نہیں اور شاعری کا ترجمہ ہم سے نہیں ہوتا۔"

(۳)

عینی شاہدوں کا بیان ہے کہ سرجن غازی (GAZET) نے ہمارے پیٹ میں لمبا سا شگاف دے کر پہلے ہماری تلی نکال کر ایک طرف کو پھینک دی۔ کہ ایں دفتر بے معنی غرقِ مئے ناب اولیٰ۔ پھر اپنڈکس نکالا کہ یہ نام ہی سے زائد ہے۔ سامنے چند غدود تھے انکو بھی نکال کر تھال میں سجا دیا۔ مختار صدیقی نے لکھا ۔۔۔ گورے جسموں کو جوان رکھتے ہیں بندر کے غدود ہیں ۔۔۔ ہم کسی طرف سے گورے نہیں اس لئے ہمارے غدودوں کے نعم البدل کی بھی ضرورت نہ سمجھی گئی۔ یا یہ سوچا ہوگا کہ ان صاحب نے جوانی میں اپنے غدودوں سے کون سا تعمیری کام لیا۔ کون سا تیر مارا جو بندر کے غدودوں سے ماریں گے۔ ایک طرف جگر لٹکا نظر آیا۔ خیریت ہوئی کہ سے نہیں نکالا لیکن اس کا ایک ٹکڑا یعنی جگر گوشہ نکال کر نمونہ کلام کے طور پر رکھ لیا پھر کچھ اور نکالنے کی سوچ رہے تھے دوسرے ڈاکٹر کو رحم آگیا۔ اس نے کہا بچارے کے پیٹ میں کچھ تو رہنے دو۔ بالکل ہی پیٹھ سے نہ لگ جائے۔ یہاں آپ کو جوشؔ صاحب کا قصہ یاد آئے گا" یادوں کی برات" والا کہ" ارے کچھ تو پیٹ میں جائے" لیکن وہ اور مضمون ہے۔ بڑے آدمیوں کی ..... بھوک بھی بڑی۔

ہمارے پیٹ میں کئی خرابیاں ہیں۔ ایک تو اس میں کوئی بات نہیں پچتی، گولیاں کھائیں، پھکی پئے۔ بکر ہضم، پتھر ہضم، چورن نوش جاں کئے۔ کچھ فائدہ نہ ہوا۔ خیر پیٹ کا ذکر تو ضمنی ہے۔ نام اس مرض کا ایک انگریز ڈاکٹر ہاجکنز (HODGKINS) کے نام پر ہے۔ اور اس کا تعلق جسم کی گلٹیوں سے ہے۔ اس نے ۱۸۳۲ء میں دریافت کیا۔ مرض تو دریافت کر لیا لیکن اس کا علاج تو ایک طرف، وجہ مرض تک دریافت نہ کی چنانچہ یہاب تک دریافت نہ ہو سکی۔ ہم پہلے تو خوش ہوئے کہ دیکھو ایک مشہور انگریز کے نام کا مرض ہمیں لگا جو بہت نادر و نایاب بھی ہے کھانسی، نمونیہ، تپ دق، ٹائیفائڈ ملیریا کی طرح عامیانہ نہیں ہے۔ البتہ اس کے بارے میں پڑھا تو پریشانی ہوئی کہ ٹیڑھا مرض ہے، جان لیوا ہے یعنی اس کا علاج یقینی نہیں ہے۔ جو ہے تجرباتی ہے۔ ان انگریزوں، امریکنوں، جرمنوں کو نئے نئے مرض دریافت کرنے کے علاوہ کوئی کام نہیں۔ پھر ایک ایک مرض کے لئے دس دس دوائیں کھلواتے ہیں کہ کوئی تو کارگر ہوگی ۔۔۔ آپریشن وغیرہ اس کے علاوہ ۔۔۔ یہ نہیں کہ ایک امرت دھارا ایجاد کر لیا۔ اسی کو کھایا اسی کو لگایا، اسی کو پانی میں ڈال کر پی گئے۔ اسی کو روماں پر ڈال کر سونگھ لیا۔ ہمارے ڈاکٹروں اور حکیموں نے ایسے سفوف بنا رکھے ہیں کہ قبض والے کو بھی وہی، اسہال والے کو بھی وہی، کان دکھتا ہو، پھنسی نکلی ہو، پیشاب نہ آتا ہو، پیشاب بہت آتا ہو۔ سر کے بال جھڑتے ہوں تو نہار منہ کھائیے ورنہ پانی میں گھول کر لیطور بال صفا پاؤڈر کے لگائیے۔ ایک صاحب تو اپنی دوا کا اشتہار دیتے ہیں کہ" بواسیر اور دیگر امراضِ چشم کے لئے اکسیر ہے۔" یعنی شرے ہمارے حکماء نے ایجاد کر رکھے ہیں کہ بصارت کے علاوہ بصیرت بھی عطا کرتے ہیں۔

ان لوگوں میں تارے نظر آنے لگتے ہیں۔ آج کل ریسرچ کے مارے امراض کی ریل پیل کا یہ عالم ہے کہ مریض کی سمجھ میں نہیں آتا کس مرض سے مرے۔ پرانے زمانے میں شرفا چپ چاپ قضائے الٰہی سے انتقال کر جاتے تھے۔ اب قضائے الٰہی نام کا مرض کسی طبی کتاب میں نہ ملے گا۔ ڈاکٹروں کا اللہ تعالیٰ پر سے ایمان بالکل ہی اٹھ گیا ہے۔

(۴)

جانے کب ۔۔۔ غالباً رات کو ہوش آیا تو دیکھا، سر پر طرہ ہار، گلے میں یعنی ناک میں نالی ہے۔ بانہہ میں سوئی، سرہانے گلوکوز کی بوتل یعنی پلاسٹک کی تھیلی ایک اور نالی پیٹ میں پیوست تاکہ آپریشن کے زخموں سے رستا ہوا خون اندر نہ رہ جائے۔ ہاں پیٹ کو ہم بھول ہی گئے کہ اس پر ٹانکے، اور ٹانکوں پر پھاہے، اور پھاہوں پر پٹی۔ ابھی سُن کرنے کی دوا کا اثر تھا لہٰذا تکلیف نہ تھی۔ البتہ سنسناہٹ یا پھر غنودگی، ہم نے دوستوں کو کہہ دیا تھا کہ اس عالم میں ہمیں کوئی دیکھنے نہ آئے۔ ایک دو روز بعد بھی۔ لیکن اگلے روز ناک کی نالی نکلوا کر بیٹھے ہی تھے کہ نیتی صاحب

جو لندن آتے ہوئے تھے تشریف لے آئے۔ فیض صاحب کسی کو دیکھنے اُدھر گئے تو اسے اسی وجہ سے آپریشن کرا لینا چاہیئے۔ گویا یہ ہمیں مفت پڑا۔ ان کے ساتھ حمید اختر پھر ابن حسن برنی اور پھر تو دوستوں کا تانتا بندھ گیا۔ جنگل میں منگل ہو گیا۔ ہمارا آپریشن تو منگل کے روز ہوا تھا۔

چھائی قفس میں داغ ہے ہو کیوں نہ رشکِ باغ
فصلِ بہار تھی کہ ہم آئے اسیر ہو

(۵)

آپریشن آج کل معمولی چیز ہے۔ ذرا بھی ضرورت ہو تو ڈاکٹر شوقیہ کر دیتے ہیں۔ ایک صاحب کو کھانسی تھی، وہ مکسچر لینے گئے۔ ڈاکٹر نے ان کی پنڈلی کا آپریشن کر کے پٹی باندھ دی۔ یہ سچ ہے کہ اس کے بعد ان کی پنڈلی میں مستقل درد رہنے لگا لیکن کھانسی غائب ہو گئی۔ مریض کا معاملہ البتہ الگ ہے۔ آپریشن سے زیادہ اس کی جان آپریشن کے خیال سے جاتی ہے۔ ہمارا آپریشن خاصا بڑا تھا۔ ہم نے پاکستان میں اپنے گھر والوں کو اطلاع بھی نہ دی۔ ہمیں دوستوں سے کہہ دیا کہ جو کچھ ہو گیا تو صورتِ حال کو سنبھالنا۔ بعد میں لوگوں نے ہمیں داد بھی دی کہ بڑے بہادر آدمی ہو۔ چپ چاپ اتنا بڑا آپریشن کرا لیا اس پر ہمیں ان صاحب کا لطیفہ یاد آیا جو جہاز کے عرشے پر کھڑے تھے۔ ایک مسافر کا پاؤں رپٹا یا کچھ اور ہوا اور وہ پانی میں جا گرا۔ غوطے کھانے لگا۔ سبھی لوگ ہچکچا کر پیچھے ہٹ گئے۔ صاحبِ مذکور کو لوگوں نے دیکھا کہ اس کے پیچھے کود گئے۔ اور اسے بچا لائے۔ ان کو بھی لوگوں نے داد دی تو وہ فریاد کرنے لگا کہ پہلے یہ بتاؤ مجھے دھکا کس نابکار نے دیا تھا۔ ہمارے آپریشن کے لئے پہلے یکم اپریل کی تاریخ دی گئی تھی۔ اس روز آپریشن کرانا ہمیں حماقت نظر آیا۔ دوسرے بھی یہی خیال کرتے۔ اس سے قطع نظر ہمت بھی نہ پڑی جھرجھری سی آئی۔ کچھ بہانہ بنا کر مہلت لے لی۔ اگلی تاریخ ۹ اپریل دی گئی اور ہم ۸ اپریل کو داخل ہو گئے۔ ۸ کو ہمارے حکیم سعید دہلوی دیکھنے کو آئے۔ ہم نے کہا ابھی وقت ہے۔ حکیم صاحب کوئی طبِ مشرق کوئی مجرب شافی نسخہ، کوئی کشتہ، معجون مرکب۔ کہ نشتر سے جان بچے۔ فرمایا۔ چڑھ جا بیٹا سولی رام بھلی کرے گا۔ اس کا علاج یہی ہے جو کرا رہے ہو۔ پھر بھی رات کو جی چاہا کہ بھاگ چلو۔ ہم نے فضل بک ڈپو کے جاسوسی ناول پڑھ رکھے تھے۔ دو چادروں کو گرہ لگائی۔ ان کے ساتھ ایک تولیے کو جوڑا۔ پھر کھڑکی سے باہر جھانکا۔ افسوس کہ ہم تیسری منزل پر تھے۔ آپریشن میں جان جانے کا اتنا امکان نہ تھا جتنا اس فرار کے طریقے میں پھر اور بھی کئی مصلحتیں آڑے آئیں۔ ہم نے تاریخ اسلام سے متقدمین کے شجاعانہ کارنامے یاد کر کر کے دل کو بڑھاوا دیا۔ سلطان ٹیپو کا قول بھی یاد آیا کہ شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی ہزار سالہ زندگی سے بہتر ہے۔ پھر غور کیا تو یہ کچھ اپنے احوال کے مطابق نہیں بلکہ کچھ الٹا ہی جاتا نظر آیا۔ کھانا پینا رات ہی سے بند کر دیا گیا۔ صبح دم غسل کے بعد خاص آپریشن کا لباس پہنا دیا گیا۔ پھر سٹریچر آ گیا۔ اور ایک انجکشن ہمیں دے دیا گیا۔ اب آپریشن تھیٹر کی طرف پا بجولاں چلے۔ دشت افشاں چلے۔ آگے آپریشن تھیٹر کے دروازے پر پھر ایک ڈاکٹر نے ہمیں انجکشن دیا۔ اور اس کے بعد . . . . چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ بیہوش ہونے سے پہلے ہم نے ان ڈاکٹر کی صورت کو مانوس پا کر پوچھا، آپ کہاں کے ہیں؟ بولے "بنگلہ دیش کا ہوں" نام "ڈاکٹر احمد"۔ ہم نے کہا الحمد للہ۔ اگر یہ آخری نظر تو تب بھی ایک بھائی ہی پر پڑی ہے۔

(۶)

گلوکوز کی بوتل کا سٹینڈ چلیپا کی شکل کا ہے اور اس کے نیچے پہیے لگے ہیں۔ ہم اُسے لے کر کاریڈور میں ٹہلنے کو نکلتے ہیں تو لگتا ہے حضرت عیسیٰ کا کوئی حواری یا نام لیوا صلیب لے کر نکلا ہو۔ انسان اپنی چھوٹی تکلیف۔ کو بھی کتنی بڑی سمجھنے لگتا ہے بے شک ہمارے پیٹ میں بھی آپریشن کے زخم کا احساس یوں ہوتا تھا جیسے کیل گاڑی گئی ہو۔ لیکن وہاں کیل گاڑنے کا مقصد ہلاک کرنا تھا۔ یہاں جان بچانا یہاں ہر قسم کی احتیاط اور مرہم پٹی کہ زخم بگڑ نہ جائے وہاں اس کے برعکس، یہاں دم دلاسا، ہمدردی، مزاج پرسی، ــــ وہاں طعن و تشنیع وہاں سنگ و خشت، یہاں پھولوں کے گلدستے، وہاں چوبیں کٹکڑی یہاں نرم و گرم بستر، چائے پانی، دوا دارو، یہ سچ ہے کہ ان مصلوبوں اور شہیدوں کو جو شہرت نصیب ہوئی ہمارے حصے میں نہ آئی۔ آج دنیا میں کروڑوں لوگ ان کے نام لیوا ہیں ان پر کتابیں چھپتی ہیں، فلمیں بنتی ہیں، درود و سلام بھیجے جاتے ہیں لیکن ہم ایسی شہرت سے درگزرے ــــ ہم یہ سب کچھ نہیں چاہتے۔ ہم تو جینا چاہتے ہیں وہ بھی اپنی دنیاداری کی سنت کے ساتھ۔

حق اچھا پر اس کے لئے کوئی اور مرے تو اور اچھا
تم بھی کوئی منصور ہو جو سولی پر چڑھو خاموش رہو۔

(۷)

بستر کی پائنتی میں کئی بٹن ہیں جو کبھی ہماری سمجھ میں نہیں آئے۔ اکثر نتیجہ خلافِ منشا نکلا۔ کئی بار بے ارادہ ہاتھ اگر کسی بٹن پر پڑ گیا تو مشین چلنی شروع ہو گئی۔ اور سرہانے ٹانگیں اوپر ہوتی چلی گئیں۔ شیطانی کارخانہ ہے۔ ہمارے ملک کے اسپتالوں میں ہتھی گھما کر اوپر نیچے کرتے ہیں۔ وہ ٹھیک ہے لیکن اس سے زیادہ آزمودہ نسخہ یہ ہے کہ جس طرف سے پلنگ اونچا کرنا ہو ادھر پایوں کے نیچے اینٹیں رکھ دی جائیں ایسا بھی ہوتا ہے کہ اینٹیں وقت کے وقت نہیں ملتیں تب یہ کام کتابوں سے لیا جاتا ہے۔ ایک پائے کے نیچے "بہشتی زیور"، دوسرے کے نیچے "ملی پور کا ایلی" ___ آخر الذکر ذرا اونچا ہو جاتا ہے۔ یوں کتابیں بھی اکثر بیکار چیز نہیں ہیں۔ ان کا بھی کوئی نہ کوئی مصرف ہے۔

(۸)

یہاں ہر کرسی پر اسپتال کا نام اور سنِ ورود درج ہے۔ یعنی جس سنِ عیسوی میں وہ چیز خریدی گئی۔ ہمارا دھاری دھار گاؤن جسے پہن کر کبھی کبھی ہم شاہانہ کروفر سے نکلتے ہیں۔ ۱۹۶۲ء سے مریضوں کی بے لوث خدمت کر رہا ہے۔ یہاں اوسطاً مریض دو ہفتے ٹھہرتا ہے کوئی کم زیادہ بھی لیکن حساب کے لئے دو ہفتے ہی رکھیئے۔ اس لحاظ سے کتنے مریض اب تک اس گاؤن کے حصے میں آئے۔ کوئی چار سو۔ یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے۔ کہیں کہیں سے مسکنے لگا ہے۔ مریض تو اس کا کیا بگاڑ سکتے تھے۔ لانڈری میں ایسا ہوا ہوگا۔ ابھی دو چار سال بخوبی کام دے گا۔ اس کا چیکا نہیں ہے۔ اس کی جگہ ہم اپنا انار بند ڈال لیتے ہیں۔ انار بند کے ذکر سے نظیر اکبر آبادی کے شہر آشوب کا ایک بند یاد آتا ہے۔ . . . بعض بیٹیوں کی کساد بازاری کے مضمون میں۔

دو دو مہینے ......

پورا نقل نہیں کر سکتے کہ بیٹھے بٹھائے نظیر نہ ہو جائے۔ عاقبت تو ہماری مشتبہ ہے دنیا بھی خراب کر بیٹھیں۔

(۹)

ہم سفر و حضر میں اپنے ساتھ کتابیں ضرور رکھتے ہیں۔ اور ان میں اپنی بھی کوئی نہ کوئی کتاب ضرور ہوتی ہے۔ بات یہ ہے کہ ہم اپنے محبوب مصنف ہیں۔ اپنی شاید ہی کوئی کتاب ہوگی جو ہم نے نہ پڑھی ہوگی۔ کیا اندازِ تحریر ہے! کئی بار تو اپنے ہاتھ چوم لینے کو جی چاہتا ہے حالانکہ قاعدے سے یہ کام کوئی اور کرتا اور صیغۂ تانیث میں کرتا

تو بہتر ہوتا۔

اس بار ہمارے ساتھ چلتے ہو تو چین کو چلئے ہے۔ اس میں ایک گروپ فوٹو ہے جس میں کچھ لوگ مارشل چین تری کے ساتھ کھڑے ہیں۔ ان کے بالکل ساتھ ایک طرف پرنسپل ابراہیم خاں ہیں۔ دوسری طرف ایک شخص ٹھگنا اکلے بھرے ہوئے۔ قد میں دوسروں سے کچھ نکلتا ہوا۔ ہم نے غور سے دیکھا یہ ہم خود تھے۔ ہمیں یقین نہ آیا لیکن نیچے نام بھی لکھا تھا۔ اس وقت اس جسم پہ پینتیس پونڈ زیادہ گوشت تھا۔ مٹن کے حساب سے بھی دام لگا لیجئے۔ یا کسی قصائی سے لگوا لیجئے تو کتنے کا نقصان اب تک ہو چکا۔

(۱۰)

آج کل ہمیں ایسے ایسے مرتب اور عالمانہ خواب آتے ہیں کہ بعض اوقات شرمندگی ہوتی ہے کہ ہم اپنے علم کو اتنا سطحی اور دماغ کو اتنا پراگندہ کیوں سمجھتے رہے۔ ہماری حد تک اس کا باعث کسرِ نفسی یعنی طبعی انکسار اور حلم بھی ہو سکتا ہے۔ ستم یہ ہے کہ اوروں کو بھی ہمارے بارے میں ایسے ہی مغالطے میں مبتلا پایا۔ اپنے جوہرِ قابل کی اس ناقدری پہ دلی افسوس ہوا۔ بعض خواب تو اتنے بلیغ اور فاضلانہ تھے کہ خود ہماری سمجھ میں نہ آئے۔ اب یاد بھی نہیں کہ بطور ثبوت یہاں درج کریں۔

(۱۱)

احباب آتے ہیں تو کوئی نہ کوئی پھل ضرور لاتے ہیں۔ ہم کچھ کھاتے ہیں کچھ نرسوں میں بانٹ دیتے ہیں۔ راقم مصنف کا شعر ہے:

جھوٹے سکوں میں بھی اٹھا دیتے ہیں یہ اکثر سچا مال
شکلیں دیکھ کے سودے کرنا کام ہے ان بنجاروں کا

نتیجہ خاطر خواہ نکلتا ہے۔ خبرگیری زیادہ ہو گئی۔ بستر کی چادر بجائے ہفتے کے بدلی جانے لگی۔ تولیے بھی ایک کے بجائے دو آ گئے۔ ایک نرس کو ہم نے ایک اورنج اور تین چار کیلے دیئے اور کچھ انگور بھی تو اس نے از راہِ شفقت ہمارے ماتھے کو چوم لیا۔ اگر وہ ایک سیب اور ایک آدھ ناسپاتی بھی دے دیتے تو شاید اسے اس عمل کے لئے موزوں تر مقامات بھی معلوم ہو جاتے۔ جو چند انچ دور تھے۔ یہ ہمارا قیاس اور خوش خیالی بھی ہو سکتی ہے۔ دراصل ہمارا ارادہ اس حکایت کو تھوڑے سے حسنِ بیان سے لذیذ تر بنانے

کا تھا۔ آخر بھی لکھنے والے اپنے سفرناموں اور اسپتال ناموں میں ایسا کرتے ہی ہیں، لیکن خدا کا خوف حائل ہوا۔ اس بیماری میں کہ ہماری زندگی داؤں پر لگی ہے۔ ہم نے صدق دل سے عہد کیا ہے کہ جب تک ٹھیک نہیں ہو جاتے جھوٹ کم سے کم بولیں گے وہ بھی فقط جہاں اور جہاں ضرورت ہوگی۔ اللہ ہمارے اس ارادے کو استقامت بخشے

(۱۲)

کل بشارت ملی کہ ہماری رپورٹ بڑی اچھی ہے۔ ہمارے زخم تیزی سے مندمل ہو رہے ہیں۔ چند روز میں ٹانکے کھل جائیں گے۔ رات ساڑھے و بجے ان ٹانکوں سے خون بہہ نکلا۔ اور اتنا کہ تسلا بھر گیا۔ ڈیڑھ دو سیر تو نکلا ہوگا۔ اس کے بعد تین چار بار پھر کوئی آدھ آدھ سیر۔ ہمارے پاجامے اور نائٹ سوٹ خراب ہو گئے ہم نے اسپتال والوں سے نائٹ سوٹ مانگا۔ انہوں نے جو دیا اس کے دونوں حصے مختلف رنگوں اور ڈیزائنوں کے تھے۔ ایک کی دھاریاں سیندوری رنگ کی، دوسرے کی سبز۔ پھر دونوں اتنے چھوٹے کہ اندر کفن کے سر ہے۔ تو باہر کفن کے پاؤں۔ پاجامہ تو ٹخنوں سے بھی اونچا۔ ہم نے فرمائش کی کہ بابا یا تو اوپر کے ساتھ کا نیچے کا حصہ لا کر دو یا نیچے کے ساتھ کا اوپر کا حصہ۔ جواب ملا ناممکن۔ ہم نے کہا کوئی تیسری صورت۔ مختلف ڈیزائن۔ لیکن ایک ہی رنگ کے دونوں حصے۔ انھوں نے کہا یہ بھی امر محال ہے۔ مختلف پاجاموں یعنی نائٹ سوٹوں کے مختلف بالائی اور زیریں حصے وارڈوں میں اس طرح پھیلے ہوئے ہیں کہ ان کا ذوالاضعاف اقل نکالنے کے لئے کمپیوٹر چاہیے۔ ہم نے کہا، ہمیں ذو اضعاف اقل یا عادِ اعظم نہیں پاجامہ چاہیے۔ مسئلہ ہماری کابینی جامہ زیبی کا ہے۔ جب تک ہمارے پاجامے نہیں دھل گئے ہم اسی قلندرانہ لباس میں دندناتے رہے۔ ع:

ترا داغ ہے دل میں چراغ صفت ، ترے نام کی زیب گلو کفنی

(۱۳)

بلمونٹ میں آج کل بہار ہے —— پھول کھلے ہیں۔ پات ہرے ہیں، کم کم بادوباراں ہے! ہمارے میر صاحب رہتے لکھنؤ میں تھے۔ نقشے ولایت کے کھینچتے تھے۔ بلمونٹ لندن میں ہے بھی اور نہیں بھی۔ لندن نے پھیلتے پھیلتے جانے کتنے قصبے اپنے پیٹ میں ہضم کر لئے ہیں۔ وکٹوریا اسٹیشن سے ریل میں بیٹھیے تو بارھواں یا تیرھواں اسٹیشن ہے۔ سٹن مشہور جگہ ہے بس اس سے ایک اسٹیشن آگے۔ ہرا بھرا، سرے کا صوبہ، اس پر فضا ماحول میں کئی اسپتال ہیں۔ یہ اسپتال رائل مارسڈن اسپتال، انگلستان بلکہ یورپ میں کینسر اور اسی قسم کے دوسرے موذی (میلگننٹ) امراض کا سب سے اچھا اسپتال اور مرکز تحقیق گنا جاتا ہے۔

کمرہ ہمارا ائلز وارڈ میں دوسری منزل پر بلکہ ہمارے حساب سے تیسری منزل پر عین سامنے کے رُخ ہے۔ ہمارے سامنے درختوں کی کونپلیں پھوٹیں۔ جھاڑیوں میں شگوفے آئے لنڈ منڈ درخت ہرے بھرے ہوئے۔ اور اُودے اُودے نیلے نیلے، پیلے پیلے پیرہن زیب تن کئے کبھی دھوپ نکلتی ہے کبھی رم جھم ہوتی ہے۔ پھر بھی اسپتال اسپتال ہے۔ اور گھر گھر ہے۔ پانچ ہفتے ہو گئے۔ اب چھٹی لیں۔ ہمارے آپریشن کے زخم نہیں بھرے نہیں ہی، ہمارے اور کون سے زخم بھرے ہیں۔ اور زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا؟ اب رہی پٹی وہ ہم گھر پر کر لیا کریں گے۔ ہمیں پٹی باندھنی آتی ہے۔ ہم نے زندگی میں سبھی کرنے کے اور نہ کرنے کے کام اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ کر ہی کئے ہیں۔ ڈاکٹر سے بات کریں گے۔ دیکھئے کیا کہتے ہیں۔

(۱۴)

سسٹرز —— خصوصاً وہ عورات کے وقت ڈیوٹی پر ہوتی ہیں ہم سے پہلی نسل کے رشتے سے تو شاید سسٹر کہلا سکیں لیکن ہمارے حساب سے ان کو چچیاں، تائیاں، پھوپھیاں وغیرہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ بہرحال ہیں اپنی اپنی جگہ شفیق —— فائدہ اس عمر کی بیبیوں کو رات کی ڈیوٹی پر رکھنے کا یہ ہے کہ مریضوں کے دلوں میں نارواہلچل پیدا نہیں ہوتی۔ وہ چین کی نیند سوتے ہیں۔ بلکہ از خود جلد از جلد سونے کی کوششیں کرتے ہیں۔ اسپتال والوں کی خواب آور دوائیں بچتی ہیں۔ شرافت اور پاکیزگی کا دور دورہ رہتا ہے۔ ایک پادری صاحب ہفتے کے ہفتے آتے ہیں۔ لوگوں کو گرجا میں بلاتے ہیں۔ گناہوں کے اعتراف

یقین کرتے ہیں۔ ہم نے کہا، ہم بھی اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیتے ہیں؟ کچھ کردہ گناہوں کا۔ لیکن زیادہ ناکردہ گناہوں کی حسرتوں کا۔ ہے تمہارے دین کے متعلق ہے؟ ہم نے کہا نہیں۔ نہ دین کے متعلق۔ بولے کچھ فائدہ نہیں۔ تمہاری بخشش کا ذمہ میں نہیں لے سکتا۔

ہمارے اور ان لوگوں کے دین میں بڑا فرق ہے۔ ان کے ہاں بڑی لوگ اعتراف گناہ کراتے ہیں۔ ہمارے یہاں تھانیدار کرتا ہے۔ ایک فرق یہ سنا ہے کہ پادری کے سامنے برضا و رغبت اعتراف کیا جاتا ہے۔ بیریا مرچوں کی دھونی پر برف کی سل پر پولیس والوں کے محاورے اور روزمرے کچھ ضرورت نہیں پڑتی۔ ہمیں یقین نہیں آتا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(۱۵)

بھانت بھانت کے لوگ اس اسپتال کے عملے میں ہیں۔ نرس ڈاکٹر اکثر زیادہ کمائی کے لالچ میں امریکہ وغیرہ کو سدھار گئے ہیں۔ اکثر یہی کالے پیلے ملکوں کے ڈاکٹر نرسیں اور دوسرے خدام بھی۔ ان ولایات کے بالخصوص کامن ویلتھ کے ملیں گے۔ کئی نرسیں سیلون کی ہیں۔ بعض ہندوستان کی۔ لیکن جنوبی ہندوستان کی۔ ایک سنگاپور کی، افریقہ کی کئی ایک، ایک لڑکی ملائیشیا کی۔ لیکن ہندو نژاد۔ ایک بہت موٹی عورت اسپین کی ماریا۔ لیکن طبیعت کی بہت اچھی، ہر وقت کچھ نہ کچھ گاتی الاپتی ہوئی۔ چربی کی تہیں پگھلائی جائیں تو اندر سے اب بھی خوبصورت نکلے۔ کچھ دارو لوائے بعض ان میں مذکر بھی۔ لیکن ایک شخص داڑھی والا افریقی ہمیشہ خوش باش، ہمیں بھلا لگتا تھا۔ اچھے ہاڑ کاٹھ کا اور موزوں اعضاء۔ سارے کام بڑی خوشی کرتا تھا۔ ایک روز ہم نے پوچھا کہاں کے ہو۔ بولا گھانا کا ہوں۔ ہم نے کہا عیسائی ہو۔ ہمارے اہل کتاب بھائی ہو؟ بولا افسوس صاحب میں عیسائی نہیں ہوں، مسلمان ہوں۔ ہم نے کہا۔ ارے اس میں افسوس کی کیا بات ہے۔ اور تمہارا اسلامی نام کیا ہے؟ بولا۔ میرا اسلامی نام اور غیر اسلامی ملاکر تو بہت لمبا ہو جاتا ہے۔ ویسے علی کہہ لیجئے۔ الحاج علی کہہ لیجئے۔ یوں پورا نام بتاؤں تو دو سطروں میں آئے گا۔ اس میں ولدیت سکونت کے علاوہ جائے پیدائش کا بھی دن شامل رہتا ہے۔ ہمارے اصرار پر اس نے ہمیں اپنا نام یوں لکھوایا۔ اور وہ دو پیچ پیچ دو سطروں میں آیا۔

SOSBOLISR SESESESKO KUKUBEDU
WRSANBAWGA MENSE NENSAHKWAHE
سوگبولیسا سیسی سیکوکو بیدوا زاہنگا منس منساکوا ہی۔ ہم نے کہا الحاج اور علی تو اس میں نہ آئے۔ بولا ہاں! وہ اس کے علاوہ ہیں۔ میں نے اختصار سے کام لیا ہے۔ چائے کے برتن چھوڑ کے آؤں تو نام کا ضمیمہ بھی لکھواؤں۔

(۱۶)

دانتوں میں ہمیں درد نہیں، دانتوں کا تھا۔ اور درد ساورد کہ ہم اصل تکلیف کو بھول گئے۔ اسپتال سے فراغت ابھی دور نظر آتی تھی پس ہم نے درخواست کی کہ دندان ساز کا یہیں انتظام کیا جائے اتنی اسپرین اور درد ربا دوائیں ہم کہاں تک کھائے جائیں آخر اسپتال کے ماہر سے ہماری اپوائنٹ منٹ ہوئی۔ نام تھا مسٹر کافن۔ (MR COFFIN) یعنی جناب تابوت، خاصا نامبارک نام ہے۔ یہاں ڈاکٹر بس ایک حد تک رہتا ہے۔ جب بہت سینیر ہو جائے اور کنسلٹنٹ کہلائے تو مسٹر بن جاتا ہے۔ اب اسے ڈاکٹر کہئے تو پسند نہیں کرتا۔ چنانچہ وہ باکمال سرجن مسٹر غازی (GAZET) بھی جنہوں نے ہمارا پیٹ چاک کیا، مسٹر غازی ہی کہلاتے تھے یا پروفیسر جیسے ہمارے اصل معالج، عالمگیر شہرت کے مالک پروفیسر پکیم مسٹر کافن نے ہمیں خاصی بے توجہی سے دیکھا، اور کہا بس زور زور سے تین بار دن میں برش کیا کرو، اور چھ بار غرارے۔ اب جاؤ پھر بلاؤں گا۔ پھر انہوں نے نہ بلایا۔ معلوم ہوا کہ دو ہفتے بعد کی اپنے اسسٹنٹ کے ساتھ شہر کے اسپتال میں اپوائنٹ منٹ کر دی ہے۔ اور وہ بھی دانتوں کے علاج کے لئے نہیں۔ دانت نکالنے کے لئے۔ ہم بہت مایوس ہوئے کہ ہمارا کلہ تو آج سوجا ہوا ہے۔ اور تاریخ دو ہفتے بعد کی ہے۔ وطن عزیز بہت یاد آیا۔ اول تو ہمارے دوست ایسے ہیں کہ اتوار کو گھر سے بلا لو۔ دل جمعی سے کام کر دیں گے اور کچھ نہیں تو عارضی طور پر دانت میں کوئی دوا بھر دیں گے۔ گولیاں بھی دے دیں گے کہ سکون رہے درد نہ ہو۔ ڈاکٹر کے پاس جانا منظور نہ ہو تو ریڈیو پاکستان کے سامنے بہت سے باکمال فٹ پاتھ پر ڈیرہ ڈالے بیٹھے ہیں۔ ایک ٹوٹی ہوئی مشین جس کا پہیہ جانے گھومتا بھی ہے کہ نہیں۔ ہاتھی کے دانتوں کی طرح کھانے کو کم دکھانے کو زیادہ، چند زنگ آلود زنبورے بہت سے دانت جو جانے خود لگائے ہیں کہ قبرستان سے اکٹھے کئے ہیں۔ کچھ لال گلابی جبڑے جانے

اصلی یا مصنوعی اور حقِ خدمت فقط پانچ روپے۔ حیران ڈاکٹر صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ انہوں نے انجکشن لگایا۔ درّزاں پیشتر کہ بانگ برآید، ہمارے تین دانت نکال کر ڈھیر کر دیئے۔ ہم نے کہا۔ یا حضرت یہ کیا۔ ہم تو مرمت کے لئے آئے تھے نکالنا تھا تو فقط ایک نکالتے جس میں تکلیف ہے۔ فرمایا تکلیف تو بے شک ایک ہی میں ہے۔ لیکن باقی میں بھی زودیا بدیر درد شروع ہوتی۔ پھر ایک کے لئے سُن کرنے کا انجکشن الگ سے لگانا پڑتا۔ اب ایک ہی انجکشن سے سارا کام ہو گیا بلکہ اگلے ہفتہ کو آؤ تین اور نکالوں گا ہم نے ان سے جان کی امان مانگی اور ایک پاکستانی ڈاکٹر تلاش کیا۔ اس نے بائیس پاؤنڈ تو لیئے لیکن بڑی مہربانی اور دلسوزی سے دیکھا اور دوا لگائی اور افسوس کیا کہ انگریز ظالم نے ناحق اتنے شاندار سے دانت نکال دیئے اس کی چارہ سازی کی بدولت اب باقی ماندہ دانت بھلے چنگے کام کرتے ہیں۔ یہاں کے لوگوں کو اصلی دانتوں سے اتنی ضد ہے کہ بعض اوقات شوقیہ بھی اصلی جبڑا نکلوا کر نقلی لگوا لیتے ہیں۔ حالانکہ سونے کے بھاؤ لگتا ہے۔ بلکہ اس سے بھی مہنگا ہے۔ ہمارے ڈاکٹر اچھے کہ چاہو تو نقلی دانت اکھڑوا کر اصلی لگوالو۔

(۱۷)

ہم اپنے بستر پر آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہیں۔ تو ہمارا پڑوسی فرینک ہمیں بہت غور سے دیکھتا ہے۔ اسے تعجب ہے کہ ہم کیسے بیٹھ لیتے ہیں اور گھنٹوں بیٹھے رہتے ہیں۔ وہ اسے یوگا کا کوئی آسن سمجھا۔ اس نے ایسے بیٹھنے کی بہت کوشش کی لیکن نہ کر سکا پسینے چھوٹ گئے۔ بولا بڑے جان جوکھوں کا کام ہے جی، ہم نے اسے بتایا کہ ہمارے ہاں تو بیٹھتے ہی ایسے ہیں کھانا کھانے کے لئے، گپ کرنے کے لئے۔ شاعروں کا مشاعرہ اور لیڈروں کی تقریریں سننے کے لئے، میلاد شریف کے لئے، جوا اور تاش کھیلنے کے لئے، گیان دھیان کے لئے، اور لوگوں کی چغلیاں کرنے کے لئے حتیٰ کہ پنڈت گوا آنجہانی کی تالیفات میں بھی اس کی تصویریں ہیں۔ بہت حیران ہوا۔

(۱۸)

شیخ سعدیؒ ایکبار معتکف تھے۔ جامع دمشق کے صحن میں حضرت یحیٰ علیہ السلام کے مزار پر، دل خستہ اور ملول کہ ان کے پاؤں میں جوتا نہیں تھا۔ اتنے میں ایک شخص مسجد میں داخل ہوا، اس کے پاؤں ہی نہیں تھے۔ گھسٹتا آ رہا تھا۔ فرماتے ہیں شیخ سعدیؒ کہ میں نے فوراً درگاہِ رب العزت میں سجدۂ شکر کیا کہ میرے پاؤں تو ہیں۔

ہمیں اپنی بیماری خاصی سنگین معلوم ہوتی تھی۔ ہے بھی، اور بے شک ہمیں پچھلے ایک سال اسپتالوں، آپریشنوں، ریڈیو تھراپی اور دوسرے علاجوں کے سلسلوں سے گزرنا پڑا۔ جو خاصا تکلیف دہ عمل ہے۔ لیکن اسپتال میں اکثر سجدۂ شکر کا موقعہ آیا کہ خدا کا ہم پر کتنا کرم ہے۔ پاس کے بستر پر مسٹر پائمن تھے۔ اچھے خوش باش۔ معلوم ہوا ان کے وہ حصۂ جسم ہی نہیں جس سے رفع حاجت کا کام لیا جاتا ہے۔ ایک پلاسٹک کی نالی سے کام لیتے ہیں۔ یوں نیچے گدی باندھ کر اوپر سے تپلون کس لیتے ہیں۔ تو خاصے سمارٹ معلوم ہوتے ہیں۔ مسٹر جان تھے۔ ان کی ٹانگ کینسر زدہ تھی۔ پوری ٹانگ پر جسم کے دوسرے حصوں کی جلد کے پیوند لگے تھے۔ سامنے والے مسٹر ابرک تیسری بار اسپتال میں داخل ہوئے۔ ان کے زیریں حصے سے خون ہی نہیں رکتا، ابھی پاجامہ بدلا، ابھی پھر آلودہ ہوا، ہر دم تولیہ باندھے باتھ روم آتے جاتے رہتے ہیں ان کا PROSTRATE GLAND کا آپریشن ہوا ہے۔ ساتھ والے پلنگ پر مسٹر فرینک ہیں۔ سارا وقت کتابیں پڑھتے رہتے ہیں۔ لیکن جاسوسی ناول، ان کے دماغ کے اعصابی نظام میں پھوڑا ہے۔ اور کینسر کا پھوڑا جس کا آپریشن ہونا ہے۔ آج یک لخت ان پر تشنج طاری ہوا، اور وہ تڑپنے لگے۔ ساتھ کے کمرے میں کوئی سیاہ فام مریض ہے رات بھر روتا کراہتا ہے۔ ماں کو یاد کرتا ہے۔ حتیٰ کہ لواحقین اس کا علاج پورا ہوئے بغیر اسے گھر اٹھا لے گئے۔

(۱۹)

ایرک اسپتال سے رخصت ہوتے ہوئے نوان کے بستر پر کسی ملکے کے پاس آئے۔ ان کے دفتر کے ماتحت اگلے روز ان کے لئے پھولوں کے گلدستے بلکہ ٹوکریاں لائے۔ ان کے جانے کے بعد صاحب مذکور نے آبدیدہ ہو کر فرمایا کہ میں اپنے دفتر میں خاصا سخت گیر مشہور ہوں۔ پھر بھی دیکھو لوگ کس خلوص

سے گلدستے لاتے ہیں۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ لوگوں کو مجھ سے اتنی محبت ہے۔ ان کو تیسرے ہی روز چھٹی مل گئی۔ چوتھے دن ان کے دفتر کا ایک آدمی بڑے شوق سے گلدستے لے کر آیا اس کو سخت مایوسی ہوئی کہ صاحب اچھے ہو کر چلے بھی گئے۔ منہ لٹکا کر کہنے لگا۔ اس کا مطلب ہوا کہ دو ایک روز میں پھر دفتر آنے لگیں گے۔ یا قسمت، یا نصیب۔

(۲۰)

اس کمرے میں جس میں ہم ہیں ٹیلی ویژن بھی ہے۔ آج یہاں ایک پروگرام دکھایا جا رہا ہے۔ "دی سیل آف دی سنچری" یہ ہمارے یہاں کے پروگرام "نیلام گھر" کی نقل ہے۔ لیکن ظالموں نے کہیں اعتراف نہیں کیا۔ اس میں بھی سوال و جواب ہوتے ہیں۔ اور انعام دیئے جاتے ہیں۔ تاہم اصل اصل ہے اور نقل نقل ہے۔ اس میں پروگرام پیش کرنے والا، ہمارے دوست طارق عزیز کی طرح جابجا اشعار آبدار نہیں پڑھتا۔ ساری گفتگو نثر میں کرتا ہے۔ اس میں فلمی ستاروں کی ریل پیل بھی نہیں۔ اگر کوئی آتا بھی ہے تو اپنی پوری اولاد کو ساتھ لے کر نہیں آتا اور لدا لدایا نہیں جاتا۔ ایک بات البتہ ہے جو سامان انعام میں دیا جاتا ہے اور بعض اوقات اس میں پورے گھر کا فرنیچر ہوتا ہے۔ مددگار لڑکیاں لباس نیم لباسی میں لہراتی ہوئی بڑے ناز کے ساتھ مسکراتی اس پر متمکن ہوتی ہیں۔ پر معلوم نہیں انعام پانے والے ریڈ حالاتے ہیں تو ان کو بھی ڈھو کر ساتھ لے جاتے ہیں۔ یا وہیں چھوڑ جاتے ہیں۔ ہم ہوں تو فرنیچر وہیں چھوڑ جائیں اور ...... خیر بیماری میں ایسے فاسد خیالات زبان پہ قلم پہ نہ لانے چاہئیں تندرست ہونے کا انتظار کرنا چاہیئے۔

(۲۱)

ہم جب کبھی ایکسرے کے لئے جاتے ہیں ـــ اور ہمارے اب تک کئی سو ایکسرے ہو چکے ہیں، تو کپڑے اتارنے کی کوٹھری میں ایک نوٹس لگا پاتے ہیں کہ اگر کوئی مریض امید سے ہو تو ڈاکٹر کو پہلے سے بتا دے۔ یوں تو دنیا بہ امید قائم اور ہماری تو ساری زندگی امید ہی امید میں گزری ہے۔ لیکن کبھی ہمیں ڈاکٹر کو بتانے کا حوصلہ نہ ہوا جس کی وجہ ہماری مشرقی حیا ہے۔ بات یہ ہے کہ ایکسرے کرنے والی ہمیشہ کوئی خاتون ہی ہوتی تھی۔ ایک روز ایسی تھیں کہ ذرا بڑی عمر کی تھیں اور ہم نے جھجکتے جھجکتے ان کے سامنے اعتراف کر ہی لیا۔ بہت ہنسیں۔ جانے کیوں؟

(۲۲)

ابھی ابھی وہ سسٹر تشریف لائیں جو شعبہ کی انچارج ہیں۔ بولیں آپ کون سی زبان بولتے ہیں؟ خوشی ہوئی کہ کسی کو تو ہماری زبان سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ زبان سے ہوئی ہے تو ہمارے ملک سے اور ہمارے کلچر سے ہوگی۔ اور ہو سکتا ہے ہوتے ہوتے ہم سے بھی ہو جائے۔ بس ہم نے کہا اسے اردو کہتے ہیں اور سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے۔ اور اس کا تعلق زبانوں کے انڈو ایرین قبیلے سے ہے۔ یہ اپبھرنش اور کھڑی بولی سے نکلی ہے ـــ جب مسلمان ہندوستان میں آئے ـــ لیکن ٹھہریئے کرسی پر بیٹھئے میں قاسم سے بات شروع کرتا ہوں۔ کہ ہماری ہر بات وہیں سے شروع ہوتی ہے۔ بے صبری سے کہنے لگیں "اور کون سی زبان جانتے ہیں آپ؟" ہم نے کہا تھوڑی سی انگریزی۔ نمونہ کلام اس کا آپ اس وقت بھی دیکھ رہی ہیں:"

"بولیں" بات یہ ہے کہ ایک مریض ہے جو ترکی بولتا ہے اور ترکی بولنے والا کوئی ہمیں ملتا نہیں:"

ہم ترکی میں بند نہیں۔ ہم استنبول میں ہوٹل کے بوائے سے کہتے تھے: "اکی شیشہ سوک شو" اور وہ دو گلاس ٹھنڈا پانی لا دیتا تھا۔ اب اس ترکی مریض کی طرف سے عین ممکن یہی فرمائش ہو تو اسے دو گلاس ٹھنڈا پانی فراہم کرنے یا فراہم کرانے کا ذمہ ہم لے سکتے تھے لیکن اس سے آگے کی کوئی تکلیف ہوتی تو ہم خود لسانی تکلیف میں مبتلا ہو جاتے لہٰذا ہم نے آر سی ڈی اور اسلام کے محکم رشتوں کے باوجود اپنی خدمات پیش کرنا مناسب نہ سمجھا بہانہ کر دیا کہ ہمیں یہ زبان نہیں آتی۔

(۲۳)

"فنون" میں ہماری نظم "اب عمر کی نقدی ختم ہوئی" پڑھ کر بہت سے ہمارے دوست اور ہمدرد اور محبت کرنے والے آزردہ ہوئے اور ہمیں خط لکھے۔ اسے اتنی اہمیت نہ دینی چاہیئے۔ ہم نے

آگے صفحہ ۴۴ پر

بچت کے لیے زیادہ سے زیادہ لوگ
قومی ترقیاتی بانڈ
خریدنا پسند کرتے ہیں

وجہ یہ ہے کہ یہ ایک سرمایہ کاری کی ضمانت ہے، سب سے بہتر۔ اپنی جمع شدہ پونجی پر یک مشت آمدنی ——— پنشن، گریجویٹی، بیمہ سے ملنے والی رقم، بقیہ جات اور بحران میں ملنے والی رقمیں وغیرہ کو نفع بخش طور پر لگانے کا یہی سب سے بڑھیا طریقہ ہے۔

سہل کارروائی ——— پرکشش منافع ——— 13 فیصد سالانہ سود (مفرد)۔ دیگر سہولتیں اس اسکیم کو اور بھی زیادہ پرکشش بناتی ہیں۔ اس میں روپیہ لگانے والے پھولتے پھلتے ہیں۔ یقیناً آپ بھی ان میں سے ایک ہیں!

100 روپے
پانچ سال میں بڑھ کر
165 روپے
ہو جاتے ہیں

بانڈ کون خرید سکتا ہے؟
ملکی ——— مرد، عورت، طالب علم، ملازمت یا پنشن لینے والا کسان، اپنا کام دھندا کرنے والا، عمر چاہے کتنی بھی ہو اور وہ کوئی بھی کام کرتا ہو۔

کس قدر؟
جتنی مالیت کے اور جتنے بھی چاہیں، بالائی حد مقرر نہیں۔ بانڈ تین قسم کے ہیں: دس دس روپے کے، سو سو روپے کے اور پانچ پانچ سو روپے کے۔

اپنے روپے کو
تیزی سے بڑھائیے
قومی ترقیاتی بانڈ خریدیئے

کہاں سے خریدیں؟
ملک بھر میں کسی بھی ڈاک گھر یا ... سے ... آپ کے پاس ہی ہے۔

کیسے خریدیں؟
[illegible]

ٹیکس کی چھوٹ
3,000 روپے ... [illegible] ... انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ... [illegible] ... ویلتھ ٹیکس سے مکمل چھوٹ مل جاتی ہے۔

دیگر سہولتیں
... ڈاک گھر ... منتقل کیا جا سکتا ہے۔

قومی بچت ادارہ
پوسٹ بکس نمبر 96، ناگپور 440001

(قسط اوّل)

اِصلاح کاریِ ادب

حضرت داغ دہلوی مرحوم کے چند اصلاحی نمونے

(حاجی نعمت اللہ۔ نعمت اُردو اعلےٰ قابلیت الہ آباد یونیورسٹی جلال آباد ضلع مظفر نگر)

اصلاح اور اُس کی ضرورت

"اِصلاح" ایک بہت ہی وسیع المفہوم لفظ ہے لیکن یہاں اس سے ہمارا مقصد صرف وہ "ادبی ترمیم و تنسیخ" ہے۔ جس سے انشاپردازی سنورتی اور ادیب صحیح معنی میں ادیب کہلانے کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ اور چونکہ اصلاح بغیر انسان کا اپنی اور دوسروں کی کوتاہیوں پر مطلع ہونا اور ان کا رفع کرنا محال ہی نہیں بلکہ مشکل ترین امر ہے۔ اس لئے اس کی ضرورت ہر ایک نقاد کے لئے ضروری اُمر ہے۔

اصلاح کاری

"ادبی اصلاح کاری" دیکھنے میں خواہ کتنا ہی آسان اور معمولی کام ہو لیکن ہے درحقیقت یہ بہت ہی اہم، دشوار اور بہت بڑی ذمہ داری کا کام۔ "اصلاح نظم و نثر" کا کام صرف اسی پر ختم نہیں ہوجاتا کہ اساتذہ کرام سُرخ روشنائی لے کر بیٹھیں اور "املائی غلطیاں" درست کر دیں۔ یا کلماتِ ربط" وغیرہ جو تلامذہ نے جلدی میں سہواً گھٹا بڑھا دیئے تھے ٹھیک کر دئے۔ یا کہیں کہیں سے عبارت کو قلم زد کر دیا۔ یا بیشتر حصۂ مضمون خود اپنے ہی قلم سے بطور اصلاح لکھ دیا نہیں اور ہرگز نہیں !!

اصلاح کار کا فرض ہے کہ وہ تلامذہ کی تحریروں کو ازابتدا تا انتہا لفظ بہ لفظ بڑے غور و خوض کے ساتھ پڑھے۔ اور سمجھے کہ آیا جو تخیلات ادا کئے گئے ہیں وہ تخیلات رکیک و نامناسب تو نہیں؟ ترتیب بھی معقول ہے یا نہیں۔ الفاظ کی ترکیب و نشست بھی خوب ہے یا نہیں۔ جو لفظ جہاں استعمال کیا گیا ہے وہاں کے لئے بھی وہ موزوں ہے یا نہیں۔ اور زبان، روزمرہ اور محاورہ اہلِ زبان کے موافق ہے کہ نہیں۔ کہاں ردّ و بدل اور کہاں ترقی کی گنجائش ہے؟ اس کے بعد جہاں کے لئے جو کچھ موزوں ہو، وہ عمل میں لائے۔ اور اگر حواشی پر وجوہِ اصلاح کے متعلق مختصر اشارات اور حوالۂ قلم کرتا جائے تو کیا کہنا ہے ورنہ خیر۔

اہلیتِ اصلاح

اِصلاحِ ادب کا کام ہر کس و ناکس انجام نہیں دے سکتا بلکہ اس کی اہلیت اُس شخص میں ہوتی ہے جس نے مختلف علوم و فنون کی کتابوں کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہو۔ ہر قسم کی صحبتوں سے فائدہ اُٹھایا ہو۔ اور اہلِ علم میں کافی زمانہ گذارا ہو جو زبان، محاورہ، قواعد، معانی و کلام، عروض و قافیہ، اور رنگا رنگ اسالیبِ بیان کا ماہر ہو جس کی فکر رسا، قوتِ متخیلہ بلند اور جس کا ذہن تیز اور دماغ اعلیٰ رکھتا ہو۔ جو نفسیات واردات و رسومات کا نباض ہو۔ اور جس شعبۂ ادب کی اصلاح کا کام اپنے ذمہ لے اُس کے پورے ماحول سے کما حقہٗ واقفیت رکھتا ہو۔ اور جو مصوّر کا قلم نیچے کا رکی سی نظر مطرب کے سے کانوں کا حامل ہو۔ تاکہ تناسب و توازنِ الفاظ کے رنگ ان کی سُبکی و گرانی کے ڈھنگ اور محلِ وقوع کی اور معانی کے ساتھ اُن کی چسپیدگی و خوش آہنگی کا بخوبی اندازہ کر سکے حضرت اکبر الہ آبادی مرحوم نے کیا خوب فرمایا ہے۔

اُسی صورت میں دلکش، خوبیٔ الفاظ ہوتی ہے
کہ حُسنِ یار کا جلوہ کرے پیدا معانی میں

ادبیاتِ اُردو اور دستورِ اصلاح

دوسری زبانوں اور اُن کے "دستورِ اصلاح" سے قطع نظر کر کے جب ہم اپنی ملکی زبانِ عام- "اُردو" کی ادبیات کے آئینِ اصلاح پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ قدیم

میں ہمارے ... ہماری زبان کی "نثر" کی اصلاح کا ادبی طور پر کبھی کوئی خاص اہتمام نہیں ہوا۔ البتہ نظم کی جانب لوگوں کی توجہ بہت کچھ منعطف رہی ہے۔ اور غالباً اس کی وجہ نظم کی جاذبیت، دلچسپی اور قبولیت عام ہے۔ اور یہ بھی ہے کہ

خوش است نثر، ولے شان نظم افزوں است
اگرچہ ... مصحف، کلام موزوں است

ہماری ادبیات منظومہ کی اصلاح کے لئے بھی کوئی باقاعدہ اسکول نہ تھا۔ اساتذۂ قدیم اور ان کی مجلسیں گویا ادارۂ تعلیم واصلاح ہوا کرتی تھیں۔ اور اب بھی ہماری "ادبی دنیا" اسی رواج کی پابند ہے۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ باقاعدہ درس گاہوں کے قیام نے "نثر" کے ساتھ وہ پہلی سی عدم توجہی دبے جس باقی نہیں رکھی ہے۔ تاہم اب بھی کہ تہذیب نثر وترقی نثر جو اہمیت اس معاملہ میں "نظم کو حاصل ہے وہ نثر کو میسر نہیں"

اساتذہ ماضی وحال

اساتذہ قدیم اپنی حالت سے اپنے تلامذہ پر کیفیت، ادبیت وانشا پردازی پیدا کر کے انہیں بذاتہ مجبور فکر کر کے ان نتائج افکار کی اصلاح کرتے اور مدت العمر میں کبھی کچھ بخشی حوصلہ افزائی کے لئے یا بطور تبرک اپنی تصنیف سے بھی کچھ عنایت کر دیا کرتے تھے اور اس طرح خود اس کی مساعی کی بدولت شاگرد کو استادی کے حقیقی مرتبہ تک پہنچا دیتے تھے۔ بخلاف اس کے آج کل کے بہت سے فریضۂ استادی، اپنے نام نہاد تلامذہ کو غزلیں کی غزلیں، نظمیں کی نظمیں اور نثریں کی نثریں کہ جو ان کے منہ پر پھبتی بھی نہیں ... خود ہی لکھ کر دے دیتے ... اور ان کے صحیح جذبات شاگردی تک کو ادر فنا کر دیتے۔ گو ایسے تلامذہ سندی امتحانات میں کامیاب ہوتے۔ تمغہ حاصل کرتے اور لائق داد وتحسین ٹھہرتے۔ مگر جب ذاتی قابلیت کی نمائش کا موقع آجاتا اور باہم مقابلہ ٹھہرتا تو ان کی قابلیت کا چور اسے بے پردہ ہو جاتا، اور وہ "سکھائے پوت" کا زندہ مجسمہ بن کر رہ جاتے۔

نمائش واشاعت اصلاحات

ہمارے ملک میں "نمائش اصلاحات ادبیہ" کا کوئی باقاعدہ رواج نہیں۔ اس کے برعکس ترقی یافتہ ممالک میں مدارس کی اصلاحی کاپیاں اور اساتذہ وقدما کے کئے ہوئے مسودات وہاں کی علمی نمائشوں میں بڑی بڑی عزت وتوقیر کے ساتھ رکھے جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں جبکہ "فن اصلاح ادبیات" کی تدوین نہ ہوئی ہو۔ اصلاح کاری سکھانے کی اس کے سوا اور کوئی تدبیر بھی نہیں۔ کیا اچھا ہو کہ ہمارا ملک بھی اس طرف متوجہ ہو جائے۔ اور ہمارے یہاں کی علمی نمائشوں میں اس مفید شعبہ کا افتتاح اور کر دیا جائے۔

ہم اوپر کہیں بیان کر آئے ہیں کہ ہمارے ملک میں "اصلاح نظم" کا رواج بہت رہا ہے۔ اور اگر تلاش کیا جائے تو گو۔ ع ورق ورق ہر سوئے برد باد

تاہم فتنۂ غدر ۱۸۵۷ء کی چیرہ دستیوں سے بچا ہوا اس قسم کا ایک زبردست ذخیرہ موجود ہے۔ جو اصول تربیت ذکی وتربیت پذیری ادبیات پر بہت کچھ روشنی ڈال سکتا ہے اگر یہ تمام سرمایہ تلاش کر کے شائع کر دیا جائے تو نہ صرف طریق اصلاح کا خضر راہ ثابت ہو بلکہ "فن تنقید ادب" کے لئے بھی جو ہمارے ملک اور ہماری زبان میں بالکل ابتدائی حالت میں ہے۔ بڑی کشادہ شاہراہیں کھل جائیں۔ اور جب تک حضرت صفدر مرزا پوری کی طرح کوئی صاحب علم وذوق "مشاطۂ سخن[1]" جیسی مظہر اصلاحات کتاب اور شائع ... رسائل واخبارات ہی میں اس سلسلہ کو جاری کرنا چاہیئے

میری نظر سے "اصلاح الاصلاح[2]" کے نام سے حضرت ابر احسنی کا مصنفہ ایک ٹریکٹ نظر سے کہ جو ایک سو بائیس صفحات پر پھیلا ہوا گزرا۔ مرحوم استاد نے مختلف شعراء حضرات کے کلام پر وہ بے نظیر تنقیدی مقالہ شائع کیا ہے کہ جس کی مثال ملنا بہت مشکل ہے۔ گویا یہ کہیئے کہ دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے۔

---

[1] "مشاطۂ سخن" میں حضرت صفدر مرزا پوری مرحوم نے اساتذہ کی اصلاحیں جمع کی ہیں نہ صرف اردو بلکہ بہت سی زندہ اور مہذب زبانوں میں یہ کتاب آپ اپنی مثال ہے۔ مگر ضروریات ملک اور سرمایہ اصلاح کی یہ بہتات موجود گی کو دیکھتے ہوئے اس کا عدم وجود برابر ہے۔ [2] "اصلاح الاصلاح" ابر احسنی کی یادگار صفحہ ۲۹ پر

خوش قسمتی سے ہمیں شرگیا شی "حضرت مائل مین پوری" کا وہ کلام مرحوم نعمت اللہ خاں صاحب جلال آبادی کہ جو ریاست حیدرآباد میں آستانۂ آصفیہ میں اونچے عہدہ دار تھے نظر نواز ہوا کہ جس پر اُستادِ زمانہ فصیح الملک، نواب مرزا، داغ "دہلوی مرحوم کی اصلاحات کا اصلی و قلمی مجموعہ ہاتھ آگیا۔ جسے حضرت "مائل" صاحب نے بطور تبرک جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ آج ہم اسی مجموعہ میں سے چند اصلاحات اصلی کلام مائل اور اپنے توضیحی اشارات کے ساتھ پیش کرتے ہوئے خوشی محسوس کرتے ہیں۔

ورناکیولر اسکولس کے نو تعلیم یافتہ اساتذہ زبان اُردو طلباء مڈل کلاس اور امیدواران اُردو واعلیٰ قابلیت وادیب ماہر وغیرہ کو چاہیئے کہ وہ اس مضمون اور ان اصلاحات کو غور سے دیکھیں کہ یہ تنقید کے پرچے اور تنقیدی سوالات کے حل کرانے اور کرانے میں خاص معاونت کرے گا۔ اس سے پہلے کہ ہم ان اصلاحات کو پیش کریں۔ ہم "مائل" صاحب کی مختصر سوانح حیات، داغ اسکول کی خصوصیات اور حضرت "داغ" کے آئین وطرز اصلاح پر روشنی ڈالیں۔

حضرت مائل مین پوری

آپ کا نام نامی دیبی پرشاد ہے پہلے آپ "عاصی" تخلص کرتے تھے مگر پھر بعد میں نواب فصیح الملک بہادر مرحوم کے ارشاد پر (مرحوم کا عطیہ) "مائل" تخلص اختیار کیا۔ جانکی پرشاد کے خلف الرشید "مین پوری" کے باشندے قدیم اور نجیب الطرفین سکسینہ کایستھ تھے۔ مکتبوں اور تحصیلی مدرسہ میں علوم رسمی کی تحصیل کی، مدت العُمر کوئی ملازمت نہ کی اور آبائی زمینداری کی آمدنی میں قناعت کے ساتھ فارغبالی سے زندگی بسر کرتے رہے۔ آپ نے ۱۹۳۱ء میں انتقال فرمایا۔

حضرت مائل صاحب بہت خوش اخلاق، خوش قلم، خوش مذاق انسان اور پرانی محبتوں اور بزرگانِ قدیم کے خلوص ومحبت کی زندہ یادگار تھے۔ آپ کو اوائل عمری سے شعروشاعری کا چسکا پڑ گیا تھا۔ اور اس سنگلاخ کوچہ میں قدم رکھتے ہی آپ کو اپنی اصلاح وتربیت کی فکر دامن گیر ہوئی اسی صلاحیت نے آگے چل کر آپ کو بارگاہ فصیح البیان، فصیح الملک حضرت داغ مرحوم تک پہونچا دیا۔ اور آپ ۱۸۹۲ء سے ۱۹۰۵ء تک مکمل تیرہ سال نواب مرحوم کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو کر مرحوم سے استفادہ اٹھاتے رہے۔ حضرت مائل صاحب کے کلام میں داغ اسکول کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ جیساکہ خود ان کے اشعار سے ظاہر ہے۔

آپ کا آنا ہے گھر آج کیونکر ہوگیا + کیا مقدر غیر کا میرا مقدر ہوگیا
کل کا چٹ لیا حضرتِ واعظ نے مرا سغر + میری توبہ ان قبلۂ حاجات سے توبہ
کہے خاک کوئی بھروسا تمہارا + قیامت کا وعدہ ہے وعدہ تمہارا
آپ ہے کس کے گلے کا ہاتھ دست ناز میں + تم تو کہتے تھے عدو دام میں آسکتے نہیں
ذرا دم لے لو ماتھے پہ باتیں لو + کہا جاتے ہو آتے ہو کہاں سے

مگر انتقال سے دس بارہ سال قبل حضرت جگر مرادآبادی کی آمد نے اُن کے طرز کلام پر ایک خاص اثر ڈالا۔ اور ان کے کلام کی مقبولیت نے مائل کو جگر کے رنگ میں رنگ جانے پر مجبور کیا اور انہوں نے بھی متصوفانہ، فلسفیانہ، پُر مغز اور جدید طرز سخن گوئی کی مثلاً آپ فرماتے ہیں ؎

میرے گناہ چھپے تھے مری رعونت میں
بڑی تلاش سے پکڑے گئے قیامت میں

جو محو ہو کے رہیں ہم تری حقیقت میں
تو ایک اور لطافت ملے لطافت میں

وہ صاحب دیوان ہیں۔ ان کا مطبوعہ دیوان عام طور پر پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ مقدس "بھگوت گیتا" اور راماین کا منظوم ترجمہ اور ان سے یادگار ہے۔ یہ دونوں کتابیں طبع ہو کر مقبول ہوئیں۔

فصیح الملک نواب مرزا داغ دہلوی مرحوم اور اصلاح

نواب فصیح الملک بہادر جیسی مشہور محسن اردو اور اس کی کوئی تراجع

حاشیہ صفحہ ۳۸ کا:- کتاب اُستاد مرحوم نے ضروریات زمانہ کو دیکھتے ہوئے ترتیب دی لیکن یہ شاہراہ ابھی اور تشنۂ تکمیل ہے کہ جس کو کئی زمانہ اساتذہ کرام کی سرپرستی کی ضرورت ہے۔

(الانف) موجود نہ ہو۔ یہ ملک کی بدنصیبی، ناقدری، احسان فراموشی نہیں تو اور کیا ہے؟ اور ایسی صورت میں اگر کوئی آدمی مرحوم کے طرزِ اصلاح پر روشنی ڈالنے تو کیسے۔ مجبوراً میں نے اپنے شفیق بزرگ نواب نثار یار جنگ بہادر کلکٹر پربھنی (حیدرآباد دکن) کو جو نواب مرحوم مذکور کے تلامذہ میں ایک خوش فکر و صاحبِ علم بزرگ ہیں۔ اور مدتوں مرحوم کی مجلسِ اصلاح کو بچشمِ خود خود مطالعہ کر چکے ہیں۔ موصوف سے مرحوم کے طریق اصلاح کے متعلق معلوم کیا نواب نثار یار جنگ بہادر نے گو بہت اختصار سے آپ نے کام لیا لیکن پھر بھی میری بہت امداد فرمائی موصوف کی قیمتی رائے اور مائل صاحب کے سرمایہ اصلاحات سے جو کچھ میں نے اپنی عقل و خرد کے مطابق اخذ کیا ہے پیشِ خدمت ہے۔

حضرت داغ کا طریق اصلاح

یوں تو آپ کے یہاں اصلاح کا کام موقع بے موقع اکثر ہوتا رہتا۔ مگر بعد مغرب وقت مقرر تھا کہ اُس وقت ضرور ہوتا۔ آپ اپنے قلم سے کم اصلاح دیتے تلامذہ میں سے (جن میں حضرت احسن مارہروی بہت نمایاں ہیں) اور مدتوں اس کام کو انجام دیتے رہے۔ کوئی صاحبِ غزل قرات کرتے اور حضرت اُستاد بے تکان اصلاح دیتے جاتے اور قاری عموماً سُرخ روشنائی سے غزل بناتا جاتا۔

بلا کسی مجبوری کے پورا مصرع یا مکمل شعر کبھی تبدیل نہ فرماتے بلکہ تلامذہ ہی کے الفاظ کو اُلٹ پلٹ کر شعر بنانے تھے۔ دَوران اصلاح مرحوم کا مطمح نظر تھا۔ روزمرہ کی پابندی محاورہ کی صحت[1] کلام کی سلاست، صفائی، روانی، الفاظ کی خوش آہنگی، فصاحت، سہل ممتنع، شوخیٔ مضمون، قدرت بیان، چُستی بندش، رندی، معاملہ بندی، طعن و تشنیع، رشک، چھیڑ چھاڑ، آئین و ادب، عشق کو بالا ئے طاق رکھ کر معشوق سے بے جھجک گفتگو، تیکھا پن، تیور اور ایسے محاسن کا مجموعہ اُن کے اسکول کا نمونۂ امتیاز اور ان کی تقلید کی سندِ تکمیل ہے۔ اس کے خلاف جو کچھ پاتے اپنے قلم معجز رقم سے بے تکلف صاف کرتے چلے جاتے، مرحوم کی بنائی ہوئی غزلیں بہمہ وجوہ مکمل ہیں، جانِ فصاحت کا قلم وہاں کمال دکھاتا ہے جہاں اپنے رشحات سے شاگرد کی آورد کو آمد کے رنگ میں رنگتا ہے۔

دادِ کلام تلامذہ

مرحوم ہمشہ مرحم اُستاد نہ تھے شعر، شعر ہوتا یا واردات و کیفیاتِ طاریہ کا آئینہ تو اس پر آپ (ص) بنا دیتے یا صریحاً اس کی تعریف و توصیف تحریر فرما دیتے، جیسا کہ اپنی اہلیہ کے انتقال کے بعد مائل صاحب کی دو غزلوں کے ایک ایک شعر نے مرحوم کے دلِ دردمند پر تیر و نشتر کا کام کیا تو اُن پر (ص) بنا دیا۔ یہ دونوں شعر یہ ہیں۔

آتی نہیں ہے موت شبِ غم میں کیا کریں
تنگ آ رہے ہیں قفس اور قضا سے ہم

دَم نکل جاتا تو بہتر تھا غمِ ہجراں میں
تو نے زندہ مجھے کیوں اے شبِ غم! چھوڑ دیا؟

یا　－　ایک غزل کے متعلق لکھا گیا۔

"حضرت اُستاد مدظلہٗ فرماتے ہیں"

یہ غزل تم نے بہت اچھی کہی ہے اور مطلع بھی بہت اچھا ہے۔

خود تلامذہ سے طبیعت پر زور دے کر کہلوانا

اگر شعر اچھا نہ ہوتا اور اپنی اصلاح کی خاص ضرورت محسوس نہ فرماتے تو تلامذہ کو تاکید فرماتے کہ خود اپنی طبیعت پر زور دے کر درست کر دو یا دوسرا شعر کہو۔ مثلاً مائل صاحب کے اس مقطع کے متعلق تحریر فرمایا، "مقطع بُرا ہے دوسرا کہو"

---

[1] ملک کے مشہور شاعر حضرت جگر مرادآبادی ایک مرتبہ بمبئی پوری میں مقیم تھے اُن سے اصلاح کاری داغ کے ضمن میں گفتگو آ گئی کیونکہ وہ خود بھی مرحوم سے اصلاح لیتے تھے۔ انھوں نے فرمایا کہ داغ صاحب کا پہلا اور مقدم اصول یہ تھا کہ "جو بولو سو لکھو"، ان کی رائے تھی کہ اگر کوئی غلط محاورہ کسی مفہوم کو اس عمدگی کے ساتھ ادا کر دے کہ صحیح نہ ہو سکے تو غلط سے کام لینا چاہیئے۔ پھر آپ نے ایک واقعہ نقل کیا کہ حضرت امیر کے تلامذہ میں سے کسی صاحب نے ایک محاورہ کے متعلق مرزا صاحب سے دریافت کیا جواب دیا گو یہ محاورہ میں نے کبھی نہیں سُنا مگر چونکہ اس مفہوم کو بحسن و خوبی تمام ادا کرتا ہے لہذا ہونا چاہیئے، اور رواج پانا چاہیئے۔

وہ مقطع یہ ہے ؎

جلد دیکھیں کہیں دل آپ کا الجھا نہ ہو مائل
سُنا ہے آج شانہ اپنی زلفوں میں وہ کرتے ہیں

عطیہ اشعار

اس معاملہ میں مرحوم بے حد محتاط تھے اور تلامذہ کو بھاڑے کا ٹٹو نہیں بنانا چاہتے تھے ورنہ مناسب سمجھا کسی نے کبھی بہت زیادہ خوشامد کی تو مشکل ایک آدھ شعر عنایت کر دیا۔ وہ یہ نہیں، مائل صاحب کی ان غزلوں میں جب کہ انہوں نے اکثر بہت خوشامد کی ہے دو شعر اپنی تصنیف سے عنایت کئے ہیں۔ اور اس سے اُن کی خصلت پر پوری پوری روشنی پڑتی ہے۔

تلامذہ کے خطوط کے جوابات

ہر غزل کے ساتھ تلامذہ خطوط بھی لکھتے تھے۔ مگر جواب ہمیشہ نہیں دیا جاتا تھا، کبھی کسی حادثہ کی اطلاع، کوئی نئی بات یا کسی استفسار کا جواب یا کوئی خاص امر حوالۂ قلم ہو گیا، ہو گیا ورنہ فلاں فلاں ان کی شوخیٔ طبع کا کوئی پہلو ہاتھ آتا تو پھر چوکتے بھی نہ تھے۔ مثلاً جیسا کہ ہم نے حصۂ اصلاحات میں لکھا ہے کہ مائل صاحب نے ایک غزل لکھی اور استاد کی خدمت میں پیش کی جس کی زمین ہے ،، دیدار اے مسیح ! بیمار اے مسیح ،، اس پہ تحریر فرمایا ،، یہ غزل آپ کی عیسائی ہو گئی۔ گرجا گھر بھیجئے، میرے پاس کیوں بھیجی ،،

چند خطوط کے جوابات میں سے کہ وہ بھی گنتی کے ہیں میں صرف وہ تین جوابات نقل کرتا ہوں۔ جو دستِ خاص سے حوالۂ قلم کئے گئے ہیں۔

(۱) میں حضور بندگانِ عالی کے ہمرکاب سفرِ کلکتہ میں ہوں چند مہینے گزرے کہ میری اہلیہ کا انتقال ہو گیا۔ میرے حواس بجا نہیں۔ نہایت صدمہ اٹھایا　　داغ دہلوی ۹ رمضان ۱۳۱۸ھ

(۲) پانچ مہینے سے میں ہمرکاب حضور پُر نور دام اقبالہٗ کے شیر کے شکار میں حاضر ہوں۔ دس شیر شکار ہو چکے ہیں، آئندہ غزل بعد محرم بھیجنا۔　　داغ دہلوی

(۳) میں مدت سے حیدر آباد سے سو کوس پر ہوں، بن میں۔ حضور پر نور شیر کا شکار کھیل رہے ہیں۔ چار شیر شکار ہوئے ،، فصیح الملک داغ دہلوی ،،

دیگر امور

آپ کے یہاں محرم میں اصلاح کا کام بند رہتا باہر جاتے تو تلامذہ کو اطلاع دی جاتی کہ واپسی تک غزل مت بھیجو، "تاریخ تحریر کی ترقیم اور ایک سے زیادہ غزل نہ بھیجنے کی ہمیشہ تاکید رہتی — زیادہ سے زیادہ ایک مہینے کے اندر اندر غزل بعد اصلاح واپس فرماتے۔ لفافہ پر ڈاک ہی سے نمبر سلسلہ ضرور پڑا ہوتا تھا۔ علی العموم تبلیغ کا ہے ما ہے وجہ اصلاح بھی تحریر فرما دیتے اپنے عہد کے دستور کے مطابق املا کی غلطیوں کی تصحیح بھی اگر غزل نظر سے گزر جاتی تو کر دیتے تھے،

حضرت داغ کی اصلاح کے نمونے

اب "کلام مائل پر" اصلاحاتِ داغ ملاحظہ فرمایئے۔ ان میں پہلے مائل صاحب کا اصلی شعر ہے۔ پھر حضرت داغ کی اصلاح اور اس کے بعد حضرت داغ یا اس ناچیز کے تحریر کردہ اشارات غزل کے اوپر تاریخ اصلاح یا روانگی خط لکھی ہوئی ہے۔

(الف)　　۱۶ ۱۹۰۱ء

(اصل) خدا کیا ہے ہماری اور ہمارا کیا چلن بگڑا
کہ جو تم آج ہم سے خود بخود اے (جان من) بگڑا
(اصلاح) " " " " " (تیغ زن) بگڑا

"جان من" عامیانہ زبان تھی، اصلاح نے جہاں متانت و سنجیدگی پیدا کی وہاں معشوق کی تنک مزاجی اور جنگ جوئی کا بھی نقشہ کھینچ دیا

کہا (میں نے) نہ چھیڑو کھیل مرنا سخت جانوں کا
تو اتنی بات پر وہ اور بھی شمشیر زن بگڑا

(تھا یہ) " " " " " " "

یہاں فعل ماضی مطلق کا بغیر حرف شرط (جو) کے لانا اور ضمیر فاعلی (میں نے) کا اظہار یہ تمام بھدے سے تھے۔ اور شعر پست ہو کر رہ گیا تھا۔ اصلاح نے ان عیوب سے شعر کو پاک کر کے روزمرہ کی رُوح پھونک دی سلاست و روانی بٹھا دی، اور معشوق کی نازک مزاجی کی تصویر کھینچ کر رکھ دی۔

. . . .

کف افسوس مل کر (حسرت دل) رہ گئی دل میں
سوالِ وصل پردہ مجھ سے جب پیماں شکن بگڑا
" " " (دل کی حسرت) " " "

"حسرت دل" دل میں رہ جانا" محاورہ کے خلاف تھا۔ اصلاح نے شعر کو عین محاورے کے موافق کر کے رونق پیدا کر دی۔

(میں شکوہ بھی نہیں کرتا ہوں جورِ آسمانی کا)
(بھلا پھر مجھ سے کیوں تو اس قدر) چرخ کہن بگڑا
(جفائیں تیری جھیلی ہیں ستم تیرے اٹھائے ہیں)
(بگاڑا میں نے کیا جو مجھ سے تو) چرخ کہن بگڑا

علاوہ شعر کے پھس پھسے ہونے کے اس میں یہ ایک زبردست خرابی موجود تھی کہ "آسمان" اور "چرخ کہن" دو جداگانہ چیزیں معلوم ہوتی تھیں۔

"جفائیں تیری جھیلی ہیں اور ستم تیرے اٹھائے ہیں" کے دونوں ٹکڑوں نے نہ صرف اس عیب ہی کو رفع کیا بلکہ شعر کو پُر درد، پُر اثر اور عاشق کے صبر و شکیب اور عالی ہمتی کا بولتا قلم بنا دیا۔

"بگاڑا میں نے کیا"، عاشق کی بے کسی، بے قصوری، مجبوری، دل شکستگی کا بہترین ترجمان ہے۔

اگر واقعی طور پر غور کیا جاوے تو اس شعر کی اصلاح نے پوری غزل کو چمکا دیا۔

(۲) ۲۲ جولائی ۱۹۵۶ء

(اے دوستو دل لے کے) وہ چٹکی میں ہمارا
(پھر اس طرح) ملتا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
کیا ظلم ہے چٹکی میں وہ لیتے ہیں میرا دل
اس طرح سے ملتا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

پہلے مصرعہ کی اصلاح نے مخاطبہ کو وسیع یعنی معتقد اور دنیا کے تجسس و تحیر کو آباد کر دیا۔ "لے کے" کے بعد پھر کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی لہذا اس کے اخراج اور "سے" کے اضافے نے شعر کو رواں اور پُر تاثیر بنا دیا

(۳) ۱۴ جولائی ۱۹۵۶ء

تو نے جس دن سے مرا (خیال) صنم چھوڑ دیا
" " " " (دھیان) " "

میں نے بھی تیری قسم مرنے کا غم چھوڑ دیا
" " " " " "

میں تو "خیال" اور "دھیان" ہم معنی لیکن بغور دیکھا جائے تو "دھیان" کے مقابلہ میں "خیال" ایک گہری شے ہے۔ معشوق کو "خیال" سے کیا واسطہ، ہاں ایک ہلکی سی کیفیت "دھیان" کی پیدا ہو سکتی ہے۔ جو چھچھلتی ہوئی چیز ہے اور اسی باریکی نے اس اصلاح پر نواب صاحب کو آمادہ کیا اور در حقیقت ایک نازک اصلاح دی۔ پھر "خیال" بروزن "ملال" ہے اور حضرت مائل نے "دی" گرادی تھی یہ فنی عیب بھی دفع ہو گیا

(تیغ سے خوب ملا شوقِ شہادت ہنس کر)
(آپ نے جب مرا سر کر کے) قلم چھوڑ دیا
(مجھ کو قاتل نے جو مشتاقِ شہادت پایا)
(نہ کیا) اس نے مرا سر بھی قلم چھوڑ دیا

پہلا مصرعہ بہت الجھا ہوا اور لایعنی سا تھا۔ استاد کی اصلاح نے الجھنیں دور کیں، روانی کی روح پھونکی، اور ایک خاص انداز معشوقانہ پر روشنی ڈال دی کہ عاشق جو چاہتا ہے معشوق اس کے برعکس ہی کرتا ہے۔ "بھی" کا اضافہ بھی فصیح الملک جیسے بہادر ہی جیسے سخن سنج اور ماہر فن محبت کا کام تھا۔ پھر "سر کر کے" کی ثقالت بہت گراں تھی جو رفع ہو گئی۔ ردیف ایک خاص لطف پیدا کر گئی۔

خط میں لکھتے ہی نہیں مہر و وفا کے الفاظ
" " " " " "
مہرباں (آپ نے کیا طرز) رقم چھوڑ دیا
" (تم نے یہ انداز) " " "

یہ نفس نفیس حضرت نواب صاحب مرحوم کا ریمارک ہے "طرز" مؤنث ہے۔ لہذا وجہ اصلاح ظاہر "آپ" کی جگہ "تم" بے تکلفی اور گلہ شکوہ کی ایک دنیا اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔ استاد مرحوم کی اصلاح نے عاشق کی شکایت کو نہایت سلیقے سے پیش کر دیا کہ جس سے غزل کا نیا دستکار عمل ہے

ظلم سے باز وہ آتے (ہیں) نہیں اے مائل
" " " " (ہی) " "

(مجھ سے) کہتے ہیں کہ "میں نے ستم چھوڑ دیا

" " " (اور) " "

"آتے ہی نہیں" میں کھلی ہوئی تعقید اور اچھی خاصی گرانی تھی "..." سے یہ عیوب رفع کئے۔ زور پیدا کیا، اور ظلم و ستم کی تہہ کیفیات سے شعر کو مملو کیا۔ "اور" سے زہر خند کی ایک خاص ہر دوڑائی، درد، تاثیر، روانی اور سلاست بڑھ گئی، وہ جُدا اور شکایت میں پختگی پیدا ہو گئی۔ جس نے غزل کے محاسن میں اضافہ فرما دیا۔

(۴) ۲۰ ۱۹۰۱ء

ان سے ظاہر کر دیا رازِ محبت دیکھنا

اس دلِ بے تاب کی (کوئی) شرارت دیکھنا

" " " " (میرے) " "

ضمیر مبہم (کوئی) کا استعمال بے موقع اور مغالطے میں ڈالنے والا تھا۔ "اس کے اخراج" اور "ضمیر اضافی" میرے "کے اضافے سے ایک طرف تو یہ خرابی رفع کی دوسری طرف ایہام قطعی پیدا ہو گیا۔ اور ردیف کی لطافت المضاعف ہو گئی۔ پھر "کوئی" کے ساتھ "دیکھیے" زبان ہے نہ کہ "کوئی دیکھنا"

(دردِ ہجراں سے مرے) پہلو میں دِل بیتاب ہے
(مرغِ بسمل کی طرح) " " " "
(کس طرح ہوں گے بسر ایام فرقت) دیکھنا
(سیر اس کے لوٹنے کی کوئی ساعت) دیکھنا

"دردِ ہجراں سے مرے" والا ٹکڑا مناظر تھا اور روانی میں روڑا اٹکاتا تھا "مرغِ بسمل کی طرح" والی تشبیہ نے دلِ بیتاب کی کیفیت مذبوحی کا منظر پیش کر دیا۔ دوسرا مصرعہ کوئی شاعرانہ خوبی نہیں رکھتا تھا۔ اس کے تغیر نے شعر کو چست مضمون کو درست اور حسنِ طلب کو بہ لطافتِ تمام ادا کر دیا۔ "دلِ بے تاب کی مذبوحی کیفیت نے "دیکھنے" کے لئے جو دوسرے مصرعہ میں تاکید فرمائی گئی ہے وہ ناقابلِ فراموش ہے۔

کیا کروں کرتی نہیں کوئی دوا مطلق اثر

" " " " "

اے مسیحا! (جانب بیمارِ فرقت) دیکھنا

" " (تم شبِ فرقت کی شدت) دیکھنا

مسیح علیہ السلام کا معجزہ کسی کو دیکھ کر اچھا کرنا نہ تھا۔ بلکہ مس و تسبیح سے صحت بخشی، اُن کی خصوصیت تھی اور اس لئے "جانب" اور "دیکھنا" دونوں بیکار الفاظ تھے۔ "تم شبِ فرقت کی شدت دیکھنا" سے یہ عیب جاتا رہا۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ شدتِ بخار کا اندازہ نبض دیکھ کر یا پیشانی پر ہاتھ رکھ کر کیا جاتا ہے۔ بہر صورت جسم کا چھونا ضروری ہوتا ہے۔ اور اس طرح استعارہ (مسیحا) کے لئے ایک نسبت قائم ہو گئی۔ حسنِ طلب کی کیفیت جو پیدا ہوئی وہ الگ اور شعر، شعر ہو گیا وہ جُدا۔

میری وحشت دیکھ کر دانتوں (سے) انگلی داب کر

" " " " (میں) " "

کہتے ہیں اہلِ بیاباں (اُن کی) حالت دیکھنا

" " " (اس کی) " "

"دانتوں سے انگلی دابنا" یہ محاورہ نہیں بلکہ "دانتوں میں انگلی دابنا" محاورہ ہے۔

دوسرے مصرعے میں وہ "اس کی" میں جس قدر حقارت اور بنانے کی کیفیت موجود ہے وہ "ان کی" میں نہیں لہذا اصلاح نے شعر کو موافق محاورہ و فطرت بنا دیا۔

... وہ گلِ خوبی بھی آ جائے چمن میں ٹھہر جا ...
... اے گل تُو ہے تجھے تیری نزاکت دیکھنا ...

اس ریمارک کے ساتھ نواب صاحب نے یہ شعر غزل سے خارج کر دیا۔

"نزاکت دیکھنی چاہیے"

علاوہ ازیں غور کیا جائے تو اس شعر کی اصلاح ناممکن بھی تھی۔ کیونکہ اس میں کوئی بات ہی نہ تھی۔ البتہ پورا شعر کا ٹکڑا اس کے مفہوم کے دوسرے شعر میں ادا کیا جاتا اور ایسا نواب صاحب مرحوم نے بہت کم اور وہ بھی بہت ضروری صورتوں میں کیا ہے۔

(۵) ۲ ۱۹۰۱ء

رنج کے ساتھ، خوشی میں بھی نہ چھوڑا مانگ

"وصل کی شب میں، مجھے ہجر کا غم یاد آیا"

(کہ شبِ وصل) " " " " "

بقول علامہ شبلی مرحوم "کلام کی فصاحت میں صرف لفظ کا فصیح ہونا کافی نہیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ جن الفاظ کے ساتھ وہ ترکیب میں آئے، اُن کی ساخت، ہیئت، نشست، سُبکی، اور گرانی کے ساتھ اس کو خاص تناسب اور توازن ہو ورنہ فصاحت قائم نہ رہے گی۔"

اگر غور کیا جاوے تو "وصل کی شب" میں اس قدر تناسب وہ توافق نہ تھا۔ جس قدر کہ "شب وصل" میں ہے۔ کیونکہ عاشق کے لئے شب وصل میں کہ جو خوشی کا موقع ہے۔ ہجر کے رنج والم کا یاد آنا ایک قسم کی بدشگونی ہے۔ "کہ" بیانیہ لفظ ہے کہ جس نے حالات پر پوری پوری روشنی ڈالی ہے۔

(باقی آئندہ)

بقیہ صفحہ ۲۷ کا

اپنی زندگی کے نفع ونقصان کا گوشوارہ بنایا تو دیکھا کسی طرح گھاٹے میں نہیں رہے۔ ہمیشہ اپنے حق سے زیادہ پایا لہٰذا حتی الوسع افسوس اور رقت سے دامن بچایا تاہم بندہ بشر ہے۔

آپریشن ٹیبل پر جانے سے پہلے ہم نے ایک زبردست تحریر دُنیا اور دُنیا والوں کے لئے لفافہ میں بند کر کے چھوڑی تھی۔ جس میں اپنا نظریہ زندگی بیان کرتے ہوئے لوگوں کو صراطِ مستقیم پر چلنے کی تلقین کی تھی۔ جس پر چند ناگزیر وجوہ سے خود نہ چل سکے تھے افسوس کہ فصاحت و بلاغت کا وہ شاہکار فی الحال منظرِ عام پر نہ آسکے گا۔ پاکستان سے ہمارے دوست مصلح الدین ٹیلی ویژن والے لندن آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے بصرفِ زرِ کثیر انگریز کیمرہ مین ہمارے گھر پر لاکر ہمارا انٹرویو کیا۔ ہزاویے سے ہماری تصویریں کھنچیں۔ یوسف کامران سے کہ وہ بھی یہاں تھے، بڑے بلیغ سوال وجواب ہم سے کئے۔ بہت سی نقلیں ریکارڈ کیں۔ ہمیں معلوم تھا کہ کس خوش خیالی میں ایسا کر رہے ہیں۔ جی ہی جی میں ہنستے رہے۔ ان کا دل کیا توڑتے ــــ ہمیں افسوس ہے کہ ہمارے قومی ادارے پاکستان ٹیلی ویژن کے پیسے ضائع جائیں گے بلکہ اس انٹرویو کے دکھانے جانے کی حسب دل خواہ تقریب جلد نہ نکلی تو خاندان سے باز پرس بھی ہو۔ ان کی ڈائریکٹری بھی ہو جائے ــــ لیکن اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟ منیب یا ہے؟

آج ترنگا لہرایا پھر آج ترنگا لہرایا

اس جھنڈے کی شان نہ پوچھو اس کی شان نرالی
اس کی عظمت اس کی عزت سارے جہاں سے عالی
خونِ شہیداں کی سرخی سے اس کا رنگ گلابی
حلفِ وفا کیسے لوگوں نے تن من دھن سے نگایا
آج ترنگا لہرایا پھر آج

چین کی بنسی باج رہی ہے من کی دُنیا جاگی
غربت کی منحوس مصیبت دھیرے دھیرے بھاگی
فصلِ خزاں بھی صحن چمن کی ہو گئی آج تیاگی
امر شہیدوں کی قربانی نے آج یہ دن دکھلایا
آج ترنگا لہرایا پھر آج

گیت اسی کا گائیں گے ہم گیت اسی کا گانا
بھارت ماں کی عظمت کو ہر صورت سے بڑھانا
ہم کو غریبی کی لعنت کو بھارت سے ہے بھگانا
پالی ہم نے پیا پیاں سکا ؤن یہاں کا کھایا
آج ترنگا لہرایا پھر

آزادی کا پاک نگر ناپاک نہ ہونے پائے
اپنی جان چلے ہی جائے اس کی شان نہ جائے
اتنی بلندی پر جا پہنچے بجلی پہنچ نہ پائے
سوا دہے اشفاق جہاں میں اس جھنڈے کا سایہ
اشفاق حسین۔ اشفاق دھری م۔ آج ترنگا لہرایا

مُشاعرہ نمائش مُظفرنگر

رمزی الاحسانی

نمائش مظفرنگر کی تقریبات کے سلسلے میں ہر سال ایک آل انڈیا مشاعرہ کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس مشاعرہ کو سننے کے لئے قرب وجوار ہی سے نہیں بلکہ میرٹھ، سہارنپور، بجنور وغیرہ سے بھی اہل ذوق اور ادب نواز حضرات تشریف لاکر اس مشاعرہ کو کامیاب بناتے ہیں۔ نمائش کے ایک وسیع پنڈال میں یہ آل انڈیا مشاعرہ منعقد ہو رہا ہے۔ آج کے مشاعرہ کو آل انڈیا ریڈیو والے بھی ریکارڈ کر رہے ہیں۔ سوا دس ہوا چاہتے ہیں جو حضرات گھنٹوں پہلے سے پنڈال میں جمے ہوئے ہیں وہ اب تالیوں پر اُتر آئے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب صبر کی حد ہو چکی ہے۔ بس مشاعرہ شروع کرا یا جائے۔ لیجئے صدارت ہی مشاعرہ شروع کرایا جا رہا ہے۔ اور جناب شاہد نوحی مظفرنگری نظامت کے فرائض انجام دینے کے لئے مائک سنبھال کر نابینا شاعر غمگین قریشی کو یاد فرما رہے ہیں۔ غمگین صاحب قدرے توقف کے بعد آ رہے ہیں ان کے تیور بتلا رہے ہیں کہ سب سے پہلے ان کو پڑھوا کر ان کی توہین کی جا رہی ہے۔ آخر جو بھی مشاعرہ کی بسم اللہ کرے گا اگر وہ اپنی توہین سمجھتا ہے تو اس احساس برتری کا کیا علاج حالانکہ یہ سوچنا ہی غلط ہے۔ بلکہ یہ سمجھنا چاہئیے کہ پڑھنا ہے چاہے جس وقت پڑھوایا جائے اگر کلام میں جان ہوتی ہے تو ہر حال میں کامیابی حاصل کرتا ہے اچھا تو دیکھئے غمگین صاحب فرما رہے ہیں ؎

ہر تمنا ہے تیرا عکس لئے
ہر نفس میں ظہور ہے تیرا
میری آنکھوں میں روشنی نہ سہی
میرے دل میں تو نور ہے تیرا

غمگین صاحب رواں دواں سنا کر اپنی جگہ لائے جا رہے ہیں اور جناب سعید مرتضیٰ صاحب ایم، پی صدر مشاعرہ کمیٹی کے ہمراہ جناب جگبیر سنگھ صاحب ڈاسسٹینٹ منسٹر برائے نشریات حکومت ہند) تشریف لا رہے ہیں۔ اور ایم، پی صاحب اس مشاعرہ کا افتتاح فرما رہے ہیں۔ آپ کی تصویر لی گئی ہے۔ پھولوں کے ہار پہنائے جا رہے ہیں۔ پھر آپ ہی صدارت کے لئے درخواست فرما رہے ہیں۔ جناب جگبیر سنگھ جی سے آپ کو بھی پھولوں سے لادا جا رہا ہے۔ آپ شعرا کی صف ہی میں بیٹھ گئے ہیں اور شاہد صاحب نصرت کنتوری کو کلام سنانے کی دعوت دے رہے ہیں نصرت صاحب غزل سرا ہیں ؎

یہ کون ہے مرکز پہ تہذیب سمٹ آئی
انساں ہی تماشا ہے انساں ہی تماشائی
بھولے سے جو چوما ہے ہونٹوں کو تبسم نے
مت پوچھئے کس کس کے ماتھے پہ شکن آئی
ہاں اس نے وفاؤں کا وعدہ تو کیا لیکن
ظالم کی ادا دیکھو مری ہی قسم کھائی

نصرت صاحب محفل کو گرما کر خوب خوب داد لوٹتے پلٹ رہے ہیں اور شاہد صاحب دعوت غزل دے رہے ہیں نسیم میرٹھی کو، نسیم صاحب وہی سُننے سنانے قطعے سُنا رہے ہیں ؎

وفاؤں کی دُنیا بسانے چلا ہوں
نئی انجمن اک سجانے چلا ہوں
مخالف ہواؤ خدا رحم کرنا
میں شمع محبت جلانے چلا ہوں

یہ معصوم چہرہ یہ چڑھتی جوانی
تو اپنا بنا لے تری مہربانی
محبت مجھ کو بھکاری سمجھ کر
مجھے بھیک دیدے مری زندگانی

نسیم صاحب داد وصول کئے جا رہے ہیں اور شاہد صاحب قمر بچھرایونی کو زحمت سخن دے رہے ہیں قمر صاحب یوں

نغمگی بکھیرتے چلے ہیں ؎

کیوں ہم پہ تعجب ہے گر پی کے جو ہم بہکے
ہم سے تو سوا شائد ارباب حرم بہکے

دوسرے مصرعے پر داد کا ایک شور ہے اور آپ فرما رہے ہیں ؎

مجرم ہیں مگر ہم ہی تنہا تو نہیں مجرم
پہلے تو نظر بہکی پھر اپنے قدم بہکے
رندی کا بھرم کھویا کم ظرف نے پی پی کر
پینا تو اسی کا ہے جو ظرف سے کم بہکے

تمنا صاحب خوب خوب داد لوٹ کر مائک سے جدا ہو رہے ہیں اور شاہد صاحب حیدر تنوری کو دعوت غزل دے رہے ہیں، حیدر صاحب یوں غزل سرا ہیں ؎

جب وہ نگاہ مائل اصرار ہو گئی
توبہ شریک ساغر میخوار ہو گئی

داد مطلع ہی سے شباب پر ہے اور آپ یوں محفل کو گرما رہے ہیں ؎

مستی، شراب و شعر، سبو، جام، میکدہ
ہر شئے تری نظر کی طرفدار ہو گئی

حیدر صاحب محفل کو گرما کر داد وصول کئے کامراں پلٹ رہے ہیں اور شاہد صاحب جناب سلیم کٹھولی کو آواز دے رہے ہیں، سلیم صاحب کا تالیوں سے خیر مقدم کیا جا رہا ہے۔ اس پہ سلیم صاحب مسکراتے ہوئے جو آئے تو آپ کی گلپوشی کی جا رہی ہے اور آپ یوں سج دھج کر مگر پرانی غزل سنا کر تنا داب پلٹ رہے ہیں۔ ادھر باد و باراں اور آندھی شباب پر ہے وہ تو یہ کہیئے کہ پنڈال جو بنایا گیا ہے وہ ٹین کا بنا ہوا ہے۔ میرے قریب ہی بیٹھے ہوئے جناب تمنا جمالی فرما رہے ہیں کہ اس دور میں اندھا ہونا بڑا ضروری ہے لیکن تمنا صاحب چونک گئے یہ بھی کہتے کہ اندھا اور بہرا ہونا ضروری ہے۔ یہاں ایک دلچسپ بات سنتے چلیئے علامہ انور صابری صاحب نے اپنی ایک کتاب جنہیں کوئی نہیں جانتا میں سلیم صاحب کے گھرانہ کو اندھا لکھا ہے۔ حالانکہ ان کے یہاں سلیم صاحب ہی اندھے ہیں۔ دیکھا تو اس ہنسی مذاق میں نرگس سہوانی ایک اینگلو انڈین غزل سنا کر محفل کو قہقہہ زار بنا کر کامراں پلٹ میں سننے میں ایسا آیا کہ ایک بھی شعر نوٹ نہ کر سکا

آیئے ایک غزل نصرت گوالیاری سے سنیئے ؎

میں نے کیا تم سے دوستی کر لی
ساری دنیا سے دشمنی کر لی

سامنے والے سننے کے موڈ میں نہیں ہیں چیخ رہے ہیں نئی غزل سناؤ، میں نے تمنا صاحب سے عرض کیا اس بحر میں نصرت صاحب اور غزل کیوں نہیں کہہ لیتے۔ نصرت صاحب اور کسی بحر میں غزل کہہ ہی نہیں سکتے: یہ اور ان کے شاگرد بحر زیر خواری میں کہتے ہیں۔ تمنا صاحب مسکرا کر فرما رہے ہیں اس پر میرا بڑا لڑکا سفقت کریم بھی ہنس رہا ہے دیکھا تو نصرت صاحب غزل سرا ہیں ؎

زندگی کیوں ہے اس قدر خاموش
مجھ کو معلوم ہے مگر خاموش
اک سوال آ رہا تھا ہونٹوں پر
کر گئی مجھ کو وہ نظر خاموش
ہم اگر لب نہ کھولتے اپنے
لوگ ہوتے نہ عمر بھر خاموش

داد نے ہنگامہ کا روپ دھار لیا ہے اور آپ اسی دلکشی سے لہرا رہے ہیں ؎

جس زبان پر مجھے بھروسہ تھا
ہو گئی وہ بھی وقت پر خاموش
دل میں طوفان آرزو لے کر
پھر رہا ہوں میں دربدر خاموش

نصرت صاحب محفل کو لوٹ کر چلتے بنے اور شاہد صاحب جیہ سنبل علیگڑھی کو دعوت نغمگی دے رہے ہیں۔ سنبل صاحبہ سفید ہرے پھول والی ساری زیب تن کئے مائک پر آ کر غزل چھیڑ رہی ہیں ؎

یوں تو تیری رحمت کی کچھ حد ہی نہیں لیکن
مجرم ہوں اگر تجھ سے دامن سے سوا مانگوں

داد کا عالم نہ پوچھئے اور آپ یوں سحر کاری کرنے کی ٹھان رہی ہیں ؎

تقدیر تو کاتب کی پابند ہے خود سنبل
ناچاری سے کیا چاہوں مجبوری سے کیا مانگوں

سنبل صاحبہ داد میں نہائے کا مزاں پلٹ رہی ہیں۔ اور شاہد صاحب مظفر رزمی کیرانوی کو یاد فرما رہے ہیں۔ رزمی صاحب یوں بزمِ خردسخن کو لوٹنے چلے ہیں ؎

ایماں کی پوچھئے تو اس کی سمت ہوں
ہندو کی سمت ہوں نہ مسلماں کی سمت ہوں
فاصلے بہت ہیں مرے ان کے درمیان
ساحل کی سمت وہ ہیں میں طوفاں کی سمت ہوں
ایسا نہ ہو کہ آپ مجھے ڈھونڈتے رہیں
آواز دیجئے کہ میں طوفاں کی سمت ہوں

رزمی صاحب بااصرار تمام ایک دوسری غزل سے مشاعرہ لوٹ کر شاداں جا رہے ہیں۔ اور شاہد صاحب تمنا جمالی سے درخواستِ غزل کر رہے ہیں تمنا صاحب غزل پیش کر رہے ہیں ؎

تھا یہ کہ شورشِ طوفان تمنا دیکھیں
بحرِ ہستی میں کوئی ہم بھی جزیرا دیکھیں
ہم سفینہ کو لئے جاتے ہیں طوفاں کی طرف
آپ ساحل پہ رہیں اور تماشا دیکھیں
چاند کے گرد تو ہوتے ہیں ستارے لیکن
کیا یہ ممکن ہے کہ ہم آپ کو تنہا دیکھیں
دن گزر جائے گا خورشیدِ منور کی طرح
صبح کے وقت اگر چاند کا چہرا دیکھیں
ہم تماشا ہیں کوئی دیکھنے والا بھی تو ہو
کیا تماشہ ہے کہ ہم خود ہی تماشا دیکھیں

تمنا صاحب محفل کو گرما کر پلٹ رہے ہیں۔ اور شاہد صاحب سلیم شیرازی لکھنوی کو دعوتِ غزل دے رہے ہیں سلیم صاحب غزل سرا ہیں ؎

بڑی ہی اندھیری ڈگر ہے میاں
جہاں ہم نفیروں کا گھر ہے میاں
ہے فرصت تو کچھ دیر جل سے بیٹھئے
جدائی سے کس کو مفر ہے میاں
کبھی بت شکن تھے مگر اب خود شکن
یہ الزام بھی اپنے سر ہے میاں

سلیم صاحب اپنی اس پندرہ سالہ پرانی غزل پہ داد پاکر اپنی جگہ آ رہے ہیں اور شاہد صاحب رنگِ محفل بدلنے کے لئے ناظم انصاری ناگپوری کو دعوتِ طنز و مزاح دے رہے ہیں۔ ناظم صاحب یوں سنجیدگی سے محفل کو ہنسی رنگ میں بدلنے چلے ہیں ؎

جس روز سے کوؤں نے قدم اپنا جمالیا
اُس روز سے بلبل نے چمن چھوڑ دیا ہے
آہٹ پہ تری ہم نے بھی اے دورِ گرانی
مہمان نوازی کا چلن چھوڑ دیا ہے
جو امیر سے غریب ہیں وہ لیں اجازت آنے جانے کی
نرسے عاشق تو اپنے باپ کی محفل سمجھتے ہیں
نہ کر تو اپنی کالی شکل پہ افسوس اے جاناں
کوئی کچھ بھی کہے ہم تو سبھی کامل سمجھتے ہیں

پھر ایک مزاحیہ نظم سنیئے ؎

میری امی کی بہو میرے منّے کی ممی
تو مری صبح بنارس تو مری شام اودھ

سُنا کر محفل کو قہقہہ زار بنا کر تالیوں کے شور میں جا رہے ہیں۔ اور اس ہنگامہ میں شاہد صاحب درخواستِ کلام کر رہے ہیں عشرت کرتپوری سے۔ عشرت صاحب عنایت کر رہے ہیں ؎

کس سادگی سے چھوڑ دیا ہے بہاؤ پہ
حالانکہ ہم سوار ہیں کاغذ کی ناؤ پر
ہم کھلکھلا کے ہنستے ہیں ہر تازہ گھاؤ پہ
کچھ لوگ معترض ہیں اسی رکھ رکھاؤ پر
یہ آگ بھی انھیں کی لگائی ہوئی تو ہے
جو لوگ ہاتھ تاپ رہے ہیں الاؤ پہ
ممکن نہیں کہ عشق کی بازی کو ہار جائیں
دل جیسی چیز ہم نے لگائی ہے داؤ پہ

عشرت صاحب خوب خوب داد و تحسین پاکر اپنی جگہ آ رہے ہیں اور شاہد صاحب دعوتِ سخن دے رہے ہیں شمیم جے پوری کو۔ اور آپ یوں بانکپن سے ابھر رہے ہیں ؎

راہزن کوئی راہبر کوئی
کارواں کس کے حال پہ روئے

کیسے گزری شبِ فراق نہ پوچھ
مختصر یہ کہ رات بھر رُوئے
مجھ کو بے ساختہ ہنسی آئی
دوست جب میرے حال پر رُوئے

آپ مائک سے جُدا ہوا چاہتے ہیں کہ ایک غزل کی فرمائش ہو رہی ہے۔ یہ غزل ہے ؎

یہ ہی نہیں کہ یار وفادار چاہیئے
دُشمن بھی ہم کو صاحبِ کردار چاہیئے

شناکر شاداں پلٹ رہے ہیں اور ادھر شاہد صاحب جناب مشیر جھنجھانوی صاحب سے درخواستِ کلام کر رہے ہیں۔ قبلہ مشیر صاحب پُر وقار انداز سے عطا فرما رہے ہیں ؎

ظلمتوں سے روشنی کیا مانگتے
قاتلوں سے زندگی کیا مانگتے
بھیک بھی پہچان کر دیتے ہیں لوگ
ہر طرف سے اجنبی کیا مانگتے

داد کا عالم نہ پوچھئے اور آپ عنایت کر رہے ہیں ؎

جن کے چہرے تشنگی سے زرد ہیں
اُن سے جام سرخوشی کیا مانگتے
مستقل دیوانہ پن ہے زندگی
ہم خرد سے آگہی کیا مانگتے
زندگی کے زخم لو دیتے رہے
ہم کسی سے روشنی کیا مانگتے

قبلہ مشیر صاحب خوب خوب محفل کو گرما کر اپنی جگہ آ رہے ہیں اور شاہد صاحب زحمتِ سخن دے رہے ہیں صوفی عالم فتحپوری کو۔ قبلہ عالم صاحب یوں گرج اور برس رہے ہیں ؎

جس کے اسلاف نے تاریخ کا رُخ موڑا ہے
اُس کی شہرت کو دبائیں کیسے

داد کا ایک دھماکہ ہوا ہے کئی بار دہرا کر یہ شعر صدر صاحب کی نذر کر رہے ہیں ؎

توڑ کر پھینک تو دی شاخ سے رنگین کلی
اس کی خوشبو پہ مگر روک لگائیں کیسے

پھر پنڈال شکن ایک شور سا شور ہے اور آپ یوں محفل کو گرما رہے ہیں ؎

ناخدائی کا سلیقہ جنہیں آتا ہی نہیں
وہ کنارے پہ سفینہ کو لگائیں کیسے

عالم صاحب کو پھر ایک اور ایک اور کے شور نے مائک سے جُدا ہونے نہیں دیا اور میں سوچ رہا ہوں یہ شہرِ انقلاب مظفر نگر ہے جہاں اس نے ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک انگریز۔ انقلابی۔ جاں نثار۔ مجاہد۔ باغی سرفروش اور وطن دوست حضرات ملک و وطن کے سامنے پیش کئے تو وہاں اس نے اہلِ ادب اور انجمن شعر و ادب کو بھی ان گنت اہلِ قلم فرزند دیئے۔ اور وہ ملکی سیاست ہو یا شعر و ادب کی بزم ہر جگہ ملک و قوم کی رہنمائی کی ہے آپ بھی مظفر نگر کی قیادت کو سلام کیجئے۔ عالم صاحب فرما رہے ہیں ؎

بجا کہ دورِ گزشتہ بُرا تھا مگر
یہ دَور اس سے بھی بدتر ہے کیا کیا جائے

کل یہیں ایک انقلاب نے ایک عظیم حکومت کو بدل کر رکھ دیا تھا اور آج ایسے اشعار پہ داد کے جو دھماکے ہو رہے ہیں وہ بھی ایک خلسرو کی گھنٹی ایک وارننگ ہو سکتی ہے کیا ہم اس انقلاب سے غافل تو نہیں ہیں ارشاد ہوا ہے ؎

اُتر کر تخت سے بھی شہزروں کا تاج ملا
یہ اپنا اپنا مقدر ہے کیا کیا جائے

پھر ایک ہنگامہ ایک ہاؤ ہو کا دھماکہ ہوا ہے کئی بار دہرا کر محفل کو گرما کر پلٹ رہے ہیں اور اس عالم میں شاہد صاحب پروفیسر عنوان چشتی کو پکار رہے ہیں عنوان صاحب قرأت کر رہے ہیں ؎

نشۂ جذبِ جنوں اور بھی گہرا ہو جائے
میں جو پوچھوں تو ترا رنگ سنہرا ہو جائے
ڈوبنا ہی جو مقدر ہے تو خود میں ڈوبوں
میری آنکھوں میں جو پانی ہے وہ گہرا ہو جائے

عنوان صاحب داد وصول کئے مائک سے جُدا ہو رہے ہیں اور شاہد صاحب یوگندر پال صابر شکوہ آبادی کو زحمتِ سخن دے

رہے ہیں صابر صاحب عنایت کر رہے ہیں ؎

نامرادی ہے اُن کی تقدیر
ظلم کا سکہ چل نہیں سکتا
ظلم کا پیڑ بڑھتو سکتا ہے
ظلم کا پیڑ پھل نہیں سکتا

صابر صاحب رواں دواں سنا کر چلتے بنے اور میں آپ کا منہ دیکھتا رہ گیا۔ اور اب قبلہ فنا نظامی کا پوری مائک پر آکر فرما رہے ہیں میں نے جنتا پارٹی کو ووٹ دیا اور یہ ووٹ صحیح دیا ـــ حالانکہ اس سے پہلے سیاسی بات کے بارے میں کہہ رہے تھے کہ یہ مشاعرہ ہے یہاں سیاسی باتیں نہ ہونا چاہئیں اور خود ہی سیاسی باتیں شروع کر رہے ہیں۔ اگر آپ نے جنتا پارٹی کو ووٹ دیا ہے تو اس اعلان سے کیا مراد ہے ـــ ؟ کیا صلہ چاہیئے ؟ کیا کسی معاوضہ کی ضرورت ہے ؟ آج جو بھی اٹھتا ہے وہ اس قسم کے اعلانات کرتا ہے آخر اس نمائش سے کیا مقصد ہوتا ہے ان حضرات کا ؟

آپ بوڑھے ترنم سے غزل سرا ہیں ؎

میں یوں بھی جانتا ہوں ترے حضور رہنا
کچھ پاس پاس رہنا کچھ دُور دور رہنا
قاتل سے کوئی سیکھے فنِ ستمگری کو
لاکھوں کا قتل کرنا اور بے قصور رہنا

آہ اور واہ کا ایک شور ہے۔ قبلہ مشیر صاحب فرما رہے ہیں یہ شعر تو سیاسی ہوگیا اور آپ فرما رہے ہیں ؎

اک اجنبی مسافر مجھ سے یہ کہہ گیا ہے
منزل کے پاس رہ کر منزل سے دُور رہنا
واعظ تمہاری خاطر مسجد میں آگئے ہیں
اک رات میکدہ میں تم بھی ضرور رہنا

آپ ایمانداری سے کہئے یہ غزل ایک پختہ گو اور کہنہ مشق شاعر کی غزل ہو سکتی ہے ـــ ؟ فنا صاحب سے کتنی امیدیں ہوں گی اہل ادب اور باذوق سامعین کو لیکن اس غزل سے بڑی مایوسی ہوئی ہوگی۔ آپ کے ساتھ آج ایک بجے پہلا دور ختم ہو رہا ہے اور داد دیجئے صدر صاحب اور جناب سعید مرتضے صاحب کو کہ پہلے دَور کے اختتام تک تشریف فرما رہے۔ آپ تشریف لے جا رہے ہیں پھر دوسرا دَور شروع ہو رہا ہے اس وقت فرمائشیں پوری ہو رہی ہیں !

امسال جن شعرائے کرام نے مشاعرہ میں شرکت کا وعدہ کیا تھا وہ نہیں آئے اور انہیں میں سے ایک صاحب کو نظامت سونپ دی جاتی وہ آئے نہیں لہٰذا نظامت کے لئے مسٹر شاہد لوحی صاحب کا نام پیش کیا گیا ہر چند کہ آپ مشاعرہ چلاتے رہے لیکن آج کا عوام اس سیدھی سادی نظامت سے خوش نہیں ہوتا جب تک کوئی نئی بات نہ ہو اب مشاعروں کا دارومدار بھی اناؤنسر کی چرب زبانی پر رہ گیا ہے۔ آج کا مشاعرہ وہ بات پیدا نہ کر سکا بہرحال منتظمین مشاعرہ نے تو ملک کے مشہور اور مترنم شعراء کو دعوت نامے بھجوائے۔ جواباً ت بھی حوصلہ افزا آئے لیکن وہ وقت پر نہ آئیں تو یہ کیا کریں ان کی کیا خطا یہ اپنی سی کوشش کر چکے اب شعراء پیسہ لوٹنے اور بٹورنے کے چکر میں پھنسیں رہیں تو اسکا کوئی علاج نہیں اسی تاریخ میں دو مشاعرے اور دوسری جگہوں پر ہو رہے تھے وہاں سے ان کو اچھی رقم ملی ہوگی وہ وہاں چلے گئے یہاں جو وعدہ کیا گیا وہ صرف شاعرانہ وعدہ ہو کر رہ گیا گویا ؎

ان کا بھی وعدہ تو ہے معتبر کہاں

پوسٹر میں ان کے نام دیدیئے گئے تھے۔ اب کنوینر صاحب ان کو عدالت میں بلا کر باز پرس کریں کہ مظفر نگر کے مشاعرے کو کیوں ناکام کرانے کی کوشش کی اور کیوں ان کو بدنام کیا گیا ـــ کم از کم اس بار ان کے ساتھ ایسا ہی سلوک ہونا چاہیئے۔ ورنہ اس طرح مشاعرہ کرانے والے جھوٹے بے ایمان اور نہ جانے عوام کی نظروں میں کیا کیا ہو سکتے اور بن سکتے ہیں۔ عوام کو بتلانے کے لئے ان کو عدالت میں بلانا ضروری ہے۔ اس طرح یہ بھی مشاعرہ والوں کو دھوکہ نہ دے سکیں گے !

خدا حافظ

میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آبھی نہ سکوں

"اپنی آگ اپنا دامن"

سروری ریاض
"علیگ"
مئوناتھ بھنجن۔ یو۔ پی ۲۷۵۱۰۱

ٹیکسی میں بیٹھنے کے بعد ساجد نے ڈرائیور سے مرین ڈرائیو چلنے کے لئے کہا۔ چند لمحوں کا سفر طے کرنے کے بعد ٹیکسی مرین ڈرائیو پہونچ چکی تھی۔ ساجد نے اپنا بریف کیس سنبھالا اور کچھ لمحوں تک عروس البلاد کی رنگینیوں میں کھویا رہا — وہی فلک بوس عمارتیں۔ لمبی چوڑی چمچماتی سڑکیں اور وہی لہریں مارتا ہوا سمندر۔ بالکل وہی جو اس نے اکثر فلموں میں دیکھا تھا۔ یکایک اس کی نظر ایک لمبے چوڑے سائن بورڈ پر جاکر ٹھہر گئی۔ "ہوٹل ساجن" وہ جلدی جلدی ہوٹل کے زینے پر چڑھنے لگا۔ کمرہ بک کرانے کے بعد وہ سب سے پہلے اپنی فیکٹری کے لئے سائزنگ میٹریل خریدنا چاہتا تھا۔ اور پھر اس کے ابو کا سخت حکم بھی تھا کہ بمبئی پہونچتے ہی سب سے پہلے فیکٹری کا کام کرے ورنہ فیکٹری بند ہو جانے کا اندیشہ ہے — اس نے سوچا رات کا کھانا کھانے کے بعد آرام سے سوئے گا اور صبح سارا دن اپنی فیکٹری کے لیے کام کرے گا۔ اور پھر عروس البلاد کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہوگا۔ بمبئی کے بارے میں اس نے پہلے ہی بہت کچھ سنا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بمبئی میں کھانا اور کمرہ مہنگا لیکن لڑکیاں بے حد سستی ملتی ہیں۔ ابھی وہ انھیں خیالات میں الجھا تھا کہ دروازے پر دستک کی آواز نے اسے چونکا دیا — "کم ان" — صاحب کھانا لاؤں؟ بیرے نے پوچھا۔ "کیا ہے کھانے میں؟" اور بیرا بہت مودبانہ سے کہنے لگا — انڈا، مچھلی، مرغا، "مرغی نہیں؟" ساجد نے مسکراتے ہوئے معنی خیز انداز میں پوچھا۔ بیرا بے حد ہوشیار تھا۔ اُسے یہ اشارہ سمجھنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی "مل جائے گی صاحب! ابھی بلوا دوں"؟ "نہیں ابھی نہیں دس بجے کے بعد! اور سنو کتنے روپے تمہیں دے دوں میرا مطلب ہے مرغی کو کتنا دینا ہوگا؟" ساجد نے قدرے توقف سے پوچھا — "صاحب جیسی مرغی ویسا ہی ......" ساجد نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے کہا اچھا ٹھیک ہے جاؤ لیکن دس بجے تک وہ مرغی آجانا ... اور ہاں مرغی اچھی ہونی چاہیے سمجھے!

بہت اچھا صاحب! بیرے نے سلوٹ کیا اور باہر نکل گیا۔

رات کے ٹھیک دس بجے دروازہ پر دستک ہوئی۔ مرغی کو سامنے دیکھ کر ساجد کے دل میں گدگدی ہونے لگی۔ ایک بے پناہ خوبصورت اور جوان لڑکی اندر داخل ہو رہی تھی۔ اور خود اپنے ہاتھوں دروازہ بند کر رہی تھی — ساجد ابھی وقت اور حالات کا اچھی طرح جائزہ بھی نہ لے پایا تھا کہ وہ بیتاب موجوں کی طرح آگے بڑھ کر ساجد کے گلے میں اپنی باہیں ڈال کر جھول گئی۔ جیسے برسوں کی شناسائی رہی ہو۔

اور پھر ....

صبح سویرے ہی ساجد کی آنکھ کھل گئی۔ وہ بیڈ سے اٹھا ایک بھرپور انگڑائی لیتے ہوئے اس نے لڑکی پر ایک نظر ڈالی وہ گہری نیند سو رہی تھی۔ جیسے بچہ پیٹ بھر جانے کے بعد گہری نیند سو جاتا ہے۔ اس نے بڑی جلدی میں تولیہ اور صابن سمیٹا اور غسل خانہ میں گھس گیا —

غسل خانہ سے نکلتے ہی اس پر ایک سکتہ طاری ہو گیا — لڑکی نہیں تھی!

بریف کیس کھلا پڑا تھا پچیس ہزار روپے غائب تھے کلائی گھڑی کے ساتھ ٹرانسسٹر بھی لڑکی لے کر چل گئی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ سر چکرانے لگا۔ اس کا سارا جسم اس کی فیکٹری کے بوائلر کی طرح تپنے لگے۔ وہ بے چینی اور اضطراب کی شدت سے زمین پر گر پڑا۔ اور بے بسی بھری نظروں سے در و دیوار کو تکنے لگا۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ لڑکی سامنے کھڑی اس کی نادانی پر قہقہہ لگا رہی ہے۔

سروری ریاض کے افسانوں کا مجموعہ بہت جلد منصۂ شہود پر آرہا ہے۔ (ادارہ)

ترقی کا ایک سال

جون ۱۹۷۷ء میں عنانِ اقتدار سنبھالنے کے بعد جنتا حکومت نے اپنی توجہ سب سے زیادہ غریب محنت کشوں، بے روزگاروں اور دیہات میں رہنے والے کاشتکاروں کی مالی حالت درست کرنے پر مرکوز کی اس سلسلے میں نئے نئے قدم اٹھائے گئے۔ ان تمام اقدامات کے خوشگوار نتائج سامنے آنے شروع ہوگئے ہیں

زمینوں کے مقدمات

راجستھان کی عدالتوں میں عرصے سے زیرِ سماعت زمینوں کے مقدمات غریب کاشتکاروں کے لئے مالی پریشانی کا سبب بنے ہوئے تھے ان مقدمات سے کاشتکاروں کو نجات دلانے کیلئے حکومت نے ۱۴ اکتوبر ۱۹۷۷ء سے "راجسو ابھیان" نامی ایک اسکیم شروع کی۔ اس اسکیم کے تحت سرکاری افسران نے دیہات میں کیمپ لگائے اور دس لاکھ زیرِ سماعت مقدمات میں سے ۹ لاکھ مقدمات کا کھلی عدالتوں میں فیصلہ کیا۔ غریب عوام کو مقدمات سے چھٹکارا ملا اور اُن کی وہ رقم جو ان مقدمات پر تا تصفیہ عدالتوں میں خرچ ہوتی برباد ہونے سے بچ گئی اس کے ساتھ ہی ان میں خود اعتمادی کا ایک نیا احساس پیدا ہوا۔ انہیں محسوس ہوا کہ حالات میں ایک تبدیلی آئی ہے افسروں کے انداز میں آئی ہے۔ پہلے غریب لوگ عدالتوں اور سرکاری افسران کے دروازے کھٹکھٹاتے تھے کوئی فریاد سننے والا نہ تھا۔ اب خود سرکاری افسر گاؤں گاؤں جاکر ان کے دکھ درد پوچھ رہے ہیں اور انہیں دور کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

انتودے یوجنا

آزادی حاصل ہونے کے بعد گذشتہ تیس سال میں مختلف ترقیاتی اسکیموں پر کروڑوں روپے خرچ ہوئے۔ بڑے بڑے منصوبے بنائے گئے۔ بڑی بڑی اسکیمیں تیار کی گئیں

بہت سے سنہرے خواب دکھائے گئے مگر غریب جہاں تھا وہیں رہا۔ تصویر کے اسی افسوس ناک پہلو کو نظر کے سامنے رکھ کر وزیر اعلیٰ جناب بھیروں سنگھ شیخاوت نے "انتودے" کے نام سے ایک نئی اسکیم مرتب کی اور یہ طے کیا گیا کہ غریبی کی آخری سطح پر زندگی گزارنے والوں کو راحت فراہم کی جائے۔ اس اسکیم کے تحت حکومت نے ہر گاؤں میں سب سے زیادہ پانچ غریب خاندانوں کو مالی امداد مہیا کرنے کا بیڑہ اُٹھایا ہے۔ اب تک اس اسکیم کے تحت راجستھان کے ۳۳ ہزار دیہات میں سے ایک لاکھ ۶۵ ہزار خاندانوں کو منتخب کیا جا چکا ہے۔ جن میں سے ۴۳ ہزار خاندانوں کو مالی امداد دلوائی گئی ہے۔ ۲۱ ہزار خاندانوں کو کاشت کے لئے زمین مہیا کی گئی ہے۔ ۲۰ ہزار خاندانوں کو زیادہ عمر کی پنشن دی گئی ہے۔ ۱۸ ہزار خاندانوں کو مویشی پالنے اور دوسرے کاموں کے لئے قرضہ دلوایا گیا ہے۔ ۵ ہزار خاندانوں کو روزگار پر لگایا گیا ہے۔ انتودے خاندانوں کو کم شرح پر بینکوں سے قرضہ دلوانے کے لئے ۳ کروڑ روپے کی رقم منظور کی جا چکی ہے۔ آئندہ سال راجستھان کے بجٹ کا ۶۵ فیصد غریب کاشتکاروں کی فلاح و بہبود پر خرچ کیا جائے گا۔ اتنی بڑی رقم دیہاتی ترقی پر پہلے کبھی صرف نہیں کی گئی۔

انتودے یوجنا کے تحت جن ایک لاکھ، ۵ ہزار کنبوں کو مالی امداد حاصل ہوئی ہے ان میں سے بیس ہزار کے قریب مسلم اقلیت کے کنبے شامل ہیں۔ بوڑھے لوگوں کو پنشن دینے کے سلسلے کا بھی آغاز کیا گیا ہے۔ اب تک بیس ہزار افراد کو چالیس روپے ماہوار فی کس کے حساب سے پنشن جاری کی جا چکی ہے۔ ان بیس ہزار بوڑھے افراد میں مسلم افراد کی تعداد ساڑھے تین ہزار ہے۔

انتودے یوجنا ۲ راکتوبر ۱۹۷۷ء کو شروع کی گئی تھی ۲ راکتوبر ۱۹۸۰ء کو اس یوجنا کا پہلا سال اور اسی کے ساتھ غریب خاندانوں کے انتخاب کا پہلا دور مکمل ہو جائے گا۔ یہ سلسلہ سال در سال جاری رہے گا تاوقتیکہ راجستھان سے غریبی کا خاتمہ نہ ہو جائے۔

مندرجہ بالا ترقیات کے علاوہ راجستھان نے آب پاشی، بجلی، زراعت، تعلیم، سڑکوں کی تعمیر، پرورشِ مویشیان اور چھوٹی صنعتوں کو فروغ دینے کے سلسلے میں بھی گزشتہ ایک سال کے دوران بے مثال ترقی حاصل کی ہے۔

ڈائریکٹر محکمۂ تعلقاتِ عامہ راجستھان، جے پور۔

پندرہ اگست کا پیغام

حضرت رتن پنڈوروی

بہت سوئے اُٹھو اے نغمہ سنجانِ چمن جاگو نہیں یہ وقت سونے کا اب اے اہلِ وطن جاگو
پیامِ فصلِ گُل آیا ہے سرو و نسترن جاگو سجاؤ ہر چمن میں اپنی قومی انجمن جاگو
محبِّ قوم بن جاؤ اگر آزاد رہنا ہے۔

ہماری پھوٹ دامن گیرِ آزادی نہ بن جائے نشاطِ زندگی کا شوق فریادی نہ بن جائے
ہماری خود فریبی قہرِ شدّادی نہ بن جائے ہوس کی خام کاری ایک بربادی نہ بن جائے
محبِّ قوم بن جاؤ اگر آزاد رہنا ہے

ہماری کج روی کوتاہ اندیشی قیامت ہے تعصّب فرقہ آرائی، حسد کیشی قیامت ہے
مشقّت میں کمی آرام میں بیشی قیامت ہے یگانے سے تنفّر غیر سے خویشی قیامت ہے
محبِّ قوم بن جاؤ اگر آزاد رہنا ہے۔

غضب ہے ہم تفاوت کیشیوں کا رہ نما سمجھے غضب ہے ہم نفاقِ تفریق کو درسِ وفا سمجھے
غضب ہے خود فراموشی کو ہم اپنا خدا سمجھے غضب ہے دردِ سر کو دردِ سر کی ہم دوا سمجھے
محبِّ قوم بن جاؤ اگر آزاد رہنا ہے

حذر اُس سے جو دارالامن کو دارالمحن سمجھے حذر اُس سے جو خضرِ راہ کو بھی راہ زن سمجھے
حذر اُس سے خزف ریزے کو جو دُرِّ عدن سمجھے حذر اُس سے جو خارستان کو صحنِ چمن سمجھے
محبِّ قوم بن جاؤ اگر آزاد رہنا ہے

اُٹھو بیدار ہو جاؤ کہ بیداری کا وقت آیا بڑی بدمستیوں کے بعد ہشیاری کا وقت آیا
سنبھل جاؤ حکومت کی گراں باری کا وقت آیا گیا دورِ غلامی اب جہاں داری کا وقت آیا
محبِّ قوم بن جاؤ اگر آزاد رہنا ہے

غزل

نکہت شاہجاپوری

فرقت کی اندھیری راتوں میں ہم دیپ جلائے بیٹھے ہیں صدیوں سے تمہاری راہوں میں آنکھوں کو بچھائے بیٹھے ہیں
اے شورشِ طوفاں ٹھہر ذرا دم لینے دے ہم کو ایک ذرا برسوں سے لرزتی پلکوں پر اشکوں کو سجائے بیٹھے ہیں
کہنے کو بہت کچھ تھا لیکن کس مصلحتِ اوقات دیکھی یادوں کے کنوارے دامن کو سینے سے لگائے بیٹھے ہیں
آئی ہے اجل بھی لینے کو پیغام بھی ان کا آیا ہے اے گردشِ دوراں ٹھہر ذرا ہم آس لگائے بیٹھے ہیں
جو لوگ جفا کے عادی ہیں نکہت وہ وفا کو کیا جانیں
ہم دل کی شکستہ کشتی کو ساحل پہ لگائے بیٹھے ہیں

یومِ آزادی

(اخلاق سہسوانی)

ہم آج ہی کے دن ہوئے تھے کامیاب و کامراں
مسرتوں سے ہمکنار ہوگئے تھے ناگہاں
اندھیرے راستے چمک اُٹھے تھے بن کے کہکشاں
ہمارے گلستاں میں آگئی ہے آج پھر بہار
ہمارے کارواں پہ ہو رہی ہیں منزلیں نثار
فرنگیوں سے آج ہی نجات ہم نے پائی تھی
وطن کی باگ ڈور آج ہی تو ہاتھ آئی تھی
کہ تخت و تاج نے شکست آج ہی تو کھائی تھی
غلامی آج ہی کے دن تو ہوگئی تھی سرنگوں
یہ پندرہ اگست ہے خوشی نہ ہم منائیں کیوں
ہمیں نے منتشر کیا تھا نظمِ تخت و تاج بھی
ہمیں نے تو ہٹا دیا فرنگیوں کا راج بھی
وہی ہے جوش و ولولہ وہی ہے عزم آج بھی
کسے خبر نہیں ہم ایک حُرّیت پسند ہیں
کسے خبر نہیں ہے آج ہم بہت بلند ہیں
وطن کے نوجوانو! آؤ مل کے عہد یہ کریں
مٹا کے لیں گے دم یہ فرقہ بندیوں کی لعنتیں
یہ مفلسی یہ بیکسی، یہ بھوک کی اذیتیں
مٹائیں ذات پات اور مذہبوں کے مسئلے
مٹائیں اُردو اور سنسکرت کے مقابلے
ہمارا کارواں ہے خود ہمیں ہیں میرِ کارواں
چلیں گے اب تو راہِ پُرخطر میں بھی کشاں کشاں
ہماری جستجو کریں گی کامیابیاں
ہمارے پاس ہمتیں ہیں، حوصلے ہیں، عزم ہے
ہمارے پاس شمع ہے، ہمارے پاس بزم ہے

"سرزمینِ ہند"

(نبی احمد اظہر۔ ایم۔ اے اُردو (بہار یونیورسٹی مظفرپور)

سرزمینِ ہند کو گلشن بنانا چاہیے
خاک کے ذرّوں سے گل بوٹے اُگانا چاہیے
ہو جہاں تک بھی رسائی طائرِ افکار کی
اس جہانِ وہم کو اپنا بنانا چاہیے
چاند کی منزل سے جاکر لوٹ آنا کچھ نہیں
کچھ نہ کچھ سورج پہ ہم کو کر دکھانا چاہیے
ملک کی عظمت پہ آئے آنچ تو اے دوستو
مال و دولت ہی نہیں جاں بھی لٹانا چاہیے
کھو نہ جانا عارضی لذت میں اے اہلِ وطن
خود کو پائل کی چھماچھم سے بچانا چاہیے
عظمتِ ہندوستاں کا پاسباں بن اے جواں
خوں بہانا بھی پڑے تو خوں بہانا چاہیے
ہم بھی گاندھی اور نہرو کی طرح ہوں باکمال
ہم کو سرمد کا بھی نغمہ گنگنانا چاہیے
کارنامے سرفروشوں نے دکھائے ہیں بہت
کارنامہ ہم کو بھی اب کچھ دکھانا چاہیے
ہے یہاں کا پھول پیارا اور کانٹا بھی عزیز
ہر خس و خاشاک کو گلشن بنانا چاہیے
فنِ غالب کی کریں عزت بحسنِ دلبری
میر کو بھی راہ کا مشعل بنانا چاہیے
محفلِ شعر و سخن باقی رہے روشن رہے
اس سنہرے خواب کا دیپک جلانا چاہیے
صنفِ نازک کی نزاکت سے خندہ شیوہ رہے
اور خود کو طارق و زاہا بنانا چاہیے
عارضی آشفتگی سے ہو نہ اظہر غمزدہ
قوم و ملت کا تمہیں بیڑا اٹھانا چاہیے

آج کا دن

(محمد یوسف شاقی پالوی)

آج کا دن بہت بڑا دن ہے
آج پندرہ اگست کا دن ہے
آج کا دن نہیں ہے کس کو یاد
آج کے دن ہوا تھا ملک آزاد
روشنی کتنے آشنا یوں کی
چاندنی کتنے ماہنا بوں کی
کتنے پھولوں کی ہے پھبن اس میں
کتنے کانٹوں کی ہے چبھن اس میں
تا بہ حدِّ نظر اندھیرا تھا
جس اندھیرے میں گم سویرا تھا
ایک مدت کے بعد دیکھا ہے
آج گلشن میں جو اجالا ہے
آج کا دن بہت بڑا دن ہے
آج پندرہ اگست کا دن ہے

ہم سے تھیں دور منزلیں بھی بہت
کھائیں رستے میں ٹھوکریں بھی بہت
عزم و ہمت سے ہم نے کام کیا
آخرش منزلوں کو پا ہی لیا
ہر طرف نور سا جو ہے بکھرا
ہے شہیدوں کے خون کا صدقہ
کتنی قربانیوں کے بعد ملا
اپنی قربانیوں کا ہم کو صلہ
آج کا دن بہت بڑا دن ہے
آج پندرہ اگست کا دن ہے

بچے بوڑھے جوان ہیں دیکھو
تیار و سپاہی وطن پہ مٹنے کو

چہرۂ فکر سے اٹھے پردے
حسنِ آزادی کے کھلے عقدے
دیکھ پہلی سی بات ہے بھی کہیں
تجھ میں تھی جو وہ بات ہے بھی کہیں
آج تجھ سے عروسِ آزادی
سہمی سہمی ہوئی سی ہے کیسی
تھا جو محدود اب بھی ہے محدود
چاندنی چاندنی ہے لگے محدود
تا بہ حدِّ نظر خلا ہی خلا
زندگی کب سے کر رہی ہے گلہ
آج تا ہم یہ سوچنا ہوگا
آپ اپنے میں جھانکنا ہوگا
جشن کیا چیز ہے خوشی کیا ہے
بکھری سڑکوں پہ زندگی کیا ہے
خواب باپو کے خواب ہی ہیں ابھی
خواب نہرو کے خواب ہی ہیں ابھی
آج کا دن بہت بڑا دن ہے
آج پندرہ اگست کا دن ہے۔

غزل

امتیاز جے پوری

شگفتگی سے بہت دور کر دیا غم نے
تمام عمر گزاری اسی طرح ہم نے
کلی کلی مرے گلشن کی بن گئی پت جھڑ
یہ انتقام لیا ہے خزاں کے موسم نے
اُداس دل ہے، پریشاں نظر زبان خاموش
فریب جب سے دیا مجھ کو میرے ہمدم نے
کسی نے حال نہ پوچھا میرا شبِ غم بھی
دیا ہے ساتھ جدائی میں چشمِ پُرنم نے
وصالِ یار تو قسمت میں امتیاز نہ تھا
گزار دی ہے شبِ غم میں تشنگی ہم نے

نوجوانانِ وطن کے نام

محلؔ خلیقی جے پوری

آج ہم آزاد ہیں آزاد ہے اپنا وطن
آج اپنا ہے ہمالہ اپنے ہیں گنگ و جمن
ذرے ذرے پر یہاں کے ہے ہمارا اختیار
باغ اپنے کھیت اپنے اپنے ہیں دشت و دمن
اس کی ہر وادی ہے جنت اس کا ہر خطہ ارم
کس قدر پیارا ہے یہ اپنا وطن اپنا وطن
آج اس گلشن کا ہر اک پھول ہے راحت فزا
یہ گل و لالہ یہ نسریں اور یہ سرو و سمن
ہر سماں ہے روح پرور ہر نظارا پُر بہار
لہلہاتا ہے ہماری آرزوؤں کا چمن
آج دامانِ نظر کو بخشتے ہیں تازگی
یہ زمیں یہ چاند تارے اور یہ نیلا گگن
متحد اور یکجہت ہو کر بڑھو آگے بڑھو
نوجوانانِ وطن اے نوجوانانِ وطن
پرچمِ ہندوستاں کو لے کے اپنے دوش پر
عام کر دو ساری دنیا میں محبت کا چلن
پھولتا پھلتا رہے یونہی یہ اپنا گلستاں
یہ دعا ہے محلؔ کی یا رب اور یہی لب پہ سخن

آسمانِ آزادی

قمرالدین برہمؔ گوالیاری

پا چکے ہیں آسمانِ آزادی
ہم بڑھائیں گے شانِ آزادی
آسجائیں وفا کے پھولوں سے
مہرباں گلستانِ آزادی
نہ سہی ہاتھ میں جو ساز نہیں
چپ ہوں کیوں نغمہ خوانِ آزادی
تیر اتنا ہی دور جائے گا
جتنی کھینچو کمانِ آزادی
کس کی طاقت مٹا سکے گی ہمیں
پڑ چکی ہم میں جانِ آزادی
میں ہوں مدہوشِ بادۂ الفت
مجھ سے سُنیئے بیانِ آزادی
بھائی بھائی میں تفرقہ کیوں ہو
ہندو مسلم ہیں جانِ آزادی
کتنا اونچا اٹھے ہیں ہم برترؔ
تب چھوا آسمانِ آزادی

ہندوستان

ڈاکٹر منجھر خیرآبادی (کوروائی)

ہندوستاں ہمارا ہندوستاں کے ہم ہیں
یہ وہ زمیں ہے جس پر قربان خلد و ارم ہیں
ہر ذرہ ہے درخشاں ہر شے ہے نور افشاں
گویا فلک پہ تارے فرشِ زمیں سے کم ہیں
لعل و جواہر اس میں اس میں ہیں سیم و زر بھی
بے شبہ اس زمیں پر اللہ کے کرم ہیں
کشمیر اس میں جنت ہے تاج اس کی زینت
گنگا کی مہربانی جمنا کے بھی کرم ہیں
پرتاب سے بہادر اکبر سے بے تعصب
فوجی ہیں سب ہمارے جنیر نثار ہم ہیں
نیتا مزاجی ہیں جنتا کا راج اس میں
دور ہم سے ہیں بلائیں ہم بے نیاز غم ہیں
نیتا رہیں سلامت جنتا کو ہو مبارک
یہ ساری برکتیں جو بے حد ہی محترم ہیں
یہ سب ہے ٹھیک لیکن اُن سے خدا بچائے
خود غرضیوں کے جو جو آج بھی کرم ہیں

مسافر

توصیف علوی عاصی۔
بی۔ اے کیرالوی

دم لے ابھی ہو نہ کامل مسافر
بی ہو نہ راحت پہ مائل مسافر
ہو اپنی منزل سے غافل مسافر
ابھی اور بھی ہیں مراحل مسافر
ابھی دُور ہے تیری منزل مسافر

ابھی تک خیالوں میں رفعت نہیں ہے
بی قلبِ انساں میں وسعت نہیں ہے
ابی آدمیت کی قیمت نہیں ہے
ابھی دل سے ملتا نہیں دل مسافر
ابھی دُور ہے تیری منزل مسافر

ابھی تک چمن میں کچھ افسردگی ہے
ہر اک غنچہ و گل پہ پژمردگی ہے
فضاؤں میں ہر سمت آزردگی ہے
فسردہ ابھی ہیں عنادل مسافر
ابھی دُور ہے تیری منزل مسافر

ابھی رُوحِ انسانیت ہے جگانی
ابھی شمعِ راہِ وفا ہے جلانی
ابھی زندگی کی ہیں قدریں اٹھانی
ملانا ہے دل سے ابھی دل مسافر
ابھی دُور ہے تیری منزل مسافر

مساوات کے ہیں ابھی گل کھلانے
ابھی ربطِ باہم کے ہیں گیت گانے
ستارے نئے ہیں ابھی جگمگانے
ہے لانی ابھی صبحِ کامل مسافر
ابھی دُور ہے تیری منزل مسافر

ابھی ہیں نقوشِ اخوت اُبھرنے
ابھی زندگی کے ہیں خاکے سنورنے
ابھی ہیں عدالت کے موتی بکھرنے
محبت کا ہونا ہے حاصل مسافر
ابھی دُور ہے تیری منزل مسافر

ابھی جگمگانی ہے تقدیرِ انساں
جہاں میں بڑھانی ہے توقیرِ انساں
دکھانی ہے دُنیا کو تصویرِ انساں
مٹانا ہے ہر رنگِ باطل مسافر
ابھی دُور ہے تیری منزل مسافر

ابھی طور ہے زندگی کا سکھانا
ابھی درسِ انسانیت ہے پڑھانا
ابھی آدمی کو ہے انساں بنانا
سفینوں کو دینا ہے ساحل مسافر
ابھی دُور ہے تیری منزل مسافر

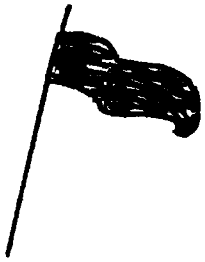
بدلنے ابھی ہیں زمانے کے تیور
ابھی ہیں لٹانے مسرت کے گوہر
چھلکنے ابھی ہیں محبت کے ساغر
جمانی ہے عاصی کو محفل مسافر
ابھی دُور ہے تیری منزل مسافر

غزل

نکہت خان، ناگپور

کیا وفا چاہیں کسی دلدار سے — پھول تک عاری ہوں جب مہکار سے
اشک پچھتاوا، گھٹن، رسوائیاں — بس یہی سوغات پائی پیار سے
اس سفر میں دھوپ ہی گی ہم سفر — مانگ نے سایہ کسی دیوار سے
ہر قدم پر مرحلے ہر سانس غم — جاں کب چھوٹے گی اس آزار سے
جب سے وہ چہرہ نہیں ہے سامنے — سارے چہرے ہوگئے بیکار سے

یاد ہے نکہت وہ رخصت کی گھڑی
اُس نے دیکھا تھا مجھے کس پیار سے



۱۵ر اگست

ہماری آزادی کا یادگاری دن ہے۔

مُلک کی آزادی، جمہوریت، اور قومی یک جہتی کے لئے ہم سب کو صدقِ دِل سے یہ حلف لینا چاہیئے کہ ہم اپنے کردار۔ اور عمل سے ان قدروں کی حفاظت کریں گے۔ اور دیش پتامہاتما گاندھی کی دکھائی ہوئی راہ پر چلتے ہوئے ہمیشہ اپنے ملک کی حفاظت کریں گے۔ اور جمہوری حکومت کو مستحکم کرنے کے علاوہ بلاتخصیص مذہب وملت مِل جُل کر رہیں گے۔

ہندوستان زندہ باد
ہماری آزادی پائندہ باد

امین چند۔ پیارے لال

کلکتہ ۔ نئی دہلی ۔ جالندھر

مَن کہ مکتوبُ الیہ

برادرِ عزیز دعائیں۔ شکر ہے کہ اب آپ کی صحت بحال ہو چکی ہے۔ اور آپ پورے عزم کے ساتھ مصروفِ کار ہیں۔ یہاں بھی گرمی کافی شدید ہے۔ اور اس گرمی میں آنکھوں کا دُکھنا۔ آفت اندر آفت است اے یارِ من! یہ تو مجھے اندازہ ہے کہ تیس اکتیس سال قبل کس شدت کی گرمی دلی میں پڑتی تھی۔ دِلیوں کا یہ حال ہوتا تھا جیسے گرم ریگ میں مچھلی! اب سُنا ہے کہ وہاں کے موسم اور بھی شدید ہو گئے ہیں۔ کئی مہینے سے شانِ ہند نہیں ملا۔ آپ سے جو تعلقِ خاطر پیدا ہو گیا ہے۔ اور شانِ ہند کی جو مخصوص جاذبیت ہے اس کے سبب سے ہر ڈاک سے پرچے کا انتظار رہتا ہے۔ نہ مجھے مارچ کا پرچہ ملا نہ اپریل کا، نہ مئی کا نہ جون کا۔ آپ کی قبلہ حافظ صاحب سے ملاقات ہو تو میر محمد تقی اور جون ایلیا کی طرف سے ان کی خدمت میں سلامِ مسنون، اور آداب نیاز عرض کر دیں۔ زندہ رہے اور حالات موافق ہوئے تو اگلے سال اُدھر آنے کا ارادہ ہے۔ آپ نے بھی پاکستان آنے کو لکھا تھا۔ اس سلسلے میں کیا پروگرام ہے۔ جون ایلیا سے عالمی ڈائجسٹ کے لئے تاکید کر دی ہے ضرور پہونچے گا۔ رُونی اور سائرہ کو بے شمار دعائیں۔ نہ جانے آپ لوگوں سے کب ملاقات ہو۔ اب تو ہر روز یہ قصد ہوتا ہے کہ:۔

چل اے دل! سوئے شہرِ جاناں نہ چل
بصد شب روی ہائے مستانہ چل
یہی ہے تمنائے خواب و خمار
سوئے ارمن افسون و افسانہ چل
یہی ہے تقاضائے شعر و شباب
سوئے خاکِ مہتاب و میخانہ چل
بہ تمسیلِ منشورِ بے خانہ اُٹھ
بہ تجدیدِ پیمان و پیمانہ چل
مبارز طلب ہیں حوادث تو کیا؟
بہ جز صیقلِ کر ازم خوا ہا نہ چل
حمائتیں ہنگامہ آما تو ہوں
علم کھول کر فتح مندانہ چل

جو مقصودِ خاطر ہے تنہا روی
تو آزاد و تنہا و بیگانہ چل
جو تنہا روی کا سلیقہ نہ ہو
تو انجان راہوں میں تنہا نہ چل
اُٹھا دلق و کشکول و کاسہ اُٹھا
قلندر صفت چل فقیرانہ چل
دَف و چنگ و طاؤس و طنبور لے
بہ قانون شہ رود و شاہانہ چل
شترِ بانِ لیلیٰ کو زحمت نہ دے
رہِ شوق میں بے حجابانہ چل
ابھی منزلیں منزلوں تک نہیں
ابھی دُور ہے شہرِ جاناں نہ چل
ابھی حُسن کی خیمہ گاہیں کہاں؟
ابھی اور بے پرواہ و بیگانہ چل
ابھی شہرِ جاناں کی راہیں کہاں؟
ابھی اور بے گانہ بیگانہ چل
جبل در جبل دشت در دشت ابھی
جو انترہ گیسا، بے پروانہ چل
وہ نبتِ قبیلہ نہ ہو منتظر
ذرا تیز اے مسمومِ مستانہ چل
جو سلمائے صحرا نہ ہو مضطرب
رہِ دشت میں عاشقانہ چل
حریفوں کی چالوں سے غافل نہ ہو
بہ گلشن و وادیوں میں حریفانہ چل
غزالوں کی آبلویاں ہیں قریب
غزل خوانیاں کر غزالانہ چل
بہت اجنبیت ہے اس شہر میں
چل اے دل! سوئے شہرِ جانانہ چل
احساس کے سوا کیا عرض کروں۔

(انیس امروہوی) ۲۰ جون ۱۹۷۰ء

اپنے اسٹیشن کو صاف رکھیئے

- اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ صاف ستھرا ماحول ایک طرف کسی شخص کے کردار کا آئینہ دار ہوتا ہے اور دوسری طرف اس کردار کو نکھارتا ہے، صاف ستھرا گردوپیش خوشی اور مسرت بکھیرتا رہتا ہے
- ہم اپنے گھر صاف ستھرے رکھتے ہیں تو پھر ان جگہوں کو صاف شفاف کیوں نہ رکھیں جنہیں ہم سب استعمال کرتے ہیں
- ریلوے پلیٹ فارموں، ویٹنگ رُوموں سواری ڈبوں اور درحقیقت ان تمام جگہوں کو جہاں بڑی تعداد میں لوگ اکٹھے ہوتے ہیں، گردوپیش کو صاف شفاف رکھنا بہت ہی ضروری ہے۔

ریلوے نے صفائی مہم شروع کی ہے جس کے بہت اچھے نتائج نکلے ہیں۔ اب ریلوے صاف ستھرے نظر آتے ہیں۔ لیکن ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس سلسلے میں ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ ہم زیادہ صفائی کے لئے اپنی کوششوں کا سلسلہ جاری رکھیں گے۔

آپ بھی اس سلسلہ میں ریلوے کی مدد کر سکتے ہیں۔ آپ صرف اتنا خیال رکھیں کہ آپ کے آس پاس کی جگہ بالکل صاف شفاف حالت میں رہے، اس طرح اسٹیشن اور منسلکہ مقامات صاف ستھرے رہ سکتے ہیں۔ اور ہاں آپ ریلوے صفائی محکمہ کے کارکنوں کی خدمات سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں، وہ صرف آپ کی خدمت کے لیئے ہی رکھے گئے ہیں۔

آپ بھی ذرا خیال رکھئے کہ کوڑا کرکٹ آپ کے ہاتھ سے اِدھر اُدھر نہ بکھرنے پائے بلکہ کوڑا دان میں پھینکا جائے۔ آپ کا یہ معمولی سا کام ہمیں آپ کی بہتر خدمات کرنے میں کافی مدد دیتا ہے۔

ریلوے آپ کی پراپرٹی ہے اسے صاف شفاف رکھیئے

ناردرن ریلوے

نور علوی

اولیائے علامہ خاتم العروض حضرت سحر عشق آبادی مرحوم

اُستادی حضرت سحر عشق آبادی کی داخلی زندگی کے متعلق میری معلومات اتنی وسیع نہیں کہ ان پر کما حقہٗ روشنی ڈال سکوں۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ وہ میرٹھ کے ایک نہایت مشہور کا شستہ خاندان کے فرد تھے۔

حضرت عزیز لکھنوی کو اپنے جن تلامذہ پر ناز تھا حضرت سحر عشق آبادی بھی ان میں سے ایک تھے۔ علامہ عشق آبادی کی تمام عمر تحقیق علم عروض اور خدمتِ فن میں گزری۔ ان کی فنی معلومات اس قدر مکمل اور جامع تھیں کہ بڑے بڑے پہلوانانِ فن ان کا لوہا مانتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ علمِ عروض کا کوئی بھی راز ایسا نہ تھا جو ان سے پوشیدہ تھا۔

غالباً ۴۳، ۱۹۴۲ء کا ذکر ہے کہ حضرت مفتون شکوہ آبادی نے میری ایک غیر مسمط غزل جو صنعتِ متلون میں تھی۔ سحر صاحب کے یہاں بھیجی اور خط و کتابت کا سلسلہ قائم ہوا۔ ایک مقام پر زحافِ تشعیث زیرِ بحث آیا۔ اور مجھے علامہ کی عالمانہ اور مدلل بحث کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔ اس بحث میں عروض کے بہت سے راز (جن سے میں ناواقف تھا) کھلے اور میں باقاعدہ طور پر ان کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو گیا۔

علامہ مجھ سے کمال محبت کرتے تھے۔ اسی لئے اپنے خطوط میں مائی ڈیر سن۔ مائی ڈیر زار لکھا کرتے تھے۔

علامہ کے فنِ عروض پر کیا کیا احسان ہیں ان کو قلمبند کرنے کے لئے ایک دفتر چاہیئے۔ اس مختصری تحریر میں اُن کا احاطہ مشکل ہے۔ اُن پر میں قسط وار بحث کروں گا۔

علامہ کے مستند اور نادر مجموعہ کلام گلبانگ سحر کے صفحہ ۲۱ پر ایک غزل بعنوان "کیا کہا کیا" ہے یہ غزل صنعتِ متلون کی نہایت حسین غزل ہے۔ جو تفصیل یوں ہے ؎

۱۔ میرا کہا کیا ہوا ۔ میرا کیا کیا کیا
سامنے آکر مجھے ۔ دیکھ کے پردہ کیا

۲۔ وہ ہے حقیقت نظر ۔ کچھ نہ اسی کو خبر
جس سے ننگ ہے عشق پی ۔ پی کے نہ غفلت کیا

۳۔ حسن کے عالم میں جب ۔ عشق نے پرواز کی
مہر فلک سے سوا ۔ ذرہ کو اونچا کیا

۴۔ ہوش بھی بے خودی ۔ عشق کے اعجاز سے
گمشدگی نے مری ۔ راستہ پیدا کیا

۵۔ آپ ہی دل میں ذرا ۔ سوچیے انصاف سے
ظلم روا سحر پہ ۔ کیا نہ کیا ۔ کیا کیا

اس غزل کا ہر شعر مندرجہ ذیل بحور پر تقطیع ہو سکتا ہے۔

۱۔ رجز ۲۔ متقارب ۳۔ طویل ۴۔ بسیط ۵۔ منسرح

یہاں صرف غزل کا مطلع تقطیع کیا جاتا ہے۔ دوسرے اشعار بھی اسی طرح تقطیع کیے جا سکتے ہیں

۱۔ بحر رجز مثمن سالم کے ارکان :۔ مُس تَفْ عِلُن ، مُس تَفْ عِلُن ، مُس تَفْ عِلُن ، مُس تَفْ عِلُن۔

وزن مزاحف جس پر غزل تقطیع ہو سکتی ہے :۔ مُفْتَعِلُن (مطوی) فاعِلُن (مرفوع) مُفْتَعِلُن (مطوی) فاعِلُن (مرفوع) یعنی بحر رجز مثمن مطوی مرفوع مطوی مرفوع

تشریح :۔

مطوی ۔ وہ رکن جس پر زحاف طے کا عمل ہو۔

تعریف طے :۔ رکن سے چوتھے حرف کو ساکن کرنا بشرطیکہ وہ سبب خفیف کا ساکن ہو۔ مُس تَفْ عِلُن میں ف، چوتھا حرف ہے۔ اور سبب خفیف کا ساکن ہے۔ اس کے ساقط کرنے کے بعد مُس تِ عِلُن رہا جس کو مُفْتَعِلُن سے بدل لیا جاتا ہے۔

مرفوع :۔ وہ رکن جس پر زحاف رفع کا عمل ہوتا ہے۔

تعریف رفع :۔ جب رکن کے شروع میں دو سبب خفیف متوالی ہوں تو پہلے سبب خفیف کو ساقط کرنا مُس تَفْ عِلُن سے پہلا سبب خفیف ساقط کیا : تَفْ عِلُن رہا جس کو فاعِلُن سے بدل لیا گیا۔

(باقی آئندہ)

تقطیع

ن	فاعلن	مفتعلن	فاعلن
میر کہا	کا ہُوا	میر کہا	کا کیا
تم نے مج چا	ہا ہُوا	تم نے مج چا	ہا کیا

عـ۵ بحرِ متقارب مسدس سالم کے ارکان۔ فعولن فعولن فعولن
وزن مزاحف جس پر غزل تقطیع ہوسکتی ہے۔ فعلُ فعولن فعل (مضاعف)
اثرم سالم محذوف

تشریح :۔ اثرم :۔ وہ رکن جس پر زحاف ثرم کا عمل ہوا ہو۔
تعریف ثرم :۔ ثلم اور قبض کے اجتماع کو کہتے ہیں یعنی ثلم + قبض
• ثلم :۔ رکن اول کے فعولن سے "ف" ساقط کرنا "عولن" رہا جس کو فعْلن سے بدل لیا جاتا ہے
• قبض :۔ رکن کا پانچواں حرف ساقط کرنا بشرطیکہ وہ سببِ خفیف کا ساکن ہو۔ فعولن کا "ن" ساقط کیا۔ فعولُ رہا۔
یعنی زحاف قبض سے پانچواں حرف ساکن ساقط کیا "فعولُ" رہا "ف" ثلم سے ساقط کی "عولُ" رہا جس کو فعْلُ سے بدل لیا گیا۔
محذوف :۔ وہ رکن جس پر زحاف حذف کا عمل ہو۔
تعریف حذف :۔ رکن کے آخر سے سببِ خفیف ساقط کردینا فعولن سے "لن" ساقط کیا "فعو" رہا جس کو فعَل سے بدل لیا گیا۔
مضاعف :۔ دوچند کیا ہوا۔ یہ نصف مصرع کا دوچند ہوتا ہے۔
(نوٹ، شعر کے چار ٹکڑے کرنے کے بعد مضاعف وزن والے اشعار وزن عـ۵ چاروں سطروں میں لکھنا چاہئے۔ یعنی مسمط لکھنا چاہیے۔ اس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ شاعر عیب شکستِ ناروا سے بچ جاتا ہے نیز فعل ردیف و عروض کا رکن ہے۔ ہر مصرع کے دو ٹکڑے کرنے کے بعد فعل اپنے مقام پر قائم رہتا ہے۔

تقطیع

وزن عـ۵

فعل	فعولن	فعَل
میر	کہا کا	ہُوا
میر	کہا کا	کیا
تم نے	مج چاہا	ہُوا
تم نے	مج چاہا	کیا

عـ۳ بحرِ طویل مسدس سالم کے ارکان :۔ فعولن مفاعی لن مفاعی لن
وزن مزاحف جس پر غزل تقطیع ہوسکتی ہے۔ فعلُ مفاعیلُ فع (مضاعف)
تشریح :۔ اثرم مکفوف مجبوب مقطوع
مکفوف :۔ وہ رکن جس پر زحاف کف کا عمل ہو۔
تعریف کف :۔ رکن کے ساتویں حرف کو ساقط کرنا بشرطیکہ سبب خفیف کا ساکن ہو۔ مفاعی لن سے "ن" جو ساکن ہے ساقط کیا مفاعیلُ رہا۔
مجبوب مقطوع :۔ وہ رکن جس پر زحاف جب اور زحاف قطع کا عمل ہوا ہو۔
تعریف جب :۔ حذف سببین مرتین کو کہتے ہیں۔ مفاعی لن سے دونوں سبب خفیف ساقط کئے تو مفا (وتد مجموع) رہا۔ اس پر زحاف قطع کا عمل کیا۔
تعریف قطع :۔ آخری رکن کے وتد مجموع سے آخری حرف ساقط کرنا۔ اور دوسرے متحرک حرف کو ساکن کرنا۔ مفا سے "ا" ساقط کیا اور "ف" کو ساکن کیا "مف" رہا جس کو فع سے بدل لیا گیا۔
مضاعف صورت میں یہ دونوں زحاف اپنے مقام پر رہے۔
تقطیع :۔

فعلُ	مفاعیلُ	فع
میر	کہا کا ہُ	وا
میر	کیا کا ک	یا
تم نے	مج چا ہا ہُ	وا
تم نے	مج چا ہا ک	یا

(نوٹ، بحرِ طویل مسدس میں بہت کم اشعار ملتے ہیں۔ اور یہ تمام غزل بحرِ طویل میں جلوہ گر ہے
عـ۴ بحرِ بسیط مثمن کے ارکان :۔ مس تف علن فاعلن مس تف علن فاعلن۔
وزن جس پر غزل تقطیع ہوسکتی ہے

مفتعلن	فاعلن	مفتعلن	فاعلن
مطوی	سالم	مطوی	سالم

تقطیع وزن عـ۵ کے مطابق۔

بحرمنسرح مجزو :۔ مس تف علن مفعولاتُ
وزن مزاحف جس سے غزل تقطیع ہوسکتی ہے۔

(مزاحف)	فاعلن	مفتعلن
	مطوی مکشوف	مطوی

شرح :۔
وف :۔ وہ رکن جس پر زحاف کشف کا عمل ہوا ہو۔
ف :۔ آخری رکن کے آخر میں اگر وتد مفروق ہو تو اس
مفروق کے دوسرے متحرک حرف کو ساقط کرنا مفعُولات
وں مف عُ لاتُ رہا۔ زحاف کشف سے "تا" سے
ب کو ساقط کیا۔ مف عُ لا رہا جس کو فاع لن سے بدل
یا۔

تقطیع

ناث

فاع لن		مفتعلن
ہوا	کا	میر کہا
کیا	کا	میر کہا
ہوا	ہا	تم نے چا
کیا	ہا	تم نے چا

ن، فاعلن . مطوی مکشوف عروض وضرب کے
مخصوص ہے۔ اسی لئے ہر مصرع کے دو ٹکڑے کئے
کہ فاعلن اپنے مقام پر رہے۔
اس غزل کا مطلع اور تیسرا شعر ذیل کی بحور پر تقطیع ہوسکتے
ہیں ۱۔ رجز ۲ رمل ۳ متقارب ۴ طویل ۵ مدید
بسیط ۷ جدید ۸ منسرح ۹ مقتضب ۱۰ مجتث ۱۱
سریع ۱۲ حمید ۱۳ سلیم (آئندہ)

آزادی کی عید

حضور شہسوانی

کس طرح اس کو اعتبار آئے
عید بے شک خوشی کا ہے تیوہار
عید کے دن بھی جن کی آنکھوں سے
بہتی رہتی ہو آنسوؤں کی دھار
صرف مجھ تک ہی یہ نہیں محدود
اور بھی سیکڑوں ہیں مجھ جیسے
جن کے تن پر نہیں کوئی کپڑا
جن کی جیبوں سے دُور ہیں پیسے
جن کی آنکھیں ہیں آج بھی پُرآب
پیٹ جن کے ہیں آج بھی خالی
جن کے اجسام ضعف سے ہیں نڈھال
ہیں سوالی جو آج کے دن بھی
جن کے چہرے نچے نچے سے ہیں
جن کے ہونٹوں پہ سسکیاں ہیں آج
جن کے لب پر ہنسی کا نام نہیں
جن کے دل پر ہے آج غم کا راج
دَم خوشی کا اسی نے گھونٹا ہے
غم جگائے ہوئے اسی کے ہیں
جس کو دیتے ہو نام آزادی
گُل کھلائے ہوئے اسی کے ہیں

غزل

نواب آبلہ۔ جاپان

تصورات کی حد سے گزر گئے ہیں ہم
تمہیں جو اب ملے گا پکار کر دیکھو
وفا کی راہ میں خود کو مٹا دیا یکسر
چمک رہا ہے ہر اک ذرّہ جگنو کی طرح
ہماری آرزو تم کو ڈھونڈنے کی تھی

یہ کیسے موڑ پہ آکر ٹھہر گئے ہیں ہم
غبار بن کے فضا میں بکھر گئے ہیں ہم
تمہارا نام زمانے میں کر گئے ہیں ہم
یہ کس زمین پر آخر اتر گئے ہیں ہم
تمہیں ڈھونڈنے کے بجائے خود بھی کھو گئے ہیں ہم

مثنوی مالوہ

(مسلسل)

نازک الہ آبادی

مہاداجی سردار تھا سیندھیا / کہ جس سے ارادہ یہ ظاہر کیا
تھا ہلکر بھی سردار ملہار راؤ / ہوا حکم مغلوں کو گھر سے بھگاؤ
رگھوجی تھا سردار ایک بھوسلا / یہی حکم اس پر بھی صادر ہوا
مصمم ارادہ جو طے ہو گیا / بڑھا پیشوا فوج کا حوصلہ
ستارہ سے سردار تینوں اٹھے / غرض سوئے دلی سبھی بڑھ چلے
دکن سے اڑا لشکرِ پیشوا / شہنشاہ دلی سے لڑنے چلا
غرض راہ کے خاندیش و بہار / علاقے ہوئے پیشوا کے شمار
مہاداجی سندھیہ و ملہار راؤ / بڑھے سوئے دلی لگانے پڑاؤ
الگ ہو گیا راہ میں بھوسلا / سوئے ناگ پور بن کے آندھی اٹھا
ادھر ہلکر و سیندھیا جو بڑھے / تو آکر لب نربدا وہ رکے
جہاں پر انھیں غم یہی تھا سوار / کریں نربدا کو بھلا کیسے پار

مدد ان کو دے کر غرض نند لال
کیا پار لشکر دکھایا کمال

مالوا میں پیشوائی فوجوں کا داخلہ

بڑھی فوج وہ مالوا آ گئی / شہنشاہیت جس سے تھرا گئی
غرض فوج ترلا پہونچ کر رکی / جہاں پر کہ فوج مغل آ ڈٹی
لگے مورچے جنگ ہونے لگی / فلک ہنس پڑا دھرتی رونے لگی
چڑھا شاہی فوجوں پہ تھا جو خمار / دیا مرہٹوں نے وہ سر سے اتار
غرض ہار کی آ گئی جب گھڑی / تو فوج مغل میں تھی بھگدڑ پڑی

ہے سترہ سو اکتیس کا ماجرا (۱۷۳۱ء)
ہوا جیت پہ سرخرو پیشوا

۱۔ راؤ صاحب نند لال منڈلوی۔ جنھوں نے اندور نگر کی داغ بیل ڈالی تھی۔ ۲۔ ۲۹.۱۱.۱۷۲۸ (ترلا) مقام پر پیشوا ان اور مغل فوجوں میں جنگ ہوئی۔ ۳۔ مہاداجی سیندھیا جو آگے چل کر گوالیار کا راجہ بنا ۴۔ ملہار راؤ ہلکر جو آگے چل کر اندور کا راجہ بنا ۵۔ رگھوجی راؤ بھوسلا ناگپور کا راجہ بنا۔ اور یہ تینوں ہی پیشوا فوج کے مشہور سردار تھے۔

دیال سنگھ کالج

کرنال

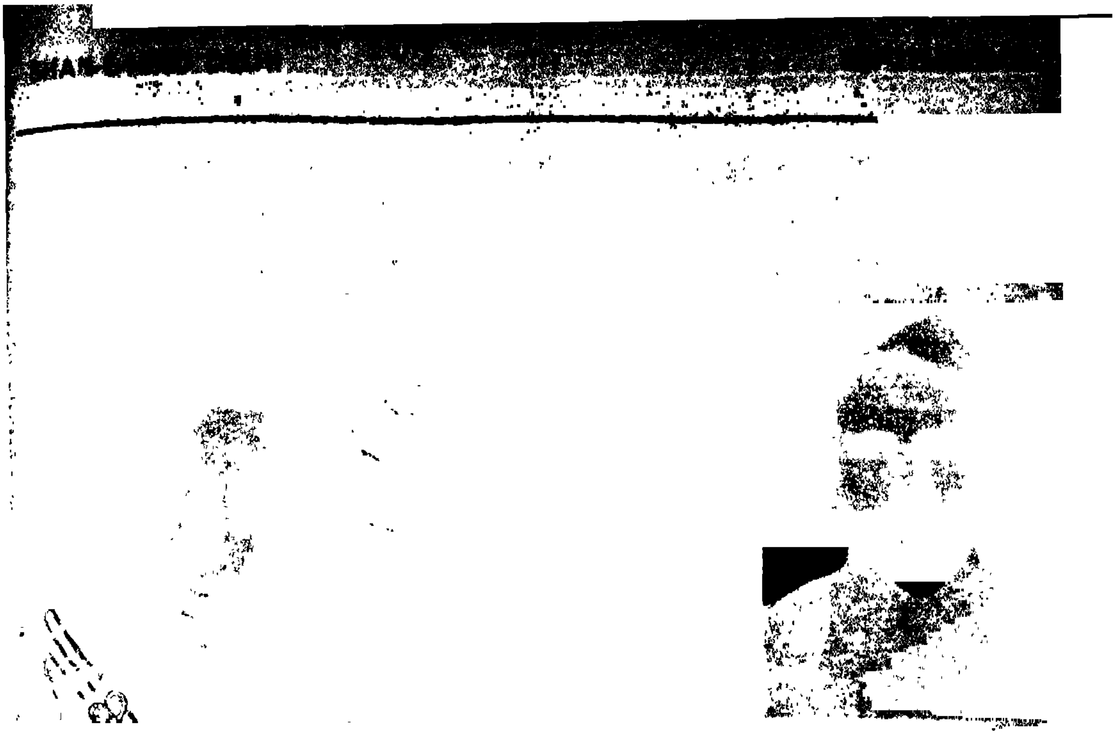
مشترکہ پنجاب میں نصف صدی اور کرنال (ہریانہ) میں چوتھائی صدی سے اپنی شاندار روایات کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ دیال سنگھ کالج کرنال میں طلبا کو ہمیشہ ڈسپلن قومی یکجہتی اور ملک کی ہر طرح سے حفاظت کرنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ اور انھیں ایک اچھا شہری اور ایک ذمّہ دار ہندوستانی بنانے کی کوشش کی جاتی ہے

اہلِ کرنال اور گردو نواح کے طلبار کے لئے دیال سنگھ کالج ایک نعمت ہے۔ اپنے بچوں کو اگر آپ اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ساتھ ایک اچھا شہری بنانا چاہتے ہیں تو دیال سنگھ کالج کرنال کی خدمات سے فائدہ اٹھایئے۔

دیال سنگھ کالج کرنال (ہریانہ)

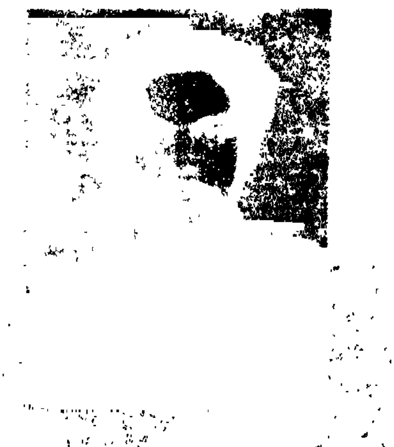
ارا کین منتظمہ کمیٹی





Younus "Makhmoor"

Hakim "Shabbeer" Kanpuri



Quazi Tanver Bhind

ٹیلیفون نمبر ۲۶۸۸۹۵ | رجسٹرار آف نیوز پیپرز آف انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۶۲۲/۵۷ | رجسٹرڈ نمبر ۵۳۰۰

ایڈیٹر سرور تونسوی

ماہنامہ

شانِ ہند دہلی

(عید مبارک ایڈیشن)

قیمت سالانہ
پندرہ روپے
فی پرچہ
ایک روپے پچاس پیسے

لد نمبر ۱۳ | ستمبر سنہ ۱۹۷۸ء | شمارہ نمبر ۹

عید مبارک

خوشیوں ، ہندو مسلم اتحاد ۔ قومی یک جہتی ۔ اور تزکیہ نفس کے اس مبارک قومی تہوار پر ہم ملک
ا ہیں دنیا بھر کے مسلمانوں کو دلی مبارک باد پیش کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ عید مبارک کا یہ قومی تہوار
فرد کے لئے واقعی مبارک ثابت ہو ۔
جنتا پارٹی اور جنتا پارٹی حکومت نے جس صدق دلی سے مسلمانوں کے مذہبی تہواروں کو قومی یکجہتی کا مظہر تسلیم کیا وہ ایک مبارک فال ہے سارے ملک میں عوام
حکومت کے ارکان مل کر عید جشن منانے کے پروگرام ترتیب دے رہے ہیں ۔ راجستھان کے گورنر اور چیف منسٹر بھی محلہ جالور پور کے
مارہ عید ملن ۹ ستمبر میں شریک ہونا منظور فرمایا ہے ضرورت ہے کہ ایک دوسرے فرقوں کے قومی تہواروں کو مشترکہ طور پر منایا جائے اور ان
اروں کے پردے میں انسانی افکار کے جو ارتقا مضمر ہیں اُن پر ہر کہہ و مہ عمل پذیر ہو ۔ عید الفطر ایک ایسا تیوہار ہے ۔ اور تزکیہ نفس کا
لہ تہوار ہے جس سے کسی بھی فکر کا کوئی بھی فرد کئی بہترین باتیں سیکھ سکتا ہے ۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر ہندوستانی کو یہ توفیق دے کہ
س مبارک تہوار پر نیک اور وطن پرست ، نیز ہمسایہ دوست بنے ۔
ہم صدق دل سے عید مبارک پیش کرتے ہیں ۔ (ادارہ)

ش سرور تونسوی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے ... پریس ... جامع مسجد دہلی ... سے چھپوا کر دفتر شانِ ہند ... سے شائع کیا

افکار و واقعات

ہندوستان میں بھٹو کی معنوی اولاد

کرناٹک سے ایک ہفت روزہ شائع ہوتا ہے
ایمرجنسی سے پہلے اس اخبار کی یہ حالت تھی کہ ہندوستانی مسلمان اسے چھپ چھپ کر پڑھتے تھے۔ اور یہ بلیک میں فروخت ہوتا تھا۔ جیسے کسی ملک کے خلاف کوئی باغی گروہ اپنی کارگزاریوں کی رپورٹ کا بلیٹن یا سائیکلوسٹائل شدہ شکل میں چوری چھپے اپنے ہمدردوں تک پہنچاتا ہے اور یہ بلیٹن جس انداز میں ہاتھوں ہاتھ چوری چوری پڑھا جاتا ہے۔ بعین اسی طرح یہ اخبار چھپا چھپا کر پانچ پانچ روپیہ فی کاپی بلیک میں خرید کر پڑھا جاتا تھا۔ اس ہفت روزہ کی مقبولیت محض اس وجہ سے تھی کہ اس میں چھ چھ کالمی سرخیاں اس انداز سے دی جاتی تھیں جیسے یہ اخبار ہندوستان سے نہیں پاکستان سے شائع ہو کر سمگل ہو کر یہاں آیا ہے۔ مسلمانوں کی انتہائی بے وقوفی۔ مذہبی امور میں بغیر سوچے سمجھے برانگیختہ ہو جانا اور دلی طور پر پاکستان سے ہمدردانہ رویہ رکھنے کے باعث اس اخبار کو نوازا جاتا تھا۔ اور مسلم عوام یہ سمجھتے تھے کہ یہ اخبار ہندوستانی مسلمانوں کے لئے مژدۂ نجات لے کر آیا ہے۔

ایمرجنسی میں اس اخبار نے بھی اپنے رویہ میں تبدیلی کر لی۔ کیونکہ اندرا جی کے ڈنڈے سے میسا کی مار اس اخبار کا ایڈیٹر سہنے کی ہمت ہی نہیں رکھتا تھا۔ کرناٹک میں رہ کر ہندوستانی مسلمانوں کو پاکستان سے متعلق دل خوش کن جھوٹی اور من گھڑت خبریں دینے والے اس اخبار کے ایڈیٹر کو دہلی میں ہونے ترکمان گیٹ پر ہونے مسلمانوں پر مظالم کی کوئی خبر نہ لگ سکی اور اس نے بھولوں بھی دلی کے مسلمانوں سے ہمدردی کا ایک لفظ تک شائع نہ کیا کیونکہ مسلمانوں کے ہزاروں مکانات گرائے جانے سے اس کو کوئی گزند نہیں پہنچ رہا تھا۔ اس لئے کہ یہ اپنے لئے ایک عالیشان نشیمن مسلمانوں کو الو بنا کر تعمیر کرا چکا ہے جو اس کاتب ایڈیٹر کو ساری عمر کتابت کے جوہر دکھانے کے باوجود نصیب نہ ہوتا۔ اسے ترکمان گیٹ کے مسلمانوں کی عورتوں، بہنوں اور بچیوں کی بے حرمتی پر کوئی افسوس نہیں تھا کیونکہ اس کی اپنی بیوی، بہن اور بچی اس قلعہ نما نشیمن میں بیٹھی چین سے دل بہلا رہی تھیں۔ اسے اُن مسلمان نوجوانوں، کنوارے کمسن مردوں اور بوڑھوں سے کوئی ہمدردی نہیں تھی جن کو نسبندی کے لئے جبراً ٹرکوں میں بھر کر لے جایا جاتا تھا۔ اور بیچارے ماؤں کو پولیس کے ڈر سے گنے کے کھیتوں میں پناہ لیتے تھے۔ اس لئے کہ اسے اپنی نسبندی کے ساتھ ساتھ انہیں نئے جھگی جھونپڑی میں پناہ لینی پڑتی۔ اس اخبار کے ایڈیٹر کی اکڑ کا یہ عالم تھا کہ جیسے مسلمانان ہند کا یہ واحد نجات دہندہ ہے۔

مگر ہندوستانی مسلمانو! اپنے خدا کو حاضر ناظر جان کر کہو کہ اس اخبار نے تمہارا کیا بھلا کیا۔ سوائے اس کے کہ تمہارے اندر جو پاکستانی ہمزاد چھپا ہوا ہے اُسے تسکین ہوئی اور یہی پاکستانی ہمزاد تمہیں ہر اس قومی دھارے سے الگ رکھے ہوئے ہے جس سے ہم کنار ہو کر تم ایک زندہ قوم ہو سکتے ہو۔ تمہارے نوجوانوں میں کسی قسم کی کوئی کمی نہیں۔ وہ زندگی کے ہر شعبہ میں آگے آ سکتے ہیں۔ ہر قومی دھارے میں وہ اپنی قابلیت کے باعث فوقیت پا سکتے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ آپ نے کبھی یہ سوچا ہی نہیں کہ پاکستان تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔ تمہیں اسی ہندوستان میں رہنا ہے یہیں مرنا ہے یہیں تمہارے آبا و اجداد دفن ہیں تمہارے دینی بزرگوں کے مزارات آج بھی رُشد و ہدایت کی ... اس سرزمین پر پھیلا رہے ہیں۔ تمہاری تو یہ دعا ہونی چاہئے کہ پاکستان اپنی جگہ پھلے پھولے، ترقی کرے۔ اور اس ملک کے عوام خوش و خرم رہیں۔ اور تم اور تمہارا ملک بھی خوشحال ہو اور تمہاری تمام ہمدردیاں اپنے ملک کے ساتھ وابستہ رہیں۔ ملک تمہیں اپنے ماں باپ بھائی سے ملنے کے لئے

سال تک ویزا تک نہیں دیا اس کے ساتھ اگر آپ اپنی کچھ تمنائیں وابستہ رکھتے ہیں تو یہ سراسر نادانی ہے۔

جونہی ایمرجنسی ہٹی تو آنگ کے اس اخبار نے پھر پرپرزے نکال لئے اگر معاملہ یہیں تک رہتا تو بھی غنیمت تھا مگر تعجب کی بات یہ ہے کہ دہلی سے دو ہفت روزہ رسالے نے اس اخبار کو بھی کوسوں پیچھے چھوڑ کر بڑے طمطراق سے ہندوستانی مسلمانوں کو الو بنانے کی نئی نئی تراکیب عمل میں لانی شروع کیں ہیں۔ یہ دونوں اخبارات فوٹو آفسٹ پر نہایت خوبصورتی کے ساتھ شائع ہو رہے ہیں۔ مگر ان کے سرخ حاشیے اس کی غمازی کرجاتے ہیں کہ اس تماشہ کے پیچھے کون کون سی طاقتیں کام کر رہی ہیں ۔ ان اخبارات میں پاکستان کے سابق وزیراعظم بھٹو کے حق میں جو پروپیگنڈا کیا جارہا ہے۔ اور پاکستان کی موجودہ حکومت کے خلاف جس انداز سے لکھا جارہا ہے اس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ ہندوستان میں بھٹو کی معنوی اولاد موجود ہے اور اس کی پشت پناہی کوئی ایسی طاقتیں کر رہی ہیں جو پاکستان میں افراتفری پھیلانا چاہتی ہیں اور ہندوستانی مسلمانوں کو بھی بھٹو کی ہمدردی کے پردے میں یہاں کی حکومت کے خلاف کرنا چاہتی ہیں۔ ان دونوں اخبارات کے کارکنان بھٹو صاحب کی اپنی صاحبزادی اور صاحبزادے کے مقابلہ میں زیادہ اصلی اولاد ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ حالانکہ یہ حضرات اس سے بے خبر نہیں ہیں کہ ہماری حکومت یہ بارہا اعلان کرچکی ہے کہ وہ ہر ملک خصوصاً ہمسایہ ممالک سے زیادہ سے زیادہ بہتر تعلقات قائم کرنا چاہتی ہے۔ اور ہماری حکومت کو اس سے کوئی غرض نہیں کہ کسی ملک میں کون سی حکومت برسراقتدار ہے کیونکہ ہمارا یہ نظریہ ہمیشہ رہا ہے کہ ہم کسی دوسرے ملک کے اندرونی معاملات میں دخل دینے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ مگر اپنی حکومت کے اس کھلے نظریہ کی موجودگی میں یہ دونوں اخبارات بھٹو کی حمایت میں پاکستانی حکومت کے خلاف جو کچھ لکھ رہے ہیں اسے ہندوستانی حکومت خاموشی سے برداشت کرے تو اس کا صاف مطلب ہے کہ ہماری حکومت محض زبانی دعویٰ کرتی ہے ورنہ حکومت کے سربراہوں سے ہم یہ دریافت کرتے ہیں کہ وہ کون سی وجوہات ہیں کہ ان دونوں اخبارات کے منہ میں لگام دینے کی ضرورت نہیں سمجھی جارہی ہے۔ بھٹو صاحب بے گناہ ہیں یا گنہگار ہیں اس کا فیصلہ پاکستان کی عدالت عالیہ کرے گی ان اخبارات کے ایڈیٹروں کی اتنی بھی جرات نہیں کہ یہ پاکستانی حدود میں بغیر پاسپورٹ اور ویزا کے قدم بھی رکھ سکیں تو پھر ہندوستانی مسلمان ہی بتائیں کہ یہ چھٹی مار کس طرح بھٹو کو اپنی مرضی کے مطابق دوبارہ پاکستان کی وزارت عظمیٰ دلا سکتے ہیں۔ جبکہ ہندوستانی مسلمانوں میں سوچنے سمجھنے کی اتنی بھی سکت باقی نہیں رہی کہ انھیں الو بنا ان اخبارات کے مالکان اپنے عیش و عشرت میں اضافہ کر رہے ہیں۔ بھٹو کی حمایت تو فخر و قدر کی بات ہے۔ اس وقت یہ اخبار نویس کہاں تھے جب ان کے دفاتر سے چند قدموں کے فاصلے پر اور ان کی عالیشان رہائش گاہوں سے تھوڑے ہی فاصلے پر ترکمان گیٹ میں مسلمان کنواری لڑکیوں کی بے حرمتی ہو رہی تھی۔ ہندوستانی مسلمانو! اسے مت بھولو کہ جب ترکمان گیٹ پر گولی چل رہی تھی اور ترکمان گیٹ کے مسلمانوں کی بچیوں اور مستورات کی بے حرمتی ہو رہی تھی تو اس وقت ان اخبارات میں سے ایک اخبار کا مالک دہلی گیٹ سے باہر "چکن کارنر" میں بیٹھا تندوری مرغ کے ساتھ جام شراب لنڈھا رہا تھا اور اسی اخبار کا ایڈیٹر اپنے مکان میں شراب کے نشہ میں مدہوش پڑا تھا۔ اور دوسرے اخبار کے مالک کے صاحبزادے ایک حسینہ کو کار میں لئے کار میں ہی شراب نوشی کا لطف اٹھا رہے تھے۔ کیا ہندوستانی مسلمانوں کی رگ حمیت اس قدر مذہب آلود اور پاکستان نواز ہوگئی ہے کہ ان شرابی اور بدکردار اخبار نویسوں کی چالوں میں آکر ان اخبارات کی سرپرستی کرتے ہوئے انہیں ہاتھوں ہاتھ خرید کر اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی سے ان لوگوں کی شراب نوشی اور حرام کاری کا انتظام کرتی ہے۔

ہندوستانی مسلمانو! اپنی آنکھیں کھولو، اپنے جھوٹے ہمدردوں کو جا بجا در بدر کرو تو تمہیں پتہ چلے گا کہ تم کس کس انداز سے الو بنایا جارہا ہے۔ کیا ہندوستان کے کسی بھی مسلمان میں یا ان تینوں اخبارات کے مالکان کارکنان میں سے کسی میں یہ جرات ہے کہ بھٹو کی پھانسی کی سزا کو بدلوا سکے۔ یا پاکستان کی موجودہ حکومت کو بدلوا کر بھٹو کو پھر سے برسراقتدار لا سکے۔ اگر یہ سب باتیں

یقیناً تمہاری دسترس سے باہر ہیں تو پھر تم ان اخبارات کی تحریروں کو پڑھ کر خوش کیوں ہوتے ہو۔ تمہارا فرض تو یہ ہے کہ حکومت سے کہو کہ ان اخبارات پر یہ پابندی لگائی جائے کہ دوسرے ممالک کے بارے میں یہ اپنی حکومت کی خارجہ پالیسی کے خلاف بکواس نہ کر سکیں۔

مسلمانو تم دہلی سے دور بیٹھے ان اخبارات کے کارکنان کو اپنا۔ جیتوں کا اور نہ جانے کس کس کا نجات دہندہ سمجھ رہے ہو حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ تمہیں بیوقوف بنا کر یہ لوگ اپنی شراب اور عیاشی کا سامان مہیا کر رہے ہیں اور نہ جانے کس کس خفیہ طاقت کے بل بوتے پر یہ ایسا کھیل کھیل رہے ہیں اے خدا ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنے دوستوں اور دشمنوں کے پرکھنے کی عقل عطا کر۔ (آمین!)

تیرہویں قوم "اُردو کے شعرا"

ایک مذہبی کتاب میں نظر سے گزرا کہ اللہ میاں نے روئے زمین پر جتنے بھی انسان پیدا کئے ہیں وہ ابتدائی طور پر بارہ قوموں سے تعلق رکھتے ہیں یہ دوسری بات ہے کہ بعد میں کئی قومیں اور سیکڑوں فرقے بنتے چلے گئے۔ ہمارے خیال میں اس کتاب کے مصنف نے بھول کی ہے، دراصل اللہ میاں نے بارہ نہیں تیرہ قوموں کو پیدا کیا۔ اور یہ تیرھویں قوم ہے "اُردو کے شعرا" موجودہ دور میں یہ ایسی قوم ہے کہ جس کا کوئی ایمان دھرم نہیں۔ دھوبی، نائی، کمہار، تیلی، کنجر، طوائف، ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، پارسی، جس کا دل چاہے اس قوم میں شامل ہو جاتا ہے۔ اور موجودہ دور میں تو اس قوم نے اپنا شیوہ بنا لیا ہے کہ ہر اس فرد کو شریک کر لیا جائے جو دنیا میں اور کوئی کام نہ کر سکتا ہو بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ اس قوم کے اکثر و بیشتر افراد کا خاندانی پیشہ ہی کر رہ گیا ہے۔ کوئی بگڑا ہوا قوال۔ ایسی طوائف جس کا دھندا نہ چل سکتا ہو، ایسی کالی کلوٹی جسے مالدار گاہک تلاش کرنے کے لئے ٹھگ بازی کا چکر لگانا ہو۔ ایسے گلے باز جو گلے کے زور پر دوسروں کے عطا کردہ اشعار اچھی لے میں پڑھ سکیں اس قوم میں بغیر کسی رکاوٹ کے شامل ہو سکتا ہے۔ جتنا کم تعلیم یافتہ

بلکہ اُردو سے نا واقف ہوگا اتنا ہی بڑا وہ شاعر سمجھا جائے گا۔ اور منتظمین مشاعرہ اسے دعوت بھجوانا اپنی اُردو دانی کا سکہ بٹھانے کے لئے ضروری سمجھیں گے۔ اور جب منتظمین مشاعرہ کو یہ پتہ چل جائے کہ کوئی شاعرہ خوبصورت ہے اور قابل عشق بھی ہے تو پھر تو اپنی بیویوں کے زیورات فروخت کر کے بھی مشاعرہ میں اس شاعرہ کو بلوائیں گے۔ خواہ منہ میں ایک مسکراہٹ کے سوا کچھ بھی نہ بول سکے۔

اس قوم میں ایسے شعرا بہت ملیں گے جو شروع شروع میں کسی مشاعرے میں پڑھنے کے لئے ترستے تھے۔ اور اگر کسی کی سفارش سے انھیں ایک دو موقعے ایسے مل گئے اور انہوں نے اپنے بل بوتے پر کچھ کامیابی حاصل کر لی تو پھر وہ اپنا یہ حق سمجھتے ہیں کہ دوسرے شریف قسم کے اچھے شعرا کی بے عزتی کریں کیونکہ یہ خود شریف نہیں ہوتے اس لئے کسی دوسرے شریف کو برداشت نہیں کر سکتے۔ ایسی ہی مثال پچھلے دنوں آگرہ کے مشاعرہ تاج محل میں دیکھنے میں آئی۔

عالم فتحپوری اس وقت اس تیرہویں قوم کے جانے پہچانے فرد ہیں۔ قریباً بیس سال ہوئے تو انہوں نے ایڈیٹر شان ہند سے درخواست کی کہ انہیں لال قلعہ مشاعرہ میں پڑھوایا جائے۔ حضرت احسن لکھنوی لال قلعہ مشاعرہ کمیٹی کے جنرل سیکریٹری تھے۔ ایڈیٹر شان ہند نے انہیں فون کیا اور کہا کہ عالم صاحب اچھے شاعر ہیں۔ اور لال قلعہ کے مشاعرہ میں اس مرتبہ اگر اس نئے شاعر کو بھی بلوا لیا جائے تو یہ میری ذمہ داری ہے کہ سامعین انھیں پسند کریں گے۔ احسن صاحب بڑے اصول پرست، نیک نیت، اور کسی کی سفارش ماننے والے نہیں ہیں۔ انہوں نے صاف الفاظ میں فرمایا کہ سرور صاحب شعرا کا انتخاب ہو چکا ہے بلکہ دعوت نامے بھی جا چکے ہیں۔ اب قطعاً گنجائش نہیں کہ کسی شاعر کا اضافہ کیا جائے خواہ وہ عالم فتحپوری ہو یا فراق گورکھپوری۔ مگر احسن صاحب دل سے یہ اعتراف کرتے تھے کہ سرور کسی کی سفارش یونہی نہیں کر سکتے لہٰذا انہوں نے یہ وعدہ فرما لیا کہ اگر کسی شاعر نے شرکت سے معذوری کی تو میں مشاعرہ کمیٹی میں عالم صاحب کا نام رکھوں گا۔

لال قلعے کا مشاعرہ جس میں شرکت کے لئے شعر حضرات وغیرہ کلکتہ پریزیڈنٹ آف انڈیا تک کی سفارشیں کراتے تھے کون ایسا شاعر ہو سکتا تھا جو اس میں شرکت سے معذوری کرتا خواہ وہ بستر مرگ پر ہی کیوں نہ پڑا ہوتا۔ جب مشاعرے میں دو دن رہ گئے تو آسیؔ صاحب نے ایڈیٹر شان ہند کو بلوایا اور فرمایا کہ عالمؔ صاحب کی شرکت ایک ہی شرط پر ہو سکتی ہے کہ مقامی شعرا میں آپ کی بیوی روحیؔ دہلوی کا نام بھی ہے۔ اگر آپ چاہیں تو روحیؔ کی جگہ عالمؔ صاحب کا نام رکھوا دیجئے۔ بطور معاوضہ انہیں پچیس روپیہ ہی ملے گا۔ جو کہ مقامی شعرا کو ٹیکسی کرایہ کے نام پر دیا جاتا ہے۔ راقم الحروف نے آسیؔ صاحب کی یہ شرط فوراً منظور کرلی اور عالمؔ صاحب کو بذریعہ فونوگرام اطلاع دے دی گئی کہ آپ لال قلعہ مشاعرہ میں مدعو ہیں۔ اور آپ کے قیام و طعام کا انتظام ایڈیٹر شان ہند کے ہاں ہے۔

مشاعرے والے دن عالمؔ صاحب مع دو بیٹوں (ان دونوں عالمؔ صاحب کو دو ہی شوق تھے شراب اور بیٹوں کی صحبت) تشریف لے آئے۔ اور انہیں تمام صورت حال سے آگاہ کر دیا گیا۔ عالمؔ صاحب نے رسمی طور پر شکریہ ادا کیا اور رات کو ہم سب مشاعرہ میں گئے۔ وہاں عالمؔ صاحب کو خدا نے وہ کامیابی دی کہ ایک ہی رات میں عالمؔ فتحپوری آگرہ کی بجائے سارے ہندوستان کا شاعر ہو گیا۔ آسیؔ صاحب نے ایڈیٹر شان ہند کو بلا کر سٹیج پر ہی کہا کہ ایک مقامی شاعر تشریف نہیں لاسکے لہٰذا ان کے پچیس روپے بھی عالمؔ صاحب کو دیا منظور کر دیئے گئے ہیں۔ سٹیج پر بیٹھے بیٹھے عالمؔ صاحب کو جناب دھرم گوپال گپتا وفاؔ اور جناب جیجنو مل صاحب نے اپنے اپنے مشاعرے کے لئے بھی مدعو کر لیا۔ اور عالمؔ صاحب کا طوطی بولنے لگا۔

مگر کس قدر عبرت کا مقام ہے کہ یہی عالمؔ صاحب اب اس تیرہویں قوم کے معزز ہونے کی حیثیت میں دوسرے شریف شعرا کی بے عزتی کرنے سے بھی نہیں کتراتے تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ اس مرتبہ تاج محل کے عرس میں قوالیوں کے ساتھ ساتھ ایک محفل مشاعرہ بھی ۲۷ جولائی کو منعقد کی گئی جس کی صدارت جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ نے فرمائی اور نقیب الشعرا جناب عالمؔ فتحپوری تھے اس مشاعرہ میں مشاعرہ کے انتظامیہ کے ایک معزز رکن کی سفارش سے بھی پانچ ملک گیر شہرت کے شاعروں کو مدعو کیا گیا تھا۔ مگر عالمؔ صاحب نے اپنے خبث باطن کی بنا پر اس تیرہویں قوم کے معزز فرد ہونے کے ناطے ان پانچوں کانپوری شعرا کو نظر انداز کر دیا۔ اور انہیں اس وقت کلام سنانے کے لئے پکارا جب کہ سامعین میں کوئی بھی نہیں رہا تھا۔ صرف دریاں اور دیگر سامان اٹھانے والے ہی رہ گئے تھے۔ عالمؔ صاحب کا یہ رویہ بلاشک و شبہ نہ صرف غیر ذمہ دارانہ ہے بلکہ کمینہ پن کا مظہر بھی ہے جس پر جس قدر بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔ مگر اس تیرہویں قوم کے ایسے منفرد رکن سے کسی بہتر سلوک کی توقع رکھنا اپنے آپ کو دھوکہ دینے کے مترادف ہے۔

مشاعرہ جشنِ آزادی ٹونک میں بدمزگی

ٹونک (راجستھان) میں ۱۴/اگست کی رات کو جشن آزادی کے سلسلے میں ایک کل ہند مشاعرہ منعقد ہوا تھا کہ جب نور اندوری غزل سرا تھے تو یکایک ایک کار مشاعرہ کے پنڈال کے پاس آکر رکی۔ کہا جاتا ہے کہ دہلی کی ایک نوعمر حسین شاعرہ مع اپنی والدہ محترمہ، راہی شہابی صاحب کے برادر خورد اور جے پور کے ایک نکھٹو پتی سیٹھ نوجوان جوہری اس کار سے اترے اور سامعین میں سٹیج کے آگے بیٹھ گئے۔ اس شاعرہ کے حسن و جمال کے قصے اہل ٹونک پہلے سن چکے تھے۔ لہٰذا مشاعرہ میں کھلبلی مچ گئی اور سامعین کا مطالبہ تھا کہ شاعرہ کلام سنائیں۔ سامعین نے نور اندوری، وسیم بریلوی اور انا اور ٹونک میں ہر کہ و مہ کی دلپسند شاعرہ تسنیم میرٹھی تک کو نہ سنا۔ اور وہ بضد تھے کہ پہلے اس شاعرہ کو سنیں گے اور اس شاعرہ کا کہنا تھا کہ میں مشاعرہ میں مدعو نہیں کیسے کلام سناؤں۔ میں تو صرف مشاعرہ سننے کے لئے آئی ہوں۔

کہا جاتا ہے کہ جب تمام کوششوں کے باوجود اس شاعرہ نے کلام سنانے سے انکار کیا تو سامعین نے نہ تو تسلیم

کی محفل طور پر کسی [illegible] اور حالات بگڑنے لگے۔ آخر کار کلکٹر ٹونک نے مشاعرہ کے اختتام کا اعلان کر دیا کہ کوئی اور بد نظمی نہ ہو جائے کہا جاتا ہے کہ اس شاعرہ نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ڈاک بنگلہ میں بھی بد مزگی پیدا کی اور پھر وہاں قیام کیا۔

ظاہر ہے کہ یہ شاعرہ ٹونک میں مشاعرہ ملنے اور بھی برستی بارش میں گئی تو یہ یقینی طور پر کوئی سوچی سمجھی سکیم کے تحت ہی ہوا ہوگا۔ کچھ حضرات کا کہنا ہے کہ یہ شاعرہ تسنیم فیضی میرٹھی کا جادو اہلِ ٹونک کے سروں سے اُتارنے کی نیت سے گئی تھیں۔ بہرکیف کچھ بھی ہو پہلے تو یہ تحقیقات ہونی ضروری ہے کہ ڈاک بنگلہ میں ایکس۔ ای۔ این (پی۔ ڈبلیو۔ ڈی) کی اجازت کے بغیر اس پارٹی کو قیام کرنے کی اجازت کس نے دی۔ کہا جاتا ہے کہ اس شاعرہ نے وہاں یہ کہا کہ ان کے ساتھ جے پور کے جوہری ہیں وہ ان کے شوہر ہیں اور ان کی شادی ابھی ہوئی ہے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ شاعرہ اپنے پہلے خاوند کا شیر خوار بچہ بھی ساتھ لے گئیں۔ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ راجستھان کے وزیر اعلیٰ کا نام لے کر ڈاک بنگلہ میں قیام کیا گیا۔ چاہئے تو یہ تھا کہ کلکٹر ٹونک اس پارٹی کو نقصِ امن کے تحت گرفتار کرنے کے آرڈر جاری کرتے۔ اور تحقیقات کراتے کہ یہ جوہری صاحب واقعی اس شاعرہ کے شوہر ہیں۔ یا ذہنی طور پر عیاشی کے لئے ڈاک بنگلہ کا سہارا ڈھونڈا گیا۔ کیونکہ اس معاملہ میں راجستھان کے وزیر اعلیٰ کا نام بھی لیا گیا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وزیر اعلیٰ کے خواب و خیال میں بھی ٹونک کے اس مشاعرہ یا اس شاعرہ یا جے پور کے اس جوہری بچہ کا کوئی خیال تک بھی ہو۔ اور وزیر اعلیٰ اس رات ایک بجے تک جے پور کے مشاعرہ آزادی میں موجود رہے جبکہ کہ ایڈیٹر شانِ ہند خود وہاں موجود تھا۔

کلکٹر ٹونک کو چاہئے کہ اس معاملہ کی چھان بین کرائیں، اور پتہ لگائیں کہ اس پارٹی نے ٹونک جشن آزادی کے مشاعرہ کو کس لئے تہس نہس کرایا۔ اور ڈاک بنگلہ میں کیسے قیام کیا جے پور کا یہ جوہری نوجوان کون تھا اور اگر ضرورت ہو تو اس پارٹی کے افراد کو قانون کے حوالے کرنے کا بندوبست کیا جائے۔

اس سلسلے میں عنقریب وزیر اعلیٰ راجستھان سے ایڈیٹر شانِ ہند مفصل بات چیت کر رہا ہے۔ تاکہ مشاعروں کو جس طرح سے غیر ادبی مقاصد کے لئے استعمال کیا جانا رواج پا رہا ہے اسے حتی الامکان روکا جا سکے۔

غزل[1] نکہت شاجاپوری۔ ایم۔ اے۔ بی اے۔

زندگی ہو گئی ہے بے نور انہیں کیا معلوم
دل تمنوں سے ہے بہت چور انہیں کیا معلوم

کچھ تو تقدیر نے بھی ہم کو سہارا نہ دیا
اور کچھ ہم بھی تھے مجبور انہیں کیا معلوم

وہ سماں جب لبِ ساحل ہی سفینہ ڈوبا
وہ تھے ساحل سے بہت دور انہیں کیا معلوم

آشیاں خار سے پھولوں سے سنوارا ہے قفس
اس جہاں کا یہ دستور انہیں کیا معلوم

اب وہ آئے جو میرے پاس تو کیا آئے ہیں
داستانِ دلِ رنجور انہیں کیا معلوم

اُن کی پہچان بتاتا ہے زمانہ نکہت
مٹ کے ہم ہو گئے مشہور انہیں کیا معلوم

غزل[2] (راشد بھوپندر سنگھ جھنجھنا راجستھانی)

یہی ہے رات بھر کی مختصر روداد میخانہ
لئے ساقی ہر گھڑی [illegible] رہا گردش میں پیمانہ
کسی کی زیست کیسے بن گئی پر سوز افسانہ
اسے [illegible] کا دیوانہ نہیں سمجھے گا [illegible]
مئے الفت کو پی کر [illegible] جو ہے سرشار
[illegible] تو تیرا [illegible]
یہ وہ شے ہے کہ آسانی سے حاصل ہو نہیں سکتی
یہ [illegible] رندوں کو [illegible]
بہار آئی ہے [illegible] سے کوئی [illegible]
شکستہ دل لئے پھرتا ہے در در تیرا دیوانہ

---

[1] بلا انتخاب [2] بلا انتخاب

اس پھول کو کھلنے دیجئے



کسی بھی بچے کی جسمانی و روحانی نشو و نما کے لئے پہلے تین سال بڑے اہم ہیں۔ بچے کو آپ کے پورے پیار اور نگہداشت کی ضرورت ہے۔

اسی عرصے میں ایک اور بچہ پیدا کر کے اس کو اس سے محروم نہ کیجئے۔

ساتھ ہی، ماں کی صحت کی حفاظت کے لئے از حد ضروری ہے کہ دو بچوں کی پیدائش میں تین سال کا وقفہ ہو۔

مفت مشورے اور خدمات سے فائدہ اٹھانے کے لئے قریب ترین صحت مرکز میں تشریف لائیے

davp 73/165

بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر

مسرور تونسوی

اُردو کے دوسرے بلکہ کسی حد تک تیسرے درجے
کے شاعر، نثری مضامین میں دوسروں کی محنت و کاوش
کو اپنا موروثی ورثہ سمجھ کر بغیر کسی حوالے کے کئی کئی پیراگراف
نقل کر لینا۔ خصوصاً پاکستانی انگریزی مصنفین کے بیش بہا
شہ پاروں کا ترجمہ یا تلخیص کو اپنے مضامین میں سمو دینا، قلمی
لیاقت ایم۔ اے۔ مگر انگریزی بولنے لکھنے میں طفلِ مکتب
کسی پرائمری سکول کی ٹیچری کا تجربہ بھی نہ رکھنے کے باوجود شیخ
عبداللہ کی نظرِ عنایت یا یونیورسٹی کے نااہل سربراہوں کے طفیل
جموں یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے ہیڈ جناب جگن ناتھ آزاد
بھی اسی بیگم صاحبہ کے تیرِ نظر کا اس بری طرح سے نشانہ ہوئے
کہ بیگم صاحبہ کے عطا کردہ ایک مستعملہ رومال کو "اسرارِ خودی" سمجھ
کر ڈاکٹر اقبال پر ریسرچ کرنا بھول گئے کیونکہ آپ کی فارسی
دانی بھی ایڈیٹر شانِ ہند کی طرح ایس۔ آر۔ اسنت، مادر پدر
علم ہی محدود ہے۔ ہم اصل امر کی تحقیق پر تھیسس لکھنے لگے کہ بیگم صاحبہ
نے اس رومال کو اپنے کس کس عاشقِ زار کو آنسو پوچھنے کے لئے
دیا ہوگا۔ اور بوقتِ ضرورت اس سے کیا کیا کام لیا ہوگا۔ چنانچہ اکثر
محفلوں میں اپنے بے تکلف دوستوں کو فخریہ طور پر یہ رومال دکھاتے
اور بیگم صاحبہ کے اس بیش بہا عطیہ پر پھولے نہیں سماتے تھے
تقسیمِ ملک کے وقت جو ہندو ہندوستان میں مہاجرین کر
گئے وہ ڈاکٹر اقبال سے اس لئے ناخوش تھے کہ پاکستان کا
تصور سب سے پہلے ڈاکٹر اقبال کے ذہن کی پیداوار تھا۔ اس
لئے اس وقت ڈاکٹر اقبال کے خلاف ہندوستان کے غیر مسلموں
کا ایک جذبہ ابھرا جسے مسلمانوں نے بُرا منایا اور جگن ناتھ
کی دور رس نظروں نے ہندوستان اور پاکستان
کے مسلمانوں میں مقبولیت حاصل کرنے کے لئے ڈاکٹر
اقبال کی تعریف میں نظمیں اور مضامین لکھنے شروع کر دیئے
پاکستانی اخبارات نے بڑی شد و مد کے ساتھ شائع
کیں اور ہندوستانی مسلمانوں نے جگن ناتھ آزاد کو "کشتۂ اقبال"
کا مداح پاکر انہیں اپنا اور اسلام کا ہمدرد سمجھ لیا۔ اور آزاد صاحب کا
مشاعروں کا کاروبار چل نکلا۔ خوش قسمتی سے جناب دیا شنکر
صاحب جو اس وقت سردار پٹیل کے سیکرٹری تھے حضرت
جوش ملیح آبادی۔ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر اور دیگر کئی
حضرات کی سفارش پر اس بات پر تیار ہو گئے تھے کہ آزاد
صاحب کو بھی سرکاری اردو ماہنامہ "آجکل" کا سب ایڈیٹر بنا
دیا جائے۔ چنانچہ انٹرویو لینے والے حضرات میں جو مسلمان ممبر
تھے وہ آزاد کی اقبال مداحی کے باعث اور فراق گورکھپوری
ایسے ممبر اس خیال سے کہ آزاد محروم صاحب کے بیٹے
ہیں۔ اور کچھ احباب کی سفارش پر آزاد صاحب کے حق میں
متفق ہو گئے۔ اور عرش ملسیانی کے ساتھ ساتھ آزاد صاحب
بھی "آجکل" کے ایڈیٹوریل سٹاف میں چن لئے گئے۔ بلکہ
عرش کی پشت پر سردار سیورن سنگھ بھی تھے مگر یہ ایک
حقیقت ہے کہ عرش صاحب جہاں پنڈت لبھو رام جوش
ملسیانی ایسے استادِ محترم کے صاحبزادے تھے۔ وہاں وہ
بذاتِ خود ایک مسلمہ شاعر اچھے ادیب اور ادارتی ذمہ
داریوں کو سنبھالنے کی قابلیت رکھتے تھے۔ مگر آزاد صاحب
کا حدود اربعہ محض جناب تلوک چند محروم کا بیٹا ہونے تک
ہی محدود تھا۔ ہاں لاہور میں "ویر بھارت" ایسے اردو کے
چوتھے درجے کے روزنامے میں مترجم کا کام بھی کرتے
رہے تھے۔ مگر ہندوستان کے پرچیاں ان پر اقبال کی
مداحی نے ملک بھر میں مشاعروں اور ادبی اجتماعات میں
روشناس ہونے کا موقع عطا فرمایا جہاں "آجکل" کی اسسٹنٹ
ایڈیٹری نے بھی من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو کے مصداق
ان کو شہرت دی۔ یعنی جن شعراء اور ادیبوں کے کلام اور مضامین
"آجکل" میں چھپتے وہ کوشش کرتے کہ ان کے ہاں ہونے
والے ادبی اجتماعات یا مشاعروں میں "آجکل" کے ایڈیٹر
صاحبان بھی مدعو کئے جائیں تاکہ عوض معاوضہ کے طور پر ان کو

کا کلام اور مضامین آجکل بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اور انہیں نقد معاوضہ ملتا ہے۔ حضرت جوش ملیح آبادی تو پہلے ہی ملک گیر شہرت رکھتے تھے۔ اور بالکل جوش تو اپنے بل بوتے یہاں تک آئے اور آزاد صاحب شہرت کے اتنے بھوکے تھے کہ کندھے مار مار کر لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتے تھے کہ مجھے اقبال لیجئے۔ کوئی بھی دیکھو۔ مسلمان پاکستانی ہو یا ہندوستانی اسے اگر غلط فہمی بھی ہو جائے کہ کوئی غیر مسلم ان کے تئیں اپنے دل میں کچھ لچک رکھتا ہے تو وہ اس غیر مسلم کے لئے اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ یہی سلوک دونوں ممالک کے مسلمانوں نے آزاد صاحب سے روا رکھا۔ کیونکہ ہر جلسے، ہر مشاعرے اور ہر ادبی اجتماع میں جہاں بھی آزاد کو موقع ملا انہوں نے کسی نہ کسی بہانے اپنی اقبال مداحی کا مظاہرہ اچھے دلپذیر انداز میں کیا۔ حالانکہ ڈاکٹر اقبال پر شاید ہی آزاد ایسا گھٹیا نقاد ہند و پاکستان میں ہو۔ جب کہ ایک مسلمان ناقد کی رائے میں اقبال صاحب کے سب سے بڑے نقاد آزاد صاحب ہیں۔

آیئے اقبال کے اس سب سے بڑے نقاد کا کچھ حدود اربعہ بھی ناپتے چلیں۔ پچھلے دنوں ڈاکٹر اقبال کے صد سالہ جشن پر ایک سیمینار ۱۳؍ اکتوبر تا ۳؍ نومبر ۱۹۷۷ء نئی دہلی میں ہوا۔ جس میں افغانستان، پاکستان، ایران، بغداد، مصر، ایڈنبرا یونیورسٹی انگلینڈ، سوویت روس، وغیرہ ممالک کے وفود نے شرکت فرمائی۔ اس اقبال سیمینار کا کیا فائدہ ہوا شاید سردار جعفری بتا سکیں ہاں یہ فائدہ ضرور ہوا کہ پاکستانی وفد کے کچھ ارکان کو خوب دعوتیں دی گئیں۔ جہاں شراب ناب کے جام پر جام لنڈھائے جاتے رہے۔ بلکہ بعض حضرات جناب کرشن موہن کی طرف سے دی گئی دعوت سے جاتے ہوئے سکاچ وہسکی کی بوتلیں بھی چھپا کر ساتھ لے گئے۔ ایک صاحب تو بوتل کے منہ پر ڈھکنا لگانا بھی بھول گئے۔ جب شراب ان کے کوٹ کی جیب سے بہنے لگی تو کرشن موہن نے بوتل کا ڈھکنا دیتے ہوئے ان صاحب سے کہا کہ یہ لیجئے بوتل کا منہ اس سے بند کر لیجئے ورنہ آپ کے کپڑے خراب ہو جائیں گے۔ ان دعوتوں کو دیکھ کر یہ سمجھ میں آیا کہ

پاکستان کے شعراء اور ادیب ہندوستانی ادبی اور ثقافتی میں آنے کے لئے کیوں بے تاب ہوتے ہیں۔

اس سیمینار کی پہلی نشست میں جگن ناتھ آزاد نے جو پڑھا اس کا عنوان تھا "اقبال اور موجودہ اسلام" پھر میں فلسفۂ اسلامیہ پر توجہ مبذول کراتے ہوئے پرتی رستوگی نے سوال کیا کہ " اسلامک فلاسفی کی وضاحت کیجئے اور اس ضمن میں تیجہ

IDDHA CHRIST
END MOHAMMAD

کے مصنف نے رائے ظاہر کی ہے اس کو پیش نظر رکھا جائے موصوف نے کہا ہے کہ دراصل فلسفۂ اسلام ایک بے معنی اصطلاح ہے۔ کیونکہ مسلمانوں میں فلسفے کا آغاز ہسپانیہ میں یونانی فلاسفہ کی تشریحات سے ہوا۔ یعنی ان تشریحات سے جو ابن رشد، ابن سینا وغیرہ نے لکھیں۔ آزاد صاحب بغلیں جھانک کر رہ گئے۔ اتنے میں کھانے کا وقت ہو گیا اور نشست ختم ہو گئی۔ رستوگی صاحب نے آزاد صاحب سے کہا کہ دوسری نشست میں جلد آئیے گا کیونکہ آپ کے پیپر کے بارے میں ابھی سترہ سوالات اور ہیں۔ چنانچہ ان سوالات کا سامنا کرنے سے آزاد نے بچنے کا یہ طریقہ نکالا کہ دوسری نشست میں تشریف تب لائے جب کہ نشست کے ختم میں چار پانچ منٹ باقی رہ گئے تھے۔ آزاد صاحب نے اس طریق سے ان سوالات کے جوابات دینے سے بچاؤ کر لیا مگر اس وقت پھر گھیرے میں آگئے جب انہوں نے ایک معترض کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے ظ۔ انصاری کے

PARATION IN IQBAL

پر کہا کہ اقبال کے یہاں اس ضمن میں پیش کئے ہوئے خیالات کو صرف تصوف کے تحت ہی لیا جا سکتا ہے رستوگی صاحب نے اس پر کہا کہ تصوف کو ہر جگہ گھسیٹ کر شعریت کا خون کر دینے سے کیا فائدہ۔ مثلاً شعر میں اگر تصوف کی چھری استعمال کی گئی تو معنویت شعریت میں کچھ کا خون ہو جائے گا۔

شعر یہ تھا ــــــــ ۔

چناں پیش حریم او کشیدم نالۂ دردے
کہ دارم محرماں را لذت سوز جدائی ما

... آزاد صاحب کے اقبال کا سب سے بڑا نقاد ہونے کا دوسرا ثبوت سنیئے۔

۱۹۶۵ء میں بزم اقبال لاہور سے جناب بشیر احمد ڈار کی ایک کتاب IQBAL AND POST KANTIAN VOLUNTARISM کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ اقبال کن کن مغربی فلسفیوں سے متاثر ہوئے۔ اور کس حد تک انہوں نے اُن کے افکار و تصورات کو قبول یا مسترد کیا۔ اس کتاب میں بڑی تفصیل اور گہرائی سے اس کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس موضوع پر ابھی تک اردو میں اس پایہ کی کتاب شائع نہیں ہوئی۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی تصنیف "اقبال اور مغربی مفکرین" کا موضوع بھی یہی ہے۔ لیکن یہ کتاب بڑی حد تک بشیر احمد ڈار کی کتاب کا پرتو یا چربہ ہے۔ آزاد صاحب نے مذکورالصدر کتاب کا حوالہ دیئے بغیر کہیں اس کا ترجمہ کر دیا ہے۔ اور کہیں اردو داں حضرات کی محدود فہم و ادراک کو مدنظر رکھتے ہوئے محض اس کی تلخیص پر اکتفا کیا ہے۔ لیکن جہاں تک موضوع سے انصاف کا تعلق ہے۔ آزاد صاحب کی کتاب کو ڈار صاحب کی کتاب سے دُور کی بھی مناسبت نہیں۔ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ ڈار صاحب کی کتاب میں بیشتر جو مضمون ہے آزاد صاحب نے اسے پورا کا پورا ترجمہ کر کے سرقہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں ایک مستند اقبال شناس نے مفصل مضمون ماہنامہ شاعر بمبئی کو اشاعت کے لئے بھجوایا۔ مگر شاعر کے مدیران نے اس مضمون کی اشاعت سے معذرت چاہی کہ ہم ایسی باتوں میں پڑ کر شاعر کو اس بحث کی آماجگاہ نہیں بنا سکتے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ آزاد صاحب نے مدیران شاعر کو یہ سبز باغ دکھایا کہ وہ اُن کے والد محترم مرحوم اعجاز صدیقی پر "شاعر" کا ایک خاص نمبر شائع کرانا چاہتے ہیں۔ جیسا کہ آزاد صاحب نے اس سلسلے میں اپنا مکتوب شائع کرایا ہے۔ شاعر ایسے مشہور اور اچھے اردو ماہنامہ کو ذاتی عناد کی خاطر اس خالص ادبی چوری کا

افشا کرنے سے احتراز کرنا زیب نہیں دیتا۔ یہ مضمون دفتر شان ہند میں اشاعت کے لئے آچکا ہے۔ ہم بہت جلد آزاد صاحب کے اس ادبی سرقہ یا استفادہ؟ کو شائع کر رہے ہیں۔ تاکہ ہند و پاک کے مسلمانوں کو اقبال کے اس سب سے بڑے نقاد کی اصلیت کا پتہ چل سکے۔ داد دیجئے اتر پردیش اردو اکاڈمی کے اُن حضرات کو جو کتابوں پر انعام کا فیصلہ کرتے ہیں کیونکہ اس چوری کی کتاب پر اس اکاڈمی نے انعام دیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس اکاڈمی کے وہ حضرات جو کتابوں پر انعام دینے کا فیصلہ کرتے ہیں یا تو وہ جاہل مطلق ہیں اور یا وہ آزاد صاحب کی اقبال مداحی سے اس قدر مرعوب ہیں کہ انہوں نے آزاد صاحب کی اس علمی و ادبی بے بضاعتی پر یہ انعام عطا فرمایا ہے۔ اگر آزاد صاحب نے اپنی کتاب کے دیباچہ میں ڈار صاحب کی کتاب کا اظہار کر دیا ہوتا تو اس سے یقیناً ان کی عظمت میں اضافہ ہوتا۔ مگر انہوں نے تو یہ سوچا کہ پاکستان سے کتابوں اور رسائل کا آنا بند ہے۔ کون بشیر احمد ڈار کی کتاب کو یہاں پڑھے گا اور کس کو اُن کی چوری کا پتہ چل سکے گا۔

شاعر کو مضمون بھجوانے والے صاحب لکھتے ہیں کہ آزاد صاحب کی تصنیف "اقبال اور مغربی مفکرین" میں زبان و بیان کی اکثر غلطیاں دیکھ کر اُن کا بلڈ پریشر اور بھی بڑھ گیا۔ مثال کے طور پر چند غلطیاں آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

صفحہ ۱۲ سطر ۱۹ "یونانی فلسفہ کی تاریخ کی جو مایہ الامتیاز مقام سقراط کو حاصل ہے"۔ یہاں مایہ الامتیاز مقام کی جگہ امتیازی مقام ہونا چاہیئے یا صرف امتیاز ہونا چاہیئے۔

صفحہ ۲۴ سطر ۱۸ "اب اس ضمن میں ایک نظر اور شیرنظامی وادیا کے خیالات ملاحظہ فرمائیے"۔ لکھنا چاہیئے تھا "اب اس ضمن میں ایک نظر ...... ڈالئے یا اب اس ضمن میں ذرا اور شیر تن جی وادیا کے خیالات ملاحظہ فرمائیے"۔

صفحہ ۷۶ سطر ۲۱ "لفظ اسلام نجات [illegible] بالذات سے"۔ کہنا چاہیئے تھا اسلام بجائے خود ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔

صفحہ ۸۸ سطر ۲ "اقبال کی جادو بھری شاعری نے

تعارف الشعراء

حکیم شبیر علی خاں شبیر کان پوری

بمقام شاہجہاں پور محلہ بارزوڑی لال میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم درگاہ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے اسلامی مدرسہ میں پائی۔ کیونکہ اُن دنوں میرے محترم والد صاحب حاجی خورشید علی خاں گورنمنٹ کنٹریکٹر تھے۔ اور راشٹر سینا نئی دہلی کی تعمیر میں انیٹیں سپلائی کر رہے تھے۔ اس کے بعد باندہ پولیس لائن کا ٹھیکہ والد صاحب کو ملا۔ اور ہم سب باندہ چلے آئے۔ باندہ میں میری والدہ صاحبہ کا انتقال ہوا۔ اور والد صاحب نے باندہ میں ہی دوسری شادی کرلی۔ مگر باندہ میں ہی کچھ سال بعد اُن کا بھی انتقال ہوگیا۔ اس وجہ سے میری تعلیم کم سے کم ہو سکی۔ مجلسی ماحول ہمیشہ اچھا ملا۔ اور اب تک یہ عالم ہے کہ ہر وقت دس بیس حضرات میری محفل میں رونق افروز رہتے ہیں۔ نماز روزے کا پابند ہوں شعر و شاعری کا شوق ان مذہبی فرائض کے بعد کا درجہ رکھتا ہے اب کان پور میں مستقل رہائش پذیر ہوں اور گورنمنٹ کنٹریکٹر ہوں۔ اس وقت تک زندگی کی ساٹھ بہاریں دیکھ چکا ہوں۔ شاعری میں کسی کی شاگردی قبول نہیں کی۔ بقول ہاگرو وو یا نہیں ملتی ہے۔ مگر میری لگن اور خدا کے کرم سے میرے ادبی ذوق کی تشنگی کا سامان بطریق احسن پورا ہو جاتا ہے۔ اور مجھے کسی کی شاگردی کا بار اٹھانے کی ضرورت محسوس ہی نہیں ہوتی انجمن گلزارِ ادب کان پور کا صدر ہوں کلام حاضر ہے۔

غزلیں

۱

کرتے رہے ہیں گریہ و زاری تمام رات
فرقت میں اُن کی ہوتی ہی گنہاری تمام رات

ہم جانتے تھے چین نہ آئے گا عمر بھر
گذشتے گی ہجر میں جو ہماری تمام رات

جس طرح ہم تڑپ کے بسر کر رہے ہیں شب
یوں ہی بسر ہو کاش تمہاری تمام رات

ایک ایک لمحہ محشرِ صد اضطراب ہے
سچ یہ ہے عمر بھر پہ ہے بھاری تمام رات

دل میں تھا دردِ عشق مگر یہ خبر نہ تھی
آنسو رہیں گے آنکھ سے جاری تمام رات

شبیر عشق کی ہے عبادت کسی کی یاد
کرتا ہے زہد سجدہ گزاری تمام رات

(۲)

ہے رنگوں کا صحرا وہاں کچھ نہیں ہے
دھوئیں کے ہوا آسماں کچھ نہیں ہے

ہے سب ہیچ میری اُڑانوں کے آگے
فلک کچھ نہیں کہکشاں کچھ نہیں ہے

کرشمہ ہے سب اُس کے دستِ ہنر کا
طلسم بہار و خزاں کچھ نہیں ہے

محبت تو نغمہ ہے کیف و خوشی کا
محبت میں سود و زیاں کچھ نہیں ہے

یہ دُنیا ہے ظاہر پرستوں کی بستی
اِک انساں کی عزت یہاں کچھ نہیں ہے

سفینہ بہاروں کے رُخ پر رواں ہے
مجھے حاجتِ بادباں کچھ نہیں ہے

بہاریں تری دلکشی سے ہیں زندہ
ترے سامنے گلستاں کچھ نہیں ہے

ہر ایک شئے سے شبیر دل بھر چکا ہے
وہاں چل کے رہیئے جہاں کچھ نہیں ہے

یونس مخمور

فن کار کی زندگی کا آغاز اس وقت سے ہوتا ہے. جب اس کا ذہن عام لوگوں کی سطح سے اوپر اٹھ کر کچھ سوچنے کے قابل ہوتا ہے. اور ساتھ ہی وہ اپنے گرد و پیش کی چیزوں کا احساس و ادراک باطنی سطح پر کرنے لگتا ہے. فن کار کی ذہنی بلوغت کی یہ ابتدا اس کی زندگی کا لمحہ اولین ہے. لیکن رسمی قاعدے کے مطابق انسانی زندگی کی شروعات بطن مادر سے باہر پہلی سانس لینے پر ہوتی ہے.

میں نے بھی ۱۰ر جولائی ۱۹۴۳ء کو بھوپال کی سرزمین پر یوسف زئی پٹھان گھرانے میں اپنی پہلی سانس سے زندگی کا آغاز کیا. محمد یونس خاں شناختی نامہ ملا. والد محترم محمد ابراہیم خاں (ایس. آئی پولس) بڑے بھائی محمد اسمٰعیل خاں محمد اسحاق خاں اور والدہ کی بے پناہ شفقتیں حاصل ہوئیں. اور ساتھ ہی ہمشیرہ شمیم جہاں اور برادرِ خورد یعقوب خاں کی بھرپور محبتوں نے زندگی کے تلخ لمحات کو شیریں بنا دیا.

۱۹۶۲ء میں انٹر کا امتحان پاس کرنے کے بعد محکمہ تعلیم میں ٹیچر کی حیثیت سے ملازم ہوں. ۱۹۶۹ء میں بقول غالب مجھے بیڑی پہنائی گئی اور اس خوشگوار اسیری میں محمد بشیر خاں (ٹھیکیدار) کی صاحبزادی سلطان جہاں میری شریک ہوئیں. سلطان جہاں کی رفاقت کے لمحاتِ شیریں نے میرے شعری احساس کو مزید نکھرنے کا موقع فراہم کیا. دو بچیاں زیبا اور حنا زندگی کی شعریت کی علامت ہیں. ادبی راستے پر میرے سفر کی ابتدا افسانے سے ہوئی. عنوان تھا پان ہم بھی کھائیں گے. یہ افسانہ ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا. اس وقت میں یونس آزاد کے نام سے لکھا کرتا تھا اور اب یونس مخمور کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہوں. ۱۹۶۷ء میں محترم واحد پریمی صاحب سے شرفِ تلمذ حاصل ہوا ان کی رہنمائی اور بیش قیمت قدر مشوروں نے دو سال کی قلیل مدت میں ادبی رسائل کے صفحات پر میرا نام لکھوا کر ادبی حلقوں میں میرا نام قابلِ شناخت بنا دیا. ۱۹۶۳ء میں میں نے شاعری شروع کی. غزل میری پسندیدہ صنفِ سخن ہے. اختصار، ایجاز و ایمائیت اور خیال کو تاثر کے ساتھ دل میں اتار دینا اس کی اعلیٰ ترین خصوصیات ہیں. یہی سبب ہے کہ قدیم عہد سے جدید دور تک غزل اپنے طویل سفر میں کہیں رکتی نظر نہیں آتی. غزل کے علاوہ دوسری اصناف میں گیت، سلام، نظم، نعت اور قطعہ کے ذریعہ بھی اپنے افکار و خیال کا اظہار کیا ہے. میرا شعری مجموعہ "حنا" زیر ترتیب ہے اور عنقریب ہی شائع ہوگا. نمونۂ کلام حاضر ہے ؎

جذب دل نے بارہا یوں جلوے دکھلائے مجھے
جس طرف بھی میں نے دیکھا وہ نظر آئے مجھے

وہ سراپا رنگ و خوشبو اس کی قربت کے بغیر
یہ بہار موسمِ گل کیسے راس آئے مجھے

کوئی ساتھی ہے نہ ہمسر ہے سرِ راہِ حیات
منزلوں کی سمت اب پھر کون لے جائے مجھے

ہوش کی باتیں ہیں یارو اب ہوش مندوں کے لئے
میں تو دیوانہ ہوں اب کوئی نہ سمجھائے مجھے

ساقیٔ محفل کا یہ دستور ہے مخمور خوب
سب کو جی بھر کے پلائے اور ترسائے مجھے

(۲) آج اس عقدۂ مشکل کو بھی کھولا جائے
کیا علاجِ غمِ انساں ہے یہ سوچا جائے

کیا دیا ہمیں رہبروں کے دلاسوں سے بھلا
رہنماؤں سے ذرا آج یہ پوچھا جائے

کون کندن ہے بنا دیکھی کسوٹی مخمور
کیوں نہ اپنوں کو بُرے وقت میں پرکھا جائے

قاضی تنویر (بھنڈ)

۱۵ر اگست ۱۹۴۶ء میں کو آگرہ کے نزدیک بھگونہ گاؤں میں پیدا ہوا. میرے والد مرحوم قاضی محمد حبیب صاحب اپنے وقت کے مشہور عالم تھے قضاۃ وراثت میں ملی ہے. ابتدائی تعلیم گاؤں میں ہوئی. ازاں بعد ۱۹۵۸ء میں اپنے ننہال مقام بھنڈ (مدھیہ پردیش) بغرض تحصیل علم آیا. ابھی حصول علم کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ ۱۹۶۲ء میں والد محترم کا سایہ سر سے اٹھ گیا.

شعر گوئی کا شوق مجھے بچپن ہی سے تھا. میں نے گوالیار اٹاوہ کے مشاعروں میں ترنم سے ۱۹۶۰ء کی ابتدا کی ۱۹۶۱ء میں ایک مشاعرے کے سلسلہ میں اٹاوہ جانا پڑا میرے محترم اور پرخلوص

دست تھا ہم رسا صاحب بھی میرے ساتھ مشاعرے میں مدعو کئے گئے تھے، اس وقت مجھے ایک ایسے استاد کی ضرورت تھی جو اردو فارسی کی کلاسکی شاعری پر ماہرانہ نظر رکھتا ہو اور ساتھ ہی دیدہ ور نقاد بھی ہو۔ میں نے محترم تمام رسا کے مشورے سے پروفیسر نثار اناوی کی خدمت میں حاضر ہو کر تلامذہ کی فہرست میں نام لکھوا دینے کے لئے مودبانہ استدعا کی موصوف نے مجھے اپنی سرپرستی میں لینا قبول کر لیا۔ افسوس ہے کہ آج سے چار سال قبل نثار صاحب بھی اللہ کو پیارے ہوگئے۔ اور اب میرا ذوق ہی میرا رہبر و مددگار رہے۔

میری شاعری میں آمد کم اور آورد زیادہ ہے اور یہی میری شاعری کا پس منظر ہے۔ میرے خیال میں اعلیٰ شاعر تک پہنچنے کے لئے کوئی قریب کا راستہ نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ شاعری کے لیے محنت، عمیق مطالعہ، اور مسلسل مشق بنیادی ستون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے بغیر اچھا شعر کہنے کا سلیقہ آتا ہی نہیں۔ آج کل میں اپنا مجموعۂ کلام، گیت اور غزل مرتب کر رہا ہوں جو عنقریب شائع ہو کر منظر عام پر آنے والا ہے۔

گزشتہ آٹھ سال سے جھنڈا انجمن ترقی اردو کا سکریٹری اور ہندی ساہتیہ سمیلن وغیرہ اردو ہندی کی سنستھاؤں میں کسی نہ کسی عہدے پر فائز رہا ہوں۔

مختصر یہ کہ میں برگ آوارہ کی صورت مدھیہ پردیش کی چمبل گھاٹی کی سنگلاخ، خشک، اور ناہموار سرزمین پر شعر و ادب کی تخم ریزی کا حوصلہ لئے اپنی راہ پر گامزن ہوں۔ چند اشعار بطور نمونہ قارئین کی ضیافتِ طبع کے پیش ہیں۔

- وہ اور ہوں گے جن کے نصیب میں ہے خوشی
  میری حیات کا حاصل الم ہے ماتم ہے
  یہ کیسا وقت ہے یا رب یہ کیسا عالم ہے
- ~~[illegible]~~
- ~~کہ زندگی سے [illegible]~~
- بربادیٔ آدم کے نشاں دیکھ رہا ہوں
  دیکھا نہیں جاتا وہ سماں دیکھ رہا ہوں

اللہ بچائے تو بچے اب کے نشیمن
ہر سمت گلستاں میں دھواں دیکھ رہا ہوں ●

● کل لگائی تھی جنہوں نے در و دیوار میں آگ
آج کرتے ہیں وہ تعمیرِ وطن کی باتیں ●

● گلشن میں کوئی تازہ جب پھول مہکتا ہے
گلچیں کی نگاہوں میں کانٹا سا کھٹکتا ہے
رکھ کر میرے سینے پر ہاتھ یہ کہتے ہیں
ہم بھی تو ذرا دیکھیں دل کیسے دھڑکتا ہے ●

شعلے لپک رہے ہیں غنچے جھلس رہے ہیں
اعلان ہو رہا کیا حسنِ عمل یہی ہے ●
(قاضی تنویر)

راغب شکیب

سرگودھا (پاکستان) میں محفلِ مشاعرہ

گزشتہ چند سالوں میں سرگودھا کی ادبی فضا نے جس تیزی سے جدیدیت کی طرف قدم اٹھایا ہے اس سے بعض ادبی حلقوں میں یہ خدشہ ظاہر کیا جانے لگا کہ اب غزل کا زمانہ شائد لد گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سرگودھا نے نئی نظم کی بھی آبیاری کی ہے، جدید نظم کو فروغ دیا ہے اور ایک نئی صنفِ ادب انشائیہ کو تحریک کے طور پر آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے۔ اور ان سب کے پسِ پشت ڈاکٹر وزیر آغا کی شخصیت ایک محرک قوت کے طور پر کام کرتی رہی ہے لیکن یہ بات بھی درست نہیں کہ دبستانِ سرگودھا نے غزل کے ارتقا میں نمایاں حصہ نہیں لیا۔ کچھ عرصہ قبل جب سید فخر الدین بلے ناظم تعلقاتِ عامہ، سرگودھا میں متعین ہوتے تو انہوں نے شعرائے سرگودھا کی آزمائش کے لئے طرحی مشاعرے کی طرح ڈالی اور رنگِ قدیم سے ٹکرانے کے لئے ڈاکٹر وزیر آغا کی غزل کا مندرجہ ذیل مصرعہ طرح کے طور پر ہوا میں اچھال دیا۔

اے ہوائے صبح ! تو نے کیا کیا

یوں تو سرگودھا کا ادبی سمندر کبھی سکون آشنا نہیں ہوا۔ اور چھوٹی بڑی لہریں اس میں ہر وقت تحریک پیدا کرتی رہتی ہیں تاہم اس مصرعہ طرح نے سرگودھا کے شعراء کے ذوقِ تخلیق کو مہمیز لگائی اور وہ صبح اٹھتے ہی کان پر رکھ کر قلم نکلے، تو گویا دبستان کھل گیا۔ سید وزیر حسین شیرازی کے دیوان خانے پر پہلا شعر ایک نئے شاعر تمکین شیرازی پر وارد ہوا۔ یہ بارش کا پہلا قطرہ تھا اور اس کے بعد ہر شخص ہی اس دیوان خانے میں آ تازہ اپنے ساتھ اشعار کا تحفہ ضرور لاتا۔ اچھی بات یہ ہے کہ اس مصرعِ طرح میں اتنی جاذبیت تھی کہ جو لوگ شاعر تھے انہوں نے غزلے اور سہ غزلے لکھے اور جو شاعر نہیں تھے ان پر بھی شاعری کی دیوی مہربان ہوگئی اور ایک آدھ غزل انہوں نے بھی پہلی فرصت میں کہہ ڈالی۔

۱۶ جولائی کی شام کو حلقہ اربابِ ذوق سرگودھا کے زیر اہتمام یہ محفلِ مشاعرہ اگرچہ ڈاکٹر وزیر آغا کی صدارت میں منعقد ہوئی تھی لیکن اس کے اصل دولہا سید فخر الدین بلے تھے جنہوں نے پاکستان نیشنل سنٹر کو روایتی دلہن کی طرح سجایا، ڈائس پہ قالین بچھا کر گاؤ تکیوں کو آراستہ کیا جونہی شام ڈھلی تو مائیکرو فون کے سامنے شمع روشن کردی گئی۔

اس مشاعرے کی ایک اور قابلِ ذکر بات یہ دیکھی گئی کہ پہلی مرتبہ سرگودھا کے اسسٹنٹ ریذیڈنٹ ڈائریکٹر سید علوی بھی کارکنانِ مشاعرہ کا ہاتھ بٹاتے نظر آئے۔ حلقہ اربابِ ذوق سرگودھا کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ سید علوی اس مشاعرہ کے انتظام میں ہاتھ بٹا رہے تھے۔ اور بار بار پوچھتے کہ "اور کسی چیز کی ضرورت تو نہیں" اس سے پہلے آج تک "کچھ شامل" میں گھرے ہونے کی وجہ سے کسی ادبی تقریب میں ان کی شمولیت کبھی نظر نہیں آئی اس مشاعرہ کی خبر گلی کوچوں میں پھیل چکی تھی۔ راغب شکیب سکریٹری حلقہ اربابِ ذوق نے سیکریٹری کی نشست سنبھالی اور انہوں نے ڈاکٹر وزیر آغا سے کرسیٔ صدارت پر اور سید فخر الدین بلے کو مہمانِ خصوصی کی نشست پر مسند آرا ہونے کی درخواست کی۔ اب محفل گوش برآواز تھی۔ اور ایک نوخیز شاعر انیس عاطف اپنا کلام سنا رہے تھے۔ انیس عاطف جب اپنے ایک شعر پر داد پا کر جا چکے تو پھر سعید مرزا غزل سرا ہوئے۔

مورد الزام ٹھہرایا ہمیں ❊ رازِ الفت آپ نے رسوا کیا

آپ ناحق ہوگئے ناراض کیوں ❊ ہم نے کب اے جانِ جاں شکوا کیا

سعید مرزا کے بعد اقبال منظر سٹیج پر آئے اور عمر رسیدہ ہونے کے باوجود عشق و حسن سے بھرپور غزل سنائی۔

اے ستم گر ظلم سہہ کر بھی ترے ❊ یہ بتا میں نے کبھی شکوہ کیا

کر کے اک پردہ نشیں کو بے نقاب ❊ "اے ہوائے صبح ! تو نے کیا کیا"

غلام محمد عصری غزل سنا رہے تھے اور ہم منہ دیکھتے ہی رہ گئے۔ بدر الدین بدر کو جن اشعار پر داد ملی وہ اس لئے تو نہیں

کہے جا سکے کہ بدر صاحب کے پڑھنے کی رفتار خاصی تیز تھی۔ ان کے بعد عزیز ابالوی آئے اور مناسب داد پائی۔ شمع مشاعرہ مندکرہ بالا شعرائے کرام سے ہوتی ہوئی حبیب محمد رفیق دبیر تک پہنچی تو محفلِ مشاعرہ اپنا رنگ جما چکی تھی اور رفیق دبیر اپنی غزل پر داد سمیٹ رہے تھے۔

کاٹ کر رکھ دیں ہری شاخیں تمام :: تو نے ہر زخم شجر ننگا کیا
ہر قدم پہ ہاتھ میں خنجر لیے :: زندگی تو نے مرا پیچھا کیا
دامنِ گل کی اڑا دیں دھجیاں :: اے ہوائے صبح! تو نے کیا کیا

تمکین شیرازی مشاعرے میں خود تو نہ آسکے لیکن ان کی غزل پہنچ گئی اور یہ غزل ان کے والد سید وزیر حسین شیرازی نے پڑھی

زخم دل میں تو چھپاتا ہی رہا :: لوگ ظالم تھے بہت چرچا کیا
دل میں خوشیوں کے دیے جلنے لگے :: شام کو آنے کا جب وعدہ کیا

ممتاز عارف کو اس شعر پر خاصی داد ملی

ڈھونڈ کر لاؤ کہیں سے تیرگی :: روشنی نے تو مجھے رسوا کیا

بزرگ شاعر عبد الکریم مخلص مائیکروفون پر آئے تو پوری محفل کشتِ زعفران بن گئی کیونکہ انہوں نے نہ صرف مصرعہ طرح میں ترمیم کر دی تھی بلکہ غزل کو بھی مسدس کی ہیئت میں لکھا تھا جس میں مصرعہ طرح کو ٹیپ کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔

محفل کے اس لطیف مزاح کو خواجہ اویس احمد شبلی پانی پتی کی مزاحیہ تقریر اور سنجیدہ غزل نے مزید گرد شادی۔ ان کے دو اشعار تبرک کے طور پر پیشِ خدمت ہیں۔

تو نے خلوت میں کہا میں نے سنا
پھر رقیبوں سے بھی جا شکوا کیا
میں نے کیا تیرا بگاڑا تھا ستم
جو بھری محفل میں جا رسوا کیا

حفیظ باجوہ نے خاصی داد وصول کی ان کے دو اشعار ملاحظہ ہوں۔

کس قدر سفاک تھا موسم کا ہاتھ
شاخِ گل پر ہر گل شگفتہ کیا
بے سرو ساماں رہا ہوں عمر بھر
میرے مولا میں نے کب شکوا کیا

حلقۂ ارباب ذوق میں یوسف گوندی پہلی مرتبہ مشاعرہ پڑھنے کے لیے تشریف لائے تھے۔ ان کی غزل خاصے نئے تجربات کی حامل تھی افسوس کہ ان کا کوئی شعر نوٹ نہ کیا جا سکا۔

یونس ارشاد نے ان اشعار پر داد پائی ہے

جان دی، دل بھی دیا، ایمان بھی
پھر بھی کہتے ہیں کہ تو نے کیا کیا
میری تربت کی اڑا دی خاک بھی
"اے ہوائے صبح! تو نے کیا کیا"

اور اب چلتے چلتے راغب شکیب کے بھی چند اشعار ملاحظہ کرتے چلیں

دھوپ تو اتری تھی آنگن میں مرے
گھر کے پیڑوں نے مگر سایا کیا
میں تری رگ رگ میں جان بن کر رہا
تو مری ہر سانس میں مہکا کیا
کھل اٹھی ہے پھر لہو کی چاندنی
دل میں پھر جگنو سا اک چمکا کیا

ظہیر الدین ظہیر اس مرتبہ مناسب داد نہ پا سکے ورنہ وہ عموماً مشاعرہ میں چھا جایا کرتے ہیں۔ ان کے چند اشعار حاضر ہیں۔

سینکڑوں وعدے کیے ہیں آپ نے
یہ تو کہیے کون سا پورا کیا
کچھ تو بولو آج اے چارہ گرو
تم نے بے چاروں کی خاطر کیا کیا

سرگودھا کے واحد انقلابی شاعر ثناء نظامی اپنی گرجدار آواز میں یوں غزل سرا تھے ہے

پتھروں میں دفن ہے انسانیت
اے خدا کس دور میں پیدا کیا
ساتھ چل کر آ گئی ہیں قبر تک
حسرتوں نے اس قدر پیچھا کیا

پرویز بزمی جدید شاعری کے قائل ہیں۔ ان کی غزل اور نظم میں روایت کے ساتھ ساتھ جدیدیت بھی سفر کرتی نظر آتی ہے۔ طرح مصرعہ پر انہوں نے صرف تین شعر کہے تھے پیشِ خدمت ہیں۔

سوچ نے کیا ذہن کا در وا کیا :: خوف کا منظر نیا پیدا کیا
برف کی مسند تھی جو ہر کے واسطے :: اس لیے سارے شہر کا سودا کیا

خواب کی چادر بھی مجھ سے چھین لی :: اے ہوائے صبح! تو نے کیا کیا"

رشک ترابی سرگودھا کے ایک کہنہ مشق اور زود گو شاعر ہیں ان کے متعلق مشہور ہے کہ مشاعروں میں دیر سے آتے ہیں چنانچہ حسب روایت اس روز مشاعرہ گاہ میں اس وقت تشریف لائے جب صرف پانچ شاعر پڑھنے والے رہ گئے تھے۔ ابھی رشک صاحب کو اپنی نشست پر بیٹھے ہوئے بمشکل پانچ سات منٹ ہی ہوئے تھے کہ ان کا نام پکارا گیا۔ چنانچہ غصہ میں بھرے ہوئے مائیک پر آئے۔ اور کہا ،،میرا نام رشک ترابی نہیں بلکہ احمد حسین ہے"۔ یہ انکشاف کر کے سامعین کو کشمکش و پیچ میں مبتلا کر دیا بعد میں معلوم ہوا کہ اپنے پیدائشی نام کی وضاحت اس لئے کی کہ رشک ترابی تو ایک شاعر ہے لیکن احمد حسین ایک محنت مند جسم کا مالک ہے۔ لہذا احتیاط رہنا بہتر ہے۔ بہر حال ہم نے تو اُن کی یہ دھمکی گرہ سے باندھ لی ہے۔ آپ رشک ترابی کا فن ملاحظہ کریں۔

کس نے پھیلائی ہے نفرت چار سُو
کس نے اس دیوار کو اونچا کیا
دیکھ کر یاروں کے ماتھے پر شکن
میں نے ساغر کو حباب آسا کیا
میں وہ ساقی ہوں کہ جس نے چوم کر
دامن سنگِ حرم میلا کیا

رشک ترابی داد سمیٹ کر جا چکے تو ملک کے نامور نقاد انور سدید کو دعوتِ سخن دی گئی۔ انور صاحب نے غزل پڑھی اور خوب داد سمیٹی۔ ان کے چند اشعار آپ بھی ملاحظہ کریں۔

آنکھ کی بستی تھی خوں بستہ مگر
تو اُسے ہنس ہنس کے کیوں دیکھا کیا
دھوپ پر بادل نے چادر ڈال دی
آنکھ پر پلکوں نے جب سایا کیا

پر عبدالرشید اشک روایتی انداز کے ایک کہنہ مشق شاعر ہیں اس لئے مشاعروں میں اکثر بہت داد پاتے ہیں۔ آپ بھی ان کی شوخیٔ طبع دیکھیں۔

حشر تک وہ شوخ یا رب خوش رہے
جس کے ایک جلوے نے دیوانہ کیا
تابِ نظارہ ہی کس کافر میں تھی
تو نے محفل میں عبث پردا کیا
خوب تڑپا دل کسی کی یاد میں
"اے ہوائے صبح! تو نے کیا کیا

عبدالرشید اشک کے بعد شمعِ مشاعرہ رفعت سلطان کے سامنے کی گئی اور وہ یوں غزل سرا ہوئے ؂

میں تو چپ بیٹھا تھا محفل میں مگر
دل کی دھڑکن نے مجھے رسوا کیا
حکمرانی غیر کو بخشی گئی
اور مجھ سے وعدۂ فردا کیا
اُن کی آنکھوں میں بھی تھیں ویرانیاں
میں بھی تنہا بیٹھ کر رویا کیا
دیکھتا تھا وہ بھی مڑ مڑ کر مجھے
میں بھی اس کو دُور تک دیکھا کیا
دوست میرے کب شریکِ غم ہوئے۔
دوستوں کا میں نے کب شکوا کیا

سید وزیر حسین شیرازی سرگودھا کے قابلِ احترام بزرگ شاعر ہیں باوجودیکہ سن رسیدہ ہیں۔ لیکن اب بھی آواز میں اتنا طنطنہ اور گرج ہے کہ سامعین انھیں ادب و احترام سے سُننے پر مجبور ہو جاتے ہیں

ذکر جب آلِ محمد کا کیا :: حق نے میرے بول کو بالا کیا
مجھ پہ تو نے خالقِ ارض و سما :: اپنی رحمت کا سدا سایہ کیا
لشکرِ اعدا میں ہلچل مچ گئی :: کھاٹ پر ضیغم نے جب قبضہ کیا
حشر میں ہر اک سے پوچھا جائیگا :: تو نے دُنیا میں بتا کیا کیا کیا
کربلا میں مصطفےٰ کے لال نے :: دے کے سر اسلام کو زندہ کیا
ہو گئی بخشش گناہوں کی وزیرؔ :: ذکر جب محبوبِ داور کا کیا

مہمانِ خصوصی سید فخرالدین بلے جب غزل سرا ہوئے تو ایک سماں پیدا ہو گیا وہ کہہ رہے تھے ؂

منہ سے زاہد نے کچھ نہ کیا :: اک ردا سے جام کا سودا کیا
کچھ نظارہ رہی میری نظر :: جام میرے تشنہ لب دیکھا کیا

اس شعر پر بہت داد پائی!

کس نے اپنی خود نمائی کے لئے :: دونوں عالم میں سجے تو ہوا کیا

آخر میں صدرِ مشاعرہ ڈاکٹر وزیر آغا غزل سرا ہوئے اور ہر ہر شعر پر خوب داد پائی۔ داد کا یہ عالم تھا کہ ایک ایک شعر کو کئی کئی بار پڑھوایا گیا۔ اس مشاعرہ میں ڈاکٹر صاحب کی غزل بہت کامیاب رہی لیجیے چند اشعار حاضر ہیں۔

بے حیائی میں ستارے چن لیے :: جگمگاتی رات کو اندھا کیا
روٹھ کر گھر سے گیا تو کتنی بار :: کیا دَر و دیوار نے پیچھا کیا؟
اپنی عریانی چھپانے کے لئے :: تو نے سارے شہر کو ننگا کیا۔
چلتے چلتے شام یک دم ہنس پڑی :: اک ستارہ دیر تک رویا کیا
کی عطا ہر گل کو اک رنگین قبا :: بوئے گل کو شہر میں رسوا کیا

ڈاکٹر صاحب کے بعد طرحی دَور کے اختتام کا اعلان کیا گیا۔ وقفے کے بعد دوسرا دَور غیر طرحی ہوا۔ اس دوسرے دَور کی صدارت سرگودھا کے معروف صنعتکار میاں محمد انور نے کی۔ مندرجہ بالا تمام شعرا نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ میاں محمد انور کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

یہ نغمے، یہ نالے، یہ صدائیں، یہ ترانے
بکھرے ہوئے ہیں ہر سُو مرے غم کے ہی فسانے
وہ خوبیٔ تقدیر سے ہر حال میں بیتے
ہم تیرہ نصیبوں کے حقائق بھی فسانے
کل سر راہے مجھے آپ ملے تھے
ایسا مجھے لگتا ہے کہ گزرے ہیں زمانے

میاں محمد انور کے خطبۂ صدارت اور اس غزل کے بعد شب کے گیارہ بجے یہ پُروقار محفلِ مشاعرہ ختم ہوئی۔ انجم نیازی نے اگرچہ غزل کے بجائے "دو غزلہ" لکھا تھا لیکن مجبوراً اس مشاعرہ میں شرکت نہ کر سکے۔ ریاض احمد شاد، یوم وارث شاہ کے سلسلہ میں ایک ادبی تقریب میں سرگودھا سے باہر تھے۔ سیف زیری اور ناز گنگوہی کے شریکِ مشاعرہ نہ ہونے کی وجہ یہ معلوم ہوئی کہ ان دونوں صاحبان کو اس مشاعرہ کے متعلق کوئی علم ہی نہ تھا سرگودھا کے استاذ الشعرا حافظ یوسف آزاد ناسازیٔ طبع کے باعث غزل نہ لکھ سکے۔ رہ گئے۔ پرویز بزمی تو وہ بھی سرگودھا سے مسلسل پانچ روز تک غائب رہنے کے بعد اچانک مشاعرہ میں جھومتے جھامتے آ نکلے

اور شعرائے کرام کو داد دینے کا فرض سنبھال لیا۔ اور ہر شاعر کے اچھے شعر پر خوب خوب داد دی۔ داد دینے کے معاملے میں ہم تو سجاد نقوی کو ہی سند حیثیت کا مالک سمجھتے تھے لیکن اس روز عقدہ کھلا کہ اس معاملہ میں رشک ترابی بھی ماہر ہیں۔

حضرت عباسؓ کے یوم ولادت کی خوشی کے موقع پر سید وزیر شیرازی نے شہر کے شعراء کو ہر سال کی طرح اس مرتبہ بھی اپنے دیوان خانے پہ مدعو کیا اور کھانے سے تواضع کی۔ کھانے کے بعد نعتیہ مشاعرہ ہوا۔ اس مشاعرہ میں جن شعراء نے اپنا کلام سنایا اُن میں سے چند شعراء کے اشعار پیشِ خدمت ہیں۔ یہ بھی بتاتے چلیں کہ یہ مشاعرہ سید وزیر شیرازی کی صدارت میں ہوا اور سٹیج سیکریٹری کے فرائض رشک ترابی نے سرانجام دیئے۔

تمکین شیرازی کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔

وفا کا سورج عروج پر ہے، چمک رہی ہے یہ بزمِ ہستی
شجر شجر پہ نکھار آیا، گلوں پہ چھائی ہوئی ہے مستی

لگے ہاتھوں اپنے راغب شکیب کے بھی چند اشعار ملاحظہ کر لیں

گر کے زمیں پہ خون جو مہکا حسینؑ کا :: جاں دے کے نام ہو گیا اونچا حسینؑ کا
ہر سمت دشمنوں کی تھی یلغار سی مگر :: سینہ سپر تھا حوصلہ تنہا حسینؑ کا
تو تا بدن تو خاک سے ملی چمک اٹھی :: موتی تھا خون کا ہر اک قطرہ حسینؑ کا

ایک بند رشک ترابی کا حاضر ہے۔

آئینے جو وقتِ محوِ گفتگو ہونے لگے :: ضو فشاں ہر سو چراغ جستجو ہونے لگے
قبلہ رو جب اہلِ بزمِ رنگ و بو ہونے لگے :: آسمانوں پر فرشتے باوضو ہونے لگے
عظمتِ دینِ الٰہی مسکرانے لگ گئی :: ہوش کے کانوں میں یہ آواز آنے لگ گئی

پرویز بزمی نے صرف دو شعر سنائے ؎

وفاؤں کی قلمرو پہ تھا آئین کا سایہ :: مہیا کر دیا سایہ وہ سلطانِ وفا تو نے
وفاداری کی دنیا کا وہی آئین ٹھہرا ہے :: جو اپنے خون سے لکھا ہے کرب و بلا تو نے

بزرگ شاعر وزیر شیرازی نے ولادتِ امام حسینؑ سنائی ایک بند ملاحظہ ہو۔

نمازِ شکر امام حسنؑ بجا لائے :: بہ اہتمام گلِ تہنیت سجا لائے
نظر میں شوق کی رنگینیاں لبا لب تھیں :: زبانِ پاک پہ یہ حرفِ مدعا لائے
ہمیشہ نخلِ تمنا ہرا رہے یا رب
خزاں کی آنکھ سے یہ گل بچا رہے یا رب

تَوارُدْ

حضرت رتن پنڈوری

تَوارُدْ بفتح اول وثانی وضم رائے مہملہ باہم یک جا فرود آمدن از منتخب وکنز وغیاث وباصطلاح شعرا واقع شدن مصرع یا بیت از طبع دو شاعر بے اطلاع یک دیگر "گویا ایک ہی مضمون کا دو یا کئی شاعروں کے ذہن میں آنا توارُد کہلاتا ہے۔ صاحب حدائق البلاغت کا قول بھی یہی ہے کہ "اگر کوئی ایسا موزوں شعر لکھے کہ وہی بعینہٖ کسی دوسرے کے دیوان میں نکل آئے اور اس کہنے والے کو اصلا اس پر اطلاع نہ ہو تو اس کو توارُد کہتے ہیں۔ توارُد فی الاصل ارتقائے ذہن اور جودتِ طبع کی صحیح آزمائش ہے۔ کیونکہ زبان ومحاورات کے کیمیائی اجزا سے مدد لے کر حسنائے سینہ میں دوبارہ رنگ بھرنا اس پر بیان کی شوخی۔۔ زبان کی صفائی اور محاورے کی بے تکلفی سے خراج تحسین وآفرین وصول کرنا آسان کام نہیں۔

اگر اساتذۂ ماضی کے دواوین کی ورق گردانی کی جائے تو مشکل ہی سے کوئی ایسا مضمون ملے گا جو بہ تبدیل الفاظ اساتذۂ سلف نظم نہ کر چکے ہوں۔ تشبیہات جدیدہ اور خیالات نادرہ کی تلاش محال نہیں تو دشوار ترین ضرور ہے۔ اسی سے بعض نکتہ رس حضرات طعنہ زن ہیں کہ۔

"خیالات نادرہ کا جب ان شعرا کے یہاں قحط ہو اور قدما کے مضامین الٹ پلٹ کر بیان کرتے ہوں تو ان کو "سابقین الاولین" کی ہم نشینی کا کوئی حق نہیں اور نظم نگاروں کی صفِ اول میں ان کو جگہ نہیں ملنی چاہئے۔ اگر انھوں نے میر اور درد کے رنگ میں بعض اشعار کہے تو کیا صاف دیے و درد ہے مگر جھوٹی۔ ظاہری چمک دمک سے نگاہوں کو خیرہ کرنے والی اشرفی ہے۔ مگر کھوٹی !!

اگر اپنے وقت کے سودا و مصحفی مشہور ہوئے تو کیا؟ محض طلا رجیسے آئینہ میں مہر جہاں تاب کی تنویر !! اور اگر میر سوز ثانی یا رشک جرأت سمجھے گئے تو کیا؟ صرف لفظی، جیسے کاغذ پر گلِ تر کی تصویر !!۔

لیکن علما اور ناقدین نے معترضین کی ان طویل دلائل کا جواب چند الفاظ میں دے کر ان کا منہ بند کر دیا ہے۔ کہ "اگر چاند سورج نظروں سے غائب ہو جائیں تو روشنی اور رہ نمائی کی خدمت ستارے ہی انجام دیتے ہیں"

عرصہ ہوا کسی رسالے میں یہ مصرعہ طرح شائع ہوا تھا مطلع

اب اس کی آرزو ہے اور میں ہوں

اس زمین میں آٹھ دس شعرا کا مطلع یہ تھا

کمر کی جستجو ہے اور میں ہوں
عدم کی آرزو ہے اور میں ہوں

زمین ہی ایسی ہے کہ اس میں کمر کا مضمون اور کسی طرح آہی نہیں سکتا۔ مگر اس قسم کا حیرت انگیز توارُد عام زمینوں میں شاذ ونادر ہوتا ہے۔ راقم الحروف کا ایک شعر ہے جو دیوان اول فرش نظر میں اشاعت پذیر ہے

مر کے جیتا ہوں جی کے مرتا ہوں
عشق کو کامیاب کرتا ہوں

۱۹۷۳ء میں جشنِ شائق کے موقع پر "کتاب یادگارِ زمانہ" میں یہ شعر شائق فریدکوٹی کا پڑھ کر حیرت ہوئی

روز جیتا ہوں روز مرتا ہوں + عشق کو استوار کرتا ہوں

توارد میں یہ نکتہ خاص طور پر قابل لحاظ سمجھنا چاہئے کہ اگر شاعر نے کسی دوسرے کا مضمون اسلوبِ بیان سے بہت بلند کر دیا ہو تو اسے سرقہ کہنا غلط ہوتا ہے۔ اور شاعر کی اس کوشش کو مستحسن کہنا پڑتا ہے۔ توارد اور سرقہ میں فرق یہی ہے کہ توارد نا دانستہ ہوتا ہے۔ اور سرقہ دانستہ۔ علامہ تفتازانی نے مطول میں لکھا ہے کہ "سرقے کا حکم اس وقت کرنا چاہئے جب کہ ثانی کا اخذ اول سے یقینی ہو۔ ورنہ سرقے کے احکام

مترتب نہیں ہو سکتے توارد کے قبیل سے ہوگا اور جس صورت میں کہ ثانی کا اخذ اول سے معلوم نہ ہو تو یہ کہنا چاہیئے کہ فلاں شاعر نے یوں کہا ہے اور دوسرے نے سبقت کر کے اس طرح پایا ہے۔

ایک مرتبہ لشکر گوالیار میں مشاعرہ ہوا اور یہ طرح ہوئی ؏

کیا جانے لکھ دیا اسے کیا اضطراب میں

مولانا سید اکبر حسن صاحب بے خود بریلوی کا مطلع تھا ؎

ساقی کا عکسِ رُخ نہیں جامِ شراب میں
ہے آفتاب جلوہ نما آفتاب میں

انہیں دونوں میں چودھری سعید الدین حسین صاحب رئیس کھیڑہ بدایوں نے مجلس مشاعرہ ترتیب دی تھی اور وہاں بھی یہی طرح ہوئی تھی۔ مولوی احمد حسن صاحب وحشت بدایونی کا مطلع غزل بھی یہی تھا ؎

ساقی کا عکسِ رُخ نہیں جامِ شراب میں
ہے آفتاب جلوہ نما آفتاب میں

ایک کو دوسرے کے شعر سے اطلاع تو درکنار نام سے بھی واقفیت نہیں تھی اور اتنا زمانہ بھی نہیں گزرا تھا کہ ان کا شعر ان تک پہنچتا یعنی ایک ہی ہفتے میں دونوں جگہ مشاعرہ ہوا تھا۔

آبِ حیات میں لکھا ہے کہ "ایک دفعہ قلعہ دہلی میں مشاعرہ تھا۔ حکیم آغا جان عیش نے ایک شعر اپنی غزل میں پڑھا ؎

اے شمع صبح ہوتی ہے روتی ہے کس لئے
تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے بھی گزار دے

اُستاد ذوق کی غزل میں بھی اسی مضمون کا ایک شعر تھا ؎

اے شمع تیری عمرِ طبعی ہے ایک رات
رو کر گزار یا اسے ہنس کر گزار دے

دونوں خوب بہت مشہور ہیں اور بہت لاجواب بھی ہیں۔ ذوق کے شعر میں مقصود بیان در پردہ یہ ہے کہ شمع کو اپنی زندگی ہنس کر گزارنی چاہیئے۔ عیش کے شعر میں زندگی کی المناک مدت کو صبر و سکون سے گزار دینے کی تلقین کی گئی ہے۔ دونوں جگہ رو رو کر زندگی گزارنے سے منع کیا گیا ہے لیکن عیش کے شعر میں بیان کا دردناک پیرایہ اور اس کا ناصحانہ انداز گھل گھل کر زندگی بسر کرنا اور ان حالات میں بھی صبر و سکون سے کام لے کر ثابت قدم رہنا ایسی باتیں ہیں جو اس شعر کو ممتاز درجہ پر فائز کرتی ہیں چوں کہ تاثیرِ کلام انہیں چیزوں پر انحصار رکھتی ہے۔ اس لئے عیش کا شعر برتر سمجھنا چاہیئے شاید یہی وجہ ہو کہ ذوق نے اپنا شعر سنانے سے پہلے جب یہ شعر سنا تو اپنا شعر اپنی باری پر نہ سنانے اور اسے چھوڑ دینے کا ارادہ کیا۔ مگر احباب نے اس کے خلاف رائے دی۔

چوں کہ ایک ہی مضمون کو بیان کرنے کے صدہا اسلوب ہوتے ہیں اس لئے بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ مضمون تو واحد ہو مگر بیان کرنے کا عالم جداگانہ ہو۔ شعر کی یہ صورت ایسی ہے کہ اس کے درجے کا اندازہ کرنے کے لئے شاعر کے ذہنی ارتقاء پر غور کرنی پڑتی ہے اور یہ سوچنا پڑتا ہے کہ تکمیلِ بیان میں کون زیادہ کامیاب رہا۔ مثلاً

رتبہ ملا اسے جو وطن سے نکل گیا
وہ پھول سر چڑھا جو چمن سے نکل گیا

خنجر کھنچا میان سے چمکا میانِ صف
جوہر کھلے جو مرد وطن سے نکل گیا

یہ شعر دو بلند پایہ مشاہیر کے ہیں۔ دونوں شعروں میں ایک ہی زمین ایک ہی مضمون یہاں تک کہ تمثیلات میں متحرک ہونے کی وحدت پائی جاتی ہے۔ مگر بایں ہمہ پہلا شعر اس وجہ سے کہ مطلع ہے۔ دونوں مصرعے برابر اور بہت مضبوط ہیں۔ زیادہ قابلِ داد اور لائقِ توصیف ہے ؎

مونس تھا ہجر میں نہ کوئی غم گسار تھا
بس ایک میں تھا ایک دلِ بے قرار تھا

ہم تھے شبِ فراق تنہا یا خدا کی ذات
کوئی انیس تھا نہ کوئی غم گسار تھا

دونوں جگہ بے بسی کا مضمون ہے۔ دوسرے شعر میں لفظ تنہا محض خدا کی رعایت سے بطور ضلع لایا گیا ہے۔ درحقیقت یہ ناسزا اور حشو ہے۔ یہ شعر مطلع بھی نہیں ہے۔ پہلا شعر مطلع ہے۔

اور مصرع ثانی بھی محسوس، بہت مضبوط اور بہت زوردار ہے لفظ کا کام تک نہیں۔ اس لئے یہ شعر بہت بڑھا ہوا ہے۔ مرزا غالب فرماتے ہیں ؎

وعدہ آنے کا وفا کیجئے یہ کیا انداز ہے
تم نے کیوں سونپی ہے اپنے گھر کی دربانی مجھے

حضرت ذوق کا شعر اسی مضمون کا ملاحظہ ہو ؎

نزع میں بھی ذوق کو بس تیرا ہی ہے انتظار
جانبِ در دیکھتا ہے جبکہ ہوش آجاتا ہے

دونوں شعروں میں انتظار کی شدت دکھائی گئی ہے اور مرزا نے اپنے خاص انداز میں مصرع ثانی اتنا دل آویز۔ دل دوز اور دلکش کہا ہے کہ انتظار کی پوری تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے اور دلِ منتظر کی دل سوزی دبے قرار ی مکمل طور پر جلوہ گر کر کے دکھائی ہے۔ لیکن جب غور کریں تو محسوس ہوتا ہے کہ ذوق کے یہاں یہ شدت بہت زیادہ ہے جس کا ثبوت پہلے تین لفظوں میں دیا گیا ہے۔ گویا ذوق کی بنائی ہوئی تصویر انتظار ہر پہلو سے زیادہ واضح زیادہ روشن اور زیادہ مکمل ہے۔ کیونکہ اس انتظار کا کیا ٹھکانا جو نزع میں بھی جانبِ در دیکھنے پر مجبور کر دے۔ جرأت فرماتے ہیں ؎

جو موت آئے تو پہچانے نہ مجھ کو
ہوا ہوں ہجر میں لاغر یہاں تک

امیر مینائی کا ارشاد ہے ؎

لاغر ہوں اس قدر کہ مجھے پہچانتی نہیں
رہ رہ کے دیکھتی ہے قضا سر سے پاؤں تک

دونوں شعروں میں مضمون مشترک ہے کہ کمزوری کے سبب صورت اس قدر تبدیل ہو چکی ہے کہ موت پہچان نہیں سکی۔ مگر امیر کے شعر کو محاکات کا رنگ سے اڑا ہے اس کے علاوہ جرأت کا بیان صرف اس بات پر ختم ہو جاتا ہے کہ موت مجھے نہیں پہچان سکتی۔ امیر نے نہ پہچاننے کی کیفیت بیان کر کے ثبوت بھی بہم پہنچایا ہے کہ قضا حیران ہو کر مجھے سر سے پاؤں تک رہ رہ کے دیکھ رہی ہے۔ اس میں محاکات کا رنگ بدرجہ اتم ہے۔ جب کوئی آدمی دوسرے کو نہ پہچانے تو بار بار اسے سر سے پاؤں تک دیکھتا ہے۔ امیر کے مصرع ثانی میں "رہ رہ کے" کا ٹکڑا نہایت ضروری ہے۔ محاکات اور شعر کی جان ہے۔ حضرت احسن مارہروی فرماتے ہیں ؎

ٹوک دے اے ضبط جو آنسو کہ چشمِ تر میں ہے
کچھ نہیں بگڑا ہے اب تک گھر کی دولت گھر میں ہے

ہجر شاہجہاں پوری کا ارشاد ہے ؎

خانۂ دل سے نہ نکلے آرزو یوں ہی سہی
ہم سمجھ لیں گے ہمارے گھر کی دولت گھر میں ہے

ان شعروں میں ایک جگہ آنسو کو گھر کی دولت کہا گیا ہے اور دوسری جگہ آرزو کو۔ باقی اسلوب بیان دونوں جگہ متشابہ ہے۔ اگرچہ ہجر صاحب نے اپنے شعر میں آرزو کی ناکامی پر اضطراب دل کی مکمل تصویر کشی کی ہے۔ اور مصرع ثانی میں اپنے دلِ وارفتہ کو سمجھایا بھی خوب ہے مگر اس میں خلل یہ ہے کہ اگر آرزو کو گھر کی دولت کہا گیا ہے تو اس دولت کو گھر سے نکالنے کا ارمان کیا معنی۔ گو آنسو بھی دوست بھی ایک متاعِ عشق ہے۔ مگر کسی حد تک بعید الفہم اور محلِ نظر۔ محض دل کی تسلی کے لئے یہ سمجھ لینا کہ وہ گھر ہی میں رہ گئی دولت کو قابلِ قدر دولت ظاہر نہیں کرتا۔ دونوں شعروں میں احسن صاحب کا شعر بصورت مطلع۔ حسنِ بندش کو پوری شان اس میں موجود ہے۔ اس لئے احسن صاحب ہی کا شعر قابلِ ترجیح ہے۔

عمر بھی کیا چیز ہے جتنی بڑھی اتنی گھٹی
اس ترقی میں نظر آیا تنزل کا جواب

خوش عبث ہوتے ہیں ادواں ماہ نو کو دیکھ کر
اک مہینہ عمر کا کم ہو چلا ہے ہر ماہ میں

پہلا شعر تسلیم لکھنوی کا اور دوسرا ناسخ کا ہے۔ نتیجہ اخذ کرنے میں دونوں کی فکر رسا ایک ہی نقطہ پر پہنچی ہے مگر ناسخ کے شعر میں زیادہ صفائی زیادہ وضاحت اور زیادہ صراحت کے ساتھ ساتھ ایک خاص بہاؤ اور بیانیہ انداز میں شعر کو خالق اور ممتاز بنا دیا ہے۔ خواجہ آتش

فرماتے ہیں ؎

پیری میں آئی موت جوانی گزر گئی
جاگا تمام شب میں دمِ صبح سو گیا

میر تقی کا ارشاد ہے۔

عہدِ جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

دونوں شعروں میں موت کو آرام سے، بڑھاپے کو صبح سے اور جوانی کو رات سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لیکن اندازِ بیان میں جو درد و اثر دوسرے شعر میں ہے پہلے میں نہیں۔ اس لئے دوسرا شعر بہتر ہے "رو رو کاٹا" کے ٹکڑے میں دورِ شباب کو شدائد و مکائد کو مفصل طور پر حل کر دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں موت کو "آنکھیں موندنا" کے محاورے میں بند کر کے شعر کو چار چاند لگا دیئے گئے ہیں۔

مندرجہ بالا امثلہ گو نمونہ از خروارے کے مصداق ہیں مگر ان سے صاف عیاں ہے کہ مختلف زمینوں میں مضامین کا تصادم اکثر ہوتا رہتا ہے اور یہ تصادم دو ذہنوں کی رسائی اور پروازِ تخیل کا صحیح پیمانہ ہے۔ ایسی غزلیات میں جو ہم طرح ہوں اور ایسے اشعار میں جو ہم قافیہ ہوں مضامین کے لڑ جانے یا توارد ہو جانے کا زیادہ امکان ہوتا ہے۔ اور اس سے بھی آگے بڑھ کر کسی مصرع پر گرہ لگانے کی مثالیں بہت دلچسپ ہوتی ہیں۔ ذوقِ سلیم کو ان امثلہ سے کسی شاعر کی ذہنی بلندی یا وسعتِ فکر کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہوتا۔ مضامین کے توارد و تصادم کی مثالوں سے دواوین بھرے پڑے ہیں لیکن "ہر چہ گیرد مختصر گیرد" پر عمل کر کے ذیل کی مثالوں پر اکتفا کی جاتی ہے۔

میر ؎ سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

سودا ؎ سودا کے جو بالیں پہ ہوا شورِ قیامت
خدامِ ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

غالب ؎ آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا

عرفی شیرازی ؎ من آں نیم ز جاں ... با تیغ و کفن
تا در جلاد بہ غزل خواں رفتم

غالب ؎ محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

عرفی شیرازی ؎ ہر کس نشناسندۂ راز است وگرنہ
ایں ہمہ راز است کہ معلوم عوام است

غالب ؎ عمر بھر دیکھا کئے مرنے کی راہ
مر گئے پر دیکھئے دکھلائیں کیا

ذوق ؎ اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

داغ ؎ آرام کے لئے ہے تمہیں آرزوئے مرگ
اے داغ اور جو چین نہ آیا فنا کے بعد

امیر مینائی ؎ صحرا سے اے جنوں مجھے انکار تو نہیں
لیکن وہ گھر جو ہاں بھی گزارا نہ ہو سکا

دیکھئے پانچوں استادوں نے ایک ہی بات کو اپنے اپنے اسلوب بیان سے کیا کیا رنگ دیا ہے۔

امیر مینائی ؎ اے حضرتِ دل بتوں کو سجدہ
اتنا تو نہ بھولئے خدا کو

مومن ؎ الٰہی ہم جو دیارِ صنم پہ دمِ وداع
مومن خدا کو بھول گئے اضطراب میں

امیر مینائی ؎ شیخ کعبہ سے گیا اس تک برہمن دیر سے
ایک ہی دونوں کی منزل پھیر تھا کچھ راہ کا

میر درد ؎ شیخ کعبہ ہو کے پہنچا ہم کنشتِ دل میں ہو
درد منزل ایک تھی ٹک راہ ہی کا پھیر تھا

داغ دہلوی ؎ وہی وحشت ہے وہی خار وہی ویرانہ
دشت کس بات میں اچھا ہے مرے کاشانے سے

غالب ؎ کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

امیر مینائی ؎ دل وہی آنکھیں وہی لیکن جوانی وہ کہاں
ہائے اب وہ تاکنا اور جھانکنا جاتا رہا

بقیہ صفحہ ۲۹ پر

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

ایس۔ ایم عابد نقوی
لندن

رات کے تاریک سائے پھیلتے جا رہے تھے اسی کے ساتھ ساتھ پارٹی کی رونق بھی بڑھتی جا رہی تھی رات کے آٹھ بجے تھے۔ پارٹی کی رونق اپنے شباب پر تھی فقرئی قہقہے اور جام سے جام ٹکرانے کی ملی جلی آوازوں سے میوزک کی آواز ہم آہنگ ہو رہی تھی۔ جس سے لطف اور سرور بڑھ رہا تھا

ہال میں ہر طرف لوگ خوش گپیوں میں مصروف تھے اس پارٹی میں شہر کے بڑے بڑے رئیس اور حکومت کے بڑے بڑے عہدہ دار، ان کے دوست بیویاں سب ہی مدعو تھے۔

مس مارگیٹ بظاہر خوش تھی اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی مگر اندر ہی اندر وہ بے چین تھی کیونکہ اسے مسٹر جارج کا انتظار تھا۔

— مارگریٹ اچھی شکل و صورت کی نوجوان لڑکی تھی۔ اور اس نے اپنی تعلیم حال ہی میں مکمل کی تھی۔ اس کے والدین کا شمار شہر کے بڑے رئیسوں میں ہوتا تھا۔ جارج کو مارگریٹ کے ڈیڈی نے پالا تھا کیونکہ اس کے والدین اس کے بچپن ہی میں ایک حادثہ کا شکار ہو چکے تھے۔ اس وقت اس کی عمر سات سال کی تھی۔ مارگریٹ کا باپ اس کو اپنے گھر لایا۔ اور تعلیم دلائی۔ مزید اعلیٰ تعلیم کیلئے اسے باہر بھیج دیا تھا یہ پارٹی دراصل اس کے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے اور گھر واپس آنے کے سلسلہ میں دی گئی تھی۔ جس میں مارگریٹ کی خواہش شامل تھی۔ اس کی وجہ دونوں نے ایک ساتھ بچپنا گزارا تھا۔

ابھی تک جارج گھر نہیں پہنچ سکا تھا۔ اسی وجہ سے مارگریٹ پریشان تھی۔ دراصل اسی پارٹی میں اس کے والد اس کی منگنی کا اعلان کرنے والے تھے۔

جارج اسی رات کو آٹھ بجے کی فلائٹ سے پہنچنے والا تھا مگر شاید اس کی فلائٹ لیٹ ہو گئی تھی اس لئے وہ کافی دیر سے پہنچا۔

جیسے ہی وہ حال میں داخل ہوا مارگریٹ کا چہرہ خوشی سے سرخ ہو گیا۔ اس نے کافی عرصہ کے بعد جارج کو دیکھا تھا۔

تھوڑی دیر بعد دونوں کی منگنی کا اعلان کر دیا گیا۔ اس وقت جارج کے چہرے پر کوئی "تاثرات" نہ تھے۔ مگر مارگریٹ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔

دوسرے دن صبح جارج نے اپنی واپسی کا اعلان کر دیا مارگریٹ کے والد نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی مگر جارج کو کوئی بہت ضروری کام تھا جس کی وجہ سے اس کا جانا بھی ضروری تھا۔ مجبوراً سب کو اجازت دینا پڑی

روانہ ہونے سے پہلے جارج نے مارگریٹ کو بہت خوبصورت اور "نازک سا قلم" دیا۔ اور چلتے وقت بس اتنا کہا "یہ کبھی فرصت ملے تو اسے دیکھ لینا"

چلتے وقت جارج کے یہ آخری الفاظ تھے مارگریٹ نے بڑی مشکل سے دل پر جبر کرتے ہوئے پیار سے رخصت کیا۔

بچپنے میں دونوں نے ایک ساتھ کس محبت و پیار سے وقت گذارا۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے بیرون ملک جانے سے پہلے عہد و پیمان کئے۔ اب جس وقت کا انتظار کر رہی تھی چند لمحوں میں گزر گیا۔

..... آج جارج کو گئے ہوئے پورے چالیس سال ہو گئے تھے۔

مارگریٹ کے بالوں میں سفیدی آ گئی تھی۔ اور چہرے پر جھریوں کے نشان صاف نظر آنے لگے تھے۔

مگر مارگریٹ ان تمام وقت کی تبدیلیوں کے ساتھ بھی جارج کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کو ابھی تک اس کے

متعلق کوئی اطلاع نہ ملی۔ سوائے اس کے کہ وہ ایک جہاز پر کپتان کی حیثیت سے ملازم ہوگیا ہے۔ مگر وہ پھر بھی مایوس نہ ہوئی۔ اضطراب تک ناامید نہ تھی۔ ہر وقت اس کے کان کسی آہٹ پہ لگے رہتے تھے۔

جارج کی روانگی کے چند سال بعد اس کے والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس نے بہت دولت اور جائداد بھی چھوڑی۔ جس کی وہ تنہا مالک تھی اور یہ دولت تو اس کی آئندہ نسلوں کے لئے بھی کافی تھی۔

مارگریٹ کے پاس جارج کی صرف ایک یادگار تھی جسے وہ اکثر فرصت کے اوقات میں گھنٹوں دیکھتے ہوئے محو خواب ہو جاتی۔

والد کے انتقال کے بعد اسے شادی کے کئی پیغام آئے مگر اس نے ایسی تمام تجویزوں کو سختی سے ٹھکرا دیا۔ اسے صرف جارج کا انتظار تھا۔

اب وہ بڑی چڑچڑی اور بدمزاج ہو چلی تھی۔ اکثر ملازموں کو ڈانٹتی۔ اس کا یہ حال ہو گیا تھا ذرا سی بات بھی اس پر بار گراں ثابت ہوتی۔

آہستہ آہستہ شام کے سائے گہرے ہو چلے تھے۔ مارگریٹ اپنی مخصوص میز پر بیٹھی بڑی محویت اور جذباتی انداز سے اس قلم کو دیکھنے میں منہمک تھی۔ اس کی نظر کھڑکی کے باہر سامنے سے آنے والی سڑک پر لگی ہوئی تھی اور حسب عادت جارج کے قدموں کی چاپ سننے کے لئے بے تاب تھی۔

اس کی ملازمہ نے آکر کمرے کی روشنی جلائی تو اسے احساس ہوا۔ اندھیرے کمرے میں بیٹھی تھی۔ ملازمہ نے بتایا کہ کھانے کی میز پر چلئے کھانا لگ گیا ہے۔

مارگریٹ نے آہستہ سے سر کو ہلایا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ جس وقت وہ قلم اٹھا کر میز کے دراز میں رکھنے جا رہی تھی تو قلم ہاتھ سے پھسل کر فرش پر گرا۔ وہ اتنا نازک تھا کہ گرتے ہی کئی ٹکڑے ہو گئے۔ بے اختیار مارگریٹ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اور وہ جھک کر ان ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو جمع کر رہی تھی کہ اس کی نظر کاغذ کے ایک پرزے پر پڑی جو قلم کے ٹوٹے ہوئے ایک حصہ میں پھنسا ہوا تھا۔ اس کاغذ کے پرزے کو نکالا تو اس پہ مارگریٹ کے نام ایک خط تھا۔

ڈیر مارگریٹ!

مجھے معلوم ہے کہ تم مجھ سے پیار کرتی ہو مگر میں شادی کر چکا ہوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ گھر پہنچ کر سب کچھ اس ملاقات پہ کہنا چاہتا تھا۔ ۔ ۔ مگر چچا جان نے مجھے کچھ کہنے کی مہلت ہی نہ دی۔ پھر یہ کہ ان کے مجھ پر بہت سے احسانات ہیں جن کی وجہ سے کچھ کہنے کی جرأت بھی نہ کر سکا۔ ۔ ۔ میں اب بھی دل میں تم بسائے ہوئے ہوں۔ لیکن مجبور ہوں۔ ۔ ۔ ۔ امید ہے مجھے معاف کر دو گی۔ ۔ ۔ ۔

آخری سطر پڑھتے پڑھتے مارگریٹ کا بدن ٹھنڈا ہو چکا تھا حرکت قلب بند ہو چکی تھی۔ ۔ ۔ ۔ (ترجمہ)

بقیہ صفحہ ۲۵ کا

رند ۔ رہا شباب تلک تاک جھانک کا لپکا
وہی ہیں آنکھیں ولیکن وہ دیکھ بھال نہیں

داغ ۔ اچھی صورت کی رہا کرتی تھی اکثر تاک جھانک
رہ گئیں آنکھیں مگر وہ دیکھنا جاتا رہا

داغ ۔ ہائے بیتابی شب وعدہ ترے مجبور کی
اکثر اٹھتے ہم نے دیکھا اس کو اکثر بیٹھتے

رند ۔ کیا کہوں رات غضب لائی تھی کیا کیا جانی
کبھی اٹھتا، کبھی بیٹھا۔ کبھی ٹہلا جانی

جلیل شاہجہانپوری ۔ نہ وہ آرام جاں آیا نہ موت آئی شب وعدہ
اسی کشمکش میں ہم اللہ اللہ کر کے اٹھتے بیٹھے ہیں

غالب ۔ مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں
شایان دست و بازوئے قاتل نہیں رہا

نظیری نیشاپوری ۔ آں تنکا مر من کہ بہ لائق بکشتن نیستم
شرم می آید مرا از عکس کہ میادمن است

خاک نشیں ۔ دتی پھلندی

مَن کہ مکتوب الیہ

شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

برادرِ محترم آداب و نیاز

ہماری زبان کے یکم جون ۸۰ء اور یکم جولائی ۸۰ء کے شمارے میں "اردو شعرا کا پہلا تذکرہ" کے عنوان سے دو مختصر مضمون دیکھ کر ملال ہوا۔

قدیم تذکروں سے متعلق ڈاکٹر حنیف نقوی کا تحقیقی مقالہ کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔ اس سے بہت پہلے مولانا امتیاز علی خاں عرشی دستور الفصاحت کے دیباچے میں کہیں تذکروں کے زمانے وغیرہ سے متعلق بحث کر چکے تھے۔ نکات الشعراء کو مولوی عبدالحق مرحوم کے بعد پروفیسر محمود الہٰی نے بھی ایک مبسوط اور عالمانہ مقدمے کے ساتھ کئی برس ہوئے شائع کر دیا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے کی کسی بحث میں ان کتابوں سے صرفِ نظر کرنا نہایت نامناسب ہے۔ خود ہماری زبان کے صفحات میں پچھلے سال جون جولائی کے شماروں میں راقم سطور نے بعض قدیم ترین تذکروں سے متعلق جن میں نکات الشعراء اور گلشن گفتار بھی شامل ہیں الگ الگ مضامین شائع کیے تھے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ حالیہ دونوں مضمونوں میں ان میں سے کسی ایک کا بھی حوالہ نہیں پایا جاتا۔

لہٰذا میں نے شاید "نئی" کے "معاصر ادب نمبر" میں اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ اردو کے بعض نامور اور بزرگ اساتذہ بوجوہ اپنے ماخذ کا حوالہ دینا پسند نہیں کرتے۔ اس باب میں زیادہ افسوس اس وقت ہوتا ہے جب تحقیق کا نام لینے والے ایسا کرنے لگیں۔ اس سلسلے میں محض مثالاً یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ پچھلے دنوں جب ڈاکٹر تنویر احمد علوی صاحب کی نہایت عالمانہ تصنیف "اصولِ تحقیق و ترتیبِ متن" موصول ہوئی تو اس کے مشتملات اجمالاً خود کو دیکھ کر مجھے اپنا مضمون "تدوینِ متن کے اصول و مدارج" یاد آیا جو مسلم یونیورسٹی کے مجلہ فکر و نظر میں شائع ہوا تھا۔ اس میں میں نے تدوین کے درج ذیل چھ شعبے بیان کیے تھے۔

فراہمی متن ۔ ترتیب متن ۔ تحقیق متن ۔ تصحیح متن
تنقید متن اور تحشیہ۔

مقدمہ اور تعلیقات وغیرہ ان کے علاوہ ہیں۔ بعد میں انہی مدارج کے مطابق اردو میں تدوین کے چند اہم ترین کارناموں کا جائزہ الگ الگ مضامین کی صورت میں ماہنامہ قومی زبان کراچی میں "اردو میں تدوین" کے عنوان سے کئی ماہ تک شائع کرتا رہا۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ پاکستانی رسائل کی فراہمی ہمارے لئے بہت دشوار ہوتی ہے لیکن تعجب اس پر ہے کہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی صاحب جیسے کہنہ مشق اور باصلاحیت شخص کو علی گڑھ سے چھپنے والے رسالے فکر و نظر کا وہ شمارہ دستیاب نہ ہو سکا جس میں میرا مذکورہ مضمون چھپا تھا۔ بایں ہمہ یہ بات بڑی طمانیت بخش ہے کہ علوی صاحب نے اپنی زیرِ نظر کتاب میں تدوین کے جو شعبے مقرر کیے ہیں کم و بیش وہی ہیں یعنی:

تالیف متن ۔ تنقید متن ۔ تحقیق متن ۔ تصحیح متن ۔
ترتیب متن۔ اور تحشیہ متن

تعلیقات ان چھ کے علاوہ ہے۔

میں علوی صاحب کی علمی استعداد کا نہایت معترف ہوں اور اس ذکر سے ان کی عالمانہ تصنیف کی اہمیت کو کم کرنا مقصود نہیں ہے۔ البتہ میں جو کچھ چاہتا ہوں یہ ہے کہ کسی موضوع پر کام کرتے ہوئے دوسروں کے کاموں کی طرف بھی توجہ کر لینے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

جہاں تک گلشن گفتار کی اولیت کا مسئلہ ہے میری ناقص رائے میں اس کی تردید موجودہ معلومات کے مطابق نہیں ہوتی۔ البتہ نکات الشعراء کے بارے میں یہ دعویٰ کہ وہ ۱۱۶۵ھ میں مکمل ہو چکا تھا محض بے دلیل ہے۔

اس سلسلے میں تفصیل سے اپنے خیالات پہلے قلمبند کر چکا ہوں۔ فقط

ڈاکٹر محمد الضیاء اللہ
۲۱/۷/۸۸

سہارنپور

محترم سرورؔ صاحب تسلیم

آپ کی صحت یابی باعثِ مسرت ہوئی۔ بارگاہِ ایزدی میں شکریہ ادا کیا کہ اس نے عاشقانِ اردو کی دعاؤں کو شرفِ قبولیت بخشا۔ خدا آپکی عمر دراز کرے۔ اور قوتِ جمالی وداعی عطا کرے تاکہ آپ اسی طرح زبان وادب کی خدمت انجام دیتے رہیں۔ آمین۔

میں دو سوال پیش کر رہا ہوں اگر مناسب سمجھیں تو ان کا جواب بذریعہ شانِ ہند[1] مرحمت فرمائیں تاکہ دوسرے پڑھنے والے بھی مستفیض ہو سکیں۔

(۱) آل انڈیا ریڈیو نئی آکاشوانی سے روزانہ سنسکرت زبان میں خبریں نشر کی جاتی ہیں۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ یہ خبریں کس ملک کے باشندوں کی سماعت کے لئے یا دنیا کے کس خطہ کے مفاد کے لئے نشر کی جاتی ہیں۔ اور ہندوستان میں وہ کون لوگ ہیں جو یہاں کی چودہ پندرہ مستند زبانوں میں خبریں نہیں سمجھتے اور ان کے لئے دس پندرہ منٹ ضائع کئے جاتے ہیں آخر اس کا کیا مقصد ہے ؟

(۲) سرکار اردو کی بڑی حمایتی نظر آتی ہے۔ اور دو زراور ریاستوں میں اردو کی فلاح وبہبود کے لئے دو ایک جملے ضرور فرما دیتے ہیں۔ لیکن ریڈیو پر اردو سکھانے کے اسباق نشر کئے جانے لگیں تو کم از کم شمالی ہندوستان میں بہت سے لوگ اردو سیکھ لیں گے جو ان کے لئے مفید اور کارآمد ہوگی۔ شمالی ہند کے لوگ تامل تیلگو یا ملیالم سیکھ کر کہاں استعمال کریں گے جب کہ اردو ہر گھر میں استعمال ہوتی ہے۔

اب تیسری بات عرض ہے آپ مجموعۂ کلام کی اشاعت کا برابر اعلان فرماتے ہیں۔ شاعری کے متعدد مجموعے ہر سال شائع ہوتے ہیں لیکن نثر کی اشاعت کی طرف کم توجہ دی جاتی ہے۔ کیا اردو ادب محض شعر وسخن کا ہی نام ہے؟ اگر آپ اس طرف بھی توجہ دیں تو بڑا کام ہوگا۔ حیدرآباد سے ڈاکٹر مجن طالب آبادی

نے میری تازہ تصنیف مثنوی داستانِ حیات عرف حیاتِ مسیح ضرور آپ کی خدمت میں بھیج دی ہوگی۔ آپ سے درخواست ہے اس پر نظر ڈالکر ایک تبصرہ حوالہ قلم فرمادیں۔ احسان ہوگا۔

(ناچیز قربان)

بمبئی، ۲۷ر جولائی ۱۹۸۸ء

پیارے سرورؔ بھائی

تسلیم و آداب،

دہلی سے لوٹنے کے بعد میں بھی خاموش رہا اور آپ بھی۔ پھر بھی "شانِ ہند" جو پابندی سے مل رہا ہے اس کے ذریعہ غائبانہ ملاقات ہوتی رہی۔ دہلی سے واپسی پر مجھ چار روز کے بعد (FISHER) نے پریشان کر دیا۔ یہ از قسم بواسیر نام کی ایک بلا ہے اور اس نازک جگہ پر حملہ کرتی ہے جس کی آبرو بچانے کے لئے بچپن سے جوانی تک کتنی تگ ودو کرنی پڑتی ہے۔ دو دن چلتے تڑپتا رہا اور پھر آپریشن کی نوبت آئی، "مقعد" کھولنے کے بعد پتہ چلا کہ افاقہ ہو چکا ہے اور آپریشن کی ضرورت نہیں لیکن ایک ڈاکٹر کے ہاتھوں عزت ساتواں گئی۔ اب اچھا بھلا ہوں امید کرتا ہوں کہ آپ بھی خوش وخرم ہوں گے، حضرتِ "دل" کیسے ہیں۔ پرہیز رکھیئے گا اور کسی قسم کی فکر دامنگیر نہ ہونے دیجئے گا۔ بھولے یار ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کا سلسلہ جاری رکھئے یہ ایک تاریخی چیز ثابت ہوگی۔ امید ہے جلد از جلد جواب سے نوازیں گے۔

(آپ کا راجندر کرشن

رئیس اکاڈمی۔ کراچی ۱۹۸۸ء

برادرم سرورؔ تونسوی دعائیں اور پیار

آپکا خط مجھے کافی تاخیر سے ملا۔ نجانے کیوں ؟ الحمد للہ کہ آپ خیریت سے ہیں۔ تشویش رفع ہوگئی۔ شانِ ہند کے لئے چشم براہ رہتا ہوں۔ سائرہ بانو کو دعائیں۔ حافظ محمد یوسف صاحب سے ملاقات ہو تو میرا سلام شوق عرض کر دیں نجانے آپ حضرات سے کب ملاقات ہو؟ سارے دوستوں کی خدمت میں میرا سلام عرض کر دیں۔

پوچھتی ہے ہر اک صبح آ کے صبا نسیم
کوئی پیام کسی یارِ آشنا کے لئے

سید محمد تقی (سابق چیف ایڈیٹر)
۔۔۔ جنگ اخبار لندن

---

[1] تفصیلات ماہ اکتوبر کی اشاعت میں ملاحظہ فرمائیں۔ (سرورؔ تونسوی)

بیگ ہمید عباس (عالمی ڈائجسٹ) اور جناب ہیبیا نے مجھ سے باصرار کہا ہے کہ آپ کو لکھا جائے سلام کم کیجئے۔ امام سمجھئے۔ یہ تینوں بھائی آپ کی خدمت میں سلام عرض کرتے ہیں۔

(رئیس امروہی۔ م)

بھارتی براورز، کلکتہ ۔ ۳ اگست

محترم بھائی خلوص بیکراں ۔

آپ کا شفقت نامہ ملا ۔ اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ کب تک آئیں گے آپ کلکتے ؟

خادم کو روانگی سے پہلے اطلاعی خط ضرور لکھیئے۔ بھگوان بھی کہیں بھگت سے گھبرا سکتا ہے! آرزو صاحب اب بہتر ہیں۔ آپ کا خط ملتے ہی میں قصرِ ادب (آرزو صاحب کا آفس) دوڑ پڑا اور تشنہ تشنہ واپس چلا آیا۔ ملاقات نہ ہونے سے تھکاوٹ کا احساس ہونے لگا۔ وہ خالص ہندو محلہ میں رہتے ہیں۔ کئی لوگوں سے موصوف کا ذکر کیا لیکن لوگوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ تھک ہار کر ایک دوکان پر چائے پینے بیٹھ گیا جو کہ موصوف کے مکان کے قریب ہی تھی۔ اور آرزو صاحب روزآنہ دودھ اسی دوکان سے لیتے ہیں۔ بیچارے نے بڑی محبت سے سب کچھ بتا دیا۔ بڑی معصومیت سے چائے والے دوکاندار نے مجھے بتایا کہ یہاں پر تو کوئی شاعر نہیں رہتا لیکن ایک اردو کے لیکھک رہتے ہیں۔ اور کوئی ہیں۔ بوڑھے سے ہوتے ہیں۔ ۹ بجے صبح وہ باہر چلے جاتے ہیں۔ ۹ بجے رات کو واپس آتے ہیں۔ تفصیل جاننے کے لئے آپ سڑک کے اس پار ایک مسلمان کی لانڈری میں چلے جائیں۔ بہر حال وہاں سب رپورٹ مل گئی۔ ایک پرزہ لکھ کر دے دیا ہوسکتا ہے کہ وہ میرے غریب خانہ پر تشریف لے آئیں۔ آرزو صاحب ہندو ہیں! بھائی جان ایک پتے کی بات بتاتا ہوں ذرا توجہ میری طرف کیجیے۔ دیکھئے دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ آرزو صاحب تو ہندو ہیں مگر آپ نے دلی والے وفیا پرکاش جی کا نام سنا ہے نا۔ خدا کی قسم وہ ایکدم کافر معلوم ہوتے ہیں۔ دیکھئے میری عزت اور کیریکٹر کا معاملہ ہے۔ اس کو راز ہی میں رکھیے ورنہ ہوسکتا ہے کہ یاران فن کی طرف سے کہیں مجھ پر ہی کفر کا فتویٰ نہ لگ جائے۔ کیسا

دور آیا ہے کہ لوگ مسلمان ہو کر بھی ہندو کا نام رکھ لیتے ہیں ذرا سوچئے تو لیجھو رام، بالمکند، تلک، بھگتی، رگھوپتی، منوہر، ٹھاکر، کنھیا لال، ماجھنت، کرشن۔ آپ کا انکا ردواقعات اور بکھرے یادیں..... بہت انہماک سے پڑھا۔ اور بہت پسند آیا۔ اللہ کرے زور قلم..... نکہت خان کا بڑا احسان ہے کہ انہوں نے مجھے آپ جیسے بزرگ ہستی سے متعارف کرایا اللہ آپ کو اپنی امان میں رکھے۔ محتاج دعا،

ایم عالم کلکتہ

سن فلاور۔ ہل روڈ،

باندرہ، بمبئی ۵۰۔ قبلہ سرور تونسوی صاحب

تسلیمات!

امید قوی ہے کہ اب آپ پہلے سے بہتر ہوں گے۔ "شاعر ہند" کا مطالعہ میرے لئے نعمت سے کم نہیں کیونکہ اس میں آپ کے تلخ مگر حقیقت پر مبنی خیالات اور مشاعرں کی روداد بہت زیادہ دلچسپی کا باعث ہوتی ہیں۔ ممکن ہے کہ آپ کے لئے میں اجنبی ہوں۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ نے تا جبر کا نام سنا ہو۔ بہر حال میرا تعلق فلم اور اسٹیج سے ہے۔ فلموں میں کردار نگاری اور اسٹیج کے پروگراموں میں اناؤنس کرتی رہتی ہوں۔ اور آج بھی مری معروفیات آپ کی دعاؤں سے بہت زیادہ ہیں۔

میں اہل زبان تو نہیں کیونکہ میں نے جس جگہ آنکھ کھولی تھی وہاں مراٹھی زبان اور اس کا کلچر تھا اس کے باوجود مجھے شاعری کا بچپن سے ہی رہا ہے۔ مینا کماری مرحومہ سے گہرے روابط نے میرے فلمی اور غیر فلمی مصروفیات کیریر کو بلند کیا۔ اور میناجی کی صحبت نے میرے ذوق شعری کو جلا بخشی۔ اب تو یہ شوق اپنی انتہا پر ہے۔ اپنی بے پناہ مصروفیات سے تھوڑا سا وقت نکال کر مشاعرے کی جانب متوجہ ہوئی اور اب نہ صرف مشاعرے پڑھتی بلکہ مشاعرے کنڈکٹ بھی کرتی ہوں۔ مشاعروں کا فضا اور ماحول نے مجھے ایک طرح کی کشش اور تعفن کا احساس دلایا ہے تاہم خوف خدا اور سنجیدگی اور متانت نے مجھے

اچھے اور صاف ستھرے مشاعروں کے انتخاب کی طرف مائل رکھا۔ ایسا کرنے یا ہونے میں آپ کے ادبیے اور مشاعروں کی اردو ادب بڑی مددگار ثابت ہوتی ہیں

"شانِ ہند" کے مطالعے ہی نے مجھے ایک اہم ترین مگر توجہ طلب تحقیقی کام کی جانب متوجہ کیا ہے۔ اور ان دنوں میں ایک تنقیدی و تحقیقی کتاب لکھ رہی ہوں جس کا عنوان ہے "اردو مشاعروں کی تاریخ" ——— اس کتاب میں مشاعرے کی ابتدا سے آج تک کا تنقیدی جائزہ لیا جائے گا۔ اس کتاب کو میں نے دو ابواب پر مشتمل کیا ہے۔ پہلا حصہ تنقیدی جائزہ اور دوسرے مسائل ہوں گے جن کا تعلق منتظمین اور شعرا سے ہے۔ اردو زبان سے ہے۔ مشاعروں کی اہمیت افادیت نیز موجودہ دور میں مشاعروں کے تناظر میں پیدا ہونے والے مسائل کا بھرپور احاطہ ہوگا۔ چونکہ آپ کے تجربات و مشاہدات، مشاعروں شاعروں اور منتظمین کے سلسلے میں بہت زیادہ ہیں۔ لہذا آپ سے بہتر میری رہنمائی اور کون کرسکتا ہے۔ مجھے آپ کی مصروفیات اور صحت کا اندازہ ہے۔ اس کے باوجود میں بہت زیادہ پرامید بھی ہوں کہ آپ گاہے گاہے میرے استفسارات کا جواب دیتے رہیں گے۔ میرے موضوع کے متعلق آپ کی گراں قدر رائے کیا ہے؟ شعرا کے نام اور پتے حاصل کرنے کی صورت کیا ہوگی؟ میں سارے ہندوستان کی منتظمین مشاعرہ سے رابطہ قائم کرنا چاہتی ہوں یہ کس طرح ممکن ہے؟ ——— کیا آپ اس معاملے میں میری رہنمائی فرما سکتے ہیں؟

کیا آپ اجازت دیں گے کہ میں مشاعروں کی ابتدا سے آج تک کے متعلق مواد جمع کرنے کے دوران آپ سے بھی مختلف اہم امور اور گوشوں پر رہنمائی حاصل کرسکوں میں بہت جلد ایک اعلان نامہ ہندوستان کے تمام اخبارات و رسائل میں اشاعت کے لئے بھجوا رہی ہوں تاکہ شعرا حضرات براہ راست مجھ سے رابطہ قائم کرسکیں میرا یہ اقدام کیسا رہے گا؟

مجھے اپنی کتاب کے لئے اور کن کن لوگوں سے رجوع ہونا چاہئے؟ جہاں میں منتظمین سے سوال نامہ کے ذریعہ اُن کے خیالات و تاثرات جاننا چاہوں گی۔ وہیں میں بعض مشہور شعرا سے بھی سوال نامہ کے ذریعہ اُن کے تاثرات جاننا چاہوں گی تاکہ مشاعروں کی وہ اہم کڑیاں اپنے اپنے موقف اور اس سلسلے کے سارے مسائل کے تناظر میں سامنے آسکے ——— اس بارے میں کون کون شعرا اہم ہوسکتے ہیں؟ خط کی طوالت کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ اُمید ہے کہ آپ مجھے اپنی رہنمائی سے محروم نہیں رکھیں گے۔ اور اپنے ارشادات سے جلد نوازیں گے۔

آپ کی صحت کے لئے دعا گو

(سادھنا کھوٹے تمنا)

غزل

شمس یمنی کراچی

خود فریبی کے سوا شرحِ دعا کچھ بھی نہیں
ہم نے چاہا کہ بنے کام بنا کچھ بھی نہیں

ایک مدت سے ہیں گردش میں زمیں کے ذرّے
اپنے اندر جو ٹٹولا تو ملا کچھ بھی نہیں

میں بھی تنکوں ہی میں شامل تھا جب آیا طوفاں
کون ہوں، کیا ہوں مرا نام پتا کچھ بھی نہیں

ایک لڑکی نے سرِ شام مجھے روک لیا
میں نے پوچھا کہ کبھی کیوں تو کہا کچھ بھی نہیں

عافیت کیجیے چمن گلشن کی نہ پوچھو لوگو
ایک جلنا ہی سزا ہے تو سزا کچھ بھی نہیں

آنکھوں ہی سے ہے محروم یہ مشروبِ قدیم
پی گئے جام پہ جام اور نشہ کچھ بھی نہیں

کیوں یہ پھیلا ہے دھواں شمس ندی کے اس پار
جب وہاں آگ نہ لکڑی نہ چِتا کچھ بھی نہیں

معیار کی کسوٹی پر

شمعِ فروزاں

مصنف : عروج زیدی صفحات ۱۸۰ مجلد قیمت پانچ روپیہ
ملنے کا پتہ : عرفان زیدی۔ گھر سیف الدین خاں۔ رام پور (یو۔ پی)
: دفتر شانِ ہند۔ نئی دہلی نمبر۲

جناب عروج زیدی کے "تازہ شعری کارنامہ "شمعِ فروزاں" جس میں انہوں نے فکر و نظر کی نئی مشعلیں روشن کی ہیں یہی وجہ ہے کہ جدید شعری ذخیرہ میں ان کی تصنیف "شمعِ فروزاں" ایک قابلِ قدر اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس کے لئے عروج صاحب دلی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

جناب عروج زیدی فکری و ذہنی عظمت کے ممتاز اور نمائندہ شاعر ہیں۔ وہ خودداری اور عزتِ نفس کے پاکیزہ جذبات سے بہرمند ہیں وہ روائتوں کی تہہ سے جدتیں ایجاد کرتے ہیں اور اچھے خیالات کو حسن و کمال کے ساتھ شعری پیکروں میں ڈھال دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اسی لئے زیرِ نظر قطعات میں گرمیٔ دل کے ساتھ مہارت "فن" ندرتِ خیال، بلندیٔ فکر اور انوکھی جدت کی روشنی پائی جاتی ہے۔ کلام میں پختگی، شوخی اور پرکاری بدرجۂ اتم موجود ہے۔ "شمعِ فروزاں" کو ایسی تابشِ فکر سے جلا دی ہے سے

دنیا، ہم نے طبعِ سلیم پائی ہے ؞ بے زبانوں سے درس لیتے ہیں
جن کا پیشہ شجر تراشی ہے ؞ پیڑ ان کو بھی چھاؤں دیتے ہیں

جو یقیناً قدر و منزلت کے لائق ہے۔ عروج صاحب کے ذہنی اور فکری سفر کی صحیح سمت سمجھنے کے لئے "شمعِ فروزاں" کا مطالعہ ضروری ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر نسیم قریشی۔

یادوں کی برات کا خصوصی مطالعہ

"یادوں کی برات" جوش ملیح آبادی کی خود نوشت سوانح حیات ہے۔ ہر خود نوشت سوانح حیات میں ہمیشہ ایک کمی رہ جاتی ہے کہ خود ستائی[1] کے الزام سے بچنے کی مصنف کوشش کرتا ہے اور اس کوشش میں وہ اپنے کردار کے بہت سے روشن پہلوؤں کو اجاگر کرنے سے قاصر رہ جاتا ہے۔ یہ کام وہ ناقد پورا کر دیتا ہے جو ایسی سوانح حیات کا گہری نظر سے مطالعہ کر کے اپنے قلم کو حرکت دیتا ہے۔

صابر کمال صاحب قابلِ صد ستائش ہیں کہ انہوں نے جوش کی کتاب "یادوں کی برات" پر قلم اٹھا کر یہ فرض پورا کر دیا۔ ان کی کتاب "یادوں کی برات کا خصوصی مطالعہ" تاریخی اہمیت رکھتی ہے جس اہمیت کو وقتِ تصنیف خود جوش نے نظر کے سامنے نہیں رکھا تھا کیونکہ یہ اندیشہ تھا کہ اس سے ان کے حسنِ نگارش کا شعار کم ہو جائیگا۔ سچ پوچھئے تو یہ دونوں تصنیفات مل کر ایک کتاب بنتی ہے یہ صابر کمال کا کمال نگارش ہے کہ انہوں نے اپنی تصنیف کو جوش کی کتاب کا پیش لفظ یا ضمیمہ بنا دیا۔ قلم کی ایمانداری کو انہوں نے جس طرح قائم رکھی وہ اس کے لئے مبارکباد کے مستحق ہیں اور ہم ان کے لئے دعاگو ہیں :۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

کتاب کی طباعت میں ایک چیز کی کمی رہ گئی ہے کہ جلد بازی سے کام لیا گیا ہے جس سے اکثر کتابت کی غلطیاں درست ہونے سے رہ گئی ہیں۔ مصنف نے بھی اپنے دیباچے میں اس کا اعتراف کیا ہے (نیاز لکھنوی)

فردوسِ خیال

کہنہ مشق شاعر۔ ادیب اور صحافی دینا ناتھ صاحب مست کا پہلا شعری مجموعہ "فردوسِ خیال" کے نام سے بڑے اہتمام سے شائع ہوا ہے۔ اعلیٰ قسم کا کاغذ بڑا لائبریری سائز مضبوط اور خوبصورت جلد۔ لکھائی چھپائی روشن اور نظر نواز ہے مجموعہ دیکھ کر جی خوش ہو جاتا ہے۔

---

[1] حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جس قدر جوش صاحب نے اس کتاب میں خود ستائی سے کام لیا ہے آج تک کسی دوسرے مصنف نے یہ حماقت نہیں کی (ادارہ)

جناب فرش ملسیانی "فردوسِ خیال" کے دیباچے میں دوسری باتوں کے علاوہ آخر میں نہایت بجا اور صحیح بات لکھی ہے کہ جب یہ مجموعہ چھپے گا تو ہم کہیں گے کہ

"دلیس از مدت گزر افتاد بر ما کاروانے را"

تعارفی نوٹ کے آخر میں رقمطراز ہیں :-

"جس قدر نظمیں اس مجموعے میں شامل ہیں وہ "مقصدی ادب" کی نہایت عمدہ مثال ہیں۔ مست صاحب اُس شاعری کے قائل نہیں کہ جس پر گوہ کندن وکاہ برآوردن کا اطلاق ہوتا ہو۔ بلکہ اس کے علی الرغم آپ کی شاعری اقبال کے اس نظریے کی تفسیر ہے ؎

جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا
اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا"

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ فردوسِ خیال ایک نہایت دلیع، قابلِ قدر، محاسنِ شعری سے بھرپور شعری مجموعہ ہے کوئی بھی نظم پڑھیے آپ سلاست، و بلاغت، ندرت و جدتِ خیال اور مست صاحب کی قادر الکلامی حسنِ بیان اور زبان دانی کے قائل ہو جائیں گے۔ اردو شعر و ادب میں یہ ایک نہایت گراں پایہ اضافہ ہے۔

"فردوسِ خیال" کے پہلے ایک حصہ میں کشمیر سے متعلق دوسرے حصے میں نیچرل پر نظمیں ہیں۔

تیسرے حصے میں جدوجہد آزادی اور حب الوطنی پر چوتھے میں منقبہ۔ پانچویں حصہ میں اکثر شخصیات اور آخری میں رُوداد پر مشتمل نظمیں ہیں۔

مست صاحب پچھلے پچپن ۵۵ برس سے بھی زیادہ عرصے سے اردو ادب کی انتھک۔ خاموش اور بے لوث خدمت میں مصروف ہیں مجھے ذاتی طور پر علم ہے کہ مست جناب علامہ برجموہن دتاتریہ کیفی کے دامن سے پینتیس چالیس برس تک وابستہ رہے ہیں۔ فردوسِ خیال ۳۱۲ صفحوں پر مشتمل ہے۔ اور قیمت ۲۵ روپے ہے۔ جو یقیناً اردو داں طبقہ کے لئے حیران کن ہے واضح رہے کہ مجموعہ پبلیشن اردو اکیڈیمی کی طرف سے "فردوسِ خیال" کے حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ "فردوسِ خیال" دفترِ خانہ ہند سے بھی دستیاب ہے

غزل

امتیاز بے پوری

بلا انتخاب کلام کی اشاعت کا مقصد صرف یہ ہے کہ شعرا اپنے کلام کے محاسن و معائب کا خود معیار مقرر کرسکیں۔ وہ شعرا جو کسی قسم کی اصلاح یا مفید مشورے کو اپنی توہین سمجھتے ہیں اُن کے لئے بلا انتخاب کلام کی اشاعت کا سلسلہ جاری کیا گیا ہے۔

(ادارہ)

میں تماشہ ہوں تو دنیا بھی تماشائی ہے
زندگی گردشِ دوراں کو پسند آئی ہے
ایک تیرے دل میں سما پائی نہ اُلفت میری
ہر نئے غم نے مرے دل میں جگہ پائی ہے
چاندنی رات کے رنگین اُجالوں کی قسم
تیرا جانا ہی مرے پیار کی رسوائی ہے
تیری فرقت میں بجلا شام و سحر شان ایسے
یہ بھی ہوتا نہیں محسوس کہ تنہائی ہے
چشمِ رنگین ہوئی اِن میں ذرا ڈوب کے دیکھ
میرے اشکوں میں سمندر کی سی گہرائی ہے
میرے زخموں میں خوشی آئے تو آئے کیسے؟
شعر نہیں جن میں مرے پاس شہنائی ہے
خوشحلی جب سے دیا اُن کے چمن میں ہم نے
امتیاز اپنے گلستاں پہ خزاں چھائی ہے۔

بقیہ صفحہ ۱۲ کا

بے پایاں کیف و تاثر کیساتھ قاری کو سلائے جاتی ہے "یہاں کیف و تاثر کے بجائے کیف و اثر لکھنا چاہئے تھا۔

صفحہ ۱۳ سطر ۱۲ " اس کے لحاظ سے مادی نقطہ نظر کی ترقی۔ تحقیقِ ذات کی ایک صورت ہے یہاں تحقیقِ ذات ترجمہ کیا گیا ہے۔ SELF REALISATION

اقبال کا فلسفہ کو مدِ نظر رکھ کر یہاں اس لفظ کا ترجمہ "تکمیلِ خودی" کرنا چاہئے تھا۔

اپنے اسٹیشن کو صاف رکھیے

- اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ صاف ستھرا ماحول ایک طرف کسی شخص کے کردار کا آئینہ دار ہوتا ہے اور دوسری طرف اس کردار کو نکھارتا ہے۔ صاف ستھرا گرد و پیش خوشی اور مسرت بکھیرتا رہتا ہے۔
- ہم اپنے گھر صاف ستھرے رکھتے ہیں تو پھر ان جگہوں کو صاف شفاف کیوں نہ رکھیں جنہیں ہم سب استعمال کرتے ہیں
- ریلوے پلیٹ فارموں، ویٹنگ روموں، سواری ڈبوں اور درحقیقت ان تمام جگہوں کو جہاں بڑی تعداد میں لوگ اکٹھے ہوتے ہیں گرد و پیش کو صاف شفاف رکھنا بہت ہی ضروری ہے۔

ریلوے نے صفائی مہم شروع کی ہے جس کے بہت اچھے نتائج نکلے ہیں۔ اب ریلوے صاف ستھرے نظر آتے ہیں لیکن ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس سلسلے میں ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے ہم زیادہ صفائی کیلئے اپنی کوششوں کا سلسلہ جاری رکھیں گے آپ بھی اس سلسلہ میں ریلوے کی مدد کر سکتے ہیں۔ آپ صرف اتنا ہی خیال رکھیں کہ آپکے آس پاس کی جگہ بالکل صاف شفاف حالت میں رہے اس طرح اسٹیشن اور منسلکہ مقامات صاف ستھرے رہ سکتے ہیں۔ اور ہاں آپ ریلوے صفائی محکمہ کے کارکنوں کی خدمات سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں وہ صرف آپ کی خدمت کیلئے ہی رکھے گئے ہیں

آپ بھی ذرا خیال رکھیے کہ کوڑا کرکٹ آپ کے ہاتھ سے ادھر ادھر نہ بکھرنے پائے بلکہ کوڑا دان میں پھینکا جائے۔ آپ کا یہ معمولی سا کام ہمیں آپ کی بہتر خدمات کرنے میں کافی مدد دیتا ہے۔

ریلوے آپ کی پراپرٹی ہے اسے صاف شفاف رکھیے

ناردرن ریلوے

گوشۂ عقیل احمد صدیقی

یہ قاش فروشانِ حقیقت

محنت کش عوام ذہنی غذا علموں سے حاصل کرتے ہیں تعلیم یافتہ خواص ادب سے، ساتھ ہی ریڈیو اور ٹیلی ویژن کا بھی تھوڑا تھوڑا دونوں طرف منسوب کر لیجئے۔ ان سمعی و بصری ذرائع ابلاغ کے دائروں میں بہ حیثیت مجموعی کل کے ترقی پسندوں اور آج کے جدت نوازوں کی جاگیرداری چل رہی ہے۔ جو مزارعین ان کے زیر سایہ تربیت پاتے ہیں، وہ پھر آگے چل کر خود بھی چھوٹے موٹے ادبی جاگیردار بن جاتے ہیں۔

یہ حضرات عوام و خواص کی اخلاقی روح کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لئے ان کی ذہنی غذا میں سست کار زہر کی خوراکیں چٹ پٹے فنی مثالوں کے ساتھ آمیز کر کے کچھ اس انداز سے لاتے ہیں جیسے چاٹ اور چاکولیٹ اور آئس کریم یا برف کے گولے بیچنے والے اس زہر خورانی کے نتیجہ میں ایمان کی کتنی ہی آبادیوں کو انہوں نے آہستہ آہستہ موت کی نیند سلا دیا ہے۔ یہ بڑا عجیب منحوس طریقِ واردات ہے۔

کچھ سخت جان قسم کے ضمائر و قلوب میں اگر اپنی تہذیبی خودی کی تھوڑی بہت کشش باقی ہے تو ان کے خلاف خوش آئند قسم کی سرد جنگ جاری ہے۔

مثلاً حال ہی میں ایک جریدے نے سال بھر کی منتخب کہانیاں جمع کر کے پیش کی ہیں۔ ان کہانیوں میں سے بعض کے ذریعے اخلاق کشی کے لئے اچھی خاصی زہر خورانی کی گئی ہے۔ ایک بڑے نامور صحافی و ادیب جو تھیٹریکل اسٹیج کی دنیا میں بھی معروف کردار رکھتے ہیں اور ٹیلی ویژن کے اسکرین پر بھی ادبی تماشاگری کر لیتے ہیں۔ پورے زور بیان و فن سے لکھی ہوئی ایک کہانی میں "ہم جنسیت" کی ایک مریضہ کے احوال سامنے لاتے ہیں کہ کس طرح وہ چھوت کی اس مرض کو آگے بڑھاتی ہے اور کس طرح اپنے لئے تو بہ تو شکار تلاش کرتی ہے۔ ایک لڑکی جسے

حاصلِ مطالعہ

پاکستانی رسائل سے اخذ کئے ہوئے ادبی شہ پارے

وہ اپنی محبوبہ بناتی ہے۔ اس کی شان میں مصنف بڑے علامتی اور تشبیہی اشارے استعمال کرتا ہے۔ وہ اس کے زیر کمر کے گھیر کا ذکر کرتے ہوئے "پچھواڑہ" کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ پھر ایک جگہ یوں آتا ہے کہ اس کا ہاتھ "فانوس" پر جا لگا۔ بڑی تخلیقی ذہانت کی مثالیں ہیں۔ مگر اندازہ کیجئے کہ یہ اکابرین ادب کن چیزوں پر سوچتے اور ان کے لئے ادبی الفاظ تلاش کرتے رہتے ہیں۔

ہم جنسیت کے مریض — مرد بھی عورتیں بھی — ہمارے معاشرے میں ضرور ہوں گے مگر نہ اتنے کہ مغرب کی طرح یہ مسئلہ پیدا ہو جائے کہ کیوں نہ قانون عوامی بگاڑ کے سامنے اپنا سر جھکا دے۔ وہ خرابیاں جو جزوی طور پر پائی جاتی ہیں — اور خاص طور سے متذکرہ کہانی کی فضا کے مطابق طبقۂ بالا میں پائی جاتی ہیں — ان کو پورے معاشرے کے سامنے لانا اور ایسے ادبی انداز سے لانا جس میں نوجوان طبقے کے لئے سامانِ ترغیب بھی ہو کوئی خدمت نہیں ہے۔ بلکہ بلحاظ نتائج کچھ ایسی ہی کوشش ہے جیسے کوئی تخریب کار کسی اسٹیشن کو آگ لگا دے کسی پل کو ڈائنامیٹ سے اڑا دے۔ ریل کی پٹری کو اکھیڑ دے یا کسی گودام کو آگ لگا دے۔

ذرا سا استفادہ اور کر لیجئے:

وہ احتیاط سے برساتی کینچوے کی طرح ملائم سے ملائم تر ہوتی ہوئی فراز پر رینگ گئی...... وہ سلیمہ کے حساس حصوں کو ٹٹولنے لگی جب اس کی انگلیاں کمر کے اتار سے نیچے فانوس سے چھوئیں تو سلیمہ ایک دھماکے سے تڑپ اٹھی...... اسے سب باتیں منہ زبانی یاد تھیں (تو اور کیا وہ کاغذ پہ پرچہ ترکیب لکھ کر سامنے رکھتی۔ ادارہ نویس) وہ خوش ہو کر نشیب کی طرف اتر گئی سلیمہ نے ٹانگوں کو پھیلا کر سکیڑ لیا۔ جیسے تیز تیز بجلی کے لہرے دوڑنے لگے ہوں۔ پھر پنڈے کی سنسنی ہونٹوں سے گرم ہو ہو کر ایک

دوسرے کو اس طرح جکڑنے پکڑنے لگیں کہ سلیمہ تا نگوں کی قینچی نا کر مروج کی کمر پہ ایڑیاں مارنے لگی اور منہ سے "اوہ جی" کی تکرار کا رس ٹپکنے لگا۔

دیکھیے یہ ساری گفتگو بیان ہے خود افسانہ نگار کا۔ یہ اس کی اپنی ذہنیت کی جھلکیاں ہیں۔ ذرا غور فرمائیے کہ کس طرح مطالعۂ حقیقت کیا جاتا ہے۔ اور پھر کس طرح اظہارِ حقیقت ہو رہا ہے۔ بس ایک ہی حقیقت ایسی باقی ہے جس کے بغیر ادب کے معیارِ عظمت کی تکمیل نہ ہو سکے گی۔ اور وہ یہ ہے کہ ابھی ان تاش وفروشانِ حقیقت نے کموڈ یا فدیچے پر بیٹھنے کے تجربات کو جزو بجز زینتِ ادب نہیں بنایا ہے۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ افسانہ نگار خود اس بستر پر موجود تھا جس پر یہ کاروائی ہو رہی تھی اور وہ باقاعدہ ہر چیز کے نوٹس لے رہا تھا کہ کس کا ہاتھ اب کہاں ہے اور کس کی ٹانگ کیا کر رہی ہے۔ کیا واقعی معاشرے کی ترقی ان تمام چیزوں کو بیان کرنے پر منحصر ہے؟ یا صورت واقعہ یہ ہے کہ ادب کے ذریعے مریض ذہنیتیں معاشرے میں چھوت پھیلانا چاہتی ہیں؟

ایک اور کہانی میں اپنے سوتیلے بیٹے پر اس کی والدہ محترمہ لٹو ہو جاتی ہیں۔ خیال رہے کہ ہماری جدید کہانیوں میں کتنی ہی ایسی ہیں جن میں دیور اور بھاوج یا بہنوئی اور سالی یا ماموں اور بھانجی کو رشتۂ جنسیت کے دو مہرے بنا کر کہانی اٹھائی جاتی ہے یہ ہمارے ہاں کے محترم رشتے کہ جن کا احترام اب تک ایسا رہا ہے کہ ان رشتوں کے متعلق بدکاری کا تصور کرنے سے بھی ذہن ناپاک ہوتا معلوم ہوتا ہے۔ ان کو چند پیسے کمانے اور کچھ قارئین کے خوش وقت ہو لینے کے لئے ادب کی منڈی میں متاعِ کاروبار بنا دیا گیا ہے۔ اب جس ادب میں ان محترم رشتوں کو اس طرح گرایا جا رہا ہو وہ ان کا احترام بحال کرانے کا ذریعہ نہیں ہو سکتا، بلکہ رہے سہے احترام کو بھی ختم کر دے گا۔

ہمارے معاشرے میں ایسے واقعات بہت قلیل اور بہت مخفی صورت میں پائے جا سکتے ہیں مگر ان کہانیوں کو پڑھ کر یوں لگتا ہے کہ گویا یہ کوئی دو بات عام ہے۔ جس نے ادیبوں کی توجہ کھینچ لی ہے۔ اگر یہ بیل بڑی جائے کہ یہ حقیقتیں ہیں اور ہم مصنفوں کو اس لئے لاتے ہیں کہ خرابیوں کی روک تھام ہو تو میں کہتا ہوں کہ ذرا یہ غور کیجئے کہ جنسی بگاڑ میں ہمارے ادب نے کوئی کمی پیدا کی ہے یا وہ اضافہ کا باعث بنا ہے؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ ان خرابیوں سے دسیوں گنا بڑھ کر جو مفاسد اور مظالم پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کو روکنے کے لئے قاش درخشانِ حقیقت نے کیا کیا؟ رشوت اور خیانت اور خیر و تشدد کے واقعات کتنے عام ہیں۔ ان کی مصوری کس تناسب سے کی جاتی ہے؟ سوال تناسب ہی کا نہیں، یہ بھی ہے کہ آخر کس برائی کا ذکر کرتے ہوئے اس برائی سے نفرت اور بغاوت اور تصادم کے موثر کتنی کہانیوں میں پیدا کر کے ایسے کردار دکھائے گئے ہیں جو برائی کے خلاف جنگ آزما ہو جاتے ہیں؟

سچ یہ ہے کہ حقیقت کا تو خوبصورت لیبل ہے جو استعمال کیا جاتا ہے۔ اصل مقصد معاشرے کو پاکیزگی دینا نہیں ہے۔ بلکہ پستی میں مبتلا کرنا ہے تاکہ اس میں نہ اسلام نشوونما پا سکے اور نہ بیرونی ملحدانہ نظریات کا راستہ روکا جا سکے بلکہ روحانی اضمحلال اور اخلاقی بحران کی صورت میں اس معاشرے کو جدید سامراجی قوتوں کا شکار بنوانے میں آسانی ہوگی۔ اور یقین کیجئے کہ تمام کمیونسٹ۔ تمام الحاد پسند، تمام مفاد پرست، ہانکا کرنے والے ان کرائے کے مزدوروں کے مانند ہیں جو کسی جنگل میں پھیل جاتے ہیں اور چاروں طرف سے شکار کو گھیر گھار کر شکاری کے نشانے پر لاتے ہیں۔

یہ ادیب ہی تھے جنہوں نے روس میں خونی انقلاب کے لئے راستہ ہموار کیا اور اب پھر ادیب ہی ہیں کہ شوسلزم کی لامحدود جبریت کے خلاف اسی سرزمین سے علمِ بغاوت بلند کر رہے ہیں۔

نعیم صدیقی

(ماہنامہ سیارہ لاہور)

احسان دانش

نعتِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم

بتوں سے پھر گیا دل اب اُدھر دیکھا نہیں جاتا
درِ مولٰے پہ ہوں اور سوئے دَر دیکھا نہیں جاتا

رُخِ خیر البشر تو پھر رُخِ خیر البشر ٹھہرا
ان آنکھوں سے درِ خیر البشر دیکھا نہیں جاتا

ہزاروں آئینے برستے، ہزار آئینہ گر دیکھے
ترے جلووں سے کوئی بہرہ وَر دیکھا نہیں جاتا

اسی کوچے میں بیٹھا ہوں یہیں سے مر کے اُٹھوں گا
گدا بیشک ہوں لیکن اور در دیکھا نہیں جاتا

کبھی مہتاب کی صورت اُتر بھی آ، آنگن میں!
ستاروں کو مسلسل رات بھر دیکھا نہیں جاتا

ہزاروں اہلِ زر اُس آستاں پر سر بسجدہ ہیں
جہاں انساں کی قیمت ہے زر دیکھا نہیں جاتا

دکھا بھی دے عطا کی ہے نظر جس کے لیے مجھ کو
اُٹھا بھی دے حجاباتِ نظر دیکھا نہیں جاتا

مسلسل ہو رہی ہے جانے کیوں اُمت کی رسوائی
دعاؤں میں یہ افلاسِ اثر دیکھا نہیں جاتا

کھڑا ہوں کب سے محرابِ حرم کے سامنے دانشؔ
نظر رہ رہ کے اُٹھتی ہے مگر دیکھا نہیں جاتا

گوشۂ جمیل مدنی

مولانا نذیر احمد کی انشا پردازی

مولانا نذیر احمد اردو کے ان نامور انشا پردازوں میں سے ہیں جن کا نام اس دنیا میں اُردو زبان کے ساتھ ساتھ باقی رہے گا۔ یہ صحیح ہے کہ ان کی تصنیفات اردو داں طبقے میں علی العموم اور مسلمانوں میں بالعموم اپنے موضوعات کے لحاظ سے مقبول و محبوب رہی ہیں۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کو مقبول و محبوب بنانے میں نذیر احمد کے اسلوب نگارش کو بھی بہت کچھ دخل ہے۔ کیونکہ بات کتنی ہی اچھی اور مفید کیوں نہ ہو جب تک اچھے طریقے سے نہیں کہی جائے گی دلوں پر اپنا سکہ اور ذہنوں پر اپنا قبضہ نہیں جما سکے گی۔ عام لوگوں میں اُردو کو اور اُردو میں اپنے موضوعات کو دلچسپ بنانے کے لئے مولانا نے جس طرز سے کام لیا ہے اس کے چند واضح خصوصیات ہیں۔

مولانا نذیر احمد کے سامنے اُردو و نثر کے کثیر تعداد نمونے داستانوں کی شکل میں موجود تھے۔ جن سے انہوں نے اپنی انشا پردازی میں بھرپور مدد لی ہے۔ ابن الوقت میں ابتدائے کلام کی ایک مثال داستانی طرز انشار کی یاد دلاتی ہے۔ ادھر آفتاب کا جنازہ کفن خون آلودہ شفق پہنا کر تیار کر چکے تھے کہ قبر مغرب میں اتار دیں ادھر کفن لاشیں دیواروں کے سائے کا ماتمی کفن پہن چکی تھیں" اس سے کچھ آگے چل کر ایک منظر کی تصویر کچھ اس طرح ملتی ہے"
ابن الوقت ہکا بکا سناٹے میں کھڑا تھا کہ ایک ساتھی بولا۔
حضرت! افطار کا وقت قریب ہے اور قلعہ دُور۔ جو ہونا تھا سو ہوا اور جو تقدیر کا لکھا ہے سو ہو کر رہے گا" اس قسم کی منظر کشی اور تقدیر پرستی کے نمونے اُردو کی داستانوں میں قدم قدم پر ملتے ہیں
داستانوں میں مختلف اشیاء کی فہرستیں ملتی میں داستان نگاروں نے اس امر خاص میں بھی امتیاز پایا ہے۔ چنانچہ مولانا نے بھی اپنی کتابوں میں فہرستوں کی فہرستیں تیار کر دی ہیں۔ یہ فہرستیں سب سے زیادہ مراۃ العروس میں ملتی ہیں۔ مثلاً اس کی ابتدا ہی میں انھوں نے سنار، لہار وغیرہ بادن پیشہ وروں کے نام گنا ڈالے ہیں۔ لڑکیوں کی تعلیم کے سلسلے میں گرمی، جاڑے برسات کے الگ الگ کل نہیں رنگ بتا دیئے ہیں۔ ہر عضو بدن کے الگ الگ کل اڑتیس زیورات کے نام لئے ہیں۔ توبۃ النصوح میں قیمتی خوش وضع اور طرحدار کپڑوں کی دس قسمیں لکھی ہیں۔ فسانۂ مبتلا میں سات زہریلی دوائیں ...... ایک جگہ گنا دی ہیں۔ مرات العروس میں سلائی کی گیارہ قسمیں لکھی ہیں۔ کٹنی کے پاس جو تبرکات بتائے ہیں ان کی تعداد اگیارہ ہے۔ جن باتوں سے مولوی صاحبان منع کرتے ہیں ان میں شب برات کے حلوے سے لے کر آرائش تک ۱۹ چیزوں اور تقریبوں کے نام لے ڈالے ہیں

مولانا نذیر احمد نے اپنی انشار کو بنانے سنوارنے میں پوری پوری صناعت سے کام لیا ہے اور داستانی انشا کے تمام گُر استعمال کئے ہیں انہوں نے جابجا رعایت لفظی سجع و قافیہ، تشبیہ و استعارہ، کنایہ، ضلع جگت اور صنائع بدائع کے نمونے پیش کئے ہیں لیکن ان کے استعمال میں توازن اور اعتدال ضرور قائم رکھا ہے البتہ محاورات کے معاملے میں وہ بے اعتدالی کا شکار رہ گئے ہیں اور بے ضرورت بھی محاورے پر محاورے بولتے چلے گئے ہیں۔

ذرا قافیوں کی بہار دیکھئے "نہ چراغ نہ چارپائی، نہ بہن نہ بھائی، نہ مونس نہ غم خوار، نہ نوکر نہ خدمت گار، مسجد میں اکیلا ایسا بیٹھا تھا جیسے قیدخانے میں مرغ نوگرفتار" تشبیہات دیکھیے: چھت کیا تھی بلا مبالغہ آسمان کا نمونہ تھا جس میں پنکھا بجائے کہکشاں کے تھا جھاڑ بمنزلہ آفتاب اور ماہتاب اور ہانڈیاں ہوبہو جیسے ستارے" یا "بے دین آدمی ایسا ہے جیسے بے نکیل کا اونٹ، بے ہاتھ کا بیل، بے لگام کا گھوڑا بے ملاح کی ناؤ۔ بے رگو بیڑ کی گھوڑی، بے شوہر کی عورت بے ماں باپ کا بچہ، بے نگینے کی انگوٹھی، بے لالی کی مہندی بے خوشبو کا عطر، بے باس کا پھول۔ بے طبیب کا بیمار،

بے آئینہ کا سنگھار،،

گھوڑے کا استعارہ دیکھئے " مبتلا پر مصیبتوں کا ایسا پہاڑ ٹوٹا تھا کہ اگر ذرا بھی عقل سلیم رکھتا تو ساری عمر اس تازیانے کو نہ بھولتا۔ مگر کیسی جرأت اور کس کا ڈر نا۔ مطلق العنان ہوتے ہی لگاؤ لگی دوڑنے، پوپہ بھاگنے،،

رعایت لفظی کی چند مثالیں دیکھئے ،، سب سے پہلے میاں مٹھو مٹھو ہوئے ،، شامد و مرد موپ کر کے کہیں بدلی کرائیں ،، لڑکی بی بی بنی، لڑکا میاں بنا،،

مولانا نے اپنی تحریروں کے لئے لفظوں کا جو انتخاب کیا ہے وہ بھی ایک خاص قسم کا ہے۔ ان کی کتابوں میں جا بجا عربی کے ایسے ایسے ثقیل اور نامانوس لغات ملتے ہیں کہ عام قاری کے ذہن کو بار بار جھٹکے لگتے ہیں۔ اس کا سبب یہ تھا کہ مولانا عربی کے بہت بڑے عالم تھے۔ اور بقول مرزا فرحت اللہ بیگ عربی دانی کے لحاظ سے دہلی شہر میں ممتاز تھے لیکن حقیقت میں عربی ان کے ذہن پر بری طرح حاوی تھی۔ وہ یہ اندازہ نہیں کر پاتے تھے کہ ان کا قاری اس بارے میں کہاں تک ان کا ساتھ دے سکتا ہے۔ اور ان کی کتنی عربی سمجھ سکتا ہے۔ دوسری جانب وہ ٹھیٹھ ہندی کے الفاظ بھی استعمال کر لیتے تھے۔ اور پھر انگریزی کے ماحول کے اثر سے انگریزی الفاظ بھی عبارتوں میں جا بجا بٹھا دیتے تھے۔ اس آخری خصوصیت میں وہ تنہا نہیں تھے بلکہ اس زمانے کے انشاء پردازوں میں یہ رجحان عام تھا کہ اردو کے الفاظ موجود ہوتے ہوئے بھی انگریزی کے الفاظ منتخب کر لیتے تھے۔ غرض مولانا نے انتخاب الفاظ میں عربی، ہندی، انگریزی تینوں زبانوں سے استفادہ کیا ہے۔

ان صنعتوں اور کاریگریوں کے علاوہ مولانا کے بیان میں خطابت کا زور اور دریا کی سی روانی بھی ملتی ہے۔ اس کے لئے وہ کبھی مترادفات کی بھرمار کر دیتے ہیں۔ مثلاً وہ توبۃ النصوح میں لکھتے ہیں "کتابیں کا ہے کو تھیں، گالی، پھکڑ، ہزلیات، بڑ، بکواس، ہذیان، خرافات، " فسانۂ مبتلا میں لکھتے ہیں " پھر اس کو چاہیے تھا کہ دل کا پکا، پیٹ کا گہرا، بھروسے کا پورا،، توبۃ النصوح میں لکھتے ہیں " وہ اپنے تئیں وکیل مطلق کی نیچے کی نجاست میں لتھڑی ہوئی پڑی انگڑائیاں لے رہی ہے بدمست، اداس، مضمحل، نیند کے خمار سے کسلمند اور دوسرے میں کچاق و چوبند، چست و چالاک، تازہ دم، پاک صاف، فسانۂ مبتلا میں کہتے ہیں " دنیا فانی ہے۔ چند روزہ ہے، خواب ہے، سراب ہے، سایہ ہے، حباب ہے، برق ہے، ناپائیدار ہے "

کبھی وہ تشریح کرتے ہیں۔ مثلاً توبۃ النصوح میں موت کی تشریح دیکھئے: مرنا وہ سفر ہے جس کا انقطاع نہیں ہے وہ جدائی ہے جس کے بعد وصال نہیں۔ وہ گم شدگی ہے جس کی کبھی بازیافت نہیں، وہ علالت ہے جس سے افاقہ نہیں۔ وہ بیگانگی ہے جس کے پیچھے کچھ تعلق نہیں،، ابن الوقت میں دنیا اور عقبیٰ کا تعلق یوں بنا ہوا ہے۔ اس دنیا کے سوائے ایک جہان اور ہے یہ ظاہر ہے وہ غائب۔ یہ فانی ہے وہ باقی یہ مجاز ہے وہ حقیقت یہ تمہید ہے وہ نفس مطلب، یہ امتحان ہے وہ نتیجہ، یہ سفر ہے وہ منزل مقصود۔ یہ خواب ہے، وہ تعبیر، یہ افسانہ ہے۔ وہ حق الامر"

توبۃ النصوح کی ایک دعا ملاحظہ کیجئے " بار خدایا بیماروں کو شفا، گمراہوں کو ہدایت قیدیوں کو رہائی، مسافروں کو امن، لوگوں کو روزی، قحط زدوں کو ارزانی، تشنہ کاموں کو پانی، مایوسوں کو امید، ناکاموں کو کامیابی کی نوید، مفلسوں کو قناعت، تونگروں کو سخاوت، بے اولادوں کو اولاد، نامرادوں کو مراد، جاہلوں کو علم، عالموں کو عمل، زاہدوں کو اخلاص، حاکم وقت کو توفیق عدل و داد، ولایت شاد، ملک آباد، کیا اپنے کیا غیر کل جہان کی خیر،،

یہ تو مخصوص موضوع گفتگو کی تشریحات تھیں بیان واقعات میں بھی مولانا کا یہی زور خطابت اور تسلسل عبارت قائم ہے جا بجا ان کی تقریریں، ان کے مکالمے اور پڑھنے لکھنے کے دفتروں میں یہی جوش و خروش ہے۔ الفاظ و خیالات کی ان کے پاس کچھ کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی وہ لفظ پر لفظ اور خیال پر خیال پیش کئے جاتے ہیں کہ قاری محوزدہ سا ہو جاتا ہے پھر وہ موضوع کی خشکی کو جا بجا شوخی و ظرافت کے چھینٹوں سے کم کرتے جاتے ہیں اور شگفتہ و بے ساختہ فقروں سے پڑھنے والے کی دلچسپی برابر قائم رکھتے ہیں غرض یہ کہ مولانا اپنے چند مخصوص خصائص کے باعث اردو ادب میں صاحب طرز انشاء پرداز کا درجہ رکھتے ہیں اور یہ مقام انھوں نے اپنی ریاضت جانفشانی محنت اور لگن کی بدولت حاصل کیا ہے۔

پھر یوں ہوا کہ

(وزیر آغا)

ایک جلتی ہوئی ویران دوپہر میں ایک ٹنڈ منڈ سی بیری کے نیچے بھاری قدموں کی چاپ یک کراتی اور میرے تعاقب میں رینگنے لگی۔

میں رکا تو وہ بھی رک گئی۔ میں چلا تو وہ بھی چلنے لگی۔

میں دوڑ پڑا کہ اس کے سحر سے نکل جاؤں۔ مگر وہ میری گیدن میں جیسے کنڈلی سی مار کر جھول گئی۔

پھر جب میں ہانپ کر کھڑا ہو گیا تو مجھے اس کے ہانپنے کی آواز آئی جیسے میرا ہمزاد ہانپ رہا ہو۔

میں نے ملتجی ہو کر کہا: خدا را میرا تعاقب چھوڑ دو۔ خدا کے لئے رک جاؤ!

مگر چاپ نہ رکی۔ وہ میرے سائے کی طرح میرے پیچھے پیچھے آئی۔ جیسے ابد تک میرے ساتھ چلے گی یوں زمانے گزرتے گئے۔ سورج ہر صبح زمین کے کاسے کشکول میں ایک سکے کی طرح مشرق سے آگرتا اور ہر شام مغرب کے لبالب پیالے کی طرح چھلک جاتا۔

عمر کے سو سال دراز ہو گئے۔ سر پر برف کی پتیوں نے گرنا شروع کیا۔ لہو کی گردش سست پڑ گئی۔

مگر چاپ برابر آتی رہی۔ بھاری قدموں کی چاپ! جو اب اتنی قریب کہ اس کی دھمک کانوں کے پردے پھاڑے ڈالتی ہے اتنی وجود کی نبض دل کی دھڑکن بن جائے مگر وہ رکی نہیں۔ برابر آتی رہی۔

پھر ایک روز مجھے یہ چاپ سامنے سے بھی آتی ہوئی سنائی دی۔ میں نے دائیں طرف کو نکل جانا چاہا تو ——— چاپ وہاں بھی تھی۔ بائیں طرف کو مڑا تو چاپ نے وہاں بھی میرا راستہ روک لیا۔

میں نے سٹپٹا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ چاپ، پاؤں کی چھاگل کی چھن چھن کے ساتھ گہرے بادلوں سے، بادلوں میں سے جھانکتے ہوئے مسافر ستاروں سے شبنم کے دھلے ہوئے آبگینوں اور چڑیوں کے اجلے زمزموں سے ایک برکھا سی بن کر مجھ پر نازل ہو رہی تھی۔

ہر طرف چاپ تھی۔ پہاڑوں پر سے کوئی لڑھکتے پتھروں کے ساتھ آ رہا تھا۔ پانیوں پر دبے پاؤں چل رہا تھا۔ لمبی سبز گھاس میں دھنسا ہوا چلا آ رہا تھا۔ ہر طرف چاپ ہی چاپ تھی۔

یا خدا یہ کون ہے جس نے مجھے آوازوں کے حصار میں جکڑ لیا ہے۔ ہزاروں لاکھوں بڑھتے ہوئے قدموں کی چاپ چاروں طرف سے میرے بدن پر دستک دے رہی تھی۔ رینگتے ہوئے کیڑوں کی طرح میرے جسم کے مساموں میں داخل ہو گئی ہے۔ میرے پورے بدن میں پھیل گئی ہے۔

میں کہاں ہوں؟ ——— میں نے سنبھل کر سوچا ہے اور کون ہوں؟ ——— میں نے بے بس ہو کر سوال کیا ہے۔ اور کیوں ہوں؟ ——— میں نے آنسو روک کر خود سے پوچھا ہے۔ جواب میں چاپ کھلکھلا کر ہنس پڑی ہے اور میرے کپکپاتے ہونٹوں کی بہتی ہوئی سسکیوں سے قطرہ قطرہ، نقطہ نقطہ زمین پر ٹپکنے لگی ہے!

(وزیر آغا)

(تخلیق لاہور)



ماہنامہ
شانِ ہند
دہلی

(مہاتما گاندھی ایڈیشن)

ایڈیٹر سرور تونسوی

قیمت سالانہ پانچ روپے
فی پرچہ ایک روپیہ پچاس پیسے

جلد نمبر ۹ | اکتوبر ۱۹۶۹ء | شمارہ نمبر ۱

بابائے قوم - پیکر انسانیت

مہاتما گاندھی

وہ اہنسا کا نیا پیغامبر
وہ صداقت کا نرالا راہدار
زندگی کا انوکھا رازداں
راہ حق کا وہ اچھوتا شہسوار

ہند کی تاریخ کا وہ باب نو
عظمت قومی کا وہ آئینہ دار
وہ کہ جس کی زندگی کا ہر قدم
گلستانِ ہند کی وجہِ بہار

اتحادِ باہمی کا وہ ستوں
حریت کی وہ انوکھی داستاں
وہ نرالا پیکر انسانیت
وہ نشانِ عظمت ہندوستاں

وہ کہ تھا ...
آج کی دنیا کو ...
وہ کہ جیسے ایک ...
درحقیقت ...

راہِ آزادی کا وہ مردِ جری
ہند کا معمار یا ... وطن
جذبۂ ایثار کی تمثیل نو
وہ شہیدِ قوم ...

وہ بہار گلستانِ آرزو
... رونقِ چمن
... کا جہاں میں ایک ...
... کی ایک کرن

... کا وہ ایک ...
... کا وہ نقیب
... سالارِ زماں
... ایک ... خطیب

وہ کہ ...
... انسان کی
وہ کہ ...
...

ترقی کا ایک سال

جون ۱۹۸۰ء میں دوبارہ اقتدار سنبھالنے کے بعد ریاستی حکومت نے اپنی توجہ سب سے زیادہ غریب محنت کشوں، بے روزگاروں اور دیہات میں رہنے والے کاشتکاروں کی مالی حالت درست کرنے پر مرکوز کی۔ اس سلسلے میں نئے نئے قدم اٹھائے گئے۔ ان تمام اقدامات کے خوشگوار نتائج سامنے آنے شروع ہو گئے ہیں۔

زمینوں کے مقدمات

راجستھان کی عدالتوں میں عرصے سے زیر سماعت زمینوں کے مقدمات غریب کاشتکاروں کے لئے مالی پریشانی کا سبب بنے ہوئے تھے۔ ان مقدمات سے کاشتکاروں کو نجات دلانے کیلئے حکومت نے ۲ اکتوبر ۱۹۸۰ء سے "راجستھان ابھیان" نامی ایک اسکیم شروع کی۔ اس اسکیم کے تحت سرکاری افسروں نے دیہات میں کیمپ لگائے اور دس لاکھ زیر سماعت مقدمات میں سے ۹ لاکھ مقدمات کا کھلی عدالتوں میں فیصلہ کیا۔ غریب عوام کو مقدمات سے چھٹکارا ملا اور ان کی جو رقم [illegible] مقدمات پر [illegible] عدالتوں میں خرچ ہوتی برباد ہونے سے بچ گئی۔ اس کے ساتھ ہی ان میں خود اعتمادی کا ایک نیا احساس پیدا ہوا۔ انہیں محسوس ہوا کہ حالات میں ایک تبدیلی آئی ہے اور [illegible] پہلے غریب لوگ [illegible] سرکاری افسران کے [illegible] [illegible] حاکمان کے [illegible] ہیں اور انہیں [illegible]

[illegible]

[illegible] حاصل ہونے کے بعد [illegible] کمزور طبقوں [illegible] کی [illegible]

[illegible]

...کر دینا [illegible] ... [illegible]

...ے کیا گیا کہ غریبی کی آخری سطح پر زندگی گزارنے والوں کو [illegible] فراہم کی جائے۔ اس اسکیم کے تحت
حکومت نے گاؤں میں سب سے زیادہ پانچ غریب خاندانوں کو مالی امداد مہیا کرنے [illegible]
اب تک اس اسکیم کے تحت راجستھان کے ۳۴ ہزار دیہات میں سے ایک لاکھ ۵۰ ہزار خاندانوں کو
منتخب کیا جا چکا ہے۔ جن میں سے ۳۰ ہزار خاندانوں کی مالی امداد کی گئی ہے ۱۰ ہزار خاندانوں کو کاشت کے لئے
زمین مہیا کی گئی ہے۔ ۲۰ ہزار خاندانوں کو زیادہ عمر کی پنشن دی گئی ہے۔ ۱۰ ہزار خاندانوں کو صنعتی یا [illegible]
کاموں کے لئے قرضہ دلوایا گیا ہے۔ ۵۰ ہزار خاندانوں کو روزگار پر لگایا گیا ہے۔ انتودے خاندانوں کو کم شرح [illegible]
سے قرضہ دلوانے کے لئے ۴ کروڑ روپے کی رقم منظور کی جا چکی ہے۔ آئندہ سال راجستھان سرکار [illegible]
غریب کاشتکاروں کی فلاح و بہبود پر خرچ کیا جائے گا۔ اتنی بڑی رقم دیہاتی ترقی پر پہلے کبھی صرف نہیں کی گئی ہے۔

انتودے یوجنا کے تحت جن ایک لاکھ ۵۰ ہزار کنبوں کی مالی امداد حاصل ہوئی ہے اُن میں سے ۲۰ ہزار [illegible]
اقلیت کے کنبے شامل ہیں۔ بوڑھے لوگوں کو پنشن دینے کے سلسلے کا اندازہ لگایا گیا ہے اب تک ۴۰ ہزار بوڑھوں کو چالیس روپے
ماہوار کی شرح کے حساب سے پنشن جاری کی جا چکی ہے۔ ان ۴۰ ہزار بوڑھوں میں مسلم افراد کی تعداد [illegible]

انتودے یوجنا ۲ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو شروع کی گئی تھی۔ ۲ اکتوبر ۱۹۷۸ء کو اس یوجنا کا پہلا سال [illegible]
غریب خاندانوں کے انتخاب کا پہلا دور مکمل ہو جائے گا۔ یہ سلسلہ سال در سال [illegible]
راجستھان سے غریبی کا خاتمہ ہو جائے۔

[illegible] کے علاوہ راجستھان نے [illegible]
[illegible] کو فروغ دینے [illegible]
[illegible]

[illegible] تعلقات عامہ راجستھان [illegible]

دلی شاہراہِ ترقی پہ گامزن

صاف ستھرا انتظامیہ :-
تمام لوگوں کو بنیادی شہری سہولتیں مہیا کرنے، صاف ستھرا اور جوابدہ بنانے کے لئے دلی انتظامیہ کے مؤثر اقدامات

ہریجنوں اور پسماندہ طبقوں کی فلاح و بہبود :-
۹۰ لاکھ روپے ہریجن بہبودی اسکیموں پر صرف ہو چکے ہیں۔ اس سال کے لئے ایک کروڑ روپے سے بھی زیادہ مخصوص۔ مفت تعلیمی امداد۔ تمام ہریجن طلبہ کے لئے وظائف مقرر، دوبارہ آباد کالونیوں میں بسنے والے کمزور طبقوں کی حالت بہتر بنانے پر خصوصی توجہ۔

سب کے لئے تعلیم :-
تعلیم کے فروغ کو پورا کرنے میں دلی سب سے آگے۔ تمام بچوں کو تعلیم دینے کے لئے مزید ۱۲۱ اسکول کھولے گئے ہیں اور اس سال مزید ۹ کھولے جائیں گے۔ برسرِ روزگار لوگوں کو بھی تعلیم کی سہولیات۔ دیہی طالبات کے لئے مفت ٹرانسپورٹ، تمام غریب بچوں کو مفت کتابیں اور مفت وردیاں۔

طبی سہولیات :-
گھر کے نزدیک غریبوں اور گاؤں والوں کو طبی سہولتیں مہیا۔ دین دیال اپادھیائے اسپتال میں ۵۰۰ بستروں کا بندوبست۔ شاہدرہ میں اسپتال اور میڈیکل کالج کی تعمیر شروع۔ دیہات اور دور دراز کالونیوں میں [illegible] بستروں والے اسپتالوں کی تعمیر جلد شروع ہوگی۔ لوک نایک جے پرکاش نارائن اسپتال میں [illegible] کا قیام۔

مہنگائی [illegible] :-
دالیں، سبزیاں، چائے، صابن، وغیرہ سستے داموں پر۔ راشن کارڈ ہولڈروں کو پہلے سے زیادہ چینی اور آٹا۔ [illegible] اور چور بازاریوں کے خلاف سخت کارروائی۔

جاری کردہ: محکمہ اطلاعات و اشاعت، دلی انتظامیہ دلی

افکار و واقعات

کیا ہریجن واقعی مظلوم ہیں؟

ہریجن کے لغوی معنی ہیں "محبوب الٰہی بھگوان کا بھگت"۔ [illegible] تعریف اور مقدس نام دیا مہاتما گاندھی نے۔ اُن انسانوں [illegible] کو شیڈولڈ کاسٹ، بھنگی، چوہڑہ، مہتر، سویپر، اور معلوم [illegible] کن حقیر ناموں سے پکارا جاتا تھا۔ مہاتما گاندھی کا [illegible] یا ایک [illegible] اُن کی ادا ایک غیر معمولی خدمتِ انسانی [illegible] ہی تسلیم کیا جائے گا۔ بھگوان رام نے ایک ہریجن [illegible] بھیلنی کے جھوٹے بیر کھائے تو ہزارہا سالوں سے [illegible] رام کے اس انسانیت نواز فعل کو سراہا جا رہا ہے۔ مگر [مہ]اتما گاندھی نے تو ہریجنوں کی بستی میں قیام فرما کر اپنے [illegible] سبھائیں بھی وہیں کیں، اور تو اور بھنگی بستی میں سب [سے] [illegible] کا پاخانہ تک صاف کیا جو یقیناً بھگوان رام کے بھیلنی [کے] بیر کھانے کے مقابلے میں کروڑہا گنا زیادہ خدمتِ انسانی [کا] ثبوت تھا اور مہاتما گاندھی کا ہی دم تھا کہ مندروں کے دروازے [ہریج]نوں کے لئے کھل گئے۔ ہریجنوں سے چھوت چھات [کو] قانونی جرم ٹھہرایا گیا۔ وغیرہ وغیرہ۔

ازل سے دبے ہوئے پا دبائے ہوئے ان انسانوں [ہ]ری جنوں کو برابر کرنے کے لئے کہ وہ بھی سورن ہندوؤں [illegible] کے مسلمانوں، سکھوں اور عیسائیوں کی طرح اُسی خدا [کی] مخلوق ہیں [illegible] [illegible] کو پیدا کیا۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس [illegible] کانگریس نے [illegible] رواداری کا برتاؤ کیا۔ عیسائیوں [illegible] کی آمد میں [illegible] نے انہیں [illegible] اور نام کے [illegible] [illegible] دیکھا۔

[illegible] اپنا سورن پن نہ چھوڑا۔ اور انہیں اچھوت ہی سمجھا۔ یہی وجہ [ہے کہ] [illegible] نے مذہب بھی تبدیل کر لیا تو بھی چھوت چھات نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا — اور نہ ہی ان سے پاخانہ اٹھانے کا کام چھوٹا۔

کانگریس حکومت نے ہریجنوں کی حالت سدھارنے کی اچھی کوشش کی اور حقیقت ہے کہ کانگریس کے عہد میں ہریجنوں کا بہت [illegible] ہو گیا۔ ان کے لئے لاکھوں مکانات بنائے گئے۔ ہریجنوں کا [illegible] ہی گھر ایسا گھر ہو جس میں پنکھا، فرج، ٹیلی وژن وغیرہ نہ ہو [illegible] ہیں۔ پڑھے لکھے ہریجنوں کو سرکاری ملازمتیں مل گئی ہیں ان کے [illegible] دوسرے ہیں۔ کانگریس نے تعلیم، ملازمت اور دیگر ہر معاملے میں ہریجنوں کے لئے مخصوص رعایتیں قانونی حیثیت [سے] قائم کیں۔ اور یہ رعایتیں بدستور سابق بلکہ اضافے کے ساتھ جنتا پارٹی کی حکومت نے بھی جاری رکھیں۔ کیونکہ جنتا پارٹی میں کوئی لاکھ [illegible] نکالے مگر اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ حکومت کانگریس کے مقابلے میں کہیں زیادہ مہاتما گاندھی کے نقشِ قدم پر [چلنے] کے لئے کوشاں ہے۔ مگر کانگریس حکومت نے ہریجنوں [illegible] نے اس وقت کانٹے بو دیئے جب دوسروں سے [illegible] ہریجنوں کو زمین دی گئی۔ ہریجنوں کو آپ زمین [illegible] [illegible] سب کچھ دوسروں سے چھین کر [illegible] [illegible] کو خوشحال کرنے کے لئے یہ راستہ نکالا [illegible] [illegible] غریب پا کر زمین کو ان پر اُٹھا جاتے [illegible] [illegible] ان ہریجنوں کی ہری [illegible] اور [illegible] [illegible] ہریجن اپنے لئے [illegible]

[illegible]

کے خلاف اور جس کو آپ کا مکان دیا گیا اُس کے خلاف مقابلے پر کھڑے ہو جائیں گے۔ بنا بریں ہری جنوں کو دوسروں سے زمین چھین کر دی جانا ایسا نامناسب قدم تھا جس نے ہریجنوں کے خلاف کچھ لوگوں کے دلوں میں نفرت کا اور دشمنی کا جذبہ پیدا کر دیا۔

کانگریس حکومت تو دشمنی کا یہ جذبہ پیدا کر کے چلتی بنی مگر اس کا اثر اب جنتا پارٹی کی حکومت کے لئے درد سر بن کر سامنے آیا۔ ہری جنوں کی حمایت حکومت کے لئے ضروری تھا اور اس نے زبردستی زمین کے قبضے ہری جنوں کو دلانے شروع کر دیئے۔ یعنی جو کام زیادہ تر کانگریس کی حکومت میں کاغذوں پر ہی تھا جنتا حکومت نے اُسے عملی شکل دینی شروع کر دی اور کانگریس کی پیدا کی ہوئی دشمنی کی وجہ پھلنے پھولنے لگی تو کانگریس والوں کے ہاتھوں میں یہ حربہ جنتا پارٹی حکومت کو بدنام کرنے کے لئے آ گیا کہ دیکھئے ہم نے تو ہری جنوں کو زمین دی تھی اور جنتا پارٹی کے عہد میں سورن ہندو یا زمیندار ہری جنوں کے دشمن ہو گئے ہیں۔ اور حکومت بھی ہری جنوں کو زمین نہیں دلا رہی ہے۔ جس کے نتیجے میں ہریجنوں اور زمینداروں کے درمیان جھڑپیں ہونا لازمی امر تھا۔ جسے کانگریس والوں نے بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ اور ہری جنوں کو مظلوم قرار دے کر اُن کی ووٹوں کو محفوظ کرنے کے لئے کانگریس نے کچھ اور چالیں بھی چلیں۔

دوسری طرف اُن غریبوں نے جو ہری جن تو نہیں مگر اُن کی مالی حالت اور رہن سہن ہریجنوں سے بھی زیادہ بُرا اور ابتر ہے۔ یہ جائز مطالبہ کرنا شروع کیا کہ حکومت سب کی ہے اگر وہ ہریجنوں کی غریبی دُور کرنے کے لئے تدابیر اختیار کر رہی ہے تو اُن غریبوں کیلئے وہی رعائتیوں کو روا کیوں نہیں رکھا جاتا جو ہریجنوں سے بھی زیادہ بُرے حال میں ہیں۔ انسانی ہمدردی، انسانی برابری اور سب ہندوستانیوں کی مشترکہ جمہوری حکومت کے ناطے غیر ہریجن غربا کا یہ مطالبہ سو فیصدی برحق ہے۔ اور حکومت کو چاہیئے کہ ہر مذہب و ملت کے ایسے بدحال لوگوں کو بھی جینے کے قابل بنائے جو ہریجنوں کے مقابلے میں یقیناً زیادہ مدد کے مستحق ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ایسے غیر ہریجن بدحال عوام بھی حکومت کے ساتھ ساتھ ہریجنوں کے خلاف جذبہ رکھتے ہیں اُسی طرح جیسے کوئی باپ اپنے ایک بیٹے کے تو ہر قسم کے ناز برداشت کرے اور دوسرے بیٹے کو دو پیسے کے کھلونے بھی نہ دے تو اُن دونوں بھائیوں میں جو نفرت کا جذبہ پیدا ہوگا یہی وجہ ہے ہری جنوں اور غیر ہریجن غربا میں ہے۔

ایک اور وجہ بھی ہے جو باشعور لوگوں کو بھی ہری جنوں کے خلاف کر رہی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہریجنوں کی اکثریت جو سرکاری رعائتوں کے باعث سو فیصدی جاہل و مطلق ہونے کے باوجود سرکاری ملازمتوں پر لگی ہے وہ اس قدر متکبر، خود غرض، اور نااہل ہے کہ وہ عوام کے ساتھ نامناسب طریقے سے پیش آتے ہیں راقم الحروف کو اس حقیقت کے اظہار میں کوئی افسوس نہیں کہ جب بھی کسی کے ساتھ کوئی سرکاری ملازم یا افسر بے رخی سے پیش آئے تو وہ سمجھ جاتا ہے کہ یہ صاحب ہریجن ہیں اور یہ اندازہ کبھی غلط نہیں نکلا۔

اندور ہسپتال میں ایک ہری جن بھی نام کا ہوا کرتا تھا۔ وہ چھری چلانے میں جواب نہیں رکھتا تھا۔ ایسے ہریجن دیکھے گئے ہیں جو بہترین لباس میں ہر قسم کے جرائم کرتے ہیں اور نو اور بہار رکشا مستری کئی سال تک انکم ٹیکس ادا کرتا ہی ہوئے رہے۔ غرضیکہ اب ہریجن زندگی کے ہر شعبے میں ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں، عیسائیوں کے کان کترنے لگے ہیں اور اب ان میں اتنی صلاحیت آ گئی ہے کہ حکومت کی طرف سے دی گئی مخصوص رعائتوں کے بغیر یہ اپنی زندگی کی گاڑی کا پہیہ خود چلا سکتے ہیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ سرکاری طور پر ہری جنوں سے چھوت چھات کو قانونی جرم قرار دیا جانا بدستور قائم رہے۔ دیگر رعائتیں اگر جاری رکھی جائینگی تو یقینی طور پر ہریجنوں کی آئندہ نسلیں کام چور ہوں گی۔ غیر ہریجن غربا کے دلوں میں ان کے خلاف جذبہ بڑھے گا۔ کسی ہری جن کو محض اس لئے تنگ کیا جائے یا اُس پر ظلم کیا جائے کہ وہ ہری جن ہے اس جرم کی سختی سے سخت سزا مقرر کی جائے یعنی ہری جن کو پورا پورا تحفظ دیا جائے۔ مگر انہیں دوسرے ہندوستانی عوام کی طرح ہی سمجھا جانا ضروری ہے۔ اور جو قانونی رعائتیں گزشتہ اکتیس سالوں سے ان کو مل رہی ہیں وہ اب باقی نہ رکھی جائیں۔ کیونکہ یہ رعائتیں صرف دس سالوں کے لئے دی گئی تھیں۔

اگر حکومت ایسا قدم اٹھائے تو یقیناً ہری جنوں کا مسئلہ کہیں بہتر طور پر حل ہو سکے گا۔ اور اگر محض ان کے ووٹوں کے حصول کے لئے حکومت اس مسئلے کو اُلجھائے رکھنا ہی چاہے تو اسے کون روک سکتا ہے۔

نومبر شمارہ کا شمارہ

زیر نظر شمارہ مہاتما گاندھی کا مضمون شائع ہوا ہے۔ نومبر کا شمارہ [illegible] کے سلسلے میں ایسا خصوصی شمارہ ہوگا جس میں [illegible] پیش کی جائیگی۔ [illegible] سے متعلق اپنا کلام جلد بھیج دیجئے۔

ضرورت

ابوظہبی اور یمن میں ہمارے غیر ملکی پروجیکٹوں کے لئے

۱۔ الیکٹریشین (بجلی کا کام جاننے والے)
۲۔ میکنیکس (ڈیزل) جو تعمیراتی اوزاروں کا استعمال اور اُن کی مرمت کر سکیں
۳۔ فیبریکیٹرز۔ (عماراتی)
۴۔ ایلومینیم فالس سیلنگ اور ونڈو فٹرز
۵۔ ویلڈرز
۶۔ میسن (معمار) میسنری، پلاسٹر آف پیرس کے کام اور پلاسٹرنگ کے لئے
۷۔ پینٹرز
۸۔ رگرز (برمائی کرنے والے)
۹۔ پلمبرز۔ (نل ٹھیک کرنے والے اور نل لگانے والے)
۱۰۔ ڈی سیلینیشن پلانٹ آپریٹر

جن درخواست دینے والوں کے پاس عرب ممالک کا پاسپورٹ ہوگا انہیں ترجیح دی جائیگی اگر کوئی ان آسامیوں کیلئے بہترین کاریگر ایسا ہوگا جس کے پاس پاسپورٹ نہ ہو تو اسے پاسپورٹ کی سہولت بھی مہیا کی جا سکتی ہے۔
اپنی عمر، تجربہ اور پاسپورٹ وغیرہ کی جملہ تفصیلات کے ساتھ اپنی درخواست اس پتہ پر فوراً بھجوائیں۔

انجینیرنگ کنسٹرکشن کارپوریشن لمیٹڈ
۱۲ ویں منزل۔ "بختاور"
ناریمان پوائنٹ
بمبئی ۴۰۰۰۲۱

ENGINEERING CONSTRUCTION
CORPORATION LTD.
12TH. FLOOR "BAKHTAWAR"
NARIMAN POINT
BOMBAY - 400021

بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر

(مسرور تونسوی)

سنہ ۱۹۶۸ء کے موسم گرما میں چراغ غرب ہوٹل بیرون حرم دروازہ ملتان شہر (پاکستان) میں مقامی اخبار نویسوں کی ایک میٹنگ تھی۔ خواجہ عبدالکریم قاصف نمائندہ اُردو روزنامہ جات لاہور ... نامہ نگار نے فرمایا مسرور صاحب میٹنگ کے بعد آپ سے ایک ضروری معاملہ میں مشورہ کرنا ہے۔ اس لئے بیٹھے رہیئے گا۔ میٹنگ کے بعد جب شرکاء تشریف لے گئے تو قاصف صاحب مجھے ایک کمرے میں لے گئے۔ پانچ منٹ بعد ایک جوان العمر شخص جس نے کسی حد تک اپنا چہرہ چھپایا ہوا تھا کمرے میں داخل ہوا اور سلام کرکے فرش پر بیٹھ گیا۔ میں نے اُسے کرسی پر بیٹھنے کے لئے کہا تو وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا مگر کرسی پر نہیں بیٹھا۔ قاصف صاحب کے کہنے پر یہ شخص بڑی عاجزانہ و نیازمندانہ جھجکا ہٹ کے ساتھ کرسی پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ ہوٹل کا بوائے چائے کی ٹرے میز پر رکھ کر چلا گیا تو قاصف صاحب نے چائے بناتے ہوئے اس شخص سے کہا کہ اب اپنے چہرہ سے کپڑا ہٹا کر مسرور صاحب سے اپنی بات کہو۔ ایک جوان رعنا جس کی عمر زیادہ سے زیادہ چوبیس سال ہوگی۔ رنگ سپید و سرخ، اُبھرے ہوئے ہونٹ پر چوٹ کا ایسا نشان کہ جس کی وجہ سے ایک دانت چمک رہا تھا۔ آنکھوں میں کاجل لگایا ہوا جسم گٹھا ہوا پہلوان نما، ملتانی زبان میں کہنے لگا "سائیں میں ڈھاڈا گنہ گار ہاں بے تساں مہربانی فرماؤ تاں میرا بیڑا پار ہو ویسی نہیں تاں اللہ مالک۔ ... اے جو اوندی مرضی ہوسی او تھیوسی کون روک سکدا اے" (محترم میں بڑا گنہگار ہوں اگر آپ مہربانی فرمائیں گے تو میرا بیڑا پار ہو جائے گا۔ ورنہ اللہ مالک ہے۔ جو اس کی مرضی ہوگی اُسے کون روک سکتا ہے)

میں نے ملتانی زبان میں تسلی دیتے ہوئے بتایا کہ قاصف صاحب میرے محترم دوست ہیں۔ ان کا کچھ کہنا میرے لئے حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ اس لئے تمہیں جو کچھ کہنا ہے کھل کر کہو اگر مجھ سے کچھ ہو سکے گا تو ضرور کروں گا۔ میرے ہمدردانہ کلمات سے بھی اس نوجوان کو اپنا حال دل کھل کر بیان کرنے کے لئے اس کی زبان نے ساتھ نہ دیا تو قاصف صاحب فرمانے لگے مسرور صاحب یہ نوجوان جس کا نام یٰسین ہے۔ ڈکیت ہے چلتی گاڑی میں عورتوں کے زیور اُتارنا۔ چاقو دکھا کر مسافروں کا مال و متاع لوٹ لینا۔ راہ چلتے اکیلے دوکیلے مسافروں کو چھرے کے زور پر لوٹ لینا اس کا روزمرہ کا کام ہے۔ مسافروں کو لوٹ کر چلتی ریل سے اُترنا اس کے لئے کوئی مشکل نہیں ہے۔ سارا محلہ اس سے ڈرتا ہے جس کو چاہے پیٹ ڈالتا ہے۔ پاک دروازہ کے باہر اس کا گھر ہے اور میں بھی پاک دروازہ میں رہتا ہوں۔ میں اسے بچپن سے جانتا ہوں۔ کل یہ میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ قاصف صاحب مجھے خدا نے لڑکا عطا فرمایا ہے اور خدا کے اس عطیہ پر میرے دل و دماغ میں بغاوت کا طوفان اُٹھ کھڑا ہوا ہے کہ مجھے اب حلال کی روزی سے اپنے بیٹے کی پرورش کرنی چاہیئے ورنہ حرام کی کمائی سے یہ بھی میرے ہی نقشِ قدم پر چلے گا۔ اور جیسے محلے والے میرے سامنے تو ڈرتے ہوئے پہلوان پہلوان کہتے ہیں اور پیٹھ پیچھے کہتے ہیں کہ یٰسین ڈاکو، یٰسین چور، یٰسین چاقو باز، جب میرا بیٹا بڑا ہوگا تو وہ دوسرے بچوں سے میرے بارے میں ایسے الفاظ سُنے گا تو کیا سوچے گا۔ بہرحال بچے کی پیدائش کے بعد سے اب تک کسی جرم کا مرتکب نہیں ہوا۔ وہ اپنی بیوی کا علاج وغیرہ بھی قرض سے کر رہا ہے۔ چوری سے لوٹا ہوا سب اثاثہ وغیرہ غریبوں میں بانٹ دیا ہے۔ اب اس کے پاس رات کے کھانے کے لئے بھی کچھ نہیں ہے کیونکہ اس نے قسم کھائی ہے کہ اب بُرا راستہ اختیار نہیں کروں گا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا ہے کہ تمہیں مسرور صاحب سے ملا دوں گا وہ تمہارا ایسا انتظام کر دیں گے کہ تم حلال کی روزی سے اپنے بچوں کا پیٹ آسانی سے بھر سکو گے۔ لہٰذا اب آپ جانیے اور یٰسین۔

قاصف صاحب کی باتیں سُن کر میں کچھ وقت چپ چاپ اس نوجوان کو دیکھتا رہا۔ اور یٰسین بھی نیچی نظریں کئے چپ چاپ بیٹھا رہا۔ میں نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا یٰسین وعدہ کرتے ہو کہ آپ اس ارادے میں پکے رہو گے۔ خواہ کتنی ہی تکلیف کیوں نہ اُٹھانی پڑے۔ یٰسین نے بے ساختہ کہا "قسم قرآن دی مر ویساں، ماں دی چھوٹی نہ کریساں" (قرآن کی قسم ہے کہ مر جاؤں گا مگر چوری نہیں کروں گا)

ان دنوں کپڑا، چینی، مٹی کا تیل۔ دوسری جنگ عظیم کے باعث نایابی کی صورت اختیار کر گئے تھے۔ ہر چیز پرمٹ پر ملتی تھی اور ضروری اشیاء کا حصول دن بدن مشکل ہو رہا تھا مگر اس کے باوجود مہنگائی نہیں تھی۔ لالہ گیان چند کمشنر ان دنوں ملتان میں شادیوں کے لئے کوٹے کا کپڑا دینے کے لئے منظور شدہ کلاتھ مرچنٹ تھے (آج کل آپ صدر بازار میں کپڑے کا کاروبار کرتے ہیں) میں نے ان کے نام ایک چٹ لکھ کر یٰسین کو دی کہ رقعہ حامل کو بارہ تولیئے دے دیجئے یہ فروخت کر کے ان کی رقم آپ کو دے جائے گا اور مزید بارہ تولیئے لے جایا کرے گا۔ دوسرے دن صبح ہی یٰسین میرے ہاں آیا اور ایک لفافے میں ان تولیوں کی فروختگی کے پیسے پیش کئے اور بتایا کہ سات روپے بچے ہیں۔ میں نے اسے بتایا کہ منافع کے سات روپے تو اپنے گھر کے اخراجات میں لے آؤ اور باقی رقم کے بارہ تولیئے اور لے آؤ۔ اسی طرح فی الحال ہر روز ایسا کرو۔ اگر تولئے جلد فروخت ہو جائیں تو اسی وقت پچھلے حساب کو ادا کر کے مزید بارہ تولئے لے لیا کرو۔ دس پندرہ دنوں میں یٰسین دس روپے سے پندرہ روپیہ روز تک کمانے لگ گیا۔ اور اس زمانے میں دس پندرہ روپیہ روزانہ کما لینا خوشحالی کی زندگی بسر کرنے کے لئے کافی تھا۔ ان دنوں ملتان میں راشننگ کے افسر اعلیٰ ایک سید صاحب تھے۔ جو انتہائی ایماندار، شفیق، ہنس مکھ اور غریبوں کے ہمدرد تھے۔ میں نے ان سے گزارش کی کہ اگر یٰسین کے لئے شوگر کا کوٹا منظور فرمائیں تو میں اسے چائے اور لسی کی دوکان کھلوا دوں۔ مگر سید صاحب نے فرمایا کہ وہ شوگر کا نیا کوٹا منظور کرنے سے معذور ہیں۔ یٰسین نے ایک ایسے شخص کو راضی کر لیا جو پہلے سے شوگر کا کوٹہ ہولڈر تھا۔ اس شخص نے راشننگ آفس میں درخواست دی کہ وہ اور یٰسین دونوں کاروبار میں برابر کے شریک ہیں اور اب وہ الگ الگ کاروبار کرنا چاہتے ہیں۔ لہذا شوگر کا کوٹا دونوں کو نصف نصف بانٹ دیا جائے۔ راشننگ والوں نے کاغذات کی ضروری خانہ پری کے بعد ایسا کر دیا۔ اور یٰسین نے پاک دروازہ کے باہر چائے کی دوکان کھول لی جو چند دنوں میں ایسی چمک اٹھی کہ دیکھنے والے یٰسین کی محنت کی داد دینے لگے۔ کام بڑھ جانے کے باعث یٰسین سے شوگر کا کوٹہ بڑھانے کی درخواست دلوائی گئی۔ جسے راشننگ انسپکٹر کے معائنہ کے بعد منظور کر لیا گیا اور یٰسین کو شوگر کا کوٹہ پہلے سے چار گنا دیا جانے لگا۔ یٰسین نے اس دوکاندار کو جس نے یٰسین کو اپنا نصف کوٹہ دلوایا تھا اپنے کوٹہ میں سے شوگر دے کر اس کا نقصان پورا کرنا شروع کر دیا۔ بعد میں اس دوکاندار کا بھی شوگر کوٹہ راشننگ انسپکٹر سے کہہ کر بڑھوا دیا گیا

یٰسین ملول رہتا تھا کہ محلے میں لوگ اسے اب بھی یٰسین ڈاکو کے نام سے یاد کرتے تھے اور اس نے کئی بار مجھ سے اپنے اس ذہنی کرب کا اظہار بھی کیا اور میں اسے سمجھا دیتا کہ وقت کے ساتھ ساتھ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں چاہ بوہڑ والا ملتان چھاؤنی میں رہتا تھا اور یٰسین ملتان شہر پاک دروازہ کے باہر رہتا تھا کم و بیش تین چار میل کا فاصلہ تھا۔ مگر یٰسین کا معمول تھا کہ سورج طلوع ہونے سے پہلے پہلے شہر سے سبزی منڈی سے سبزی موسم کے مطابق پھل اور بہترین دودھ لے کر چھاؤنی آتا اور دے جاتا اور بڑی رد و کد کے بعد ان اشیاء کی لاگت وصول کرتا۔ ایک دن یٰسین آیا اور کہنے لگا۔ سائیں بچے دی خوشی کرنی اے اور دھوم دھام نال کرنی اے۔ تمبو لگوانے نے برف دی دو سلیاں دا۔ انتظام کرا دیوے۔ ایک قوال پارٹی دی چاہی دے اے۔ تسیں تے بھابھی جی نے بچیاں نال آنا اور پرسوں شام دا چار بجے دا وقت مقرر کرتا اے۔ میں نے اس کی یہ دعوت خوشی سے قبول کر لی اور اسے انتظام کے سلسلے میں کچھ ضروری ہدایات دیں۔ دوسرے دن میں نے لالہ بال کشن بترہ ایڈیٹر گل، ایڈیٹر اقبال جناب اویسی۔ لالہ ہمت رائے ایڈیٹر مسافر۔ جناب شمسی ایڈیٹر طوفان اور دوسرے ہندو مسلم مدیران اخبارات کو بھی اس تقریب میں شرکت کی دعوت دے دی۔ [illegible] کی گرمی مشہور ہے لہذا ان دنوں برف بارہ آنہ سیر ملنا بھی مشکل تھا۔ میں نے ڈپٹی کمشنر صاحب سے کہہ کر برف کے کارخانے میں کہلوا دیا اور دو سلی برف کا انتظام کرا دیا۔ راشننگ۔ سول سپلائی۔ ڈاکخانہ۔ پولیس۔ اور میونسپل کمیٹی کے کچھ افسران کو بھی میں نے مدعو کر رکھا تھا۔ صبح کو میں خود یٰسین کے انتظامات کو دیکھنے گیا اور اسے ضروری ہدایات دیں۔ لالہ امرت لال پاٹھی پریذیڈنٹ میونسپل کمیٹی سے کہہ کر سارے محلے میں صفائی کرا دی گئی۔ میونسپلٹی کی چھڑکاؤ کرنے والا [illegible]

کر گئی۔ اور شام کو وقت مقررہ پر جملہ مدعو حضرات تشریف لے آئے یٰسین آنے والوں کا استقبال کرتے ہوئے پھولا نہ سماتا تھا۔ محلے کے لوگ اس اجتماع کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ محلے کی عورتوں کا ایسا ہجوم تھا کہ یٰسین کے گھر میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ میرا سیٹن ڈھولک پر گیت گا رہی تھیں۔ نائیٹس بھی دھما چوکڑی مچائے ہوئی تھیں غرضیکہ اس محلے میں یہ تقریب اپنی طرز کی اولین تھی۔ یٰسین نے ایک سو بیئر کی بوتل منگا رکھی تھی جو اُن دنوں بارہ آنے کی آتی تھی اور ایک ہزار سوڈا واٹر کی بوتلیں جو تین پیسے کی آتی تھی۔ قوال موقع شناس نہیں تھے اس لئے وہ موقع و محل کا خیال کئے بغیر گا رہے تھے کہ غم خوار جو قائد اعظم ہے گاندھی کی قضا کون کرے۔ مگر بیئر۔ پلاؤ۔ زردہ کباب کی موجودگی میں مہمانوں نے قوالوں کی اس بے وقت کی راگنی پر دھیان نہیں دیا رات کے گیارہ بجے تک یہ محفل چلی۔ میرے اشارے پر یٰسین نے محلے کے اُن تمام بچوں۔ جوانوں اور بوڑھوں کو جو اس تقریب کو دیکھنے کے لئے کھڑے ہوئے تھے سوڈا واٹر کی بوتلیں پیش کیں محلے والوں کے لئے یہ عزت افزائی غیر متوقع تھی۔ دوسرے دن یٰسین میرے یہاں آیا تو آتے ہی پاؤں پکڑ لئے اور آنکھوں میں خوشی کے آنسو لئے ہوئے کہنے لگا بابو جی سارا محلہ یٰسین سیٹھ کہہ رہا ہے۔ میرے دریافت کرنے پر بتایا کہ ایک ہزار دو سو روپے خرچ ہوئے ہیں۔

سیاسی حالات بگڑ رہے تھے مارچ ۱۹۴۷ء میں ماسٹر تارا سنگھ نے لاہور اسمبلی ہال کے باہر تلوار کیا گھمائی کہ ملتان شہر جلنے لگا۔ یٰسین کئی روز چھاؤنی میں میرے مکان کے باہر سوتا رہا۔ اور آخر نوبت یہاں تک آگئی کہ چاہ بوہڑ والا پر ۱۴ اور ۱۵ اگست درمیانی رات کو دو ہندو چھرے سے ہلاک کر دیئے گئے اور مجھے بھی دو دیگر غیر مسلم حضرات کے ساتھ حرم دروازے کے اندر گلی ماڑی والی میں ہندو علاقے میں پناہ لینی پڑی۔ فسادات زوروں پر تھے کسی غیر مسلم کا گھر سے نکلنا موت کو دعوت دینا تھا نمک تک ملنا مشکل تھا۔ مگر میرے لئے یٰسین ہر صبح سولہ سیر دودھ شہر سے لاتا تھا۔ اُن دنوں ایک روپیہ کے سولہ سیر دودھ ملتے تھے اور میرے علاوہ میرے پڑوسیوں کی ضروریات

کی اشیاء بھی یٰسین مہیا کرتا۔ میرا ریڈیو، پنکھا اور دیگر سامان یٰسین فروخت کرتا رہا۔ اور اس طرح ایک ہزار روپیہ مجھے فراہم کر دیا۔ یٰسین کو ساتھ لے کر میں چھاؤنی کے ڈاک خانہ میں اپنے سیونگ بنک اکاؤنٹ سے روپیہ نکلوانے گیا۔ ڈاک خانہ کا ہیڈ کلرک میرا واقف تھا۔ انہوں نے مناسب عزت و احترام کیا مگر روپیہ دینے سے انکار کر دیا اور بتایا کہ ایسا حکم سرکاری طور پر آگیا ہے کہ غیر مسلموں کو روپیہ نہ دیا جائے۔ اب غیر مسلموں کی ہندوستان کے لئے نکاسی شروع ہو چکی تھی۔ ٹرین کی روانگی سے چار گھنٹے پہلے کرفیو نافذ کر دیا جاتا۔ تانگے والے اسٹیشن تک منہ مانگے دام جو دس روپے پچاس روپیہ تک ہوتے تھے لینے لگے۔ کرفیو کے باوجود پولیس اور غنڈے غیر مسلموں کا سامان وغیرہ چھین لیتے تھے۔ ایک فیملی کو ایک بستر اور ایک ٹرنک لے جانے دیتے اور باقی سامان چھین لیتے تھے۔

میرا ارادہ پاکستان میں ہی رہنے کا تھا۔ مگر جب مسلمان دوستوں نے یہ مشورہ دیا کہ ان حالات میں میرا ہندوستان چلے جانا لازمی ہے تو میں نے بھی تیاری شروع کر دی۔ کتابوں کا اسٹاک، گھر کا اکثر سامان سب یٰسین کے حوالے کیا اور اُسے کہہ دیا کہ اگر ہم لوگ پھر اپنے وطن میں واپس آگئے تو یہ سامان ہمارا ورنہ تمہارا، اور اُسے ایک تحریر بھی دے دی کہ یہ سب سامان میں اپنی خوشی سے یٰسین کو دے رہا ہوں۔ چاہ بوہڑ والا چھوڑے قریباً پونے دو ماہ ہو گئے تھے۔ اور اس عرصہ میں ہماری جملہ ضروریات یٰسین پوری کر رہا تھا۔ آخر کار ۲ اکتوبر کی رات کو ہمیں اطلاع کیا گیا کہ صبح چار بجے سے سات بجے تک کرفیو لگا دیا گیا ہے اور اس وقفہ میں ہمیں مخصوص ریلوے پلیٹ فارم پر ملتان چھاؤنی پہنچنا ہے۔ اب میرے پاس کوئی ذریعہ نہ تھا کہ یٰسین کو اس کی اطلاع دی جا سکتی۔ کچھ ضروری سامان تیار تھا صبح حرم دروازے پر آ کر بمشکل ایک تانگہ لیا گیا۔ سامان اور اہل و عیال کو لے کر میں چھاؤنی اسٹیشن کو روانہ ہوا۔ راستہ میں ایک اور پرانے تانگے کو پلیا پر پولیس اور چند غنڈے ہر تانگے کی تلاشی لے کر ایک ٹرنک ایک بستر چھوڑ کر باقی سامان اتار رہے تھے۔ ہمارا تانگہ کا ... خود اتر کر دل سپاہیز افسر کی ڈیوٹی میں چلا گیا ہوا اس پلیٹ ... سپاہی اور افسر مذہبی اور کٹر مسلمان جو کہ ... نماز پڑھتے تھے۔ رشوت کو حرام سمجھتے تھے اور ...

ان کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ مجھے دیکھ کر چونکے اور کہنے لگے مسعود صاحب اتنے سویرے سویرے کیسے آنا ہوا۔ میں نے انہیں بتایا کہ ہندوستان جا رہا ہوں آخری بار سلام کرنے آیا ہوں۔ وہ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہنے لگے کہ بہت اچھا کیا، اور میرے ساتھ کوٹھی کے باہر آئے اور پولیس والوں سے کہا کہ مسعود صاحب کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ اور ان کے سامان کو بغیر تلاشی کے جانے دو۔ اور ایک سپاہی سے کہا کہ ان کے ساتھ جاؤ اور اسٹیشن پر چھوڑ کر آؤ۔

۳۰ اکتوبر کو صبح دس بجے جب یٰسین صابن والی گلی میں میری رہائش گاہ پر پہنچا تو اس کے ہاتھ میں ذبح شدہ مرغیاں دیگر اشیاء سبزی وغیرہ اور دھوبی کے دھلے ہوئے ہمارے کپڑے بھی تھے محلہ والوں نے جب اسے بتایا کہ وہ ہندوستان چلے گئے اور تمہیں سلام کہہ گئے اور تم سے نہ مل سکنے کی تمنا لے کر گئے ہیں تو بتانے والے بتاتے ہیں کہ یٰسین دھاڑیں مار کر رونے لگا اور کہنے لگا کہ خدا نے آج مجھے یتیم کر دیا ہے۔ سب کھانے پینے کی چیزیں اس نے غریبوں کو دیدیں۔ اور ہمارے کپڑے بھی ان کو دینا چاہا کہ جب وہ ہندوستان جائیں تو انہیں دے دیں۔ مگر کسی نے بھی یہ امانت سنبھالنے سے انکار کر دیا لوگوں کو اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ کسی کی امانت کون سنبھالتا۔ یہ سب حالات لالہ فتح چند گر نے مجھے بتائے جو صابن والی گلی کے ایک ممتاز باشندے تھے۔ اور ان کا انتقال حال ہی میں [illegible] میں ہی ہوا ہے۔

یٰسین نے جس ایمانداری، دیانت داری۔ اور خدمت گزاری سے میرے دل کو جیتا یہ اس کا ہی نتیجہ ہے کہ میں نے اپنے دفتر یا پریس میں آج تک کسی غیر مسلم کو ملازم نہیں رکھا۔ ہمیشہ ہی مسلمان لڑکوں کو ساری ذمہ داری سونپی۔ یہ یٰسین ہی کی ذات تھی جس نے مجھے یقین دلایا کہ مسلمان وفاداری۔ احسان شناسی اور جاں نثاری میں اپنا جواب آپ ہے (وہ یسٰین کا [illegible] ہر مذہب اور قوم میں ہوتے ہیں)

میں ۳۰ اکتوبر کو دہلی پہنچا اور دوسرے ہی دن یٰسین کو خط لکھا مضمون خط لکھنے کے بعد اس کا ایک خط آیا جس میں [illegible] لکھوایا تھا (یٰسین خدانخواستہ [illegible] کر [illegible] مجھے بھی ہندوستان بلوا لو اور میرے [illegible]) ناصف صاحب نے اپنے خط میں لکھا کہ پولیس نے یٰسین کو خوب تنگ کیا مگر [illegible]

[illegible] امانت سمجھتے ہوئے اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔ کچھ عرصہ بعد اطلاع ملی کہ یٰسین کا انتقال ہوگیا ہے۔ مگر میں اب بھی یٰسین کو اپنے دل و دماغ کے ہر گوشے میں محسوس کرتا ہوں۔ اس کا بھولا بھالا چہرہ جب بھی آنکھوں کے سامنے خیالی طور پر آجاتا ہے تو میری آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں۔ اب بھی میں اس کے دل سے نکلے ہوئے دعائیہ کلمات سنتا ہوا محسوس کرتا ہوں جیسے وہ جنت میں میرے لئے اللہ تعالیٰ کے حضور دعائیں مانگ رہا ہے۔ میں یٰسین کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ خدا نے یقیناً اس کے گناہ معاف فرما دیئے ہوں گے اور اسے جنت میں جگہ دی ہوگی۔ خدا کرے کہ یٰسین کا بیٹا زندہ ہو اور وہ پاک دامنی اور نیکی کی راہ پر زندگی گزار رہا ہو۔ ناصف صاحب کا احسان ہوگا اگر وہ یٰسین کے اہل و عیال کے بارے میں اطلاع دیں۔

اکتیس سال بعد میں یٰسین کو خراج عقیدت پیش کرتا ہوا برائیوں کو چھوڑ کر نیکی کی راہ پر آنے والے اس محسن کے احسانات کا شکریہ ادا کر رہا ہوں جس نے اس برے وقت میں میری خدمت کی جب انسان حیوان سے بھی بدتر حیوانیت پر اتر آیا تھا۔ اور میں نہایت ادب و احترام کے ساتھ مرحوم یٰسین کی پاک روح کو سلام کہہ رہا ہوں ــــ باقی رہے نام اللہ کا۔

نقد انعامات

جیتئے

آگ سے بچاؤ کے موضوع پر

نعروں / سلائیڈوں / مختصر فلموں کے لئے

لوگوں میں آگ سے محفوظ رہنے کا احساس و شعور پیدا کرنے کی غرض سے بھارت سرکار کی وزارت داخلہ ایک انعامی مقابلے میں شرکت کے لئے ایسے نعرے / سلائیڈ ڈیزائن / مختصر فلمیں مدعو کرتی ہے جن میں آگ سے بچاؤ کے موضوع کے اہم پہلوؤں کو اُجاگر کیا گیا ہو۔ یہ داخلے ہندی، انگریزی یا کسی بھی علاقائی زبان میں بھیجے جا سکتے ہیں۔ مقابلہ جیتنے والوں کو حسب ذیل انعام دیئے جائیں گے۔

انعامات	نعروں کے لئے	سلائیڈ ڈیزائن کے لئے	مختصر فلموں کے لئے سپر 8 - 16 ملی میٹر یا 35 ملی میٹر صوتی
پہلا انعام	500 روپے	1،500 روپے	5،000 روپے
دوسرا انعام	300 روپے	500 روپے	3،000 روپے
تیسرا انعام	200 روپے	250 روپے	1،500 روپے

براہ کرم مزید تفصیلات حاصل کیجئے
فائر ایڈوائزر،
وزارت داخلہ،
دوسری منزل، انڈین ایکسپریس بلڈنگ،
بہادر شاہ ظفر مارگ
نئی دہلی — 110002

داخلے وصول کرنے کی آخری تاریخ
31۔ اکتوبر [illegible] ہے

DAVP 78/239

انجمن کاروانِ ادب محلہ جالُوپور (جے پور) کا مشاعرۂ عید ملن

(سرور تونسوی)

انجمن کاروانِ ادب محلہ جالُوپور (جے پور) کے سکریٹری جناب گلُ خلیق کے اصرار پیہم کے پیشِ نظر اس بار پھر عید ملن مشاعرہ کی رُوداد لکھنے کا وعدہ کر لیا۔ دِلی نے شاید ہی سیلاب کی اس قدر عظیم تباہ کاری کا منظر ازل سے اب تک دیکھا ہو۔ دِلی کے گرد و نواح کے اضلاع یو۔پی۔ ہریانہ، پنجاب، راجستھان، سب ہی سیلاب کی لپیٹ بلکہ موت کے چنگل میں ہیں۔ ریل، بس اور دیگر ذرائع آمد و رفت مسدُود ہو چکے ہیں۔ ان جان لیوا حالات میں یقین تھا کہ مشاعرہ ملتوی کر دیا جائے گا کیونکہ بیرونی شاعروں کا جے پور پہنچنا ممکن تھا ہی نہیں۔ یکایک ریڈیو نے خبر دی کی کہ کل سے دہلی احمد آباد ایکسپریس اور احمد آباد میل چلائی جا رہی ہے اُسی وقت گلُ خلیق صاحب سے فون پر بات کی (دہلی سے جے پور ڈائل گھما کر ہی فون کیا جا سکتا ہے) تو انہوں نے بتایا کہ مشاعرہ ان حالات میں بھی ہو رہا ہے خواہ باہر سے کوئی شاعر بھی نہ آئے۔ مگر آپ اور روحی صاحبہ ضرور آجائیے۔ چنانچہ اُسی وقت احمد آباد میل میں جے پور کے لئے دو سلیپنگ برتھ ریزرو کرا لئے گئے اور ستمبر کی صبح کو جے پور اسٹیشن پر گلُ صاحب کو منتظر پایا۔ انہوں نے بتایا کہ عابدہ رفعت لکھنؤ سے عید کے باعث اپنے میکے ٹونک سیلاب کی یورش سے پہلے ہی تشریف لے آئی تھیں لہٰذا اُن کے شریک مشاعرہ ہونے کی تو اُمید ہے باقی بیرونی شعراء کا ابھی تک کچھ پتہ نہیں گو سب بیرُونی شعراء نے شریک مشاعرہ ہونے کی منظوری دے رکھی ہے۔

پچھلے سال جالُوپور کے اسی عید ملن مشاعرہ نے جے پور کے کامیاب مشاعروں میں اپنا مقام سرِفہرست کر لیا تھا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ جناب وسیم بریلوی کی بہترین اناؤنسنگ (اتفاقاً) نے مشاعرے کو اسی بہترین انداز سے بامِ عروج پر پہنچایا تھا کہ اس کی یاد اہلِ جالُوپور کے دلوں میں جاگزیں تھی اور ان کی خواہش پر ہی جناب وسیم بریلوی کو بطور خاص اُن کے مُنہ مانگے معاوضہ پر مدعو کیا گیا تھا۔ جناب ہلال سیوہاروی نے گزشتہ سال کے مشاعرہ میں جنتا پارٹی حکومت کے ارباب بست و کشاد کی اصل صورت اپنے اشعار کے پردے میں سامعین کو دکھائی تھی جسے جناب بھیرون سنگھ شیخاوت وزیر اعلیٰ راجستھان نے اور دیگر ارکان حکومت نے پسند فرمایا تھا۔ لہٰذا اس مرتبہ وزیر اعلیٰ کی فرمائش پر ہلال سیوہاروی کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ اسی طرح نرگس سہسوانی اور دوسرے اچھے شعرا کو بھی شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔

انجمن کاروانِ ادب کی یہ ادا پسند آئی کہ یہ صرف تین افراد پر مشتمل ہے۔ سرپرست جناب گردھاری لال بھارگو۔ ایم، ایل، اے، صدر جناب نور محمد صاحب، اور سکریٹری جناب گلُ خلیق، اور اس تثلیث نے یہ ثابت کر دیا کہ جس انجمن میں کم سے کم عہدہ دار ہوں گے وہ ٹھوس کام بہتر انداز میں کر سکے گی بہ نسبت اس انجمن کے جس کے عہدہ دار درجنوں ہوں۔ اس ضمن میں ایک واقعہ بھی سُن لیجئے۔ مرحوم مولانا محمد علی دہلی برادران کے اخبارات کا دفتر اور پریس دہلی میں تھا۔ کافی سٹاف۔ روپیہ اور اپنا پریس ہونے کے باوجود اخبارات وقت پر شائع نہ ہوتے تھے۔ تو تنگ آکر مولانا محمد علی نے بھیا احسان الحق صاحب (مرحوم) کو یہ ذمہ داری سونپی کہ وہ جائزہ لے کر رپورٹ پیش کریں کہ وہ کون سی وجوہات ہیں جن کے باعث اخبارات لیٹ چھپتے ہیں جب کہ ہر سہولت حاصل ہے۔ ایک ہفتہ بعد بھیا احسان الحق صاحب نے مولانا محمد علی کی خدمت میں رپورٹ پیش کی اور یہ مشورہ دیا کہ اگر آدھا سٹاف ہٹا دیا جائے تو اخبارات نہ صرف وقت پر ہی شائع ہوں گے بلکہ پریس اپنے اخبارات کے علاوہ باہر کا کام بھی کر سکے گا۔ چنانچہ بھیا احسان الحق کی اسی گذارش پر عمل کیا گیا تو دوسرے ہی دن اخبارات وقت پر شائع ہونے شروع ہو گئے اور ایک ہفتے کے اندر اندر ہی پریس میں باہر کا کام بھی ہونے لگا۔ اسی طرح ہر ادبی یا سیاسی

انجمنوں کا داخلی اندرونی پارٹی بازی کا شکار ہونا محض عہدہ داروں کی زیادتی کے باعث ہی ہوتا ہے۔

جمعہ ۸ ستمبر ۸۹ء کے ساڑھے آٹھ بجے مشاعرہ گاہ میں قدم رکھا تو انتظامات دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ لئیق محمد اوج کلی خلیقی صاحب نے جس شبانہ روز محنت اور کاوش سے (مخالف گروپ کی رخنہ اندازی کے باوجود) مشاعرے کا ہر پہلو سے بہترین انتظام کیا ہے وہ یقیناً قابلِ تعریف ہے۔ ساڑھے نو بجے تک تا حدِ نظر سامعین کا جمِ غفیر جو پوری اُردو نواز روایات کا ثبوت دے رہا ہے۔ کلی صاحب نے بتایا کہ وسیم صاحب وغیرہ شعراء راستے خراب ہونے کے باعث تشریف نہیں لا سکے اور اہلِ محلہ کے دل و دماغ وسیم زدہ ہو چکے ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ وسیم صاحب کے بغیر کوئی دوسرا اناؤنسر مشاعرے کو بہترین ڈھنگ سے چلا ہی نہیں سکتا۔ اور مخالف گروپ اہلِ محلہ کی اس دماغی جلن کو اور تیز تر کر رہا ہے۔ ادھر جناب راہی شہابی اپنے دولت کدہ پر اس انتظار میں تشریف فرما ہیں کہ مشاعرے والے اناؤنسنگ کے لئے اُن کی خدمت میں حاضری دیں کیونکہ گزشتہ سال اناؤنسنگ کے معاملہ میں راہی شہابی کا مجوزہ نام ہٹا کر وسیم بریلوی کو یہ فرض سونپا گیا تھا۔ اس لئے راہی شہابی بالکل بجا طور پر اپنی بے عزتی کا تدارک چاہتے تھے لہٰذا کلی صاحب نے جناب بہار گو صاحب سے راہی صاحب کو فون پر کہلوایا کہ آئیے جناب مشاعرہ کی نظامت سنبھالیئے۔ خیر جناب راہی تشریف لے آئے ہیں۔ جناب نذیر احمد صاحب جوہری نے راہی صاحب کو سمجھا دیا ہے کہ اس مشاعرہ کی یہ خصوصیت ہے کہ ہر پارٹی کے شعراء کو مدعو کیا گیا ہے۔ لہٰذا آپ ایک غیر جانبدار اناؤنسر بن کر ہر شاعر کا مناسب تعارف کرائیے گا۔ اور کوشش کیجئے کہ ہر شاعر کامیاب رہے کیونکہ اُردو کے لئے یہ ایک نیک فال ہے کہ ہر پوری برادری پارٹی کے نمائندہ شعراء کو اس مشاعرہ میں مدعو کر کے کلی صاحب اور نذیر احمد صاحب نے واقعی خادمِ اُردو ہونے کا ثبوت دیا ہے۔

جناب بھیروں سنگھ شیخاوت وزیرِ اعلیٰ راجستھان کسی ضروری کام کے لئے تین دنوں کے لئے کلکتہ تشریف لے گئے ہیں۔ عالی جناب گورنر راجستھان اُردو اور فارسی سے بخوبی واقف ہیں۔ مشاعرہ سے صرف تین روز پہلے مسلم مسافر خانہ کے عید ملن جلسہ میں گورنر صاحب موصوف نے اپنی اس خواہش کا اظہار فرمایا تھا کہ انھیں اُردو شاعری کا شوق ہے لہٰذا جب بھی جے پور میں کوئی معقول شعری نشست یا مشاعرہ ہو تو انھیں ضرور یاد کیا جائے۔ چونکہ ڈاکٹری ہدایات کے باعث گورنر صاحب کو رات کے ۹ بجے کے بعد یقینی طور پر بستر پر دراز ہو جانا چاہئے۔ لہٰذا اس پابندی کے باعث وہ بھی آج کے مشاعرہ میں آنے سے معذور رہے۔ مسلم مسافر خانہ کے عید ملن اجتماع میں گورنر صاحب نے اُردو کے بارے میں جن بہترین خیالات کا اظہار فرمایا اگر ہماری حکومت اس پر عمل بھی کرے تو پھر رونا ہی کس بات کا رہ جائے۔ دورانِ تقریر گورنر صاحب نے فرمایا کہ وہ اُردو، فارسی، لکھ پڑھ اور بول سکتے ہیں۔ مگر ساری عمر انگریزی یا ہندی لکھتے لکھتے اُن کا اُردو خط اچھا نہیں ہے۔ انھیں کسی شاعر کا اُردو میں لکھا ہوا خط آیا (غالباً ساغر نظامی صاحب کا) تو وہ چاہتے تھے کہ اس خط کا جواب بھی اُردو میں لکھیں مگر اپنی بدخطی کے پیشِ نظر انھوں نے چاہا کہ کسی سے خوش خط اُردو میں اس خط کا جواب لکھوائیں اور خود اُردو میں دستخط کر دیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنے اے۔ ڈی۔ سی۔ کو حکم دیا کہ سٹاف میں سے کسی ایسے کارندے کو بلائے جو اُردو لکھ سکتا ہو۔ گورنر صاحب نے فرمایا کہ اُن کی حیرت کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا جب اُنہیں یہ بتایا گیا کہ ان کے سٹاف میں کوئی بھی [illegible] ایسا نہیں ہے جو اُردو سے واقف ہو۔ جب کہ گورنر ہاؤس کے سٹاف میں کئی مسلمان حضرات بھی ہیں۔ آپ مشاعرہ سننے کے [illegible] ہوں گے۔ اور میں آپ کو اِدھر اُدھر کی باتوں میں الجھا رہا ہوں۔

لیجئے مشاعرے کے صدر مجوزہ بیری کمیشن کے سربراہ عالیجناب جسٹس جگوتی پرشاد بیری سابق چیف جسٹس [illegible] تشریف لے آئے ہیں۔ داعیانِ مشاعرہ کا یہ انتخاب [illegible] ہے۔ بیری صاحب اُردو، فارسی کے علاوہ جب اُن کے بس میں ہوتا تو وہ عدالتی فیصلے بھی اُردو میں لکھتے۔ صاحب صدر کی گل پوشی داعیانِ مشاعرہ اور اہلِ محلہ کے معززین کے علاوہ [illegible] کی مختلف انجمنوں کی طرف سے کی گئی ہے۔ بیری صاحب کو پھولوں سے لاد دیا گیا ہے۔ اس کے بعد جملہ شاعروں کی گل پوشی

محترم گرد ھاری لال بھارگو سرپرست انجمن کاروانِ ادب نے کی اور محترمہ اکرواجلا اروڑہ ایم۔ایل۔اے راجستھان کی واحد بہاری خاتون جے ایمرجنسی میں میسا اور ڈیفنس انڈیا رولز کے تحت ۱۹ ماہ جیل میں رکھا گیا اور اذیتیں دی گئیں۔ یہاں تک کہ انہیں کھانے میں کچھ ایسے سلو پوائزن اجزا دیئے گئے کہ یہ اب تک بیمار چلی آ رہی ہیں اور آئے دن ہسپتال میں داخل رہتی ہیں۔ نے شاعرات اور دوسری معزز خواتین کی گل پوشی کی ہے۔

آج ہی ۷ بجے شام کو ریڈیو سے یہ خبر نشر ہوئی ہے کہ جناب گردھاری لال بھارگو ایم۔ایل۔اے سرپرست انجمن کاروانِ ادب کو یو۔آئی۔ٹی راجستھان کا چیئرمین مقرر کیا گیا ہے۔ لہٰذا اب پھولوں کی بارش ہے کہ بھارگو صاحب پر کی جا رہی ہے۔ اور وہ ہاتھ باندھے عوام کا شکریہ ادا کر رہے ہیں۔ اور کہہ رہے ہیں کہ جاگیردار کے رہنے والے ہمیشہ مجھے اپنا خادم ہی پائیں گے۔

راہی صاحب نے مائیک سنبھالا۔ تو جناب پروفیسر کیدار صاحب ٹرانسپورٹ منسٹر فرمانے لگے۔ راہی صاحب کوئی ایسے شاعر بھی بلائے ہیں جو ہمارے خلاف اشعار پڑھ سکیں اس پر قہقہہ لگا ہے۔ اور راہی صاحب نے مشاعرہ کا آغاز جناب جعفر مال پوری سے کیا ہے۔ جعفر صاحب مائیک پر آئے اور انہوں نے پہلا مصرع پڑھا ہی تھا کہ محترمہ راج ماتا گائتری دیوی جی تشریف لے آئی ہیں راہی صاحب نے جعفر صاحب کو کلام سنانے سے روک دیا ہے اور راج ماتا کا شایانِ شان استقبال کیا ہے۔ محترمہ اجلا اروڑہ ایم۔ایل۔اے۔ کماری پشپا جین ایم۔ایل۔اے۔ روحی دہلوی۔ عابدہ رفعت ٹونکی نے راج ماتا کی گل پوشی کی۔ صاحبِ صدر۔ حکومت کے ارکان مشاعرہ کے داعیان اور معززین محلہ نے راج ماتا کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کیا اور اُن کی خدمت میں پھول پیش کئے۔ راجستھان کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ راج ماتا کسی اُردو مشاعرے میں بہ نفسِ نفیس تشریف لائی ہوں۔ راج ماتا کے شایانِ شان استقبال کے بعد راہی صاحب نے جعفر صاحب کلام سنانے کی درخواست کی ہے۔ جعفر ارشاد فرما رہے ہیں ؎

انسان وہی ہوتے ہیں انساں زمانے میں
جو کرتے ہیں دشمن پہ احسان زمانے میں
ہے کون یہاں رہبر اور کون سا رہزن ہے
مشکل ہوئی جاتی ہے پہچان زمانے میں

جعفر صاحب مشاعرہ کا آغاز کس حد تک بہتر انداز میں کر کے اپنی جگہ آ گئے ہیں۔ اور اب تکلیف دی گئی ہے جانشین میر اُستاد رونق جے پوری کو۔ اُستاد کا ایک ہی شعر سُن لیجئے۔ آپ تو کیا میر کی رُوح تک پھڑک اُٹھی ہو گی فرماتے ہیں ؎

اندھیری رات میں ہم کھیل کے شکار چلے
لگے لگے نہ لگے ہم تو تیر مار چلے

اُستاد رونق اچھی خاصی رونق لگا کر مائیک سے ہٹے تو راہی صاحب نے بڑے اچھے تعارف کے ساتھ جناب جوش خلیق جے پوری سے کلام سنانے کی التجا کی ہے۔ جوش صاحب اُردو کی خدمت کا جو جوش و خروش اپنے دل میں رکھتے ہیں اس کا مظاہرہ میں ادب نواخت کے مشاعرہ جشنِ آزادی کے موقع پر دیکھ چکا ہوں۔ محب خلیق اور جوش خلیق نے جو بھاگ دوڑ مشاعرہ کے انتظامات کے سلسلے میں کی اس کے لئے انجمن "ادب نواخت" کا ہر رکن دل سے اس کا ممنونِ احسان ہے۔ لیجئے جوش سے اُن کا کلام سنیئے۔ فرماتے ہیں ؎

جو تری یاد سے غافل نہیں ہے ؛ وہی تو دل ہے ورنہ دل نہیں ہے
مری نظروں میں ہے ایک اور عالم ؛ یہ دُنیا تو مری منزل نہیں ہے

جوش دلو پاتے ہوئے نغمہ سرا ہیں ؎

تجھے پانا بہت مشکل ہے لیکن ؛ محبت ہو تو کچھ مشکل نہیں ہے
شہید ناز ہیں اے جوش ہم تو ؛ وہ قاتل ہو کے بھی قاتل نہیں ہے

جوش خلیق صاحب داد پا کر اپنی جگہ تشریف لے گئے ہیں۔ اور راہی صاحب نے مرزا حمید بیگ جے پوری سے کلام سنانے کی درخواست کی ہے مرزا صاحب کہہ رہے ہیں کہ چار مصرعے سُنیئے جو شاعر رباعی یا قطعہ کو چار مصرعے کہتا ہے میرے نزدیک اس کی شاعری مشکل دکھائی دیتی ہے۔ مرزا صاحب نے اگرچہ چار مصرعے اور غزل میں کچھ شاعرانہ خصوصیت کا مظاہرہ فرمایا ہوتا تو بھی کچھ بات بن جاتی۔ آئیے اب پارس جودھ پوری کو سُنیئے۔ پارس صاحب اب راجستھان کے کامیاب ترین شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔ ترنم کا انداز بالکل بلبل دام پوری کا سا ہے۔ راہی صاحب نے پارس صاحب کو

بہت اچھا تعارف کرایا ہے۔ پارس صاحب نے صاحبِ صدر کی شان میں ایک مدحیہ نظم سنائی ہے۔ صاحبِ صدر جودھ پور میں ہائی کورٹ کے چیف جسٹس رہے ہیں۔ اور اپنی قانونی قابلیت اور انصاف پر مبنی قابلِ ذکر فیصلے دے چکے ہیں۔ جودھ پور کے ہر فرد کی زبان سے ہیری صاحب کی تعریف و توصیف کے کلمات بے ساختہ نکل پڑتے ہیں۔ جودھ پور کی اکثر شعری محفلوں میں ہیری صاحب شرکت فرماتے رہے ہیں۔ اس لئے پارس صاحب سے خوب واقف ہیں۔ اور پارس صاحب نے بھی نظم میں اپنی عقیدت کا اظہار قابلِ تعریف انداز میں پیش کر کے اپنی نیازمندی کا ثبوت دیا ہے نظم پسند کی گئی ہے۔ اس نظم کے بعد پارس صاحب نے ایک اور نظم "آج خوشیاں مناؤ کہ ہے عید کا دن" سنا کر داد سے جھولیاں بھر لیں ہیں۔ اور اب مائیک پر تشریف لائے ہیں جناب صادق نہرولوی پہلے قطعہ سنایا ہے اور پھر "وجدِ محبت" عنوان سے نظم۔ قطعہ معمولی نوعیت کا ہے اور نظم اچھی۔ مگر اس تیز رفتاری سے پڑھی گئی ہے کہ مجھ ایسے ملبل سے اس کا نقل کرنا مشکل ہے۔ راہی صاحب نے بڑے ہی اچھے انداز سے محترمہ ڈاکٹر اُجلا ارورہ ایم۔ اے۔ سے درخواست کی ہے کہ وہ اپنی ہندی کویتا سنا کر اس اردو مشاعرہ کو دو آتشہ بنا دیں۔ محترمہ اُجلا صاحبہ مائیک پر تشریف لائی ہیں اور اپنی ہندی کویتا سنا کر مناسب داد پائی ہے اس وقت رات کے گیارہ بجے ہیں۔ راج ماتا صاحبہ واپس تشریف لے جا رہی ہیں منتظمین مشاعرہ اور دیگر معززین انہیں کار تک پہنچانے گئے ہیں۔ راہی صاحب نے اب مؤدبانہ التماس کیا ہے جنابِ قوی فائیزی ٹونکی سے کہ وہ اپنا کلام بلاغت نظام عطا فرمائیں۔ راجستھان بلکہ ہندوستان میں سرزمینِ ٹونک کو گہوارۂ علم و ادب تسلیم کیا گیا ہے۔ جس سرزمین پر قبلہ حضرت صولت صاحب ٹونکی (مرحوم) ایسے نادرہ و یکتائے روزگار شاعر۔ اپنی طرز کے واحد استادِ فن۔ فنِ شعر کے جملہ رموز سے واقف اور عروضی باریکیوں پیچ و خم سمجھنے والے بزرگ کے قدوم میمنت لزوم پڑے ہوئے وہاں کا ذرہ ذرہ بھی شاعر ہو تو کیا عجب ہے آئیے اسی سرزمین ٹونک کے اس شاعر سے بھی مطلع غزل کے چند شعر سنئے۔ ارشاد ہوا ہے ؎

اللہ رے یہ آپ کا اندازِ تکلم یہ موجوں کا ترنم ہے کہ نغموں کا تلاطم
یہ رنگ یہ نکہت یہ بہاریں یہ تبسم کیا لطف ہوا ایسے میں چلے آؤ اگر تم

شاعرانہ ترنم۔ ہر مطلع مطلعِ انوار۔ داد و ستائش کا ریلا ہے کہ سامعین کے خوش فہم ہونے کی دلالت کر رہا ہے۔ قوی صاحب پورے اعتماد اور کامیابی کی قوی اُمید کے ساتھ سرزمینِ ٹونک کی شعری روایات کو برقرار رکھ رہے ہیں ؎

اللہ رے نگاہوں کا نگاہوں سے تصادم
پیمانوں میں میخانے نہ ہو جائیں کہیں گم
یہ نیچی نظر اور یہ اندازِ تبسم
محشر تو ابھی دور ہے کیا کرنے لگے تم

اس مطلع پر تو داد نے شورِ محشر کا روپ دھار کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ محشر دور نہیں ہے۔ بلکہ اس مطلع کو سنتے ہی حشر بپا ہو گیا ہے قوی صاحب اپنی جگہ پر تشریف لے گئے تو راہی صاحب نے جلدی میں انیس جے پوری کا نام پکارا ہے مگر افسوس کہ قوی صاحب کی بقیہ مطلع غزل کے جادو میں انیس جے پوری ہوٹ ہو گئے۔ اب شاداب جے پوری مائیک پر تشریف لائے ہیں۔ راہی صاحب نے ان کا تعارف اس شد و مد سے کرایا ہے کہ جیسے راہی صاحب خود ان کے شاگرد ہوں مگر حقیقت یہ ہے کہ شاداب صاحب محض گلے کے ماہر ہیں۔ ان کے اچھے اشعار غلط تلفظ ادا کرنے کے باعث یہ اعلان ببانگِ دہل کر رہے تھے کہ ہم دوسروں کا مال ہیں۔ ہاں اس میں کوئی شک نہیں کہ شاداب صاحب کا ترنم قابلِ تعریف ہے اگر وہ برا نہ مانیں تو یہ مشورہ عرض کرنے میں کوئی قباحت نہیں کہ وہ اپنے دوسروں کے مال کو صحیح تلفظ سے پیش کرنے کی ریہرسل کر لیں تو بڑے بڑے گلے باز شعراء کو یہ احساس دلا سکتے ہیں کہ فنِ موسیقی صرف انہیں تک محدود نہیں ہے۔ راہی صاحب نے بڑے مناسب تعارف کے ساتھ محترمہ شانتا بالی صاحبہ روشن کو کلام عطا فرمانے کی فرمائش کی ہے۔ سنئے روشن صاحبہ نغمہ سرا ہیں ؎

ہم نے یہ جرمِ محبت کی سزا پائی ہے
اک تری یاد ہے اور گوشۂ تنہائی ہے
[illegible] تو کبھی ہم نہ مجھنے کی قسم کھائی ہے
آپ کو دیکھ کے کیوں آنکھ بھر آئی ہے

شاخِ دل پہ امیدوں کا کوئی ٹھکانا نہیں

زندگی جیسے کسی بانجھ کی انگنائی ہے

شانتا بالی صاحبہ ابھی مائیک سے الگ ہوئیں تو راہی صاحب نے جناب عزیز ایوبی جے پوری کو کلام سنانے کی دعوت دی ہے۔ عزیز ایوبی جے پور کے شعراء میں اچھا مقام رکھتے ہیں۔ جے پور ہندوستان بھر میں ایک ایسا شہر ہے، جہاں کبھی بھی فرقہ وارانہ بدمزگی پیدا نہیں ہوئی۔ یہاں ہر مذہب و ملت کے لوگ انتہائی خلوص و محبت سے رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کے دُکھ درد اور خوشی میں شریک ہوتے ہیں۔ ۱۹۴۷ء کے انقلاب میں راجستھان کے شہروں میں خصوصاً جے پور میں سندھی مہاجرین کی بہت بڑی تعداد پناہ گزین ہوئی۔ مگر سندھی پیسہ کمانے کے سوا کسی اور بات میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا۔ اس لئے سندھی مہاجرین نے یہاں آکر اپنا نقصان محنت اور کاروبار سے پورا کرنے کی کوشش کی۔ جناب عزیز ایوبی جے پور کی نظم میں سرزمین جے پور کی انہی صفات کا ذکر ہے۔ نظم بہت اچھی ہے ملاحظہ فرمائیے —

لوگ کہتے ہیں کہ جے پور کی جنّت کشمیر

ہم یہ کہتے ہیں کہ ایسی کہاں اس کی تقدیر

جس کے پیروں میں فسادوں کی پڑی ہے زنجیر

یہی جنت ہے تو ہو منظور میری یہ تقصیر

کہیں جنت میں فساد ہوا کرتے ہیں

اتنے ناقص بھی خیالات ہوا کرتے ہیں

جے پور کی امن پسندانہ روایات کا ذکر اس بند میں یوں فرمایا ہے —

اس کے آنگن میں محبت کا برستا ساون

اس کی کلیوں نے حیا کا نہیں چھوڑا دامن

پیار کی ڈال دی ذہنوں پہ اسی نے چلمن

اسی جے پور کے چرچے ہوئے گلشن گلشن

تحفۂ امن اس شہر کو دینا ہوگا

اس کا جے پور بھی انقلاب کتنا ہوگا

جناب عزیز ایوبی صاحب کی یہ نظم خوب کامیاب رہی ہے اور انہیں جی بھر کر داد دی گئی ہے۔ عزیز ایوبی صاحب کے بعد جناب شمیم ایوبی صاحب مائیک پر تشریف لاتے ہیں۔ شمیم صاحب نے "تب اور اب" عنوان سے نظم سنائی ہے۔ جس میں یہ کہا گیا ہے کہ پچھلی حکومت اور موجودہ حکومت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جنتا پارٹی کے لیڈر سیاسی سوجھ بوجھ جسے پولیٹکل وزڈم کہا جاتا ہے، سے کوسوں دور ہیں۔ اور ان کی حماقتیں جنتا پارٹی کی مقبولیت کو عوام کے دلوں سے دن بدن کم کر رہی ہیں۔ اس لئے سامعین نے شمیم ایوبی کی نظم کو خوب پسند فرمایا ہے۔ راہی فرما رہے ہیں کہ بحرِ دخیر کہیاد صاحب وزیرِ ٹرانسپورٹ کی خواہش کو شمیم صاحب نے پورا کر دیا ہے اور اب راہی صاحب نے بڑے ادب و احترام سے رحمانی کو ادب و احترام کے اخلاقی معنوں سے یہ واقف نہیں ہیں بلکہ صرف لفظی معنوں سے شناسا ہیں، بہ روحی دہلوی سے کلام سنانے کی التجا کی ہے۔ روحی صاحب نے بلاشک و شبہ ایک پرانی غزل سنائی ہے۔ مگر اس پرانی غزل کے لیسے اشعار —

اے محبت تمام تری شان جگمگے نثار

دام و قفس بھی بخش دیئے بال و پر کے ساتھ

ہم جانتے ہیں گردشِ شام و سحر کا حال

گزری ہے عمر گردشِ شام و سحر کے ساتھ

بہر نوع نئی غزلوں پر بھاری ہیں۔ روحی صاحب غزل سنانے کے بعد اپنی جگہ پر آگئی ہیں۔ اور راہی صاحب نے فرید ایوبی جے پوری کو پکارا ہے۔ فرید ایوبی نے اپنے روایتی ترنم سے ایک غزل سنائی ہے نہ معلوم جے پوری شعراء کے ذہنوں کے شعری سوتے خشک کیوں ہوتے جا رہے ہیں کہ سالہا سال سے مشاعروں میں وہی سنائی غزلیں ہی سناتے ہیں۔ خیر فرید صاحب کی یہ غزل بھی خاصی طویل عمر رکھتی ہے تاہم اچھی غزل ہے۔ ایک شعر سنئے —

گزرے ہوئے وقتوں کی چوٹیں اُبھر آئی ہیں

پہلے کی طرح اب بھی لوگوں نے ستایا ہے

راہی صاحب نے جناب شمیم صاحب رحمانی سہارن پوری سے کلام سنانے کو کہا ہے۔ شمیم صاحب جے پور میں مقیم ہیں

سہارا لیا ہی اور بے پڑی اندازِ شاعری کا یہ عالم کہ شاعر بنے پھرتے
میں کہاں پہ آکے شعر کہا یہ نہ جانے کیا مقام ہے ۔

نہ خلوص ہے نہ سلوک ہے نہ پیام ہے نہ سلام ہے
مجھے اُن کے فعل سے کیا غرض مجھے اپنے کام سے کام ہے

وہ زباں چپ ہے تو کیا ہوا، نظر تو محوِ کلام ہے

تبسم صاحب مناسب داد دے سکے اور راہی صاحب نے مشاعرہ کے کنوینر جناب گل خلیقی جے پوری کو بہت ہی اچھے اور سو فیصدی مناسب تعارف کے ساتھ کلام سُنانے کی دعوت دی ہے۔ گل خلیقی شاعری کے میدان میں نوزادہ ہیں مگر انہوں نے جس تیز رفتاری سے مقبولیت پائی ہے اُس سے کئی حاسدوں کی نیند حرام ہو چکی ہے ۔ اس پر لطف یہ کہ ایک مشاعرہ میں ان کے بہترین کلام اور مسحور کُن ترنم کے باعث ایک ہندی چترکار نے نقرئی تمغہ دینے کا اعلان کیا ۔ دوسری غزل سُننے پر اندرا مارکیٹ کے پریذیڈنٹ سردار صاحب نے طلائی تمغہ کا اعلان کیا گیا تو سامعین نے گل صاحب سے ایک اور غزل سُنی جسے سنتے ہی اچاریہ دھرمیندر ناتھ صاحب ڈائرکٹر ایرانیالوجی یونیورسٹی راجستھان جے پور نے بھی نقرئی تمغہ کا اعلان کیا ۔ اور یہ تینوں تمغے ۱۶ راگست کو مشاعرہ ادب نواحت جے پور (رام لیلا گراونڈ) میں صاحبِ صدر جناب زیدی صاحب ہیڈ آف اُردو راجستھان یونیورسٹی جے پور۔ جناب مولانا قمر واحدی صاحب چیرمین اُردو اکاڈمی راجستھان جے پور اور جناب اچاریہ دھرمیندر ناتھ صاحب کے ہاتھوں گل خلیقی صاحب کے سینے پر لگائے گئے ۔ جس سے حاسدوں کی نیندیں ہی نہیں دن کا چین بھی جاتا رہا ہے ۔ حالانکہ عزت اور ذلت خدا ہی دیتا ہے گل خلیقی سے فرمائش کی گئی ہے کہ وہ اپنی مشہور غزل جس کا مطلع ہے ؎ کہہ رہی ہے مری چشمِ نم ۔ اب تو کیجے نگاہِ کرم ۔ سنائیں ۔ یہ غزل شانِ ہند کے ماہِ جون کے شمارے میں شائع ہوئی ۔ اور سہواً دوبارہ جولائی کے شمارہ میں بھی طبع ہو گئی ۔ جس پر جودھپور کے فریدہ آفریدی صاحب کو محض اس وجہ سے دردِ قولنج کا عارضہ ہو گیا کہ انہوں نے راہی صاحب کے سلسلے میں جو مطلب دیا بس شانِ ہند میں اشاعت کے لئے بھیجا تھا اُسے شائع کرنے سے انکار کر دیا گیا تھا ۔ اس مشاعرہ میں اگرچہ آفریدی صاحب موجود

ہوتے تو اپنے کانوں سے سنتے اور آنکھوں سے دیکھتے کہ گل صاحب کو اس غزل پر کس قدر داد ملی ہے ۔ یہ دوسری بات ہے کہ انہیں گل صاحب کی اس مقبولیت اور کامیابی پر حسد کی آگ میں اور بھی جلنا ہوتا ۔ خیر چھوڑیئے حاسدوں کو ۔ یہ تو ازل سے ابد تک اپنی کمینہ خصلت سے باز نہیں رہ سکیں گے ۔ سُنیئے راہی صاحب کس قدر [illegible] کے بعد عزیزی عابدہ رفعت ٹونکی کو کلام عطا کرنے کی گزارش کر رہے ہیں ۔ عابدہ رفعت غزل سُنا رہی ہیں اُن کا اشعار تو میں آپ کو سُنا سکتا ہوں مگر اُن کے ترنم کو [illegible] بیان کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا ۔ اپنے اشعار کا لطف آپ بھی اُٹھا لیجئے ۔ ترنم تو دعا کیجئے کہ آپ بھی عابدہ رفعت صاحبہ کو کسی مشاعرہ میں سُن سکیں ۔ عابدہ رفعت فرما رہی ہیں ؎

دل میں زخموں کی لالہ کاری ہے ؛ فصلِ گل پھر بھی ہم کو پیاری ہے
دل تمہارا ہے جان تمہاری ہے ؛ نام کو زندگی ہماری ہے
اپنا اپنا نصیب اے دوست ؛ غم ہمارے خوشی تمہاری ہے
جو حسنِ نظر تو کیا ہے جمال ؛ حسن کیا ہے نظر جو بھاری ہے
اُس نظر کا یہ حال ہے رفعت ؛ اک نظر سو دلوں پہ بھاری ہے

داد اور پسندیدگی کے شور میں سامعین کا مطالبہ ہے کہ رفعت صاحبہ سے ایک غزل اور سنوائی جائے ۔ مگر راہی صاحب نے گزارش کی ہے کہ شعراء کی فہرست طویل ہے ۔ اس لئے پہلا دور ختم ہو جانے کے بعد آپ کی فرمائشوں کا نمبر ہوگا ۔ اب جناب آرزو جے پوری مائک پر تشریف لائے ہیں ۔ اچھا ترنم ۔ چھوٹی بحر کی غزل ۔ بے شک خاصی پُرانی ہے ۔ تاہم اب بھی سُنیئے تو اچھی لگتی ہے ۔ ارشاد ہو رہا ہے ؎

حسن جب محوِ خواب ہوتا ہے ؛ آپ اپنا جواب ہوتا ہے
پھول جھڑتے ہیں بات کرنے میں ؛ جب مکمل شباب ہوتا ہے
اُن کے معصوم ہونٹ ہیں ایسے ؛ جیسا کھلتا گلاب ہوتا ہے

ہونٹ کو ہوٹ کہہ کر آرزو صاحب نے عالمانہ غلطی کر کے کمال کر دیا ہے اس کے باوجود یہ شعر بھی سُن لیجے ؎

اُن کی درکار میں جگہ تو سہی ؛ کرم بے حساب ہوتا ہے

اب جناب پارسا کوثری کو اُن کے شایانِ شان تعارف کے بعد راہی صاحب نے کلام مرحمت فرمانے کی استدعا کی ہے ۔ آپ

جے پور راجستھان حضرت پارسا کوثری کے کلام سے لطف اٹھا رہے ہیں۔ پارسا جو ابتدائی میں اپنے ترنم سے جو جادو جگاتا تھا اب بڑھاپے میں وہ ترنم تو نہیں رہا مگر ضعیفی میں بھی وہ کسی ترنم شاعر سے پر بھاری ہے۔ مطلع ہوا ہے ؎

جس جگہ اہلِ نظر پہنچے نہ فرزانے گئے
اُن مقاموں پر گئے تو تیرے دیوانے گئے
اُن کی محفل میں میرے جتنے بھی نذرانے گئے
خونِ دل سے جو لکھے تھے وہی افسانے گئے
کون سے میکش ہیں ساقی آج پینے کے لئے
خم گئے شیشے گئے لبریز پیمانے گئے
کون کہتا ہے کہ مانگا غیر سے ہم نے کبھی
کب ترے در کے سوا دامن کو پھیلانے گئے

واہ ہے کہ جالو لو سے مکیں اور مکاں دونوں یاد رکھیں گے۔ اور حضرت پارسا ہیں کہ کیا پتے کی بات کہہ رہے ہیں ؎

الجھنوں میں خود الجھ کر رہ گئے وہ بدنصیب
جو تری اُلجھی ہوئی زلفوں کو سلجھانے گئے

داد کا پھر ایک شورِ قیامت ہے۔ اور جناب پارسا دُنیا دارانہ بے خبر ہونے کے باوجود کیا سچائی کا منظر دکھا رہے ہیں ؎

اب نہ وہ دلداریٔ ساقی نہ رندوں میں خلوص
کچھ روش ہی اور دیکھی ہم جو میخانے گئے
اس سے بڑھ کر اور کیا ملتی ہمیں دادِ وفا
ہم ترے ہی نام سے دُنیا میں پہچانے گئے

واہ پارسا واہ قبلہ کوثرؔ و حضرت صولتؔ کی روحیں بھی اس داد پر خوش ہو رہی ہوں گی۔ مقطع عطا ہوا ہے ؎

پارسا ہوتے ہوئے بہت تھا پارسائی پر نہیں
میکدے میں آج وہ کس دل کو بہلانے گئے

پارسا اپنی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے واپس اپنی جگہ تشریف لائے تو راہی صاحب نے اختر گوالیاری سے کلام عنایت فرمانے کے لئے فرمایا ہے۔ اختر گوالیاری اُردو شاعری کے اختر تاباں بنے فرما رہے ہیں ؎

جب ہم دوست رنگ و بو میں سما جاتا ہے
تب کہیں صبا کے دامنوں میں اتر آتا ہے
دھوپ ہی ٹھیک ہے اس چھاؤں سے جو گم کر دے
کم سے کم دھوپ میں سایہ تو نظر آتا ہے

واہ ہے کہ پارسا کا ریکارڈ توڑ گئی ہے۔ صاحب صدر نے اس شعر کو دوبارہ پڑھوایا ہے اور سامعین نے اس شعر کو حاصلِ مشاعرہ قرار دیتے ہوئے داد سے اختر کو ایسا نوازا ہے کہ وہ اہلِ جے پور کے سخن فہم ہونے کے قائل ہونے کے ساتھ ساتھ خوش ہو رہے ہیں کہ اصل داد سخن شناس ہی دے سکتے ہیں۔ اب آپ غزل شروع کر رہے ہیں ؎

گرمیٔ حق و صداقت سے بھرے ہیں ہم لوگ
ظلم باطل سے ڈریں گے نہ ڈرے ہیں ہم لوگ
تم نے بے جان سمجھ کے ہمیں دفنا تو دیا
یہ تو بتلاؤ کہ کس وقت مرے ہیں ہم لوگ

داد دینے والے حقِ داد کو اس کا حق ادا کر رہے ہیں اور اختر صاحب گوالیار کا نام روشن کر رہے ہیں ؎

بارہا یورشِ باطل کا جگر چیرا ہے
اور کبھی اپنی ہی آہٹ سے ڈرے ہیں ہم لوگ
جس گلستاں کے لئے خون کفن پہنا تھا
آج اُس کی بہاروں سے پرے ہیں ہم لوگ

داد کے شور میں اختر صاحب واپس ہوئے تو سامعین نے طویل اور پُرزور دادیوں کا سلسلہ تب تک جاری رکھا جب تک کہ اختر صاحب دوبارہ مائیک پر نہیں آئے۔ اختر صاحب سے ایک ایک شعر کئی کئی بار پڑھوایا گیا ہے اس لئے وہ تھک گئے ہیں اور سامعین ہیں کہ انہیں ابھی اور سننا چاہتے ہیں۔ دوسری غزل کا مطلع شروع کیا تھا کہ راہی صاحب نے اعلان کیا ہے کہ جناب ہیرو ضیر کیدار صاحب منسٹر آف ٹرانسپورٹ راجستھان اختر صاحب کو اکیاون روپے نذر کر رہے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ راجستھان کی کیبنٹ میں ایک وزیر تو ایسا ہے جو اُردو شاعری کا قدرداں ہے۔ سنئے اختر صاحب

فرما رہے ہیں ؎

قریب آگیا وقتِ نماز اے واعظ
شراب کوثر و تسنیم لا وضو کے لئے
میں اُن کے سامنے یوں گنگنا رہا ہوں غزل
کوئی بہانہ ضروری ہے گفتگو کے لئے

اختر صاحب اس قدر تھک گئے ہیں کہ اب اُن سے غزل سُنانا ممکن ہی نہیں رہا۔ لہٰذا وہ معذرت چاہتے ہوئے اپنی جگہ آگئے ہیں۔ راہی صاحب نے اعلان کیا ہے کہ اب کماری پُشپا ثمین ایم۔ اے مائیک پر تشریف لا رہی ہیں۔ بڑی رد و کد کے بعد پُشپا صاحبہ مائیک پر آئی ہیں۔ اور فرما رہی ہیں کہ میں کوئی شاعرہ نہیں ہوں۔ اِل ہندی اور اردو کے کویوں کی کوتائیں گاتی ضرور ہوں۔ آپ شاعروں سے کلام سننے آئے ہیں۔ اور یہاں مجھ غیر شاعر کو بٹھا دیا گیا ہے۔ تاہم دو چار اشعار شکیل بدایونی کے پیش کرتی ہوں۔ کماری پُشپا نے فن کارانہ ترنم سے مرحوم شکیل کی مشہور غزل کا مقطع ہے ؎

تم نے ہنسنے نہ دیا ضبط نے رونے نہ دیا
اسی اُلجھن نے کوئی فیصلہ ہونے نہ دیا

سنا کر اچھی داد پائی ہے۔ اس وقت ایک بجا ہے اور راحت اندوری کسی نہ کسی طرح بارش میں بھیگتے بھاگتے مشاعرہ کے پنڈال تک آ پہنچے ہیں۔ ابھی وہ بیٹھنے بھی نہ پائے تھے راہی صاحب نے راحت صاحب کے دو اشعار سُنا کر انہیں مائیک پر بلا لیا ہے۔ سنئے راحت کے کچھ گوہر بار جنہوں نے مشاعرے کا رُخ ہی موڑ دیا ہے۔ راحت صاحب کلام سنا رہے ہیں اور اس دلفریب انداز میں سنا رہے ہیں کہ ہزاروں ترنم پانی پانی ہو رہے ہیں ؎

خانقاہوں میں ملے ہیں نہ شوالوں میں ملے
وہ فرشتے جو گناہوں کے حوالوں میں ملے
اللہ کو ہم نے کبھی غور سے دیکھا ہی نہیں
اُس سے کہنا کہ کبھی دل کے اُجالوں میں ملے

ہے کہ راحت مشاعرے کا دولہا دکھائی دے رہا ہے ارشاد ہوا ہے ؎

مسکراہٹ کی ہتھیلیوں پہ چڑھا دو آنسو
زندگی ایسی گزارو کہ مثالوں میں ملے
میں نے دیکھا ہے تجھے غور سے اے جانِ غزل
میر و غالب ترے اُلجھے ہوئے بالوں میں ملے

داد کا ایک ایسا ریلا ہے کہ جس میں میر و غالب بھی بہتے نظر آ رہے ہیں۔ اور راحت ہیں کہ قیامت ڈھانے کے جملہ ذرائع استعمال کر رہے ہیں ؎

شکل و صورت سے تو جیسے بھی ہیں راحت صاحب
پھر بھی جب جب وہ ملے زہرہ جمالوں میں ملے

دوسری غزل عطا ہو رہی ہے ؎

آج ہم نے دل کا ہر قصہ مکمل کر دیا
خود بھی پاگل ہو گئے اُن کو بھی پاگل کر دیا
اپنی پلکوں پر سجا کر میرے آنسو آپ نے
راستے کی دھول کو آنکھوں کا کاجل کر دیا
یہ ہوائیں کب نگاہیں پھیر لیں کس کو خبر
شہرتوں کا تخت جب ٹوٹا تو پیدل کر دیا

داد ہے کہ جملہ ریکارڈ منہ تک رہے ہیں۔ اب راحت صاحب کو جو کچھ یاد آ رہا ہے وہ جھٹ جھٹ سنا رہے ہیں سُنئے ؎

آنکھ اُٹھاتا ہوں تو شیشے کی چھتیں ملتی ہیں
ہاتھ اُٹھاتا ہوں تو پتھر کی طرف جاتے ہیں
میں اس سوچ میں گم ہوں کہ کدھر جانا ہے
راستے سب ہی ترے گھر کی طرف جاتے ہیں

داد دینے والے بخل سے کام نہیں لے رہے ہیں اور راحت کلام سُنانے میں فراخدلی سے کام لے رہا ہے۔ فرما رہے ہیں ؎

پھول جیسے مخملیں تلووں میں چھالے کر دیئے
گورے سورج نے ہزاروں جسم کالے کر دیئے
پیاس اب کیسے بجھے گی ہم نے خود ہی بھول سے
میکدے کم ظرف لوگوں کے حوالے کر دیئے

داد ہے کہ جنتا پارٹی کی ہائی کمان ممبروں کے گھروں تک سنائی دے رہی ہوگی۔ اور راحت کیا خدا لگتی کہہ رہا ہے ؎

ظلم کے حق میں آمر ور کے پے گئے ہیں
میرے دشمن ہیں مگر چپ ہیں بھلے گئے ہیں

دوستی، احباب، وفا، پیار، محبت، اخلاق
اب یہ الفاظ کتابوں میں بھلے لگتے ہیں

اشعار ہیں کہ جو اپنے بہت کم اشعار پر داد پانے والے ہیں ہم بار بار داد دے رہے ہیں۔ اور ادھر راحت سے کہا جا رہا ہے کہ اگر کسی آل انڈیا مشاعرے میں آپ کو بلا لیا جائے تو وہ آل انڈیا مشاعرہ واقعی کامیاب ترین مشاعرہ ہوگا۔ سنئے راحت ایک غزل سنا رہے ہیں ؎

تیرگی چاند کے زینے سے سحر تک پہنچی
زلف چہرے سے جو اتری تو کمر تک پہنچی

تم تو سورج کے پجاری ہو تمہیں کیا معلوم
رات کس حال میں کٹ کٹ کے سحر تک پہنچی

میں نے پوچھا تھا کہ یہ ہاتھ میں پتھر کیوں ہے
بات جب آگے بڑھی تو مرے سر تک پہنچی

داد ہے کہ راحت اس مشاعرہ کا ہیرو نظر آرہا ہے۔ ایک شعر اس غزل کا اور سنئے ؎

میں تو سویا تھا مگر بارہا تجھ سے ملنے
جسم سے آنکھ نکل کر ترے گھر تک پہنچی

قریباً ایک گھنٹے تک راحت نے جس والہانہ ادا سے کلام سنایا ہے وہ اس امر کی ضمانت ہے کہ ہر وہ مشاعرہ جس میں راحت شریک ہوگا یقیناً کامیاب ہوگا۔ اور سننے والوں نے بھی جس فراخدلی سے داد دی ہے اس سے راحت کو بھی دلی راحت ملی ہے۔ گیت پیڑ کے سامعین ہر اچھے شعر پر داد دینے میں بخل سے کام نہیں لیتے۔ راحت طویل تالیوں کی جھنکار پر اپنی جگہ پر آئے تو پھر مائک پر جاکر راہی شہابی سے کلام سنانے کی درخواست کی ہے۔
محترمہ ڈاکٹر اجلا ارونا صاحبہ نے بھی راہی صاحب سے کلام سنانے کو کہا ہے۔ لیجئے راہی شہابی (جنہوں نے اس مشاعرہ کی اناؤنسنگ میں بسیم بریلوی کی کمی کسی مرحلے پر محسوس نہیں ہونے دی اور اہل جے پور کو درس دیا ہے کہ انہوں نے اپنے

گھر والوں کی کچھ خبر ہی نہیں لی اور باہر والوں کے پیچھے بھاگتے رہے ہیں وگرنہ یہ پھر میں کس سے ملنے کی گئی ہے؟ ایک نظم "پیغام عید" سنا کر صاحب صدر بھی ... ہے۔ نظم خاصی طویل ہے۔ اور بہت اچھی ہے یہ نظم شمع ہند کے ماہ نومبر کے شمارہ عید الفطر کے موقع پر شائع کی جا رہی ہے۔ اب جناب راہی صاحب نے قبلہ مولانا خلیق صاحب سے کلام عطا فرمانے کی گزارش کی ہے۔ سنئے خلیق صاحب کا استادانہ کلام ؎

صہبائے عشق ساغر ہستی میں بھر گئے
وہ مجھ کو عمر بھر کے لئے مست کر گئے

دل میں سمائے اور جگر میں اتر گئے
کچھ اس ادا سے آئے کہ دیوانہ کر گئے

دنیا نگاہ شوق کا مرکز نہ بن سکی
ہم آپ کی حسین اداؤں پہ مر گئے

صدقے خلیق اس نگہ التفات کے
غم خانۂ حیات کے گیسو سنور گئے

قبلہ خلیق اچھی داد پا کر اپنی جگہ تشریف لے گئے تو راہی صاحب نے نہایت ادب و احترام کے ساتھ اردو اکاڈمی کے صدر جناب مولانا قمر واحدی ایوبی صاحب سے التماس کیا ہے کہ کلام بلاغت نظام عطا فرمائیں۔ حضرت مولانا نے عید مبارک سے متعلق کچھ اشعار سنا کر غزل شروع فرمائی ہے ؎

محبت کا اثر اے کاش اتنا تو عیاں ہوتا
کہ اپنی شکل و صورت پر مجھے ان کا گماں ہوتا

وہ میرے دیکھ لینے ہی لیکن مزا ایب تھا
یہ پردہ بھی نہ حائل ان کے میرے درمیاں ہوتا

نتیجہ کیا ہوا گر طور کا خرمن جلا ڈالا
گری تھی جس پہ بجلی کاش میرا آشیاں ہوتا

وہ کیوں رنجیدہ ہوتے میرے مرنے کی خبر سن کر
ماتم کس لئے ان کو نصیب دشمناں ہوتا

قمر یہ رات دن کی گردشیں مجھ کو ستاتی کیوں
ازل سے ہی اگر دشمن نہ میرا آسماں ہوتا

نعت

انور مسعود

ہے ثبت تری ذات سے تاریخِ بشر میں
وہ عزم کہ تھکتا نہیں طائف کے سفر میں

تو نورِ ازل تا بہ سحرِ مطلعِ تخلیق
فیضانِ ضیا تجھ سے ہے دامانِ سحر میں

خورشید کے کاسے میں ترا صدقۂ انوار
خیرات ترے نور کی کشکولِ قمر میں

تو سارے جہانوں کے لئے مژدۂ رحمت
احوال زمانوں کے سبھی تیری نظر میں

اے سیدِ سادات عنایت کی نظر ہو
یہ عہدِ ہوس ڈوب چلا ظلمتِ شر میں

درپیش ہے بے سمت مسافت کی اذیت
اس دور کا انسان ہے دانش کے بھنور میں

شاداب سدا تیرا چمن زارِ تکلم
ہر فلسفۂ غیر ہے آشوبِ خطر میں

حیراں ہے تری شانِ توکل پہ زمانہ
چولھا بھی نہ جلتا تھا مہینوں ترے گھر میں

اشکوں کو زمیں پر بھی گرنے نہیں دیتا
سرمایہ تری یاد کا ہے دیدۂ تر میں

انور مرے دیوان میں ہے نعتِ پیمبر
کیا توشۂ عقبیٰ ہے مرے رختِ سفر میں

اپنے اسٹیشن کو صاف رکھئے

- اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ صاف ستھرا ماحول ایک طرف کسی شخص کے کردار کا آئینہ دار ہوتا ہے اور دوسری طرف اس کردار کو نکھارتا ہے صاف ستھرا گرد و پیش خوشی اور مسرت بکھیرتا رہتا ہے۔
- ہم اپنے گھر صاف ستھرے رکھتے ہیں تو پھر اُن جگہوں کو صاف شفاف کیوں نہ رکھیں جنھیں ہم سب استعمال کرتے ہیں
- ریلوے پلیٹ فارموں، ویٹنگ روموں، سواری ڈبوں، اور درحقیقت اِن تمام جگہوں کو جہاں بڑی تعداد میں لوگ اکٹھے ہوتے ہیں گرد و پیش کو صاف شفاف رکھنا بہت ہی ضروری ہے۔

ریلوے نے صفائی مہم شروع کی ہے جس کے بہت اچھے نتائج نکلے ہیں اب سٹیشن صاف ستھرے نظر آتے ہیں لیکن ہم محسوس کرتے ہیں کہ اس سلسلے میں ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے ہم زیادہ صفائی کیلئے اپنی کوششوں کا سلسلہ جاری رکھیں گے آپ بھی اس سلسلہ میں ریلوے کی مدد کر سکتے ہیں آپ صرف اتنا ہی خیال رکھیں کہ آپکے آس پاس کی جگہ بالکل صاف شفاف حالت میں رہے اس طرح اسٹیشن اور منسلکہ مقامات صاف ستھرے رہ سکتے ہیں۔ اور ہاں آپ ریلوے صفائی محکمہ کے کارکنوں کی خدمات سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں وہ صرف آپ کی خدمت کیلئے ہی رکھے گئے ہیں آپ بھی ذرا خیال رکھئے کہ کوڑا کرکٹ آپکے ہاتھ سے اِدھر اُدھر نہ بکھرنے پائے بلکہ کوڑا دان میں پھینکا جائے آپ کا یہ معمولی سا کام ہمیں آپ کی بہتر خدمات کرنے میں کافی مدد دیتا ہے۔

ریلوے آپ کی پراپرٹی ہے اسے صاف شفاف رکھئے

ناردرن ریلوے

گوشۂ عقیل صدیقی

(پاکستانی رسائل سے اخذ کئے گئے ادبی شہ پارے)

پروین شاکر — زخمِ جگر سے نقشِ ہنر تک کا ایک سفر

نیر صدیقی

کچھ اس قسم کی بات غالباً فراق نے کہی تھی کہ اردو شاعری عاشق کے جذبات کی شاعری ہے۔ اردو شاعری کا بیشتر حصہ فراق کے اس خیال کی تصدیق کرتا ہے لیکن میں اس صورتِ حال کو ایک اور نقطۂ نظر سے دیکھتا رہا ہوں۔ اردو شاعری کا مطالعہ کرتے وقت بسا اوقات مجھے یہ محسوس ہوتا رہا ہے کہ اردو شاعری ایک مجنوں صفت مجنوں کے جذبات کا اظہار تو ہے لیکن ان جذبات کا تعلق کسی لیلیٰ صفت لیلیٰ سے نہیں۔

پروین شاکر کی کتاب "خوشبو"[1] پڑھتے وقت مجھے یہ محسوس ہوا کہ "خوشبو" میں پہلی مرتبہ ایک لیلیٰ صفت لیلیٰ کے جذبات کو زبانِ شعر نصیب ہوئی ہے۔ لیکن ان جذبات کا تعلق کسی مجنوں صفت مجنوں سے نہیں۔ اردو شاعری کی اس صورتِ حال نے مجھے جمیل ملک کا وہ شعر یاد دلایا جس کے سہارے ممکن ہے وہ ہمیشہ زندہ رہ سکیں۔

پیچ در پیچ سلسلہ دل کا ؏ مجھے تیری تجھے کسی کی تلاش

محبت کی کہانی بسا اوقات محبت کے اس ابدی نشاط سے خالی نہیں ہوتی لیکن اگر ہو۔ جب بھی محبت کی کہانی انسانی زندگی کی پرانی کہانیوں میں سے ہے۔ جیسا کہ خود پروین شاکر کو اعتراف ہے یہ کہانی نئی نہیں ہے اور یہی کیا دنیا کی کوئی کہانی نئی نہیں ہے — یہ تو ہمارے اندر کا کہانی کار ہے جو اس کو ایسا سندر بنا دیتا ہے کہ سننے والا کاسن ہو سے ا۔

یقیناً یہ کہانی اپنے اجزائے ترکیبی کے اعتبار سے نئی نہیں ہے — یہ کہانی کبھی دو دلوں کے مل جانے سے وجود میں آتی ہے اور کبھی نہ ملنے سے، کبھی مل کر جدا ہو جانے سے اور کبھی ساری جدائیوں کے باوجود ملے رہنے سے — غرض کہ اس کہانی کے بنیادی اجزا ہمیشہ یکساں ہوتے ہیں لیکن جس طرح کائنات کا سب سے بڑا فن کار خدا یا فطرت انسانی چہرے کے مشترک اجزا سے ہر روز بلکہ ہر لمحے بے شمار نئے چہرے پیدا کرتی رہتی ہے اسی طرح خدا یا فطرت کے بعد کائنات کا دوسرا سب سے بڑا فن کار انسان اپنے دکھ سکھ کے پرانے اجزا سے ہمیشہ نئے فن پارے تراشتا رہتا ہے۔ واضح کا مشاہدہ داد کے قابل ہے:

ہر دل میں نئے درد سے ہے یاد کسی کی، ملتی نہیں فریاد سے فریاد کسی کی

یاد، درد، فریاد کے نئے طریقے ہی نہیں سکھاتا بلکہ روح کے ان زخموں کو بھی گننا سکھاتا ہے جو ہر کھلے دور میں کسی نہ کسی وجہ سے نظر انداز ہوتا رہا ہے۔ جوں جوں انسان میں ذہنی بالیدگی آتی جاتی ہے وہ اپنے جذبات سے شرمانے لگا ہے۔ اپنی نسل کے برعکس "خوشبو" کی شاعرہ اپنے جذبات سے شرماتی نظر نہیں آتی۔ یہ عہد چونکہ فلسفے کی خشکی کو جذبات کی خوشبو پر ترجیح دینے کا عادی ہو چکا ہے اس لئے پروین شاکر کی شاعری پر یہ اعتراض کئے بغیر نہ رہ سکا۔

آپ کی شاعری صرف خوشبو ہے۔
دل میں اترتی ہوئی۔
روح پر شبنمی ہاتھ رکھتی ہوئی۔
یہ مگر — ذہن کو صرف ہلکے سے چھو کر گزر جائے گی (تنقید اور تخلیق)

اس اعتراض کے جواب میں پروین شاکر نے بڑی خود اعتمادی کے ساتھ کہا:

آپ سچ کہہ رہے ہیں — میں نہیں چاہتی — کہ میرا فن
گلہ — دیکھئے نا — ابھی میرا فن کچی عمر دار میں ہے
جوان ہونے سے قبل ہی بوڑھا ہو جائے
(آپ اسے خواب ہی دیکھنے دیجئے — اور فلسفے کا عصا لے کر چلنے لگے)
ابھی گمبھیر دانش وری میں نہ الجھائیے (تنقید و تخلیق)

---

[1] خوشبو۔ پروین شاکر کا مجموعہ کلام قیمت ۳۰ روپے
ناشر: مکتبۂ فنون لاہور۔ و تعاون اظہر لاہور۔

"خوشبو" ایک غیر معمولی ذکی الحس اور حساس لڑکی کے عنفوانِ شباب کی شاعری ہے۔ عام شاعروں کو عنفوانِ شباب کی شاعری کہہ کر بڑی آسانی سے ادبی SNOBBERY کا نشانہ بنایا جا سکتا ہے۔ لیکن "خوشبو" ایک ایسا شعری کارنامہ ہے جو اپنے کسی انصاف پسند قاری کو اپنے مضمون عنفوانِ شباب کا عشق اور عنفوانِ شباب کی شاعری ان میں سے نہ تو کسی عنصر کی دل کشی سے انکار کرنے دے گا۔ خوشبو اسی کی اہمیت سے۔ یہاں میں نے "قاری" کے ساتھ انصاف پسندی کی شرط یا صفت اس لئے لگا دی ہے کہ اگر قاری میں انصاف پسندی نہ ہو تو وہ اٹھارہویں صدی کے ٹوماس رائمر (THOMAS RHYM...) کی طرح شیکسپیئر تک کے بارے میں یہ کہنے سے باز نہیں آتا کہ گھوڑوں کے ہنہنانے اور گینڈوں کے چیخنے میں شیکسپیئر کے ڈراموں سے زیادہ معنی ہوتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ پروین شاکر اردو شاعری میں ایک حیرت واقعہ ہیں۔ ان کی کتاب "خوشبو" میرے عام اندازے کے مطابق پندرہ سال سے بیس سال کی عمر کے درمیان کی شاعری ہے جو ۲۹۹ غزلوں اور نظموں سے عبارت ہے۔ غزلوں اور نظموں میں مساوی طور پر اتنی پر زور اور موثر شاعری بڑی مدت کے بعد دیکھنے میں آئی ہے۔ پرگوئی اور خوش گوئی کی ہم سفری کا عالم یہ ہے کہ ۲۹۵ صفحے کی اس کتاب میں کوئی صفحہ ایسا نہیں جہاں دل کو نہ کھینچتا ہو یا جس سے دامن کشاں گزر جانا آسان ہو۔ "خوشبو" بنیادی طور پر عشق کے جذبات و تجربات کی شاعری ہے اور اردو کی عشقیہ شاعری کے سرمائے میں ایک نہایت منفرد اور خوبصورت اضافہ ہے۔

پروین شاکر کی انفرادیت کا راز یہ ہے کہ انھوں نے شاعری میں اپنی حقیقی ذات سے کام لیا ہے۔ وہ انگریزی ادب کی ایم۔ اے ہیں۔ اور مغرب کے ادب کی طالب۔ اگر وہ چاہتیں تو شاعری میں مغربی جدیدیت کی رسیت پر بھی اپنی انفرادیت کا محل کھڑا کر سکتی تھیں لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ انھوں نے وہی کچھ لکھا جو ان کی ذات ان سے لکھوا رہی تھی اور اسی اسلوب میں لکھا جس کی جڑیں ان کے ذہن و روح میں پیوست ہیں۔ انھوں نے نظم کی جدید ہیئتوں کو ضرور قبول کیا لیکن نظم کے ان جدید ترین رجحانات سے اپنا دامن بچائے رکھا جنھوں نے شاعری کو شاعری کے سوا اور بہت کچھ بنا دیا ہے۔

"خوشبو" کو صرف مزے کی خاطر یا مزے لے لے کر پڑھنا ممکن نہیں۔ محبت کا یہ المیہ بدن میں وہ ارتعاش اور روح میں وہ لرزش پیدا کرتا ہے جو کسی بھی ٹریجڈی کو دیکھتے یا پڑھتے وقت ناگزیر ہے۔ یہ بات کہہ کر میں "خوشبو" کو دنیا کی بڑی ٹریجڈیز کے برابر نہیں رکھ رہا ہوں۔ در اصل کہنا صرف یہ ہے کہ چونکہ "خوشبو" پروین شاکر کے کرب ذات کی کمائی ہے اس لئے اس کتاب کے قارئین کرب کی لطیف ترین اور شدید ترین کیفیات سے بچ کر نہیں گزر سکتے۔ پروین شاکر نے "خوشبو" میں جو کامیابیاں حاصل کی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ خود جس آگ میں جلی اور تپی ہیں ان کی آنچیں پڑھنے والوں کے قلب و روح تک پہنچ رہی ہیں۔

میں نے "خوشبو" کے باب میں ٹریجڈی کا لفظ استعمال کر ڈالا۔ اب کہیں کوئی مجھ سے یہ نہ پوچھے کہ کیا اس کتاب کو پڑھ کر پڑھنے والوں کے جذبات کی تطہیر بھی اسی طریقے سے ہوتی ہے۔ جس طریقے سے یونانی ٹریجڈیز کے دیکھنے سے ہوتی تھی یا ہوتی ہے۔ لیکن "خوشبو" پر میں ارسطو کے مفہوم میں تطہیر کی اصطلاح کے اطلاق کا سوال اٹھائے بغیر صرف اتنا کہنے پر اکتفا کروں گا کہ "خوشبو" میں جذباتِ عشق کا جو المیہ ملتا ہے اس سے جذباتِ عشق کی تطہیر ہوتی ہو یا نہیں لیکن جذباتِ عشق کی وہ تہذیب ضرور ہوتی ہے اور ہو سکتی ہے جسے عشق اور عشقیہ شاعری کی سب سے بڑی دین مانا گیا ہے۔ "خوشبو" میں عشق کی ساری بے قراریوں اور بے اختیاریوں کے باوجود صبر و ضبط بھی پایا جاتا ہے جو غمِ ذات کو سہنے کے سلیقے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

زر خرید محبت کے اس دور میں جب کہ محبت کا بھرم اٹھتا جا رہا ہے اور زر کی اہمیت بڑھتی جا رہی ہے "خوشبو" نے محبت کو اعتبار او وقار بخش دیا ہے۔ یہ بات اس لحاظ سے اور بھی قابلِ قدر ہے کہ "خوشبو"

انسانی تاریخ کے ایک مخصوص دَور کی تصنیف ہونے کے باوجود بر حقیقت بہ اصرار کرتی نظر آتی ہے کہ عشق جنس پر ہی منحصر ہے لیکن عشق جنس کا دُوسرا نام ہرگز نہیں۔ عشق صرف جسم کی طلب نہیں، رُوح کی تکمیل بھی ہے۔ لیکن اس بات کو صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو صرف جسم نہیں رُوح بھی رکھتے ہیں۔

"خوشبو" ایک ایسی کتاب ہے جس میں پہلی مرتبہ شروع سے آخر تک یعنی پہلے صفحے سے لے کر آخری صفحے تک ایک شاعرہ کی آواز سُنائی دے رہی ہے۔ پروین شاکر سے قطع نظر اُردو کی شاعرات کے بیشتر کلام کو اگر اُردو شعراء کے کلام میں ملا دیجئے تو کوئی فرق محسوس نہ ہوگا۔ یوں تو اُردو شاعرات کی تعداد سینکڑوں تک پہنچی ہے۔ لیکن امتیاز و اہمیت کے اعتبار سے ان کی تعداد اتنی بھی نہیں کہ پانچ انگلیوں پر بھی گنی جا سکے۔ پھر اگر اس کا بھی لحاظ رکھا جائے کہ شاعرات کی شاعری میں طرزِ احساس نسوانی ہو تو ان کی تعداد اور بھی گھٹ جاتی ہے۔ یہ بات تو کوئی محقق ہی بتائے گا کہ اُردو شاعری میں نسوانی آواز کی ابتدا اور ارتقاء کی "تاریخ" کیا ہے۔ اس باب میں میرا تاثر کچھ ایسا ہے کہ اُردو شاعری میں نسوانی جذبات و تجربات کی کارفرمائی نہ تاریخ بنا سکی ہے نہ روایت بن سکی ہے۔ البتہ نسوانی طرزِ احساس کی جلوہ گری یہاں وہاں دیکھی جا سکتی ہے تقسیمِ ہند سے پہلے ایک شاعرہ نجمہ تصدق نے خاصی شہرت پائی تھی۔ ان کے دو ایک شعر دیکھئے:

آنا کسی کا آج بھی ممکن نہیں اگر ✽ کیوں دیر سے سنگھار کئے جا رہی ہوں میں
تیرے عشق کی بن گئی ہوں کہانی ✽ کہی جا رہی ہوں سُنی جا رہی ہوں
ہو کو ترے فراق کا احساس ہے مگر ✽ میں تیرے پاس آ نہیں سکتی ہوں کیا کروں

پنڈی کی ایک شاعرہ امتہ الرؤف نسرین نے جنھیں کوئی شہرت حاصل نہیں۔ اپنا کلام یا مجموعۂ کلام شائع نہیں کرایا۔ صرف ایک مرتبہ نیاز فتحپوری نے چالیس پچاس سال پہلے اپنے رسالہ "نگار" لکھنؤ میں ان کے چند اشعار شائع کر دیئے تھے۔ ان میں سے کئی شعر تو غیر معمولی ہیں اور دو ایک غیر فانی بھی ہیں۔

آئینہ دیکھ کر خیال آیا ✽ تم مجھے بے مثال کہتے تھے
جانتی ہوں کہ انھیں مجھ سے محبت ہے مگر
مجھ سے ملتا ہے وہ جب مجھ سے جدا ہو سکتا ہے

میں بیت ملاقی اُن کی محبت ✽ خاموش آنسو کا آ گئے ہیں
میں نے چاہا ہونٹ کے ہاتھ بڑھے ✽ اُس نے بیتاب ہو کے چوم لئے
موسم کی خنک ہوائیں تو یہ ✽ جذبات پہ کپکپی ہے طاری
مُروّت میں ہونے لگا ہے اضافہ ✽ محبت میں آنے لگا ہے کمی سی
کیا تمہیں عہدِ محبت کے وہ لمحے یاد ہیں
جب نگاہیں بولتی تھیں اور ہم خاموش تھے

اُردو شاعرات میں ادا بدایونی کی شہرت تو آزادی کے پہلے ہی کی ہے اور اس وقت تک ان کے تین مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ لیکن اُن کے کلام سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ وہ کبھی لڑکی یا عورت بھی تھیں۔ صرف اتنا پتا چلتا ہے کہ پہلے وہ ادا بدایونی تھیں اور اب ادا جعفری ہیں۔ یہ بات کہہ کر میں ان کے کلام کی خوبیوں سے انکار نہیں کر رہا ہوں بلکہ اُن کی شاعری میں صرف نسوانی احساس کی کمی کی طرف اشارہ کر رہا ہوں۔

اُردو شاعری کے موجودہ دَور میں دو شاعرات ایسی ہیں جو مشہور بھی ہیں اور ممتاز بھی۔ میری مراد فہمیدہ ریاض اور کشور ناہید سے ہے۔ فہمیدہ ریاض نے شاعری ایک لڑکی کی حیثیت سے کی تھی جس کی ابتدا بہت اچھی تھی:

تزئینِ لب و گیسو کیسی، پندار کا شیشہ ٹوٹ گیا
تھی جس کے لئے سب آرائش اس نے تو ہمیں دیکھا ہی نہیں

"پتھر کی زبان" جو فہمیدہ ریاض کا پہلا مجموعۂ کلام ہے اس کے بارے میں خود فہمیدہ ریاض نے اپنے پیش لفظ میں لکھا ہے:

"یہ نظمیں کیا ہیں؟ ادبی شہ پارے؟ یہ سب تو کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ ایک متوسط نوجوان لڑکی کی اُمنگیں ہیں جن میں زندگی کا جذبہ ہے۔۔۔۔"

"پتھر کی زبان" سے "بدن دریدہ" تک یہ متوسط نوجوان لڑکی نہیں رہی ہے۔ وہ نہ صرف اپنے معاشرے کی جنسی اقدار سے بغاوت کرتی ہے۔ بلکہ وہ تیر تک پہنچے پہنچے جرأتِ فکر اور جسارتِ اظہار کی بہت سی منزلیں طے کر چکی ہے۔ یہاں فہمیدہ ریاض کی شاعری کا تجزیہ یا جزیاتی مطالعہ میرا مقصد نہیں۔ بتانا صرف یہ تھا کہ فہمیدہ کی شاعری جس نسوانی آواز کی ترجمان ہے، اس سے پہلے کبھی اُردو شاعری میں نہیں آئی ہے۔ فہمیدہ ریاض اور پروین شاکر کے درمیان ایک اہم کڑی کشور ناہید ہیں۔ اب کی شاعری [illegible]

اس لڑکی کی شاعری ہے جس کی تصویریں کشور ناہید نے یوں کھینچی ہیں:
دیکھ کے جس شخص کو ہنستا بہت • سو اس کے سامنے جھکنا بہت
کچھ یوں ہی نسندری ناہید آگئی تھی • کچھ اور عشق کا رنگ بھی کھلتا ہوا نہ تھا
اور اس لڑکی کے مسائل کچھ اس طرح کے تھے:
وہ اجنبی تھا غیر تھا کبھی سمجھا نہ تھا • دل کو مگر یقین کسی پر ہوا نہ تھا
کچھ اس ادا سے کر گئی بازارِ آرزو • دل جو خریدتا تھا اسے دیکھتا نہ تھا
جاری عمر تجھے بڑا عشق سچا ہاں کی • ڈھلک پڑے گی اگر کوئی آسرا نہ ملا
جیتیں خوب ہیں خوش ذوق عمر کی خاطر • کوئی ایسا ہو جسے جان دے کے چاہا ہو
گھر کے دستک تو نہیں ہیں ناہید • میں نکلا ہی اگر شام کو گھر سے چاہا ہو

کشور ناہید ابھی اس طرح کی شاعری کر ہی رہی تھیں کہ انھیں جدیدیت کی ہوا لگ گئی جس کے زیرِ اثر وہ نہ صرف جدید انداز کی نظمیں لکھنے لگیں بلکہ مغرب کی جدید نظموں کے ترجمے بھی کرنے لگیں۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر اُن کے بہی خواہ ابن انشا نے انھیں فارسی میں یہ مشورہ دیا تھا:

اے تماشا گاہِ عالم روئے تو • تو کجا بہرِ تماشا می روی (سعدی)

ہاں ابھی یاد آیا کہ پروین شاکر کی معاصرات میں پروین فنا سید، عرفانہ عزیز، شاہدہ حسن اور فاطمہ حسن بھی ہیں جو تھوڑا بہت امتیاز اور چھوٹی موٹی شہرت رکھتی ہیں۔ پروین شاکر نے بہت ممکن ہے کہ نجمہ تصدق اور راحت الرؤف شیریں کے نام بھی نہ سُنے ہوں لیکن جس نسوانی انداز کی شاعری میں انہوں نے امتیاز اور کمال حاصل کیا ہے اس کے کچھ ابتدائی نقوش نجمہ تصدق اور نسرین کے ہاں دیکھے جا سکتے ہیں۔ فہمیدہ ریاض اور کشور ناہید کی نسوانی شاعری نے بڑی حد تک شعوری طور پر ان کی رہبری تو ضرور کی ہوگی لیکن یہ بات واضح ہے کہ وہ شاعری جو لڑکی یا عورت کی شاعری کہلا سکتی ہے اس میں پروین شاکر فہمیدہ ریاض اور کشور ناہید کو بہت پیچھے چھوڑ گئی ہیں۔ فہمیدہ ریاض اور کشور ناہید کے ہمراہ پروین شاکر کے راستے کے کچھ کانٹے ضرور کم ہوئے لیکن اس رشتے کے فاصلوں کو اُردو شاعری میں جتنا پیچھے چھوڑ کر نے لے گیا اتنا کوئی اور شاعرہ نہ کر سکی۔ پروین فنا سید، عرفانہ عزیز، شاہدہ حسن، اور فاطمہ حسن وغیرہ ان میں سے کوئی بھی نہ ان کی ہم سفر ہیں نہ حریف۔ در اصل اس سلسلے میں ذہن دُنیا کی دوسری زبانوں کی بعض عظیم شاعرات کی طرف جاتا ہے۔ ان کی ذات میں اُردو کے

ایک وسیع المطالعہ اور لطیف احساس شاعر تخلیق کو مستقبل کی سیفو نظر آتی ہے۔ میں نے سیفو کا نام تو سنا ہے اور اس کی دو ایک نظمیں بھی پڑھی ہیں لیکن شاید ترجمے کی صورت میں (بقول رابرٹ فروسٹ شاعری وہ ہے جس کا ترجمہ نہیں کیا جا سکتا) پڑھنے کے باعث مجھے اس حلاوت اور عظمت کا عرفان نہ ہو سکا جو سیفو کی شاعری میں ہے۔ ممکن ہے کسی کو پروین شاکر کی شاعری میں قرۃ العین طاہرہ کی جھلک نظر آئے لیکن مجھے کچھ ایسا لگتا ہے کہ وہ سیفو اور طاہرہ سے زیادہ میراں سے قریب ہے اس بنیادی فرق کے ساتھ کہ میراں کا تعلق سرتا سر عشقِ حقیقی سے تھا۔ جب کہ پروین شاکر کا تعلق سرتا سر عشقِ مجازی سے رہا ہے۔ لیکن دونوں کا سوز و گداز دونوں کا اضطراب و التہاب، دونوں کی جنہائی و بیتابی، دونوں کی خود سپردگی و خود سپردگی ہم رنگ و ہم کیف ہے۔ اتنا ہی نہیں دونوں کے اظہارِ عشق میں یکساں برجستگی و بے ساختگی بھی پائی جاتی ہے۔ پروین شاکر کے یہاں بیانِ حال کے علاوہ تجزیۂ حال بھی ہے۔ میراں کا کمال یہ ہے کہ اس نے صرف بیانِ حال کی شاعری کی ہے بلکہ صرف بیانِ حال کی شاعری کو عظیم بنا دیا ہے۔ اس کا ہر مصرع بلکہ مصرع کا ایک ایک لفظ براہِ راست روح میں اترتا محسوس ہوتا ہے۔ میراں اور پروین شاکر دونوں کی شاعری بنیادی طور پر عورت کے عشق کی شاعری ہے۔ اس میں دونوں کی کامیابی کے درجے یقیناً مختلف ہوں گے لیکن دونوں کو جس حد تک بھی کامیابی نصیب ہوتی ہے اس کا راز دونوں کے اندر عشق کی غیر معمولی صلاحیت میں پوشیدہ ہے۔

میراں کے بارے میں روایت ہے کہ راجپوتانہ کے محل کے سامنے سے ایک بارات گزری۔ محل کی ماتائیں اور بچے دریچوں سے جھانک کر تماشا دیکھنے لگے۔ بارات گزر گئی اور تماشا ختم ہو گیا۔ مہارانی کرشن کی مورتی کی پوجا کرنے مندر کو چلی تو کمسن شاہزادی بھی ساتھ ہولی۔ اور ماں سے پوچھنے لگی کہ میرا دولہا کون ہے۔ ماں نے مورتی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہنسی ہنسی میں کہہ دیا تیرا دولہا گردھر گوپال ہے۔ راجکماری کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی اور وہ کہا کرتی ـــ میرے تو گردھر گوپال دوسرا نہ کوئی ـــ

ہوا یک نئی بیاہی ہوئی دلہن کی طرح منہ پر کپڑا ڈال لیا۔ اس دن سے راجکماری نے کرشن ہی کو اپنے من مندر کا دیوتا بنا لیا۔ اور اسی دن سے اس کے من کے پٹ کھل گئے ۔۔۔۔۔۔ وہ راجکماری میراں تھی۔ پروین شاکر کا ایک شعر ہے؛

ماں سے کیا کہیں گی دکھ ہجر کا خود پر بھی

اتنی چھوٹی عمروں کی بچیاں نہیں کھلتیں

اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انہیں بھی کتنی چھوٹی عمر میں ہجر کا دکھ لاحق ہوا ہوگا یہی وجہ ہے کہ ہجر کا دکھ یا ہجر کا تجربہ ان کے لئے کشف سے کم نہ تھا۔ کشف ہی کے عنوان سے ان کی ایک نظم ہے:

ہونٹ بے بات ہنسے | خوشبو لہرائی، مرے کان میں سرگوشی کی
زلف بے وجہ کھلی | اپنی شرمیلی ہنسی میں نے سنی
خواب دکھلا کے مجھے | اور پھر جان گئی
نیند کس سمت چلی | تیری آنکھوں میں تیرے نام کا تارہ چمکا

اس تارے کے چمکنے کا ایک سبب تو یہی ہے کہ یہ میرا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ تھا ـــــ دوسرا سبب یہ بھی ہے کہ پیار سے محرومی پیار کی ناقابلِ تسکین بھوک پیدا کرتی ہے۔ پروین شاکر ہی کا شعر ہے:

شدت کی نفرتوں میں سدا جس نے سانس لی

شدت کا پیار پا کے خلا میں بکھر نہ جائے

میں نہیں کہتا کہ پروین شاکر نے یہ شعر اپنے ہی بارے میں کہا ہے۔ ان کے یا کسی بھی شاعر کے ہر شعر کا اسی کے بارے میں ہونا ضروری نہیں اصل بات جو کہنے کی ہے وہ وہی ہے جس کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے۔ یعنی میراں یا پروین کی شاعری کا بنیادی طور پر عشقیہ ہونا اور ان کی عشقیہ شاعری میں اس قدر گیرائی اور گہرائی کا پایا جانا نتیجہ ہے۔ ان کی غیر معمولی عشق طلبی اور عشق پرستی کا۔ اسی افتادِ طبیعت کے طفیل میراں نے کمسنی میں گردھر گوپال کو ساری زندگی کے لئے اپنے من مندر کا دیوتا بنا لیا اور اسی افتادِ طبیعت کے ہاتھوں پروین شاکر کو نہ صرف چھوٹی عمر میں ہجر کا دکھ لاحق ہوا بلکہ جیسیں سال کی عمر سے پہلے ہی انہیں اس قسم کا شعر کہنا پڑا:

رنجِ ہجر کا مرے دل میں جب قیام کہاں

اور یہ بھی ہے کہ پہلے سے وہ اعصاب کہاں

یعنی بچیس چھبیس سال کی عمر سے پہلے وہ اپنے اعصاب شکستہ کرا بیٹھیں۔ عشق کے ہاتھوں ان کے اندر جو ٹوٹ پھوٹ ہوئی ہے اس کی مکمل تصویر ان کی شاعری میں موجود ہیں لیکن ان کی شاعری صرف اس ٹوٹ پھوٹ کی تصویر نہیں۔ ابتدائے عشق سے غمِ فراق اور غمِ فراق سے نشاطِ وصل اور نشاطِ وصل سے زوالِ عشق کا مکمل ذکر بھی موجود ہے اور یہ سب کچھ منفی امتیاز کے ساتھ یعنی پروین شاکر کی شاعری قارئین کو ہر جگہ احساس دلاتی رہتی ہے کہ یہ عشق محض مجرد عشق نہیں ہے بلکہ ایک لڑکی یا عورت کا عشق ہے۔ یہ محبوب صرف ایک محبوب نہیں بلکہ ایک لڑکی یا عورت کا محبوب ہے۔ بلکہ ہر لڑکی یا ہر عورت کا محبوب بھی ایسا نہیں ہوتا۔ یہ تو پروین شاکر کا محبوب ہے جو اسی چاہنے والی کی طرح دوسرے تمام محبوبوں سے ممتاز و منفرد ہے۔ یہ آنسو صرف دردِ عشق کے آنسو نہیں ہیں بلکہ ایک لڑکی یا عورت کے دردِ عشق کے آنسو ہیں جو کاجل کو پھیلا دیتے ہیں اور دوپٹے یا آنچل کو بھگو دیتے ہیں۔

پروین شاکر کی شاعری کا ایک امتیازی پہلو یہ بھی ہے کہ ان کی شاعری سے اپنے دیس کی مٹی کی خوشبو آتی ہے ان کی شاعری میں اس ملک کے پھولوں کی باس ملتی ہے ان کی شاعری بڑی SENSUOUS واقع ہوئی ہے اور ان کے حواسِ خمسہ میں ان کی قوتِ سامعہ، قوتِ باصرہ اور قوتِ شامہ نسبتاً زیادہ تیز ہیں ان کی شاعری میں یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ اس ملک میں لڑکیاں کس طرح جوان ہوتی ہیں۔ ان کے دن کن خوابوں میں گزرتے ہیں اور ان کی راتیں کس طرح کے رتجگے کی نذر ہوتی ہیں ان کی ساڑیاں اور ان کے زیور کس طرح اور کس حد تک ان کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کے تصورات و توہمات ان کی محبتوں میں کیا کیا رنگ لاتے ہیں۔ ان کی گفتگو کتنی گونگی ہوتی ہے اور ان کی خاموشی کتنی بلیغ۔ لیکن یہ ساری باتیں میں اپنی بے کیف نثر میں کیوں بتاؤں۔ آپ یہ باتیں پروین شاکر کے رنگین و حسین اشعار میں کیوں نہ دیکھیں۔ مگر آپ ان کے شعر پڑھتے وقت یہ ہرگز نہ بھولیں کہ کیا عشق یا عشقیہ زندگی سے متعلق ایسے اور اتنے اشعار اردو کی کسی دوسری شاعرہ نے بھی کہے ہیں۔

کمالِ ضبط کو خود بھی تو آزماؤں گی ۔۔ میں اپنے ہاتھ سے اُس کی دلہن سجاؤں گی

سپرد کر کے اسے چاندنی کے ہاتھوں میں ؛ میں اپنے گھر کے اندھیروں کو لوٹ آؤں گی
بدن کے کرب کو وہ بھی سمجھ نہ پائے گا ؛ میں دل میں روؤں گی آنکھوں میں مسکراؤں گی
وہ کیا گیا کہ رفاقت کے سارے لطف گئے ؛ میں کس سے روٹھ سکوں گی کسے مناؤں گی
اب اس کا فن تو کسی اور سے ہوا منسوب ؛ میں کس کی نظم اکیلے میں گنگناؤں گی
وہ ایک رشتۂ بے نام بھی نہیں لیکن ؛ میں اب بھی اس کے اشارے پہ سر جھکاؤں گی
سماعتوں میں گھنے جنگلوں کی سانسیں ہیں ؛ میں اب کبھی تری آواز سن نہ پاؤں گی
جواز ڈھونڈ رہا تھا نئی محبت کا ؛ وہ کہہ رہا تھا کہ میں اس کو بھول جاؤں گی
دھنک دھنک مری پوروں کے خواب دیکھا ؛ وہ لمس میرے بدن کو گلاب کر دے گا
جنوں پسند دل اور تجھ تک آنے میں ؛ بدن کو ناؤ لہو کو چناب کر دے گا
میں سچ کہوں گی مگر پھر بھی ہار جاؤں گی ؛ وہ جھوٹ بولے گا اور لاجواب کر دے گا
انا پرست ہے اتنا کہ بات سے پہلے ؛ وہ اٹھ کے بند مری ہر کتاب کر دے گا
اسی طرح سے اگر چاہتا رہا پیہم ؛ سخن وری میں مجھے لاجواب کر دے گا
یارب مرے سکوت کو نغمہ سرائی دے ؛ زخم ہنر کو حوصلۂ لب کشائی دے
رنگ رنگ میں اس کا لمس نظر آ کے ؛ جو کیفیت بھی جسم کو دے انتہائی دے
شہر سخن سے روح کو وہ آشنائی دے ؛ آنکھیں بھی بند رکھوں تو رستہ سجھائی دے
تخلیق ماہتاب ہو اظہار آئنہ ؛ آنکھوں کو لفظ لفظ کا چہرہ دکھائی دے
دل کو لہو کروں تو کوئی نقش بن سکے ؛ تو مجھ کو کرب ذات کی سچی کمائی دے

پروین شاکر کی بیشتر غزلیں بلکہ تقریباً ہر غزل غزل مسلسل کی حیثیت رکھتی ہے۔ آج کل نفسیاتی تنقید کے زیر اثر نقادوں کو غزلوں میں وحدت تاثر کی تلاش رہتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ انہیں اردو کی ان غزلوں میں بھی وحدت تاثر نظر آنے لگی ہے جہاں وہ نہیں ہے اور شعرا نے غزل مسلسل کی طرف جو وحدت تاثر مبنی ہوتی ہے بہت کم توجہ دی ہے۔ غزلوں کی ریزہ خیالی ایک ایسی حقیقت ہے جس سے غزل کی تمام خوبیوں کے باوجود انکار نہیں کیا جا سکتا۔ غزل مسلسل کی بہار پروین شاکر کی غزلوں میں دیکھی جا سکتی ہے جو جذبے کی شدت اور وحدت دونوں سے لبریز ہوتی ہیں۔ ممکن ہے ان کے یہاں یہ خوبی کسی حد تک ابن انشا کے اثر سے بھی آئی ہو۔ پروین شاکر نے اپنے معاصرین سے زیادہ اثر قبول نہیں کیا لیکن ان کی شاعری پر ان کے جن معاصرین کا تھوڑا بہت سایہ پڑ گیا ہے ان میں فیض، فراز، عبید اللہ علیم کے علاوہ ابن انشا بھی ہیں، جو پروین شاکر کو بہت عزیز تھے۔ اب آپ ان کے کچھ اور اشعار دیکھتے چلیے۔

اگر بس نہیں تو لفظ ہی بھیج ؛ میں تجھ سے جدا رہوں کہاں تک
نہیں نہیں یہ خبر دشمنوں نے دی ہوگی ؛ وہ آئے آکے چلے بھی گئے، ملے بھی نہیں
کبھی کبھار اسے دیکھ لیں، کہیں مل لیں ؛ یہ کب کہا تھا کہ وہ خوش بدن ہمارا ہو
لڑکیاں بیٹھی تھیں پاؤں ڈال کر ؛ روشنی سی ہو گئی تالاب میں
میں جب بھی چاہوں اسے چھو کے دیکھ سکتی ہوں
مگر وہ شخص کہ لگتا ہے اب بھی خواب ایسا
اور وں کا ہاتھ تھامو، انہیں راستہ دکھاؤ
میں بھول جاؤں اپنا ہی گھر، تم کو اس سے کیا
وہ اپنی ایک ذات میں کل کائنات تھا ؛ دنیا کے ہر فریب سے ملوا دیا مجھے
کہیں رہے وہ مگر خیریت کے ساتھ رہے ؛ اٹھائے ہاتھ تو یاد ایک ہی دعا آئی
ایسے تو کچھ اداسی کا دکھ کب نہیں سہا ؛ آج اس کی بے رخی نے مگر دل دکھا دیا
موسم مزاج تھا نہ زمانہ سرشت تھا ؛ میں اب بھی سوچتی ہوں وہ کیسے بدل گیا
آلودۂ سخن بھی نہ ہونے دیا اسے ؛ ایسا بھی دکھ ملا جو کسی سے نہیں کہا
ترا خیال کر کے میں خاموش ہو گئی ؛ ورنہ زبان خلق سے کیا کیا نہیں سنا
میں جانتی ہوں میری بھلائی اسی میں تھی ؛ لیکن یہ فیصلہ بھی کچھ اچھا نہیں ہوا
بس یہ ہوا کہ اس نے تکلف سے بات کی ؛ اور ہم نے روتے روتے دوپٹے بھگو لیے
صرف اس تکبر میں اس نے مجھ کو جیتا تھا ؛ ذکر ہو نہ اس کا بھی کل کو نارساؤں میں
اس خوف سے وہ ساتھ نبھانے کے حق میں ہے
کھو کر مجھے یہ لڑکی کہیں دکھ سے مر نہ جائے
ملے گی آنسوؤں سے تن کو ٹھنڈک ؛ بڑی لو ہے ذرا آنچل بھگو لوں
وہ اب میری ضرورت بن گیا ہے ؛ کہاں ممکن کہ اب اس سے نہ بولوں
جانتی ہوں کہ بچھڑنا تری مجبوری ہے ؛ پر مری جان ملے مجھ کو سزا آہستہ
کسی بھی شاخ کے پیچھے پناہ لیتی میں ؛ مجھے وہ توڑ ہی لیتا شریر ایسا تھا
شہر گلوں کا پتا دینے لگیں ؛ تیز ہوتی ہوئی سانسیں اس کی
وہ شہر چھوڑ کے جانا تو کب سے چاہتا تھا ؛ یہ نوکری کا بلاوا تو اک بہانہ تھا
میں اپنے گاؤں میں بیلے کا پھول کیوں سونپوں ؛ زبان رنگ سے کس کو مجھے بلانا ہوا
اب ان دریچوں پہ گہرے دبیز پردے ہیں ؛ وہ تاک جھانک کا معصوم سلسلہ بھی گیا
میں پھول چنتی رہی اور مجھے خبر نہ ہوئی ؛ وہ شخص آ کے مرے شہر سے چلا بھی گیا
بہت عزیز ہی اس کو مری دلداری ؛ مگر یہ ہے کہ کبھی دل مرا دکھا بھی گیا
ملنے سے گریزاں ہیں نہ ملنے پہ خفا بھی
دم توڑتی چاہت ہے کسی نذر کا رشتہ

بل کہ اس شخص سے بہت کم خوشی سے چلوں

بل اٹھتی ہے نظر یا دُنیا کی چھاگل کی طرح

بارہا تیرا انتظار کیا ؛ اپنے خوابوں میں اک دلہن کی طرح

کیسے کہہ دوں کہ مجھے چھوڑ دیا ہے اس نے ؛ بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی

تری چاہت کے بھیگے جنگلوں میں ؛ مرا تن مور بن کے ناچتا ہے

میں اس کی دسترس میں ہوں مگر وہ ؛ مجھے میری رضا سے مانگتا ہے

مجھے بھی اس کا احساس ہے کہ مثالیں بہت ہو گئیں لیکن مثالوں کی یہ کثرت اپنے جواز سے خالی نہیں۔ پروین شاکر کے یہ اور اس قسم کے اشعار پڑھتے وقت ایسا لگتا ہے کہ جہاں ایک لڑکی کی حیثیت سے ان کی روح زندگی کی دھوپ چھاؤں جیسی محبت کی مختلف کیفیتوں سے گزر رہی ہے وہاں ایک شاعرہ کی حیثیت سے ان کا تخیل محبت سے متعلق ہر صورتِ حال کو انتہائی بے ساختگی کے ساتھ شعری پیکر میں ڈھالتا جا رہا ہے۔ بے ساختگی عظمتِ کلام کی دلیل نہیں لیکن ایک ایسی خوبی ضرور ہے جو بعض عظیم شاعروں کے یہاں بھی کمیاب ہے۔ کیٹس نے کہا تھا کہ اگر شعر اس قدر فطری طور پر نہ آئے جس قدر فطری طور پر درخت میں پتیاں آتی ہیں تو پھر بہتر یہی ہے کہ شعر آئے ہی نہیں۔ پروین شاکر کی شاعری میں شعر کے فطری طور پر آنے کا یہی عالم ہے۔ انہوں نے اپنے ہر دکھ اور اپنی ہر چوٹ سے مصرعے جوڑ لئے ہیں۔ ان کے مصرعوں اور شعروں کی دل کشی کا ایک سبب غالباً یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری میں اس سچائی سے کام لیا ہے جس سے کام لینا بسا اوقات مردوں کے لئے ممکن نہیں ہوتا۔ اس بات کو ذرا ایک مثال کے ذریعے سمجھتے چلئے۔ فہمیدہ ریاض کا یہ شعر آپ کی نظر سے گزر چکا ہے۔

ترے چین لب و گیسو کیسے، پندار کا شیشہ ٹوٹ گیا

تھی جس کے لئے سب آرائش اس نے تو ہمیں دیکھا بھی نہیں

اس شعر میں جس سچائی کے ساتھ "اس نے تو ہمیں دیکھا بھی نہیں" کا اعتراف کیا گیا ہے وہ سچائی مردوں کی شاعری میں یا تو بالکل نہیں ملتی یا بہت کم ملتی ہے۔ ایسے مواقع پر مرد کے یہاں اعتراف کی بجائے ردِ عمل کا اظہار ہوتا ہے۔ مثلاً

یوں سرِ راہ ملاقات ہوئی ہے اکثر

تم نے دیکھا بھی نہیں ہم نے پکارا بھی نہیں (اقبال عظیم)

پروین شاکر کے یہاں بھی وہی سچائی جو اعتراف کی شکل میں رونما ہوتی ہے۔ ان کی شاعری کو ان لوگوں کی شاعری سے زیادہ دلکش بنا دیتی ہے جن کے یہاں سچائی ردِ عمل کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ ان کی شخصیت میں انا کی کوئی کشمکش پیدا ہی نہیں ہوتی [illegible] ہوتی ہے لیکن ان کی شخصیت کا نسوانی لوچ انا کی انا پر ہمیشہ ہی غالب آتا ہے۔

تجھے مناؤں کہ اپنی انا کی بات سنوں ؛ الجھ رہا ہے مرے فیصلوں کا ریشم پھر

میری خودداری برتنے والے ؛ تیرا پندار بھی ٹوٹا کہ نہیں

ہاتھ میرے بھول بیٹھے دستکیں دینے کا فن

بند مجھ پر جب سے اس کے گھر کا دروازہ ہوا

دوسرے شعر میں کتنی خوبصورتی کے ساتھ اپنے پندار کی شکست کا اعتراف کیا گیا ہے۔ اس میں "لفظ بھی" نے شعر کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ پہلے شعر میں فیصلوں کے ریشم کا الجھنا بڑی خوبصورت اور نئی امیجری ہے۔ شاید ارسطو نے کہا تھا کہ شاعری استعارے کا دوسرا نام ہے۔ عہدِ حاضر کی جدید شاعری کا خاصا حصہ نئے استعارے کی تلاش سے عبارت ہے۔ پروین شاکر کی شاعری تشبیہات و استعارات کی دولت سے مالا مال ہے لیکن انہوں نے تشبیہات و استعارات کو اپنی شاعرانہ کاوشوں کا منتہا نہیں بننے دیا ہے۔ ان کی شاعری تجربات، معاملات اور مسائل کی شاعری ہے۔ ان کی شاعری میں عشق و محبت کے جذباتی اور نفسیاتی مسائل کی کمی نہیں۔ "خوشبو" کا مطالعہ کرتے وقت ایک سوال بار بار ذہن کو کچوکے لگاتا ہے۔ وہ یہ کہ محبت میں ایسی ڈوبی ہوئی لڑکی جو اپنے محبوب کی خاطر اپنی انا تک کا سودا کر لیتی ہے محبت میں اتنی ٹوٹ پھوٹ کا شکار کیوں کر ہوئی اور وہ کتنا سنگدل تھا جو ایسی سراپا محبت لڑکی سے جس پر "آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری" والا مصرع صادق آتا ہے رشتۂ وفا استوار نہ کر سکا لیکن ان دونوں الجھنوں کا جواب خود ان کی شاعری فراہم کر دیتی ہے:

تیری خاطر یہ کیا ہے مگر میرے حبیب ؛ جی میں آتا ہے کوئی اور بھی تجھ سا دیکھوں

تجھے بھی مجھ سے تعلق نہ تجربہ کا ہوگا ؛ ہمیں ہی شوق تھا کہ محبت آزمانے کا

موت کا ذائقہ لکھنے کے لئے ؛ چند لوگوں کو تو مر کر دیکھنا

ایسا لگتا ہے کہ ہر بلندی کا دروازہ کسے ڈھونڈ لیا، لیکن [illegible]

ہو کی شاعرہ کو اپنے خواب جانے کا اتنا صدمہ نہیں جتنی تسکین اسے اس خیال سے حاصل ہے کہ

شدت سے کا بجھے تعبیر خواب تو بخشے ۔ میں احترام کروں گی تیری بڑائی کا

یہ رویہ اور یہ عمل اپنے اپنے مزاج کا معاملہ ہے ورنہ تعبیر سے محروم خواب نے بہتوں کو نہ صرف خواب سے بلکہ پوری زندگی سے برگشتہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ یہاں مجھے محبوب خزاں (شاعر تو اچھا ہے بدنام بہت ہے) یاد آ رہے ہیں جن کا ایک شعر ہے:

اب کیا کہیں تم سے یہ جہاں کتنا حسیں تھا
کچھ دیکھ کے سمجھے تو سمجھ کر نہیں دیکھا

پروین شاکر کے یہاں ساری محرومیوں اور مایوسیوں کے باوجود زندگی کی طرف برگشتگی و بیزاری کا رویہ نہیں ملتا۔ ان کے یہاں جینے، زندہ رہنے، اور زندگی کے نت نئے تجربات سے آشنا ہونے کا جذبہ واضح ہے۔ انھوں نے محبت کے المیے سے جانبر ہونا سیکھ لیا ہے۔ اور انھیں دنیا کو اس کے مختلف پہلوؤں میں دیکھنے سے گہری دلچسپی ہے۔ جس کو موت کا ذائقہ چکھنے کے لئے چند لمحوں کی موت کا خطرہ بھی گوارا ہوا سے نئی محبت کی نئی لذتوں کے لئے محبت آزمائی کا شوق کیوں نہ ہوگا۔ اس معاملے میں پروین شاکر کی صداقت پسندی لائق تعریف بھی ہے اور قابل احترام بھی کہ انھوں نے روایت کے برعکس نئی محبت کا الزام صرف مرد کے سر نہیں رکھا بلکہ عورت کو بھی اس تجربہ پسندی میں برابر کا شریک قرار دیا۔ یہ ناخوشگوار حقیقت نہ مردوں کو اچھی لگے گی نہ عورتوں کو، ممکن ہے مرد اپنی صفائی میں شیکسپیئر کے یہ شعر پڑھے بغیر نہ رہ سکیں:

LET ME NOT TO THE MARRIAGE OF TRUE
MINDS
ADMIT IMPEDIMENTS. LOVE IS NOT LOVE
WHICH ALTERS WHEN IT ALTERATION FINDS
LOVE ALTERS NOT WITH HIS BRIEF HOURS AND WEEKS
BUT BEARS IT OUT EVEN TO THE EDGE OF DOOM

اور عورتیں اپنی وفاداری اور وفا شعاری کے ثبوت میں امریکی شاعرہ ایملی ڈکنسن کے یہ مشہور مصرعے پیش کئے بغیر نہ رہ سکیں۔

THE SOUL SELECTS HER OWN SOCIETY —
THEN — SHUTS THE DOOR —

اس میں شک نہیں کہ روح اپنی سوسائٹی منتخب کر لینے کے بعد اپنا دروازہ بند کر دیتی ہے۔ لیکن جو بات ایملی ڈکنسن کو معلوم نہیں تھی یا جس کا تجربہ اسے نہیں ہوا وہ یہ ہے کہ روح نہ تو اپنی سوسائٹی کا انتخاب صرف ایک مرتبہ کرتی ہے نہ دروازہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیتی ہے۔ زندگی کی طویل مسافت میں روح کی سوسائٹی کا انتخاب بھی ایک سے زائد بار ہوتا ہے۔ اور دروازہ بھی ایک سے زائد بار بند ہوتا ہے۔ بہت سے ذہنوں کو محبت کا یہ تصور محبت کے منافی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ محبت عمیق ہو سکتی ہے، شدید ہو سکتی ہے، تباہ کن ہو سکتی ہے، جاں لیوا ہو سکتی ہے، غرض کہ وہ بہت کچھ ہو سکتی ہے یا ہوتی ہے لیکن مستقل اور لازوال نہیں ہوتی اور جو محبت مستقل اور لازوال ہوتی ہے وہ یا تو MYTH ہوتی ہے، یا مستثنیات کا جزو۔ محبت کے ساتھ وفاداری اور وہ بھی وفاداری بشرط استواری۔ دراصل محبت کا اخلاقی تصور ہے جو اس کی نفسیاتی ماہیت سے مطابقت نہیں رکھتا۔ محبت کے لازوال یا مستقل ہونے کا سودا سید الشعراء شیکسپیئر صاحب کو بھی بہت تھا۔ اقبال نے شیکسپیئر کو دنیا کا بہترین خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

حفظ اسرار کا فطرت کو ہے سودا ایسا ۔ رازداں پھر نہ کرے گی کبھی پیدا ایسا

شیکسپیئر اس خراج تحسین کا پورے طور پر مستحق ہونے کے باوجود جانے کیوں اس بات کو نہ سمجھ سکا کہ محبت اختیاری ہے نہ ترک محبت ارادی، اور جو چیز ارادی اور اختیاری نہ ہو اس میں وفاداری بشرط استواری کی خوبی کا دعویٰ کرنا کیا معنی!

مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوتی کہ محبت کی پائداری اور استواری کے معاملے میں شیکسپیئر اور ایملی ڈکنسن جیسے بڑے ناموں سے مرعوب ہوئے بغیر پروین شاکر نے وہی کچھ لکھا جو ان کے تجربے اور مشاہدے نے ان سے لکھوایا۔ ساحر لدھیانوی کی ایک غزل نما نظم خوبصورت، موثر، اس نظم کی اہمیت سے صرف اس لئے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ نظم ایک فلمی نغمے کے طور پر استعمال کی گئی ہے کے دو مصرعے ہیں

مرے بڑا ہو بھی تو رسوائیاں ہیں میرے ساتھی کی
تمہارے ساتھ بھی گزری ہوئی راتوں کے سائے ہیں

پروین شاکر کی کوئی غزل یا کوئی نظم ٹھیک اس قسم کی صورتِ حال کی ترجمانی نہیں کرتی لیکن ان کی شاعری یہ تاثر دیئے بغیر نہیں رہتی کہ ان کے یہاں بھی کچھ ملاقاتیں ایک کے ساتھی کی رسوائیاں اور دوسرے کی گزری ہوئی راتوں کے سائے میں ہوئی ہیں۔ زندگی جب اس طرح کے راستوں سے گزرتی ہے تو اس میں طرح طرح کی پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں ——— ذاتی قانونی اور نفسیاتی ——— پروین شاکر کی نہایت مختصر مگر مندرجہ ذیل نظم "عقدہ" اردو شاعری میں اس قسم کی نفسیاتی پیچیدگی کا بہترین، حسین ترین اور انتہائی نمکین اظہار ہے۔

میں وہ لڑکی ہوں
جس کو پہلی رات
کوئی گھونگھٹ اٹھا کے یہ کہہ دے ۔
میرا سب کچھ ترا ہے، دل کے سوا

پروین شاکر کے لئے قادر الکلام شاعرہ، کے الفاظ استعمال کرنا کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ کیونکہ قادر الکلامی کی صفت یا تو سودا یا ذوق جیسے اُستادوں کے لئے استعمال ہوتی رہی ہے۔ یا غالب اور اقبال جیسے عظیم شاعروں کے لئے جو بڑے سے بڑے مضمون کو دو مصرعوں میں بیان کر دینے پر قادر تھے۔ لیکن یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ غزلوں اور نظموں دونوں میں پروین شاکر کا بعض اوقات صرف ایک مصرعہ پوری کہانی کو اس کے تمام نشیب و فراز اور تمام تر سوز و گداز کے ساتھ سامنے لے آتا ہے مثلاً مندرجہ بالا نظم کا آخری مصرعہ یا ان کی غزل کے اس شعر کا دوسرا مصرعہ اسی قسم کا معجزہ دکھاتا نظر آتا ہے۔

کمالِ ضبط کو خود بھی تو آزماؤں گی
میں اپنے ہاتھ سے اس کی دلہن سجاؤں گی

لیجئے میں موضوع کی طرف آگیا جبکہ ابھی مجھے دو ایک باتیں پروین شاکر کی نظموں کے بارے میں کہنا چاہتا ہوں۔ اس سلسلے میں مناسب بات تو یہ ہے کہ موضوع اور مزاج کے اعتبار سے پروین شاکر کی غزلیں اور نظمیں ایک ہی چیز کے دو چہرے معلوم ہوتی ہیں۔ اصل میں ان کی سرحدیں ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں۔ دونوں میں فرق صرف اجمال اور تفصیل کا نظر آتا ہے۔ یہ محسوس نہیں ہوتا کہ پروین شاکر تنگنائے غزل کی تنگی سے عاجز آ کر نظم کی کھلی فضا میں سانس لے رہی ہیں۔ غالب کی طرح پروین شاکر بھی تنگنائے غزل کی وسعتوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اس کے باوجود اگر وہ نظمیں کہتی ہیں تو اس کا سبب صرف یہ ہے کہ بعض اوقات کسی بات یا تجربے کی تفصیل اپنا جواز آپ ہوتی ہے۔ اشارے کنائے اور ایجاز و اختصار کے حسن سے کون انکار کر سکتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود بعض اوقات دل یہی چاہتا ہے کہ بات تفصیل سے کہی جائے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے ایک جگہ کہا ہے کہ آپ یہ نہ دیکھیں کہ شاعر نے اپنے مقطع میں کیا کہا ہے بلکہ یہ دیکھیں کہ مقطع شاعر کے بارے میں کیا کہتا ہے۔ پروین شاکر اردو کے ان دو چار شاعروں میں سے ہیں۔ جنہوں نے شاعری اختیار کرنے کے باوجود تخلص کا گنہگار بننا پسند نہیں کیا۔ اس لئے ان کے یہاں یہ نہیں دیکھا جا سکتا کہ انہوں نے اپنے مقطعوں میں کیا کہا اور ان کے مقطعے ان کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ البتہ یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ انہوں نے غزلوں کے علاوہ اپنی نظموں میں کیا کہا اور ان کی نظمیں اُن کے بارے میں کیا کہتی ہیں۔

پروین شاکر نے اردو نظم کی جدید ترین قسم نثری نظم سے قطع نظر باقی تینوں قسمیں استعمال کی ہیں۔ یعنی (۱) پابند نظم (۲) نظم معرا اور (۳) نظم آزاد۔ انہوں نے سب سے زیادہ نظم آزاد سے کام لیا ہے۔ لیکن اس میں ابہام و اشکال کی علامتی روایت سے بچ کر لطیف اشاریت اور ایمائیت کی اس روایت کو برتا ہے۔ جو عالمی شاعری کی مشترکہ میراث ہے چونکہ وہ شاعری میں صرف اظہار کی نہیں ابلاغ کی بھی قائل ہیں۔ اس لئے ان کی نظموں کے ذاتی اور داخلی ہونے کے باوجود پڑھنے والوں کو ان کی شاعری کے ادراک میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ اس سلسلے میں ان کی نظموں کے عنوانات قاری کو بڑی مدد دیتے ہیں۔ ان کی بیشتر نظموں کو پڑھنے کے بعد جب ان کے عنوانات پر دوبارہ نظر پڑتی ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے

معلوم ہے نظم کے تجربے کو CRYSTALIZE کیا ہے ان کی نظموں میں جس عشق کی تصویر ملتی ہے وہ سادہ بھی ہے ......
SOPHISTICATED بھی پروین شاکر سے پہلے غزل کے ایک شعر میں کسی نے کہا ہے :

جو حیرت سادہ کا صورت پیشہ تھی گئی
وہ لڑکی تیرے نے کس طرح پہیلی ہوئی

اس میں شک نہیں کہ تو شعر عشق سادہ و معصوم کی شاعری سے بھری پڑی ہے لیکن جو لڑکی اس طرح کے شعر کہتی ہے :

شام بھی ہوگئی دھندلا گئیں آنکھیں بھی مری
بھولنے والے میں کب تک ترا رستہ دیکھوں

دھوپ کچھ نہیں لگتا مگر اسے جانِ حیات
جانے کیوں تیرے لئے دل کو دھڑکتا دیکھوں

بند کر کے مری آنکھیں وہ شرارت سے ہنسے
بوجھے جانے کا میں ہر روز تماشا دیکھوں

سب ضدیں اس کی میں پوری کروں ہر بات سنوں
ایک بچے کی طرح سے اُسے ہنستا دیکھوں

اسی زمین میں اس طرح کا شعر بھی کہہ جاتی ہے :

تو مری طرح سے یکتا ہے مگر میرے حبیب
جی میں آتا ہے کوئی اور بھی تجھ سا دیکھوں

تو یہ خیال بجلی کی طرح ذہن میں کوند جاتا ہے کہ تمام تر سادگی کے باوجود اس لڑکی کے اندر کوئی نہ کوئی ٹیڑھی لکیر ضرور ہے۔ ویسے نفسیاتی اعتبار سے ایسا کون ہے جس کے اندر ٹیڑھی لکیر نہیں ہوتی۔

لیجئے میں پھر پروین شاکر کی غزلوں کی طرف جا نکلا۔ قصہ یہ ہے کہ ان کی غزلوں اور نظموں میں آنگن اور کمروں کا رشتہ ہے۔ اس لئے کبھی ادھر آ نکلنا اور کبھی اُدھر جا نکلنا ناگزیر ہے۔ جہاں تک اُن کی نظموں کا تعلق ہے۔ اجنبی، اعتراف، کشف، اجنبیت، واہمہ، اتنا معلوم ہے۔ خوشبو کی زبان، مقدر، تیری ہم رقص کے نام ڈیولپ ڈیپارٹمنٹل سٹور میں، اوتھیلو، ہجر، مشیر، ان کی نمائندہ نظمیں ہیں۔ یہ نظمیں نہ صرف پروین شاکر کی نمائندگی کرتی ہیں بلکہ عشق و محبت کے باب میں ان کے عہد کی عکاسی بھی، لیکن یہ عکاسی عمومی اور غیر ارادی ہے کیونکہ کیٹس کے الفاظ میں پروین شاکر کی

شاعری اپنے منکشف ہونے کی خوش PALPABLE DESIGN نہیں رکھتی اور شعوری تشنگی کے اس دور کی ترجمانی کرتی ہے جب وہ افکار کے بجائے احساسات کی زندگی بسر کر رہی تھیں۔ کیٹس ہی کے لفظوں میں اُن کی شاعری اپنے قارئین کو اپنے انوکھے پن (SINGULARITY) سے نہیں بلکہ اپنے وصف اضافی (A FINE EXCESS) سے چونکاتی ہے۔ جسے جزوے دیگر بھی کہہ سکتے ہیں۔ جوانی کی یہ شاعری یقیناً جوانوں ہی کو زیادہ پسند آئے گی۔ لیکن یہ شاعری جوانی کی منزل سے گزر جانے والوں اور گزر جانے والیوں کو بھی اس لئے دلکش معلوم ہوگی کہ جوانی ہر انسان کی عزیز ترین یاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور پروین شاکر کی شاعری نے اسی یاد کو شعر کی زبان میں محفوظ و مجسم کر دیا ہے۔ یہ شاعری جوانی کے جذبات کی شاعری ہے نہ کہ جذبات کی جوانی کی شاعری۔ اس میں آنسو اور آنسوؤں کی تصویر کشی مقصد ہے لیکن وہ جذباتی ہیجان یا خود رحمی نہیں ہے جس سے میر اور فانی تک کی شاعری دو اغدار ہے۔ آنسو بھی موت وہ فانی شاعری کے پسندیدہ اور اہم موضوعات میں سے ہیں۔ لیکن میر اور فانی نے اپنی تمام عظمت و ماہیت کے باوجود کسی جگہ رونے اور مرنے کے عمل کو مضحکہ خیز اور کراہت انگیز بنا کر رکھ دیا ہے۔ غالباً یہاں مثالوں کی ضرورت نہیں۔ مثالیں خود بخود آپ کے ذہن میں آ رہی ہوں گی۔

مارکوئس ڈی سیڈ نے کہا تھا کہ نیک جذبات سے بُرا ادب پیدا ہوتا ہے۔ نیک جذبات سے بُرا ادب پیدا ہوتا ہو یا نہیں شرعی معنوں میں نیک اور اچھی شاعری یقیناً پیدا نہیں کر سکتا زندگی کے گہرے تجربات سے بھرپور شاعری کے لئے تھوڑی بہت آوارہ مزاجی، بے راہ روی، دین بزرگاں سے اختلاف اور مسلمہ اخلاقیات سے انحراف یہ سب کچھ ضروری ہے۔ بالفاظ دیگر زندگی خواہ سمت کوئی بھی ہو کا دیکھا اور ہمہ جہت تجربہ ضروری ہے۔ پروین شاکر کی شاعری تجربے کی اس وسعت اور ہمہ جہتی سے خالی نہیں ہے۔ ان کی شاعری بنیادی طور پر عشقیہ شاعری ہونے کے باوجود صرف اُن کی ذات میں محصور یا ان کی ذات پر مرکوز نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں کہیں کہیں ذات سے باہر کی کائنات بھی اپنی جھلک دکھا جاتی ہے۔ کچھ عکس آپ بھی دیکھئے:

…بانو ہے شکستہ بدن تو ہے کے پاس میں
زندگی کا یقین کس کو تھا بس یہ کہیئے وہ لگ گئی

…نہ بجھتے رہے اور خواب جلتے رہے

عجیب طرز کا موسم مرے وطن میں رہا

…جن کھلائے اپنے دلیں میں ؛ اپنے گھر میں رہ کے بے گھر ہو گئے

…بے چہرہ رُتیں آئیں وطن میں اب کے
پھول آنگن میں کھلے ہیں نہ چمن میں اب کے

…ہے نئی سفیدیاں میں ؛ اندر سے مکان ڈھہ رہا ہے

شہر میں شاعر کے زبر کیسے نہ بجیں ؛ ہر شہر کو لاحق ہوئی سخن فہمی

…نسل کا ذہن کٹ رہا ہے ؛ اگلوں نے گنا تے تھے فقط سر

…بچ بھی جاؤں تو تنہائی مار ڈالے گی

مرے قبیلے کا ہر فرد قتل گاہ میں ہے

برسوں پہلے میں نے اپنے ایک مضمون میں یہ خیال ظاہر تھا کہ غزل کے معاملے میں زمین کا انتخاب غزل کے اہم ترین مسائل میں سے ہے۔ یوں تو ایک اچھا شاعر سنگلاخ سے سنگلاخ زمین میں بھی شعر کہہ لے گا اور طرحی غزل میں بھی ایک آدھ اچھا مصرع یا شعر نکال لے گا لیکن کسی کی نمائندہ غزل کا اس کی زمین سے متعلق ہوتا ہے وہ مرکزی اہمیت کا معاملہ ہے۔ نمائندہ غزلیں یا …لیں اسی وقت وجود میں آتی ہیں جب شاعر نے زمین کا انتخاب …طور پر کیا ہو اور انتخاب یا ایجاد میں شاعر کے صرف ذہن و ذوق …ہیں بلکہ پوری زندگی کو دخل ہوتا ہے ـــــ کبھی اس کی ذاتی زندگی اور کبھی اس کی معاصرانہ زندگی کو ـــــ غرض کہ اچھی زمینیں شاعر کی زندگی سے نکلتی ہیں نہ کہ قافیوں، ردیفوں اور بحروں سے ـــــ پروین شاکر کی نمائندہ غزلیں بھی غزل کے بارے میں میری اس دریافت کی تصدیق کرتی نظر آتی ہیں۔ "میں اپنے ہاتھ سے اس کی دلہن سجاؤں گی" ـــــ "وہ جھوٹ بولے گا اور لا جواب کر دے گا" …ح اس کی بے رخی نے گھر دل دکھا دیا تھا" "آنکھیں بند رکھوں تو دستہ …بانی دے ہے ـــــ دروازہ جو کھولا تو نظر آئے کھڑے وہ" …سی زمینیں غرض شاکر سے نہیں روح کی گہرائی سے ابھری ہیں۔ ان نمائندہ غزلوں میں وہ غزل بھی شمار کی جا سکتی ہے جس کا …شعر یہ ہے :

وہ مرے پاؤں کو چھونے جھکا تھا جس لمحے
جو مانگتا اسے دیتی امیر ایسی تھی

زیادہ سے زیادہ اچھے شعر ایسی زمینوں میں نکلتے ہیں جو شاعر کے ذوق سے نہیں براہ راست اس کی زندگی سے نکلتی ہیں۔ شاعری کا آہنگ زندگی کے آہنگ سے الگ نہیں ہوتا اگر شاعر کی زندگی انفرادی آہنگ سے خالی ہے تو اس کی شاعری بھی انفرادی آہنگ سے خالی ہوگی۔

بادی النظر میں پروین شاکر کی کتاب ان کے EXPERIMENTALIST ہونے کا تاثر نہیں دیتی۔ پہلی نظر میں تو صرف ایسا محسوس ہوتا ہے کہ "خوشبو" کی شاعرہ اپنی روح کی آگ کو الفاظ میں منتقل کر دینا چاہتی ہے اور بس، لیکن ایک ذرا غور سے پڑھیے تو پتا چلتا ہے کہ ان کی فن کارانہ بے خودی ہشیاری سے خالی نہیں ہے ان کی شیریں دیوانگی میں ایک فن شعر کا شعوری ادراک بھی کارفرما ہے ان کی غزلوں کے دوسرے اور نظموں کے آخری مصرعے چونکانے والے ہوتے ہیں۔ ان میں نہ صرف ایک نیا یا لطیف پیچ ہوتا ہے بلکہ مضمون و معنی کی توسیع بھی۔ غزل کے شعروں کا دوسرا مصرع بات کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے۔ انھوں نے غزل کی کوئی نئی زبان تو ایجاد نہیں کی لیکن اپنے ایک شعر میں اردو کے ایک لفظ "خانہ جنگی" کو پہلی مرتبہ بڑی خوبصورتی سے کھپایا ہے۔ ان کا شعر ہے :

دل اسے چاہے جسے عقل نہیں چاہتی ہے
خانہ جنگی ہے عجب ذہن و بدن میں اب کے

اردو شاعری میں خود سے لڑنے کا تصور نایاب نہیں ہے۔ درد کا نہایت عمدہ شعر ہے۔

عالم سے اختیار کی ہر چند صلح کل
پر اپنے ساتھ مجھ کو شب و روز جنگ ہے

خود پروین شاکر کا شعر ہے :

ایک مدت ہوئی ہے خود سے لڑتے ؛ اندر سے تمام تھک رہی ہوں

لیکن خود سے لڑنے کے تصور کے باوجود خانہ جنگی کا لفظ شعر تک محدود تھا۔ شاعری میں یہ لفظ یا تو شیکسپیر کے یہاں نظر آیا یا پھر پروین شاکر کے یہاں۔ شیکسپیر کے سونیٹ نمبر ۳۵ کا ایک مصرع ہے :

SUCH CIVIL WAR IS IN MY LOVE AND HATE

اس مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ پروین شاکر نے غالب، میر کا
لفظ شیکسپیئر یا ایلیٹ یا ہر ممکن ادبی استفادہ قابل فخر ہے
کی خدمت دنیا کے ایک عظیم ترین شاعر کے پیش نظر کیا۔

پروین شاکر کی ایک فنی خصوصیت شاعری میں انگریزی الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ اردو شاعری میں انگریزی الفاظ اکبر الٰہ آبادی کے زمانے سے استعمال ہو رہے ہیں۔ طنزیہ اور مزاحیہ اثر پیدا کرنے کے لئے یہ طریقہ آسان بھی ہے اور مفید بھی۔ لیکن سنجیدہ شاعری میں انگریزی الفاظ کو کھپانا یقیناً ایک خطرناک عمل ہے۔ لیکن پروین شاکر نے کہیں کہیں اردو گفتگو کو دور حاضر کا رنگ دینے کے لئے انگریزی الفاظ کو بے تکلفی اور بے ساختگی سے استعمال کیا ہے۔ جس طرح وہ ہماری روزمرہ نثری گفتگو میں استعمال ہوتے ہیں۔ پروین شاکر کے یہاں انگریزی الفاظ نظم و غزل دونوں میں آئے ہیں۔ دو تین مثالیں دیکھئے:

میں خواب کس کے ساتھ بانٹوں ÷ اب مجھ کو کہاں بلٹ ملا ہے (غزل)

ایک انگریزی محاورہ TO BURN ONE'S BOAT کا ترجمہ تو خوب صورتی سے کر دیا ہے لیکن اس کے ساتھ انہیں کشتی کو بھی خوبصورتی سے استعمال کیا ہے:

اپنے آئین کی خبر رکھنا ÷ تم اگر کشتیاں جلا دینا (غزل)

کچھ اور مثالیں بھی دیکھئے:

یاد تو ہوں گی وہ باتیں تجھے اب بھی لیکن
شیلف میں رکھی ہوئی بند کتابوں کی طرح (غزل)

ابھی تصویر بری کیا بنے گی ÷ ابھی آئینوں پہ اک نشاں ہوں (غزل)

ان کی ایک نظم ہے "ٹیلی فون" کیا یہ نظم کسی اور طریقے سے بھی لکھی جا سکتی تھی؟

اپنے فون پہ اپنا نمبر
بار بار ڈائل کرتی ہوں
سوچ رہی ہوں
کب تک اس کا ٹیلی فون انگیج رہے گا۔
دل کڑھتا ہے۔
اتنی اتنی دیر تلک

وہ کس سے باتیں کرتا ہے

پروین شاکر کی ایک نظم ہے "مسند"، اس میں قصیدہ

ریاض پہ کتنی سہانی ریتیں ہیں
لکھتی تھی اسی طرح کی نظمیں
پر اب تو وہ ساری نظمیں غزلیں
گزرے ہوئے خواب کی ہیں باتیں
میں سب کو ڈس اون کر چکی ہوں۔

پروین شاکر کی ایک اور فنی خصوصیت قوسین کا استعمال ہے۔ قوسین کسی وضاحتی فقرے یا جملہ معترضہ کے لئے نثر میں ہمیشہ استعمال ہوتے رہے ہیں۔ پروین اردو کی پہلی شاعر یا شاعرہ ہیں۔ جنھوں نے قوسین کو جا بجا اپنی نظموں میں استعمال کیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ کئی جگہ ان کا استعمال خوبصورت اور دلچسپ ہے۔

شاید یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ چونکہ انسان کا بڑے سے بڑا کارنامہ بھی بالکل بے داغ اور بے عیب نہیں ہو سکتا اس لئے پروین شاکر کی شاعری بھی بعض خامیوں سے مبرا نہیں ہے۔ بعض خامیوں کو اختلاف ذوق سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے مثلاً ذاتی طور پر میں لفظ پانی کی جمع پانیوں بالکل پسند نہیں کرتا اور پروین شاکر نے لفظ پانیوں کثرت سے استعمال کیا ہے۔ پانیوں کی طرح لفظ 'بھی' ان کی کمزوریوں میں سے ہے۔ اس لفظ میں بذات خود کوئی خرابی نہیں لیکن وہ اسے اتنی مرتبہ استعمال کر چکی ہیں کہ اگر اب نہ کریں تو بہتر ہوگا۔۔ اسی طرح میرا جی چاہتا ہے کہ وہ 'کبھی بھی' کے الفاظ کے بجائے صرف 'کبھی' استعمال کریں تو ان کے مصرعے اس غیر ضروری ثقالت سے بچ جائیں جو 'کبھی بھی' کے استعمال سے پیدا ہوتی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ 'کبھی بھی' میں لفظ 'بھی' بالکل غیر ضروری ہے۔ ایک جگہ انھوں نے لفظ "مُحرِم" کو قافیے کی خاطر مُحرَم استعمال کیا ہے:

ملا ہے حکم کہ سایہ کو محرم کر لیں۔

یک فنی کارکردگی کی آتمائیں رہ جاتی ہیں لیکن مجموعی [illegible] سے آزاد [illegible] الفاظ کے ساتھ ہیں ان میں پروین شاکر کا [illegible] کا حرف

بھتی ہیں اور جہاں ضرورت محسوس کرتی ہیں ے کو بعض دیگر حرفوں کی طرح گرا دیتی ہیں مثلاً

شعر: ابرو نہ طبیعت تھی جن پر
لے جائیں مجھ کو مال غنیمت کے ساتھ عدو

دونوں مصرعوں میں ے کے گرنے سے مصرعے ناموزوں ہو جاتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اردو میں ے کا صحیح اور صاف تلفظ نہیں ہوتا اس کے باوجود اسے گرنے والے حرفوں میں شمار نہیں کیا جاتا۔

پروین شاکر متعدد نظموں میں ارتکاز اور چستی کی کمی کا احساس ہوتا ہے اگر وہ اپنی نظموں میں مزید ارتکاز اور چستی (COMPACTNESS) پیدا کریں۔ تو ان کی شاعری اور نکھر جائے۔ بعض نظموں میں انھوں نے پوربی اور ہندی زبان استعمال کی ہے۔ اس باب میں انھوں نے جس اعتدال کا ثبوت دیا ہے اگر اس پر وہ قائم رہیں تو بہتر یعنی "دھوپ" والی فہمیدہ ریاض کا راستہ اختیار نہ کریں تو بہتر کیونکہ وہ پاکستان کی بجائے ترکستان کی طرف جاتا ہے۔ فہمیدہ ریاض سے اس بات پر میرا جھگڑا کبھی ہو رہے گا کہ وہ ایک مصنوعی زبان استعمال کر کے اپنی شاعرانہ صلاحیت کیوں ضائع کر رہی ہیں۔ عوامی بولیوں اور لوک گیتوں سے خوبصورت ٹکڑے لے کر شاعری میں جادو جگانے کی کوشش ضرور کرنی چاہیے۔ لیکن اگر یہ کوشش محتاط نہ ہو تو جادوگر خود اپنے جادو کا شکار ہو جاتا ہے۔

میں نے پروین شاکر کی جن شاعرانہ خامیوں اور خطرات کی طرف اشارے کئے ہیں وہ ان کی خوبیوں کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہیں۔

شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ پروین شاکر ایک GENIUS سے کمتر کوئی چیز ہو سکتی ہیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ ایک TALENT سے برتر کوئی نہ کوئی چیز ضرور ہیں۔

غزل

اشفاق مہدی
(احمد آباد)

طوفاں میں زلزلوں میں مانا پناہ رہا ہوں
ساحل کی جستجو میں لیکن اتار رہا ہوں
اشکوں کو دیکھ کر اب یوں لگ رہا ہے جیسے
جھوڑے میں موت کے میں موتی اتار رہا ہوں
اے عزم مجھ کو دینا ہر ہر قدم سہارا
میں گردش جہاں سے آنکھیں لڑا رہا ہوں
لوگوں نے جس طرح بھی چاہا نمائش کر ڈالا
میں پتھر دلوں کی صورت یوں ہی بنا رہا ہوں
ہر اک ستم کو میں نے ہنس کر گلے لگایا
چھوٹا نصیب کا ہوں دل کا بڑا رہا ہوں
سن کر مری کہانی وہ بھی بجھ رہے ہیں
دیوانگی میں جیسے کچھ بڑبڑا رہا ہوں
جرأت سے تک رہی ہے اے انتہا دنیا
پیتا نہیں ہوں پھر بھی میں لڑکھڑا رہا ہوں

عقل و عشق

(احمد ندیم قاسمی)

اے اہل عشق! عقل سے اس درجہ بیر کیوں!
جب عشق کا سبب رازِ توانائی عقل ہے
تم ماورا کی دھند میں سرشار جستجو
اسرار کائنات کی شیدائی عقل ہے
ہے منتہائے عشق تو سچائی سر بسر
سچائی کے وجود کی زیبائی عقل ہے
تعمیر شخصیت کے لئے دونوں کیمیا
تنہائی عشق ـــــ انجمن آرائی عقل ہے
تخلیق عرش و فرش کی بنیاد عشق تھی
اجزائے ریزہ ریزہ کی یکجائی عقل ہے

(شاعر)

جگمگاتے انگور چھایا

وقت کہ

وہ وقت جو تجھ بن بیت گیا
اس وقت کا کون حساب کرے ؛
یوں جان کہ وہ گزری ہوئی عمر
اک لمبی کالی رات تھی
جس کے ماتھے پہ
جھوٹے تاروں کی افشاں تھی
(اور اس افشاں کو میں نے اپنی مانگ میں بھرنا چاہا تھا)
اک لمبی کالی رات
کہ جس کے پہلے پہر کی آنکھوں میں
ادھ کھلے دریچے اور ان کی بے خوابی تھی.
اور پچھلے پہر کی سانسوں میں
پھر کبھی نہ آنے والوں کے قدموں کی آہٹ
واہمہ بن کر گونجتی تھی
(ہر واہمہ تب کس درجہ یقین سا لگتا تھا!)
میں ایسی شاخ کو جو اپنی کچی کلیاں
بارش سے قبل جلا بیٹھی
جب پھول آنے کے دن آئے
بادل کا پیار گنوا بیٹھی
کیسی کیسی بے معنی باتوں میں شامیں برباد ہوئیں
کیسے بے مصرف کاموں میں اُجلی راتیں برباد ہوئیں
کس درجہ منافق لوگوں میں دل کی بات سناتا رہا
وہ جن کے قلوب پہ مہریں تھیں انہیں روشنیاں دکھلاتا رہا
کیسے کیسے پیارے جذبے کن ناقدروں کو دان کیے
کیسی بارآور رُت نے بے زر موسم سے پیمان کیے
کن کم ہمت شہزادوں کے وعدوں پہ بھروسا کر کے
کچی عمروں کے جسم میں سوئیاں گڑوا لیں
کن جسم بریدہ آسیبوں کے کہنے پر
آبادیاں شہرِ جاں کی تمام اُجڑوا دیں
کیسا کیسا دُکھ دل نے پائے
چھوٹی سی خوشی کے بدلے
اِن کون سے زخم نہ کھائے
ننھی سی ہنسی کے بدلے
زخموں کا کون شمار کرے
یادوں کا کیسے حصار کرے
اور جینا پھر سے عذاب کرے
اُس وقت کا کون حساب کرے
وہ وقت جو تجھ بن بیت گیا!

([illegible])

ٹیلیفون نمبر ۲۶۰۰۰۰
رجسٹرار آف نیوز پیپرز آف انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۲۳/۵۷
رجسٹرڈ نمبر ڈی ۳۲۰-۵
ایڈیٹر سرور تونسوی
قیمت سالانہ
پندرہ روپے
فی پرچہ
ایک روپیہ پچاس پیسے

ماہنامہ شانِ ہند دہلی

(دیوالی عید ایڈیشن)

جلد نمبر ۳۹ | نومبر سنہ ۱۹۶۸ء | شمارہ نمبر ۱۱

دیپاولی اور عیدِ قرباں کے مبارک سنگم پر

فیاض گوالیاری

"نودیپ، نورتن!"

کچھ دیئے تھے لیے دیئے روشن
ہم نے لاکھوں دیئے کیے روشن!

تم نے جب چاندنی کو قید کیا
خود بخود ہو گئے دیئے روشن

احتراماً ہوائیں ہیں خاموش
کس کے ہاتھوں ہوئے دیئے روشن

کیوں اتاریں وہ جام میں سورج
جن کے چہرے ہیں بن پیئے روشن

تیل جب تک نہ ہو محبت کا
جل چکے دیپ! ہو لیے روشن

عید دیپاولی سے دور نہیں
آنکھوں آنکھوں ہوئے دیئے روشن

جیسے سنگم ہو گنگا جمنا کا
مل کے آنکھوں نے دل کیے روشن

چمک اٹھے محل بھی، کٹیا بھی
سب نے دیوار و در کیے روشن

بچہ بچہ ہو دیش پر قرباں
کیجئے فیاض وہ دیئے روشن

دویا پرکاش سرور ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے ... سے چھپوا کر دفتر شانِ ہند ... سے شائع کیا۔

اپنے ریفنڈ کا کلیم داخل کیجئے

اگر آپ نے واجب سے زیادہ انکم ٹیکس دیا ہے تو آپ زائد رقم واپس لے سکتے ہیں۔

خاص طور پر اگر۔

آپ کی آمدنی کا ذریعہ ہے:

(ا) ڈیویڈنڈ (کمپنی حصص پر منافع)

(ب) سود

(ج) دیگر کوئی وسیلہ جہاں انکم ٹیکس ماخذ پر وضع کیا جاتا ہے۔

اور کسی مالی سال میں کل آمدنی کم سے کم قابل ٹیکس حد (اب -/10000 روپے) سے کم ہو تو آپ کو چاہئے کہ آپ ماخذ پر کاٹی گئی رقم کو واپس لینے کے لئے اپنے حساب کتاب کے ساتھ فارم نمبر 30 پر [illegible] ریفنڈ کا کلیم داخل کر دیجئے۔

بہر حال، جس سال کے لئے ریفنڈ واجب ہے اس تخمینہ سال کے آخری دن سے [illegible] سال کے اندر [illegible] آپ کو یہ کلیم داخل کر دینا ضروری ہے۔ مثال کے طور پر 77-1976 کے تخمینہ سال کے لئے ریفنڈ کلیم (1975-76 [illegible]) [illegible] 31 مارچ 1978 [illegible] اس سے پہلے داخل کرنا ضروری ہے۔

[illegible]

جاری کردہ:
ڈائریکٹر آف انسپکشن
(ریسرچ، اسٹیٹسٹکس و پبلک ریلیشنز)
محکمہ انکم ٹیکس، نئی دہلی 110001

davp 78/398

افکار و واقعات

راجستھان اُردو اکادمی

راجستھان اُردو اکادمی کی قائمی کا اعلان ۱۹۸۸ء کے مالی سال کے آخر میں کیا گیا۔ اردو اکادمی کے لئے تیس ہزار روپیہ دیا گیا۔ نیز جناب مولانا قمر واحدی کو راجستھان اُردو اکادمی کا صدر بنائے جانے کا اعلان کیا گیا۔ ماہ اپریل میں راجستھان کے وزیر اعلیٰ جناب بھیرون سنگھ شیخاوت نے نئی دہلی کی ایک پریس کانفرنس میں ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ اکادمی کے قواعد و ضوابط بنانے کے لئے صدر اکادمی سے کہہ دیا گیا ہے اور انہوں نے دوسرے پردیشوں کی اُردو اکادمیوں کے قواعد و ضوابط منگانے کے لئے لکھ دیا گیا ہے تاکہ انھیں مدِ نظر رکھتے ہوئے راجستھان اُردو اکادمی کے قواعد و ضوابط اور بھی بہتر طور پر بنائے جا سکیں۔

مگر کیا غضب ہے کہ آٹھ ماہ گزرنے پر بھی ابھی تک نہ تو اکادمی کے قواعد و ضوابط بن سکے ہیں نہ تو اکادمی کا دفتر ہی قائم ہوا ہے اور نہ ہی اکادمی کا سیکریٹری مقرر کیا گیا ہے اور نہ ہی مشاورتی کمیٹی کے ارکان کے ناموں کا اعلان کیا گیا۔ اور جو اس مالی سال میں اُردو اکادمی کے لئے دو لاکھ روپیہ دیئے جانے کے لئے کہا گیا تھا۔ اس کا بھی دور دور تک نشان تک نہیں ملتا۔ اور تو اور پچھلے سال کا جو تیس ہزار روپیہ بینک میں جمع ہے اس میں سے ایک پیسہ بھی خرچ کرنے کا اختیار صاحب صدر کو نہیں ہے۔ صاحب صدر کو ابھی تک نہ تو ٹیلیفون اور نہ ہی کار کی سہولیت مہیا کی گئی ہے۔

یہ سب واقعات جن کا تذکرہ اوپر کیا گیا ہے اس کی ذمہ داری کس پر آتی ہے؟ مختلف اخبارات میں اکثر و بیشتر مراسلے اور سُرخیاں اس سلسلے میں شائع ہونے کے باوجود حکومت راجستھان ٹس سے مس نہیں ہو رہی ہے تو اس کا سبب کیا ہے؟ اگر راجستھان کے اُردو پرست حضرات، شاعر، ادیب، تو اس ضمن میں ہم کچھ سچائیوں کی نشاندہی کرنا اپنا ایمان سمجھتے ہیں۔

۱۔ حکومت راجستھان دلی طور پر اُردو اکادمی بنانے کے حق میں ہی نہیں تھی، مگر اس کو مسلمانوں کی ووٹوں کی ضرورت ہے۔ اس نے اُردو اکادمی کی قائمی کا اعلان کر دیا۔ جو صرف اکادمی کے صدر کے نام تک ہی محدود رہا۔ اس سے حکومت کو دو فائدے ہوئے ایک تو یہ کہ راجستھان کے مسلمان خوش ہو گئے کہ اُردو اکادمی قائم کر دی گئی ہے۔ اور دوسرے یہ کہ ساہتیہ اکادمی اُدے پور اُردو کے لئے تھوڑا بہت جو کام کر رہی تھی وہ اُردو اکادمی کے پردے میں ختم کر دیا گیا۔ مثلاً اُردو کے چند مستحق شعرا اور ادیبوں کو وظیفے مل رہے تھے۔ اُردو اکادمی کے منتخب صدر خود ڈیڑھ سو روپیہ ماہانہ وظیفہ پاتے تھے جو سب بند کر دیئے گئے۔

۲۔ اُردو کے شعرا کی تصانیف ہر سال ایک دو ساہتیہ اکادمی شائع کر دیتی تھی وہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ مثال کے طور پر بھوپال کے معروف جناب جعفون گورکھپوری کی کتاب "نقوش" ساہتیہ اکادمی نے دہلی کے ایک پریس میں چھپوانے کے لئے بھیج دی تھی۔ "نقوش" کی کتابت بھی ہو چکی تھی مگر ساہتیہ اکادمی نے اب چھاپنے کے بعد ہی کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ ساہتیہ اکادمی اُردو کا سہ ماہی رسالہ "نخلستان" شائع کرتی تھی جسے بند کر دیا گیا یعنی اُردو اکادمی کا جلوہ دکھا کر حکومت نے عملی طور پر اُردو کی مانگ ختم کر دی۔ اور اُردو کتابیں اور اُردو سہ ماہی رسالے کی طباعت کا سلسلہ بھی بند کر دیا۔

۳۔ ساہتیہ اکادمی اُدے پور سال میں ایک دو اُردو سمپوزیم یا مشاعرے وغیرہ راجستھان کے مختلف مقامات پر منعقد کراتی تھی جس سے راجستھانی عوام کو اُردو کے ارتقا سے باخبر رکھا جاتا تھا۔ اب یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ اُردو اکادمی کو اُردو کا ایک مشاعرہ کرنے کے لئے جس کی تاریخ مقرر ہو چکی تھی اور شعرا کو دعوت نامے بھی دیئے جا چکے تھے، حکومت نے اُردو اکادمی کے فنڈ سے سات ہزار روپیہ دینے سے انکار کر دیا۔ اس کی وجہ بے شک کئی مالی مشکلات بتائی جاتی ہیں مگر اصل وجہ یہ ہے کہ اس سلسلے کو بھی ختم کر دیا گیا۔

۴۔ بیتے برسوں کے ... حضرات جن میں راجستھانی حکومت کے وزیر ریاست جناب محمد علی بھی شریک ہیں، کا کہنا ہے کہ اُردو اکادمی کا صدر ایک مسلمان کو ہونے کے بعد ... ہو گیا اور انہوں نے اس سلسلے میں ... اب اپنی زبان کو کیوں گنگ کئے ہوئے ہیں ... وزیر اعلیٰ کو مجبور کر دیا تھا کہ اُردو اکادمی کا صدر ... اب کون سی مجبوری ہے کہ وہ وزیر اعلیٰ کو مجبور نہیں کرتے کہ آٹھ ماہ گزر جانے پر بھی ... والا معاملہ کیوں ہے۔

۵۔ مسلمانوں کے ووٹ خود ... میں حاضر ہو کر انہیں یاد دلانے کی ضرورت ... اُردو اکادمی کا صدر مسلمان کو ہی بنایا ... اگر اُردو اکادمی کا سیکریٹری بنا دیا گیا تو راجستھان کی حکومت اُلٹ جائے گی۔ وہ خود اب راجستھان کی رتیلی زمین پر بارش ہونے کے بعد پھر ریتیلی ... اب بھی اسی طرح ... کی شکل میں وزیر اعلیٰ پر کیوں اثر نہیں ڈالتے کہ حضور اُردو اکادمی کو سرسبز کر دیجئے۔

۶۔ راجستھان اسمبلی میں غیر مسلم ممبران کو تو چھوڑیئے کیا کسی مسلم ممبر کو خواہ وہ کانگریس کا ہو یا جنتا پارٹی کا یہ توفیق نہ ہوئی کہ اسمبلی میں اس سوال کو اٹھاتا کہ اردو اکادمی کے سلسلے میں حکومت بے حسی کیوں دکھا رہی ہے۔

۷۔ حکومت راجستھان کے وزیر تعلیم بھی اس ضمن میں دروغ گو ثابت ہوئے۔ انہوں نے بھی اپنی سرگرمی محض ایک مسلمان کو صدر منتخب کرانے تک محدود رکھی۔

ایڈیٹر شانِ ہند جب … ہوا تو مسلمانوں کی اکثریت نے یہ مطالبہ کیا کہ شانِ ہند کی طرف ہم سب کی نظریں لگی ہوئی ہیں کہ وہی اس سلسلے میں ہماری نمائندگی کر سکتا ہے۔ لہٰذا ایڈیٹر شانِ ہند نے وزیر اعلیٰ سے ملاقات کے لئے … وزیر اعلیٰ کی آمد … جنتا پارٹی شیویر میں … مستقبل قریب میں ہی ان سے ملاقات کا … بالمشافہ اردو اکادمی کے سلسلے میں بات چیت کی جا سکی۔ اور یہ بھی تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے کہ وہ اتنے حاضر جواب اور … قسم کے سیاسی کھلاڑی ہیں کہ وہ باتوں باتوں میں … اردو اکادمی کے لئے … کر دیئے گئے مگر … رہے گا۔ لہٰذا … دیکھنا باقی رہ جاتا ہے کہ اس سلسلے میں … کیا جائے۔ آپ تو اس سلسلے میں … تجاویز پر عمل … شانِ ہند اردو اکادمی کا … عملی صورت میں تبدیل ہو سکے۔

۱۔ مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کا ایک مشترکہ وفد وزیر اعلیٰ کے پاس جاکر صاف صاف پوچھے کہ اردو اکادمی کے سلسلے میں یہ نامناسب رویہ کیوں اپنایا جا رہا ہے۔ جب کہ سندھی اکادمی اپنا کام کر رہی ہے حالانکہ اردو اکادمی اور سندھی اکادمی کا قیام ایک ہی وقت میں ہوا ہے۔

۲۔ مسلمان ممبران راجستھان اسمبلی جس میں جناب … علی صاحب بھی شامل ہیں، کو مجبور کیا جائے کہ وہ وزیر اعلیٰ کو اپنے استعفے پیش کر دیں کہ حکومت راجستھان اردو کے ساتھ قطعاً نامناسب سلوک کر رہی ہے اور جب تک یہ ناانصافی دور نہ کی جائے یہ حضرات اپنے استعفے واپس نہ لیں۔

۳۔ اردو اکادمی کے صدر صاحب بھی وزیر اعلیٰ کو مشروط استعفیٰ پیش کریں کہ اگر پندرہ دن کے اندر اندر اردو اکادمی کے سلسلے میں جملہ اقدامات نہ کئے گئے تو احتجاجاً ان کا استعفیٰ منظور کر لیا جائے۔

۴۔ راجستھان کے مشہور … اور … حضرات اپنے اپنے علاقے کے افسرانِ اعلیٰ کے پاس وفد لے کر جائیں اور میمورنڈم پیش کریں کہ ان کا یہ احتجاج حکومت راجستھان تک پہنچا دیں کہ ہم سب اردو اکادمی کے سلسلے میں کی جا رہی بے انصافی کے خلاف اظہارِ ناراضگی کرتے ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ مندرجہ بالا تجاویز پر عمل کرنے کی ہمت راجستھان کے مسلمانوں اور اردو پرستوں میں نہیں ہے اور نہیں ہوگی۔ معلوم ہے کہ ہمارا … وزیر اعلیٰ راجستھان جن کے ساتھ ہمارے تعلقات بہت اچھے ہیں، ہم سے ناخوش ہوں گے اور راجستھان کے سرکاری اشتہارات بھی شانِ ہند کے لئے بند کر دیئے جائیں گے مگر شانِ ہند نے قوم کو اردو اور بے انصافی کے بارے میں ہمیشہ آواز بلند کرنے میں اپنے ذاتی مفاد کو کبھی ترجیح نہیں دی۔ بے شک راجستھان میں شانِ ہند کا داخلہ ممنوع قرار دیا جائے مگر اردو کے لئے ہم حکومت راجستھان خصوصاً وزیر اعلیٰ کی دیدہ دانستہ سرد مہری اور عدم توجہی کے خلاف آواز ضرور بلند کریں گے۔ کاش راجستھان کے مسلمان اور اردو پرست غیر مسلموں کی غیرت میں جوش آ سکتا اور وہ حکومت راجستھان کو اردو اکادمی کے سلسلے میں انصاف کرنے کے لئے مجبور کر سکتے۔ رہا اکادمی کا منشور بنانے کا معاملہ تو ایڈیٹر شانِ ہند اسے ایک گھنٹہ میں تیار کر کے دے سکتا ہے حالانکہ سننے میں یہ آیا ہے کہ صدر اکادمی نے جو قواعد و ضوابط کا خاکہ وزیر اعلیٰ کو پیش کیا ہے وہ صرف … صفحات سے زیادہ پر مشتمل ہے۔ گو یہ بھی ہے تو پھر خاطر جمع رکھئے وزیر اعلیٰ کے پاس تو دس سال میں بھی اتنا وقت نہ ہو سکے گا کہ وہ اسے ایک نظر دیکھ بھی سکیں۔ ہم جانتے ہیں کہ مسئلہ اردو اکادمی راجستھان اصل صورتِ حال کے بارے میں ایک بیان اخبارات میں شائع کرانا …

جشنِ شبیر کانپوری

جناب حکیم شبیر علی خان شبیر کانپوری اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں جو اردو کی بقا و حیات کے لئے ہر وقت سینہ سپر رہتے ہیں۔ کانپور کے معززین کی صفِ اول کے یہ خاندانی رئیس سماج میں عزت و توقیر کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں وہ یقیناً قابلِ مبارکباد ہیں۔ شہر کے ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی شبیر صاحب کی عزت کرتے ہیں، اور ہر مذہب و ملت کے عوام میں مقبول ہیں۔ شبیر صاحب ایک مقتدر شاعر بھی ہیں۔ لہٰذا ان کی شعری اور ادبی خدمات کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لئے اہلِ کانپور ان کا جشن ۷ نومبر کو بہت بڑے پیمانے پر منا رہے ہیں۔ جشن کے سلسلے میں ایک آل انڈیا مشاعرہ بھی ہو رہا ہے جس کی مفصل کارروائی ایڈیٹر شانِ ہند قلم بند کر رہا ہے۔

ایک مودبانہ گزارش

اکثر منتظمین مشاعرہ کے خطوط آتے ہیں کہ ایڈیٹر شانِ ہند ان کے مشاعرہ کا آنکھوں دیکھا حال لکھے۔ اس سلسلے میں یہ گزارش ہے کہ اول تو ایڈیٹر شانِ ہند نے مشاعروں میں شرکت ہی تقریباً دس سال ہوئے چھوڑ دیا ہے اور اب تو ہارٹ اٹیک کے بعد طویل مسافت طے کرنا خود بھی مشکل ہے اس لئے دور دراز مقامات کے مشاعروں کا آنکھوں دیکھا حال لکھنا اس کے بس کی بات نہیں۔ پچھلے دنوں جن دو تین مشاعروں کا آنکھوں دیکھا حال لکھا گیا وہ مجھے انتہائی مجبوری کی حالت میں کیونکہ کچھ احباب کا پُرزور تقاضا تھا کہ ان کے احکام کی تعمیل کی جائے۔

ایسے حالات میں جب کہ ایڈیٹر شانِ ہند اکیلا سفر بھی نہیں کر سکتا اسے اس قسم کے دعوت ناموں سے معاف فرمایا جائے۔ ہاں اگر کوئی بہت ہی اچھا مشاعرہ ہو تو یہ خدمت انجام دینے میں انکار نہیں ہوگا۔

بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر

(سرور تونسوی)

جولائی ۱۹۵۲ء کے ماہنامہ "آجکل" میں جناب وی بشنکر صاحب آئی سی ایس کا ایک مضمون "سردار ولبھ بھائی پٹیل" کے عنوان سے شائع ہوا اس مضمون کے ساتھ جناب جوش ملیح آبادی (جو اس وقت "آجکل" کے مدیر سربراہ تھے) کا ایک مختصر سا تعارف بھی موجود ہے۔ حضرت جوش فرماتے ہیں۔

"میری زندگی میں وہ لمحہ بہت مبارک تھا جبکہ مسز سروجنی نائیڈو نے مجھے شنکر صاحب سے متعارف کیا تھا۔ کیونکہ اگر شنکر صاحب سے میں متعارف نہ ہوتا تو محروم رہ جاتا ایک ایسی گراں قدر ہستی کی دوستی سے جو علمی و ادبی بصیرت، وضع داری، دیانت، غیر مذہبی انسانیت، قلب کی طہارت، وسعت اور فن اور ارباب فن کی قدر افزائی و خدمت کے لحاظ سے ایک ایسی محبوب شخصیت ہے جس کے ساتھ صرف عقیدت و محبت ہی نہیں بے ساختہ عشق کرنے کو جی چاہتا ہے"۔

حضرت جوش نظم کے ہی بادشاہ نہیں نثر میں بھی وہ اپنا جواب آپ ہیں۔ چنانچہ اس مختصر سی عبارت میں انہوں نے نہایت خوبصورتی سے جناب وی بشنکر کا جو تعارف کرایا ہے وہ اتنی وسعت لئے ہوئے ہے کہ اگر وی بشنکر صاحب پر سیکڑوں صفحات بھی لکھے جائیں (جو یقیناً لکھے جا سکتے ہیں) تو بھی ان کی شخصیت پر ہی لکھا جائے گا۔

مگر کس قدر ستم ظریفی ہے یا محسن کشی یا دوسرے الفاظ میں احسان فراموشی کہ ان ہی جناب وی بشنکر صاحب آئی۔ سی۔ ایس جن کے ساتھ قبلہ جوش صاحب کو نہ صرف عقیدت و محبت ہی تھی بلکہ وہ ان سے بے ساختہ عشق کرنا چاہتے تھے کے بارے میں اپنی "یادوں کی برات" میں بھولے سے بھی ایک حرف تک نہیں لکھا۔

جناب وی بشنکر صاحب جب سردار پٹیل کے سیکریٹری تھے تو اس وقت وزارت براڈکاسٹنگ و انفارمیشن کے سیکریٹری جو ایک گجراتی تھے وہ اردو "آجکل" کی دوبارہ اشاعت کے خلاف تھے۔ مگر وی بشنکر صاحب نے سردار پٹیل سے کہہ کر نہ صرف اردو "آجکل" کا دوبارہ اجرا کرایا بلکہ اس ماہنامہ کی ادارت پر حضرت جوش ملیح آبادی کو متمکن کرایا۔ جوش صاحب کی سپیشل تنخواہ بھی وی بشنکر صاحب کی بدولت مقرر ہوئی۔ اس کے علاوہ وی بشنکر صاحب کی مہربانیوں، کرم فرمائیوں اور احسانات کی جو فراوانی جوش صاحب کے لئے وقف رہی اگر اس کا عشر عشیر بھی جوش صاحب کو یاد رہتا تو "یادوں کی برات" میں کئی صفحات ان کے لئے وقف کئے ہوتے۔ چہ جائیکہ جناب وی بشنکر صاحب کا نام ہی تک ان کے ذہن سے اتر گیا۔ "یادوں کی برات" میں جوش صاحب کی اس احسان ناشناسی کا تذکرہ جب ایڈیٹر "شانِ ہند" نے اپنے خط میں جوش صاحب سے کیا تو انہوں نے اپنے گرامی نامے مورخہ ۲۰ جون ۱۹۷۵ء میں لکھا۔

"اسلام آباد (پاکستان) میاں سرور صاحب خدا کا شکر ہے کہ آپ کا خط ملا اور تشفی خاطر ہوئی، اور آپ کے خط کا شکریہ واجب ہو گیا۔ سرور صاحب کے بارے میں ایک مختصر سا مضمون بھیج رہا ہوں۔ وی بشنکر صاحب (وی بشنکر) کو میں نے "یادوں کی برات" میں بھلا دیا، عجب بات ہے یہ۔ ان کا پتہ لکھ بھیجئے تاکہ میں ان کو خط لکھ سکوں، اور ہاں میرے عزیز (فراق گورکھپوری) کے پتے سے بھی آگاہ کیجئے اور آپ کی زندگی کن منازل سے گزر رہی ہے یہ بھی تحریر فرمائیے۔ میں اپنے جیتے جی، بچھڑے وطن کی یاد میں گھل رہا ہوں اور تمنا ہے کہ مرنے سے پیشتر احباب کا دیدار کر لوں۔ دیکھئے کب حالات اجازت دیتے ہیں۔ آپ نے اپنے خط میں درازیٔ عمر کی دعا کی ہے۔ آخر کیا اللہ میاں ہٹ رہے ہیں، زندگی کے دربار میں کہ جینے کی آرزو کی جائے میں تو اپنی طوالت عمر سے پریشان ہوں۔ اور شرمندہ بھی ہوں۔

جہاں بسمل تپیدہ در داست، آشانش کی دیا میں جارہ؟
بقدر ہمت جانی، ہر کسے، تپیدہ بیچارا
نیاز مند جوش مرحوم"

۲۰/۶/۷۵ء۔ صبح سات بجے دس

جناب جوش ملیح آبادی نے اپنے مکتوب گرامی میں جناب وی بشنکر صاحب کو بھول جانے کو جس انداز سے عجیب بات لکھا ہے وہ اس کی غمازی کر رہا ہے کہ یہ بھول اتفاقی نہیں بلکہ دانستہ ہے۔

جناب وی بشنکر صاحب کی تصنیف لطیف "سردار پٹیل سے متعلق میری یادداشتیں" شائع ہوئی تو اس میں حضرت جوش ملیح آبادی کا ذکر خیر جس حقیقت پسندانہ اور اخلاقی انداز میں تھا وہ جہاں وی بشنکر صاحب کے

چابک دستانہ طرزِ تحریر کا مظہر ہے ۔ وہاں اس امر کی پردہ دری بھی کہ حضرت جوش ملیح آبادی نے "یادوں کی برات" میں جناب وی شنکر کو دانستہ طور پر بھول جانے میں ہی عافیت سمجھی تھی ۔ اس سلسلہ میں جناب وی شنکر صاحب کا مکتوب گرامی بنام ایڈیٹر شانِ ہند بھی قابلِ مطالعہ ہے ۔

- ایس ۵۰۲ - گریٹر کیلاش ۔ نئی دہلی ۲۸ مائی ڈیر مسٹر قدر - میں سوموار کو ہندوستان سے باہر جا رہا ہوں ۔ اس لئے ۱۰ روانگی کے بعد واپسی پر ملاقات ہو سکے گی ۔ میری کتاب (سردار پٹیل سے متعلق میری یادداشتیں) کے بارے میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے اس کے لئے شکرگزار ہوں ۔ یہ کتاب ہر طبقہ میں پسند کی گئی ہے ۔ اس کتاب میں حضرت جوش ملیح آبادی کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ ایک حقیقت بیانی ہے ۔ اور یہ میرا فرض تھا کہ میں اس واقعہ کو کتاب میں شائع کرتا ۔ میں جب گزشتہ دنوں لندن میں تھا تو میں نے جوش صاحب کو لکھا تھا کہ اُن کی کتاب "یادوں کی برات" پڑھنے کے بعد ایسا لگا کہ آپ کو "یادوں کا جنازہ" نام سے کتاب لکھنی چاہیئے تھی ۔ نیک خواہشات کے ساتھ

وی شنکر (آئی ۔ سی ۔ ایس ریٹائرڈ)

جناب وی شنکر کی یہ اعلیٰ ظرفی اور وضعداری اور شرافت ہے کہ انہوں نے جوش صاحب کو اُس وقت بھی نہیں بھلایا جب کہ وہ ہندوستان کے وزیراعظم کے دستِ راست میں تھے ۔ پچھلے دنوں ایڈیٹر شانِ ہند سے انہوں نے جوش صاحب کی خیروعافیت کے بارے میں دریافت فرمایا کیونکہ کچھ ماہ پہلے حضرت جوش تشویشناک حد تک علیل رہے ۔ اور اب بھی ایسی حالت میں نہیں ہیں کہ جسے مکمل صحت کہا جا سکے ۔

جوش صاحب نے "یادوں کی برات" میں اپنے محسنِ اعظم جناب وی شنکر کو ہی فراموش نہیں کیا بلکہ اپنے کئی دوسرے محسنین کو بھی دانستہ طور پر فراموش کیا ہے آیئے دو تین حقیقی واقعات جوش صاحب کی احسان فراموشی کے آئینہ میں دیکھیں ۔

جوش صاحب نواب صاحب ٹونک کے ہاں تشریف لے گئے (نواب اسماعیل خاں تاج جن کا انتقال ہو چکا ہے ۔) کئی روز تک تمام ٹونک جوش صاحب کی جنبشِ نظر کا اشارہ پانے کے لئے سراپا نیاز بنا رہا ۔ نواب صاحب نے مہمان نوازی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی ۔ اور جب جوش صاحب ٹونک سے رخصت ہونے تو نواب صاحب نے ایک معقول رقم اور نہایت قیمتی تحفے ان کی خدمت میں پیش کیے ۔ اور اپنی نئی بیوک کار (جو ان دنوں ۸۰ ہزار کی آتی تھی) بیسے پور ہوائی اڈے پر بھجوایا ۔ جناب جوش کے رفیقِ سفر جناب بسمل ٹونکی اور جوش صاحب کے علاوہ بار (ثنا بلکہ سنا کسی ایرانی سے پوچھئے ہمیشہ ٹونکی بھی جوش صاحب کے

ہمسفر تھے ۔ چنانچہ ٹونک سے جب غلطی لشکر کی شکلیت بے پور پہنچی تو بسمل صاحب کی تحریک اور جوش کی تائید پر جوش صاحب نے ڈرائیور کو حکم دیا کہ وہ اسی کار سے ہی دہلی تک جائیں گے ۔ ڈرائیور نے اپنے مالک کے مہمان خصوصی کی عزت و احترام میں فرق نہ آنے دیا اور حکم کی تعمیل کی گئی ۔ دلی آتے ہی بسمل صاحب نے جوش صاحب سے کہا کہ حضور اب یہ کار واپس کرنے کی کیا ضرورت ہے اسے آپ اپنے مصرف میں لایئے ۔ اور ڈرائیور سے کہہ دیجئے کہ ٹرین سے واپس چلا جائے اور نواب صاحب سے کہہ دے کہ کار آپ نے رکھ لی ہے وہ شبیر حسن خاں جوش جن کے باپ دادا بقول ان کے دوسروں کے لئے اشرفیوں کے توڑے کھوٹے رکھتے تھے ۔ بسمل سعیدی کی انگیخت پر خود غرضی اور لالچ کے جذبات سے مغلوب ہو گئے اور ایسا ہی کیا گیا ۔ چنانچہ جب ڈرائیور نے جب تیسرے دن ٹونک پہنچ کر نواب صاحب کو اس صورتِ حال سے آگاہ کیا تو وہ اسّی ہزار کی بیوک کار کے اس ڈرامائی انداز میں چھن جانے پر خاموش رہے جوش صاحب جب اس ہتھیائی ہوئی بیوک کار پر جناب شنکر پرشاد صاحب آئی ۔ سی ۔ ایس چیف کمشنر دہلی کے ہاں تشریف لاتے تو وہ مذاق میں فرماتے جوش صاحب جب آپ اس کار میں تشریف لاتے ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ کوئی بلیک مارکیٹیا ملنے آیا ہے ۔ اس پر جوش صاحب کھسیانی ہنسی ہنس دیتے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ چیف کمشنر صاحب "بلیک مارکیٹیے" کے پردے میں کہہ رہے ہیں کہ یہ کار غصب کی ہوئی ہے ۔ نواب ٹونک نے کئی اور طریقوں سے جوش صاحب کی مدد کی ۔ مگر "یادوں کی برات" میں نواب صاحب ٹونک بحیثیت محسن کی حیثیت سے کہیں بھی نظر نہیں آتے ۔ اسلام آباد میں یہ کار اب بھی جوش صاحب کے پاس ہے ۔

جناب شنکر پرشاد صاحب آئی ۔ سی ۔ ایس دہلی کے چیف کمشنر ۹ سال تک رہے ۔ اور اس کے بعد وہ کئی معزز عہدوں پر سرفراز رہے اس تمام عرصہ میں جوش صاحب نے جناب شنکر پرشاد سے ایک دو نہیں ہزاروں فائدے اٹھائے مگر کیا مجال کہ ملیح آباد کے اس پٹھان نے شنکر پرشاد صاحب اپنے محسن کے بارے میں اپنی کتاب میں ذکر تک بھی کیا ہو ۔

حضرت جوش جب بھی پاکستان سے ہندوستان تشریف لاتے تو مستقل طور پر ان کے میزبان ہوٹل ماجسٹک کے مالک جناب کرشن لال ہی ہوتے ایک اندازے کے مطابق کرشن لال صاحب نے جوش صاحب کی مہمان نوازی پر تقریباً ایک لاکھ روپیہ صرف کیا ہوگا ۔ جوش صاحب نے "یادوں کی برات" میں پنڈت جواہر لال نہرو کا ذکر کرتے ہوئے جو لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ۔۔

جب پاکستان سے دہلی گئے ہوئے تھے تو انہوں نے پنڈت جواہر لال نہرو کو اپنی قیام گاہ پر کھانے پر مدعو کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جوش صاحب نے پنڈت جواہر لال نہرو کو اپنے میزبان کرشن لال کے یہاں ہی کھانے پر مدعو کیا تھا۔ اور اس دعوت پر کرشن لال صاحب کا آٹھ ہزار روپیہ لگ گیا تھا۔ ایڈیٹر شانِ ہند بھی اس دعوت میں مدعو تھا۔ جو اپنی آنکھوں دیکھا واقعہ ہے کہ پاکستان سے مالِ مفت دلِ بے رحم پر عمل کرتے ہوئے، سکاچ وسکی کے پندرہ پندرہ بڑے پیگ انڈیلتے اور جب پی نہ سکے تو کوٹھی کے سبزہ زار کے کسی گوشے میں پی ہوئی وسکی اگل رہے تھے۔ پچھلی بار جب جوش صاحب دہلی تشریف لائے تو کرشن لال صاحب کی اہلیہ محترمہ [illegible] کے ہسپتال میں زیرِ علاج تھیں اور ان کا آپریشن ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے کرشن لال صاحب کی ایک ٹانگ دہلی میں تھی تو دوسری ہسپتال میں۔ اس حالت میں جوش صاحب کی میزبانی کے فرائض حسبِ سابق بطریقِ احسن انجام نہ دے سکتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے جوش صاحب سے کہا کہ انہیں کسی موزوں ہوٹل میں ٹھہرانے کا انتظام کر دیا جائے تو بہتر رہے گا۔ وسکی کی بوتل ہر شام انہیں کرشن لال کی دکان سے آ جایا کرے گی اور ہوٹل کے جملہ اخراجات بھی وہ ادا کر دیں گے۔ جوش صاحب نے کرشن لال صاحب کی مجبوری کا لحاظ نہیں فرمایا۔ اور کرشن لال صاحب کی اس تجویز کو اپنی توہین سمجھتے ہوئے بادلِ ناخواستہ آگرہ ہوٹل میں قیام فرمایا۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کرشن لال صاحب کے یہاں سے ہر روز ایک بوتل سکاچ وسکی جوش کے یہاں پابندی سے ٹیکسی لاتے رہے۔ اور جن دنوں جوش صاحب لکھنؤ اور ملیح آباد وغیرہ تشریف لے گئے اور [illegible] ٹوکی اکیلا جوش صاحب کے روم میں مقیم، ہاں تو یہ جوش صاحب کی عدم موجودگی میں بھی سکاچ وسکی کی بوتل ہر روز کرشن لال صاحب کے ہاں سے لاتا رہا۔ اور اسے آدھے پونے داموں فروخت کر کے اپنی جیب بھرتا رہا۔ ہندوستان کی سی۔ آئی۔ ڈی جانتی تھی کہ جوش کے ہمراہ [illegible] ٹوکی پاکستانی سرکار کا مقرر کردہ جاسوس ہے۔ لہٰذا [illegible] ڈی نے پوری چوکسی سے کام لیا۔ اس سلسلے میں کرشن لال صاحب سے بھی کئی مرتبہ بازپرس ہوئی مگر کرشن لال صاحب نے اس کے باوجود جوش صاحب کی میزبانی کا سلسلہ جاری رکھا اور ہزارہا روپیہ ان کی شراب نوشی، دعوتوں اور دوسرے اخراجات پر صرف کر دیا۔ اور صرف یہی کیا، انتہائی مجبوریوں کے تحت طاقتِ مہماں داشت کے مصداق وہ اس "سعادت" سے محروم رہے تو اسی کرشن لال صاحب کا نام اور ان کی عنایات ایسی ضخیم کتاب میں کہیں نظر نہیں آیا۔ جوش صاحب پر قرض ادا کرنے کے سلسلے میں جو ڈگریاں ہوئیں اور جن جن حضرات نے ان ڈگریوں کی ادائیگی میں ڈیڑھ لاکھ روپیہ دیا ان میں سے کسی بھی محسن کا نام تک اس کتاب میں نہیں ملتا۔ (جاری ہے)

یہ سنسار سراسر دھوکا

بشیر احمد، بیتاب (صادق آباد پاکستان)

من میں کس نے آگ لگائی کوئی مجھے بتائے
کون سکھی ری چپکے چپکے راتوں کو تڑپائے
جیون بھر کا روگ لگا کر بیٹھ سکھی پچھتائی
جس پریتم کو دل دے بیٹھی وہ نکلا ہرجائی
میں نے جن کو سچ سمجھا تھا وہ تھے سُندر سپنے
خواب حقیقت بن نہ پائے بھاگ کہاں تھے اپنے
پھر رُت بدلی پھر گُل مہکے پھر برکھا رُت آئی
تنہا تنہا کوک رہی ہے پھر کوئل سودائی
ہر انساں ہے تنہا تنہا کوئی نہیں ہے اپنا
یہ سنسار سراسر دھوکہ جیون ہے اک سپنا
آشاؤں کے دیپ جلا کر جیون رین گزاری
صبح کی زردی رُخ پر پھیلی کر لی کوچ تیاری

میں نہ رہوں گا

تو میرے بال بچے تباہ ہو جائیں گے۔

کاروبار چوپٹ ہو جائے گا۔

مال وجائداد تیرہ تین ہو جائے گی

میرے شاگردوں کو مجھ جیسا ہمدرد اور لائق اُستاد بھلا کہاں ملے گا؟

میرے بعد قوم کی سچی خیرخواہی کرنے والا لیڈر کہاں سے آئے گا؟

مجھ سے بہتر مُلک کا انتظام سنبھالنے والا مُدبّر اب بھلا کون ہے؟

غرض یہ کہ ہر شخص

چاہے وہ عام آدمی ہو، کوئی اُستاد یا فن کا ماہر ہو، لیڈر یا حاکم ہو، ہر ایک یہی سوچتا ہے کہ اس کے چلے جانے کے بعد دُنیا ایک بہت بڑی کمی محسوس کرے گی۔

لیکن دُنیا سے بہت بڑے بڑے لوگ اُٹھ گئے

اور دُنیا یوں ہی چلتی رہی

سوچنے کی بات یہ نہیں ہے کہ میں نہ رہوں گا تو دُنیا کا کیا بنے گا؟

سوچنے کی بات یہ ہے کہ جب تک میں ہوں میں اپنے لیے کیا کچھ بنالوں کہ کل میرے کام آئے۔

مشاعرۂ عید و دسہرہ ملن کمائی مادھوپور

(سمر قند تونسوی)

سوائی مادھوپور دہلی بمبئی شاہراہ پر ایک جنکشن ہے۔ اور راجستھان کا ایک مشہور ضلع۔ یہاں پر سرکاری طور پر جنگلی خونخوار جانوروں کا کھلے بندوں نظارہ کرنے کا بہت اچھا انتظام کیا گیا ہے جسے دیکھنے کے لئے دُور دُور سے شائقین آتے ہیں۔ یہ جگہ اپنی طرز کی خوب ہے اور قدرتی پہاڑیوں کے دلکش مناظر اور بھی دیدہ زیب بنا رہے ہیں۔

جب میں مشاعرہ گاہ میں پہونچا تو جناب اختر علی نقوی، سیکریٹری تقریب کمیٹی نے مشاعرہ گاہ کو بڑے اچھے ڈھنگ سے سجایا گیا ہے۔ مشاعرہ سے پہلے اسی جگہ ایک گوٹ (پکنک) کا انتظام کیا گیا تھا جس میں تقریباً گیارہ سو حضرات نے حصہ لیا۔ اس پکنک میں شریک ہونے کے لئے داخلہ فیس سات روپے تھی کھانے اور چائے وغیرہ کے اخراجات کے بعد بچے گا وہ عیدگاہ کی چار دیواری کے لئے خرچ کیا جائے گا۔ جے پور، ٹونک، اور دیگر کئی راجستھانی مقامات سے اردو مشاعرہ کے شائقین اس گوٹ میں شریک ہونے کے لئے آئے ہیں۔ دوسرے جیپیں، کاریں مختلف مقامات سے ندلے روؤساکی کھڑی ہیں۔ اور ان حضرات نے شب بسری کے لئے مشاعرہ گاہ سے ملحق خیمے لگا رکھے ہیں۔ جناب ستیہ فاروق حسین سابق ایجوکیشن منسٹر راجستھان اور جناب منظور احمد صاحب جے پور سے تشریف لائے ہیں جن میں ہندو مسلم اتحاد پر بہت اچھے ڈھنگ سے تقریر کی ہے۔ جناب ایچ ڈوبے صاحب کلکٹر سوائی مادھوپور صدر مملکت منتخب ہو چکے ہیں۔ اے۔ ڈی۔ ایم۔ اور دیگر معززین بھی پنج پر تشریف فرما ہیں۔ ڈپٹی نائب ایریا کمپنی کے چیف شری دوردشنکر پاریکھ نے شرکائے مشاعرہ کا خیر مقدم بہت اچھے انداز میں کرتے ہوئے ہندی کے بہت اچھے اشعار سنائے۔ پیرو شری دیا رام جی نے ہندو مسلم اتحاد پر بہت اچھی تقریر کرتے ہوئے سوائی مادھوپور کو ہندو مسلم اتحاد کا ایک ترجمہ قرار دیا۔

جناب پروفیسر [illegible] کے ہاتھوں آج کے مشاعرہ کی نظامت سونپی ہے۔ انور صاحب نے [illegible] سے پہلے جو تقریر کی ہے وہ اس امر کی غمازی ہے کہ [illegible] کے حقوق سے واقف ہیں۔ کبھی آپنے خیالات میں [illegible] کیا ہوا کہ لیجئے کہ آپ [illegible] [illegible] کے ساتھ مشاعرہ کو [illegible] کے لئے [illegible] کی اس

تقریب کو شاعرِ مشرق ڈاکٹر سر محمد اقبال کے ترانے سے شروع کرنے کے لئے عزیزی عابدہ رفعت ڈگی سے کہا گیا ہے کہ وہ ترانۂ اقبال سنائیں۔ عابدہ رفعت نے "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" سنا کر تین طرف سے پہاڑیوں سے گھری ہوئی مشاعرہ گاہ میں ایک نئی روح پھونک دی ہے۔ ناظمِ مشاعرہ انور صاحب نے کوثر و تسنیم سے دُھلی ہوئی زبان میں ایک مقامی شاعر [illegible] ڈگی کو کلام سنانے کی دعوت دی ہے۔ پُرسوز ترنم سے تابش صاحب فرما رہے ہیں:

تمہاری محفل میں ہم نے دیکھا یہ حال ہر ایک کی بے خودی کا
کہیں پہ دامن کہ مرتفع [illegible] نگیں، کہیں گریباں تھا کسی کا

میری کلام۔ شگفتہ اصلاح طلب، ٹونک استاذ بیان اور ادب کا گہوارہ ہے نہ معلوم تابش پر ٹونک کا رنگ کیوں نہیں چڑھا۔ اب آنادہ کوٹوی مائک پر آئے ہیں اور قطعہ سنا رہے ہیں:

ہر نصیب کو منزل پہ آ گیا ہوں میں ٭ ہزار بار لُٹا ایسا قافلہ ہوں میں

ترنم معمولی اور قطعے بھی کچھ ایسے انداز کا ہم وزن اشعار اُن کے فن کی پیچیدگی تو قدم قدم بچا لیا ہے زندگی نے مگر ٭ ہوئے ہوا نہ کبھی ایسا فلسفہ ہوں میں
تمام عمر ترستا رہے کئے پیاسا دوں کو ٭ کچھ ایسے پُرسکوں ساحل پہ بنا بیٹھا ہوں میں
دیر و دشت میں جب بکھیرو جاتا ہے ٭ جہاں جہاں سے بھی تجھ کو لگتا ہوں میں

اب شاداب جے پوری کو دعوت دی گئی ہے کہ کلام سنائیں۔ شاداب صاحب نے ہی دلنشین ترنم سے کئی مرتبہ کی سنائی غزل شروع کی ہے نہ معلوم ان کا ترنم سُر ہو کہ پاس دو چار ہی غزلیں کیوں ہوتی ہیں۔ ۹۰ کا ہر غزل کی مشکل اور ترنم شاداب کا نقشہ موسیقی کی فضاؤں میں لے آیا ہے۔ عام طور پر اہلِ جے پور بڑی خوبصورتی سے قائل ہیں اس لئے غزل اور ترنم دونوں خوب ہیں۔ مگر افسوس کہ شاداب جے پوری کا پایا ہے چشمہ سے ہیں جس پر اہلِ ذوق شاداب کی شاعری پر تحسین و آفرین کی برسات کر رہے ہیں۔ نور اندوری اور انور لکھنوی نے یہ آواز بلند کئی بار کہا کہ پھر پڑھیں مگر شاداب ہیں کہ پھول اور چھوڑ کے معنوی فرق سے واقف ہی نہیں ہیں آپ بھی سُن لیجئے:

آپ کیا جانیں کہ کیا چیز ہے داغِ فرقت
بسے پھول کھلا یہ زخم ہیں ابھر سکتے

ترنم کا دریا بہتے ہوئے شاداب مائک سے ہٹے تو انور صاحب فرما رہے ہیں

فیروز آبادی [illegible] کہ جانے [illegible] ۔ اقبال صاحب [illegible] صاحب [illegible] کے
ساتھ شکیب کم عمر [illegible] فیروز آبادی کو پیش کیا ہے ۔ راست کہ [illegible]
کا [illegible] ۔ یک [illegible] اس میں فیروز آباد سے دلی [illegible] زمانے
میں ہندوستان کا سب سے بہترین مترنم شاعر سمجھا جاتا تھا ۔ ایک ایک وقت
میں [illegible] شعر پڑھنے کے [illegible] جاتے تھے [illegible] ۔
[illegible] میں [illegible] بیگم [illegible] کیا گیا [illegible]
بھی اس شاعر [illegible] وقت [illegible] کا [illegible] کر رہا ہے ۔
اچھا ترنم اچھا کلام ۔ اس پر [illegible] کی خصوصیت اس شعر سے نمایاں ہو
رہا ہے ۔

شمشان شام غم تھی اندھیرا بلا کا تھا
شانہ شعر آپ کی [illegible] کا تھا

مانگے کے نشانے کی ایک جھلک دیکھ لی آپ نے ، اس پر کتنا کچھ کہا جائے ۔ اور اب
بیٹھے جناب شعر [illegible] پوری کو جو اپنے روایتی ترنم سے شعار رنگوں کی زندگی سے [illegible]
پھولوں کی طرح [illegible] ہیں [illegible] ہیں

اے وقت کی گردش تو ہی بتا کیا لطف ہے ایسے جینے میں
[illegible] جنوں اب تو ہی بتا [illegible] کا دامن ہو کے رفو
یہ ہاتھ اٹھا جاتے ہیں اپنا ہی گریباں سینے میں
کل ہم کو کسی سے عشق [illegible] کوئی [illegible] سکتا تھا
[illegible] کا دامن ہاتھ میں ہے اب لطف ہے مرنے جینے میں

اس شعر پر [illegible] صاحب کو خوب داد ملی ہے ۔ جناب [illegible] کو بھی کوے
تاب تحمیل دل کی حالت بگھ [illegible] ہیں ۔ اور [illegible] سے داد دے
رہے ہیں ۔ اگر وہ مقامات میں [illegible] ہوں گے تو بیچارے
[illegible] کا خدا ہی حافظ ہے ۔ اب [illegible] تشریف لاتے ہوئے جناب
شکیب بناری کو بہت ہی اچھے انداز کے ساتھ [illegible] کی گزارش
کی ہے ۔ خاتم [illegible] گذشتہ [illegible] میں [illegible]
شاعر [illegible] کے سامنے آئے مگر جس
خاص ادبی شعور اور [illegible] کے ساتھ [illegible] صاحب [illegible] کر رہے
ہیں اس کا انداز ہی الگ ہے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ [illegible] صاحب [illegible]
سے دلی طور پر واقف نہیں ہیں [illegible] ان [illegible] کے [illegible]
[illegible] شعراء کے کلام سننے کے بعد [illegible] ہیں کچھ کہنا پڑتا ہے اور
وہ کہیں کہیں اپنی تعارفی تقریر کو طولانی دیتے ہیں [illegible] کے بغیر نہیں رہا جا سکتا

کی آج اس محفل میں ایک بار [illegible] حیثیت کے مالک ہیں ۔ جناب شکیب بناری نے
[illegible] ہے

[illegible] جینے میں ۔ [illegible] دینے
[illegible] جینے
[illegible] جناب شکیب صاحب [illegible]
[illegible] میں دینے
[illegible] گہری [illegible] دینے
[illegible] ہے

[illegible] سے [illegible] ۔ [illegible] ہے
[illegible] ہے
[illegible] ہے

[illegible] بھی نہیں جاتے ۔ [illegible] جاتے
[illegible] زمانہ ۔ [illegible] نہیں جاتے
[illegible] یار و ۔ [illegible] جاتے
[illegible] ۔ [illegible] نہیں جاتے
[illegible] مگر [illegible] دینے
[illegible] شکیب صاحب کا یہ شعر [illegible] ہے

تیری محبت کی یہ روش تو مجھے راس آئی نہیں
[illegible] گردش تھا اور [illegible]

داد و تحسین کی تالیوں کے شور میں شکیب صاحب اپنی جگہ پر تشریف لائے
[illegible] صاحب [illegible] فیروز آبادی کو آواز دی ہے ۔ [illegible]
میں [illegible] کہ ایک [illegible] ۔ اس دن سے [illegible]
[illegible] کے نام کا [illegible] کرتے ہیں ۔ [illegible] شاعر بنا دیا تو انہوں نے اپنے
تخلص کی نسبت اپنی [illegible] وابستہ کرتے ہوئے [illegible] کہنا ہے جس
کی [illegible] مرشد [illegible] ۔ عاشق و معشوق دونوں
[illegible] میں پرورش کر چکے ہیں ۔ [illegible] رہی ہے ۔
چنانچہ [illegible] صاحب کا ایک [illegible] دیکھئے [illegible] وہ مرد
[illegible] کے اس [illegible] کلام [illegible] ہے

[illegible] ہے ترنم ہے ۔ [illegible] ہے
[illegible] ۔ [illegible] ہے
اب جناب [illegible] پوری [illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible] خوبصورت اضافہ کیا ہے۔ ان کی یہ نظم بھی بہت [illegible] سے متعلق ہے جس میں انہوں نے [illegible] ترجمانی کی ہے۔ اور یہ حقیقت بھی ہے کہ [illegible] غزل میں یہ [illegible] اب [illegible] صاحب [illegible] جناب کرشن بہاری نور لکھنوی کے کلام پر [illegible] فرماتے ہیں [illegible] نور لکھنوی کی کلام سنانے کی ادا بہت دلنشیں ہے۔ اُن کے تحت پر پڑھنے اور ترنم دونوں [illegible]

[illegible] پھر اُٹھے ✣ تو نہ آیا تو سے پیغام [illegible] آئے

اُس نے [illegible] ✣ مقصد اتنا تھا کہ یہ بھی [illegible] جائیں

زیست کے [illegible] یوں اس سے بچھڑ کر جیسے

کسی ناول کے ورق بیچ سے غائب ہو جائیں

[illegible] غزل [illegible] یہ شعر [illegible]

نہیں ہے [illegible] میں سناتا ہوں ؎

[illegible] خوابوں سے [illegible] کو چھوڑ دیا

شکن نصیب وہ بستر مری تلاش میں ہے

میں ایک قطرہ ہوں میرا الگ وجود تو ہے

ہوا کرے جو سمندر مری تلاش میں ہے

وہ ایک سایہ ہے اپنا ہو یا پرایا ہو

جنم جنم سے برابر میری کوئی تلاش میں ہے

ہر شعر پر جو داد مل رہی ہے اس کا ذکر ہی [illegible] غزل کے لطف و سلسل کا سلسلہ منقطع نہ ہو [illegible]

میں [illegible] سمندر میں ✣ وہ میرے جسم سے باہر مری تلاش میں ہے

[illegible] ✣ تری نگاہ [illegible] مری تلاش میں ہے

میں [illegible] اُس کے [illegible] مری تلاش میں ہے

[illegible] داد [illegible] اور داد کے [illegible] صاحب غزل کا آخری شعر سناتے ہیں ؎

[illegible] مری تلاش میں ہے

غزل ختم کرنے کے بعد [illegible] صاحب اپنی جگہ [illegible] کلام [illegible] [illegible] اور [illegible] غزل [illegible] مثلاً اس [illegible] غزل [illegible] ہے۔ [illegible] آپ بھی [illegible] کیا کریں گے۔ اس [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] پاس [illegible] ایک [illegible] ہے

[illegible] کی [illegible] میں ہے ✣ [illegible] اُس کے [illegible]

جناب [illegible] صاحب [illegible] [illegible] اپنے [illegible] ہے [illegible]

[illegible] کی [illegible] ہے

[illegible] ساتھ [illegible] ✣ [illegible] ساتھ دیں گے

[illegible] ساتھ دیں گے ✣ [illegible] ساتھ دیں گے

[illegible] ✣ [illegible] ساتھ دیں گے

[illegible] ✣ کہاں تک یہ لوح و قلم ساتھ دیں گے

[illegible] ✣ [illegible] ساتھ دیں گے

[illegible] ✣ [illegible] ہم ساتھ دیں گے

[illegible] شعروں کی [illegible] کلام [illegible] کے [illegible] ہے۔ [illegible] چلا کر [illegible] صاحب [illegible] کی بہترین شعری [illegible] راحت اندوری [illegible] ہے۔ راحت [illegible] آگئے ہیں۔ [illegible] کے شہر میں [illegible] ہوا ہوں۔ اور یقیناً آپ [illegible] ایک [illegible] میں نہیں [illegible] راحت [illegible] کے باعث اور بھی [illegible] ہے) میں یوں ارشاد فرماتے ہیں ؎

کشتیاں موجوں میں طوفان میں لنگر ڈوبے

ہم نے [illegible] کنارے پہ پہنچ کر ڈوبے

میں [illegible] ملا اُن سے

ایسی آنکھیں کہ سمندر کا سمندر ڈوبے

[illegible] غزل شروع کی ہے ؎

تم [illegible] نام [illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible] کی [illegible]

[illegible]

[illegible]

عفت اقتدار کی تھی قیمت گھر پہ رکھی تھی
سر تک تہہ جا جاتے تو منظر دیکھ سکتے تھے
دیئے پلکوں پہ رکھے تھے شکن بستر پہ رکھی تھی

خوب خوب داد پاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اب جو شعر یاد آئیں گے سناتا ہوں ارشاد ہوتا ہے ؎

جمیل اچھا ہے کنول اچھا ہے کہ جام اچھا ہے
تیری آنکھوں کے لئے کون سا نام اچھا ہے

والہانہ کے راحت آئے مشاعروں کا دور یاد آ جاتا ہے سنیئے ؎

تجھ سے بچھڑا ہوں تو یہ ہوگئی حالت میری ؛ میری تصویر سے ملتی نہیں صورت میری

راحت کہتے ہیں کہ ایک غزل کے دو تین شعر یاد آگئے ہیں۔ سن لیجئے ؎

ہر ایک چہرے کو زخموں کا آئینہ نہ کہو ؛ یہ زندگی تو ہے رحمت اسے سزا نہ کہو
نہ جانے کون سی مجبوریوں کا قیدی ہو ؛ وہ ساتھ چھوڑ گیا ہے تو بے وفا نہ کہو
بہت حسین سہی آنکھوں پہ گوند وہ ؛ ہماری پیٹھ کے پیچھے ہیں بُرا نہ کہو

ہال کے مجمع میں ایک اور ایک اور کی آوازیں ہیں کہ کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی ہے۔ دیکھا تو راحت صاحب اپنی جگہ پر جاتے جاتے پھر مائیک پر لگے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ ایک تازہ غزل سن لیجئے ؎

خانقاہوں میں حرم میں نہ شوالوں میں ملے
وہ فرشتے جو کتابوں کے حوالوں میں ملے
چاند کو ہم نے کبھی غور سے دیکھا ہی نہیں
اس سے کہنا کہ کبھی دن کے اُجالوں میں ملے
پچھلی سے ہونٹوں پہ بھی سقراط کا نام آیا تھا
اور ہم ڈوبے ہوئے زہر کے پیالوں میں ملے
میں نے دیکھا ہے تجھے غور سے اے جانِ غزل
تیرے قاتل تیرے اُلجھے ہوئے بالوں میں ملے

واہ رے کرنیا ہنگامہ ہو گئی ہے اور اس عالم وارفتگی میں ہی راحت مقطع سناتے ہیں ؎

شکل واسطہ سے تو یہ بھی ہیں راحت صاحب
پھر بھی جب جب وہ ملے دیر و حجابوں میں ملے

راحت مشاعرے کو تمام عروج بخرون سے آگے لے گئے ہیں اور (اناونسر) نے منقل مندی کا مظاہرہ کر کے ہوئے عزیزی عابدہ رفعت کو بہت ہی اچھے تعارف کے ساتھ کلام سنانے کی دعوت دی ہے۔ عزیزہ عابدہ رفعت بھی ایک سچائی غزل شناوی ہے اور غزل تو آپ سن چکے ہیں مگر ترنم سے مظلوم ہی رہ گیا ہے ان تو عابدہ رفعت کی نغمہ سرائی ملاحظہ فرمائیے ؎

دل میں زخموں کی لالہ کاری ہے ؛ فصلِ گل پھر بھی ہم کو پیاری ہے
جل تمہارا ہے صحیاں ہماری ہے ؛ نام کو زندگی ہماری ہے
اپنا اپنا نصیب ہے بیز رفعت ؛ غم ہمارے خوشی تمہاری ہے
جو زمیں تلک تو گیا ہے جمال ؛ حسن کیا ہے نظر ہماری کا ہے
اُس نظر کا یہ حال یہ رفعت ؛ اک نظر سو دلوں پہ بھاری ہے

حُسن، ترنم اور شاعری کی تثلیث بجلیاں گراتے۔ اور تشنگی کا احساس سامعین کے دلوں میں باقی رکھتے ہوئے اپنی جگہ پر آئیں تو خراب میں نہلائے ہوئے ناظر خیامی مائیک پر آگئے ہیں اور اناونسر سے مخاطب ہو کر کہہ رہے ہیں کہ ان کی ڈاڑھی بھی میرے آنے نہیں آئی۔ میں ہندوستان میں کسی سے پیار نہیں کرتا۔ بے شک شرعی یا سیاسی قسم دلا دیجئے۔ ذرا ہوش مشاعرے کو چلا جاتا ہے وہ سچائی سے چلا جاتا ہے (اناونسر کو ذرا دیر سے تشبیہ ہوے کہ ناظر صاحب نے سامعین کو قہقہوں کی دعوت دی ہے) یہ اسٹیج اردو کا ہے۔ اردو لشکری زبان ہے اور فوجی جھوٹ نہیں بولتے۔ اس کے بعد ناظر صاحب اردو کے شعراء کے نام گنوا کر کہتے ہیں کہ یہ سب شراب پیتے ہیں۔ شراب بندی اُردو سے دشمنی ہے۔ شراب بُری ہوگی اور بُری رہے گی مگر جب ملک پر یا زبان پر بُرا وقت پڑے گا تو یہ شراب ہی کام دے گی ؎

مجھ کو افسوس نہیں تم جو بُرا کہتے ہو ؛ میں نے مانا کہ شرابی ہوں بجا کہتے ہو
. . . . ؛ خونِ انساں جو پیتے ہیں اسے کیا کہتے ہو

ناظر خیامی کلام کم سنا رہے ہیں اور تقریر زیادہ کر رہے ہیں۔ یہ موقع ناشناس شاعر اس مجمع میں جہاں مسلم حضرات کی اکثریت ہے شراب کے حق میں دلائل دے رہا ہے۔ ایسے مشاعروں میں شراب بندی - مذہبِ اسلام کے خلاف یا کسی دوسری سرکاری مفید پالیسی کے خلاف بولنا اُردو کے لئے نقصان دہ ہے۔ ایک ہندو وزیر اعظم اگر شراب بندی کے لئے کوشاں ہے تو مسلمانوں کو تو خوش ہونا چاہئے کیونکہ اسلام میں تو شراب حرام ہے۔ مگر کیا ستم ظریفی ہے کہ ایک مسلمان شاعر جو خدا کے کرم سے مجتہد کہلاتے اور محرم کی مجالس میں مرثیہ خوانی کرتا ہے وہ شراب میں شرابور شراب کے حق میں اشعار سنا رہا ہے اور مسلمان ہی اُسے داد دے رہے ہیں۔ چاہیے تو یہ تھا کہ ناظر صاحب کو اٹھا کر بٹھا دیا جاتا تاکہ وہ ایسی خرافات جاری نہ رکھ سکتے۔ مشاعروں کے منتظمین اگر شعراء سے یہ پابندی کرانے پر مصر رہا کریں کہ شراب پی کر کلام سنانے کی

اجازت نہ ہوگی تو یقیناً شاعروں سے یہ جنت بہت جلد ختم ہو سکتی ہے
خدا شکر کے ناظرین کی نے مائیک چھوڑا ہے۔ اور اناؤنسر جناب انور جلالپوری
خود کلام سنا رہے ہیں۔ ارشاد ہوا ہے ؎

جو برسوں سے گئے اپنے آنسوؤں کو پی رہا ہوگا
ذرا سوچو کہ وہ انسان کیسے جی رہا ہوگا
میں کیسے مان لوں کل شب مرا گھر لوٹ لینے میں
جو سایہ میں بھی میرے ساتھ تھا وہ ہی رہا ہوگا

اس کے بعد انور صاحب نے ایک بہت اچھی غزل سنائی ہے جسے کسی وجہ سے میں نوٹ نہ کر سکا۔ صاحبِ صدر پوسف دہ بے تشریف لے جا چکے ہیں اور ان کی جگہ جناب ونود شنکر صاحب نے مسندِ صدارت سنبھال لی ہے اور انور صاحب نے شاد آفاقی سے کلام سنانے کو کہا ہے۔ شاد صاحب کا ترنم اچھا اور اشعار بھی مناسب۔ دو تین اشعار آپ بھی سن لیجئے ؎

ہر دل کو جو زیست نے بیکار کیا ہے ؛ انسان محبت کا چلن بھول گیا ہے
اللہ رے کیا حال زمانے کا ہوا ہے ؛ اپنوں پہ بھی غیروں کا گماں ہونے لگا ہے
شمعِ محبت ہے بجھی ہے نہ بجھے گی ؛ مانا کہ بہت تیز زمانے کی ہوا ہے

اب کوئی ذاکر صاحب مائیک پر آئے ہیں جن کے اشعار انتہائی معمولی نوعیت کے اور ترنم بھی بھدی کا یعنی جس آ فغانی کا۔
رومی دہلوی نے ملک بھر کے سیکڑوں مشاعروں میں کلام سنایا ہوگا اور ہر اناؤنسر نے ان کا تعارف بہتر سے بہتر انداز میں کرایا۔ مگر جس طرح انور جلال پوری نے آج ان کا تعارف کرایا ہے میں نے ایسا بہتر تعارف کسی شاعر کا کبھی بھی اناؤنسر سے نہیں سنا۔ رومی صاحب بھی پہلی مرتبہ سوائی مادھوپور میں آئے ہیں اس لئے انہوں نے بھی ایک پرانی غزل سنا کر اچھی داد پائی ہے۔
لیجئے اب شمیم جے پوری مائیک پر آئے ہیں۔ انہوں نے قطعہ سنایا ہے ؎

ہم غم سے سبکدوش نہیں تیری طرح
خوش خو ہی سے ہم آغوش نہیں تیری طرح
یہ بات بھی روشن ہے زمانے تجھ پر
احسان فراموش نہیں تیری طرح

قطعہ کے بعد اختر صاحب نے ایک نظم سنائی ہے جو دورِ حاضر سے تعلق رکھتی ہے۔ جو واقعی بہت اچھی نظم ہے اور سامعین داد بھی خوب خوب دی ہے
اب انور صاحب نے باقی ضیا پاوی سے کلام سنانے کی درخواست کی ہے۔ بڑے اچھے ترنم سے قطعہ سنایا ہے ؎

نشۂ عیش میں ہو تم تمہیں کیا معلوم
کیفیاتِ دلِ بے نور تمہیں کیا معلوم

داد بہت اچھی دی گئی ہے اور باقی صاحب فرما رہے ہیں ؎

پاس ہوتے تو مرے حال سے واقف ہوتے
تم تو مجھ سے ہو بہت دور تمہیں کیا معلوم
نظر آتا ہے مرے ہونٹوں پہ تبسم لیکن
دل ہے زخموں سے مرا چور تمہیں کیا معلوم
تم نے شبِ وعدہ تو ستارے ڈھکے
چاندنی ہو گئی بے نور تمہیں کیا معلوم

اس شعر پہ داد کا شور سامعین کے سخن فہم ہونے کی دلالت کر رہا ہے۔ اعلان ہوا ہے کہ اب جناب نظر ایٹوی کلام سنائیں گے۔ اس وقت سوا دو بجے ہیں۔ مشاعرہ گاہ شہر سے کافی فاصلہ پر ہے۔ اس لئے مقامی سامعین گھر جا چکے ہیں۔ اور بیرونجات سے آئے ہوئے سامعین ہی بیشتر تشریف فرما ہیں۔
نظر ایٹوی مائیک پر تشریف لائے تو سامعین کا ہجوم نہ پاکر شکایت کے لہجہ میں کہنے لگے کہ میں پہلی بار یہاں آیا ہوں۔ اور آپ ہی لوگ میرے حصہ میں آئے ہیں۔ ایک آواز آئی ہے کہ اگلا تو یہاں ٹونک کے بہت سے لوگ بیٹھے ہیں چونکہ نظر ایٹوی خوبصورت اور کم عمر ہیں۔ اس لطیف چوٹ کو وہ سمجھ نہیں سکے مگر جو حضرات اس چوٹ کو سمجھ گئے ہیں وہ زیرِ لب مسکرا رہے ہیں۔ اور نظر صاحب نے وہی پرانی اور مشہور غزل شروع کی ہے ؎

دنیا تو بھٹکتی ہے دن رات اندھیرے میں
دیکھے وہ ابھی میرے حالات اندھیرے میں

نظر صاحب یہ غزل راگ پہاڑی کے ترنم میں پڑھتے ہیں اور ہر مشاعرہ میں اس غزل کے طفیل کامیاب ہوتے ہیں ویسے یہ ایک حقیقت ہے کہ جو بھی غزلیں گیت پہلے فلموں کے لئے پہاڑی راگ میں لکھے گئے ہیں وہ سب پسند ہوئے ہیں۔ نظر صاحب کی اس غزل کو چوری کی غزل بتایا جاتا ہے علی گڑھ کے ندیم صاحب کا کہنا ہے کہ یہ غزل ان کی ہے۔ اور ان کے پاس اس امر کی صداقت میں دستاویزی ثبوت موجود ہیں مگر وہ پریشان ہیں کہ ان سب باتوں کے باوجود نظر ایٹوی اس غزل کو اپنی ملکیت سمجھتے ہیں اور اس غزل کے باعث ہی وہ مشاعروں کے شاعر گردانے جانے لگے ہیں۔ تاہم اگر نظر صاحب اس متنازعہ غزل کے بارے میں کچھ روشنی ڈال سکیں تو ان کے لئے بہتر ہوگا۔ یہ اعتراف کرنا ہوگا کہ نظر صاحب اس غزل کے باعث آج کے مشاعروں میں بہت زیادہ کامیاب ہے۔ اب اثر صاحب جمیل افغانی کا کلام

سُنانے کی استدعا کی ہے۔ چونکہ کلام بہت ہی عمدہ ہے [illegible]
ان کا ترنم سننے کے لئے مشاعروں میں شرکت [illegible] کا ترنم شاعروں
سے بہتر ہے۔ غزل جس میں [illegible] غزل ہوا ہی ہے

وحشت غضب آج قیامت ہو گئے
برہمی آئینہ تیرے گیسو بکھر گئے
پھر چشم انتظار نے دھوکا دیا ہمیں
وہ سامنے گزرے تھے نہ جانے کدھر گئے
لائیں کہاں سے ڈھونڈھ کر تصویر آپ کی
اب تو کتاب دل کے ورق ہی بکھر گئے
بار ہمیشہ دعوتِ پرواز دے گئی
ٹوٹے جب سے قفس سے پر و بال ہو گئے
گھر کی تلاش تھی جنہیں صحرا میں جا بسے
صحرا کی آرزو تھی جنہیں اپنے گھر گئے
اُن کے ہی مقبرے تو ہیں جنت نشان بھی
جو لوگ اپنی موت سے پہلے ہی مر گئے

جمیل کی غزل جتنی ہی اچھی ہے اُتنی ہی بے مزہ دلی ہے اب کوئی افضل چنگیزوی مائیک پر تشریف لائے ہیں۔ پرانی وضع کے بزرگ ہیں نہایت معمولی بلکہ کلام ہے جسے رسالہ دوال پڑھ گئے ہیں۔ تحت میں پڑھنا شروع کیا اور ختم ترنم سے کیا۔ معلوم کیسے کیسے مشاعروں میں نذر کئے گئے ہیں۔ اب اعلان ہوا ہے کہ ہلال سیوہاروی مائیک پر تشریف لا رہے ہیں۔ ہلال صاحب سوا دو بجے کے بعد تشریف لائے تھے۔ ان کو جیسے ارشاد ہوا ہے سے

تفتگو کسی کام ہے جس شخص سے پلٹ کر دیکھو
ایک ہی بات کے گھڑ رکھے ہیں افسانے دو
چودھری اب تو صلح کر لیں مسز کا نذر سے
خوف گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

جناب راج ناراین سے متعلق کہا ہے ہے

کوئی منزل ہے نہ جادہ نہ کوئی غزنہ سفر
لے کے اب گردش حالات کہاں جائے گی
اب انہیں فکر میں ہیں راجہ بھارت کے تمام
ذوالفقار علی ہے یہ بات کہاں جائے گی

جناب ہلال اگر غزل نہیں تو انہیں یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ بات ہیچ نہیں اسے

رات ہی [illegible] کرنے کا [illegible] کیا تھا
[illegible] نہیں [illegible] اس وقت سے [illegible]
صاحب [illegible] ہے

چودھری سے چھوٹ کر بادہ کش
رات بجلی کی طرح ہی قتل تھا
جب بن کے آج آئے پادر کشا
گول بالکل ہی اشارہ قتل تھا
ذیل کے کلام میں [illegible] صاحب پہ [illegible] ہے ہے
جاندنی کی شہروات میں کیا چیز ہے بلاف
واللہ حسن دھوپ کے قربان جائیے
بستر سے رات کو نہ نکلیے بار بار
بیمار مزاج کا کہنا مان جائیے

اس کے بعد یک جانی [illegible] نظم پنڈت نہرو کی آتما پرلک میں سنانی ہے۔ [illegible] ہلال [illegible] مشاعرہ۔ سامعین [illegible] [illegible] حسین ساحر [illegible] [illegible] جناب اخلاق احمد صاحب [illegible] کامیاب کیا ہے [illegible] یاد رکھیں گے اور [illegible] مشاعرہ ختم ہوا۔

تاثرات

مائل خیرآبادی

وہ قدر بھی ہیں خود یک جا ہیں، یہ کیسے کوئی بارِ یک نہیں
اک انکا دلیں ہے [illegible] ہم اپنی [illegible] ٹھیک نہیں

ہے بات تو جب مائل صاحب خود آپ کا پہلو بھی ہے سب
ورنہ تو سبھی کہہ دیتا ہے ٹھیک نہیں ہے ٹھیک نہیں

دل [illegible] ہے [illegible] گئی ہے
دنیا کا [illegible] بات ہے کوئی ٹھیک نہیں

[illegible] ہے
اُن کی خاطر [illegible] تو [illegible] ٹھیک نہیں

معیار کی کسوٹی پر

ہندوستانی مشرقی افریقہ میں (حصہ اول) مصنفہ کمال داس گپتا۔ قیمت دس روپے پچاس پیسے مجلد

[illegible] ان کی طرح [illegible] کا بھی جو قریب ہے جیسے [illegible] کی ہے۔

[illegible] کا پہلا انگریزی فہرست سے متعارف [illegible] ہے واس کا اہم سبب یہ ہے کہ اُردو میں [illegible] جن میں ہر ملک کے تاریخی حالات پر جو تحقیق کی گئی ہے ان کے مقالات [illegible] مختصر [illegible] یا اصل مختصر [illegible] پہنچ جاتے ہیں۔ مگر زمانے کا تقاضا یہ نہیں تھا جو قریب سے بیٹھ کر زمانے کی طرف دیکھ [illegible] ہیں کہ نہ صرف آنکھوں کا [illegible] ہوتا ہے بلکہ [illegible] مطالعہ، اور مشاہدہ دونوں لازمی ہیں۔ اور اُردو والے اس [illegible] کی فہرست بھی نہیں سمجھتے۔

کمال داس گپتا اُردو کے معروف محقق اور [illegible] شاعر ہیں۔ آپ نے اپنی عمر عزیز کا بیش قیمت حصہ مشرقی افریقہ میں گزارا ہے [illegible] میں [illegible] کے بعد آپ نے بمبئی میں اپنے وطن کے اوقات کا بیشتر حصہ [illegible] تحقیق و تصنیف کے لئے وقف کر دیا ہے۔

آپ کی زیر تبصرہ تصنیف "ہندوستانی مشرقی افریقہ میں" ایک اہم تصنیف ہے۔ اور اس کی یہ اہمیت موضوع کا [illegible] ہے۔ اُردو میں [illegible] کی حیات اور کارناموں کے تعلق سے بہت سے مقالات جزوی [illegible] افریقہ کے [illegible] کو مل جاتے ہیں لیکن وہ جزوی حیثیت رکھتے ہیں۔ مشرقی افریقہ کی حیثیت قطعی الگ ہے۔

زیر تبصرہ کتاب اس [illegible] مشاہدہ کی [illegible] ہے جو مصنف کے [illegible] ہے۔ مشرقی افریقہ میں ہندوستانیوں کا [illegible] کس طرح [illegible] کی سرزمین پر پہنچ کر قیام [illegible] ان [illegible] [illegible] کی [illegible] کس [illegible] تمام افراد کی [illegible] کے سامنے [illegible] ہیں۔ جغرافیائی [illegible] مشرقی افریقہ [illegible] ان کی [illegible] میں

[illegible] بہت [illegible] ہے۔ اس کے لئے ان کی [illegible] کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ [illegible] مشرقی افریقہ کی اس کہانی کو ثابت کیا ہے کہ ایسے [illegible] وطن کے [illegible] کے پیچھے کسی نہ کسی ہندوستانی فرزند کا سر [illegible] ہے۔

[illegible] ہے کہ مشرقی افریقہ کی موجودہ زندگی کے خاکے میں رنگ بھرنے کا کام ہندوستانیوں [illegible] کا اہم رہا ہے۔ یہ [illegible] یہاں کے سیاسی، ثقافتی، معاشی [illegible] میں بھی ہندوستانیوں کی بے لوث خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا [illegible] میں کہ ہندوستانی پیش پیش نظر آتے ہیں۔ (جس کا تفصیلی مطالعہ مصنف کی اگلی تصنیف سے ہو سکے گا)

[illegible] یہ کتاب محض اپنی یادداشت و مشاہدات کی بنیاد پر تصنیف نہیں کی [illegible] بلکہ مشرقی افریقہ سے متعلق اہم کتابوں کا بھی مطالعہ کیا ہے اور ان کے حوالے دیئے [illegible] ان کتابوں کے مطالعہ سے اس حقیقت پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ مشرقی [illegible] تہذیب و تمدن کی راہ پر باوجود بر اعظم کے زمینی جغرافیائی اختلافات [illegible] [illegible] تہذیب نے [illegible] ہیں۔ اور یہ ہندوستانی مشرقی افریقہ [illegible] تعمیر [illegible] ہیں۔ یہ سب کچھ ایک دن میں نہیں ہوا ہے بلکہ اس کے لئے [illegible] [illegible] کیا کچھ [illegible] اس کا اندازہ اس کتاب سے کیا جا سکتا ہے۔ [illegible] [illegible] کو [illegible] سے پیش کیا گیا ہے [illegible] میں اضافہ ہوا ہے۔

اس موضوع کی کتابیں اُردو میں مفقود ہیں۔ مصنف نے اس کی کوشش [illegible] [illegible] کیا ہے اور اسے [illegible] کرنے کی کوشش کی ہے نیز [illegible] [illegible] [illegible] کر روشنی کی ہے۔ تاکہ اُردو [illegible] [illegible] [illegible] ہے باہر آسکیں۔ بلاشبہ یہ کتاب [illegible] [illegible] ہے اس کتاب کی ایک [illegible] [illegible] ہے [illegible] [illegible] [illegible] حکومت [illegible] کی [illegible] نے اس کتاب کو [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] کتابت بھی [illegible] ہے۔ [illegible] [illegible] (د۔ م)

حضرت نجم آفندی کی ہندی شاعری

رفیق ہند دہلوی

ہندی کے معتقد ہیں۔ متاخرین اور دورِ حاضر کے مسلمان شعراء میں سیکڑوں ایسی روادار۔ صلح کل۔ وسیع المشرب۔ انسان دوست۔ بلند نظر اور فراخ دل ہستیاں ہیں جو بیک وقت اردو۔ فارسی اور ہندی میں شعر کہہ کر جہاں اردو فارسی کی خدمت کو اپنا فرض سمجھتی ہیں وہاں ہندی ادب کو بامِ عروج پر پہنچانے کے لئے بھی سعی بلیغ اور کوشش جزیل سے کام لے رہی ہیں۔ ان صاحب دل حضرات میں حضرت نجم آفندی اکبرآبادی خاص مقام اور شہرت کے مالک ہیں۔

آپ کا اسم گرامی مرزا تجمل حسین۔ نجم تخلص کبھی کبھی تجمل تخلص بھی فرماتے تھے۔ آفندی خاندانی خطاب۔ باعتبارِ قومیت مغل۔ آپ کا وطن اور مقام ولادت ارضِ تاج (اکبرآباد) ہے۔ والد ماجد مرزا عاشق حسین صاحب مرحوم جو مرزا فصیح مرحوم کے پوتے تھے۔ جن کا شمار قدیم مرثیہ گو اساتذہ میں ہوتا ہے۔ تاریخ ولادت کا علم نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ راقم الحروف کو [illegible] میں آپ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ اُس وقت آپ کی عمر [illegible] سال تھی [illegible] میں بمقام ریاست محمود آباد ملازمت شروع کی اور مہاراجہ محمود آباد کے نواسے کے اتالیق مقرر ہوئے۔ پھر سلسلۂ ملازمت حیدرآباد میں مقیم ہو گئے۔

شعر و شاعری کا فن چار پشتوں سے آپ کو ورثہ میں ملا ہے۔ خاندانی شاعر ہونے کے علاوہ اوائل عمری سے جہاں جہاں قیام رہا ماحول شاعرانہ ہی ملا عرصہ دراز تک دہلی کے قریب غازی آباد میں مقیم رہے۔ جہاں آپ نے پہلا آل انڈیا مشاعرہ منعقد کیا۔ ہندوستان میں ایسا شاندار مشاعرہ اس وقت تک نہیں ہوا تھا۔ زمانہ قیام اترپردیش میں آپ نے دہلی۔ میرٹھ۔ ہاپڑ۔ لکھنؤ۔ ردولی اور دیگر بیشتر مقامات پر مشاعروں میں شرکت کی۔ آپنے اُس دَور کے مشاہیر اساتذہ شعراء اور ادباء کی آنکھیں دیکھی ہیں۔ اور ان سے تبادلہ خیالات کا موقع ملا ہے۔ آپ کو اس بات کا فخر ہے کہ آپ نے یادگار مومن و تسلیم منشی امیر اللہ تسلیم کے ساتھ مشاعرہ پڑھا ہے۔

آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے جلسوں میں چار پانچ سال تک بڑی معرکہ آرا قومی نظمیں پڑھیں۔ مذہبی مشاعروں میں آپ نے ایک خاص انقلاب پیدا کیا۔ تضمینوں کے لئے ایک نئی شاہراہ بنائی۔ اپنے ممدوح کے اسوۂ حسنہ کو تاریخی اعتبار سے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ المیہ کربلا سے متعلق آپ کی نظموں اور نوحوں نے وہ مقام پیدا کیا جو حضرت انیس کے بعد شاید کسی کو حاصل ہوا ہو۔ اس سلسلے میں آپ کو شاعر اہل بیت کا خطاب دیا گیا جس طرح کربلائی ادب میں آپنے جذبات کو ابھارنے اور اخلاق کو سنوارنے کی کوشش کی ہے۔ اسی طرح غزل میں بھی مقصدی شاعری پر زیادہ زور دیا ہے نثر میں بھی آپ نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ آفاقی کے سلسلے میں اپنی تصنیفات نظم و نثر کے ذریعہ بڑی خدمت کی ہے۔

اردو شاعری کے علاوہ آپ ہندی کے بھی ممتاز شاعر ہیں۔ آپ نے اپنے زمانہ تعلیم میں اسکول میں کچھ ہندی پڑھی تھی اس کے بعد غازی آباد میں اپنے ایک دوست بابو منداین سے ہندی زبان میں اچھی قابلیت حاصل کی۔ کبیر داس اور تلسی داس کے کلام کا مطالعہ گہری نظر سے کیا اور ہندی میں خود بھی کہنے لگے۔ ہندی شاعری سے متعلق آپ کا انکسار دیکھئے کہ اپنے ہندی کے پہلے مجموعہ کلام "پریم بھگتی" کے دیباچے میں کمال صاف دلی اور منکسر المزاجی کے ساتھ یوں رقمطراز ہیں۔

"مجھے اپنی ہندی شاعری کی صحت و سلامتی پر کوئی بھروسہ نہیں۔ اگر میرا نام ہندی شعراء میں شامل کر لیا جائے تو مجھے بڑا تعجب ہوگا۔ کیونکہ اردو گھٹی میں بچپن سے ہے۔ گویا میرے خون میں ملی ہوئی ہے۔ چار پیڑھی سے یہی اُس کا مایہ ہے۔ اُردو شاعری کے کارن ہندی کو جلنے کا موقع پیدا ہو گیا۔ کیونکہ نقش کو بڑا اور پارتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے اُردو زبان کے کئی ہی بے تحاشہ شاعر دیکھے ہیں۔ اُن کا ساری حال برا ہی ہے۔ میں ہندی بھاشا کا ان پڑھ کوی ہوں۔ مجھے بھروسہ نہیں کہ میں نے ٹھیک کہا ہے۔ اور وہ اس چھوٹی سی پستک میں آپ کے سامنے ہے۔ ہندی بول چال اور ہندی کو اس کے کارن میں ٹھیک ٹھیک۔ اثر سے گا۔ میں نے تو اپنے من کی پیاس بجھائی ہے۔"

(وزیر گنج لکھنؤ) ۵ رمئی [illegible]

اس کے علاوہ اسلام پاکی، کربلا کی، وغیرہ کتابیں ہندی کی کتابیں لکھیں۔ نمونۂ کلام ہندی ملاحظہ ہو۔

من کی جھولی

من کی جھولی بھرو سے داتا من کی جھولی بھرو سے۔

داتا تیری دیا نرالی
پھول بھرے ہیں ڈالی ڈالی
میرے من کی گود ہے خالی ۔۔۔۔ من کی جھولی بھر دے داتا من کی جھولی بھر دے
تاروں سے آکاش سجایا
انگاروں سے نرک بسایا
پریم سندیسا ادھر نہ آیا ۔۔۔۔۔۔۔ داتا من کی جھولی بھر دے
سانجھ سکارے سنت دوپہری
گھڑی گھڑی پل پل آس ابھری
من کی جھولی بہت سے گہری ۔۔۔۔۔۔۔ داتا من کی جھولی بھر دے

رَینا بیتی جائے سہیلی

رَینا بیتی جائے سہیلی رَینا بیتی جائے
پریم کہانی کہو البیلی جب تک ساجن آئے ۔۔۔۔۔ سہیلی
کوئل کی سی کوک لگا دے ۔ پیت کی کوئی بات سُنا دے
مکھڑے نکلیں بول رسیلے من سے نکلے ہائے ۔۔۔۔۔ سہیلی
تجھی کون یہ جیتا جانے کوئی برہ کا دُکھ کیا جانے
بادل جیسی رین میں جیسے بجلی سی لہرائے ۔۔۔۔۔ سہیلی

دونوں گیت کس قدر روانی سلاست، فصاحت اور ملاحت کے حامل ہیں۔ "من کی جھولی بہت ہے گہری!" "پریم کہانی کہو البیلی" کے ٹکڑے شاعری نہیں بلکہ ساحری ہیں۔ اس مصرع کی نفاست اور بلاغت قابلِ صد ہزار تحسین ہے "مکھڑے نکلیں بول رسیلے من سے نکلے ہائے" "بادل جیسی رین میں جیسے بجلی سی لہرائے" اس مصرع کی تمثیل نگاری تلسی داس کے کلام کی یاد تازہ کر رہی ہے۔ گیت پڑھ کر خالی الذہن نہیں کر سکتا کہ ہندی کا یہ شاعر اردو کا بھی جادو نگار شاعر ہو گا نہیں ہیں "پریم کی ہنسی" کے عنوان گیت ملاحظہ ہو۔

پریم کی ہنسی

من میں باجی پریم کی ہنسی جھوم اُٹھو ساجن ۔ ساجن جھوم اُٹھو سنسار
دیپک جھوم رہا ۔ بہ جھومے ۔ پریم کے سب متوالے جھومے
ساون رُت کا بادل جھوما ۔ برسے امرت دھار ۔۔۔۔۔ ساجن
من آنگن میں آج اجالا جھوما ۔ جھن جھن کا ۔۔۔ جھوما ۔ رنگ روپ کے پھول جھومے چمکے تارے جھومے ساجن
من میں پریم کی بینا جھومی ۔ پریت کی ساری دنیا جھومی ۔ پریم میں جھومو پیار پریم کا جیون پار ۔۔۔ ساجن

جھومنا مصدر کو کتنے مختلف انداز سے بیان کیا گیا ہے ۔ یہ امر شاعر کی قادر الکلامی اور استادی کا ثبوت ہے ۔ پھر ہر مصرع میں محاکات کا رنگ بھر کر کلام کو پرتاثیر اور مقتضائے حال کے مطابق بنا دیا ہے ۔ پہلا شعر کس قدر پیارا ۔ کس قدر اچھوتا اور کس قدر حقیقت آمیز ہے یہ اہلِ نظر ہی جانتے ہیں ۔ پریت کی ساری دنیا جھومی اس ٹکڑے کی داد کما حقہ دی نہیں جا سکتی ۔ پھر لطف یہ کہ ہر لفظ اپنی جگہ نگینے کی طرح اس طرح جڑ دیا گیا ہے کہ دوسرا لفظ وہاں وہ شان نہیں دکھا سکتا۔

ناظرین گیت کی فضاؤں سے مسرور ہو چکے اب ذرا انجمی صاحب کے دوہے ملاحظہ ہوں ۔ ہر دوہے میں وعظ و نصیحت کے دریا بہا دیئے ہیں ۔ ہر دوہے کا عنوان مقرر کیا ہے۔

ایک اکیلا

پردے بھیتر ایک ہے رَب کہئیے یا رام
جو بھی جپے پریم سے سو ہی میٹھا نام

پریم پوتھی

من کو دیکھا چیر کے پایا ست بسرام
پوتھی کھولی پریم کی ایک تمہارا نام

پریم کی چوٹ

بجلی چمکی پریم کی چمچماتی اوٹ
منہ اُترا نیناں چڑھے گہری لاگی چوٹ

مصرعِ ثانی میں اُترنا اور چڑھنا کا اجتماع پھر محاورہ کی صورت میں قابلِ صد داد ہے

پریم چاندنی

جب جاؤں جگ چاندنی آنے والا آئے۔
سورج ڈوبا شام ہوئی ۔ جی ساڈو بلجائے

من کی چوپڑ

بنسے من کی چوپڑ سے لڑیں دھرم کی ٹیک
مذہب جگ میں سیکڑوں ۔ مالک سب کا ایک۔

مندر مسجد

مندر مسجد جا کے کرسیوک چھوڑیں جنگ
گھر دور سے دور کر دے۔ مالک دیکھیں رنگ

ہندو مسلم گنتی

متوالے ہیں تھوڑے سب گنتی کا ہے گنائیں ÷ جا دن ہم تم مل گئے بہو گنتی ہو جائیں

ہندی اردو

ہندی اردو میل ہے جیوں سمجھوا میں باس ÷ کس کو انگ لگاتے کے کس کو دیں بن باس

ہندی اردو پر جھگڑنے والے تنگ دل حضرات اس دوہے کو پڑھیں اور اس سے سبق حاصل کریں کہ دونوں زبانوں کی اصل ایک ہے کس کو اپنایا جائے اور کس کو ترک کیا جائے۔ گویا دوہا نویس نے کتنی فراخ دلی کیساتھ ایک حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے

لیڈری کی ریل پیل

تن چاہت کا کس نہیں من آدھن کی کھان ÷ تن کے گھر کی لیڈری جن کی چلے زبان

مالک کے چور

ان یہ سنسار کی دیکھی جہاں پہچان ÷ جان بچائیں مرنے سے کبھی گرو کے چور

پرم بھگتی

پریم بھگتی اس کرائی جیسی برکھا کی دھوپ ÷ سبھی کس ڈھب دیکھئے چندر سمان روپ

برکھا رت میں بارش ہو چکنے کے بعد جب دھوپ نکلتی ہے تو وہ انتہائی تیکھی، تیز اور شدت آب رتی ہے۔ شاعر نے پریم بھگتی کی شدت اور تیکھی کو برکھا رت کی دھوپ سے تشبیہ دے کر حقیقت نگاری کا مرقع پیش کیا ہے۔

پریم ساگر

اگر گہرا پریم کا۔ اور ملے نہ چھور ÷ ایک نئے (تقدیر) تقدیر سے ڈوبیں لاکھ کروڑ

جگ کا دکھ

ہوئے ست کارے جیب دکھ جی کو چھونے ÷ بھی کہیں پریم سے بڑا نہ مانیں کوئے

ہندو مسلم

ہندو مسلم ایک ہیں کبھو نہ جانو دوئے ÷ رشتے جوڑے آپس میں قوم سپاہی ہوئے

پریم کوی

مایا سب کو چاہتی مایا کوی ہزار ÷ بھی کوئی پریم کے ان کا کون شمار

بنسی والا

گوکل تے بنسی بجی پریم سے بکھیے راگ ÷ رادھا دوڑی پوچھیں لالہ کے من میں جو لگی آگ

الٹی ریت

ندیا تیرے پیو کو سندری گلے لگاون آئی ÷ پیو بہروپ دھیرج کہاں اٹھ گلے لگائی

کوی

ہندی اردو، فارسی سب ہی کچھ کہہ لائیں ÷ پریم شبد جانیں نا ہیں رہے کوی کہلائیں

بھی صاحب نے اپنے کلام میں محبت۔ انسانیت۔ رواداری۔ قومی یکجہتی۔ امداد باہمی۔ صلح جوئی۔ امن پسندی۔ وسیع المشربی۔ فراخ دلی۔ بلند نظری۔ خدا پرستی اور عبادت کی تلقین کرتے ہوئے اخلاق حسنہ کو حیات انسانی کا مدار المہام اور اعلیٰ جوہر ثابت کیا ہے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا انکشاف حسن عمل اس امر انتظری کے دور میں سکون قلب انسانی اتحاد عالم اور راحت بخش زندگی کا موجب ہے۔ ایسی ہی شائستہ و شستہ شاعری کی نسبت کہا گیا ہے کہ "شاعری جزو یست پیمبری"

دوہوں اور گیتوں کے علاوہ طویل ہندی نظمیں بھی آپ نے کہی ہیں۔ چنانچہ اسلامی تاریخ کو "اسلام پوتھی" کا نام دے کر ہندی نظم کا جامہ پہنایا ہے۔ چند اشعار سنیئے اور داد دیجئے۔

اللہ باد سے اِسے آکاش کی بانی	کبھی مجھے بھاشا میں ہے اسلام کہانی
سچائی کی شکتی کا سبا کا نج ہے اسلام	سمجھے جو کوئی تو جیتا راج ہے اسلام
چمکا جو رب دیش کی قسمت کا ستارا	کرتار نے آکاش سے ایک نور اتارا
کیا جانئے کس بھیس میں کس روپ میں آیا	سنتے ہیں کسی آنکھ نے دیکھا نہیں سایا
دنیا کو بدلنے کا چلن سوچ رہا تھا	انسان کی مکتی کے جتن سوچ رہا تھا
دُبدا میں رہا تھا یہ جہاں ابھی من میں	پیدا ہوا ایک بھاؤ یا من کی لگن میں

اسی طرح کربل نگری میں شہیدان کربلا کے رقت خیز اور ماتم آمیز حالات انتہائی پُر درد انداز سے ہندی بھاشا میں نظم کئے ہیں۔

رتن پنڈوری

مقام پنڈوری۔ ڈاک خانہ گھان - ضلع گورداسپور (پنجاب)
143514

نئے چراغ

توصیف الٰہی ساقی۔ بی۔ اے۔ گیلانی

چاندنی سے زندگی کی یہ دُنیا سجائیں ہم
ہر گوشۂ حیات کو جنت بنائیں ہم
تاریکیاں الم کی مٹا کر دکھائیں ہم
نورِ پرتو سے بزمِ جہاں جگمگائیں ہم
آؤ نئے چراغ جہاں میں جلائیں ہم

ہر سُو فضائے دہر میں اب بھی ہے تیرگی
انساں کے قلب پر ہے ابھی تک فسردگی
اب تک بجھی بجھی سی ہے ہر سمت زندگی
ہر ظلمت کدہ کو نورِ طرب کر دکھائیں ہم
آؤ نئے چراغ جہاں میں جلائیں ہم

راہِ حیات میں ابھی تاریکیاں سی ہیں
فکر و نظر پہ آج بھی کچھ بدلیاں سی ہیں
انساں کے قلب میں ابھی کچھ سختیاں سی ہیں
رمزِ حیات اہلِ جہاں کو بتائیں ہم
آؤ نئے چراغ جہاں میں جلائیں ہم

مرجھائے فصلِ گل میں ہے رنگِ خزاں ابھی
گلشن میں محوِ رقص ہے برقِ تپاں ابھی
پُر وحشت ہے فضائے چمن میں دھواں ابھی
دُنیا کو پھر بہار کا عالم دکھائیں ہم
آؤ نئے چراغ جہاں میں جلائیں ہم

محنت کشوں کی آنکھ میں اب تک ہیں اشکِ غم
ہے "دستِ زر" میں آج بھی تقدیر کا قلم
اب تک بھی لڑکھڑاتے ہیں انسان کے قدم
عیش و طرب کے راگ نئے گنگنائیں ہم
آؤ نئے چراغ جہاں میں جلائیں ہم

صہبا کا دور اب بھی نہیں میکدوں میں عام
رندوں میں کشمکش ہے ابھی تک بفکرِ جام
"دیوانگی" کا آج بھی "ہوش و خرد" ہے نام
بھٹکے ہوؤں کو راہ پہ لا کر دکھائیں ہم
آؤ نئے چراغ جہاں میں جلائیں ہم

تاریکیٔ حیات کو نورِ سحر کریں
خاکِ وطن کے ذروں کو رشکِ قمر کریں
آؤ قدم کو اور ذرا تیز تر کریں
ہر گام کو حیات کی منزل بنائیں ہم
آؤ نئے چراغ جہاں میں جلائیں ہم

عید سے خطاب

اخلاق سہسوانی

اے پیامِ انبساط و لُطف اے روزِ سعید
اے مسرت کی نمودِ صبح، اے تقریبِ عید
اے مُرقعِ لطف، اے گہوارۂ عیش و نشاط
کیف و سرمستی کی دُنیا کاروانِ انبساط
واقعی ہیں تجھ سے وابستہ ہزاروں راحتیں
اپنے دامن میں تو بھر لاتی ہے صد ہا مسرتیں
لیکن اے روزِ سعید! اپنا پس منظر تو دیکھ
آج بھی چھایا ہوا ہے جن پہ غم وہ گھر تو دیکھ
صرف تو سرمایہ داروں کو خوشی کی لہر ہے
اور غریبوں کے لئے ایک طنز ہے اک قہر ہے
عید اطمینان اور آسودگی کا نام ہے!
غرق ہیں جو غم میں اُن کو عید سے کیا کام ہے؟
تیری آمد سے تو اُن کا تازہ ہو جاتا ہے غم
تیری آمد سے چھلک پڑتی ہے ان کی چشمِ نم
اک طرف عیش و مسرت، شادمانی، قہقہے
اک طرف حرماں نصیبی، رنج و غم کے مرحلے
اک طرف ہے پُر تکلف خوانِ نعمت سامنے
اک طرف روٹی کے کچھ ٹکڑوں کی حسرت سامنے
اک طرف ہر لب پہ ہے شورِ مُبارک بادِ عید
اک طرف ہے بھوک اور افلاس سے ہستی پلید
تُو نے دیکھا ہے یہاں آ کر کبھی یہ تجزیہ؟
دیکھ یہ بھی دیکھ ہو تجھ میں جو اتنا حوصلہ

کاش اے عیدِ سعید! ایک بار تو آ جائے یوں
سب کو مل جائے مسرت سب کو مل جائے سکوں

پیغامِ عید

(توصیف علوی ماہی کیرانوی)

راحتِ قلبِ جہاں ہو نامِ عید
ہو نشاطِ زندگی انعامِ عید
غم کے لمحے بھی بنیں ایامِ عید

آدمی کو درسِ قرآنی ملے
زندگی کو ذوقِ تابانی ملے
ظلمتوں کو نورِ ایمانی ملے

بزمِ ہستی میں گردشِ جامِ عید
ہو مئے عرفاں کا حامل جامِ عید
ہے حقیقت میں یہی پیغامِ عید
ہے حقیقت میں یہی پیغامِ عید

نشۂ الفت سے دل مخمور ہو
نورِ حق سے زندگی معمور ہو
تیرگی قلب و نظر سے دور ہو

زندہ سنت ہو خلیل اللہ کی
روحِ تازہ ہو ذبیح اللہ کی
ہو تجدید عظمت حبیب اللہ کی

شادمانی کا امیں ہو جامِ عید
ہو تربیت کا امیں ہر جامِ عید
ہے حقیقت میں یہی پیغامِ عید
ہے حقیقت میں یہی پیغامِ عید

ہو جبینِ شوق وقفِ بندگی
ہر نظر میں ہو نئی تابندگی
قلبِ انساں کو ملے آسودگی

ہو جہاں میں عام فیضانِ حیات
ہو ہر اک انساں کو عرفانِ حیات
چاک ہو کوئی نہ دامانِ حیات

کیف سے لبریز ہو ہر جامِ عید
جوڑ دے ٹوٹے دلوں کو جامِ عید
ہے حقیقت میں یہی پیغامِ عید
ہے حقیقت میں یہی پیغامِ عید

درس دنیا کو ملے ایثار کا
ہو نمونہ آدمی کردار کا
زندگی پیکر بنے اک پیار کا

ایک ہو آوازِ ناقوس و اذاں
ایک ہو دیر و حرم کی داستاں
ایک ہو شیخ و برہمن کی زباں

جامِ الفت بن کے چھلکے جامِ عید
یکتا کا ہو نشاں ہر جامِ عید
ہے حقیقت میں یہی پیغامِ عید
ہے حقیقت میں یہی پیغامِ عید

زندگی ہو وقفِ تسلیم و رضا
ہر قدم ہو عاملِ ماہ و دعا
ہو ہر اک گوشہ میں رحمت کی فضا

جامِ دنیا کے لئے ہو جامِ عید
ہے حقیقت میں یہی پیغامِ عید

"ترقی"

(دلکش آفریدی)

نرس بولی اپنے ایک بیمار سے
بازآ ذرا عشق کے آزار سے
مرتبہ کیا ہے بڑا تم جان لو
نرس کہہ کر مجھ کو مت آواز دو
نرس کل تھی آج سسٹر ہوگئی
اب ترقی میری میٹرن ہوگئی
نرس کا بیمار بولا مرحبا
گر ترقی کا یہی عالم رہا
تم یقیناً درد سر ہو جاؤ گی
کل کو سسٹر سے صدر ہو جاؤ گی

غزل

امتیاز سپے پوری (احمد آباد)

مرنے کے بعد قبر کو میری سنوار کر
کیوں رو رہے ہو جسم کے زیور اتار کر
مجھ کو میرے مزار کی مٹی عزیز ہے
پھولوں کی چادروں سے نہ میرا سنگھار کر
جب دے رہا تھا پیار تو ٹھکرا دیا مجھے
اب کیوں لگے ہو قبر پہ دامن پسار کر
زندہ تھا جب تو چین نہ تھا تجھ کو دو گھڑی
لا قبر میں نہ مجھ کو بے قرار کر
[illegible]
[illegible]
دلہن بنی تھی موت تو ڈولا بنا تھا میں
نکلا تری گلی سے میں تجھ کو پکار کر
تجھ کو کہے گا آج سے کچھ بھی نہ امتیاز
اے جانِ انتظار نہ تو انتظار کر

مفتون کوٹوی

دیوالی

(قطعات)

ہے ضیا پاش آج دیوالی .... دل بھی روشن نگاہ بھی روشن
عشق کی بارگاہ بھی پُر نور .... حسن کی جلوہ گاہ بھی روشن

کیا چراغاں ہے کیا فروغِ جمال .... روئے روشن سے چار چاند لگے
مہ جبینوں کا عکس پڑتا ہے .... ان دیوں میں ہزار چاند لگے

نور پاش آسماں ہے تاروں سے .... قمقمے ہیں زمیں پر روشن
روشنی قلب تک پہنچتی ہے .... شرط یہ ہے کہ ہو نظر روشن

بات کہتا ہوں اک صفائی سے .... بام و در بھی ہیں صاف دل بھی صاف
دن ہے بچھڑے ہوؤں کے ملنے کا .... کیجئے گا ہم قصور معاف

نورِ دل سے ہے نور چاروں طرف .... نورِ دل ہی سے یہ چراغاں ہے
وہ دیا ہو کہ چہرۂ روشن .... نورِ باطن ہی سے درخشاں ہے

قلب پر تیرے کاش روشن ہو .... ان دیوں سے مرا پیام تجھے
ایک مدت سے ہیں جدا ہم لوگ .... پہنچے اے دوست اب سلام تجھے

تجھ کو اللہ روشنی بخشے .... دل بھی روشن رہے نظر کی طرح
ہے خدا سے دعا یہ مفتوں کی .... تو چمکتا رہے قمر کی طرح

عیدِ قرباں

مفتون کوٹوی

بشر کا جزوِ لاینفک ہے شر بھی ‖ ہے یوں مجبورِ شر دُنیا میں انساں
ہوس کی آندھیاں چاروں طرف ہیں ‖ انہیں میں ضو فگن ہے شمعِ ایماں
ضیائے دیں سے تابانی ہے اس میں ‖ ضیائے دیں سے حاصل ہے چراغاں
میسّر یہ نہ ہو تو زندگی کا ‖ کوئی پہلو نہیں رہتا دُرخشاں
رضا، ایثار، قربانی، محبت ‖ خلوص اور صدق ہیں اجزائے ایماں
ہوس، ظلم و ضلالت جور و فتنہ ‖ یہ کیا ہیں؟ شعبہ ہائے کفر و طغیاں
بشر ان میں اگر ڈوبا رہے گا ‖ کبھی ہوگا نہ دل اس کا فروزاں
جب ان کے ترک پہ مائل ہوا دل ‖ رجوعِ حق ہوا جب قلبِ انساں
یہی ایثار ہے جس و محبت ‖ یہی رُجحان ہے عنوانِ ایماں
نہ خون و گوشت کی حاجت خدا کو ‖ نہ وہ ایثار مال و زر کا خواہاں
اگر صدق و خلوصِ دل نہیں ہے ‖ تو یہ صدقہ یہ قربانی ہے بے جاں
اگر ہو صدقِ نیت اس میں شامل ‖ تو پھر وجہِ فلاحِ نوعِ انساں
ہے قربانی رضا جوئی خدا کی ‖ ثبوت اس کا کہ چمکا نورِ ایماں
دماغ و عقل پر چھائے محبت ‖ ہوا دل شر و عصیاں سے گریزاں
حصولِ خیر بھی ہو ترکِ شر بھی ‖ اگر اس رسمِ قربانی کا عنواں
تو پھر نظریں ہیں روشن دل منور ‖ بشر ہے با مراد و گل بہ داماں

مبارک ہو یہ روزِ شادمانی
حقیقت میں یہی ہے عیدِ قرباں

پیغام عید

راہی شہابی
(جے پور)

خدا نے خیر کا خاطر کیا انسان کو پیدا
تبھی تو اشرف المخلوق کا بخشا اسے درجہ
نہ ہو انساں کبھی نفرت کی جانب بھول کر مائل
محبت اس کے دل کی دھڑکنوں میں کی گئی شامل
جسے انسانیت کہیے وہ دولت لے کے آتی ہے
ہمیشہ عید پیغام محبت لے کے آتی ہے
ازل کے دن سے نفرت صرف حیوانوں کا شیوہ ہے
محبت آدمی کے جبیں میں رحمت کا نوشتہ ہے
جو نفرت آگ ہے سیلاب ہے۔ طوفاں ہے آفت ہے
محبت امن ہے عزت ہے۔ راحت ہے۔ مسرت ہے
جو نفرت تیر ہے۔ تلوار ہے۔ نیزہ ہے۔ خنجر ہے
محبت پھول ہے۔ شبنم ہے۔ موتی ہے۔ سمندر ہے
جو نفرت چلچلاتی دھوپ ہے صحرا کی ہستی میں
محبت اک رو پہلی چاندنی ہے دل کی بستی میں
جو نفرت بستیاں برباد کرتی ہے بلا بن کر
محبت خشک کھیتوں پہ برستی ہے گھٹا بن کر
جو نفرت ظلم کا بہتا ہوا پُرشور دھارا ہے
محبت بے کسی و کمزور لوگوں کا سہارا ہے
جو نفرت ظلم کے واروں سے تڑپانا سکھاتی ہے
محبت دوسروں پر رحم فرمانا سکھاتی ہے
جو نفرت بن کے آندھی اخوت کی شمعیں بجھاتی ہے
محبت آدمیت کے چراغوں کو جلاتی ہے
جو نفرت آدمی کو موت کا پیغام دیتی ہے
محبت زندگانی کا چھلکتا جام دیتی ہے
جو نفرت کا پجاری گلستاں برباد کرتا ہے
محبت کا پجاری اجڑے گھر آباد کرتا ہے

جو نفرت ماؤں کی گودوں سے بچے چھین لیتی ہے
محبت دلہنوں کی مانگ کو سیندور دیتی ہے
جو نفرت بربریت اور ستم کی ایک ڈوری ہے
محبت ماؤں کی ممتا بھری رنگین لوری ہے
کبھی انسانیت پر جب کوئی الزام آتا ہے
محبت کا پجاری صرف اس کے کام آتا ہے
نہ ڈرتا ہے نہ وہ پروائے مال و جان کرتا ہے
محبت کا پجاری زندگی قربان کرتا ہے
وہ گھر کر آگ کی لپٹوں میں حق کے گیت گاتا ہے
کہ چڑھ کر دار پر بھی شان سے وہ مسکراتا ہے
کبھی وہ رام ہو کر پیکرِ ایثار بنتا ہے
شہید کربلا کا آہنی کردار بنتا ہے
کبھی مثلِ خلیل اللہ ہے شعلوں کے سمندر میں
کبھی سُولی پہ چڑھ جاتا ہے وہ عیسیٰ کے پیکر میں
جبھی تو ہم محبت کو خدا کی دید کہتے ہیں
اسی کو دوسرے الفاظ میں ہم عید کہتے ہیں
مئے انسانیت کا آدمی کو جام دیتی ہے
ہمیشہ عید انسانوں کو یہ پیغام دیتی ہے
کہ اٹھو فرقہ بندی کے نشانوں کو مٹا ڈالو
بڑھو اور نفرتوں کی ساری دیواریں گرا ڈالو
جو پیاسے ہوں مئے الفت انھیں پینے کا موقع دو
جیو اور دوسرے لوگوں کو بھی جینے کا موقع دو
جو ہوں افسردہ ان ہونٹوں کو تم طرزِ تکلم دو
وہ جن کی مسکراہٹ چھین لی ان کو تبسم دو
سبق انسان کو یہ عید دیتی ہے قرینے سے
جو دشمن ہوں لگا لو آج انھیں بھی اپنے سینے سے

جنّت کا مُشاعرہ

(جناب سید مظفر حسین برنی، آئی اے ایس، ممبر بورڈ آف ریونیو کٹک اڑیسہ)

عنوان نہ صرف دلچسپ بلکہ حیرت انگیز بھی ہے۔ مجھے اس مشاعرہ میں مہمان خصوصی کے طور پر مدعو کیا گیا ہے۔ اول تو میں ابھی جنت میں جانے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ بقول جذبیؔ ــــہ

اُف یہ رنگین، پُر اسرار فضاؤں کے محل
ایسے دو چار محل اور بنا لوں تو چلوں

کبھی ط

عالمِ ضعیف میں بھی شباب کی باتیں

یہ آسمان یہ زمین	نظارہ ہائے دلنشین
انہیں میں چھوڑ دوں نہیں	ہے موت اس قدر قسین
مجھے نہ آئے گا یقیں	نہیں نہیں ابھی نہیں

ابھی تو میں جوان ہوں

میں مُردوں کی دو قسمیں کرتا ہوں ایک وہ جو جوان ہیں اور دوسرے وہ جو اتنے جوان نہیں! میں اپنا شمار دوسری قسم میں کرتا ہوں جب ریاضؔ خیرآبادی لکھنؤ آئے تو انھوں نے کہا ــــہ

ریاضؔ! لکھی تھی قسمت میں بازگشتِ شباب
جوان ہونے کو پیری میں لکھنؤ آئے!

مصرعہ ثانی میں لکھنؤ کی جگہ کٹک پڑھ لیجئے تو میرے حسبِ حال ہوگا۔ اگرچہ سکتہ پڑے گا لیکن یہ سکتہ تو بہر عنوان لکھنؤ اور کٹک میں ضرور پڑے گا۔ خیر لیجئے اس شعر کو یوں پڑھ لیجئے ــــہ

جناب! لکھی تھی قسمت میں بازگشتِ شباب
جوان ہونے کو دلی سے ہم کٹک آئے

میں یوں بھی جنت میں جانے کا اہل نہیں کہ میرا نام گناہ گاروں میں سرِ فہرست ہوگا۔ چنانچہ جنت میں داخلہ تو معلوم! ملال تو یہ ہے کہ دوزخ میں بھی جانے کی کوئی اُمید نہیں کہ لیڈری نہیں کی۔ البتہ جنت کا کوئی گمنام گوشہ نصیب ہو جائے تو رحمت باری کو کسی خاص جوش میں لانے کی ضرورت نہ پڑے گی۔

یہ مشاعرہ خواتین کٹک کے لئے مخصوص ہے اس لحاظ سے اس میں میرا داخلہ جنت میں غیر قانونی داخلہ سے کم نہیں۔ اُردو لائبریری کٹک نے اس مشاعرہ کا اہتمام کیا ہے۔ یہ ایک عجیب و غریب ادارہ ہے۔ عجیب کم، غریب زیادہ! عجیب اس لئے کہ "زندہ دلانِ اُردو" نے ایک شاندار اور وسیع عمارت محض ایمان کی حرارت کی بنا پر بقول شخصے شب بھر میں بنا دی اور اس پر طرہ یہ کہ آناً فاناً میں سب نمازی بھی بن گئے۔ میں نے دیکھا کہ کس خشوع و خضوع سے نوجوانانِ شہر اُردو انگریزی اور اُڑیہ کے اخبارات اور رسائل کا مطالعہ کر رہے تھے۔ وہاں خانۂ ملک کے لئے عموماً اور اس شہرِ قدیم کے لئے خصوصاً ایک عجیب منظر ہے یہ ادارہ غریب اس معنیٰ میں ہے جس میں ایک دوست نے کہا کہ چلئے! میرا غریب خانہ بھی دیکھتے چلئے۔ دیکھا تو واقعی غریب خانہ نکلا!! یہ ادارہ معین الدین احمد صاحب (ریٹائرڈ۔ آئی اے ایس) اور ان کے رفقائے کار نے خون دے دے کر قائم کیا ہے۔ اس کی تعمیر میں نہ صرف روپیہ لگا ہے (دوسروں کا) بلکہ خون پسینہ اور آنسو بھی! (معین الدین احمد صاحب کے)

کٹک کی خواتین اور نوجوان لڑکیوں نے اس مشاعرہ کو ایک نئے انداز میں برپا کیا ہے۔ اس میں نوجوان طالبات نے مختلف قدیم اور جدید شعرائے اُردو کا لباس خصوصی زیب تن کر کے ان کا چیدہ چیدہ کلام بہ انداز ترنم یا انداز تکلم خوب پڑھا۔ یہ مرزا فرحت اللہ بیگ کے "دلی کا آخری مشاعرہ" کا ایک نیا روپ ہے۔ اور بہت ہی دلکش اور انفرادی! اس میں تو قطب شاہ ــــ پہلے اردو شاعر جو کٹک کے مشہور شاعر گزرے ہیں۔ ہر دور کے منتخب شعراء کو اور طرح کو "جنت الفردوس" سے (اگر وہ واقعی وہاں ہیں مجھے تو شبہ ہے) عالم محسوس میں لایا گیا ہے۔ اس مشاعرہ میں جن شعرائے کرام نے شرکت کی ان کے ــــ سے گرامی یہ ہیں: قلی قطب شاہ، میر

ذوقؔ، غالبؔ، ظفرؔ، داغؔ، شادؔ عظیم آبادی، اکبرؔ الٰہ آبادی، علامہ اقبالؔ، جگرؔ مراد آبادی، اور امجدؔ نجمی۔ ترتیب تاریخی بنیں تھی تعلیمی تھی۔ یعنی کون کون طالبات کس کس کا کلام اچھا پڑھ سکتی ہیں۔ اور کس کس شاعرہ کا حلیہ اور لباس منفرد ہے۔ اس لحاظ سے اس بے ترتیبی میں بھی ایک طرح کی ترتیب مضمر تھی۔

"جنت ارضی" قائم کرنے کا ایک نادر روزگار تجربہ ایران میں ہوا ہے۔ گیارہویں صدی میں نیشا پور کے مکتب میں تین بچے درس لیتے ہیں۔ ایک بڑا ہو کر ریاضی دان، منجم، فلسفی اور شاعر (اسی ترتیب کے ساتھ گویہ امتداد زمانہ سے الٹی ہو گئی ہے) بن کر منظرِ عام پر آتا ہے۔ اس کا نام ہے عمر خیام جس کی رباعیات قبولِ عام اور شہرتِ دوام حاصل کر چکی ہیں۔

اس شہرت کے لئے عمر خیام بیچارہ کو قصور وار نہیں ٹھہرا سکتے، اصل میں یہ شہرت اس مت کئے انگریز FITZGERALD کی دین ہے۔ جس نے ان رباعیات کا انگریزی میں ایسا معرکۃ الآرا ترجمہ کر ڈالا کہ گویا مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا۔ ادب عالم کی تاریخ میں یہ ایک نادر مثال ہے کہ کوئی ترجمہ اصل تخلیق سے سبقت لے گیا ہو۔ اس سے بھی یہ کارنامہ اس وجہ سے سرزد ہوا کہ ؎

سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا!

دوسری حیرت انگیز بات یہ ہے کہ عمر خیام غریب نے کبھی خواب و خیال میں بھی یہ نہ سوچا ہوگا کہ اس کی شاعری کی شہرت چاردانگ عالم میں فردوسی اور سعدی سے بڑھ کر ہوگی۔ کبھی فرصت میں اس موضوع پر لکھوں گا۔

کہانی کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ دوسرا لڑکا ایران کا وزیر اعظم نظام الملک بنتا ہے۔ اور تیسرا ہم جماعت حسن بن صباح "فردوس ارضی" قائم کرتا ہے اور ایک نئے سلسلہ (ORDER) کی بنیاد رکھتا ہے۔ حسن بن صباح الاموت (ALAMUT) کے قلعہ کو فتح کرتا ہے اور اس کے پس پشت جنت کا وہ پورا نقشہ قائم کرتا ہے۔ جس کے اشارے قرآن پاک میں ملتے ہیں۔ (یعنی) حسین و جمیل حوریں ہیں۔ شیر و شراب و شہد اور آب خنک کی نہریں جاری ہیں۔ قسم قسم کے میووں کے درخت ہیں۔ بارہ دریاں ہیں۔ محلات ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ وہ ایک جدوجہد

وفادار گروہ کی تشکیل کرتا ہے جن کے افراد کو "فدائی" کہتے ہیں۔ حسن بن صباح جس کو شیخ الجبال "(GRAND MASTER OF THE MOUNTAIN" کہا جاتا ہے۔ نوجوان کو کس طرح "فدائیوں" کے گروہ میں شامل کرتا ہے۔ وہ بھی بڑا حیرت انگیز طریقہ کار ہے وہ ان میں سے چند کو "حشیش" (عربی میں بھنگ کو کہتے ہیں) پلاتا ہے اور جب وہ نشہ میں سرمست ہو جاتے ہیں تو ان کو اپنی جنت ارضی میں داخل کر دیتا ہے۔ ان کو پوری آزادی ہے کہ وہ خوب کھیل کھیلیں۔ کسی[1] نے شادی کی تعریف یوں کی ہے کہ یہ ہوس بالائے ہوس اور مواقع بالائے مواقع کے اخراج کا نام ہے۔

یہاں شادی کی بندش بھی نہ تھی بلکہ وہ "جنتِ نشاط" جس میں احساس ذمہ داری حصولِ تمنا میں آڑے نہیں آتا۔ (یہ ناجائز محبت کی تعریف[2] ہے کہ BLISS WITHOUT RESPONSIBILITY IS ADALTERY اور ظاہر ہے کہ ناجائز محبت جائز محبت سے زیادہ جان گداز ہوتی ہے اور جان لیوا بھی!) الغرض اس جنت ارضی میں بغیر کسی ذمہ داری کے حصولِ تمنا کے تمام مواقع میسر تھے۔ دو چار دن کے بعد ان فدائیوں کو پھر حشیش کا ایک جام پلا کر قلعہ سے باہر نکال لیا جاتا ہے۔ حسن بن صباح "ان سے پوچھتا ہے کہ کیا تم نے جنت دیکھی؟ جواب ملتا ہے کہ یا شیخ! نہ صرف دیکھی بلکہ برتی بھی۔ سوال ہوتا ہے" کہ "اب تمہیں موت سے کوئی خوف ہے" جواب صاف ہے "اگر موت کے بعد اسی جنت میں جانا ہے تو پیر و مرشدا ذرا عجلت کیجئے۔ ہمیں موت زندگی سے زیادہ پیاری لگتی ہے۔ چنانچہ وہ ان فدائیوں کو اس دور کے عظیم مائیدین سلطنت و شریعت مثلاً وزرائے مملکت قاضی القضاۃ حتیٰ کہ خود وزیر اعظم نظام الملک کے قتل کا آلۂ کار بناتا ہے۔ ان فدائیوں کا یہ عالم ہے کہ ان کی مائیں روتی ہیں اگر یہ زندہ سلامت لوٹ آتے ہیں۔ ان کو حشیشین کہا

---

[1] جارج برنارڈ شا۔ [2] ۱۹ ویں صدی کے مشہور انگریز ناول نگار جارج میریڈتھ۔

جاتا ہے۔ جو صلیبی جنگوں کے درمیان ASSASSINS ہوگیا (لفظ ASSASSIN حشیشین سے نکلا ہے۔) یہ حشیشین قریب قریب دو سو سال تک نہ صرف ایران میں زبردست سیاسی قوت حاصل کر لیتے ہیں۔ بلکہ شام اور یورپ کے ممالک میں بھی سلاطین ان سے لرزہ براندام رہتے ہیں یہ دن دہاڑے قتل کرتے ہیں کسی مسلم امیر کو مسجد میں جمعہ کی نماز میں شہید کر دیتے ہیں۔ کسی شہزادہ یا ڈیوک کو اتوار کے دن گرجا میں وہ نصرف COMNT MARQUIS OF MONFERRAT کا قتل کرتے ہیں بلکہ یہاں تک مشہور ہے کہ شاہ ایران ملک شاہ سلجوقی اور صلاح الدین ایوبی کے خیموں میں جاکر خنجر نصب کر کر کے دھمکیاں دیتے ہیں۔ ان کی وفاداری کا یہ عالم ہے کہ HENRY COUNT OF CHAMPAGNE. جو یروشلم کا حاکم تھا۔ شام کے شیخ الجبال سے ملنے آتا ہے۔ دونوں چہل قدمی کر رہے ہیں۔ سامنے ایک بلند مینار پر چند نوجوان سفید کپڑے پہنے بیٹھے ہیں۔ شیخ کاؤنٹ سے مخاطب ہوتا ہے کہ کیا آپ کی رعایا اتنی وفادار ہے؟ اور جواب کا انتظار کئے بغیر اشارہ کرتا ہے اور وہ نوجوان سر کے بل مینار سے کود تے ہیں اور شیخ کے قدموں میں اپنی جان نثار کر دیتے ہیں۔ دنیا میں SHOWMANSHIP کا یہ پہلا باکمال مظاہرہ تھا بالآخر ہلاکو خاں کے منگولوں نے قلعہ الاموت کو تیرھویں صدی کے وسط میں فتح کیا اور اس سلسلہ کے آٹھویں امام اور آخری شیخ الجبال رکن الدین[1] خورشاہ کو تہ تیغ کر دیا۔

حسن بن صباح کی فردوس ارضی کا قصہ مولانا عبدالحلیم شرر کے مشہور ناول "فردوس بریں" میں پڑھیئے جو ۱۸۹۹ء میں شائع ہوا اور ان کا بہترین ناول ہے

[1] یہ واقعات پروفیسر ایڈورڈ جی براؤن کی "ایران کی ادبی تاریخ"

A LITERARY HISTORY OF PERSIA VOL II By PROFF EDWARD G BROWN 1906.

سے ماخوذ ہیں جو کیمبرج یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر تھے لیکن فارسی ادب کی تاریخ

حقیقت یہ ہے کہ جنت کا تصور CONCEPT بذات خود کتاب در کتاب موضوع ہے۔ غالب نے اس کی نہایت جدت آمیز تاویلیں کی ہیں کہیں کہتے ہیں ؎

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

کہیں حوروں پر خندہ زن ہیں ؎

جس میں لاکھوں برس کی حوریں ہوں
ایسی جنت کا کیا کرے کوئی

کہیں اُن کا فلسفہ تشکیک صوفیانہ رنگ اختیار کر لیتا ہے ؎

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست
لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

کہیں جنت و دوزخ کو دونوں کا یوں مذاق اڑاتے ہیں ؎

کیوں نہ جنت کو بھی دوزخ میں ملالیں یارب
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

کہیں بڑے پایہ کی بات کہہ جاتے ہیں ؎

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دے کوئی لے کر بہشت کو

"غبار خاطر[1]" میں مولانا آزاد نے رابعہ بصریہ[2] کا ایک واقعہ لکھا ہے جو پہلے طبقہ کی کبار صوفیہ میں شمار کی گئی ہیں اور جن کا انتقال آٹھویں صدی عیسوی میں ہوا کہ ایک دن اس عالم میں گھر سے نکلیں کہ ایک ہاتھ میں آگ کا برتن تھا اور دوسرے میں پانی کا کوزہ لوگوں نے پوچھا کہاں جا رہی ہو؟ جواب میں کہا کہ آگ سے جنت کو جلا دینا چاہتی ہوں اور پانی سے دوزخ کی آگ بجھا دینا چاہتی ہوں تاکہ دونوں ختم ہو جائیں اور پھر لوگ خدا کی عبادت صرف خدا کے لئے کریں۔ جنت اور دوزخ کے طمع و خوف سے نہ کریں۔

جہاں تک "انگبیں کی لاگ" کا تعلق ہے اکثر صاحب ذوق حضرات اس سے طاعت پر تیار کیا ہوں گے بلکہ بے زار ہو جائیں گے سچ تو یہ ہے کہ میں بھی شیر و شکر ہونے کا ضرور قائل ہوں لیکن

بقیہ صفحہ

[1] صفحہ ۱۰۰ مطبوعہ نعمانی پریس دہلی ناشر آزاد اکیڈمی دہلی۔ [2] بشر بیگ ....

اپنے اسٹیشن کو صاف رکھئے

- اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ صاف ستھرا ماحول ایک طرف کسی شخص کے کردار کا آئینہ دار ہوتا ہے اور دوسری طرف اس کردار کو نکھارتا ہے۔ صاف ستھرا گرد و پیش خوشی اور مسرت بکھیرتا رہتا ہے۔
- ہم اپنے گھر صاف ستھرے رکھتے ہیں تو پھر ان جگہوں کو صاف شفاف کیوں نہ رکھیں جنھیں ہم سب استعمال کرتے ہیں
- ریلوے پلیٹ فارموں، ویٹنگ رومز، سواری ڈبوں اور درحقیقت ان تمام جگہوں کو جہاں بڑی تعداد میں لوگ اکٹھے ہوتے ہیں گرد و پیش کو صاف و شفاف رکھنا بہت ہی ضروری ہے۔

ریلوے نے صفائی مہم شروع کی ہے جس کے بہت اچھے نتائج نکلے ہیں، اب ریلوے صاف ستھرے نظر آتے ہیں لیکن ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس سلسلے میں ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ ہم زیادہ صفائی کے لئے اپنی کوششوں کا سلسلہ جاری رکھیں گے۔

آپ بھی اس سلسلہ میں ریلوے کی مدد کر سکتے ہیں۔ آپ صرف اتنا خیال رکھیں کہ آپ کے آس پاس کی جگہ بالکل صاف شفاف حالت میں رہے۔ اس طرح اسٹیشن اور منسلکہ مقامات صاف ستھرے رہ سکتے ہیں۔ اور ہاں آپ ریلوے صفائی محکمہ کے کارکنوں کی خدمات سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، وہ صرف آپ کی خدمت کے لئے ہی رکھے گئے ہیں،

آپ بھی ذرا خیال رکھیے کہ کوڑا کرکٹ آپ کے ہاتھ سے ادھر ادھر نہ بکھرنے پائے بلکہ کوڑادان میں پھینکا جائے۔ آپ کا یہ معمولی سا کام ہمیں آپ کی بہتر خدمات کرنے میں کافی مدد دیتا ہے۔

ریلوے آپ کی پراپرٹی ہے اسے صاف شفاف رکھئے

ناردرن ریلوے

مَن کہ مکتوبِ الیہ

اوسلو ۔ (ناروے)

برادرِ محترم! آداب۔ کافی دن ہوئے آپ کا نوازش نامہ ملا تھا آپکی علالت اور پھر صحت یابی کا ذکر بھی ساتھ ہی تھا۔ اس لئے بے فکر ہو گیا۔ دیکھئے میری دعائیں بار آور ہوئیں۔ رام لال صاحب یہاں ہیں۔ آج ایک ہفتہ کے لئے لندن گئے ہیں۔ اسی مہینے کے آخر میں اُن کی واپسی ہے۔ مئی کا شانِ ہند پچھلے ہفتے ملا ہے۔ آپ کا انداز بہت شاندار ہے مضمون صاحب کی زندگی کا دوسرا رُخ آپ کے مضمون سے ایک دوسرے ڈھنگ سے سامنے آیا ہے۔ بہرحال وہ آدمی خوب تھے۔ میرا پہلا افسانہ اُنہی کے رسالے "ریاست" میں شائع ہوا تھا۔

ابھی تین افسانے لکھے تھے۔ رام لال صاحب نے شب خون۔ شاعر اور آہنگ کو بھجوا دیئے۔ ان رسالوں میں پہلے ہی چھپ چکا ہوں۔ میں تو سمجھتا تھا کہ یہ سب رسالے بند ہو گئے۔ اب جب بھی کوئی نیا افسانہ تخلیق ہوگا وہ آپ کی امانت رہا۔ آپ کی کتابیں اور واجدہ تبسم کے افسانوی مجموعے کیسے منگواؤں۔ دسمبر آنا ہوا تو آپ سے یہ سب کتابیں لے آؤں گا۔ میرے مجموعے کی کچھ اور جلدیں آپ کو ضرورت ہو تو لکھئے گا۔ خیر اندیش ہرچرن چاولہ

39 | II ۔ آر۔ ٹی سٹوری ۔ چار باغ ۔ لکھنؤ ۱۹

برادرم ودیا پرکاش جی، آداب

آپ کا خط ابھی ابھی ملا۔ خوشی ہوئی۔ میں ناروے ۔ لندن۔ سویڈن اور ڈنمارک میں دو ماہ سے زائد رہ کر ۲۰ اکتوبر کو دہلی واپس آگیا تھا اور اُسی روز کاشی ایکسپریس سے لکھنؤ آگیا۔ دہلی میں میری بیوی بھی ایک ہفتہ سے مقیم رہی تھی۔ میرے پہلے خط کے مطابق مجھے ۱۵ ستمبر کو پہنچنا تھا لیکن ۲۰ ستمبر کو اچانک عارفی بچوں کے سامنے لیکچر کا پروگرام بن جانے سے مجھے اپنا پروگرام بدلکر ۱۲ اکتوبر کو کوپن ہیگن سے فلائیٹ پکڑنی پڑی۔ اوسلو میں میں نے ایک انٹرنیشنل سیمینار میں شرکت کی اور ایک مقالہ "ہندوستان میں اخبار کی آزادی" پڑھا۔ اس سیمینار میں سنسر شپ کے تاریخی و سیاسی و سماجی پس منظر پر کئی مقالے پڑھے گئے۔ اور اس میں سویڈن۔ جرمنی۔ پولینڈ۔ ناروے انگلینڈ، آئرلینڈ، اور چیکوسلواکیہ کے ادیب اور صحافی موجود تھے۔ وہاں رہ کر میں نے اُردو میں ایک چھوٹی سی کتاب ناروے کے بارے میں لکھی اور اُسے ٹیکسٹ کے طور پر وہاں کے کلچرل ڈیپارٹمنٹ کے حوالے کر دیا۔ ناروے کے ریڈیو اور لندن میں بی۔ بی۔ سی سے اُردو کے بارے میں تین انٹرویو دیئے اور یورپ میں پاکستان اور انگریزوں کی پھیلائی ہوئی اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی کہ اُردو صرف پاکستان کی زبان ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ یورپی ممالک میں ہمارے سفارت خانے اس قسم کا کوئی اقدام نہیں کر سکتے کیونکہ انہیں حکومت ہند کی طرف سے اُردو کے بارے میں کوئی بیان جاری کرنے کے لئے ہدایات نہیں ملی ہوئی ہیں۔ اسے اُردو کی بدقسمتی ہی کہا جائے۔ ناروے میں میرے قیام و طعام کے لئے مسٹر چاولہ ذمہ دار تھے۔ انھوں نے میرا ہر طرح سے خیال رکھا۔ یہاں آتے ہی میں پاؤں کی تکلیف میں مبتلا ہو گیا۔ ٹھیک ہوتے ہی دہلی آؤں گا۔ اور آپ کے نیاز حاصل کروں گا۔ (مخلص رام لعل)

سرونج ۔ (ایم۔ پی)

محترم۔ تسلیم۔

ستمبر کے شانِ ہند میں افکار و افغانات کے تحت "بھٹو کی معنوی اولاد" کے نام سے جو مضمون شائع کیا گیا ہے۔ اس کو پڑھ کر بے حد مسرت ہوئی کاش ان اخبارات کے نام بھی شائع کر دیئے جاتے تو بھوپے عوام کے سامنے ایک صحیح تصویر سامنے آجاتی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں بھٹو کی معنوی اولاد کے مقابلہ میں بی۔ بی۔ سی کی معنوی اولاد زیادہ تعداد میں آباد ہے۔ جو اس کے ہر پروپیگنڈہ کو حرفِ آخر تسلیم کرتی ہے۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ مسز بھٹو کو اس ریڈیو نے سب سے زیادہ مقبول بنایا ہے۔ اور اس لیڈر کی اُس وقت بھی حمایت کر رہا ہے جب کہ پاکستان کے عوام اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر رہے تھے۔ پھر "دلی میرے یار" کو نظر انداز کر دینا بھی انصاف کا خون کرنا ہے۔ پیلو مودی صاحب نے بھی بھارت کے اس دشمن نمبر ایک کو مقبول بنانے میں زبردست رول ادا کیا ہے۔

عالیجناب کنھیا صاحب کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ جو بھارت سے سب سے پہلے بھٹو صاحب کی دعوت پر پاکستان تشریف لے گئے۔ اور ۱۹۷۲ء سے آج تک اس کی ہمدردی میں مضمون شائع کر رہے ہیں۔ میرے ان سکھ

کا مطلب یہ ہے کہ چند مسلم اضبا ادوں کو ہی اس معاملہ میں مورد الزام ٹھہرانا بعید از انصاف ہے۔ غیر مسلم حضرات کی نشاندہی ضروری ہے جس سے مسلم طبقہ خاص طور پر متاثر ہے۔ (اسماعیل ذبیح)

علی کو۔ متو ناتھ بھنجن۔ یو۔ پی۔

محترم سرور صاحب —— آداب عرض!!

ستمبر کا شانِ ہند " ملا۔ افکار و اقوال " حقیقت کے زہر میں بجھا ہوا تیر ہے۔ جو سید معاول کے اندر اتر تا چلا گیا لیکن —— آپ نے ذرا عجلت سے کام لے کر کچھ مسلمانوں کی بجائے ..... تمام مسلمانوں کو گھسیٹ دیا —— اور یہ نہ سوچا کہ اُن مسلمانوں پر کیا گزرے گی جن کا ذہن اور دل و دماغ ایسی باتوں سے کوسوں دور رہتا ہے —— !!

" من کی مکتوب الیہ " میں راجندر کرشن کا خط پڑھنے کے بعد مسلسل پندرہ منٹ تک ہنستا رہا —— اشاروں میں کیا بات کہہ دی ہے اور کتنے اچھے انداز سے کہ اب تو میں جب بھی فرصت پاتا ہوں اُن کا خط پڑھ کر تھوڑا ہنس لیتا ہوں —— !!

اتنا تو میرے علم میں ہے کہ جناب راجندر کرشن " فلم سے وابستہ ہیں پر آپ مجھے یہ بتائیں کہ مکالمہ نویس ہیں کہ گیت کار

(آپ کا —— ریاض احمد۔ م)

امیر منزل۔ ناگوری محلہ۔ نصیر آباد۔ راجستھان

محبی و مخلصی سرور صاحب، آداب و نیاز!

مرحوم غلام عشق آبادی کے بعد حضرت رتن پنڈوری کے گرانقدر علمی اور تحقیقی مضامین کا سلسلہ جو آپ نے "شانِ ہند" میں شروع فرمایا ہے۔ اس کے لئے آپ بھی اور قبلہ رتن صاحب بھی لائق صد ہزار مبارکباد ہیں۔ تشنہ کامانِ علم و ادب نیز خوشہ چینانِ ریاضِ سخن کے لئے یہ بڑے کام کی چیز ہے۔ اُمید ہے کہ آپ اور حضرت رتن صاحب استفادہ ناظرین کے پیش نظر اس مستحسن سلسلے کو جاری رکھیں گے —!

شکستِ ناروا (اگست شمارہ) میں معطوف علیہ کو کاتب نے مضاف الیہ پر محمول کر کے " معطوف الیہ " لکھ دیا ہے۔ جو رتن جی نے ہرگز نہیں لکھا ہوگا۔

محترم سرور صاحب! شانِ ہند اگر لیٹ ہو جاتا ہے تو بڑی کوفت ہونے لگتی ہے۔ کیونکہ انتظار موت سے بدتر ہوا کرتا ہے۔ افکار و اور بکھرے یار ...... سے تو آپ کا گرویدہ ہی بنا کر رکھ دیا۔ افکار و اقوال میں آپ کی صحافتی دیانت داری اور بے باکی جھلکتی ہے۔ تو بکھرے یار ...... میں تلخ حقائق کی پردہ داری مثال ہے۔ " بڑے بڑوں " کی " بڑی بڑی باتیں " نظر کے سامنے ہیں۔ خدا کرے بکھرے یار ...... کتابی صورت میں شائع ہو جائے ایک یادگار تاریخی دستاویز ثابت ہوگی۔ اللہ رب العزت آپ کو صحت و سلامتی کی تمام تر نعمتوں اور دولتوں سے ہمیشہ مالا مال رکھے۔ اور آپ اسی طرح علم و ادب کی خدمات انجام دیتے رہیں۔ دنیائے اُردو آپ کے گرانمایہ احسانات کو کبھی فراموش نہیں کر سکیگی۔

(مخلص۔ مقبول نصیر آبادی)

غزل

ندرت نواز
(اردو بہ م)

جس میں رہنے کی آس تھی بھائی
وہ عمارت بھی گر گئی بھائی
پھر ہیں بے چینیاں وہی بھائی
پھر چلیں تو اس گلی بھائی
کامنا پھر کہاں کوئی من میں
جب سے دیکھی وہ کامنی بھائی

کوئی بھی موڑ آخری کب ہے
ہے یہ دُنیا بہت بڑی بھائی
کیا کسی اور غم کی خواہش ہے
آگئی کس لئے ہنسی بھائی

آپ اپنا روپیہ دوگنا کر سکتے ہیں

سوچ سمجھ کر بچت کرنے والوں کے لئے ایک بھاری کشش۔ اس سیکورٹی پر ۱۴.۰ فیصد سالانہ سود مفرد ملتا ہے۔

نیشنل سیونگز سرٹیفکیٹ
(پانچواں اجراء)
کے ذریعے

۱۰۰ روپے لگانے سے

7 سال میں 200 روپے ہو جاتے ہیں

یہ سرٹیفکیٹ پانچ مالیتوں میں دستیاب ہیں جس رقم اور جتنی بھی مالیت کے چاہیں۔ یہ انہیں ضرورت پڑنے پر انھیں تین سال بعد بھنایا بھی جا سکتا ہے۔

دیگر فوائد

+ انکم ٹیکس کی غرض سے سود کا شمار سال بہ سال کیا جاتا ہے۔
(یہ رعایت حال ہی میں دی گئی ہے)
+ دولت ٹیکس سے چھوٹ
(ڈیڑھ لاکھ روپے کی حد تک)
+ سود پر انکم ٹیکس معاف
(تین ہزار روپے سالانہ تک)

مزید معلومات ان سے لیجیے!

× منظور شدہ ایجنٹ، یا
× ڈسٹرکٹ سیونگز افسر، یا
× قریبی ڈاک گھر، یا

اپنے علاقے کے ریجنل ڈائریکٹر (نیشنل سیونگز) سے

قومی بچت ادارہ
پوسٹ بکس نمبر 96
ناگ پور
۴۴۰۰۰۱
DAVP 78/204

گوشۂ عقیل صدیقی

(پاکستانی رسائل سے اخذ کئے گئے ادبی شہ پارے)

اگر شاعر پر پابندی عائد کر دی جائے کہ وہ شعر کہنے کے بعد کسی کو نہ سنائے تو ایک ہفتے میں پاگل ہو جائے گا

کیا عدالت جاتے ہوئے کمرے میں بھینسا باندھ گئی ہے

شاعر خرابات کے ساتھ نصف رات تک

ہمارے ہاں شاعر اور مشاعرے ایک دوسرے میں اس طرح گڈمڈ ہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے جدا کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے شاعروں کے بغیر مشاعرے اور مشاعروں کے بغیر شاعر صفر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ شعر کہنا بڑی مشکل بات ہے اور جب اسے کہہ لیا جائے تو اسے اپنے تک محدود رکھنا اس سے بھی بڑی بات ہے۔ ہو سکتا ہے کہ شاعر حضرات ازراہِ تکلف مجھ سے اتفاق نہ فرمائیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ اگر کسی شاعر پر یہ پابندی عائد کر دی جائے کہ وہ شعر کہنے کے بعد کسی کو نہ سنائے تو وہ شاعر ایک ہفتے میں پاگل خانے پہونچ جائے گا۔

شعر کہہ کر سنانے کی بات چل نکلی ہے تو ایک دلچسپ بات سنیئے۔

تقسیم ملک سے پہلے لاہور کا "ایس پی ایس کے" ہال مشاعروں اور مشاعرہ بازوں کے لئے ایک خاص اہمیت رکھتا تھا۔ اس ہال میں ہر روز مشاعرے ہوا کرتے تھے کبھی شاعر مشاعرہ باز حاضرین پر قبضہ کر لیتے اور کبھی مشاعرہ باز حضرات، شاعروں کے لتے لیتے۔ اس تمام گہما گہمی میں ایک نوجوان اور خوبرو شاعر شورلج بہار سب سے نمایاں حیثیت کا حامل تھا۔ وہ ہر ہفتے اس ہال میں محفل مشاعرہ برپا کرتا تھا اصل میں اس کی حیثیت ایک پیشہ ور مشاعرہ باز کی سی تھی۔ اور وہ مشاعرے برپا کرنے کا انتظام کاروباری انداز پر کیا کرتا تھا ان شاعروں میں دوسرے شعراء کے علاوہ اختر رضوانی بڑی نمایاں اہمیت کے حامل تھے وہ اگرچہ ہندو تھے لیکن انہوں نے اپنے نام اور تخلص میں اس قسم کا ابہام رکھا ہوا تھا کہ اکثر لوگ انہیں مسلمان ہی سمجھتے تھے۔

اختر رضوانی بڑی خوبصورت رباعیات کہا کرتے تھے اور جب بھی وہ... مشاعروں میں اپنی رباعیات پیش کرتے تو سامعین نہ صرف انہیں جھوم جھوم کر داد دیتے بلکہ کئی لوگ انہیں ہدیۂ عقیدت کے طور پر نقد بھی پیش کرتے۔ اصل پر اختر رضوانی صاحب نے اپنے حلقۂ احباب میں گٹھ جوڑ کر رکھا تھا جب وہ رباعیات سناتے تو ان کے احباب پانچ پانچ، دس دس روپئے ہدیۂ عقیدت کے طور پر پیش کر دیتے اور ان کی دیکھا دیکھی دوسرے لوگ بھی اختر رضوانی کی خدمت میں نذر نقد پیش کر دیتے۔ مشاعرہ کے خاتمہ کے بعد اختر صاحب اپنے احباب کی طرف سے پیش کردہ رقم انہیں واپس کر دیتے اور عام حاضرین کی طرف سے دی گئی رقوم کو ہضم کر جاتے یہ سلسلہ کافی دیر تک جاری رہا۔ ہو سکتا ہے کہ عام لوگوں کو اس گٹھ جوڑ کا شبہ تک نہ ہوتا لیکن اسی دوران ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے اختر رضوانی صاحب کے کاروبار کی قلعی کھول کر رکھ دی۔ ہوا یہ کہ ایس پی ایس کے ہال کے ایک مشاعرہ میں اختر رضوانی نے اپنا کلام پیش کیا ان کے احباب نے حسب سابق نہ صرف یہ کہ دل کھول کر داد دی بلکہ کوئی پچاس روپئے کے قریب ہدیۂ عقیدت کے طور پر پیش کئے۔ کرنا خدا کا کیا ہوا کہ مشاعرہ کے سامعین نے اس روز ایک پائی تک پیش نہ کی اور اختر رضوانی اپنے احباب کی طرف سے پیش کردہ رقم ان کو لوٹانے کے بجائے راہِ فرار اختیار کر گئے۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ دوستوں نے سارا بھانڈا پھوڑ دیا۔

ایس پی ایس کے ہال کے مشاعروں کے بانی مبانی اور روح رواں شورلج بہار کے متعلق اس سے زیادہ عرض نہیں کیا جا سکتا کہ انہیں نہ تو اردو ادب سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ شاعری سے کوئی لگاؤ تھا۔

وغیرہ بڑی دھوم سے مشاعرے برپا کرتے تھے اور مختلف شاعروں اور مشاعروں کی صدارت کرنے کے خواہشمند حضرات کے نام کو فروخت کر کے مال پیدا کرتے تھے۔

شوراج بہار بحیثیت ایک دوست کے بڑے ہی پیارے انسان تھے لیکن ایک مشاعرہ باز کی حیثیت سے انہوں نے جو تجربات کئے وہ بھی خاصے دلچسپ تھے۔ اختر شیرانی ان کے محبوب شاعر تھے اور وہ اپنے ہر مشاعرے میں انہیں ضرور مدعو کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ جہاں گیر میں کسی ذاتی کام کے سلسلے میں انارکلی چوک سے گزر رہا تھا کہ بہت سے لوگوں کو ایک جگہ اکٹھا دیکھا۔ لاہور کی شہری زندگی میں کسی بازار یا چوک میں لوگوں کے جم غفیر کے تین ہی مطلب ہوتے ہیں ـــ کوئی مداری یا مجمع گیر اپنے فن کے مظاہرہ میں مصروف ہے۔ کوئی لڑائی جھگڑا ہو رہا ہے اور یا کوئی ٹریفک کا حادثہ ہوا ہے۔ میں جب اس انبوہ کے قریب پہنچا تو تماشائیوں میں سے ایک کہہ رہا تھا ـــ "یار! یہ شاعر نہیں میرے خیال میں تو پاگل ہیں۔" شاعر اور پاگل کے الفاظ سن کر میرے قدم بھی رک گئے۔ ذرا آگے بڑھ کر دیکھا تو شوراج بہار اور حضرت اختر شیرانی ایک دوسرے سے الجھے ہوئے ہیں۔ میں نے بیچ بچاؤ کی کوشش کی اور کہا ـــ تم دونوں پڑھے لکھے ہو، یہ بازاری انداز تمہیں زیب نہیں دیتا۔ جب دونوں ذرا ٹھنڈے ہوئے تو معلوم ہوا کہ لڑائی اس بات پر ہوئی تھی کہ اختر شیرانی نے بڑی سختی سے بہار سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ اسے وہ آئندہ ماہ ہونے والے مشاعرہ میں متوقع شرکت کا پانچ روپے پیشگی معاوضہ دے۔ شوراج بہار کا کہنا یہ تھا کہ جب مشاعرہ ہوگا تو دیکھا جائے گا۔ اختر شیرانی کی جیب خالی تھی وہ بپھر گئے۔ اور بات بڑھتے بڑھتے لڑائی تک پہنچ گئی۔

اختر شیرانی شاعری کے علاوہ بھی بہت بڑے فنکار تھے۔ انہیں دوست احباب کی جیبوں سے پیسے نکلوانے کے بہت سے گر آتے تھے چونکہ شاعر ہونے [illegible] شعر پڑھنے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ اس لئے ان کی مالی حالت ہمیشہ خراب رہا کرتی تھی لیکن جب بھی وہ اپنے کسی دوست کو بقول ان کے مالی گزند پہنچاتے تھے تو اُن کے دوست اسے ان کی [illegible] سمجھتے تھے۔ ایک دفعہ ۱۹۴[illegible]ء کے لگ بھگ امرتسر میں ایک مشاعرہ ہوا۔ لاہور سے کوئی درجن بھر شعراء کو شریک مشاعرہ ہونے کی دعوت دی گئی۔ ہر شاعر کو دس دس روپے سفر خرچ

کے لئے پہنچ گئے۔ شاعروں کی پارٹی ڈبے میں [illegible] تھا۔ جب ریلوے اسٹیشن پر پہنچی تو اختر شیرانی نے سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "دوستو! ٹکٹ وکٹ خریدنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ریلوے کا عملہ آپ کا غلام ہے۔" پیسے بچانے کی بات بڑی معقول تھی لیکن یہی خدشہ تھا کہ اگر بغیر ٹکٹ سفر کرتے پکڑے گئے تو مشاعرہ گاہ کی بجائے کسی پولیس اسٹیشن کی زینت بننا پڑے گا۔ چنانچہ اختر شیرانی کے سوا سب نے ٹکٹ خریدے اور ٹرین کے ایک خالی ڈبے میں جا کر بیٹھ گئے۔ اختر شیرانی بھی کسی چور دروازے سے ریلوے اسٹیشن میں داخل ہو گئے اور ہمارے ڈبے میں ہی آ کر بیٹھ گئے۔ ٹرین جونہی امرتسر ہو کر اٹاری کے ریلوے اسٹیشن سے ایک سکھ ٹکٹ چیکر ڈبے میں داخل ہوا۔ ہم سب نے بیک وقت اختر شیرانی کے چہرے سے اس کی دلی کیفیت کا جائزہ لینے کی کوشش کی لیکن وہ بڑے سکون سے پلنگ پڑی کے کش لگا رہا تھا۔ ٹکٹ دیکھتے دیکھتے جب چیکر ان تک پہنچا اور ٹکٹ مانگا تو اس نے بڑے سکون سے جواب دیا۔ "مجھے اختر شیرانی کہتے ہیں۔" اس کے اس انداز سے ہم یہ سمجھے کہ غالباً ریلوے کے کسی ملازم نے چیکر کو اختر کے بغیر ٹکٹ سفر کرنے کی اطلاع دے رکھی ہے اور وہ اسے یاد دلانے کے لئے اپنا نام بتا رہا ہے لیکن سکھ ٹکٹ چیکر نے بڑی ڈھٹائی سے خالص پنجابی لہجے میں جواب دیا ـــ "او نے آہندے ہوں گے تون ٹکٹ کڈ۔ میں تیرون ناں نہیں پچھیا۔" اختر شیرانی نے مسکرا کر کہا۔ "سردار صاحب! اس میں ناراض ہونے کی کون سی بات ہے۔ میں اردو کا مشہور شاعر ہوں اور آپ کی انتہائی خوش قسمتی ہے کہ میں آپ کو اپنا کلام سنانے کے موڈ میں ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے ٹکٹ چیکر کے جواب کا انتظار کئے بغیر ترنم سے ایک غزل سنانی شروع کر دی۔ ٹکٹ چیکر پریشان تھا کہ یہ کس قسم کے مسافر سے پالا پڑا ہے۔ اور ادھر [illegible] اختر شیرانی کو باری باری ترنم سے اشعار فرمانے کی درخواست کرتے [illegible] کوئی نصف سے زیادہ سفر ایک ہی غزل میں کٹ گیا۔ "اوئے تون ٹکٹ دکھاندا کیوں نہیں؟" اختر شیرانی اس قسم کے سرکش کے بادشاہ تھے۔ انہوں نے چیکر کی برہمی کو کوئی لفٹ دیئے بغیر کہا ـــ "سردار جی! [illegible] آپ کی خدمت میں [illegible] ایک طویل نظم عرض کرتا ہوں جو یہاں سے [illegible] تک چلے گی۔" اور ٹکٹ چیکر

پڑ کھا کر ڈھیر سے بھاگ کھڑا ہوا۔

— ۲ —

سیالکوٹ کے بازار بانساں والا میں محمد دین عک یا تیزاب اور آتش بازی کی ایک چھوٹی سی دکان ہوا کرتی تھی۔ اس دکان کے مالک چودھری محمد دین تھے جو پورے شہر میں اپنی بذلہ سنجی اور حاضر جوابی کے باعث شیطان کی طرح مشہور تھے۔ نام تو ان کا محمد دین ہی تھا لیکن یار لوگ اسے مہتاں دادگر کہا کرتے تھے۔ اس کی دکان پر سارا دن دوست و احباب کی مجلس جما کرتی تھی اور قہقہوں کے سیلاب اُمڈا کرتے تھے مہتاں اگرچہ زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا لیکن اس نے بلا کی حاضر جوابی پائی تھی۔ وہ دکانداری سے پہلے ایک مقامی وکیل کے پاس منشی تھا۔ اس زمانے میں آنریری مجسٹریٹ کا نظام قائم تھا۔ سابق ایم۔ ایل۔ اے چودھری غلام رسول بھی اس زمانے میں آنریری مجسٹریٹ واقع ہوئے تھے۔ ان کا رنگ خاصہ کالا، جسم بھدا اور موٹا تھا ایک روز مہتاں ایک درخواست ضمانت کی تصدیق کے لئے ان کی عدالت میں گیا۔ عدالتوں کا وقت ڈیڑھ بجے تک ہوتا تھا اس وقت ایک بجکر بیس منٹ ہو چکے تھے چودھری صاحب مہتاں کی حاضر جوابی کو بڑی اچھی طرح جانتے تھے اس لئے انہوں نے چھیڑنے کے لئے طنزیہ لہجے میں کہا "کیا بات ہے؟ کدھر آئے ہو؟" مہتاں نے بڑے پرخلوص لہجے میں کہا "حضور! ضمانت کی ایک درخواست تصدیق کروانے کے لئے حاضر ہوا ہوں" چودھری صاحب نے جواب دیا "وقت ختم ہو چکا ہے اور عدالت جا چکی ہے" مہتاں بھانپ گیا کہ چودھری صاحب اس سے کچھ سننے کے موڈ میں ہیں۔ اس نے [illegible] کہا "اچھا عدالت جا چکی ہے! تو کیا عدالت جاتے ہوئے کمرہ میں بھینسا باندھ گئی ہے؟" اور چودھری صاحب نے مسکرا کر درخواست پر دستخط کر دیئے۔

تقسیم ملک سے پہلے سیالکوٹ کے زندہ دل لوگ ہر اتوار کو بذریعہ ٹرین جموں پہنچ جاتے اور جموں توی کے کنارے پکنک منانے کے بعد شام کو واپس آ جاتے۔ ہر پارٹی تفریح طبع میں اضافے کے لئے مہتاں کو ہمراہ لے جانے کے لئے بے چین ہوتی۔ اس کا سارا خرچ برداشت کیا جاتا۔ بعض اوقات تو یہ ہوتا کہ ایک پارٹی آ کے یہ کہتی ــــ آپ ہمارے ساتھ چلیں آمدورفت کرانے کے علاوہ مرغ، بریانی، اور چائے پیش کی جائے گی اور مٹھائی کھلائی جائے گی۔ دوسری پارٹی آتی تو مہتاں کہہ دیتا کہ فلاں پارٹی مجھے کھانے کے لئے فلاں فلاں چیز کی پیشکش کر گئی ہے۔ آپ اس میں اور کیا اضافہ کر سکتے ہیں اور اگر وہ پارٹی کہتی کہ ہم مرغ کے علاوہ تیتر اور بٹیر کا بھنا ہوا گوشت بھی پیش کریں گے تو وہ ان سے حامی بھر لیتا۔ ایک دفعہ وہ ایک پارٹی کے ہمراہ جموں گیا۔ سارا دن سیر و تفریح ہوتی رہی شام کو پارٹی کے چند ممبروں نے مہتاں کو پریشان کرنے کا منصوبہ بنایا۔ جموں توی کے کنارے حلوائی کی ایک بہت بڑی دکان تھی وہ لوگ اس دکان پر پہنچے اور ایک شخص نے مہتاں کے ساتھ اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں۔ باقی چار افراد نے حلوائی سے ایک ایک سیر دودھ پیا اور فارغ ہونے کے بعد مہتاں اور اس کے ساتھی کو آواز دی کہ بھئی آ کر دودھ پی لو دیر ہو رہی ہے وہ دونوں جب دکان کے قریب پہنچے تو آواز دینے والے ساتھی دودھ کی قیمت ادا کئے بغیر کھسک گئے تھے۔ مہتاں نے ایک ایک سیر دودھ پیالوں میں ڈلوایا اور ساتھی سے پینے کے لئے کہا۔ اس کے ساتھی نے جو سازش میں باقاعدہ شریک تھا کہا "بھئی میں دودھ نہیں پیوں گا۔ میری طبیعت خراب ہے" اور وہ بھی پیشاب کے بہانے کھسک گیا۔ مہتاں کو ایک دم خیال آیا کہ اس کے خلاف کیا سازش ہوئی ہے۔ اس کی جیب میں ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی اور اسے پانچ سیر دودھ کے پیسے ادا کرنے پڑیں گے۔ دوسری طرف اس کے چاروں ساتھی ایک درخت کے پیچھے چھپ کر اس کا تماشہ دیکھنے لگے۔ ان کا خیال تھا کہ جب پیسے ادا نہیں کر سکے گا تو اس کی ٹھکائی ہو گی۔ اور دو چار گھونسے پڑنے کے بعد وہ موقع پر پہنچ کر چھڑا لیں گے۔

مہتاں بلا کا ذہین تھا۔ اصل صورت حال کو تو وہ بھانپ ہی چکا تھا اسے اس بات کا بھی احساس تھا کہ اس نے بھاگنے کی کوشش کی تو پکڑ لیا جائے گا۔ دکان پر خاموشی تھی۔ یکدم اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی اس نے زمین پر جانے والی ایک چھپکلی کو پیر تلے دبا کر مار ڈالا اور زمین پر اس انداز سے بیٹھ کر جیسے اس کی کوئی چیز گر گئی ہے چھپکلی کو اٹھا کر پیالے کے باقی ماندہ دودھ میں ڈال لیا۔ اس کے بعد وہ دکان کی طرف بڑھا اور چھپکلی کو دُم سے پکڑ لیا۔ اور دودھ سے باہر نکالتے ہوئے نعرہ مارا ـــــ "ارے لالہ جی! اتنا بڑا ظلم! یہ کیا دودھ میں ڈال کر مجھے دیا ہے" لالہ جی کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر گاہکوں کو یہ علم ہو گیا کہ دودھ میں سے چھپکلی نکلی ہے تو وہ اس کی دس من دودھ کی کڑاہی اٹھا کر پھینک دیں گے۔ اس نے انتہائی معذرتی انداز میں کہا "حضور خاموش ہو جائیں" مہتاں نے سوچ کر جواب دیا "خاموش ہو جاؤں مجھے زہر کی متلی ہو

رہی ہے۔ اور تم کہہ رہے ہو کہ خاموش ہو جاؤ۔" لالہ جی نے گھبرا کر لڑکے سے کہا۔" ارے چھوکرے! بابو جی کو فوراً ایک لفافے میں مٹھائی ڈال دو۔ ان کی طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔ اب سماں دیکھئے کو دم سے پکتے لے کمزا ہے اور لالہ جی کا نوکر مختلف قسم کی مٹھائیاں لفافے میں ڈالتا چلا جا رہا ہے۔ ادھر مہماں کہہ رہا ہے " ارے کمبختو! مروا دیا ہے مجھے۔ یار قلاقند بھی ڈالنا اور لالہ جی کہہ رہا ہے۔ لڑکے قلاقند بھی ڈالو دو جلدی کرو۔ اور پھر مہماں کہہ رہا ہے۔ ہائے مر گیا،، وہ امرتیاں تو تم نے ڈالی ہی نہیں " اور لڑکا امرتیوں کے تھال کی طرف لپک رہا ہے پانچ منٹ کے بعد مہماں کوئی دو سیر مٹھائی کا لفافہ ہاتھ میں لئے دکان سے نکلا۔ اتنے میں اس کے دوست بھی درخت کی اوٹ سے نکل کر باہر آ گئے اور اس نے انہیں دکھا کر کہا۔" تم مجھ پر ہنس رہے تھے مجھے جوتے مروانے کی فکر میں تھے لو رنگ رنگ کی مٹھائی کھاؤ اور جائیں بناؤ۔"

میں جن دنوں محکمہ تعلقاتِ عامہ میں تھا تو جب بھی سیالکوٹ جاتا مہماں کی مجلس میں ضرور شریک ہوتا۔ ایک شام میں اور پروفیسر اصغر سودائی اس کے پاس بیٹھے تھے کہ بازار سے ایک شخص کندھے پر باجہ اٹھائے گزرا۔ مہماں نے اس باجے والے کو آواز دی۔" او میاں بات سننا۔ جب وہ نزدیک آیا تو مہماں نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔" ان کو بھی ساتھ لے جاؤ۔ یہ بھی تمہاری برادری ہی کے ہیں۔" باجے والے نے حیران ہو کر پوچھا۔" کیا مطلب ہے؟" مہماں نے جواب دیا۔" سرکاری باجوں والے ہیں،، آپ خود سوچیں کہ کیا محکمہ تعلقات کا اس سے بہتر ترجمہ ہو سکتا ہے۔؟"

مہماں ہر مشاعرے میں پہونچا کرتا تھا اس کی موجودگی میں شاعر خاصے زچ ہوا کرتے تھے۔ ایک دفعہ یوم اقبال کے سلسلے میں مشاعرہ ہوا۔ مہماں بھی موجود تھا جب ساغر صدیقی مائیک پر آیا تو اس نے سیاہ رنگ کی قمیص پہنی ہوئی تھی ساغر نے ابھی پڑھنا شروع کیا ہی تھا کہ مہماں نے اٹھ کر کہا۔" دوستو! اس کی کمی ستو! یہ سر سے نیچے تک شاعر بنا ہوا ہے اور سارا مشاعرہ قہقہہ زار بن گیا۔

ایک دفعہ مہماں ایک برات کے ساتھ ایک گاؤں گیا۔ پنجاب کے دیہات میں عام طور پر براتیں شام کے بعد ہی لڑکی والوں کے ہاں پہونچتی ہیں جب برات گاؤں میں داخل ہوئی اس وقت خاصی تاریکی ہو

چکی تھی۔ گاؤں کی بڑی بوڑھیاں اور بچے برات کو دیکھنے کے لئے گلی میں نکل آئے تھے۔ گلی میں گندے پانی کی ایک نالی تھی جب برات وہاں پہونچی تو مہماں نے آگے ایک ساتھی سے کہا۔" بھئی! دولہا کو باندھے بچہ اٹھا کر نالی پار کروا دو کہیں بھانڈا ہی نہ پھوٹ جائے۔" یہ بات گاؤں کی ایک بڑھیا سن رہی تھی۔ اس نے مہماں سے پوچھا۔" کیوں کیا بات ہے بیٹا؟" مہماں نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔" کچھ نہیں ماں جی۔ وہ بیچارا شب کوری کا مریض ہے۔" یہ بات سن کر وہ بڑھیا گاؤں کی چھتیں پھاندتی ہوئی بجلی کی طرح لڑکی والے کے ہاں پہنچی اور واویلا مچا دیا۔" تم اپنا بڑا غرق۔ لڑکی کو تباہ کر رہے ہو۔ ایک اندھے کے پلے باندھ رہے ہو۔" اب لڑکی کے والد اور برادری کے دوسرے لوگوں میں جھگڑا شروع ہو گیا لڑکی کے ماموں نے اعلان کیا۔" برات کو فوراً واپس کر دو ان لوگوں نے ہمارے ساتھ فریب کیا ہے۔" دوسری طرف لڑکی کے والد کا خیال تھا کہ برات کو واپس بھیجنا بے عزتی کا باعث ہوگا۔ گھر میں لڑائی چل رہی تھی اور برات گلی کے نکڑ پر کھڑی اس بات کا انتظار کر رہی تھی کہ لڑکی والوں میں سے کوئی ان کے خیر مقدم کے لئے آئے۔ یہ سلسلہ ڈیڑھ گھنٹہ جاری رہا براتیوں نے تنگ آ کر گاؤں کے چوپال میں جا کر ڈیرہ لگا لیا۔ رات کے کوئی ۹ بجے کے قریب لڑکی کا والد، بھائی اور ماموں آئے۔ انہوں نے ایک کتاب کھول کر دولہا کے سامنے رکھی اور لیمپ کی روشنی میں اسے پڑھنے کے لئے کہا۔ لڑکے نے کتاب فرفر پڑھنی شروع کر دی۔ اتنے میں لڑکی کے ماموں نے اپنا دایاں ہاتھ دولہا کے سامنے پھیلاتے ہوئے کہا۔" کتنی انگلیاں ہیں؟" دولہا نے جواب دیا" تین۔" پھر سوال ہوا" یہ کیا ہے؟" دولہا نے کہا " انگوٹھا۔" لڑکے کے باپ نے آگے بڑھ کر کرم بخش سے پوچھا" یہ کیا مذاق کا تماشہ کر رہے ہو؟" اس کے بعد لڑکی کے باپ نے اصل صورت حال بیان کی۔ فیصلہ یہ ہوا کہ اس بڑھیا کو جس نے یہ بات لڑکی والوں تک پہونچائی ہے بلا کر اسے یہ کہا جائے کہ وہ اس براتی کی شناخت کرے جس نے اسے بتایا تھا کہ دولہا کو شب کوری کا مرض ہے۔ اس بڑھیا کو بلایا۔ اب صورت حال یہ تھی کہ ہر براتی کو لیمپ کے سامنے لایا جاتا اور بڑھیا سے پوچھتے کہ۔" یہ تھا؟" تو وہ نفی میں سر ہلا دیتی۔ جب تمام براتیوں کی شناخت ہو چکی تو ایک براتی نے کہا۔" بھئی اصل آدمی تو غائب ہے۔ وہ مہماں کہاں ہیں؟" سب برات کی تہ تک پہونچ گئے اتنے میں مہماں ایک درخت کی اوٹ میں بیٹھا کا...

بڑے کے باپ نے نفرت سے کہا یہ کیا بیہودگی ہے۔ ـــــ
یہاں سے تشریف لے جائیے۔ آپ بھائی کے ساتھ سے تنے
بھی شاعروں میں شاعرانہ مذاق ہوتا ہے اور ساری بات ہنستے
ہنستے یونہی گزر گئی۔

ـــــ ۳ ـــــ

شاعر خرابات سید عبدالحمید عدم کے اشعار پاکستان کے
نوجوان اور بوڑھوں کی دھڑکنوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان
کے شعروں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جو بے پناہ مقبولیت حاصل کر چکے
ہیں۔ جن لوگوں نے اردو کے اس عظیم اور شراب پرست شاعر کو قریب
سے نہیں دیکھا وہ اس کے خلوص اور محبت کی انتہائی گہرائیوں کا اندازہ
نہیں کر سکتے۔ شاعر خرابات سید عبدالحمید عدم سے میری پہلی ملاقات
اس وقت ہوئی جب پاکستان ابھی معرض وجود میں نہیں آیا تھا۔ عدم صاحب
اللہ دین کنٹرولر آف ملٹری اکاؤنٹس کے دفتر میں اسسٹنٹ تھے اور میں
اکاؤنٹنٹ جنرل پنجاب کے دفتر میں آڈیٹر کے عہدہ پر کام کر رہا تھا۔ عدم صاحب
نے اپنے دفتر کے خشک ماحول میں "بہار ادب" اور میں نے "کاروان
ادب" کے نام سے ادبی انجمنیں قائم کر رکھی تھیں۔ اس زمانے میں ملٹری
اکاؤنٹس کے کنٹرولر مسٹر رشید احمد صدیقی تھے۔ صدیقی صاحب اگرچہ
بڑے ہی ادب نواز انسان تھے۔ لیکن وہ دفتر کا ماحول اور معاملات
میں بڑے سخت گیر واقع ہوئے تھے۔ جناب سید عبدالحمید عدم ایک سیکشن کے
انچارج تھے۔ پورے دفتر میں جتنے شاعر تھے وہ عدم صاحب کی برانچ میں
کوشش کر کے تبادلہ کروا لیتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انچارج سے لے کر چپڑاسی
تک سب کے سب شاعر اکٹھے ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ جہاں شعراء ہی شعراء
ہوں وہاں کام کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ بات بڑھتے بڑھتے صدیقی صاحب
تک جا پہنچی۔ وہ اس صورت حال سے بہت گھبرائے۔ لیکن آدمی بڑے
ہی کائیاں تھے۔ انہوں نے ایک روز عدم صاحب کو اپنے کمرے میں
بلایا اور مسکرا کر کہا۔

عدم صاحب! ہمارے دفتر کی یہ خوش قسمتی ہے کہ آپ جیسے بلند پایہ
شاعر یہاں کام کرتے ہیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ دفتر میں اور بھی کئی شعراء موجود
ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ایک مشاعرہ ہو جس میں صرف دفتر کے شاعر حضرات
حصہ لیں۔ عدم صاحب نے حامی بھر لی۔ اور مشاعرہ کی تاریخ مقرر کر دی
گئی۔ دوسری طرف۔ صدیقی صاحب نے اپنے ایڈمنسٹریشن کے سپرنٹنڈنٹ کو بلا کر
حکم دیا کہ مشاعرہ میں جو شعراء اپنا کلام سنائیں ان کے نام اور سیکشن نوٹ
کر لیے جائیں۔ مقررہ تاریخ پر بڑے اہتمام سے مشاعرہ ہوا۔ صدیقی صاحب نے
بڑے خلوص سے صدارت کی اور ایڈمنسٹریشن برانچ کے سپرنٹنڈنٹ نے
بڑے اہتمام سے سب شعراء کی ایک فہرست تیار کی۔ کوئی دو ہفتہ بعد دفتر کے
تمام شعراء کو یک دم کر کے متحدہ ہندوستان کے مختلف مقامات پر تبدیل
کر دیا گیا اور عدم صاحب ع

کس نے پرسد کہ بھیا کیستی

کی مثال بن کر رہ گئے۔ انہیں شاعر کلرکوں کے تبادلے کا بیحد افسوس تھا لیکن
بول نہیں سکتے تھے۔

اس کے بعد شاعر خرابات سید عبدالحمید عدم سے ۴۲ء کے بعد ملاقات
ہوتی رہی۔ جن دنوں میں محکمہ تعلقات عامہ میں ملازم تھا اور سرکاری جلسوں کے
سلسلے میں صوبہ بھر میں گھومنا پڑتا تھا۔ اس زمانے میں جہلم کے دورے کے دوران
مجھے یہ معلوم ہوا کہ حضرت عدم جہلم میں تشریف فرما ہیں۔ ٹیلیفون پر ملاقات ہوئی۔
شاعر خرابات نے فرمایا۔ حضور! آج دوپہر کا کھانا میرے ساتھ تناول فرمائیں
۔ مجھے اس دعوت کو قبول کرنے میں کیا انکار ہو سکتا تھا۔ یہ طے ہوا کہ میں ایک
بجے ان کے دفتر میں پہنچ جاؤں اور وہاں سے ان کے دولت کدہ پر جائیں
گے۔ میں جب پورے ایک بجے دفتر پہنچا تو معلوم ہوا کہ صاحب بہادر دفتر
میں موجود نہیں ہیں۔ میں حیران تھا کہ عدم صاحب یہ کیا چکر دے گئے ہیں۔ ابھی
میں اس عجیب و غریب دعوت کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ ایک بوڑھا چپڑاسی
میرے پاس آیا اور کہا۔ آپ شاہ جی کے وہ مہمان تو نہیں جو ان کے ہاں دوپہر
کے کھانے پر مدعو ہیں؟ میں نے جب اس بات میں سر ہلایا تو اس نے
مسکرا کر کہا۔ آئیے میں آپ کو ان کی کوٹھی لیے چلتا ہوں۔ محکمہ تعلقات
عامہ کی عطا کردہ گاڑی میرے پاس تھی اس پر بیٹھے اور سید عبدالحمید عدم
عرف شاہ جی عرف شاعر خرابات کی کوٹھی پر پہنچ گئے۔ کوٹھی کے صدر دروازہ
سے داخل ہوتے ہی کوئی ڈیڑھ سو کے قریب کتوں نے بھونک بھونک کر
ہمارا استقبال کیا۔ یہ کتے ہر نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ خارش زدہ کتے
[illegible] کتے۔ دبلے پتلے اور مریل کتے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے یہ بیمار اور
جاں بلب کتوں کی آخری آرام گاہ ہے۔ [illegible]
رہے تھے۔ عدم صاحب نے مسکرا کر [illegible]
[illegible] میں نے [illegible]
یہ کتوں کی فوج [illegible]

آپ سے ؟ حضرت عدم نے خشوع میں ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ "جو گناہ میں اسی کوشش میں داخل ہوتا ہے میں یہی سمجھتا ہوں کہ شاید یہی سگ لیلیٰ ہو۔ میری یہ تحقیق جاری ہے اور کتوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اور پھر شاعر کو اگر کوشش میسر آجائے تو وہ اس کے دروازے اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے لئے کیسے بند کر سکتا ہے ؟" دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد کچھ دیر شعر و شاعری کا دور چلا اور اس کے بعد گرمی کی حدت سے بچنے کے لئے ہم لوگ سو گئے۔ شام کو عدم صاحب نے مجھے چائے پر کہا۔ "جی ! تم نے مجھے مبارکباد نہیں دی ؟" میں نے پوچھا کس بات کی مبارکباد۔ کیا محکمانہ ترقی ہوئی ہے ؟ کہنے لگے۔ "جی نہیں ! میں نے شراب چھوڑ دی ہے۔" میں نے کہا "یہ تو آپ نے بہت ہی اچھا کیا۔ اب آپ کی صحت بھی ٹھیک ہو جائے گی۔"

چائے کے بعد ہم دونوں پیدل جہلم شہر پہونچ گئے۔ راستے میں عدم صاحب کو ایک شاگرد پیشہ قسم کا شاعر مل گیا۔ ہم ادھر اُدھر گھومتے رہے جب سات بج گئے تو ایک بازار سے گزرتے ہوئے عدم صاحب ایک دکان کے سامنے کھڑے ہو گئے اور بلند آواز سے کہا "لعنت ہے حرامزادے پر شام کے سات بجے ہی دکان بڑھا گیا ہے۔" اب جو میں نے دکان کے بورڈ کی طرف غور سے دیکھا تو اس پر لکھا تھا کہ "یہاں ہر قسم کی شراب فروخت ہوتی ہے۔" میں نے عدم کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "شاہ جی ! یہ کیا چکر ہے۔ آپ تو شراب چھوڑ چکے ہیں۔" مسکرا کر کہنے لگے۔ "شراب نوشی ترک کر چکا ہوں آج تو صرف آپ کی آمد کی خوشی میں چسکی لگانے کا موڈ ہے۔" وہاں سے چلے اور شہر کے جنوبی حصے کے ایک بیرونی محلے میں پہونچ گئے۔ شاگرد پیشہ شاعر کو [illegible] کر عدم صاحب نے ایک مکان کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "یہ اس [illegible] کا گھر ہے اس سے ایک بوتل لے آؤ۔" کوئی دس منٹ کے بعد حضرت واپس آئے اور کہا "عدم صاحب ! اس شخص نے مجھے گالیاں دی ہیں وہ کہتا ہے کہ میں آپ کے باپ کا نوکر نہیں ہوں کہ رات کو آرام کرنے کے بجائے شراب فروخت کرتا رہوں۔"

عدم صاحب تاؤ کھا گئے۔ اور سوچنے لگے کہ خود اس کے مکان پر جائیں لیکن بات نہ بن سکی۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے [illegible] میرا برا حال تھا۔ وہاں سے [illegible] تو شاعر خرابات کی قیادت میں ہم لوگوں نے شہر کے مشرقی حصے کا رُخ کیا۔ آبادی ختم ہونے کے بعد کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ عدم صاحب جانے کہاں سے چلے جا رہے تھے۔ آبادی سے ذرا ہٹ کر کھیتوں کے درمیان ایک دو منزلہ کوٹھی بنی ہوئی تھی۔ اس کے اوپر کی منزل کی ایک کھڑکی سے بجلی کی روشنی چھن چھن کر باہر آ رہی تھی۔ عدم صاحب نے فرمایا کام بن گیا ہے شراب جاگ رہی ہے۔" اس کے بعد انہوں نے کھڑکی کے نیچے کھڑے ہو کر دو چار نعرے مارے۔ کھڑکی سے ایک لمبی لمبی مونچھوں والے آدمی نے نیچے جھانکا۔ شاعر خرابات نے کہا۔ "ہم حاضر ہو گئے ہیں۔" وہ شخص پیچھے ہٹا اور ایک منٹ بعد پھر کھڑکی میں نمودار ہوا۔ اور شراب کی ایک خالی بوتل اوندھی کر کے دکھاتے ہوئے جواب دیا۔ "خزانہ ابھی ابھی خالی ہوا ہے۔" اور عدم صاحب وہاں سے لوٹے تو ان کا برا حال تھا۔ رات کا ایک بج چکا تھا۔ سارا جہلم چھان پڑا تھا اور ہم سڑکوں پہ مارے مارے پھر رہے تھے۔ ایک مقام پر شاگرد پیشہ شاعر ہماری آنکھ بچا کر کھسک گیا اور ہم گرتے پڑتے واپس کوٹھی پہونچے۔ عدم صاحب کہہ رہے تھے "عجیب ذلیل شہر ہے۔ یہاں کے لوگ شراب سے زیادہ نیند سے رغبت رکھتے ہیں۔ میں یہاں سے تبادلہ کرا لوں گا۔"

(بقیہ صفحہ ۲ کا جنت کا مشاعرہ)

کا نہیں۔ میں تو بغیر احسن ملاحت کا پرستار کہ وطن پرستی پہ وہال ہے میرا کیش تو یہ ہے ؎

اے نمک پاش ! تیرے حسن ملاحت کی قسم
بات تو جب ہے کہ ہر زخم نمک دان ہو جائے

خاکم بدہن اگر رحمتِ باری سے کبھی حق وسلوی آنہی آئے تو میں تو ضرور میں اپنے حصہ میں رکھ لوں گا لیکن شہد حسن شاہی صاحب کی خدمت میں رازق اکبر کی نیک خواہشات

WIT H COMPLIMENTS

کے ساتھ پیش کر دوں گا۔

دیکھئے ! بات کہاں سے شروع ہوئی اور کہاں جا کر ٹھہری۔ ذکر تھا خاتمین کا اور ان کے مشاعرہ کا۔ اعلیٰ اللہ کہ جنت اور موضع اللاکرے فردوس گوش ؟ اس باب میں جنت کا ذکر بھی وہ اس کا ہونا تھا لیکن اب تان آ کر حق و سلوی پہ آن کر ٹوٹی فرائڈ (FARHAD) نے شاید غلطی سے صحیح کہا تھا۔

غزل

م۔ یوسف ناؔتی پالوی

خوب انعام دیا ہے مجھ کو — اُس نے دیوانہ کہا ہے مجھ کو
زہر تریاق سے بڑھ کر ہے مجھے — درد ہی آج دوا ہے مجھ کو
میں کہاں ہوں یہ نہیں مجھ کو خبر — وہ کہاں ہیں یہ پتہ ہے مجھ کو
دل کی دھڑکن سے ہوا یہ محسوس — اُس نے پھر یاد کیا ہے مجھ کو
اِک محبت کے علاوہ سب کچھ — شہر والوں نے دیا ہے مجھ کو
شیشۂ دل ہے سلامت اب تک — ایک پتھر سے گلہ ہے مجھ کو
کیوں کسی اور کا دامن پکڑوں — تم نے جب تھام لیا ہے مجھ کو
خوش نصیبی ہے مری یہ ناؔتی — آپ نے اپنا کہا ہے مجھ کو

غزل

متینؔ بدایونی ایم اے

بڑی مہیب بڑی بے قرار گزری ہے — تمام رات سرِ کوئے یار گزری ہے
نہ کوئی پھول کھلا ہے نہ چٹکی کوئی کلی — بہار صحنِ چمن سے ہزار گزری ہے
کہیں پتہ نہ چلا دہر میں محبت کا — نظر ہماری یہ شہر و دیار گزری ہے
زمانے بھر کے فسانے انہوں نے دل سے سُنے — ہماری بات سماعت پہ بار گزری ہے
بہار آئی چمن میں مگر ہزار افسوس — خزاں کے خوف سے دیوانہ وار گزری ہے

پتہ یہ دیتے ہیں مُرجھائے ہوئے پھول متینؔ
ضرور صحنِ چمن سے بہار گزری ہے۔





نصیر افسر (راجی) معہ اپنی شریک حیات



لیتھو/لائسنس نمبر ۱۲۷   رجسٹرڈ آف نیوز پیپر آف انڈیا رجسٹریشن نمبر ۵۰/۶۴۲   رجسٹرڈ نمبر ڈی ۔

قیمت سالانہ
پندرہ روپے
فی پرچہ
ایک روپیہ پچاس پیسے

ماہنامہ
شانِ ہند دہلی

ایڈیٹر
سرور تونسوی

جلد نمبر ۴۴		دسمبر ۱۹۷۸ء		شمارہ نمبر ۱۲

نورِ حق ، جلوہ رب ، سر اللہ
ہے تو بندہ مگر اللہ اللہ

مندرجہ بالا مطلع حضرتِ آرزو سہارنپوری کا ہے۔ گزشتہ دس سال سے چیلنج کے باوجود کوئی بھی شاعر ایسا مطلع نہیں کہہ سکا اور پھر یہ رُباعی ملاحظہ فرمائیے۔ فرماتے ہیں ؎

ڈوبا ہوا توحید میں سر پیدا کر   دل جزوِ ہو جس کا وہ نظر پیدا کر
رکھنا ہے اگر تجھ کو محبت میں قدم   احمدؐ کے نواسے کا جگر پیدا کر

اور یہ قطعہ بھی پڑھیے ؎

جانِ بتولؓ و سبطِ پیمبر حسینؓ ہیں   معدن ہے جس کا عشق وہ گوہر حسینؓ ہیں
سمجھاؤں کس کو رازِ حقیقت یہ آرزو   آئینہ ہے وجود تو جوہر حسینؓ ہیں

ایک قطعہ اور ملاحظہ فرمایئے اور ایمانداری سے بتایئے کہ ایسا قطعہ بوترابؑ کی تعریف میں آپ نے پہلے بھی سنا تھا فرماتے ہیں :-

اب نیا انتخاب کیا ہوگا   حُسن پھر بے نقاب کیا ہوگا
ہو چکا جو ازل میں ہونا تھا   اب کوئی بوتراب کیا ہوگا

اگر آپ اس قسم کے نعتیہ اور عارفانہ کلام سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں تو حضرت آرزو سہارنپوری کے نعتیہ کلام ظہورِ قدسی اور مجموعہ مناقب بہارستان اولیا (جس میں ۵۵ اولیائے کرام پر مناقب شامل ہیں) مطالعہ فرمایئے۔ یہ دونوں کتابیں دفتر شانِ ہند دہلی ۲ سے دستیاب ہیں اور ہر کتاب کا ہدیہ دس دس روپیہ ہے۔

نوریاب کاظمی سرور ایڈیٹر پرنٹر پبلشر لیتھو کے صفحات خواجہ پریس جنتہ شیخ منگو جامع مسجد دہلی اور متن ہائی آرٹ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر شانِ ہند انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۲ ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔

اپنی بچتیں لگائیے

سود کی رواں شرحیں

مدت	شرح
1- سال	7.0 فیصد
2- سال	7.5 فیصد
3- سال	8.0 فیصد
5- سال	10.0 فیصد

زیادہ سے زیادہ سرمایہ لگانے کی کوئی حد نہیں۔

سود سال بہ سال ادا ہوتا ہے۔

ضرورت ہو تو کچھ رقم چھوڑ کر 2 سالہ، 3 سالہ اور 5 سالہ کھاتوں کو ایک سال بعد بھنایا جا سکتا ہے۔

نئی کشش: 5 سالہ میعادی ڈپازٹ کھاتے ہیں سال بہ سال شمار ہونے والا سود 5 سالہ ریکرنگ ڈپازٹ کھاتے میں خود بخود قائم رہ سکتا ہے۔ اس پر ملتا ہے (ا) 9.25 فیصد سالانہ سود مرکب۔ (ب) بارہ مہینوں کی قسطیں پیشگی جمع کرانے پر چھوٹ اور (ج) کچھ شرطوں پر آپ مفت «زندگی بیمہ» کے مستحق ہو جاتے ہیں۔

دیگر سہولتیں:

ایک سال میں 3,000 روپے تک سود ٹیکس سے مستثنا (دیگر منظور شدہ سرمایہ کاریوں سمیت)۔ کھاتے دار کی موت ہونے پر نامزد شخص فوراً رقم لے سکتا ہے۔

قومی بچت ادارہ
پوسٹ بکس نمبر 96.
ناگپور 440001

بلبل چہ گفت، گل چہ شنید و صبا چہ کرد؟

غیر مسلم اُردو پرستوں کیلئے ایک لمحۂ فکریہ

انگریزی حکومت کے زمانے میں اُردو کو مسلمانوں نے اپنی میراث سمجھ رکھا تھا۔ حالانکہ اُس وقت بھی اُردو کے غیر مُسلم صحافی شعرا اور ادیب اپنے ہم عصر مُسلم اُردو شعرا ادیبوں اور صحافیوں کے شانہ بہ شانہ اُردو کی آبیاری کر رہے تھے اور جموں کشمیر، پنجاب۔ صوبہ سرحد، بلوچستان۔ سندھ کے علاوہ دوسرے صوبجات میں سکولوں میں اُردو پڑھائی جاتی تھی اور ہر غیر مسلم بھی اُردو پڑھتا تھا۔ اس وقت کے پنجاب میں ہندوستانی پنجاب۔ پاکستانی پنجاب۔ ہریانہ۔ ہماچل پردیش سب شامل تھے۔ چونکہ انگریز مُسلمانوں کی پُشت پناہ تھا اس لیئے غیر مُسلم اُردو شعرا کے کلام اور ادیبوں کے رشحات قلم سے مُسلمانوں کو بُوئے کچوری آتی تھی اور غیر مُسلم اُردو پرست اس تضحیک کو برداشت کرنے پر مجبور تھے۔

مگر تقسیم مُلک کے بعد مُسلمان اُردو دانشوروں کو یہ احساس تو ہوا کہ اب اُردو خود اُن کے مفاد کے لئے "بُوئے کچوری" کو بھلا کر زبانی طور پر یہ تسلیم کر لینے میں کوئی نقصان نہیں کہ اُردو ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان ہے مگر سارے ہندوستان میں ایک بھی مُسلم اُردو دانش ور ایسا نہیں ہے جس نے یہ تسلیم کیا ہو کہ جہاں مالی مفاد ہو وہاں غیر مُسلم اُردو دانشوروں کو برابر کا نہ سہی جزوی طور پر ہی حصہ دار سمجھا جائے۔ اس کے ثبوت میں ہماری اُردو اکاڈمیوں، انجمن ترقی اردو ہند، نیشنل بک ٹرسٹ، ساہتیہ اکاڈمی، ترقی اردو بورڈ کی کارگزاری کا اگر جائزہ لیا جائے تو صاف نظر آجائے گا۔ کہ ان اداروں کے سربراہ حکومت کی پالیسی کے مطابق اُردو کو صرف مُسلمانوں کی زبان ہی تسلیم کرانے کی کوششیں کر رہے ہیں۔ اُردو اکاڈمیاں ہر سال اُردو کی کتابوں پر انعامات تقسیم کرتی ہیں۔ کتب خانوں کو مدد دیتی ہیں۔ مصنفین کو کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں مالی امداد دیتی ہیں اسی طرح نیشنل بک ٹرسٹ، ساہتیہ اکاڈمی۔ ترقی اُردو بورڈ ہر سال لاکھوں روپیہ کتابوں کی اشاعت پر صرف کرتے ہیں مگر بڑی مشکل سے پانچ سات فیصد غیر مُسلم مصنفین کو ہی تراجم کا کام دیا جاتا ہے یا غیر مُسلم ادیبوں کے شاہکار شائع کئے جاتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ خالصتاً سرکاری یا نیم سرکاری ادارے حکومت کی پالیسی (کانگریسی تھی یا جنتا کی ہے) کے مطابق ایسا کرنے پر مجبور ہیں کیونکہ نہ تو سرکار کو اُردو سے محبت ہے اور نہ وہ اُردو کو پسند کرتی ہے اور نہ ہی وہ اسے زندہ رکھنا چاہتی ہے۔ یہ تو بھلا ہو "ووٹ" کا کہ ہر حکومت کو مسلمانوں کے ووٹ کی ضرورت ہے اور وہ مُسلمانوں کو مذہب کے ساتھ ساتھ انعامات۔ اعزازات اور تراجم وغیرہ کے ذریعہ معقول معاوضہ کے نام پر نقد دے کر ایک تیر میں کئی کئی نشانے لگانے میں کامیاب ہو رہی ہے۔ مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ حکومت مُسلم ادیبوں اور شعرا نیز صحافیوں کو غیر مُسلموں سے بہتر سمجھتی ہے اس لیے غیر مُسلم ادیبوں، شعرا اور صحافیوں کی اُنہیں کیا ضرورت ہے اور اس طرح حکومت اپنی حکمت عملی کو بہ خوبی برقرار رکھ رہی ہے کہ اُردو مُسلمانوں کی زبان ہے اور مُسلم دانشور محض ذاتی اور مالی مفاد کے لیے حکومت کا [illegible]

بن رہے ہیں۔

اس ضمن میں ایک نہیں سینکڑوں ثبوت دیئے جا سکتے ہیں۔ پچھلے سال (بلکہ جب سے یہ سلسلہ شروع ہوا ہے) اتر پردیش اردو اکاڈمی نے ایسی ایسی کتابوں پر انعامات دیے ہیں جو یقیناً اس کی مستحق نہیں تھیں۔ مگر محض اس لیے کہ ان کتابوں کے مصنف مسلمان تھے۔ اور ان کے مقابلے میں ایسی کتابوں کو شاید انعامی کمیٹی کے ممبران نے ایک نظر دیکھنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی جو ان انعام پانے والی کتابوں سے کہیں بہتر تھیں۔ مگر ان کتابوں کے مصنفین بدقسمتی سے غیر مسلم تھے۔ اس سلسلے میں ہم نے اتر پردیش اردو اکاڈمی کے سکریٹری صاحب کو خط لکھا۔ انہوں نے جو جواب دیا ہے وہ دفتری زبان کا بہترین نمونہ ہے مگر انہوں نے اس گزارش کا کوئی جواب نہیں دیا کہ غیر مسلم مصنفین کے ساتھ ناانصافی کیوں کی گئی۔ حالانکہ وہ اس کا جواب بہتر انداز میں دے سکتے تھے کہ ہم نے جگن ناتھ آزاد کو پاکستانی کتاب سے چوری شدہ مضامین کو ہندوستان میں اقبال اور مغربی مفکرین کے نام سے شائع کرنے پر دو ہزار روپیہ کا انعام دیا۔

دہلی ایڈمنسٹریشن نے خضر برنی کے لئے بہترین صحافی کی پنشن منظور فرمائی۔ حالانکہ خضر برنی اور صحافت میں اتنا طویل فاصلہ ہے کہ جس کو صرف حماقت ہی ماپ سکتی ہے دہلی ایڈمنسٹریشن نے ہی رشید حسن خاں کو اردو کا بہترین مصنف قرار دے کر انعام سے نوازا۔ حالانکہ ان کی سب سے مشہور تصنیف "اردو املا" حماقتوں اور زباں دانی سے ناواقفیت کی ایک ایسی دستاویز ہے کہ آئندہ نسلیں اگر اس پر عمل پیرا ہوں تو پوری اردو اپنے آپ ختم ہو جائے گی۔ کیا اردو اکاڈمی اتر پردیش سے متعلقہ ارباب اور دہلی ایڈمنسٹریشن کے ذمہ دار دل پر ہاتھ رکھ کر یہ کہہ سکتے ہیں کہ جتنا مسلم ادیبوں، شعرا اور صحافیوں کو نوازا گیا ہے۔ ان سے بہتر غیر مسلم ادیب۔ اور صحافی موجود نہ تھے۔ مگر جب معاملہ ہی مسلمانوں کے ووٹ حاصل کرنے کا ہو تو پھر حق و انصاف کا ساتھ دینا بڑی جرأت کا کام ہے اور موجودہ زمانے کی سیاست نام ہی بزدلی، دھوکہ دہی، جھوٹ بولنے اور اپنی کرسی کو ہر قیمت پر قائم رکھنے کا ہے۔

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے اس اداریے سے ہمارے کئی مسلمان دوست برہمی کا اظہار کریں گے۔ مگر سچی بات بظاہر برہمی کا موجب ضرور ہوتی ہے مگر فائدہ مند بھی وہی ہوتی ہے۔ کیونکہ اس وقت تو مسلمان دانشور ذاتی اور مالی مفاد کی خاطر حکومت کی اردو دشمنانہ چالوں کا شکار محض اس لیے ہو رہے ہیں کہ غیر مسلم اردو پرستوں کے ساتھ ناانصافی کے باعث انہیں فائدہ ہو رہا ہے مگر جب ان شاطرانہ چالوں کے نتائج سامنے آئیں گے تو اردو کا جنازہ انہی مسلمان شاعروں اور صحافیوں کے کندھوں پر نظر آئے گا جو اب سرکاری نوازشوں کو دستِ غیب کا عطیہ سمجھ رہے ہیں۔

موجودہ حالات میں اب ہندوستان میں اردو کو اگر کوئی بچا سکتا ہے تو صرف اور صرف غیر مسلم اردو پرست۔ اس لئے ہم غیر مسلم اردو پرستوں کو ہی مخاطب کر رہے ہیں۔ کہ اگر ایک اچاریہ دھرمیندر ناتھ اروڑہ یونیورسٹی راجستھان میں فارسی کلاسیں شروع کر کے ستر طالب علموں کو فارسی پڑھنے کے لئے اکٹھا کر سکتے ہیں۔ جبکہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں بھی فارسی پڑھنے والے طلبا کی تعداد اتنی نہیں ہے اور ان ستر طالب علموں میں پچاس غیر مسلم طالب علم اور طالبات ہیں تو کیا وجہ ہے کہ اگر اس طرح ہر غیر مسلم اردو پرست اپنے بھگوان پر بھروسہ رکھتے ہوئے اپنے اپنے حلقۂ احباب میں سے پانچ پانچ بچوں۔ جوانوں، بوڑھوں، لڑکیوں اور عورتوں کو اردو پڑھانے کا عزم کر لے تو کچھ ہی سالوں میں ہم اردو کے لیے کیا کیا نہیں کر سکتے۔ سکولوں میں اردو پڑھانے کا مطالبہ حکومت سے غیر مسلم کریں۔ ہر سرکاری محکمہ میں اردو میں لکھی ہوئی درخواستیں قبول کئے جانے کے لئے غیر مسلم ہی کوشاں ہوں۔ تعلیم بالغان کے سلسلے میں اگر ہم غیر مسلم ہی اردو کی تعلیم دیں تو یقیناً ہم اردو کے لئے بہتر انداز میں کام کر سکتے ہیں اور یہ کام کوئی مشکل کام نہیں ہے جناب تاجور سامری جو ایک برہمن تھیں۔ اس وقت تک سینکڑوں

لڑکیوں اور لڑکوں کو اُردو پڑھا چکے ہیں اور وہ ہر اُردو پڑھنے والے کے ہاں پیدل چل کر جاتے ہیں۔ شاہدرہ سے چل کر دریا گنج میں دفتر "تحریک" میں وہ ایک غیر مسلم لڑکی کو اُردو پڑھانے آتے ہیں اسی طرح جناب آرزوؔ سہارنپوری (جناب سادھو رام) نے کلکتہ میں اس ضعیفی میں اُردو پڑھانے کا سلسلہ جاری کر رکھا ہے اور وہ کسی سے کوئی معاوضہ نہیں لیتے اور پردہ دار مسلم بچیوں کو اُن کے گھر جا کر اردو پڑھاتے ہیں۔ غیر مسلم لڑکیوں میں اُردو پڑھنے کی دلی خواہش ہے جس کا اظہار مشاعروں میں یوں کیا جاتا ہے کہ درجنوں لڑکیاں ہندی میں اُردو شعراء کا کلام لکھ رہی ہوتی ہیں اور ایڈیٹر شانِ ہند سے سینکڑوں غیر مسلم لڑکیوں نے اُردو پڑھنے کے لئے اپنے ذوق کا اظہار کیا ہے مگر وہ بیچاریاں کوئی معقول انتظام نہ ہونے کے باعث خاموش ہو جانے پر مجبور ہیں۔ غیر مسلم اُردو پرستو یہ یقین کر لو کہ اب اُردو کو ہمیں اس مُلک میں زندہ رکھ سکتے ہیں۔ کیونکہ مُسلمان دانشور اب حکومت کے نقیہ تر پر نظر جمائے ہوئے ہیں اور جب کوئی قوم خیرات (خواہ وہ کتابوں کے انعامات کے رُوپ میں یا اشتہارات کی فراوانی یا اعزازات کی شکل میں ہو) پر خوش ہوتی ہے تو سمجھئے وہ اپنے علم، کلچر اور روایات پر فاتحہ پڑھنے کی تیاری کر رہی ہے۔ اس سلسلے میں ہم پھر رام لال صاحب کی طرف دیکھ رہے ہیں کہ وہ ایک بار اور غیر مُسلم اردو پرستوں کی کانفرنس بلائیں اور اس بار وہ خوشامد کے طور پر بھی مُسلمان دانشوروں کو مدعو نہ کریں۔ اس سلسلے میں ایڈیٹر شانِ ہند دامے۔ درمے۔ سخنے۔ قلمے خدمت کے لئے حاضر ہے۔

شرم تم کو مگر نہیں آتی

محترم جناب رتنؔ پنڈوروی صاحب نے "ہندی کے مسلمان شعراء" نام سے ایک کتاب ترتیب دی ہے جس میں ۲۸۰ ہندی کے مسلمان شعراء کے حالاتِ زندگی۔ نمونہ کلام وغیرہ اس دلپذیر انداز میں تحریر فرمائے ہیں کہ یہ تذکرہ اپنی نظیر آپ ہے۔ اس کتاب کو مکمل کرنے کے لئے حضرت رتن پنڈوروی نے ۲۰۲ کتابوں سے مدد لی ہے۔ اس مسودہ کی تیاری میں رتن صاحب کی زندگی تباہ ہوگئی۔ کتابوں کی فراہمی اور انہیں خریدنے کے لئے زرِ کثیر کا صرف کرنا۔ حیدرآباد۔ بانکی پور پٹنہ۔ لکھنؤ۔ رامپور۔ آگرہ۔ دہلی۔ کراچی۔ لاہور اور دیگر مقامات کی مشہور لائبریریوں سے مخطوطات کے نقل کرنے، انگریزی نہ جاننے کے باعث لندن کی لائبریری سے انگریزی کتابوں کے تراجم کرانے میں رقمِ خطیر ادا کی گئی۔ پچاس سال کی محنت شاقہ اور زرِ کثیر لگانے کے باعث رہائشی مکان تک فروخت کر دیا۔ کتابوں کی چھان بین نے آنکھوں کو ختم کر دیا۔ غرضیکہ اس کتاب کی تیاری میں لگا تار پچاس سال صرف کرنے کے بعد نہ تو اب رتن صاحب کا جسم رہا نہ کان رہے نہ آنکھیں رہیں۔ نہ ہمت رہی اور نہ ہی روپیہ۔ قرض خواہوں نے رہائشی مکان بھی لے لیا اور اب وہ مارے مارے پھر رہے ہیں جس شخص نے اتنی قربانی دی ہو اُس کی یہ دلی خواہش قدرتی ہے کہ اُس کی یہ کتاب چھپے اور ہندو مسلم یک جہتی کے علم بردار یہ دیکھیں کہ ہندو مسلم یک جہتی، ہندو مسلم اتحاد۔ ہندو مسلم علمی یگانگت۔۔ وہم آہنگی کو عملی صورت میں پیش کرنا کتنا مشکل ہے۔

چنانچہ رتن صاحب نے انجمن ترقی اُردو ہند۔ نیشنل بک ٹرسٹ۔ ترقی اُردو بورڈ اور ساہتیہ اکاڈمی کو لکھا کہ ان کی یہ کتاب شائع کی جائے۔ مگر افسوس کہ کسی ادارے نے انہیں جواب تک سے نہیں نوازا۔ اب کوئی بتلائے کہ حکومت ان اداروں پر ہر سال جو لاکھوں روپیہ بلکہ کروڑوں کا روپیہ خرچ کر رہی ہے کیا اس کا مصرف ہندی کے مسلمان ایسی قابلِ قدر کتاب کو شائع نہ کر کے صحیح طور پر کیا جا رہا ہے۔

ہم ان اداروں سے اتنے مایوس نہیں ہوئے کہ وہ اس نادرِ روزگار کتاب کے بارے میں کسی مزید حماقت کا ثبوت دیں گے ہاں تو یہ چاہئے کہ ان اداروں کے سربراہ از خود رتن صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کتاب کو شائع کرنے کے لئے پیش کش کریں اور انہیں اس کا معقول معاوضہ ادا کریں۔ وگرنہ اس ادارتی شذرہ کا عنوان زبانِ حال سے پکار پکار کر اپنی صداقت کا اعلان کرے گا۔

حاتم کی قبر پر لات

جناب غلام ربانی صاحب "تاباں" نے علی گڑھ کے فرقہ وارانہ فساد کے خلاف اظہارِ ناراضی و ناپسندی کے طور پر "پدم شری" کا اعزاز حکومت کو واپس کردیا اور تاباں صاحب کے اس مصرعِ طرح پر جناب جگن ناتھ آزاد نے دو غزلہ کہتے ہوئے غلام ربانی تاباں صاحب کو مبارکباد پیش کی ہے اور علی گڑھ کے مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار فرمایا ہے۔ جہاں تک فرقہ وارانہ فساد کا معاملہ ہے وہ علی گڑھ میں ہو یا سنبھل میں ہر دو حالت میں نہ صرف قابلِ مذمت ہے بلکہ اس حقیقت کا علم بردار ہے کہ جس ہندو نے اس فساد کو ہوا دی یا اس میں حصہ لیا وہ ہندو نہیں بلکہ چنڈال ہے اور جس مسلمان نے اس فساد میں جوشِ ایمانی دکھایا وہ یقیناً مسلمان نہیں۔ ہے او. اس پر خدا اور رسول کی رحمتوں کے دروازے اس دنیا میں اور حشر کے میدان میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہوگئے۔

مگر جہاں تک ان فسادات کی آڑ میں سستی شہرت کے حصول اور کسی غلط فہمی پھیلانے کا سوال ہے وہ ان ہندو مسلمانوں کے کردار سے بھی بدتر ہے جنھوں نے عملی طور پر کسی فرقہ وارانہ فساد میں حصہ لیا ہو۔

صوبہ بہار میں بیلچی کے مقام پر کچھ ہری جنوں کو زندہ جلا دیا گیا اُس وقت "تاباں" صاحب کی انسانیت نہ معلوم کہاں سو رہی تھی۔ سنبھل کے فساد میں ایک کارخانہ میں آگ لگا کر کئی ہندوؤں کو زندہ جلا دیا گیا اُس وقت "تاباں" صاحب شاید چاچن کی تعریف میں نظمیں لکھنے میں مصروف تھے مگر علی گڑھ کے فساد میں ان کی رگِ حمیت اس تیزی سے پھڑکی کہ "پدم شری" کا سفارش سے حاصل کیا ہوا اعزاز حکومت کو واپس کردیا۔ یہ اعزازات جنتا حکومت نے ویسے ہی ختم کردیے ہیں۔ جیسے انگریزی حکومت کے عطا کردہ خطاب ملک آزاد ہوتے ہی عذاب بنا کر رہ گئے تھے۔ اسی طرح کانگریسی حکومت کے یہ تمغے اعزازات موجودہ حکومت کے آتے ہی ختم کردیے گئے اور یہ اعزاز رکھنے والے حضرات زبانِ حال سے یہ کہنے پر مجبور تھے کہ ہم کانگریسی حکومت کے گزیٹڈ وفادار رہے ہیں، چنانچہ تاباں صاحب نے اس طوقِ وفاداریِ کانگریس کو گلے سے اتارنے کا خوب بہانہ نکالا یا دوسرے الفاظ میں حاتم کی قبر پر لات ماری ہے۔

تاباں صاحب ہمارے دوست ہیں اور ہمارے دل میں اُن کی عزت ہے۔ مگر انہوں نے اس سفید بالی میں یہ بچگانہ حرکت کرکے کوئی قابلِ تعریف کام نہیں کیا۔ تاباں ایسے شاعر کو ملک ہی تو کیا ساری دنیا کا خیر خواہ ہونا چاہیئے تھا مگر وہ کنوئیں کے مینڈک کی طرح علی گڑھ کے فرقہ وارانہ فساد میں ہی پھنس کر رہ گئے۔

حق بہ حق دار رسید

جناب انور جمال قدوائی وائس چانسلر جامعہ ملیہ نے قدوائی خاندان کی روایات پر عمل پیرا ہوتے ہوئے جامعہ ملیہ میں جن جن حضرات کے ساتھ ناانصافی ہوتی تھی اُن کا جائزہ لینے کے بعد حق و عدل کی فضا پیدا کرنی شروع کردی ہے۔ چنانچہ ایک بہت بڑی بے انصافی جو پچھلے دس ماہ سے ہوتی چلی آرہی تھی اُس کی تلافی انہوں نے یہ فرمائی ہے کہ جناب ڈاکٹر عنوان چشتی کو جامعہ میں صدر شعبۂ اردو مقرر فرمایا ہے۔ عنوان چشتی صاحب نے اردو تنقید کو ہیئتی تنقید کی نئی جہتوں سے آشنا کیا اور اردو غزل کو ایک نیا فکر انگیز جمالیاتی لہجہ عطا کیا ہے۔ ادارہ شانِ ہند حق بہ حق دار رسید کی اس خوشگوار فتح پر جہاں ڈاکٹر عنوان چشتی کو مبارکباد پیش کرتا ہے وہاں جامعہ ملیہ کے وائس چانسلر جناب انور جمال قدوائی کو بھی مبارکباد پیش کرتا ہے کہ انہوں نے حق و عدل کی فضا کو جامعہ میں پھر سے سرفراز کیا ہے۔

حکیم محمد امین خاں دھولپوری

حکومت راجستھان کے محکمہ صحت کے شعبہ یونانی ...

مع حکیم محمد امین خان دھولپوری ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ امین [illegible] صاحب جہاں ایک اچھے شاعر، ہمدرد انسان اور عوام کے خدمت گزار ہیں وہاں آپ ایک بہت اچھے حکیم بھی ہیں۔ حکیم امین صاحب نے پندرہ سال کی لگاتار ریسرچ کے بعد کینسر ایسے موذی مرض کے لئے شافی علاج ڈھونڈ نکالا ہے اور وہ اپنے اس یونانی طریقہ علاج کو کینسر کے کچھ مریضوں پر کامیابی کے ساتھ آزما بھی چکے ہیں۔ آپ اس وقت جے پور میں سورج پول کے نزدیک بہار گنج کے یونانی دواخانہ میں درجہ اول کے حکیم ہیں اور دواخانہ کے ہیڈ ہیں۔ اس دواخانہ میں چھ مریضوں کو مفت علاج کے لیے بھرتی کرنے کی گنجائش ہے۔ مریضوں کو خوراک وغیرہ سرکاری طور پر مہیا کی جاتی ہے۔ لہٰذا اگر کوئی کینسر کا مریض حکیم امین صاحب کی خدمت سے فائدہ اٹھانا چاہیے تو براہ راست حکیم صاحب سے یا ایڈیٹر شانِ ہند کی وساطت سے رجوع کر سکتا ہے۔ ایسی ادویات جو دواخانہ میں میسر نہ ہوں گی ان کے لیے مریضوں کو خود کفیل ہونا ہوگا۔

جناب محمود عالم کلکتہ

اخلاص اور خدمتِ خلق نیز انسانی ہمدردی کی تثلیث جناب محمود عالم اپنی ذات میں ایک انجمن رکھتے ہیں۔ آپ بہار شریف کے رہنے والے ہیں اور کلکتہ میں بسلسلہ کاروبار ایک مدت سے مقیم ہیں۔ اردو آپ کا اوڑھنا بچھونا ہے اور بقائے اردو کے لئے آپ ہر وقت ہر ممکنہ خدمت کے لئے تیار ہیں۔ شانِ ہند کے مداحوں میں آپ صفِ اول کے خون دینے والے مجنوں ہیں۔ آپ ایک اچھے شاعر بھی ہیں اور اردو ادب کا مطالعہ آپ کا واحد مشغلہ ہے۔ اردو رسائل اور اردو کتابیں خریدنے کے لئے اردو خواں حضرات کو تلقین کرنا آپ کا مشن ہے۔ غرضیکہ اردو پڑھو۔ اردو لکھو اور اردو بولو کا جیتا جاگتا اور چلتا پھرتا سائن بورڈ عالم صاحب کو دیکھا جا سکتا ہے۔

جشنِ جمہوریت کا مشاعرہ لال قلعہ

حسبِ سابق ۲۴ جنوری کو جشنِ جمہوریت کا مشاعرہ لال قلعہ میں ہو رہا ہے۔ دلی انتظامیہ نے کسی قدر ہوش مندی کا ثبوت دیا ہے کہ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر اور جناب مہیشور دیال صاحب کو مشاعرہ کمیٹی کے ممبران میں شرکت کی دعوت دی۔ کنور صاحب نے تو عطائے تو بہ لقائے تو کہتے ہوئے اس دعوت کو نامنظور کر دیا ہے مگر جناب مہیشور دیال صاحب نے اس دعوت کو منظور کر لیا۔ دلی انتظامیہ نے اس مرتبہ تھوڑی سی مزید عقل مندی بھی دکھائی کہ پروانہ ردولوی کو اس مرتبہ مشاعرہ کمیٹی کا ممبر نہیں رکھا۔ گوپال متل مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے مشاعرہ کمیٹی کے ممبر ہونے کی صورت میں مشاعرہ لال قلعہ میں پڑھنے سے حسبِ سابق انکار کر دیا کیونکہ گزشتہ [illegible] پر یہ طے ہوا تھا کہ مشاعرہ کمیٹی کے ممبران مشاعرہ میں نہ پڑھ سکیں گے مگر اس مرتبہ یہ شرط ختم کر دی اور اسی وجہ سے بہار برنی صاحب باقاعدگی کے ساتھ مشاعرہ کمیٹی کے [illegible] حاضر رہتے ہیں۔ یعنی بہار برنی، کامل قریشی اور ایک آدھ اور ایسے شاعر کو لال قلعہ مشاعرہ میں پڑھنے کا پرمٹ مل گیا ہے۔ اس مرتبہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کو مشاعرہ کا کنوینر مقرر کیا گیا ہے۔ جنہوں نے جناب مہیشور دیال صاحب کے صلاح و مشورہ سے شعرا کا انتخاب کیا ہے۔ مگر ہمیں یہ کہنے میں کوئی عذر نہیں کہ دلی انتظامیہ کے ذمہ دار حضرات کو تو واقعی یہ علم نہیں ہے کہ کچھ ایسے لوگ بھی دلی میں موجود ہیں جو ہندوستان کے ہر شاعر کو جانتے ہیں اور جن کی رائے کو صائب سمجھا جاتا ہے کہ وہ جس شاعر کا بھی انتخاب کریں گے وہ مشاعرہ میں ضرور کامیاب ہوگا۔ مگر کمیٹی کے دوسرے ممبران تو جانتے ہیں کہ ایسے صائب الرائے حضرات کون کون سے ہیں۔ کیا ان کا فرض نہیں تھا کہ وہ انتظامیہ کو بتاتے کہ ممبرانِ کمیٹی میں فلاں فلاں اصحاب کو بھی شامل کیا جائے تاکہ ان کے مشوروں سے فائدہ اٹھایا جا سکے مگر یہ پڑھے لکھے ممبران اس قدر تنگ دل ہیں کہ وہ اپنے سوا کسی دوسرے کو بہتر کہہ دیں تو انہیں یہ کھٹکا لگتا ہے

(باقی صفحہ پر)

بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر

سرور تونسوی

سردار دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر "ریاست" کو کسی ریاست کے مہاراجہ نے وسکی سیٹ تحفتاً بھجوایا۔ صراحی اور چھ گلاس پر جو نقاشی کی گئی تھی وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ سردار صاحب کا کہنا تھا کہ یہ سیٹ مہاراج نے لندن سے پچاس پاؤنڈ میں خریدا تھا۔ سردار صاحب نے وسکی کبھی نہیں پی۔ ہاں برانڈی وہ ضرور پیتے تھے اور وہ بھی "ہنزے تھری اسٹار" نہ معلوم یہ کیسے مشہور ہو گیا تھا کہ سردار صاحب بہت بڑے شرابی تھے حالانکہ انھوں نے کبھی دو چھوٹے پیگ سے زیادہ برانڈی بھی نہیں پی اور نہ ہی انہیں روزانہ پینے کی عادت تھی۔ مولانا عبدالحق ہاپوڑی (انجمن ترقی اردو والے بابائے اردو) کے بھائی عادی پینے والے تھے اور جی بھر کر پینے والے تھے۔

سردار صاحب نے ایک دن ہنزے تھری سٹار کی بوتل منگائی اور اس صراحی میں برانڈی ڈال کر ابھی گلاس میں آدھا پیگ ڈالا ہی تھا کہ مولانا عبدالحق صاحب کے بھائی تشریف لے آئے۔ سردار صاحب نے فوراً دوسرا گلاس منگایا اور مولانا کے لئے پورا پیگ بنا کر پیش کیا۔ مولانا کے دوسرے پیگ کے ساتھ سردار صاحب نے بھی [illegible] ساتھ دیا۔ اس کے بعد سردار صاحب تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ایک گھونٹ پیتے اور اتنا ہی پانی گلاس میں ڈالتے جاتے مگر مولانا نے پانچ بڑے پیگ پینے کے بعد صراحی جس میں ابھی نصف بوتل برانڈی موجود تھی اٹھائی اور اپنے تھیلے میں ڈال کر کرسی سے اٹھے اور فرمانے لگے اچھا سردار صاحب آداب اب اجازت دیجیے۔ سردار صاحب نے فرمایا۔ مولانا یہ صراحی تھیلے میں کیوں رکھ لی ہے۔ مولانا نے بڑی معصومیت کے ساتھ فرمایا سردار جی یہ صراحی آپ کے پاس تو رہے گی نہیں۔ کوئی نہ کوئی اسے لے جائے گا اور جب کسی نے لے ہی جانی ہے تو پھر میں ہی کیوں نہ لے جاؤں۔ سردار صاحب نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور فرمانے لگے ٹھہریئے چھ گلاس بھی ساتھ لیتے جایئے اور مولانا پورا وسکی سیٹ مع نصف بوتل برانڈی لئے یہ جا وہ جا۔

سردار صاحب نے ریڈیو کی کیبنٹ ہاتھی دانت کی بنوائی.... جو اتنی خوبصورت تھی کہ بس دیکھتے ہی رہیے۔ محلے کی ایک لڑکی پھولاں جس کی عمر زیادہ سے زیادہ آٹھ دس سال ہوگی۔ سردار صاحب کے ہاں اکثر آتی تھی۔ اس نے جب شام کو ریڈیو دیکھا تو وہ جتنی دیر بیٹھی رہی۔ ریڈیو کو ہی دیکھتی رہی۔ جب یہ لڑکی معمول سے زیادہ وقت بیٹھی رہی تو اس کی بہن اور بھائی اسے بار بار بلانے آتے کہ گھر چلو ماں بلا رہی ہے تو پھولاں یہی کہتی رہی کہ ابھی آتی ہوں اور وہ ٹکٹکی لگائے ریڈیو کو دیکھتی ہی رہی۔ جب گھر والوں نے اسے بلانے کا تقاضا زیادہ کر دیا تو سردار صاحب نے کہا کہ پھولاں تو جاتی کیوں نہیں۔ اس پر وہ بے دلی سے اٹھی اور کہنے لگی "بھا پاجی تسیں اکھیاں سی ناں کہ جدوں تیرا ویاہ ہو و[illegible] نوں جہیڑی چیز منگیں گی او ہو دیاں گا" (بھا پاجی آپ [illegible] تھا جب تیری شادی ہوگی تو تو جو چیز بھی مانگے گی وہی لے دوں گا) سردار صاحب نے اپنے وعدے کی حامی بڑے زوردار الفاظ میں بھری تو پھولاں کہنے لگی "تے فیر مینوں اے ریڈیو دے دیو" (تو پھر مجھے یہ ریڈیو ہی دے دیجیے) سردار صاحب نے اپنے ملازم کو آواز دی اور حکم دیا کہ یہ ریڈیو اٹھا کر اس لڑکی کے گھر چھوڑ آؤ۔ اور دوسرے دن ریڈیو کا لائسنس بھی پھولاں کے نام ٹرانسفر

کرا دیا گیا۔

مضطر ہاشمی آل انڈیا ریڈیو میں ملازم تھے۔ ایک دن شام کے وقت سردار صاحب کے ہاں آئے اور ان کے کان میں کچھ کہا۔ سردار صاحب نے فرمایا۔ [illegible] صاحب کمرے میں میری میز پر کیش کا ڈبہ پڑا ہے اٹھا لائیے (کریم کریکر بسکٹ کا ٹین کا ڈبہ سردار صاحب کا کیش بکس ہوتا تھا) میں نے یہ ڈبہ لا کر دیا تو اس میں سو سو روپے کے تین نوٹ رکھے تھے وہ نکالے اور مضطر ہاشمی کو دے دیئے اور وہ فوراً واپس چلے گئے۔ مضطر ہاشمی کے جانے کے بعد سردار صاحب کے بڑے لڑکے کھوبی نے کہا کہ کل پرچہ چھپنا ہے کاغذ لینا تھا اور آپ نے روپیہ دے دیا ہے اس پر سردار صاحب نے غضبناک آنکھوں سے کھوبی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ایسی تیسی میں گیا پرچہ ایک دوست کی ضرورت تو پوری ہو گئی۔ مگر دوست کی یہ ضرورت پوری کرنے کے باعث اس ہفتہ ریاست چھپ ہی نہ سکا اور دو ہفتوں کا مشترکہ شمارہ شائع کرنا پڑا۔

سردار صاحب ہمیشہ مقروض رہتے مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جب بھی ان کے پاس روپیہ آیا تو انہوں نے سب سے پہلے قرضوں کی ادائیگی کی طرف توجہ دی۔ سردار صاحب کے ہاں ایک صاحب کام کرتے تھے۔ جب ان کی تنخواہ کا اٹھارہ سو روپیہ سردار صاحب پر واجب الادا ہو گیا تو وہ صاحب ان کی ملازمت چھوڑ کر روزنامہ "ملاپ" جالندھر میں چلے گئے۔ آٹھ ماہ بعد جناب سید محمود صاحب وزیر حکومت بہار نے اخبار "ریاست" کی ایک سو کاپیوں کے زر سالانہ کا ڈرافٹ بھجوایا تو سردار صاحب نے سب سے پہلے اٹھارہ سو روپیہ ان صاحب کو جالندھر بھجوایا۔ ان صاحب کا کہنا ہے کہ جب انہیں یہ اٹھارہ صد روپیہ ملا تو دوسرے دن ان کی لڑکی کی برات آنے والی تھی۔

سردار صاحب کا کوئی بھی ملاقاتی اجازت لئے بغیر ان کے کمرے میں نہیں جا سکتا تھا۔ ترا بہرام خاں والے مکان میں دفتر نچلی منزل میں تھا اور سردار صاحب دوسری منزل میں بیٹھتے تھے۔ ہر ملاقاتی کا نام وغیرہ لکھ کر چپراسی کو دیا جاتا اور وہ سردار صاحب کے ہاں لے جاتا۔ اگر انہوں نے اجازت دی تو ملاقاتی کو اوپر بھیج دیا جاتا اور اگر انہوں نے انکار کر دیا تو ملاقاتی سے دفتر کے منیجر معذرت چاہتے (مگر یہ شرط جوش ملیح آبادی کے لئے نہیں تھی) ایک روز سردار صاحب کے بھانجے بیج بکھتہ جو میدان جنگ سے واپس آئے تھے۔ سردار صاحب سے ملنے آئے اور بغیر اطلاع دیئے اوپر چلے گئے۔ بس پھر کیا تھا۔ سردار صاحب کی دیوان سنگھی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ فرمانے لگے کہ تم منیجر ہو تمہیں اتنی بھی عقل نہیں کہ کسی کے کمرے میں بغیر اجازت نہیں جانا چاہیئے۔ اگر میں اس وقت .....

..... کر رہا ہوتا۔ بیچارہ منیجر بکھتہ جو کئی سالوں کے بعد بڑے ارمانوں کے ساتھ ماموں سے ملنے آیا تھا۔ نہ جانے [illegible] کی تصویر بنا سب کچھ سنتا رہا۔ جب سردار صاحب کی گھن گرج قدرے کم ہوئی تو منیجر بکھتہ نہایت احترام سے ہاتھ جوڑ کر اور سر جھکا کر نمسکار کر کے چلا گیا۔

سردار صاحب کے جب کسی سے تعلقات خراب ہو جاتے تو خواہ وہ کتنا ہی قریبی دوست کیوں نہ رہا ہو اس سے بول چال تو بند ہی کر دیتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی اپنے دروازے بھی اس پر بند کر دیتے تھے۔ پھر کیا مجال کہ وہ سردار صاحب کو منا سکے یا اپنا اصلی یا مفروضہ قصور معاف کرا سکے۔ مگر چرنجیت لال ایڈووکیٹ نے اس سلسلے میں نظیر قائم کی کہ پندرہ سال تک متواتر ہر دوسرے تیسرے دن سردار صاحب کے ہاں آ کر ملاقات کی اجازت مانگتا اور انکار ہونے پر چپ چاپ واپس چلا جاتا۔ یہاں تک کہ سردار صاحب بے نقط گالیاں بھی سناتے۔ مگر آفرین ہے چرنجیت لال کی کہ اس نے سردار صاحب کو ہرا کر ہی چھوڑا۔ ایک دن چرنجیت لال صبح سویرے ہی آ کر سردار صاحب کے دروازے پر بیٹھ گئے اور چپراسی سے کہلوا دیا کہ منیجر

صاحب جب تک آپ ملاقات کی اجازت نہیں دیں گے میں یہیں بیٹھا ہوں۔ نہ کچھ کھاؤں گا نہ پیوں گا۔ماہ جون کے دن ۔ دفتر کے اسٹاف نے چرنجیت لال کی ہر خدمت کرنے کی کوشش کی ۔ مگر اس نحیف وکیل نے پانی پیا اور نہ کچھ کھایا۔ سردار صاحب نے کہلوایا کہ اُسے کہہ دو وہ چلا جائے وگرنہ پولیس کو بلوا کر نکلوا دیا جائے گا۔ مگر چرنجیت لال صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے۔ شام کے سات بجے حسب معمول میں اور ماسٹر امیر کھنہ جب سردار صاحب کے ہاں پہنچے تو اس تمام صورت حال سے آگاہی ہوئی۔ میری تو ہمت نہ ہوئی مگر ماسٹر امیر چند کھنہ نے سردار صاحب سے کہا کہ دیوان سنگھ ویسے چرنجیت لال نے تیرے کپڑے مال رہے نہیں کہ اپنی بخشش ہی نہیں ہندی۔ د دیوان سنگھ اس چرنجیت لال نے کونسے تیرے ماں کے کھیت اجاڑ دیے ہیں جو اس کی بخشش نہیں ہو رہی، اس پر سردار صاحب نے قہقہہ لگایا اور کہا کہ بلا لے اُس حرامزادے کو۔

منشی عبدالقدیر صاحب دہلی کی مشہور علمی، ادبی شخصیت کے مالک تھے اور ایسے پختہ کانگریسی شاید و باید ہی [illegible] آئے ہیں۔ دہلی میں ایک مسلم لیگی لیڈر کا قتل [illegible] ان منشی عبدالقدیر صاحب کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ کچھ ملزمین ضمانت پر رہا ہوئے تو اُن میں منشی عبدالقدیر [illegible] منشی صاحب سردار دیوان سنگھ کے [illegible] اور سردار صاحب منشی صاحب کے ثناخواں تھے۔ منشی جی [illegible] روز بانٹنا ہو یا آندھی سردار صاحب سے ملنے ضرور [illegible] سردار صاحب کو یقین تھا کہ اس [illegible] میں منشی عبدالقدیر کا قطعاً کوئی ہاتھ نہ تھا۔ مگر مقدمہ کی [illegible] میں سماعت ہو رہی تھی وہ چغلی کھا رہی تھی کہ پولیس کئی بے گناہوں کو سزا دلوا کے رہے گی اور منشی عبدالقدیر ایسے بے گناہ کا بچنا بھی مشکل نظر آتا تھا۔ سردار صاحب منشی جی کو بچانے کی تراکیب [illegible] جب سیشن جج نے مقدمے کے فیصلے کی [illegible] مقرر کر دی تو سردار صاحب نے سیشن جج کو

اپنے ہاں کھانے پر بلایا۔ جناب توکلی ایڈووکیٹ اور اسی قسم کے دیگر معززین کو بھی مدعو کیا گیا۔ سردار صاحب کی اسکیم کے مطابق ایک صاحب نے اس سیاسی قتل کا ذکر چھیڑ دیا۔ سردار صاحب نے تفصیل سے اس واقعہ کو بیان کیا اور باتوں باتوں میں یہ بھی کہہ دیا کہ سارے [illegible] بے گناہ ہیں اور پولیس نے اصل مجرموں کو تو چھوڑ دیا ہے اور بے گناہوں کو پھانسی پر لٹکوانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ یہ سب باتیں سننے کے بعد سیشن جج کہنے لگے کہ سردار صاحب یہ مقدمہ تو میری عدالت میں چل رہا ہے۔ یہ سنتے ہی سردار صاحب فرمانے لگے ۔ اوہو معاف فرمائیے گا اگر مجھے یہ معلوم ہوتا تو میں اس سلسلے میں کوئی بات بھی نہ کرتا ہر تو . . . صاحب نے ذکر چھیڑ دیا تو جو کچھ مجھے اصل حالات معلوم تھے بتا دیے۔ جب اس مقدمہ کا فیصلہ سنایا گیا تو سیشن جج نے تمام ملزمان کو باعزت بری کر دیا اور پولیس کے خلاف سٹرکچر پاس کیا کہ بے گناہوں کو پھانسا گیا ہے۔ منشی عبدالقدیر صاحب نے سردار صاحب کا یہ احسان ہمیشہ یاد رکھا۔ افسوس ہے کہ ایک جھوٹی اطلاع پر سردار صاحب نے منشی عبدالقدیر سے بھی تعلقات منقطع کر لئے۔ انہی منشی عبدالقدیر صاحب نے ہی سردار دیوان سنگھ کے کہنے پر مجھے محلہ سوئی والاں میں مکان کرایہ پر دلایا تھا۔

سردار صاحب جب کسی ریاست کے نواب یا راجے کے خلاف مہم چلاتے اور معاملہ لین دین کا طے ہو جاتا تو روپیہ لینے وہ خود کبھی نہیں جاتے تھے بلکہ اس کام کے لئے ماسٹر امیر چند کھنہ ۔ جناب شیو نارائن بھٹناگر ایڈیٹر وطن ۔ اور . . . . . نوطیری پبلک کی خدمات مستعار لیتے تھے اور اس خدمت کا معاوضہ وہ فیاضی کے ساتھ ادا کرتے تھے۔ چنانچہ ماسٹر امیر چند کھنہ ایک ریاست میں سردار صاحب کے لیے روپیہ لینے کے لئے گئے تو والی ریاست نے ماسٹر امیر چند کھنہ کو قتل کرا دینے کی اسکیم بنائی۔ کسی طرح امیر چند کھنہ کے کانوں میں بھی اس کی بھنک پڑ گئی اور وہ آدھی رات کو کسی نہ کسی طرح

جہان خانہ سے نکل کر کئی میل پیدل چل کر انگریزی علاقے میں ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر پہنچے اور جس سمت کی بھی ریل انہیں پہلے ملی وہ اسی میں سوار ہو کر پانچ چھ دنوں کے بعد حواس باختہ دہلی پہنچے اور سارا واقعہ سردار صاحب کو سنایا تو جہاں سردار صاحب نے دانت پیستے ہوئے والی ریاست کو بے نقط سنائیں۔ وہاں امیر چند کھنہ کو اس سے زیادہ روپیہ دیا جو وہ اس حالت میں دیتے۔ جبکہ ماسٹر امیر چند کھنہ اس والی ریاست سے روپیہ لاتے۔ مگر اس کے بعد ماسٹر امیر چند کھنہ نے ایسی خدمت سے کنارہ کشی کر لی۔

غالباً ریاست اودے پور کے والی ریاست اور اُن کے بھائی میں ناچاقی ہو گئی۔ مہاراج کے بھائی سردار صاحب کے ہاں آئے اور "ریاست" میں مہاراج کے خلاف مہم شروع کرنے کے لئے ان کی مدد چاہی اور ساتھ ہی دس ہزار روپے کے نوٹ سردار صاحب کی میز پر رکھے مگر سردار صاحب اس خدمت کا معاوضہ ۲۵ ہزار چاہتے تھے اور اودے پور والے صاحب دس ہزار سے زائد دینے کو تیار نہ تھے۔ ہاں منت سماجت ضرور کر رہے تھے کہ اتنے میں ہی کام کر دیجئے۔ سردار صاحب زود رنج تو تھے ہی غصہ میں آ کر دس ہزار کے نوٹ اٹھائے اور کھڑکی سے باہر سڑک پر پھینک دیے۔ جی۔ بی روڈ پر (اُن دنوں ریاست کا دفتر اجمیری گیٹ کے باہر جی بی روڈ پر تھا)۔ اودے پور والے حضرات نوٹ اکٹھے کر رہے تھے اور کئی راہگیر نوٹوں کی اس بارش میں فیضیاب ہوئے۔ جب سردار صاحب پر ریاستوں کے خاتمے کے بعد مالی بدحالی کا سایہ منڈلانے لگا تو ماسٹر امیر چند کھنہ کہتے تھے کہ سردار جی وہ دن یاد کیجئے جب آپ دس دس ہزار کے نوٹ کھڑکی سے باہر پھینک دیا کرتے تھے۔ آپ نے روپیہ کی بے قدری کی اور اب روپیہ آپ کی بے قدری کر رہا ہے۔

سردار صاحب کے ہاں تبادلہ میں سینکڑوں اخبارات آتے تھے جنہیں بغیر کھولے ہی وہ ایک کمرے میں پھینک دیا کرتے تھے اور سال کے بعد کئی من ردی فروخت ہوتی تھی۔ چاوڑی بازار کی ایک مشہور طوائف حج پر جا رہی تھی (اُن دنوں چاوڑی بازار میں گانے والی طوائفیں اپنا دھندا کرتی تھیں) وہ سردار صاحب کے ہاں آئی اور ایک رومال میں بیس ہزار روپے کے بندھے نوٹ دے کر کہنے لگی۔ سردار صاحب یہ میری امانت اپنے پاس رکھ لیجئے۔ جب میں حج سے واپس آؤں گی تو لے لوں گی۔ سردار صاحب نے بغیر نوٹ گنے بندھا بندھایا رومال اس خاتون سے لے کر اس ردی والے کمرے میں پھینک دیا۔ کچھ دنوں بعد لالہ شیو نارائن بھٹناگر ایڈیٹر وطن سردار صاحب کے ہاں آئے اور کچھ روپیہ قرض کے طور پر طلب کیا۔ سردار صاحب نے فرمایا کہ بھٹناگر جی میں جھوٹ بول نہیں سکتا۔ میرے پاس بیس ہزار روپے ہیں مگر میں اس میں سے ایک پیسہ بھی نہیں دے سکتا۔ بھٹناگر صاحب نے بیس ہزار روپیہ کا نام سنا تو اُن کے کانوں نے اس انکشاف کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے سوچا کہ چیل کے گھونسلے میں ماس کیسے ہو سکتا ہے۔ انہوں نے سمجھا کہ سردار صاحب انہیں بے وقوف بنا رہے ہیں۔ بھٹناگر صاحب نے کہا اچھا سردار صاحب میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ سے روپیہ نہیں لوں گا مگر مجھے وہ بیس ہزار روپیہ دکھا دیجئے۔ سردار صاحب نے بڑی بے اعتنائی سے اُس اندھیرے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ان ردی اخبارات میں پڑا ہے۔ بھٹناگر کمرے میں گئے اور چند منٹ میں اخبارات کو ادھر اُدھر کرنے کے بعد بیس ہزار کے نوٹوں کے رومال میں بندھے ہوئے بنڈل کو اٹھا لائے۔ بھٹناگر صاحب نے رومال کھول کر نوٹ گنے تو پورے بیس ہزار کے تھے۔ سردار صاحب نے کہا کہ ویسے ہی باندھ کر وہیں پھینک دو۔ چنانچہ جب یہ طوائف حج سے واپس آئی تو کچھ دنوں کے بعد اپنی امانت واپس لینے کے لئے سردار صاحب کے پاس آئی تو سردار صاحب نے فرمایا کہ جہاں رومال پھینکا گیا تھا وہیں سے اٹھا لیجئے۔

کل ہند مشاعرہ دیوالی ملن جے پور

سرور تونسوی

آج ۴ نومبر ۱۹۷۸ء رات کے ساڑھے نو بجے ہیں۔
شہید عبدالحمید نگر جے پور میں [illegible] انجمن اردو ادب جمعیۃ القریش
کے زیر اہتمام دیوالی ملن کا کل ہند مشاعرہ کا پنڈال جگ مگ
جگ مگ کر رہا تھا۔ جے پور جو ہمیشہ ہندو مسلم اتحاد کے سلسلے میں ایک
مثالی شہر رہا ہے۔ یہ اس کی پرانی روایات کے عین مطابق
ہے کہ آج جے پور میں عید ملن کا مشاعرہ اپنی مثال آپ تھا
تو آج کا دیوالی ملن کا مشاعرہ بھی زبان حال سے پکار پکار کر کہہ
رہا ہے کہ جے پور میں مسلمان اپنے ہم وطنوں کی خوشیوں میں
برابر کے شریک ہیں۔ اس سلسلے میں جناب مسرت اعجازی
جناب نبیاز علی صاحب اور جناب ہاشم علی خاں آف جے پور
مبارکباد کے مستحق ہیں جنھوں نے دیوالی کی خوشیوں
کو دوبالا کرنے کے لئے اپنے ہم وطنوں کا ساتھ دیا ہے۔
جناب گردھاری لال صاحب بھارگو ایم ایل اے اور
محترمہ اُجلا اروڑہ صاحبہ ایم۔ایل اے نے جس طرح
عید ملن مشاعرہ میں دل و جان سے تعاون دیا تھا اسی
طرح آج دیوالی ملن کا مشاعرہ بھی اُن کا مرہون منت ہے
جناب مسرت اعجازی صاحب نے آج کے مشاعرہ کے
سلسلے میں بہت اچھی تقریر فرمائی ہے اور اُن شعراء کرام
کے اسمائے گرامی سے سامعین کو واقفیت دلائی ہے جو
آج کے مشاعرہ کے لئے تشریف لا چکے ہیں۔ مسرت
اعجازی نے فرمایا کہ شمیم جے پوری حسب اعلان مشاعرہ
میں اس لئے شریک نہ ہوسکیں گے کہ وہ ہندوستان
کے نمائندہ کے طور پر جدہ کے مشاعرہ میں تشریف لے
گئے ہیں۔ اس سلسلے میں مسرت صاحب کی خدمت میں
یہ گزارش کرنا ضروری ہے کہ شمیم صاحب کو وہ ہم سے بہتر
جانتے ہیں کیونکہ وہ بھی جے پوری ہیں۔ مگر یہ نہ بھولیں

کہ شمیم جے پوری بیچارا کیا ہندوستان کی نمائندگی کرے گا
اگر ایسے شعراء ہندوستان کی نمائندگی کریں گے تو پھر
لفظ نمائندہ بیچارا شرمندۂ معنی ہوکر رہ جائے گا۔
جناب فضل امام صاحب رکن شعبہ اردو راجستھان یونیورسٹی
نے مولانا قمر واحدی صاحب صدر اردو اکاڈمی راجستھان
(جس کا وجود صرف کاغذوں میں ہے) [illegible]
کی صدارت کے لئے پیش کیا ہے۔ [illegible] مسرت اعجازی
صاحب نے تائید فرمائی ہے اور جناب قمر صاحب واحدی
مسند صدارت پر تشریف لے آئے ہیں۔ پانچ منٹ
کے بعد افتخار الشعراء جناب حکیم فتح محمد صاحب تشریف
لائے اور اسٹیج پر صاحب صدر کے قریب بیٹھ گئے ہیں۔
مگر ایک نوجوان شاعر ان کے پاس گئے ہیں کہ آپ کو
باہر کوئی صاحب بلا رہے ہیں۔ افتخار الشعراء چپ چاپ
اُٹھ کر اپنے گھر چلے گئے ہیں۔ کمینگی کی ایسی مثال کم
ملے گی کہ ایک بزرگ کو اُس کے گھر سے نہایت عزت و
احترام سے بلا کر لایا جائے اور پھر سازش کرکے انہیں یوں
بے عزت کیا جائے۔ افتخار الشعراء بزرگی، حکمت اور
شرافت کے معاملے میں جو مقام رکھتے ہیں اُس کی گرد
کو بھی وہ لوگ نہیں پہنچ سکتے جو انہیں اس طرح تضحیک کا
نشانہ بناتے ہیں۔ منتظمین مشاعرہ کے لئے بھی یہ مناسب
نہیں تھا کہ ایک چھوکرا جو شاعری کی الف ب سے
بھی واقف نہیں ایک معمر بزرگ سے اس قسم کی
کمینہ پن کی حد تک گستاخی کا مرتکب ہو۔ افتخار الشعراء
تو اسٹیج سے اُٹھ کر چلے گئے مگر جاتے ہوئے ایسی بددعا
دے گئے کہ اسٹیج آخر تک ویران ہی رہا۔ ایک کونے پر
صدر صاحب تشریف فرما رہے۔ دوسرے کونے پر

نقیب الشعر جناب فضل امام صاحب مشاعرے کی نظامت فرما رہے تھے۔ اور جب دربار (مہاراجہ بھوانی سنگھ جی) تشریف لائے تو وہ تیسرے کونے پر تشریف فرما رہے۔ باقی سٹیج خالی پڑا رہا۔

ڈاکٹر فضل امام کی ابتدائی تقریر ادبی رنگ لیے ہوئے تھی مگر اُن کا لب ولہجہ اناؤنسمنٹ کے لیے درست نہیں ہے۔ اُن کی زبان بولتے وقت الفاظ کو صاف نہیں نکالتی۔ بہرکیف انہوں نے اخگر جے پوری مرحوم کی غزل سے مشاعرہ شروع کرایا ہے۔ اخگر صاحب کی غزل کوئی ریڈیو آرٹسٹ سنا رہے ہیں جن کا ترنم مردہ اور غزل پڑھنے کا انداز اناڑی پن کی غمازی کر رہا تھا۔ اگر ریڈیو جے پور کے گلوکار آرٹسٹ ایسے ہی ہیں تو پھر جے پور ایسے شہر جہاں کا بچہ بھی سُر میں روتا ہے۔ اپنی موسیقی کی روایات کو بیٹھ رکھالے گا۔ یہ صاحب مطلع غلط پڑھ رہے ہیں۔ درستی کی طرف توجہ دلائی گئی تو کہنے لگے لکھا ہی ایسا ہے۔ خدا خدا کرکے مرثیہ کے رنگ میں انھوں نے غزل سنا کر ختم کی تو پھر ڈاکٹر فضل امام نے اُردو کی تعریف میں تقریر فرمائی اور کہا کہ الیکشن میں اُردو عاملہ ہوجاتی ہے (مگر انہوں نے یہ نہ بتایا کہ یہ حمل حرام کن حضرات کی مہربانی سے قرار پایا ہے) افسوس ہے کہ ڈاکٹر فضل امام اس قسم کے ناشایستہ الفاظ استعمال فرما رہے ہیں۔

دس بجے پہلے شاعر جناب حسین کوثری مائیک پر تشریف لاتے ہیں اور فرماتے ہیں

جب کوچۂ جاناں تجھے آباد کیا ہے
کیوں طوق و سلاسل نے مجھے یاد کیا ہے
ہنس ہنس کے وہ تم نے مجھے برباد کیا ہے
رو رو کے کسی نے مجھے کیوں یاد کیا ہے

حسین کو سنا تو اُن کے والد محترم جناب شمیم کوثری مرحوم یاد آگئے۔ وہ بھی اسی طرح پڑھتے تھے۔ حسین نے نوزائیدہ کی گئی ہے۔ ان کا ش [illegible] بالکل بچہ ہے۔ [illegible]

جناب فرید الوبی کو یاد فرمایا ہے۔ سنئے اچھے ترنم سے ارشاد ہوا ہے ؎

زباں پہ شکوۂ بے داد لا نہیں سکتے
تڑپ رہے ہیں مگر لب ہلا نہیں سکتے
وہ اپنے ڈھائے ہوئے ظلم بھول سکتے ہیں
مگر ہماری وفائیں بھلا نہیں سکتے
غمِ حیات کے ماروں کو یہ جہاں والے
رُلا تو سکتے ہیں لیکن ہنسا نہیں سکتے
انہیں تو اور بھی دل میں لگا نا آتا ہے
یہ اشک دل کی لگی کو بجھا نہیں سکتے
فرید اشک چھلکتے ہیں بات کرنے میں
ہم اپنا رازِ غمِ دل چھپا نہیں سکتے

محترم اجلا ارورڑہ ایم۔ [illegible] اے اور جناب گردھاری لال صاحب بھاگو ایم۔ [illegible] اے تشریف لائے ہیں اور وی آئی پی ونگ [illegible] تشریف فرما ہوگئے ہیں۔

ڈاکٹر فضل امام صاحب نے ملاپ چند راہی صاحب کا ایک شعر پڑھ کر انہیں بلایا ہے۔ سنئے راہی صاحب عطا فرما رہے ہیں۔

آج پھر بچھڑے ہوئے کچھ یار یاد آنے لگے
جیسے کچھ بھولے ہوئے اشعار یاد آنے لگے
وسعتِ صحرا سے گھبرانے لگی ہے کیوں نظر
کیوں ہمیں گھر کے در و دیوار یاد آنے لگے

داد ہے کہ سامعین کے باذوق ہونے کی تائید کر رہی ہے اور راہی صاحب یوں ستم ڈھا رہے ہیں

شوقِ اظہارِ مسیحائی پریشاں تو نہیں
دفعتاً کیوں آپ کو بیمار یاد کرنے لگے
لے چلا ہے پھر جنوں اہلِ خرد کی بزم میں
پھر ہمیں یارو صلیب و دار یاد آنے لگے

داد ہے کہ ان اشعار کا حق ہے۔ سنئے راہی صاحب کیا فرما رہے ہیں ؎

زندگی تجھ سے تری حالت کا کچھ شکوہ نہیں —
ہاں مگر تیرے الم بردار یاد آنے لگے
اس سے بڑھکر اور کیا ہو ماتم شائستگی
انجمن میں گرمی بازار یاد آنے لگے

راہی صاحب داد کے شور میں اپنی جگہ پر تشریف لے گئے تو ممتاز شکیب صاحب نے مائیک سنبھالا ہے اور اس دور کے نوجوان شعرا کی شاعری کا نمونہ پیش ہے ؎

معجزے علم کے ہر روز دکھاتے جاؤ
لفظ احساس کتابوں سے مٹاتے جاؤ
کوئی تو ہوگا جو غم کی بھی زباں سمجھے گا
سنگ دل شہر میں آواز لگاتے جاؤ
پھر در خواب پہ اندیشہ شب خوں ہے ابھی
سو نہ جائے کوئی آواز لگاتے جاؤ
آنکھ لگ جائے نہ ایثار کے جذبے کی کہیں
دل کے دروازے کی زنجیر ہلاتے جاؤ

اب ڈاکٹر فضل امام صاحب نے اپنی یونیورسٹی کے شعبہ فلاسفی کے ڈاکٹر مجاز سریواستوا کو کلام سنانے کی دعوت دی ہے ۔ مجاز صاحب نے قطعہ سنایا ہے ۔

آرزو میں تباہ کرتا ہوں | رنج و غم سے نباہ کرتا ہوں
زندگی دیکھ میں تری خاطر | کیسے کیسے گناہ کرتا ہوں

دوسرا قطعہ بھی قابل سماعت ہے

پاؤں تھرا گئے کہیں لب سوکھے | خامشی سی فضا پہ چھائی ہے
دیپ بجھنے لگے ہیں راہوں کے | میری منزل قریب آئی ہے

مجاز صاحب کی غزل کے بھی کچھ اشعار سن لیجئے فرماتے ہیں

سوز دروں ہی اشک میں ڈھلتا دکھائی دے
اے دوست یہ چراغ تو جلتا دکھائی دے
آباد بستیوں کے تو گل ہو گئے چراغ
شاید کسی مزار پہ جلتا دکھائی دے
پوچھو نہ اس کی رات گذرتی ہے کس طرح
جس کو یہ چاند آگ اگلتا دکھائی دے

ڈاکٹر مجاز خوب داد پاکر مائیک سے ہٹے تو جناب خداداد خاں صاحب مونس سے کلام سنانے کی درخواست کی گئی ہے ۔ جناب مونس نے نظم شروع کی ہے ۔ پہلا شعر آپ بھی سن لیجئے ۔

ایک دن اٹھا چمن کے رہنے والوں میں سوال
کیا بہاریں بھی کیا کرتی ہیں گلشن پائمال

مونس صاحب کی نظم بہت خوب ہے اور انہیں داد بھی خوب ملی ۔ چونکہ نظم بہت اچھی تھی ۔ میں نے بجائے نوٹ کرنے کے سننا پسند کیا اور یہ سوچا کہ مونس صاحب سے بعد میں نظم کی نقل لے لی جائے گی ۔ انہوں نے نظم بھجوانے کا تحریری وعدہ بھی فرمایا مگر غالباً اپنی مصروفیات کے باعث وہ وعدہ ایفا نہ فرما سکے ۔ اب جناب سحر جے پوری مائیک پر تشریف لائے ہیں اور قطعہ سنایا ہے

یہ ایں خیال زمانے کا غم سمیٹ لیا | نہ جانے پھر غم دنیا نصیب ہو کہ نہ ہو
تمام رات اسی کش مکش میں گذری ہے | سحر کے بعد اجالا نصیب ہو کہ نہ ہو

اس کے بعد رباعی ارشاد فرما رہے ہیں

مے پی ہے تو ساقی ترے در پر پی ہے
اور مے بھی فقط بادہ احمر پی ہے
لیکن جو غریبوں کا لہو پیتے ہیں
میں نے انہیں نظروں سے گرا کے پی ہے

جناب خورشید احمد صاحب سحر جے پوری اچھی داد پاکر اپنی جگہ پر گئے تو فضل امام صاحب نے جناب چاند نرائن صاحب تلکو قہر کو کلام بلاغت نظام عطا فرمانے کی درخواست کی ہے ۔ قہر صاحب نے گنگنانے کے بعد ایک ماہر موسیقی کے انداز میں کلاسیکل راگنی میں غزل شروع کی ہے ۔ ایک تو کلام قہر دوسرے وقت کی راگنی کا مرہون منت ترنم اس مے دو آتشہ کا لطف آپ بھی تو اٹھائیے ۔ ارشاد فرماتے ہیں ؎

اک ہمیں پر یہ ترے لطف و کرم کیسے تھے
اتنی سی بات بھی سمجھے نہیں ہم کیسے تھے
غیر جس گھر میں بھی پہنچا اسے برباد کیا
اللہ اللہ یہ ظالم کے قدم کیسے تھے

تم نے کیا کیا نہ کیا پھر بھی وفا کی ہم نے
یہ بھی سوچا کبھی تم کیسے تھے ہم کیسے تھے
پیچ وہ ڈالے مری گردشِ قسمت نے کہ بس
یاد ہے کس کو کسی زلف کے خم کیسے تھے
ٹھوکریں تو مری تربت کو دیے جاتے ہو
پھر یہ کہتے ہو ترے سر پہ قدم کیسے تھے
ہنستے ہنستے جو زمانے کے ستم جھیل گئے
اللہ اللہ وہ دم کیسے تھے غم کیسے تھے
ہم نے غیروں سے بھی اپنوں کا سا برتاؤ کیا
ایسے ویسوں سے بھی تم پوچھ لو ہم کیسے تھے

داد ہے کہ زبان حال سے کہہ رہی ہے کہ جے پور میں مہر صاحب کا دم غنیمت ہے۔ یہ شعر کئی بار پڑھوایا گیا ہے داد کا شور کچھ کم ہوا تو مہر صاحب فرما رہے ہیں۔

آج تک تو کبھی بھولے سے بھی پورے نہ ہوئے
تیرے اقرار ترے قول و قسم کیسے تھے
میں نے دیکھا جو صنم خانہ تو آیا یہ خیال
اللہ اللہ رے یہ اہلِ حرم کیسے تھے

داد کا پھر وہی حال ہے کہ کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی اور ایمانداری کی بات بھی یہ ہے کہ مونس صاحب کی نظم اور ملکو مہر صاحب کی غزل آج کے مشاعرے کی جان تھیں سنئے مہر صاحب نغمہ سرا ہیں۔

وقت کے ساتھ بھی تحریر یہ مٹتی ہی نہیں
لکھ گئے جو مری قسمت وہ قلم کیسے تھے
آج اے مہر نہیں نام کا لیوا کوئی
یا ہمارے ہی زمانے میں بھرم کیسے تھے

مہر صاحب داد میں شرابور اپنی جگہ تشریف لے آئے ہیں اور ابھی تک سامعین کی داد و تحسین جاری ہے۔ فضل امام صاحب نے جناب پارسا کوثری صاحب کو کلام سنانے کی گذارش کی ہے۔ پارسا فرما رہے ہیں کہ مجھے مہر صاحب سے پہلے پڑھوانا چاہئے تھا۔ ایک صاحب فرما رہے ہیں کہ دونوں بھی پی کر آئے ہو۔ کوئی بات نہیں۔ پہلے مہر صاحب نے پڑھا یا آپ نے ضرورت تو اس بات کی تھی کہ آپ دونوں کا نشہ اترنے سے پہلے پہلے آپ کا کلام سن لیا جائے۔ پارسا صاحب عطا فرما رہے ہیں:

ختم ہوگا نہ فسانہ مرے انجام کے بعد
ذکر تیرا ابھی تو آئے گا مرے نام کے بعد
دل سے تسلیم ہے الزامِ محبت لیکن
اور الزام نہ دو مجھ کو اس الزام کے بعد
سیکڑوں جلوے تھے گو راہ میں فردوسِ نظر
کہیں نظریں نہ جمیں تیرے در و بام کے بعد
میں یہ سمجھا تھا سکوں دل کو ملے گا لیکن
الجھنیں اور بڑھیں نامہ و پیغام کے بعد
آپ پر تو نہیں تہمت مری بربادی کی
آپ افسردہ ہوئے کیوں مرے انجام کے بعد
صرف اتنا تو بتا کاتبِ تقدیر مجھے
اور کیا لکھا ہے اس گردشِ ایام کے بعد
پارسا کاش کہ ساقی یہ بتا دے مجھ کو
اور بھی جام ملے گا کوئی اس جام کے بعد

پارسا نے اپنی روایات کے مطابق خوب سے خوب تر داد پاکر مائیک چھوڑا تو جناب بلرام صاحب کھوسلہ واقف مائیک پر تشریف لائے ہیں اور غزل مرحمت فرما رہے ہیں ؎

ہم عشق کو مے دل کو پیمانہ سمجھتے ہیں
اور محفلِ ہستی کو میخانہ سمجھتے ہیں
وہ لوگ محبت کے رتبے کو نہیں سمجھے
جو اہلِ محبت کو دیوانہ سمجھتے ہیں
یہ بات کہ مے پر ہی موقوف نہیں مستی
وہ حسن کی طبیعت بے رندانہ سمجھتے ہیں
کیا بات ہے میں اپنی روداد سناتا ہوں
اور لوگ اسے تیرا افسانہ سمجھتے ہیں

واقف صاحب داد پاتے ہوئے کس قدر بہترین واقفیت پر مبنی اشعار عطا فرما رہے ہیں۔
سنئے:

اک وہ کہ ہر افسانہ نظروں میں حقیقت تھا
اک یہ کہ حقیقت کو افسانہ سمجھتے ہیں
آگاہ ہیں ہم واقف آدابِ محبت سے
کیوں شمع پہ جلتا ہے پروانہ سمجھتے ہیں

واقف صاحب مناسب داد پاکر مائیک سے ہٹے تو ایک نوعمر لڑکا فاروق میرٹھی مائیک پر آئے ہیں اور یہ "چار مصرعے" سنائے ہیں ؎

وہ خود اپنا دامن بڑھانے لگے
چلو آج آنسو ٹھکانے لگے
ہمارا برا وقت جب ٹل گیا
پھر احباب ملنے ملانے لگے

"ملنے ملانے" کے بعد ان کی غزل نوٹ کرنا وقت ضائع کرنا تھا۔ اول تو جو شاعر "چار مصرعے" کہہ کر قطعہ اور رباعی کے اوزان سے اپنی ناواقفیت کا اعلان کرتا ہے۔ اُسے میں شاعر ہی نہیں سمجھتا۔ دوسرے جو نوعمر لڑکا "چار مصرعے" کہنے کے بعد غزل ایسی سنائے کہ اس کے آباواجداد نے کبھی ایسی غزل نہ کہی ہو تو پھر محض ترنم سن کر تو میں اپنا اور آپ کا وقت ضائع نہیں کر سکتا۔ اب فضل امام صاحب نے کھڑے ہوکر بڑے اچھے انداز میں تمنا جمالی صاحب کا تعارف کرانے کے بعد انہیں کلام سنانے کی دعوت دی ہے ایک آواز آئی ہے کہ آپ کھڑے ہوکر اچھا کنڈکٹ کرتے ہیں۔ اس پر فضل امام صاحب فرمانے لگے "معلوم نہیں کھڑے ہوکر کیا کیا ہوجاتا ہے" ایک اردو لیکچرار کی زبان سے اس قسم کے ناشائستہ اور بازاری الفاظ سن کر ندامت محسوس ہوئی ... کاش فضل امام صاحب نے یہ احساس کیا ہوتا کہ وہ ایک مشاعرہ کنڈکٹ کر رہے ہیں اور معزز خواتین بھی تشریف فرما ہیں۔ سنئے جناب تمنا جمالی بڑے دلکش ترنم میں نغمہ سرا ہو رہے ہیں ؎

دیکھئے وقت کا طیارہ کہاں پر ٹھہرے
اب فضاؤں میں ہر اک سمت ہیں بادل گہرے
میری نظریں مرے حالات کا آئینہ ہیں
شوق سے آپ لگا دیجے زباں پر پہرے
ہو کے ناکام صدائیں مری لوٹ آئی ہیں
کیا ترے شہر میں رہتے ہیں گونگے بہرے

میں نے بھی تمنا جمالی صاحب کو آج پہلی بار سنا ہے۔ مندرجہ بالا چار مصرعے تو اتنے اچھے نہیں جتنی کہ ان کی تعریف سنی تھی۔ اب آپ ...... غزل شروع کر رہے ہیں ؎

تغافل سے تیرے جو برباد ہوگی
تو بستی نہ پھر دل کی آباد ہوگی
جہاں سے میں کہوں بتا دیجئے گا
مری داستاں آپ کو یاد ہوگی

اس شعر پر داد ملی اور تمنا جمالی صاحب فرما رہے ہیں

غلط ہے کہ ہم مستقل چپ رہیں گے
اگر آپ کی ہم پہ بیداد ہوگی
مناسب یہ ہوگا زباں کاٹ دیجئے
نہ ہوگی زباں اور نہ فریاد ہوگی

ان قطعہ بند اشعار پر خوب خوب داد دی گئی۔ ایک بات ماننی پڑے گی کہ اہلِ جے پور داد بھی دیتے ہیں جب شعر داد کا مستحق ہو۔ سنئے تمنا صاحب مقطع ارشاد فرما رہے ہیں

قفس توڑ کر اڑ تو جاؤں تمنا
مگر اس میں توہینِ صیاد ہوگی

ایک صاحب نے بہ آوازِ بلند کہا ہے آپ بے شک پاکستان چلے جائیے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ آواز لگانے والا شخص واقعی سخن فہم ہے۔ ہمارے مسلمان شعراء نہ جانے کیوں وطن کو قفس اور حکومت کو صیاد کہہ کر اشارات و کنایات میں خدا اور وطن کا ناشکرا پن کرتے ہیں۔ تمنا جمالی صاحب غزل سنا کر اپنی جگہ جانے لگے تو سامعین نے اصرار کیا ہے کہ ایک غزل اور سنائیں۔ سنئے تمنا صاحب دوسری غزل شروع کر رہے ہیں ؎

یوں تو ہر ایک سانس مرے دل پہ بار تھا
پھر بھی نفس نفس کو ترا انتظار تھا

تم نے مزاج پوچھ کے تڑپا دیا مجھے
ورنہ غمِ فراق بہت سازگار تھا
ٹوٹی کوئی چٹان تو ذرّوں میں بٹ گئی

ابھی یہ مصرع پڑھا ہی تھا کہ مہاراجہ جے پور کرنل بھوانی سنگھ صاحب تشریف لائے ہیں جن کی آمد پر منتظمین اُن کا استقبال کر رہے ہیں۔ تمنّا صاحب اپنی جگہ پر چلے گئے ہیں کئی حضرات نے مہاراجہ صاحب کی گُل پوشی فرمائی۔ اب فضل امام صاحب نے جناب فاخر جلال پوری کو کلام سنانے کے لئے پکارا ہے۔ دیکھا تو ایک ٹھگنے قد کے شاعر مائیک پر تشریف لائے ہیں آوازیں آنے لگی ہیں کہ پوا پچا۔ فاخر صاحب بڑی شاعرانہ کروفر سے مائیک پر آئے تھے۔ خیال تھا کہ بہت اچھا کلام ہوگا اور ترنم بھی خوب ہوگا مگر سننے والوں کو مایوسی ہوئی اگر یہ صاحب ترنم کی بجائے تحت میں پڑھتے تو یقیناً بہتر رہتے بہر کیف انہوں نے بہت بھدّے ترنم سے یہ دو اشعار سنائے ہیں وہ آپ بھی سن لیجئے ؎

یہ تیری نظر کے پیالے یہ شباب کے اُجالے
انہیں دیکھ کر کہاں تک کوئی اپنا دل سنبھالے
یہ اشارتوں کے پالے اور سنہرے جسم والے
یہ غریب دل بھی آخر ترے حُسن کے حوالے

اس قطعہ پر داد نہ ملی تو غزل شروع کی ہے۔ بات نہ بنی تو دوسری غزل سنانا شروع کی مگر "مجھے مارا ... نگاہ نے" کے مصداق ان کا ترنم ان کو لے ڈوبا اور یہ بُری طرح ناکام ہو کر واپس اپنی جگہ آ گئے ہیں۔ اب فضل امام صاحب نے مشاعرے کو اُکھڑتا دیکھا تو ڈاکٹر وسیم بریلوی سے استدعا کی ہے کہ آیئے اور اس نازک مقام پر ان کی مدد کیجئے۔ ڈاکٹر وسیم بریلوی کے نام کا اعلان سنتے ہی سامعین نے طویل تالیوں سے وسیم صاحب کا استقبال کیا۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وسیم صاحب نے اہلِ جے پور پر جادو کر رکھا ہے۔ عوام۔ ایم۔ ایل۔ اے صاحبان، وزرا۔ وزیرِ اعلیٰ گورنر ان کے کلام کے مداح ہیں اور پچھلے سال جالو پورہ کے مشاعرہ جید ملن کو جس خوبی اور بہتر انداز سے انہوں نے کنڈکٹ کیا تھا اُس کی　　دلوں سے نہیں جا سکتی

وسیم صاحب نے مائیک سنبھال کر بڑے اچھے الفاظ میں عید ملن اور دیوالی ملن مشاعروں کو سراہا۔ وسیم صاحب نے مہاراج کرنل بھوانی سنگھ صاحب کی شایانِ شان طور پر تعریف فرمائی اور منتظمین کو دیوالی ملن مشاعرے کے انعقاد پر مبارکباد دی۔ لیجئے وسیم صاحب تحت میں کچھ اشعار سنا رہے ہیں ؎

لگا رہا ہوں ترے نام کا پھر ایک گلاب
ملال یہ ہے یہ پودا بھی سوکھ جائے گا
وہ ایک بوند جو پھیلاؤ میں سمندر تھی
اُلٹ کے رہ گئی مٹی کے چند ذرّوں میں
میں اک ندی کی طرح بہہ رہا ہوں صدیوں سے
اگر ٹھہر گیا ہوتا تو جھیل ہو جاتا

ہر شعر پر داد پاتے ہوئے وسیم صاحب فرما رہے ہیں ؎

کیوں مرا ساتھ چھوڑ ... ہو
راستہ رہنما نہیں ہوتا
اپنا دل بھی ٹٹول کر دیکھو
فاصلہ بے وجہ نہیں ہوتا

داد حسبِ سابق ملی ہے مگر ایک شاعر فرما رہے ہیں کہ "فاصلہ بے وجہ نہیں ہوتا" کا کیا مطلب ہے

جناب وسیم اپنے مخصوص ترنم میں غزل ارشاد فرما رہے ہیں

کچھ اتنا خوف کا مارا ہوا بھی پیار نہ ہو
وہ اعتبار دلائے اور اعتبار نہ ہو

مطلع سنایا ہی تھا کہ آبدار پانی لئے سٹیج کے سامنے سے گذرا تو وسیم صاحب فرمانے لگے بھائی غیرت دار کو تو ملو بھر پانی کافی ہوتا ہے آپ دو دو بالٹیاں لئے ہوئے ہیں۔ ایک قہقہہ ہے کہ سامعین تازہ دم ہو گئے ہیں اور وسیم صاحب حسنِ مطلع سنا رہے ہیں

ہوا خلاف ہو موجوں پہ اختیار نہ ہو
کسی کی ضد ہے کہ دریا کسی سے پار نہ ہو

داد کی کچھ آوازیں شروع ہوئی تھیں اور وسیم صاحب نغمہ سرا ہیں ؎

میں گاؤں لوٹ رہا ہوں بہت دنوں کے بعد
خدا کرے کہ اُسے میرا انتظار نہ ہو
ذرا سی بات پہ گھٹ گھٹ کے صبح کردینا
مری طرح بھی کوئی میرا غم گسار نہ ہو
گنہگاروں پہ اُنگلی اُٹھائے دیتے ہو
وسیم آج کہیں تم بھی سنگسار نہ ہو

وسیم صاحب نے غزل پر بہت اچھی داد پاکر مائیک چھوڑنا چاہا تو سامعین نے ہنگامہ برپا کر دیا ہے کہ گیت سنیں گے۔ اس پر فضل امام صاحب فرمانے لگے۔ وسیم غزل سے زندہ رہ سکے گا گیت سے نہیں۔ خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ نہ معلوم فضل امام صاحب کو اس بے وقت کی نازگی کی کیا ضرورت تھی۔ اناؤنسر کو بڑی پابندیوں میں رہنا ہوتا ہے۔ مگر ڈاکٹر فضل امام صاحب اس طرح کنڈکٹ کر رہے ہیں جیسے طلبا کو پڑھا رہے ہوں۔ بہرکیف وسیم صاحب نے سامعین کے اصرار پر گیت سنا کر وہ داد پائی کہ فضل امام مُنہ دیکھتے رہ گئے۔

لیجئے اب جناب نظر ایٹوی تشریف لائے ہیں اور اپنے مخصوص ترنم (پہاڑی) میں کم از کم دو سو مرتبہ کی سُنی ہوئی غزل عمر دُنیا تو بھٹکتی ہے دن رات اندھیرے میں روشنائی شروع کی ہے۔ یہ غزل شان ہند میں ہی مختلف مشاعروں کی رُوداد میں کم و بیش پچاس مرتبہ آچکی ہے۔ چنانچہ ایک آواز آئی ہے کہ نظر صاحب آپ کی یہ غزل ہے کہ ستیم شیوم سندرم فلم ہے کہ اسے لوگ بار بار سنیں گے۔ اس غزل کا معاملہ آیا تو اس سلسلہ میں نظر ایٹوی کو اپنی پوزیشن صاف کرنی ہوگی۔ کیونکہ کہا جاتا ہے کہ یہ غزل جناب ندیم علی گڈی کی ہے ندیم صاحب حضرت ابر آحسنی گنوری کے شاگردوں میں ہیں مگر منظر ایٹوی صاحب نے یہ غزل اپنی ملکیت بنالی ہے اور مشاعروں میں سُنا سُنا کر اس کے واحد مالک بن گئے ہیں۔ ندیم صاحب کے پاس دستاویزی ثبوت موجود ہیں کہ یہ غزل اُن کی ہے۔ لہٰذا اس سلسلہ میں نظر صاحب کو اپنی پوزیشن واضح کرنی انتہائی ضروری ہے۔

اب شاعرِ حریت جناب حفیظ میرٹھی سے کلام نظام عطا فرمانے کی التجا کی گئی ہے۔ افسوس ہے کہ ناظم صاحب کو اکثر شعرا کے مقام کا پتہ ہی نہیں بلکہ نہ اصل حالات کا علم ہے۔ عرض کر دیا جائے کہ سارے بھارت میں جناب حفیظ میرٹھی واحد شاعر ہیں جو ایمرجنسی زمانے میں بیسا میں بند رہے۔ رو دو کوڑی کے کو تو بڑے بڑے دار تعارف کے ساتھ بلایا گیا مگر حفیظ جیسے قابلِ تعظیم شاعر کو بغیر کسی تعارف کے بلا لیا گیا۔ خیر حفیظ صاحب ان فروعات سے بالاتر ہیں۔ آپ تو اُن کا کلام سُنئے ؎

زندگی کی بے پناہی کا مداوا کیا کرے
چلچلاتی دھوپ میں زلفوں کا سایہ کیا کرے
کہہ دُنیا سے ہم نے ہم تو حق کے ساتھ ہیں
دیکھنا ہے اب ہمارے ساتھ دُنیا کیا کرے
ہر سہارا بے عمل کے واسطے بے کار ہے
آنکھ ہی کھولے نہ جب کوئی اُجالا کیا کرے
اس سے پہلے آدمی کی اتنی بے قدری نہ تھی
سوچتی ہے آج دُنیا آدمی کا کیا کرے
تھم گئے آنسو جب اُس نے رکھ دیئے آنکھوں پہ ہاتھ
راستے ہی بند ہو جائیں تو دریا کیا کرے
حُسن کے نزدیک ہم ہوتے گئے ہوتے گئے
کوئی دامن زد میں آجائے تو شعلہ کیا کرے
کچھ تو ہوگی رکھ رکھاؤ کی بھی آخر انتہا
غم اگر حد سے زیادہ ہو تو چہرا کیا کرے
رنجِ فرقت ہے محبت کا مقدر اے حفیظ
اس میں رادھا کیا کرے اس میں کنہیا کیا کرے

میں نے داد کا ذکر دانستہ طور پر نہیں کیا تاکہ آپ غزل داد کے شور و غل کی داستان کے بغیر اطمینان سے پڑھیں۔ ہر شعر پر داد دی گئی ہے۔ مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حفیظ میرٹھی اور نازش پرتاپگڑھی جیسے بلند پایہ شعرا مشاعروں کے شاعر نہیں ہیں

کلام سنتا ہو تو مخصوص نشستوں میں سنا جائے۔ خدا اُن دونوں حضرات کو نظرِ بد سے بچائے۔ یہ قوم و وطن کا قیمتی سرمایہ ہندوستان کے لئے مایۂ افتخار ہے۔ لیجئے اب حضرت نازش پرتاب گڑھی مائیک پر تشریف لے آئے ہیں۔ کاش فضل امام صاحب حفیظ میرٹھی اور نازش پرتاب گڑھی ایسے شعراء کے مقام سے واقف ہوتے (واقف تو ضرور ہیں مگر شاید وہ اپنے سے بہتر کسی اور شاعر کو نہیں سمجھتے) افسوس ہے کہ ایسے شعراء کو بغیر تعارف کے مائیک پر بلایا جائے۔ نازش پرتاب گڑھی نے زبان کے بارے میں بہت اچھی مختصر سی تقریر کے بعد ارشاد فرمایا ہے ؎

جہاں بھی چھاؤں گھنی ہو قیام کرتے چلو
ادب جہاں بھی ملے احترام کرتے چلو
زباں کے باب میں من اور تو کی حد کیسی
کوئی زبان ہو انساں کو اس سے کد کیسی
زبان پاک ہے گاؤں کی گوریوں کی طرح
زباں عظیم ہے ماؤں کی لوریوں کی طرح

زبان کی تعریف اس سے بہتر کیا ہو سکتی ہے۔ داد کا شور کم ہوا تو نازش صاحب نے ایک طویل نظم "رات کے پرستار" سنائی ہے اور وہ داد پائی ہے کہ شاید ہی کسی نظم پر اتنی داد مل سکے۔ یہ طویل نظم شانِ ہند کے جشنِ جمہوریت ایڈیشن (اشاعت آئندہ) میں شائع کی جا رہی ہے۔ اب جناب ہلاک رامپوری تشریف لائے ہیں۔ انہوں نے پون گھنٹے تک کلام سنا کر سامعین کو مسرور کیا ہے۔ آپ بھی اُن کا کچھ کلام پڑھ کر تازہ دم ہو لیجئے۔ کیا خوب کہتے ہیں ؎

دلی کی بس میں اک بڑے نیتا بہ کرّ و فر
بے سوچے سمجھے بیٹھ گئے آ کے سیٹ پر
کنڈیکٹر نے اُن سے کہا ہاں بصد ادب
لیڈیز کی یہ سیٹ ہے بیٹھے ہیں جس پہ سر
جب بار بار کہہ چکا کنڈیکٹر تو پھر
بولے وہ جا دماغ نہ چاٹ اپنا کام کر
اے بیوقوف مجھ کو تعجب یہ ہے کہ تو
حالاتِ حاضرہ سے ہے بالکل ہی بے خبر
لیڈیز سیٹ پہ ہوں میں بیٹھا ہوا تو کیا
بیٹھے مرار جی جو ہیں اندرا کی سیٹ پر

اب ان سے "دوپٹہ" سنئے ؎

بھرے تھے ریل میں کچھ مارواڑی اور گجراتی
ہمارے پاس میں بیٹھا ہوا تھا ایک دیہاتی
زمانے کے فریب و مکر سے کچھ بے خبر تھا وہ
ہم اُس کے ہم سفر تھے اور ہمارا ہم سفر تھا وہ
یکایک روشنی ڈبے کی غائب ہو گئی ساری
اندھیرے میں اُٹھا کر اس کا تھیلا چل دیا کوئی
خلش سینے کی مثلِ خنجر و شمشیر ہوتی ہے
اُدھر دوڑا جدھر لٹکی ہوئی زنجیر ہوتی ہے
وہ دوڑا اور جھپٹ کر اس نے اس زنجیر کو کھینچا
پڑا اک منہ پہ تھپڑ گال سہلاتا ہوا پلٹا
میں اپنی سیٹ پر سنبھلا تڑاکے کی صدا سن کر
سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ آخر ہے یہ کیا چکر
وہ سنبھلا اور اُس نے پھر سے زنجیر کو کھینچا
فضا میں ریل کی پھر اک تڑاکا سا ہوا پیدا
یہ جب دو تھپڑوں سے ہو گیا بے حال و خستہ
تب آ کر ریل کی لائٹ نے کھولا رازِ سربستہ
یہ دیہاتی تھا بیچارہ اور اس کی عقل تھی کچی
جسے زنجیر سمجھا تھا وہ اک عورت کی چوٹی تھی

پون گھنٹے تک ہلاک رامپوری نے دو نظموں کے علاوہ ع بند دروازہ ہوا کیوں کس لئے پھر در کھلا۔ ع مری سانگ میں شمع میں ہوں پتنگا۔ ع مریضِ عشق دل کے عارضے میں ہے شفاخانے۔ کے علاوہ بوالہوس بڈھے (از طویل نظم) دانتوں سے زبان کی تکرار سنا کر سامعین کو ہنساتے ہنساتے بالکل تازہ دم کر دیا ہے اور اب فضل امام صاحب تڑپ کا پتہ جناب ڈاکٹر بشیر بدر صاحب کو مائیک پر لا رہے ہیں۔ تعارف ان کا بھی یوں ہی سا کرایا گیا ہے اور

اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ فضل امام صاحب ہر شاعر کو اپنے سے کم تر سمجھتے ہیں۔ سنئے ڈاکٹر بشیر بدر صاحب تمہاری عوامی کتاب سے ہیں

دشمنی جم کر کرو لیکن یہ گنجائش رہے
جب کبھی ہم دوست ہو جائیں تو شرمندہ نہ ہوں

اس ایک عوامی کے بعد غزل شروع کی ہے

کچھ تو مجبوریاں رہی ہوں گی — یوں کوئی بے وفا نہیں ہوتا
گفتگو ان سے روز ہوتی ہے — مدتوں سامنا نہیں ہوتا
جی بہت چاہتا ہے سچ بولیں — کیا کریں حوصلہ نہیں ہوتا
رات کا انتظار کون کرے — آج کل دن میں کیا نہیں ہوتا

ڈاکٹر وسیم صاحب کہنے لگے۔ سرور صاحب میلارام کا شعر پایا۔ ع روز روشن میں کیا نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر بشیر بدر صاحب دوسری غزل سنا رہے ہیں

سیاہیوں کے بنے حرف حرف ہوتے ہیں
یہ لوگ رات میں کاغذ کہاں بھگوتے ہیں
چراغ پانی میں موجوں سے پوچھتے ہوں گے
وہ کون لوگ ہیں جو کشتیاں ڈبوتے ہیں
قدیم قصبوں میں کیسا سکون ہوتا ہے
تھکے تھکائے ہمارے بزرگ ہوتے ہیں
چمکتی ہے کہیں صدیوں میں آنسوؤں سے زمیں
غزل کے شعر کہاں روز روز ہوتے ہیں

داد تو بشیر بدر کا حق ہے۔ بے شک داد دینے والے ع یہ لوگ رات میں کاغذ کہاں بھگوتے ہیں'' کی تفسیر گھر جا کر اپنی اپنی بیویوں سے بتائیں گے اب بشیر بدر زیر ترنم غزل سرا ہو رہے ہیں۔

خدا ہم کو ایسی خدائی نہ دے
کہ اپنے سوا کچھ دکھائی نہ دے
ہنسو آج اتنا کہ اس شور میں
صدا سسکیوں کی سنائی نہ دے
خطا وار سمجھے گی دنیا تجھے
اب اتنی زیادہ صفائی نہ دے
غلامی کو برکت سمجھنے لگیں
اسیروں کو ایسی رہائی نہ دے
خدا ایسے احساس کا نام ہے
رہے سامنے اور دکھائی نہ دے

ڈاکٹر بشیر بدر کا ترنم شاعرانہ ہے۔ انہیں اس بھی داد بہت اچھے انداز سے ملی ہے۔ اب فضل امام نے تمنا جمالی صاحب کو دوبارہ بلانے ان کے ترنم کی تعریف میں "شعلہ سا لپک جائے تو دیکھو" کو شعلہ سا لرز جائے کہا ہے۔ توجہ دلا تو کسی نے بلند آواز سے کہا کہ انہیں لکھ ہی ایسا ہے۔ اس خوشگوار نوک جھونک میں پہلا دور ختم ہوا ہے اور میں نے بھی مشاعرہ نوٹ کر دیا ہے۔ تاکہ دوسرا دور سکون سے سن سکوں

قلم اور تخلیق

پروفیسر ہمراہ بانہالوی کشمیر

کلاس میں میرے کتنے دوست ہیں
رول نمبر ۱
۲
۳
۴
۵
۶
۷ ......؟
ان کے علاوہ اور بھی ساتھی ہیں
سب کے پاس اپنا اپنا قلم ہے۔
اپنے پاس بھی ایک اچھا سا قلم ہے
پھر بھی نہ جانے کیوں
اپنی تخلیق تمہارے قلم سے لکھنا چاہتا ہوں۔

نسیم بھیلسوی!

برائے جشن نسیم منعقدہ مارچ ۱۹۷۸ء

ادھر سے پہلے اُدھر سے پہلے یہاں سے پہلے وہاں سے پہلے
سناؤں حالِ نسیم آخر بتائے کوئی کہاں سے پہلے

اُدھر ماضی کے "بھیلسہ" اور حال کے "وِدیشہ" میں اپنے زمانے کے مشہور حکیم قبلہ وکعبہ جناب چھوٹے خاں صاحبؒ کے پوتے، قبلہ محترم حافظ (معروف بہ حافظ جی) حکیم محمد امیر خاں صاحبؒ طبیب کامل کے بیٹے اور شفیق مکرم حکیم حاذق حاجی محمد مظفر صاحب اجمل کے برادرِ خورد اور ادھر رتن وید کے ڈگری ہولڈر، ہومیوپیتھی کے مستند ڈاکٹر محمد خوشحال ظفر ایم۔ ایس سی اور رحمان ظفر صاحبان کے چچا جان نیز فیرٹی لائیزر کارپوریشن آف انڈیا کے سیلس اسسٹینٹ اظہر پرویز بی ایس سی اور ایک دوا ساز کمپنی واقع ایران میں دس ہزار روپیہ ماہ تنخواہ پانے والے اظہر پرویز ایم۔ ایس۔ سی کے بھی دادا میاں اور علم جوتش کے تحت خصوصاً غالب ومغلوب کا ماہر حساب داں حاجی عبدالغفور کاشتکار لینڈ آفس کا کلرک محمد ابراہیم، محمد جمیل کاشت کار اور رپی ڈبلو ڈی محکمہ میں اوورسیر محمد جمیل صاحبان کے والد بزرگوار نیز اپنے فرائض کی انجام دہی کی اعلیٰ کارکردگی کے صلے میں راشٹرپتی سے ایک خاص سند اور تمغہ پانے والے اسکول ٹیچر اقبال ظفر سلمہ کے ناناجان یعنی حضرتِ نسیم بھیلسوی اور ان کے ذی عزت اقرباء وافرادِ خاندان وفیض رساں بزرگوں سے بھیلسوی نسل (وہ خواہ کسی بھی فرقہ اور ذات یا برادری سے متعلق ہو) ایسا کون شخص ہے جو واقف نہ ہو! ہاں یہ اور بات ہے کہ "ودیشہ" کی نئی پیڑھی، نسیم صاحب کو نہ جانتی پہچانتی ہو کیونکہ کم وبیش بیس برس سے آپ بوجوہ "ساگر" میں اقامت گزیں ہیں۔

پھر بھی محترم نسیم صاحب کے بارے میں کچھ نہ کچھ لکھنے کے لئے مجھے ایک ایسی بزرگ شخصیت کا حکم موصول ہوا جس کے لئے انکار کا تصور بھی مجھے ممکن نہیں۔ چنانچہ اپنے موجودہ دماغی انتشار اور ظاہری وباطنی تمام تکالیف نیز دیگر مجبوریوں کے باوجود محض حکم کی تکمیل کے پیشِ نظر یہ چند سطور اس لطیفہ آمیز حقیقت کے ساتھ تحریر کر رہا ہوں کہ نسیم صاحب ایک خاص حساب کے مطابق ۱۳۱۲ھ میں اپنے آبائی وطن بھیلسہ اور ودیشہ، گویا بیک وقت دو مشہور تاریخی شہروں میں پیدا ہوئے اور وہیں پروان چڑھے۔

ناز ونعم میں پرورش پانے والے اس شاعر کا پورا نام محمد وزیر (مخاطب بہ وزیر میاں) اور تخلص نسیم ہے۔ چونکہ میری اطلاع کے مطابق گذشتہ سے پیوستہ چار پشت سے آپ کے خاندان کے بعض افراد طبابت کرتے آرہے ہیں لہٰذا حضرتِ نسیم کا بھی طبیب ہونا گویا ناگزیر تھا، چنانچہ آپ نے بھی وراثتاً اپنے بزرگوں سے نہ صرف طب میں مہارت حاصل کی بلکہ اپنی مستند طبی مہارت کے ذریعہ آج بھی عوام کو فائدہ پہنچا رہے ہیں۔

نسیم صاحب کے والد صاحب قبلہ حافظ جیؒ فن طب میں بھوپال کے شاہی طبیب حکیم نورالحسن مرحوم کے بھائی بادشاہ میاں کے ہم سبق یا بالفاظ دیگر کلاس فیلو تھے اور حافظ قرآن وطبیب کامل ہونے کے علاوہ ان کو علم رمل، جوتش اور جفر میں بھی کمال حاصل تھا، وہ نہایت... پاکیزہ مزاج مثالی امین، معیاری دیانتدار اور صوم وصلوٰۃ کے پابند بزرگ تھے۔ آپ کے صفاتی نام سے "ودیشہ" میں جو گلی آج بھی مشہور ہے یعنی "حافظ جی کی گلی" وہیں وہ اپنے ذاتی مکان میں مطب کرتے تھے، اسی مطب کو آج کل نسیم صاحب کے بڑے بیٹے جناب مظہر ظفر چلا رہے ہیں۔

چونکہ نسیم صاحب نہ صرف ایسے حضرات (جو عام طور پر معیاری تعلیم وتہذیب کے حامل ہوتے ہیں) سے ہمیشہ وابستگی رہی بلکہ بھیلسہ اور بھیلسہ کے اطراف واکناف کے حکامِ وقت، راجاؤں اور نوابوں کی محفلوں میں بھی بار پایا

سے مواقع حاصل رہے ہیں، چنانچہ آداب محفل سے واقفیت کا ثبوت آپ ہر رنگ کی محفل میں دے سکتے ہیں یہ سب کچھ آپ کے نیک طینت آباء و اجداد کی تعلیم اور خصوصاً بزرگ خواتین کی تربیت کا نتیجہ ہے جو نسیم اور نسیم صاحب کے خاندان کے تمام افراد بلند کردار، شائستہ مزاج، تعلیم یافتہ، مؤدب، مہذب اور اعلیٰ اخلاق و محبت کے نمونہ نظر آرہے ہیں۔

بہرکیف نسیم صاحب اچھے شاعر اور ایک سچے مسلمان ہیں لیکن آپ کا حلقۂ احباب مسلمانوں کے علاوہ زیادہ تر ایسے ہندو افراد پر مشتمل رہا ہے جو انھیں اپنا ہی کوئی بزرگ سمجھتے تھے۔ پسندیدگی اور مقبولیت کی اس عمارت کی بنیاد، سوائے خلوص، محبت اور پریم کے اور کیا ہو سکتی ہے؟

راقم السطور نے بھی خلوص و محبت کے پیکر بھائی نسیم صاحب میں ہمیشہ ایک دردمند و شفیق کی تصویر دیکھی ہے۔ آپ کو میں ایک مدت سے جانتا ہوں پہلے تو دور سے جانتا تھا اب بہت نزدیک سے جانتا ہوں۔ آپ ایک اچھے دوست خوش گو شاعر اور ایک دردمند انسان ہیں، اسی لئے فرماتے ہیں۔ ؎

میرے وطن کے واسطے انسان چاہیئے؛
ہندو کو کیا کروں میں مسلمان کو کیا کروں!

آپ کی عمر کا آفتاب سہ پہر کی منزل میں ہے، جس کا اعتراف آپ خود بھی اپنے اس شعر میں یوں فرماتے ہیں۔

مقابل آئینہ رکھ کر جو دیکھا اپنی صورت کو
پتا عمر رواں کا دے رہی ہیں جھریاں میری
اب تک آپ تماشی سرد گرم موسم دیکھ چکے ہیں گویا۔
جوانی گئی حافظ اور پیری آئی
بس اب بیٹھ رہیئے مدینہ میں جاکر۔ کا زمانہ سر پر آپہنچا ہے۔

نسیم صاحب چونکہ شاعر کے علاوہ ایک اچھے طبیب بھی ہیں اور ایک طبیب کا نباض ہونے کے ساتھ ہی قیافہ شناس بھی ہونا لازمی ہے۔ چنانچہ آپ قیافہ بھی ہیں اور موقعہ شناس بھی۔ آپ عام طور پر بحث و مباحثہ سے احتراز فرماتے آپ کا بول چال سادہ، رہن سہن سادہ اور آپ کی شاعری میں بھی سادگی بدرجۂ اتم موجود ہے، ملاحظہ فرمایئے۔ ؎

ان کے رخ کا جواب کیا ہوگا
ماہتاب آفتاب کیا ہوگا

مشاعروں اور ادبی ماحول کی تحریک پر نسیم صاحب نے پندرہ سال کی عمر سے سلسلۂ سخن شروع کر دیا تھا جسے عوام و خواص سے رابطہ قائم رکھنے کا بھی ایک اچھا ذریعہ تصور کیا جاتا ہے۔ لیکن ملک کی تقسیم کے بعد دفعتاً ادبی ماحول کے بگڑنے اور احباب کے بچھڑنے کی وجہ سے آپ نے سخن گوئی اور شعر خوانی ترک ہی سی کر دی ہے ورنہ آپ بلاشبہ ایک پختہ مشق شاعر ہیں اور آپ نے غزل، نظم، قطعات، رباعیات، منقبت اور نعت کم و بیش سبھی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے اور قریب قریب ہر موضوع پر اپنے قلم کو جنبش دی ہے۔

زبان کے اعتبار سے آپ کی شاعری عوام کے لئے نہایت آسان اور عام فہم ہے، ترنم سے پڑھنے والوں کے لئے بحروں کا انتخاب بھی عمدہ ہے، جیسے ؎

نہ آئے پھول پھل جس میں مری شاخ تمنا تھی
ہمیشہ جو رہا خالی وہ دامن میرا داماں تھا

میں نے اپنے ابتدائی ربط و یا بس یا با الفاظ دیگر ٹریک بندیوں کے زمانے میں دیکھا کہ نسیم صاحب اکثر و بیشتر اندرونی و بیرونی، چھوٹے بڑے سبھی مشاعروں میں بڑے ٹھاٹ کے ساتھ غزل سرا ہوا کرتے تھے، مگر تبدیلیٔ حالات کے سبب آپ نے اب گوشہ نشینی اختیار کر لی ہے۔ آپ کا کلام بعض ہندی اور اردو کے مقامی اور غیر مقامی اخبارات و رسائل کی زینت بھی بنتا رہا ہے۔ زبان و بیان کی پختگی کے ساتھ ساتھ ان کے رنگا رنگ احساسات کی نزاکت و لطافت بھی ان کے بیشتر اشعار سے نمایاں ہے، جیسے ؎

ان کو دیکھا مسکرا کر رہ گئے ۔۔۔ بجلیاں دل پر گرا کر رہ گئے
کسی گل رخ کی زیارت کر رہا ہوں ۔۔۔ تماشائے قدرت کر رہا ہوں
گل کھلے، غنچے ہنسے، شاخ و شجر ہیں شاد کام
دیکھ کر گلشن میں ان کے روئے خنداں کی طرف

نسیم صاحب اپنے تجربات و مشاہدات کی روشنی میں اپنی شاعری کے ذریعہ اپنے ملک و قوم کے سامنے حتی المقدور مفید مشورے بھی پیش کرتے رہے ہیں، جیسے ؎

ہندو و مسلم خدا کے واسطے — جان کر چھوڑو نہ راہِ راست کو
وطن کی محبت میں مرنا ہے جینا — تو ہستی کو اپنی مٹانے چلا جا
غلامی کا جینا گوارا نہیں ہے — یہی راگ سب کو سنانے چلا جا

نسیم ہندو و مسلم کے جھگڑے چکا کر
گلے سب کو اپنے لگانے چلا جا

انگریز حکمرانوں کے حوصلہ شکن مظالم سے نڈھال اپنے وطن والوں کے دلوں میں جوش اور ولولہ پیدا کرنے کی خاطر فرماتے ہیں۔

سن لو بھارت کے سپوتو! تم کو گنگا کی قسم
ویرتا کے خون سے پیدا کرو تم روشنی

آپ ایک سچے وطن پرست، آزادیٔ وطن کے متوالے نہ صرف ہندو مسلم بلکہ بھاشا اور زبان کے بھی عملی اتحاد کے علمبردار رہیں اور فرماتے ہیں ؎

اتحادِ باہمی کو عام کرنا چاہیئے
دیش بھگتی ہو جس میں وہ کام کرنا چاہیئے

جب بار بار باہمی تبادلۂ خیال اور کوششوں کے باوجود کانگریسی اور لیگی سربراہ آپس میں متفق و متحد نہ ہو سکے تو نسیم صاحب کو بڑی کوفت ہوئی، لہٰذا بڑی سنجیدگی اور متانت کے ساتھ اپنے دلی کرب اور خواہش کا یوں اظہار فرمایا ؎

عدمِ شرکت سے لیگی لیڈروں کی کچھ نہ مجھ کو
کمی محسوس ہوتی ہے کمی معلوم ہوتی ہے

اکثر و بیشتر آپ فرقہ وارانہ یکجہتی کا راگ چھیڑتے رہے ہیں ملاحظہ کیجئے اور ساتھ ہی اردو اور ہندی کے ملاپ سے بننے والی گنگا جمنی زبان کا بھی لطف اٹھائیے۔

اس نئی دنیا محبت کی بسانا چاہیئے — ایکتا کا راگ ہر انساں کو گانا چاہیئے
بھید بھاؤ اپنے ہر دل سے مٹانا چاہیئے — دین دکھیوں کو گلا اپنے لگانا چاہیئے

جو شخص اپنی عمر کے بیشتر حصے میں انسانیت، رواداری محبت، پیار اور اپنی قوم و ملک کی آزادی کا گیت الاپتا رہا ہو حتی کہ قوم و ملک پر آزادی کی بہار آ گئی ہو، بھلا اس شخص کی خوشیوں اور مسرتوں کا کیا ٹھکانا۔ چنانچہ ہمارے وطن کو جس وقت گورے حکمرانوں سے چھٹکارا نصیب ہوا تو آپ اپنی دیرینہ آرزو کی بارآوری کے موقع پر ؎ شامِ زیست آ گیا یعنی اگست آ گیا۔ والی اپنی تصنیف نظم گنگناتے ہوئے مستی و بیخودی کے عالم میں جھوم اٹھے تھے اور پھر کتنے لطیف طنز اور باہمی احساسات کا اظہار فرمایا تھا

سوئے مغرب جانے والے مڑ کے مشرق کی طرف
کس نگاہِ یاس سے ہندوستان دیکھا گئے

شکر ہے صد شکر تیرا، اے خدائے دو جہاں،
کر دیا آزاد ہم کو حکمراں دیکھا گئے

نسیم صاحب نے محض انسانیت کی پکار اور اپنے ملک و قوم کی سلامتی کی خاطر آزادی سے پہلے کی طرح آزادی کے بعد بھی ہندو مسلم میل جول پر بہت زور دیا ہے۔ ملاحظہ کیجئے ؎

اتحاد باہمی پیدا کریں — آؤ بیٹھیں مل کے دن کو رات کو
لو بڑھاؤ اب تو دستِ دوستی — مل کے ٹالو دیس سے آفات کو

حریت کے سب مزے لوٹیں نسیم!
کوئی کیوں دے دخل اپنی ذات کو

یاد پڑتا ہے کہ یہ مکمل نظم ملک کے مشہور صاحبِ طرز ادیب محترم کوثر چاند پوری نے ایک پُرخلوص نوٹ کے ساتھ ماہنامہ "بادہ" بھوپال کے کسی شمارے میں شائع فرمائی تھی۔

ضرورت ہے کہ نسیم صاحب کے تمام و کمال نایاب اور اسی طرح غیر مطبوعہ ادبی ذخیرہ کو طبع کرا کر ملکی عوام کو استفادہ کا موقع دیا جائے اور موصوف ممدوح کو ان کی دیرینہ ادبی قومی اور ملکی خدمت کے اعتراف میں "بھارت رتن" قسم کے کسی مناسب اور موزوں خطاب سے نوازا جائے نیز اپنی بھارت سرکار سے معقول وظیفہ بھی مقرر کرا جائے۔ جس کے وہ مستحق ہیں۔

(باقی صفحہ ۳۰ پر)

چھوٹے شہر کا بڑا فنکار

اسمعیل ذبیح سرونج

مجھے یہ کہتے ہوئے جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ میں کسی حد تک رومانٹک ہوں۔ اور رومان کا پرستار بھی۔ اکثر احباب مجھے خوابوں میں کھویا ہوا انسان تصور کرتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں سچائی کو جاننے کی بھی کوشش کرتا ہوں اور اس کو حاصل کرنے کی جستجو بھی، میری اس سچائی اور حقیقت کی تلاش کا مرکز سائنس داں نہیں ہوتے بلکہ شاعر ہوتے ہیں۔

ایک لمحہ کے لئے بھی یہ تصور میرے ذہن میں نہیں آتا کہ زندگی سرتا پا حسن و شباب کا پیکر ہے۔ پھر بھی میں ہمیشہ جادو کے اس جھروکے کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہوں جس سے پریوں کے دیش کا خوشنما منظر دکھائی دیتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ میر عرفانی بہ حیثیت شاعر میرا پسندیدہ شاعر ہے۔ میرا یہ خیال ابدی بجل نہیں سرونج کے کئی اردو پڑھے لکھے لوگ یہی کہتے ہیں جو میں نے کہا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ میر عرفانی صرف حسن و شباب کا ہی شاعر تھا بلکہ یہ کہنا قطعی طور پر صحیح ہوگا کہ وہ حقیقت اور سچائی کا بھی متلاشی تھا۔ اس کی شاعری محض حسن کی ترجمانی ہی نہیں بلکہ زندگی کے اس منظر سے بھی فرار ہے جہاں ایک نوجوان کا چہرہ زرد اور ان کا تخیل آسیب زدہ ہو جاتا ہے اور وہ مرجاتا ہے۔

خرد کے مرحلوں سے ہوتے ہوتے دل کی بیزاری
زہے قسمت کہ راس آئی جنوں کی چار دیواری
ذرا میرے نیازِ عشق کی تکمیل ہو جائے
انھیں خود بھی میری کرنا پڑے گی ناز برداری
ہاں ترکِ محبت سہل نہیں ناصح کو اپنی کہنے دو
یہ دنیا ہے اس دنیا میں ہر قسم کے انساں ہوتے ہیں

موجوں کی تلاطم خیزی پر آتی ہے ہنسی اے میر مجھے!
طوفاں کا انھیں کیا خوف کہ جو پروردہ طوفاں ہوتے ہیں

میر عرفانی ایک جواں شاعر تھا۔ اس نے زندگی سے کیف حاصل کیا اور اس کے کرب کو بھی لاکھوں نوجوان مردوں اور عورتوں کی طرح محسوس کیا۔ اس کی شاعری میں ہمیں موثر درد انگیز اور اک خیال کا تصور ملتا ہے۔ اور ایسے خوابوں کا پرتو بھی جو ہم بیداری میں دیکھے جاتے ہیں، مزید برآں ابدی سچائی کے عناصر کے احساس کے ساتھ ساتھ حسن و شباب کا اک ایسا پرتو پردۂ تصور پر متحرک ہو جاتا ہے جس کی ہر جواں ذہن کو تلاش ہوتی ہے۔

اے میر کوئی پوچھو تو ذرا دل چاک گریباں والوں سے
کیا چاک گریباں کرنے سے تکمیلِ جنوں ہو جاتی ہے
زباں قاصر رہے جہاں پر سنا دو تم حالِ دل مکرر
نظر سے ان کی نظر ملا کر نگاہ کو ہم کلام کر دو
جاگے تو آستین تھی اشکوں سے اپنی تر
دیکھا تھا ہم نے خواب میں تاروں کا سلسلہ
ہم جن سے اپنا حال کہیں اور شفا ملے
کیا جانئے کہاں وہ مسیحا نفس گئے

اختر شیرانی کی نظموں کی طرح میر کی غزلوں سے حمایہ انداز بہت نمایاں ہیں خارجی مظاہر و آثار حواس کے ذریعہ ہر دل کو متاثر کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ درج ذیل اشعار سے یہ تاثر قاری کے دل میں پیدا ہو کہ میر عرفانی حسن پسندی کی منزل سے گزر کر روح کی گہرائیوں میں سرگرم سفر تھا۔

دھواں اٹھتا ہوا معلوم ہوتا ہے میرے دل سے
گزر کر ہاں شاید وہ گزرا ہے مقابل سے
مری کشتی کبھی منت کشِ ساحل نہیں ہوتی
بچا کر اپنے دامن کو گزر جاتی ہے ساحل سے

[illegible] آپ کو ڈھونڈ رہی ہے!
ابھی تو ابتدائے داستاں ہے
محبت سے منہ موڑتا جا رہا ہوں
جنوں کی حدیں توڑتا جا رہا ہوں
سنبھل کر ذرا راہروانِ محبت
میں نقشِ قدم چھوڑتا جا رہا ہوں

میر کرناٹی کے حسبِ ذیل اشعار سے وسعتِ تخیل اور ایجادِ معانی تک رسائی حاصل کرنا ممکن ہے جن سے اس کی انفرادیت اور شعری مزاج کی ساخت کا سلسلہ وابستہ ہے۔

ماضی کی یاد آئی ہے یوں میر صف بصف
کشمیر میں ہو جیسے چناروں کا سلسلہ
یہ ملالِ خستگی کیوں، یہ غمِ شکستگی کیا
یہی پستیاں بنیں گی کبھی رفعتوں کے زینے

ان اشعار میں یاد کا صف بہ صف آنا۔ چناروں کا سلسلہ۔ ملالِ خستگی غور طلب ہیں۔ اور شاید شعری مزاج کے لیے یہ اشعار کافی ہیں۔

میرے دیش میں [illegible] کاش یہ سپنا سچ ہو جائے
رنج ہو تو راحت کیسی، دھوپ نہ ہو تو چھاؤں [illegible]
چہرہ دل کا حال بتائے گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے
مجھے چین آ ہی جاتا مگر آہ جاتے جاتے
یہ غضب کیا کہ دیکھا مجھے لوٹ کر کسی نے

[illegible] اور جنوں کا تعلق حسن اور [illegible] دو رائے کا شکوہ غزلوں میں عام طور پر پایا جاتا ہے۔ میر کرناٹی کی غزلوں میں جو ربط اور تعلق ان احساسات سے ہے اور جو حسن لطافت اور تازگی و شگفتگی کے ساتھ ان کو [illegible] روشنی ڈالی [illegible]
چند اشعار کا حصہ ضروری [illegible]
[illegible]

[illegible] دیکھو تو کمی کا [illegible] ہے
[illegible] اک مستقل غم ہو گیا ہے

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ [illegible] شاعر کے [illegible] کا تصور کیا جاتا [illegible] کی بلند نظری۔ اس خیال [illegible] محبت دل بہلانے کا سامان بن جاتی ہے [illegible] وہ کتنی ہی [illegible] حاصل نہیں ہوتا [illegible] سے [illegible] کہ جہاں [illegible] ذوق کی تحمیل کا ذریعہ بنا دیں [illegible] تخلیق کے ارتقائی منازل، شعور و فکر اور جذبات کے نمونے پیش کرنے سے قاصر نہیں رہا۔ چنانچہ مختلف رسائل میں اس کا کلام شائع ہو چکا ہے۔

ان شائع شدہ شعری عناصر کے باہمی رشتوں [illegible] کا احساس تخلیقی عمل کے مدارج کا تجربہ چند اشعار کی [illegible] اور [illegible] سے لگایا جا سکتا ہے۔

کبھی بقدرِ تمنا نظر ملا نہ سکا
نظر ملی تھی کہ پھر [illegible] یاد کیا
آئے [illegible]
جبیں [illegible]
[illegible]
یہ عمر دکھے جام و ساغر [illegible]
[illegible] شباب [illegible] کلام [illegible]
مری بات [illegible]
[illegible]
[illegible]

آپ کا واجب الادا انکم ٹیکس!

کیسے تخمینہ لگایا جائے؟

اگر آپ منفرد شخص یا غیر منقسم ہندو خاندان ہیں تو درج ذیل گوشوارہ شرح آپ کے لئے مددگار ہو سکتا ہے۔

1978-79 کے تخمینے کے لئے انکم ٹیکس کی اور 1978-79 کے دوران قابل ادا پیشگی ٹیکس کی شرحیں

کل آمدنی (سلیب) احد	ہر منفرد شخص یا غیر منقسم ہندو خاندان کے لئے قابل ادا ٹیکس (تیسرے کالم میں درج کو چھوڑ کر)		ہر غیر منقسم ہندو خاندان کے قابل ادا ٹیکس جس کے کم سے کم ایک ممبر کی کل آمدنی دس ہزار روپے سے متجاوز ہے	
1	2		3	
کہاں سے کہاں تک	مقررہ حد کے لئے طے شدہ رقم	تبدیل پذیر بعد رقم بمطابق درج ذیل	مقررہ حد (سلیب) کے لئے طے شدہ رقم	تبدیل پذیر بعد رقم بمطابق درج ذیل
10,000 تک	کوئی نہیں		کوئی نہیں	
10,001 سے 15,000 تک	کوئی نہیں	بعد 18% فیصد 9,000 ہزار روپے سے متجاوز پر	کوئی نہیں	بعد 18% فیصد 8,000 ہزار روپے سے متجاوز پر
15,001 سے 20,000 تک	1,050	بعد 19% فیصد 15,000 ہزار روپے سے متجاوز پر	1,260	بعد 25% فیصد 15,000 ہزار روپے سے متجاوز پر
20,001 سے 25,000 تک	1,950	بعد 25% فیصد 20,000 ہزار روپے سے متجاوز پر	2,510	بعد 30% فیصد 20,000 ہزار روپے سے متجاوز پر
25,001 سے 30,000 تک	3,200	بعد 30% فیصد 25,000 ہزار روپے سے متجاوز پر		بعد 40% فیصد 25,000 ہزار روپے سے متجاوز پر
30,001 سے 50,000 تک	4,700	بعد 40% فیصد 30,000 ہزار روپے سے متجاوز پر	6,010	بعد 50% فیصد 30,000 ہزار روپے سے متجاوز پر
50,001 سے 70,000 تک	12,700	بعد 50% فیصد 50,000 ہزار روپے سے متجاوز پر	16,010	بعد 55% فیصد 50,000 ہزار روپے سے متجاوز پر
70,001 سے 1,00,000 تک	22,700	بعد 55% فیصد 70,000 ہزار روپے سے متجاوز پر	27,010	بعد 60% فیصد 70,000 ہزار روپے سے متجاوز پر
1,00,001 اور زیادہ	39,200	بعد 69% فیصد 1,00,000 ایک لاکھ روپے سے متجاوز پر		

سرچارج: — درج بالا شرحوں کے مطابق قابل ادا انکم ٹیکس کے علاوہ پندرہ فیصد کے برابر سرچارج بھی قابل ادا ہے۔
اگر کل آمدنی 10,559 روپے سے متجاوز نہیں تو قابل ادا انکم ٹیکس کی رقم 10,000 روپے سے متجاوز کل آمدنی کے 70% فیصد سے زیادہ نہ ہوگی۔
اگر کل آمدنی 10,690 روپے سے متجاوز نہیں تو قابل ادا انکم ٹیکس کی 10,000 روپے سے متجاوز کل آمدنی کے 70% فیصد سے زیادہ ہوگی۔

ٹیکسوں کا صحیح تخمینہ لگائیے اور بروقت ادا کیجئے

جاری کردہ: ڈائرکٹوریٹ آف انسپکشن (ریسرچ، اسٹیٹسٹکس اینڈ پبلی کیشن)
محکمہ انکم ٹیکس، نئی دہلی 110001

محمد عبد الغنی القادری

ولیِ کامل حضرت سید بابا تاج الدین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں والدِ محترم جناب شیخ چاند قاسم مرحوم اپنے چند دوست احباب کے ہمراہ خیر و برکت کی دعا حاصل کرنے کی غرض سے واکی شریف ضلع ناگپور تشریف لے گئے۔ حضور بابا جان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ کو مسواک کے برابر ایک جڑی عنایت فرمائی اور دعا دے کر ارشاد فرمایا کہ "اسلام کا خیال رکھنا" اپنے مکان پر واپس آنے کے بعد والدین نے اس جڑی کو سروتے سے کاٹ کر پان کے ساتھ استعمال کر لیا چنانچہ بابا جان رضی اللہ تعالیٰ کی دعا کی برکت سے سال آئندہ مورخہ ۱۶ ر جون ۱۹۲۷ء شب جمعہ میں بمقام موہکھیڑہ ضلع چھندواڑہ ایم۔ پی پیدائش واقع ہوئی۔ والد صاحب نے عبد الغنی نام تجویز کیا۔ والد صاحب چونکہ ۴ سال کی عمر سے یتیم ہو چکے تھے اور گھر میں کوئی اولاد نرینہ موجود نہ تھی لہٰذا ولادت کی تقریب نہایت دھوم دھام سے منائی گئی اور نام عمر حضور بابا تاج الدین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے چرچے زبان زد رہے اور آج بھی نہایت زور شور سے آپ کے احسانات کے گیت اہلِ خاندان گاتے ہیں۔ اس طرح بچپن کے ایام پانچ چھ سال تک بڑے ناز و نعم اور پیار و محبت میں گزرے۔

والد صاحب چونکہ ہندی پرائمری اسکول میں ماسٹر تھے۔ اس لئے اپنا وطن چھوڑ کر والدین کو نیوٹن چکلی آنا پڑا۔ چاچیوں اور پھوپھیوں کی طرح دادی اماں بھی بیحد پیار کرتی تھیں اور کھلونوں کے علاوہ اچھے اچھے کپڑے پہنا کر نہایت خوش ہوتی تھیں اور بعض اوقات چھوٹی لنگی پہنا کر کہتی تھیں کہ یہ میرا چھوٹا مولوی ہے۔ والد صاحب نے باوجود اسکول میں ماسٹر ہونے کے کبھی ہندی پڑھانے کی طرف توجہ نہ کی اور جب عزیز رشتہ دار اس سلسلہ میں گفتگو کرتے تو آپ کہتے کہ میں اس کو مولوی بناؤں گا اس لئے کہ بابا تاج الدین نے کہہ دیا تھا کہ اسلام کا خیال رکھنا اور اسی جذبہ کے تحت نیوٹن چکلی سے ۱۲ میل فاصلہ پر موضع جامٹی میں جناب رحمت اللہ خاں ٹھیکیدار کے مدرسہ میں داخل کر دیا جہاں اس وقت تقریباً دس لڑکے قرآن پاک اور اردو کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ وادی کابل سے ایک کابلی مولانا جناب رمضان خاں صاحب دونوں وقت صبح و شام پڑھانے آتے تھے۔ ان دنوں پھوپھی کے یہاں قیام تھا۔ دس ماہ کے قلیل عرصہ میں قرآن پاک ختم کر کے اردو کی ساتویں اسلامی کتاب تک پڑھ کر نیوٹن چکلی واپس آیا۔ گھر پر چند روز ہندی لکھنا پڑھنا سیکھ کر تیسری کلاس میں داخل ہو کر پہلے سال میں تیسری اور دوسرے سال میں چوتھی کلاس ۱۹۴۰ء میں پاس کر لیا۔ اب تک یہاں کوئی مسجد نہ تھی مگر اب یہاں بھی ایک مسجد ۴ فٹ لمبی اور ۳ فٹ چوڑی تعمیر ہو چکی تھی اور کچھ پڑھائی کا بھی انتظام ہو گیا تھا۔ لہٰذا کچھ دنوں حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب کے زیرِ تعلیم رہا۔ پھر آنجناب نے خود ہمراہ لے جا کر جامعہ عربیہ اسلامیہ ناگ پور میں اونچی تعلیم کے لئے داخلہ کر دیا۔ جامعہ عربیہ میں بانی مدرسہ شیخ الجامعہ حضرت علامہ الحاج مولانا المولوی الصوفی الشاہ محمد عبد الرشید خانصاحب رضی اللہ عنہ کی تحویل میں ناگپور یونیورسٹی سے فارسی زبان میں منشی اور منشی عالم اور عربی زبان میں مولوی اور مولوی عالم و مولوی فاضل کے امتحانات پاس کئے۔ اس کے بعد جامعہ نعیمیہ مرادآباد یو۔پی پہنچ کر درس نظامیہ میں شریک ہوئے اور مستقل تین سال تک رہ کر حضرت مولانا ملک محمد نعیمی صاحب و حضرت مولانا حبیب اللہ صاحب بھاگلپوری رضی اللہ تعالیٰ عنہ و حضرت مولانا محمد یونس صاحب نعیمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ و حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب مدظلہم سے درس نظامیہ کی تکمیل کی اور حضرت مولانا مفتی محمد حبیب اللہ صاحب

گا ، دعا کا یہ اثر ہوا کہ ان کا چھوٹا مولوی آج اپنے علاقے کا سب سے بڑا مولوی ہے ۔

[illegible]

[illegible] سلسلہ [illegible]

[illegible] قبلہ [illegible] اعظم

[illegible] سید [illegible] صاحب اشرفی جیلانی کچھوچھوی رضی اللہ

[illegible] صاحب مظہر

[illegible] حضرت [illegible]

[illegible] حضرت [illegible]

[illegible]

[illegible] کے مقدس ہاتھوں سے

[illegible] اپنے علم نیک سے نوازا۔

[illegible] حضرت [illegible] صاحب

[illegible] تھے۔ جن کی مبارک صحبت

اور شفقتوں سے [illegible] کو ایک طرح سے سجتا۔ اللہ

تبارک و تعالیٰ تمام علماء دین و محسنین کو اپنی جنت الفردوس

[illegible] کے لائق [illegible]

[illegible] آنے کے [illegible] مفتی اعظم ہند

[illegible] صاحب [illegible] نے شرف بیعت کے علاوہ

[illegible] حاصل ہے [illegible] حضور قبلہ فقیہ اعظم

[illegible] صاحب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے

بھی سلسلہ عالیہ چشتیہ، اشرفیہ و قادریہ، اشرفیہ میں خلافت

حاصل ہے۔ [illegible] سلسلوں میں کثرت سے لوگ [illegible]

بیس سال سے [illegible] ہو رہے ہیں۔ نیز قادریہ [illegible]

[illegible] سال سے بفضل تعالیٰ کامیابی

[illegible] والد محترم

[illegible] کے بہترین [illegible] تھے۔ آپ نے گھر پر بہت

[illegible] کے بعد جا کر

[illegible] ماہ [illegible]

[illegible] سے گریجویشن

[illegible] حاصل کیا اور ۲-M.T اسکول [illegible] کا بھی

۹-۲۹-۶۰-R [illegible]

[illegible] بچوں کی تعلیم کا انتظام [illegible]

[illegible]

سے [illegible] بدایوں

دیوان شریف [illegible] ۔ بدایوں

[illegible] شریف وغیرہ مقا

مقدسہ کا سفر اکثر لوگوں کے ہمراہ ہوا ہر عرس کے

بعد جاری رہتا ہے

[illegible] شاعری [illegible] ۔ بچپن

[illegible] ۔ [illegible] قوالوں کی محفلوں

[illegible] غزل [illegible] اور نعتیہ کلام پڑھنے کا موقع

آیا۔ ان دنوں جہاں اپنے وقت کے اچھے [illegible]

[illegible] کے [illegible] کا [illegible] کیا کر۔

اس لئے ان کے ہمراہ جانا قریب ضروری تھا۔ اور

اچھے گانے والوں میں شمار تھا۔ [illegible]

مشہور ہو گئے تھے۔ شاعری کی محفلیں نہ اس وقت

ہوتی تھیں اور نہ آج ہی باقاعدہ ہوا کرتی ہیں۔

حضرت محرم کے چالیسواں میں محفل شاعری سال میں دو

بار ہوا کرتی تھیں۔ وہ بھی غیر طرحی۔ آج کل اتنا

فرق پڑا ہے کہ طرحی مشاعرہ بھی سال میں کبھی کبھی ہو

ہیں۔ اس لئے سخن شاعری کا ماحول [illegible]

نہ اور استاد ملا نہ ہی کوئی رہبر بس ذوق شاعرانہ

استاد اور رہبر ہے۔ اگر ماحول اور استاد ہوتے تو

کچھ اور بات ہوتی۔ بس یہ سمجھئے کہ جب [illegible]

[illegible] کلام [illegible] ہوا۔

[illegible] یا نعت و منقبت [illegible]

[illegible] حضرت [illegible]

[illegible]

ہے۔ [illegible]

محمد [illegible]

دل و جان [illegible]

[illegible]

ان کے جلووں کی چمک نے دل منور کر دیا
گیسوؤں نے یہ مشام جاں معطر کر دیا

اے خدا ہو احمدِ مختار کے او پر درود
اے عزیزو سب پڑھو سرکار اکثر درود

کہاں ہے جہاں میں مثالِ محمد
کہ ہے نورِ حق لازوالِ محمد

خدا کی قسم تاجدارِ مدینہ
ترے دم سے ہے نوبہارِ مدینہ

کبھی سے بغض رکھ کر رب سے کچھ حاصل نہیں ہوتا
بلا حُبِّ نبی ایمان بھی کامل نہیں ہوتا

کمالِ خدا ہے بیانِ محمد
ثنائے خدا ہے ثنائے محمد

کھلا دو مثلِ گل یہ غنچۂ دل یا رسول اللہ
میں صدقے جاؤں تم پر مثلِ بلبل یا رسول اللہ

اے دل تو مدینہ چل کیوں دیر لگائی ہے
... قدا جاؤں یہ دل ... سمائی ہے

مدینہ کی گلی کتنی بھلی معلوم ہوتی ہے
نظر میں ہیچ جنت کی گلی معلوم ہوتی ہے

بہر دا، آں پہ آنے لگا چھپکے چھپکے
وہ غم جی کو بہلانے لگا چھپکے چھپکے

قافلے جب مدینہ کو چلنے لگے
میرے زخم جگر مسکرانے لگے

در مصطفےٰ پہ جاتے تو کچھ ...
کبھی لوٹ کر نہ آتے نہ کچھ اور بات ہوتی

یقیں کا ہاتھ تھمے اے دل دستِ شاہِ جیلانی
ہے دستِ پاک ان کا اصل میں در دستِ یزدانی

ابرِ رحمت ہے جہاں میں قطبِ ربانی میرا
سرورِ کونین ہے محبوبِ سبحانی میرا

مرے دردِ دل کی دوا غوثِ اعظم
ملے روح کو بھی دوا غوثِ اعظم

دلِ ویراں بسا دیا تو نے
... بنا دیا تو نے

... دل میرا ایک دن ... تھا
... بھی ... تھا

نور سے احمد کی ضیا سرکار تاج الاولیاء
دین احمد کا دیا سرکار تاج الاولیاء

ہے میرا کعبہ تیرا آستاں غریب نواز
تیرے سپرد ہے سود و زیاں غریب نواز

خواجۂ خواجگان غریب نواز
تو سا ہے شاہ غریب نواز

ہر بشر محشر میں صرف امتحاں ہو جائے گا
جو بھی پردے میں نہاں ہے سب عیاں ہو جائیگا

خاک پائے اولیا وتاج الاولیاء

محمد عبدالغنی قادری
موضع چکلی کلاں ضلع چھندواڑہ ایم پی

نصیر افسر

صوبہ بہار کے شہر رانچی میں یکم جولائی ۱۹۵۵ء کو ایک متوسط لیکن باعزت گھرانے میں جب میں نے پہلی مرتبہ سانس لی تو والدین نے محمد نصیر کے نام سے پکارا اور اب اپنی دنیا نصیر افسر کے نام سے جانتی ہے

۱۹۷۰ء میں بی کام پاس کیا اور اسی سال ہندوستان اسٹیل لیمیٹڈ (راورکیلا، درگاپور و بھیلائی جیسے فولاد کے کارخانوں کے سنٹرل آفس) رانچی کے اکاؤنٹس ڈپارٹمنٹ سے ... ۱۹۷۴ء منسلک رہا اور اب MECON رانچی کے مالیاتی ڈپارٹمنٹ سے وابستہ ہوں۔ میری شعری زندگی کا ابتدا اس حسین شام سے ہوتی ہے جب میں نے پہلی مرتبہ ایک نظم میں یونیورسٹی چیمپین شپ شیلڈ کو رانچی یونیورسٹی کی جھولی میں ڈال کر سامعین کو پیش کیا تھا اور ... تھا ... نے مجھے سلسلہ شعر گوئی برقرار رکھنے کی تلقین کی تھی میری تخلیقات آل انڈیا ریڈیو سے نشر کی جاتی ہیں۔ ... اخبارات و رسائل میں بھی جگہ پاتی رہی ہیں۔ ... ہندوستان میں شرکت کرنے کا شرف حاصل ہے ... واسطے گزشتہ تمام کل ہند مشاعروں کے ... کام کرنے کا تجربہ بھی۔ ...

کے جوائنٹ سکریٹری کے عہدوں سے میرا نام جوڑا جاتا ہے نیز ساہتیہ سنگم، رانچی و دفتر کی مختلف ادبی انجمنوں سے بھی گہری وابستگی ہے۔ کسی حد تک زندگی کی گاڑی ایک ہی پہیہ سے چلنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی کہ ۳ مارچ ۱۹۷۸ء کو کوثر پروین نام کا دوسرا پہیہ بھی جوڑ دیا گیا جس سے گاڑی کی رفتار خوشگوار حد تک سبک ہو گئی۔ دو غزلیں ملاحظہ فرمایئے۔

اس حسنِ مجسّم کو پرستار چاہیئے   ہر ناز اٹھائے وہ طلبگار چاہیئے
رخسار کو مہتاب بناؤں گو کس طرح   پہلے یہ تیری زلف تو خمدار چاہیئے
میں اٹھ کے چلا جاؤں گا اس بزم سے ابھی   اک جام نقد آپ سے سرکار چاہیئے
ساغر نہ سبو جام نہ مینا کی بات کر   بس ایک نظر مجھ پہ مرے یار چاہیئے

افسر کو دے دست کرم سے اے باغباں
شاداب رہے ایسا چمن زار چاہیئے

دیکھ کے تجھ کو جانِ غزل   بھڑک گیا بن تاج محل
پوچھ نہ مجھ سے شوق میرا   رقص کرے جب ایک غزل
بات پرانی جور و جفا   ان کا کوئی عنوان بدل
میری کوئی تقصیر تو ہو   یوں ہی نہ کر اب پیار میں چھل
سنگ سبھی خاموش ہوئے   ٹوٹ گیا جب شیش محل
ان کی نظر کا تیرِ غضب   میرے جگر کا شوق اٹل

دیکھ رہی افسر کو وہی
جھیل کو جیسے نیل کمل

بقیہ جشن نسیم

بڑی خوشی کی بات ہے کہ "باشندگان" ودیشہ" نے اپنے ایک قوم پرست اور کہنہ مشق شاعر نسیم صاحب کو فراموش نہیں کیا اور گو دیر سے سہی لیکن "جشنِ نسیم" کا اہتمام کر کے نہ صرف اردو نوازی و ادب دوستی کا بلکہ اپنے نسیم سے بھی اپنی بھرپور عقیدت و محبت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔

میں اس موقع پر آپ تمام مخلصین ادب کے اس پُر خلوص جذبہ کی قدر کرتے ہوئے محترم حضرت نسیم صاحب بھیلسوی کی خدمت میں دلی مبارکباد پیش کرنے کے بعد تضیع اوقات کے لئے شرکائے جشن سے معذرت چاہتا ہوا رخصت ہوتا ہوں، تاکہ اب آپ حضرات شوقِ مسرت، جوش و ولولہ، درد و کرب اور حسن و عشق میں ڈوبے وہ نغمات اور نورانی ترنم سماعت فرما سکیں جن کے سننے کے واسطے غالباً آپ لوگ بیتاب ہوں گے،

اچھا خدا حافظ۔   (ابوالانوار سلام)

(جشن نسیم میں پڑھا گیا)

بقیہ چھوٹے شہر کا فنکار

اپنی حقیر نظروں سے اس کو نہ دیکھئے
پھولوں سے جا ملا ہے خاروں کا سلسلہ

ہر چند کہ شاعری ایک نظری جذبہ ہے لیکن علم کی محبت مشاہدات اور کتب کا مطالعہ اس پر چار چاند لگا دیتا ہے انھیں امور نے میر عرفانی کو ایک بلند مرتبہ اور عدیم المثال شاعر بنا دیا۔ اس اظہارِ خیال کے باوجود مجھے بھی میر عرفانی کے لئے وہی کہنا پڑتا ہے جو خود اس نے اپنی زندگی میں کہا تھا

لے لیا مجھ کو رحمت نے آغوش میں
زاہد و شیخ ہاتھ ملتے رہے

موصوف کی وفات سے کلاسیکل انداز کا سلجھا ہوا شوخ و شگفتہ لہجہ ختم ہو گیا جو آپ اپنا امتیاز اور آپ اپنی شناخت تھا۔

دلّی

شاہراہ ترقی پر گامزن

○ صاف ستھرا انتظامیہ

عام لوگوں کو بنیادی شہری سہولتیں مہیا کرنے اور انسداد بدعنوانی کے لئے دلّی انتظامیہ کے موثر اقدامات

○ ہریجنوں اور پسماندہ طبقوں کی فلاح و بہبود

۷۵ لاکھ روپے ہریجن بہبودی اسکیموں پر صرف ہو چکے ہیں ۔ اس سال کے لئے ایک کروڑ روپے سے بھی زیادہ مخصوص ۔ تکنیکی تعلیمی اداروں میں تمام ہریجن طلبہ کے لئے وظائف خصوصی ۔ نو آباد کالونیوں میں بسنے والے کمزور طبقوں کی حالت بہتر بنانے پر خصوصی توجہ

○ سب کے لئے تعلیم

تعلیم کے قومی نشانے کو پورا کرنے میں دلّی سب سے آگے ۔ تمام بچوں کو تعلیم دینے کے لئے مزید ۲۱ اسکول کھولے گئے اور اس سال مزید ۹۷ کھولے جائیں گے ۔ برسرِ روزگار لوگوں کو بھی تعلیم کی سہولیات دیہی طالبات کے لئے مفت ٹرانسپورٹ ۔ تمام غریب بچوں کو مفت کتابیں اور مفت وردیاں۔

○ طبّی سہولیات :۔

گھر کے نزدیک غریبوں اور گاؤں والوں کو طبّی سہولتیں مہیا ۔ دین دیال اپادھیائے اسپتال میں ۵۰۰ بستروں کا بندوبست ۔ شاہدرہ میں اسپتال اور میڈیکل کالج کی تعمیر شروع ۔ دیہات اور دور دراز کالونیوں میں ۱۰۰ بستروں والے اسپتالوں کی تعمیر جلد شروع ہوگی ۔ لوک نایک جے پرکاش نارائن اسپتال میں گورونانک آئی سینٹر کا قیام

○ خوراک و رسد

دالیں ۔ سبزیاں ۔ چائے ، صابن وغیرہ سستے داموں پر ، راشن کارڈ ہولڈروں کو پہلے سے زیادہ گیہوں اور آٹا ۔ بدعنوان بیوپاریوں کے خلاف سخت کارروائی

جاری کردہ: محکمہ اطلاعات و اشاعت ، دلّی انتظامیہ ، دلّی

ناردرن ریلوے

عزیز طلباء، زائرین اور سیاحو!

ہندوستان دیکھئے ـــــ سہل طریقے سے

[illegible] ٹکٹ [illegible] کے [illegible] مقررہ ریلوے [illegible] سے خریدیئے۔ میل ایکسپریس گاڑیوں میں ۱۵ فیصد رعایت کے ساتھ یہ ٹکٹ [illegible] مدت کے اندر قابل استعمال ہوا کرے۔ مدت کا انحصار طے کئے جانے والے [illegible] فاصلہ پر ہے۔ سفر کے دوران آپ جب چاہیں، جتنی بار چاہیں اور جتنے عرصہ کے لئے چاہیں [illegible] کہیں بھی قیام کر سکتے ہیں۔ شرط یہ ہے کہ ٹکٹ کی کل مقررہ میعاد استعمال نہیں بڑھ سکے گی۔

آپ کی سہولت اور ضرورت کی مناسبت سے ہم نے ایسے تمیں سرکلر ٹورز کا بندوبست کیا ہے۔ ان کے [illegible] عظیم الشان ملک کا احاطہ ہو سکے گا جسے ہندوستان کہا جاتا ہے۔ ان ٹورز میں کسی کا انتخاب کر لیجئے۔

اور اگر آپ کا کوئی ایسا پروگرام ہے جو آپ کی انفرادی ضرورت کے مطابق ہو تو اس کے لئے ہم سے خود ملئے یا ہمیں اپنا پروگرام لکھ کر بھیجئے۔ ہم آپ ہی کے خود پروگرام کے لحاظ سے کرایہ کا حساب کر کے رعایتی شرح پر لگا کر ... آپ کو مطلع کر دیں گے۔

[illegible] ہونا چاہیے اور اس کا فاصلہ ۲۴۰۰ کلو میٹر سے کم نہیں ہونا چاہیے۔ اس کے ساتھ ہی فاصلہ جس کا کرایہ چارج کیا جاتا ہے اور پروگرام کے آغاز کے اسٹیشن سے پروگرام کے آخر تک کے اسٹیشن تک ان اسٹیشنوں کے درمیان براہ راست مسافت کے فاصلے کے مقابلے میں [illegible] سے زیادہ ہونا چاہیے۔

مزید معلومات کے لئے براہ کرم اپنے قریب ترین ریلوے اسٹیشن ماسٹر یا متعلقہ ڈویژنل کمرشیل سپرنٹنڈنٹ سے ملئے یا [illegible] کا [illegible] کیجئے۔

چیف کمرشیل سپرنٹنڈنٹ

ناردرن ریلوے، بڑودہ ہاؤس، نئی دہلی

گوشۂ عقیل صدیقی

گلہائے رنگ رنگ

حضرت احسن رسولی داناپوری

مٹ گئے بے رخی پہ ہم نقشِ وفا ابھار کے
داغ یہ سارے دل کے ہیں پھول نہیں مزار کے
کر لیا ترک شوق نا بھی رنج طلب سے ہار کے
رنگ کہاں سے آ گئے جبر میں اختیار کے
غم کا جنوں کو پاس تھا ربط اب اور ہے سوا
دیدۂ اشک [illegible] سے دامن تار تار کے
صبح [illegible] نہیں تو ہوتی شام کچھ تو بدلتا انتظام
[illegible] گئے کس لئے قدم گردشِ روزگار کے
وقت کی رو سے پائمال ٹھوکروں سے شکستہ حال
جیسے ہم آدمی نہیں سنگ ہیں رہگزار کے
عمرِ رواں گزر گئی راہ طلب نہ طے ہوئی
بڑھتے گئے قدم قدم فاصلے کوئے یار کے
ڈھلے پڑے ہیں دل کے جام سیر ہیں پھر بھی تشنہ کام
دیکھ رہا ہے شعبدے چشم کرشمہ ساز کے
کاسۂ چشمِ شوق میں اشکوں کی اب کمی نہیں
دولتِ غم سے بھر گئے ظرف امیدوار کے
داغ جو ہوں تو محو ہوں دھبے جو ہوں تو مٹ بھی جائیں
دل پہ نشانِ غم نہیں نقش ہیں اعتبار کے
غم کا اثر نہ لیجئے ، داد بہار دیجئے
نالے ہیں اک غریب کے نغمے نہیں ہزار کے
ظلمتِ شام فصلِ گل مٹ گئی احسن حزیں
برقِ نظر جلا گئی سارے کنول بہار کے

سفینۂ غزل کا ایک صفحہ

حضرت عروج زیدی

کوئی گم گشتہ مجھے سمجھا کوئی صحرا سمجھا
حسبِ توفیقِ نظر دیکھنے والا سمجھا
سادگی سے جسے میں شہر میں اپنا سمجھا
اب نہ پوچھو اسے ہر موڑ پہ کیا کیا سمجھا
اپنی بربادیٔ دل پر نہیں توفیقِ ملال
جیسے انجامِ وفا ہو میرا سوچا سمجھا
یہ بھی وقت مرے ساتھ ہے سائے کی طرح
اس تعلق سے غم و دل کا میں رشتہ سمجھا
سچ کی تلخی تو مسلّم ہے، مگر اس کی سزا
ہائے کیا لوگ تھے دنیا نے انہیں کیا سمجھا
میں تو آئینۂ حیرت تھا مگر سُنتا ہوں
اُن کی محفل میں سبھی نے مجھے تنہا سمجھا

بقیہ :۔ جشن جمہوریت کا مشاعرہ لال قلعہ

کہ پھر انہیں کون پوچھے گا لہذا اُن پڑھے لکھے حضرات کی اس تنگ دلی ۔ کم ظرفی اور سفارش بازی کے پیشِ نظر ہم پیش گوئی کرتے ہیں کہ اب کی مرتبہ بھی یہ مشاعرہ بری طرح سے فیل ہوگا کیونکہ جن مقامی شعرا جن میں بھارت بھوشن ۔ کامل قریشی وغیرہ شریک ہیں ۔ ان سے عوام الرعب ہیں ۔ جونہی یہ لوگ مائیک پر آئیں گے عوام انہیں سننا پسند نہیں کریں گے ۔ اور بیرونی شعرا میں اگر نوبہار صابر جیسی ہستی کو سفارش کی بنا پر مدعو کیا گیا ہے تو مشاعرہ کے فیل ہونے کے اور بھی امکانات روشن ہیں ۔ ویسے ہم اردو پرست کی حیثیت سے دلی طور پر یہ چاہتے ہیں کہ یہ مشاعرہ کامیاب ہو ۔ مگر بقول کنور صاحب یہ مشاعرہ " اب پست طفلاں " کے مصداق اپنی روایات قائم کر رہا ہے ۔ کم از کم ہمیں ڈاکٹر نارنگ سے ایسی توقع نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ بھی مشاعرہ کو کامیاب بنانے کے لئے دوسرے حضرات سے مشورہ کرنے میں اپنی ہیٹی سمجھیں گے ۔

میری نظروں نے تو سمجھی ہیں اُجالوں کا نقیب
کم نگاہوں نے اندھیرے کو اندھیرا سمجھا
اپنے دیوانے کو وہ دادِ نظر کیا دیتا
جو تماشائی عالم کو تماشا سمجھا
دوست کے حُسنِ تغافل کا گلہ کیا معنی؟
میرے دل نے تو اُسے دولتِ دُنیا سمجھا
اس سے پہلے کہ میں اقرارِ خطا کر لیتا
مجھ کو اربابِ زمانہ نے فرشتا سمجھا
سنگ دل لوگ ہیں سنگین ہے [illegible]
میں تو اس عہد کو پتھر کا زمانہ سمجھا

غزل

توصیف علوی عاصی بی اے کیرانوی

زندگی کے پیچ و خم دیکھ کر — میں ہنستا ہوں ہر شامِ غم دیکھ کر
ہیں خزائیں بھی آج خود ماتم کناں — فصلِ گُل کے جبر کرم دیکھ کر
بجلیوں نے بھی حیرت سے سر دُھن لیا — میری شاخِ نشیمن قلم دیکھ کر
آگ خود آشیاں کو لگا دی مگر — روشنی صحنِ گلشن میں کم دیکھ کر
عظمتِ مے مسلّم ہوئی بالیقیں — بزمِ رنداں میں شیخِ حرم دیکھ کر
آج دنیائے انساں ہے حیرت زدہ — زر کے ہاتھوں میں اہلِ قلم دیکھ کر
بات منزل کی خود سوچنی پڑ گئی — رہنماؤں کے بہکے قدم دیکھ کر
فطرتِ حُسن میں انقلاب آ گیا — عشقِ مجبور کی آنکھ نم دیکھ کر
وہ بھی کھانے لگے ہیں وفا کی قسم — اپنی رفتار جور و ستم دیکھ کر
پھر اندھیروں کی جانب بڑھے قافلے — روشنی کے ستونوں کو خم دیکھ کر
خود تلاطم نے منزل کو آواز دی — میرے عزمِ جواں کی قسم دیکھ کر
مدعی ماضی کے آزر بھی ہیں دم بخود — آج کے بتکدوں کے صنم دیکھ کر
رحمتیں آخرش جوش میں آ گئیں
چشمِ مجبورِ عاصی کی نم دیکھ کر

غزل

ابوالانور سلام سانگری

یوں تو ہر پھول خوبصورت ہے — تجھ سے کم حُسن، کم نزاکت ہے
عشق کی اب تو یہ حقیقت ہے — کچھ حکایت ہے کچھ شکایت ہے
چشم و دل مست، روح ہے سرشار — میکدہ زندگی کی جنت ہے
غم کی نعمت ہمیں عطا کر دو — ہنسنا خدمت خوشی کی رشوت ہے
ہے چمن منتظر بہاروں کا — دل کو پھر زخم کی ضرورت ہے

ہر خوشی لا رہی ہے غم کی خبر — ہر سحر شام کی ضمانت ہے
آپ چاہیں تو تجربہ کر لیں — اک نظر زندگی کی قیمت ہے
مول لیتا ہے یاس کے لمحے — ہر نفس بر سرِ تجارت ہے
زندگی کے جمودِ پیہم میں — ایک بھی حادثہ غنیمت ہے
وہ فرشتوں سے بھی سوا ہو گا — جس کو احساسِ آدمیت ہے
زندگی زندگی نہیں ہے سلام!
جیسے جی ہر نفس قیامت ہے

احکامِ عشرہ

شمس بمن گراجی

میں بھی کہنے کو کہتا مگر کیا کروں — کھولنا رازہی کا مہا پاپ ہے
ہائے منصور کو یہ نہ معلوم تھا — فاش کرنا خودی کا مہا پاپ ہے
ہم نے دو گھونٹ پی لی تو کیا ہو گیا — بحرِ رحمت میں کیا کچھ کمی آ گئی
معفرت شرطِ عصیاں [illegible] — چھوڑنا مے کشی کا مہا پاپ ہے
باغ کی ٹہنیاں جھوم کر گا اُٹھیں — [illegible]
پاپ ہے توڑنا پھول کا بھی مگر — توڑ لینا کلی کا مہا پاپ ہے
[illegible] یہ مگر — [illegible] اک راہ سیدھی [illegible]
[illegible] ہے اور کتنی بڑی — دل دکھانا کسی کا مہا پاپ ہے
اک کرن [illegible] صبح کو ناگہاں — ٹوٹ کر عرش سے فرش پر آ رہی
اور ذرّہ ذرّہ [illegible] کر گئی بولنے — انتشار آگہی کا مہا پاپ ہے
خیر خواہانِ ظلمت کی یلغار ہے — شمع سے کچھ پتنگوں کو الفت نہیں
شمس حیوانیت ہے وہ ذہنِ جہاں
گیان بھی روشنی کا مہا پاپ ہے

غزل

ابر سرہندی

تم اور پاس وعدۂ لطف و کرم غلط! — کہتے نہیں یہ بات سرِ بزم ہم غلط
وہ جام وہ مے کہ جس کا نشہ حشر تک رہے — ساقی! اگر شراب سے ہوتا ہے غم غلط
دشوار ہے کہ فائزِ منزل ہو کارواں — پڑتے ہیں رہنماؤں کے بھی جب قدم غلط
محدود ماسوا ہے خرد کی رسائی بھی — ڈھل جائے گا یقین میں کیسے [illegible] غلط
تقدیرِ کائنات تماشا ازل سے ہے — کوئی ہو ہر ستگارِ وجود و عدم غلط
منظور ہے خلوص سے ہمیں وہ ام بھی — محکوم ہو کسی کی زبان قلم غلط
کچھ بھی کہے کوئی مگر آئینِ عشق میں — مظلومیت ہماری تمہارے ستم غلط
دینی تعصبات میں انساں الجھ گیا — ثابت ہوئی بنائے کنشت و حرم غلط
نکلے تو ہو تلاشِ حقیقت میں تم ابر
طے کر سکو گے جادۂ [illegible] غلط

غزل

زخمی حصاری

جو تیرے رنج و غم کو فراواں نہ کر سکے
وہ مشکل حیات کو آسان نہ کر سکے

ممکن نہیں کہ کر سکیں تعمیرِ نو کبھی
جب ہم خزاں کو رشکِ بہاراں نہ کر سکے

دینا پڑے گا اس کا ہمیں ایک دن جواب
کیا کر سکے جو نظمِ گلستاں نہ کر سکے

خود ہی کریں گے اس کے تدارک کا اہتمام
تم تو علاجِ گردشِ دوراں نہ کر سکے

وہ لذّتِ حیات سے ہوتے ہیں بہرہ ور
جن کو خیالِ مرگ بھی ہراساں نہ کر سکے

کچھ بات ہے جو اُن کے غمِ زندگی کو ہم
افسانۂ حیات کا عنواں نہ کر سکے

شاید یہ اپنے سوزِ دروں کا قصور ہے
تاریکیوں میں ہم جو چراغاں نہ کر سکے

شادابیِ چمن کے تو چرچے ہیں چار سُو
ہم خار کو مگر گلِ خنداں نہ کر سکے

زخمی نہ ہو گا پستیٔ اخلاق کا علاج
ہم آدمی کو بھی، اگر انسان نہ کر سکے

غزل

خواجہ معین الدین مخلص کلکوروی پوسد

نظر آتے ہیں گل شعلہ فگن جب تم نہیں ہوتے
جہنم ہے مرے حق میں چمن جب تم نہیں ہوتے

بڑھا تا ہے مرا دیوانہ پن جب تم نہیں ہوتے
اُڑاتا ہے ہنسی چرخِ کُہن جب تم نہیں ہوتے

خزاں بردوش رہتا ہے چمن جب تم نہیں ہوتے
نہیں ہوتی بہاروں میں پھبن جب تم نہیں ہوتے

دکھاتی ہے یہی منظرِ گلستانِ اُداسی بھی
لرز جاتی ہے سورج کی کرن جب تم نہیں ہوتے

سرور و کیف و مستی بخشتی ہے آپ کی ہستی
کسی میں پھر کہاں یہ بانکپن جب تم نہیں ہوتے

بہلتا ہی نہیں ہے دل گلستاں کی بہاروں میں
بڑے بے لطف ہیں سرو سمن جب تم نہیں ہوتے

نہیں آتا لبِ مخلص پہ بھی رنگیں سخن کوئی
زباں کو روکتے ہیں اہلِ فن جب تم نہیں ہوتے

غزل

رؤف جاوید

چلا گیا ہے کوئی شاخ سے گرا کے مجھے
میں تازہ پھل ہوں اُٹھا لو تو بیٹ کے مجھے

وہ ایک شخص جو مجھ میں شریک ہے اب تک
وہ دیکھتا ہے ہمیشہ گھٹا بڑھا کے مجھے

تمہیں عزیز ہیں موسم گئے زمانے کے
بہت لبھاتے ہیں جھونکے نئی ہوا کے مجھے

ندی کے پاس درختوں کی اوٹ سے بابا
بلا رہا ہے کوئی بانسری بجا کے مجھے

قدم قدم پہ ہر اک امتحاں سے گزرا ہوں
ہزار بار کوئی دیکھے آزما کے مجھے

غزل

ڈاکٹر ایس۔ پی شرما تفتہ

پھر ذہن کے سینے سے اک یاد اُتر آئی
پھر داغ سُلگ اُٹھے، پھر چوٹ اُبھر آئی

احساس کے غاروں میں پھر درد نے کروٹ لی
سینے کے شگافوں سے پھر ٹیس اُبھر آئی

جس سمت نظر اٹھی اک حُسن کا عالم تھا
جس غنچے پہ نظر ڈالی تصویر نظر آئی

ہم ڈوب گئے جب سے اُن جھیل سی آنکھوں میں
تب سے نہیں اے دل اپنی بھی خبر آئی

ہمدرد اگر پایا تو موت کو پایا ہے
بے درد اگر دیکھی تو زیست نظر آئی

ایسا بھی ہوا [illegible] بھیگی ہوئی راتوں میں
اک چاند اُبھر آیا اک زلف بکھر آئی

غزل

واحد پریمی

اس طرح تیرہ شبی آج ہے گھنگھور اے دوست
جیسے کوئی ہو تاریک سمندر اے دوست

صبح کے بدلے میں کیوں خنجر ہوں خوگر اے دوست
یہ اندھیرا تو نہیں اپنا مقدر اے دوست

خون دل صرف کریں حسن چمن کی خاطر
آؤ بن جائیں بہار دل کے پیمبر اے دوست

درحقیقت ہے وہی واقف اسرار حیات
جس نے پہچان لئے وقت کے تیور اے دوست

غم نہیں اہل خرد جتنے بھی چاہیں برسائیں
پھول ہیں اہل جنوں کے لئے پتھر اے دوست

ہم پرستار وفا ہیں تو ذرا غور کریں
مضمحل کیوں ہیں کئی پھول سے پیکر اے دوست

نشتر غم دل واحد کو ملے ہیں اتنے
اس کی [illegible] ہے اب صورت خنجر اے دوست

[illegible]ل

متین بدایونی

[illegible]بت اہل محبت کو خوار کرتی ہے
جگر کو سوختہ دل کو فگار کرتی ہے

[illegible]ں چمن میں [illegible] قرار کرتی ہے
بہار آتی ہے لیکن فرار کرتی ہے

[illegible] فصل بہار کرتی ہے
ہمیشہ امن غم تار تار کرتی ہے

[illegible] بھی بھرتے ہیں ہماری فا
خوشی ہزار ہو غم اختیار کرتی ہے

[illegible] نہیں کم سوز پروانہ
یہ جان جل کے وہ محفل نثار کرتی ہے

[illegible] ہے اپنا درحل [illegible]
جو آنسوؤں سے الم آشکار کرتی ہے

متین رہ گئے وحشت کو ہے دشمن جاں
کبھی اسیر کبھی رہن دار کرتی ہے

[illegible]ل

دانش علی گدھی (درتالام)

[illegible]م فرقت کو اندھیروں سے بچایا جائے
آنسوؤں سے ہی کوئی جشن منایا جائے

[illegible] سے پہلے کہ کریں اہل گلستاں سازش
آشیاں اپنے ہی ہاتھوں سے جلایا جائے

[illegible] تیری ستمگر ہیں زمانے بھر کے
زندگی تجھ کو کہاں جا کے چھپایا جائے

اب مسیحا بھی تو شامل ہیں نمک پاشوں میں
زخم دل اپنا کسے جا کے دکھایا جائے

یہ نہ سوچو وہ تمہیں یاد کریں کے دانش
سوچنا یہ ہے انہیں کیسے بھلایا جائے

غزل

شمیم ندوائی بارہ بنکی

شکستہ ساز محبت ہے کیا غزل لکھوں
بہت اداس طبیعت ہے کیا غزل لکھوں

تمہیں کو کہتے ہیں اہل جہاں تو جان غزل
تمہیں کو مجھ سے عداوت ہے کیا غزل لکھوں

کیا ہے غنچۂ دل پاش پاش کیا نے
گواہ ذوق محبت ہے کیا غزل لکھوں

مرا وجود فقط ایک چلتی پھرتی لاش
اداس دل بھی مصیبت ہے کیا غزل لکھوں

بجھی بجھی سی تمنا تو آرزو ناکام
اداس اداس سی حسرت ہے کیا غزل لکھوں

یہاں فریب ہی پایا نقاب الفت میں
عجب مذاق محبت ہے کیا غزل لکھوں

برس کے کھل گئے بادل گیا طوفاں
خموش بحر محبت ہے کیا غزل لکھوں

جنوں نواز نہ ہو جائے فکر بھی میری
خموشی اب تو غنیمت ہے کیا غزل لکھوں

شمیم کہنے لگے وہ بھی مجھ کو سودائی
بہت عزیز یہ شہرت ہے کیا غزل لکھوں

غزل

م یوسف ثانی

گاؤں میں بھی نہ جی مدام لگے
شہر میں زندگی حرام لگے

کس کے ہاتھوں ہوا چمن ویراں
آؤ یہ الزام کس کے نام لگے

اپنے حالات میں ہے خود محصور
آدمی آج بھی غلام لگے

شب کی بے کیفیوں کا کیا شکوہ
مجھ کو ہر صبح جب کہ شام لگے

آج کیا جانے بات ہے ثانی
کچھ نیا سا ترا کلام لگے

غزل

حضور سہسوانی

غم کو اپنا کے دل ملول نہیں
اب مسرت مجھے قبول نہیں

کب ہوا ہے وہ کامیاب یہاں
جس کا اپنا کوئی اصول نہیں

جس کے پہلو میں خار ہو نہ کوئی
پھول میری نظر میں پھول نہیں

آپ غم دے کے ہیں عبث نادم
میں تو پا کر ذرا ملول نہیں

زندگی اس کو کس طرح کہہ دوں
جس میں غم کی ذرا بھی دھول نہیں

عشق کی دنیا میں یہ داغ اگر
کیسے کہہ دوں مجھے قبول نہیں

ان کے وعدے پہ اعتبار کیا
کیا ہماری حضور بھول نہیں

غزل

اخلاق سہسوانی

مجھے دیکھنا ہے رہزن! کہ ہے کس میں کتنا دم خم
ترے پاس مکر چالیں، مرے پاس عزم محکم

یہ اگر ہے فصل گل تو پھر عجیب فصل گل ہے
جہاں پھول خندہ زن ہیں وہیں رو رہی ہے شبنم

کبھی دل کو دی تسلی تو کبھی تمہیں پکارا
مری بیقراریوں کا شب ہجر تھا یہ عالم!

مرے دل میں ان کے جلوے مرے دل میں انکی محفل
مرے دل کے سامنے تو ذرا آئے شاغر جم؟

میں جہاں نظر اٹھاؤں وہیں دیکھوں انکے جلوے
مرا جذب عشق اتنا تو بلند ہو کم از کم

مجھے خود پکاریں گی مری منزلیں کسی دن
کہ بتا رہا ہے مجھ کو یہی میرا عزم محکم

مجھے ڈر یہی ہے اخلاق اسی کے سوچ میں ہوں
نہ اٹھائیں کوئی طوفاں یہی میرے اشک پیہم

غزل

شرون کمار ورما

گل امید، شمع غم، نہ اب رنگ تمنا ہے
وہی شہر محبت ہے مگر کچھ اجڑا اجڑا ہے

جو تجھ کو دیکھتے ہیں، دیکھتے وہ بھی نہیں تجھ کو
کہیں حیرت ہی حیرت ہے کہیں پروا ہی پروا ہے

کوئی تصویر ہی واضح نہیں ہوتی نگاہوں میں
میں اس دنیا سے گزرا ہوں کہ کوئی خواب دیکھا ہے

کوئی غم ہو کوئی دکھ ہو ہمارے دل کو دے جاؤ
کہیں سے بھی چلے دریا، سمندر ہی میں گرتا ہے

کبھی اک موج آوارہ، کبھی ٹوٹی ہوئی کشتی
نئے عنواں سے دنیا نے مرا افسانہ لکھا ہے

کوئی منزل بھی قدموں کو مری منزل نہیں لگتی
مجھے لگتا ہے جیسے زندگی پر چلتے رہنا ہے

بہت مضبوط ہوتا جا رہا ہے درد کا رشتہ
جدا ہو کر بھی مجھ سے جیسے اب تک کوئی میرا ہے

غزل

فخر واحدی قنوج

جو دل ہے جذبۂ کامل کے قابل
وہی دل ہے ہر اک مشکل کے قابل

مرا ذوق طلب ہے خام جب تک
مری کشتی نہیں ساحل کے قابل

تقاضا ہے بدل ڈالو اسے تم
نہیں دستور جو محفل کے قابل

میسر خود بخود آسانیاں ہوں
اگر بن جائے دل مشکل کے قابل

وہ سیم و زر ہو یا لعل و گہر ہوں
نہیں یہ سب ترے سائل کے قابل

جو رہبر کے سہارے چل رہا ہو
نہیں وہ راہرو منزل کے قابل

نہیں جاں باز ہیں وہ جن کا سینہ
ہے فخر خنجر قاتل کے قابل

غزل

حکیم شبیر علیخاں شبیر کانپوری

ستمگر تجھے باوفا کہہ رہا ہے
جنوں میں نہ جانے یہ کیا کہہ دیا ہے

عجب حال ہے سری دیوانگی کا
گلوں کو ترا نقش پا کہہ دیا ہے

ہوا انجام کچھ بھی مگر بے خودی میں
بتوں کو بھی ہم نے خدا کہہ دیا ہے

تلاش اپنے دل کی ہے ان رات ہم کو
کہ جب سے تمہیں دلربا کہہ دیا ہے

ہے بربم بہت آسماں جب سے ہم نے
ستاروں کو ان کی قبا کہہ دیا ہے

لبوں کو گلابوں سے تشبیہ دی ہے
حسیں گیسوؤں کو گھٹا کہہ دیا ہے

خفا مجھ سے شبیر ہیں لوگ میں نے
چمن کو خزاں آشنا کہہ دیا ہے

چہرے کتنے

ایس مقبول حسن مقبول نصیرآبادی

ٹوٹ کر چور ہوئے خواب سنہرے کتنے
رہ گئے سر کو ترستے ہوئے سہرے کتنے

یہ کس انداز کی ہے چارہ گری اے لوگو
ہو گئے زخم جگر اور بھی گہرے کتنے

جس طرف دیکھئے بہروپیے آتے ہیں نظر
لوگ پھرتے ہیں لئے چہرے پہ چہرے کتنے

باغباں تاک میں ہے گھات میں صیاد بھی ہے
آشیانے پہ لگے ہیں مرے پہرے کتنے

کان دھرتا ہی نہیں کوئی صدائے دل پر
ہو گئے آج کے انسان یہ بہرے کتنے

بھیڑ سی بھیڑ کہ دشوار ہے چلنا لیکن
اس میں انسانوں کے مقبول ہیں چہرے کتنے

غزل

چھپا غنی پالوی

لاکھ حالات کروٹ بدلتے رہے
راہ پر اپنی ہم تھے کہ چلتے رہے
اشک یوں آنکھ سے میری ڈھلتے رہے
سیپ سے جیسے موتی نکلتے رہے
اُن کی زلفوں میں پڑتے رہے پیچ و خم
میری تقدیر کے بل نکلتے رہے
راست گوئی کسے راس آئی تھی
راہِ حق پر ہمیں تھے کہ چلتے رہے

خوشبو کا کربِ[1]

نکہت خان

پیغامبر کوئی تو بنے گا قرار کا — ہوگا کبھی تو ختم یہ دورِ انتشار کا
پوچھو نہ مجھ سے حال دلِ سوگوار کا — بجھتا ہوا دیا ہے کسی کے مزار کا
آنا ہی چاہتی ہوں میں دنیائے سرخوشی میں — ٹوٹا ہی چاہتا ہے فسوں اب خمار کا
اچھا ہوا کہ تم سے تعارف نہ ہو سکا — رسوا ہوا نہ شہر میں افسانہ پیار کا
صدیوں کا کرب جس کے مجسّم میں ڈھل گیا — وہ پل بہت گراں تھا مرے انتظار کا
ان سے بچھڑ کے لوٹے تو احساس یہ ہوا — جیسے گزر گیا ہو زمانہ بہ پیار کا
سمجھے گا کون دردِ محبت کو اب یہاں — پوچھے گا کون حال دلِ بے قرار کا

یہ جانتے ہوئے کہ لٹے کی متاعِ ہوش
نکہت کو انتظار رہے فصلِ بہار کا

[1] میرے مجموعۂ کلام کا نام ہے جو دفتر شانِ ہند سے دستیاب ہے۔

غزل

عابدہ رفعت

یاد ہے اُن کی وہ جو پاس نہیں — دور رہ کر بھی میں اداس نہیں
اک تری آرزو کے صدقے میں — کوئی امید دل کو راس نہیں
موت جب تک نہ آئے جیتے رہو — زندگی سے تو کوئی آس نہیں
آپ کے درد کی عنایت سے — دل میں اشکوں ہجوم یاس نہیں

دل میں غم لب پہ آہ آنکھ میں اشک
کیا ہے رفعت جو میرے پاس نہیں

غزل

نکہت شاہجاپور

خوشی تقدیر سے ملتی ہے یہ لائی نہیں جاتی
طبیعت لاکھ بہلائیں تو بہلائی نہیں جاتی

تقاضا ہے نگاہوں کا کہ دل کو نذر کر دیجے
مگر جو چیز کھو جاتی ہے پھر پائی نہیں جاتی
چڑھانا پھول گر ممکن نہ تھا تمکین و نخوت سے
تو کیا تُربت بھی میری تم سے ٹھکرائی نہیں جاتی
کیا ہے صبر ہم نے بارہا اے ضبطِ غم لیکن
جنونِ عشق میں مطلق کمی پائی نہیں جاتی
بہت الجھی ہوئی منزل ہے حیاتِ عشق بھی نکہت
بجز جذبِ وفا شانے کی سلجھائی نہیں جاتی

غزل

کریم پیاوری

نہ دل لگی کے لئے ہے نہ دلبری کے لئے
انہیں تو حسن ملا ہے ستم گری کے لئے
مجھے یقین ہے کوئی نہیں کسی کے لئے
تڑپ نہ اے دلِ ناداں تو دوستی کے لئے
ہمیں نے رکھی تھی بنیادِ میکدہ لیکن
ترس رہے ہیں ہمیں آج میکشی کے لئے
یہ راہِ عشق ہے رہبر کے بس کی بات نہیں
تو راہزن کو بھی رکھ ساتھ آگہی کے لئے
گرا بھی ایسا کہ احساس تک نہیں اس کا
مقامِ عرش پہ تھا ورنہ آدمی کے لئے
نہیں، نہیں یہ تو ممکن نہیں ہے دوست مرے
خودی کو بیچ دوں اور وہ بھی زندگی کے لئے
یہ آدمی بھی ہے بہروپیا بلا کا کریم
ہزار رنگ بدلتا ہے رہزنی کے لئے

غزل

سحر سعیدی

حریف تھے جو سحر میرے تام نامی کے
وہ معترف ہیں میری قادر الکلامی کے
گلوں نے پائی ادا تجھ سے مسکرانے کی
ہوا میں چرچے ہیں تیری سبک خرامی کے
تھکن کی گرد لئے سر پہ لوٹ آئے ہیں
وہ جن کو دعوے تھے رستے کی تیز گامی کے
زبان سادہ و شیریں شگفتہ تحریریں
ہیں اب بھی دل میں چرچے حسن نظامی کے

غزل

قربان سہارنپوری

نگاہوں سے بجلی گرا کر تو دیکھو
یہ دل طور ہے آزما کر تو دیکھو

غمِ زندگی پر ارے رونے والو
غموں میں ذرا مسکرا کر تو دیکھو

کسی شکل سے بھی یہ ممکن نہیں ہے
مجھے اپنے دل سے بھلا کر تو دیکھو

یہ رفعت میں بڑھ جائیگی آسماں سے
جبیں اس کے در پر جھکا کر تو دیکھو

کسی کے چھپائے نہیں چھپ سکا ہے
غمِ عاشقی کو چھپا کر تو دیکھو

ہر اک شے میں پاؤ گے جلوہ اسی کا
نگاہوں سے پردا اٹھا کر تو دیکھو

محبت کی دنیا نہایت حسیں ہے
کسی کو تم اپنا بنا کر تو دیکھو

فرشتے تمہیں آکے سجدہ کریں گے
گناہوں سے دامن بچا کر تو دیکھو

وہ ہو جائیں گے مہرباں تم پہ قرباں
اُنہیں دل کی حالت بتا کر تو دیکھو

غزل

عتیق احمد مسلم تلہری

جھانکے جو دل میں کوئی نہ ایسا ملا مجھے
ملنے کو یوں تو سارا زمانہ ملا مجھے

رہتا تھا گم جو چاہنے والوں کی بھیڑ میں
دیکھا تو آج شہر میں تنہا ملا مجھے

فردا کی فکر سے جو بڑا بے نیاز تھا
ماضی کی یاد میں وہ تڑپتا ملا مجھے

سایہ تھا سر پہ جس کا مرے آج تک وہی
سورج کی طرح آگ اُگلتا ملا مجھے

محسوس یہ ہوا کہ تمہارا کرم ہے یہ
جب بھی کبھی کسی کا سہارا ملا مجھے

غم تو یہ ہے کسی نے بھی پوچھا نہ دل کا حال
حالانکہ سارا شہر شناسا ملا مجھے

میں اتنا بد نصیب ہوں مسلم کہ کیا کہوں
میرا چمن بہار میں اُجڑا ملا مجھے

غزل

سید یاسین علی وفا دیودھن

دل کے جذبات کو پابندِ وفا رہنے دو
اُن کی چاہت کے لیے دل میں جگہ رہنے دو

یوں تو آغوشِ مسرت میں ہے تابندہ حیات
اور آہوں کی تپش کو نہ بڑھا رہنے دو

شکوۂ یار تو، توہینِ محبت ہو گی
دل کے زخموں کو تبسم میں چھپا رہنے دو

وہ نہ آئیں گے شبِ وصل تسلی کے لئے
اُن کی تصویر کو آنکھوں سے لگا رہنے دو

درد و غم رنج والم تم بھی رہو پردے میں
اُن کی یادوں کے لیے کچھ تو جگہ رہنے دو

دیدہ ور جلتے ہیں، در غمِ الفت کو
دل کی تسکین بہ عنوان حیا رہنے دو

یہ دُعا دل سے نکلتی ہے کہ تم شاد رہو
آپ کا غم دلِ مضطر میں چھپا رہنے دو

غزل

ذاکر صدیقی ملکاپور پاگرہ

راحتِ قلب سکوں زیر و زبر ہونے تو دو
داستانِ زندگی کو مختصر ہونے تو دو

بعد مدت کے ہوئی ہے آپ کی قربت نصیب
ہاں چلے جانا، ذرا ٹھہرو سحر ہونے تو دو

وہ تڑپ جائیں گے خود مجھ کو تڑپتا دیکھ کر
اُن کے آنے تک ذرا دردِ جگر ہونے تو دو

غیر پر ہوتی رہی چشمِ کرم بہرِ وفا
کچھ نوازش کچھ کرم اُٹھو ادھر ہونے تو دو

ذاکرِ آشفتہ سر کی بے سر و سامانیاں
ہمدم و دمساز میرے منتشر ہونے تو دو

غزل

نذیر فتحپوری . پونہ

اپنی ہستی کو مٹانے آپ دیوانے گئے
شمع کی محفل میں خود جلنے کو پروانے گئے

وقت جب آیا تو پیچھے ہٹ گئے اہلِ خرد
منزلِ دار و رسن تک صرف دیوانے گئے

ورنہ اس سے پہلے اُن سے آشنا کوئی نہ تھا
وہ ہمارے نام سے محفل میں پہچانے گئے

آنکھ میں آنسو، لبوں پہ آہ، دل میں حسرتیں
لیکے ہم ان کی گلی میں کیا کیا نذرانے گئے

ہوش میں آئے تو اپنی بھول پر رونا پڑا
بے خودی میں کس کئے دنیا کو سمجھانے گئے

ہم گئے تو پھول برسائے زمیں کی گود میں
تم گئے تو آسماں پہ، آگ برسانے گئے

اُن کے جانے سے ہماری زندگی سے اے نذیر
پیار کی باتیں گئیں، چاہت کے افسانے گئے

غزل

وقار تلہری

اپنے ہاتھوں اپنے ہی مسکن کو ڈھا دینا پڑا
اس تباہی کو بھی نامِ ارتقا دینا پڑا

گو کہ خونِ آبرو خونِ انا دینا پڑا
مصلحت ایسی کہ پھر بھی مسکرا دینا پڑا

کس کو فرصت ہے جو سوچے اس مشینی دور میں
کیا ہوا حاصل مجھے اور کیا گنوا دینا پڑا

وہ جو آئینہ بنا پھرتا تھا سارے شہر میں
اُس کے ہاتھوں میں بھی مجھ کو آئینہ دینا پڑا

پھر نظامِ فکر میں اک انقلاب آیا ہے آج
پھر نگاہوں کو نیا اک زاویہ دینا پڑا

دوسروں کا عیب بیں تھا وہ مگر اک دن اسے
خود کو بھی اپنی نگاہوں سے گرا دینا پڑا

ہائے عاشق خانماں برباد کی مجبوریاں
ایک کافر کو خدا کا واسطہ دینا پڑا

یہ بھی شاید ایک طرزِ خودکشی ہی ہے وقار
اپنا ماضی مجھ کو دانستہ بھلا دینا پڑا

آستاں بن گیا

ستیش کمار حیرت چاندپوری

جب سے اے دوست تو مہرباں بن گیا
دن ہر اک، عمر کا، جادو بن گیا

آپ آئے تو دل کی کلی کھل گئی
غم کے صحرا میں اک گلستاں بن گیا

نام لے کر تمہارا بہ جذبِ خلوص
سر جھکایا جہاں آستاں بن گیا

اتنے آنسو بہائے تری یاد میں
یہ ستاروں بھرا آسماں بن گیا

راہِ الفت میں آہ و فغاں اشکِ غم
جب بھی حیرت چلے، کارواں بن گیا

غزل

انیتا وجے چودھری

چہروں پہ تبسم ہے رعنائی نہ مستی ہے
یہ کون سی دنیا ہے یہ کون سی بستی ہے

بازار میں دنیا کے ہم نے یہی دیکھا ہے
قیمت یہاں انساں کی مٹی سے بھی سستی ہے

ارمان بنے گلشن حسرت ہے گل و غنچے
جب سے مری آنکھوں سے برسات برستی ہے

اپنے ہی نشیمن میں، مر مر کے جئے ہیں ہم
تنہائی وہ ناگن ہے رہ رہ کے جو ڈستی ہے

بے خوف جو پتھریلی راہوں سے چلے آئے
کانٹوں میں گزر کرنا ہم لوگوں کی ہستی ہے

اے گردشِ دوراں اک تیری ہی وہ انساں ہوں
مل کر بھی تو اب جس سے ملنے کو ترستی ہے

ہے نام مرا پھر بھی گمنام سا رہتا ہوں
ہنسنے دو اگر دنیا اس بات پہ ہنستی ہے

غزل

سراج ڈبائیوی

رہِ عشق کے مسافر ذرا چل سنبھل سنبھل کر
کہ ہزاروں لٹ چکے ہیں اسی رہگزر پہ چل کر

ہے یقیں کہ انجمن میں کوئی دل نہ بچ سکے گا
وہ نگاہِ ناز ان کی اگر اٹھ گئی سنبھل کر

ذرا ٹھہرو جلدی کیا ہے ابھی مست ہیں فضائیں
ابھی لطف آ رہا ہے ابھی کیا کرو گے چل کر

کبھی لاؤں گا نہ لب پر تری بے رخی کا شکوہ
شبِ غم گزار دوں گا یوں ہی کروٹیں بدل کر

یہ سراج میری قسمت کہ وہ خود پکار رہے ہیں
یہ ہزار ناز و عشوہ سرِ انجمن مچل کر

دیال سنگھ کالج

کرنال

مشترکہ پنجاب میں نہ صرف دہلی اور کرنال (ہریانہ) میں اپنی چوتھائی صدی سے اپنی شاندار روایات کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ دیال سنگھ کالج کرنال میں طلباء کو ہمیشہ ڈسپلن، قومی یک جہتی اور ملک کی ہر طرح سے حفاظت کرنے کی تلقین کی جاتی ہے اور انھیں ایک اچھا شہری اور ایک ذمہ دار ہندوستانی بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اہل کرنال اور گردونواح کے طلباء کے لئے دیال سنگھ کالج ایک نعمت ہے۔ اپنے بچوں کو اگر آپ اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ساتھ ایک اچھا شہری بنانا چاہتے ہیں تو دیال سنگھ کالج کرنال کی خدمات سے فائدہ اٹھائیں۔

دیال سنگھ کالج کرنال (ہریانہ)

اراکین منتظمہ کمیٹی

کالجوں یونیورسٹیوں اور پبلک لائبریریوں کے لیے

مایۂ ناز اردو کتابیں

کالجوں اور یونیورسٹیوں کے شعبۂ اردو کے سربراہوں اور پبلک لائبریریوں کے منتظمین کی خدمت میں مودبانہ گزارش ہے کہ وہ اردو کتب کی مندرجہ ذیل فہرست کو بغور ملاحظہ فرمائیں اور اپنے ہاں کی ضرورت کے مطابق کتابیں منگا کر اردو پرچم کو اونچا رکھیں۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کو یونیورسٹی گرانٹ کمیشن کی ہدایات کے مطابق کمیشن دیا جاتا ہے اور پبلک لائبریریوں کو لائبریری کمیشن دیا جاتا ہے۔ ذاتی لائبریریوں کے لئے بھی مناسب رعایت دی جاتی ہے

ترجمان القرآن (مولانا ابوالکلام آزاد (چار حصے) ۸۸/۰
فرہنگ آصفیہ ۱۵۰/۰
سٹینڈرڈ انگریزی اردو ڈکشنری مولانا عبدالحق ۵۰/۰
سٹینڈرڈ اردو انگریزی ڈکشنری " ۴۰/۰
فیروز اللغات مولوی فیروز الدین ۵۰/۰
ظہور قدسی آرزو ۱۰/۰
بہارستان اولیا ۱/۰
بیسویں صدی کے بعض لکھنوی ادیب اپنے تہذیبی پس منظر میں مرزا جعفر حسین ۱۸/۰
قصیدہ نگاران اتر پردیش سید علی جواد زیدی ۱۸/۷۵
مطالعہ اقبال (اقبال سیمینار کے مقالے) ۵/۲۵
مراۃ الشعراء عبدالرحمٰن ۳/۷۵
انیسات ڈاکٹر مسعود حسن رضوی ۱۲/۵۰
روح نظیر مخمور اکبرآبادی ۲۰/۷۵
منشورات جوش ملسیانی جوش ملسیانی ۲۰/۰
کلیات نواب مرزا شوق لکھنوی ڈاکٹر شاہ عبدالسلام ۱۵/۰
اردو اسالیب نثر ڈاکٹر امیر اللہ شاہین ۲۵/۰
حافظ کی شاعری کے ایل پنڈت ۱۰/۵۰
دیوان اختر ڈاکٹر کامل قریشی ۱۸/۰
اخبار نویسی کے ابتدائی اصول مظہر ۱۵
اردو شاعری میں قومی یکجہتی کی روایت ڈاکٹر رام آسرا راز ۲۵/۰
اردو ہندی کا لسانیاتی رشتہ " ۱۳/۰

اقبال کے نثری افکار عبدالغفار شکیل (ادارہ) ۱۰/۵۰
تاریخ ادبیات تاجکستان کبیر احمد جائسی ۳/۰
اردو میں تمثیل نگاری منظر اعظمی ۲۴/۰
نیاز فتحپوری امیر عارفی ۱۵/۰
خسرو کا ذہنی سفر طٰہٰ انصاری ۱۰/۰
دھنک (انشائیے) عزیز اندوری ۴/۰
فلسفہ کے بنیادی اصول میر ولی الدین ۱۸/۷۵
نفسیات جنوں عبیدہ زبان ۵/۲۵
دکن کے بہمنی سلاطین ہارون خاں شیروانی ۱۰/۵۰
اجارہ ایم اے گیلانی ۱۴/۵۰
آزادی سعید انصاری ۶/۲۵
شعریات ارسطو ۶/۲۵
امریکی ادب کا مختصر جائزہ سلامت اللہ خاں ۹/۵۰
کاوش کاشف اندوری ۱۲/۰
نغمۂ جمہور کریمی الاحسانی ۸/۰
متعلقات غالب کالی داس گپتا رضا ۴/۰
نظم طباطبائی ڈاکٹر اشرف رفیع ۳۲/۰
پریم چند اور فن تعمیر فن ڈاکٹر جعفر رضا ۳۴/۰
اردو ادب میں طنز و مزاح ڈاکٹر وزیر آغا ۱۰/۰
پنجر کا گلاب (ناول) عصمت بانو ۵/۰
رنگوں کا صحرا شبیر کانپوری ۴/۰
ہم نے آزادی جیتی (دوسرا ایڈیشن) مولانا آزاد ۳۵/۰

...آزاد		۱۸/۰
...نظم		۱۰/۰
اردو تنقید	ڈاکٹر ...	۱۵/۰
...اقبال اردو	ڈاکٹر اقبال	۱۸/۰
...جل	وزیر آغا	۱۲/۰
...کا ...		۲۰/۰
...گی کی ...		۱۲/۰
...اور اجالے		۱۰/۰
...شاعری	ڈاکٹر عبادت بریلوی	۲۵/۰
...ی اور شاعری کی تنقید	″	۱۶/۰
...یا اور مطالعہ غزل	″	۲۰/۰
غالب تیر و نشتر	عرش گرامی	۱۸/۰
عربی ادب کے معمار	... محمد ابراہیم	۱۲/۰
ناقابل فراموش	سردار دیوان سنگھ مفتون	۲۵/۰
...بات مشرق	″	۲۵/۰
...دوں کی برات	جوش ملیح آبادی	۲۵/۰
...سخ	ڈاکٹر عبیدالحق	۲۰/۰
مطالعہ داغ	ڈاکٹر احمد علی زیدی	۲۴/۰
لکھنو کا دبستان شاعری	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	۲۵
تحقیقی نوادر	ڈاکٹر اکبر حیدری	۳۵/۰
یادوں کے سائے	ممتاز مرزا	۲۰/۰
شرح بال جبریل	یوسف سلیم چشتی	۱۴/۰
شرح بانگ درا	″	۴۰/۰
شرح غالب	″	۲۴/۰
شرح جاوید نامہ	جلد اول دوم مکمل	۱۰۰/۰
بہشت نظر	رتن ہنڈوری	۱۵/۰
انداز نظر	″	۱۰/۰
کلیات شاد عارفی	ڈاکٹر مظفر حنفی	۳۰/۰
اردو شاعری میں جدیدیت کی روایت	ڈاکٹر عنوان چشتی	۲۰/۰
مکاتیب احسن مارہروی	″	۴۰/۰

ایوان غزل	جیلانی بانو	۱۶/۰
شہر ممنوع	واجدہ تبسم	۲۴/۰
...کا بوجھ	″	۲۰/۰
اترن	″	۲۰/۰
زخم دل اور مہک مہک	″	۲۰/۰
آپا سکھی بسنت		۲۰/۰
سحر نغمہ	ساحر ہوشیارپوری	۱۵/۰
پیاروں کی برات کا خصوصی مطالعہ	صابر کمال	۱۲/۰
...املا	رشید حسن خاں	۳۴/۰
غالب اپنے ہم عصروں میں	ظفر ادیب	۱۰/۰
گفت و شنید	″	۱۰/۰
در حالی	″	۹/۰
ہماری شاعری	ڈاکٹر مسعود حسن رضوی	۷/۵۰
کلیات فیض	فیض	۹/۰
کلیات جگر	جگر مرادآبادی	۹/۰
لاہور کا جو ذکر کیا	گوپال متل	۱۰/۰
صحرا میں اذان	″	۲/۰
کلیات اختر شیرانی	″	۱۰/۰
حیدر علی	افتخار حسن صدیقی	۱۴/۰
خسرو شناسی	ظ انصاری و سحر	۱۲/۵۰
انیس کے مرثیے	صالحہ عابد حسین	۲۰/۰
تحریک خلافت	قاضی محمد عدیل عباسی	۱۲/۰
آریہ سماج کی تاریخ	لالہ لاجپت رائے	۱۰/۵۰
تاریخ شاہ جہاں	ڈاکٹر سید اعجاز حسین	۱۴/۰
شہیدان آزادی (جلد دوم)	پی این چوپڑہ	۲۰/۵۰
جدید ہندوستان جات پات	شہباز حسین	[illegible]
تعلیم میں نفسیات کی اہمیت	ڈاکٹر سلامت اللہ	۱۲/۲۵
تاریخ جہانگیر	[illegible]	۱۸/۲۵
ہندوستان میں بیوپاری ...	[illegible]	[illegible]
سماجی انسانیات	... کے ...	[illegible]

ملنے کا پتہ :- دفتر شانِ ہند ماہنامہ فلیٹ ۸ انصاری مارکیٹ، دریا گنج نئی دہلی ۲